ارکان اسلام

تصنیف

امام علامہ ملک العلما بحر العلوم

مولانا عبد العلی محمد فرنگی محلی

ترجمہ

مولانا ظفر اقبال کلیار

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ)

۳۸۔ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ
بے شک اللہ کے ہاں اسلام ہی دین ہے (آل عمران ۱۹)

ارکانِ اسلام

مختصر

نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام و مسائل فقہ حنفی کے مطابق
قرآن و حدیث کے دلائل کی روشنی میں

تصنیف

امام علامہ ملک العلماء بحر العلوم مولانا عبد العلی محمد فرنگی محلی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ترجمہ

مولانا ظفر اقبال کلیار
فاضل دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف

ناشر
فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

فہرست

ارکان اسلام

2

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ الذی خلق الانسان من اطوار مختلفة وجعله مظهر العجائب موتلفة فتبارک الله احسن الخالقين. وفضله على العالمين بجعله مخاطبا لكلامه المبين فبعث اليهم الانبياء والمرسلين ليبينوا ما فيه سعادة حيوته الدنيوية والاخروية وخصنا بارسال من هو رحمة للعالمين سيد ولد آدم الذی کان نبيا وآدم ابوالبشر بين الماء والطين وبابقاء خلفائه لاقامة الدين المتين من اولياء الله المجتهدين ليظهروا احكامه المتعلقة بالافعال المتجددة للمكلفين بآرائهم المتنورة بنور الله الذی لاينطفى با طفأ المطفين فجعل ما رأوا شرعا مقررا الى يوم الدين. اللهم صل على ذلک النبی الذی اصطفاه من بين العالمين وجعله للمرسلين اماما وختا ما وعلى آله واصحابه الذين حازوا قصبات السبق فی العرفان واقامة الدين وافض علينا من بركاتهم واسلک بنا مسالک اجتازوها بكرا مائهم.

امـا بعد! اللہ رب العزت کا یہ عاجز بندہ عبدالعلی محمد بن نظام الدین محمد انصاری غفراللہ لھما یوم الدین کہتا ہے کہ انسان کی سعادتِ فکری اور عملی قوتوں کی تکمیل میں ہے تا کہ وہ ان قوتوں سے معرفت کی راہ پر گامزن ہو سکے اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حضور سرخرو ہو۔ دنیوی اور اخروی کامیابی کے لئے نیک اعمال کا التزام ضروری ہے۔ شریعت مطہرہ پر عمل، اخلاق حسنہ سے آراستگی اور اس دین حنیف کے مطابق زندگی گزارنا جیسے اوّلین وآخرین کے لئے محمد مصطفیٰ ﷺ لے کر آئے اور جیسے اللہ تعالیٰ نے بطورِ دین پوری نسلِ انسانیت کے لئے پسند فرمایا۔

چار اعمال (مسلمان ہونے کے بعد) کو اللہ تعالیٰ نے دین کا ستون قرار دیا ہے۔ انہیں چار اعمال پر دین کی عمارت ایستادہ ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے۔

بنى الاسلام على خمس شهادة ان لااله الا الله وان محمدا عبده ورسوله واقام الصلوة وايتاء الزكوة والحج وصوم رمضان.	اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج بیت

(رواہ بخاری و مسلم) اللہ اور ماہ رمضان شریف کے روزے رکھنا۔

حدیث قدسی ہے۔ اللہ تعالیٰ بزبان مصطفیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قال جبریل یا محمد اخبرنی عن الاسلام. قال الاسلام ان تشهد ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله وتقیم الصلوة وتؤتی الزکوة وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیه سبیلا قال صدقت.

(رواہ مسلم)

جبریل امین عرض کناں ہوئے۔ یا محمد! (ﷺ) مجھے اسلام کے بارے میں کچھ بتایئے۔ (حضور ﷺ نے) فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ (اور یہ کہ) نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے، رمضان کے روزے رکھے اور سفر کی استطاعت ہو تو بیت اللہ شریف کا حج کرے۔ (جبریل امین نے) عرض کیا (یارسول اللہ ﷺ) آپ نے سچ فرمایا۔

بارگاہِ رسالت میں ایک اعرابی آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول! ﷺ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جسے بجالا کر جنت میں جاسکوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تعبد الله ولا تشرک به شیئا وتقیم الصلوة المکتوبة وتؤدی الزکوة المفروضة وتصوم رمضان. قال والذی نفسی بیده لاازید علی هذا ولا انقص منه. فلما ولی قال النبی صلی الله علیه وآله وسلم من سره ان ینظر الی رجل من اهل الجنة فلینظر الی هذا. (رواہ بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنا، فرض نماز قائم کر، فرض زکوٰۃ دیا کر اور رمضان شریف کے روزے رکھا کر۔ (اعرابی) عرض کرنے لگا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں نہ اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کچھ کم کروں گا جب وہ اعرابی چلا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: جو جنتی کو دیکھنا چاہتا ہو وہ اس اعرابی کو دیکھے۔

جو سعادت اور اخروی کامیابی کا طالب ہو اسے ان ارکان کی بجا آوری میں سستی نہیں کرنی چاہیے اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے متعلقہ مسائل سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔

اس چیز نے مجھے مجبور کیا ہے کہ ایک ایسی کتاب لکھوں جو ارکانِ خمسہ کے مسائل اور ان کے دلائل پر مشتمل ہو تا کہ آخرت کی راہ کے طالب کے لئے آسانی ہو۔ میں نے اس کتاب کو چار رسائل میں تقسیم کر کے اس کا نام رسائل الارکان تجویز کیا ہے۔ اللہ رحمٰن ورحیم کی بارگاہ میں التجا کرتا ہوں کہ وہ اسے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ میری مغفرت اور حصولِ رحمت کا وسیلہ ہو، اس سے نفع حاصل کرنے والے نفع حاصل کریں اور اسے محبت سے قبول کریں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کا مطالعہ کرنے والے مجھے اپنی دعاؤں میں نہیں بھولیں گے۔

نماز

نماز ارکانِ اسلام میں سے ایک اہم ترین رکن ہے' اس کے فضائل محتاج بیان نہیں۔ یہ بے حد مفید عبادت ہے اور ہر مکلف (یعنی مسلمان' بالغ' عاقل) پر فرض ہے اور اس کی فرضیت کسی سے کسی صورت (جب تک خطاب فہم رکھتا ہے اور کوئی مانع نہیں) ساقط نہیں ہوتی۔

فضائل نماز

حضرت سیدنا امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ:

عن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم بین العبد وبین الکفر ترک الصلوة (رواہ مسلم)

حضرت سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام اور کفر کے درمیان وجہ امتیاز نماز ہے۔

عن بریدة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم العهد الذی بیننا وبینهم الصلوة من ترکها فقد کفر (رواہ احمد' ترمذی' نسائی)

حضرت سیدنا بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمارے اور ان کے درمیان نماز (گویا) معاہدہ ہے جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے کفر کیا۔

عن عبد الله ابن عمرو ابن العاص عن النبی صلی الله علیه وسلم انه ذکر الصلوة والسلام یوما فقال من حافظ علیها کانت له نورا وبرهانا ونجاتا یوم القیامة ومن لم یحافظ علیها لم یکن له نورا ولا برهانا ولا نجاتا وکان یوم القیمة مع قارون وفرعون وهامان وابی بن خلف. (رواہ احمد' دارمی' بیہقی)

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کا ذکر فرمایا اور کہا: جس نے نماز کی محافظت کی (تمام آداب وشرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے پورے خشوع وخضوع سے ادا کی) قیامت کے دن نماز اس کے لئے نور' برھان اور (سبب) نجات ہوگی اور جس نے اس کی محافظت نہ کی وہ نور' برھان اور نجات سے محروم رہے گا اور اس کا حشر قارون' فرعون' ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

عن عبد الله ابن شقیق قال کان

عبداللہ بن شقیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ

اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لايرون شيئا من الاعمال تركه كفرا غير الصلوة. (رواہ ترمذی)

رسول اللہ علیہ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان نماز کے علاوہ کسی اور عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔

عن ابی الدرداء قال اوصانی خلیلی ان لاتشرک بالله شيئا وان قطعت او حرقت ولا تترک صلوٰة مکتوبة معتمدا ومن ترکها فقد برئت منه الزمة ولا تشرب خمر افانه مفتاح کل شر. (رواہ ابن ماجہ)

سیدنا ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے میرے دوست (یعنی نبی کریم علیہ) نے یہ نصیحت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تیرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائیں یا تجھے جلا دیا جائے اور جان بوجھ کر فرض نماز نہ چھوڑنا۔ جس نے نماز ترک کی میں اس سے بری الذمہ ہوں اور شراب نوشی نہ کرنا کہ شراب ہر برائی کی چابی ہے۔

ترک نماز کے متعلق فقہی آراء

حضرت سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بے نمازی کی سزا کے متعلق یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ اسے قید کیا جائے، اگر توبہ کرلے تو فبہا ورنہ اسے قتل کیا جائے کیونکہ حدیث مبارکہ میں تارک نماز سے برأت کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہم احناف کے نزدیک بے نمازی کے لئے حکم ہے کہ طاقتور ہے تو اس سے جنگ کی جائے اگر طاقتور نہیں تو اسے قید کیا جائے اور توبہ کی تلقین کی جائے، اگر ترک نماز سے توبہ نہ کرے تو اسے جسمانی سزا دی جائے حتیٰ کہ توبہ کرے۔ اگر بے نمازی توبہ کرے اور اندازہ ہو جائے کہ اب وہ نماز کی محافظت کرے گا تو اسے رہا کر دیا جائے۔ نماز کے لئے کچھ شرائط ہیں جن کے بغیر نماز کی ادائیگی متحقق نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے ایک شرط حدث اصغر (جس کی وجہ سے وضو لازم آتا ہے) اور حدث اکبر (جس کی وجہ سے غسل فرض ہو جاتا ہے۔ مثلاً جنابت، حیض اور نفاس) سے جسم کا پاک ہونا ہے۔ پہلے ہم طہارت کے احکام بیان کریں گے اور اس کے بعد نماز کی دوسری شرائط کا تذکرہ ہوگا۔

وضو

حدث اصغر سے طہارت کو وضو کہتے ہیں' بغیر وضو کے نماز کی ادائیگی متحقق نہیں ہو سکتی۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَإِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ.

اور جب تم نماز کا ارادہ کرو تو دھوا پنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت اور مسح کرو اپنے سروں کا اور دھوا پنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت۔

اس آیت کریمہ میں وضو کے چار فرائض کو بیان کیا گیا ہے۔ (۱) ان میں سے پہلا فرض چہرے کا دھونا ہے۔ یعنی پیشانی کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے اور ایک کان کی لو سے لے کر دوسرے کان کی لو تک کا حصہ چہرہ ہے۔ کانوں سے لے کر داڑھی تک کا حصہ یعنی رخسار بھی چہرے میں شامل ہے اور اس کا دھونا فرض ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمۃ کا مذہب ہے۔ امام یوسف سے بھی صحیح روایت فرضیت کی منقول ہے اگر چہ ایک روایت اسے نہ دھونے کی بھی ہے۔

وضو میں داڑھی کا حکم

رہی داڑھی تو اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر داڑھی پتلی ہے' بال بہت تھوڑے ہیں اور جلد نظر آتی ہے تو جلد تک پانی پہنچانا فرض ہے مگر بالوں کو تر کرنا ضروری نہیں۔ اگر داڑھی گھنی ہے اور چہرے پر بال بہت زیادہ ہیں تو جلد تک پانی پہنچانا فرض نہیں۔ داڑھی کے ظاہری حصہ کو دھونا فرض ہے اور سامنے ہونے کی وجہ سے وجہ (چہرہ) کا اطلاق اسی پر ہوگا (کیونکہ جلد نظر نہیں آ رہی اس لئے وہ وجہ نہیں) جسے اللہ تعالیٰ نے دھونے کا حکم دیا ہے۔

فتح القدیر میں شیخ ابن الھمام فرماتے ہیں کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے الاصل میں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ پوری داڑھی کا دھونا فرض ہے اور اسے صحیح کہا گیا ہے۔ فتاویٰ ظہیریہ کے مطابق اسی پر فتویٰ ہے۔

امام ابوحنیفہ سے مذکورہ روایت کے علاوہ کئی دوسری روایات بھی منقول ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ چوتھائی داڑھی کا مسح فرض ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس حصہ کا مسح فرض ہے جو حصہ جلد کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ داڑھی کا دھونا فرض نہیں اور نہ ہی مسح ضروری ہے مگر یہ تمام روایات اصول کے مطابق نہیں ہیں۔ آخری روایت اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے داڑھی کا بالکل نہ دھونا اور جلد کا دھونا لازم آتا ہے اور ایسا ممکن نہیں کہ داڑھی کا وہ حصہ جو چہرے کے ساتھ ملا ہوا ہو نہ دھویا جائے (جب جلد دھلے گی تو داڑھی کا دھلنا یقینی ہے)۔ مسح والی روایات کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مسح میں خواہ مخواہ کی مشقت ہے حالانکہ مسح کے بارے کوئی نص (آیت یا حدیث جو خاص کسی حکم کو بیان کرتی ہو) وارد نہیں ہوئی۔

فتح القدیر اور بدائع (از ابوشجاع رحمۃ اللہ علیہ) میں مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسح والی روایات سے رجوع فرما لیا تھا۔ بحرالرائق کے مصنف نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اصحاب المتون نے ضعیف روایات کو اختیار کیا حالانکہ مفتیٰ بہ قول دھونے کا ہے جسے انہوں نے ترک کر دیا ہے۔

کہنیاں دھونے میں ائمہ کرام کے دلائل

وضو کا دوسرا فرض: دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا ہے۔ احناف کے نزدیک کہنیاں دھونے کے حکم کے تحت آتی ہیں۔ حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد بن حنبل اور حضرت امام مالک علیہم الرحمۃ کی رائے بھی یہی ہے۔ (کہ کہنیاں دھونا بھی فرض ہے)۔ جبکہ امام زفر کی رائے اس کے برعکس ہے ان کے نزدیک غایت (کہنیاں) مغیا (ہاتھ) میں شامل نہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کرتے ہوئے کہنیوں کو دھویا۔

اس حدیث کے بارے شیخ ابن الھمام فرماتے ہیں کہ اس سے کہنیاں دھونے کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی (سنن اور مندوبات بھی تو حضور ﷺ کے عمل سے ثابت ہیں) ان کا دھونا سنت بھی تو ہو سکتا ہے جیسے کلی کرنا، پورے سر کا مسح کرنا وغیرہ۔ حضور ﷺ کے عمل مبارک سے ثابت ہیں مگر یہ فرض نہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جب غایت کو مغیا سے الگ نہ کیا جا سکتا ہو تو غایت کو مغیا میں داخل سمجھا جائے گا۔ پہلی صورت میں غایت کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غایت کے بعد کا حصہ اس حکم میں شامل نہیں۔ دوسری صورت میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ خود غایت بھی حکم سے مستثنیٰ ہے۔ پہلی کو غایت اسقاط کہتے ہیں اور دوسری کو غایت مد سے موسوم کرتے ہیں۔ یہاں غایت کی پہلی قسم پائی جا رہی ہے لہٰذا اس کا دھونا فرض ہے۔ اصول الفقہ کی کتابوں میں اس پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اگر کوئی اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو شرح مسلم الثبوت دیکھیے جس میں، میں نے اس سے متعلقہ کچھ معلومات ذکر کی ہیں۔

سر کی کتنی مقدار کا مسح کرنا فرض ہے؟

وضو کا تیسرا فرض سر کا مسح ہے۔ مسح کا مطلب ہے ہاتھ کے ذریعے تری کا جسم کے کسی حصے تک پہنچانا۔ علماء فقہ میں اختلاف ہے کہ سر کی کتنی مقدار کا مسح فرض ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پورے سر کا مسح فرض ہے کیونکہ ان کے خیال میں (وامسحوا بروؤسکم) میں باء الصاق کے لئے ہے یا زائد ہے اور فعل (امسحوا) لفظ رؤس کی طرف متعدی ہے لہٰذا اس کا اطلاق پورے سر پر ہوگا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پورے سر کا مسح فرض نہیں بلکہ سر کے کچھ حصہ پر مسح کرنے سے فرض ادا ہو جائے گا۔ ان کے نزدیک بروؤسکم میں حرف باء تبعیضیہ (بعض کو بیان کرنے والا) ہے اور اس حرف کا تقاضا

ہے کہ بعض سر کا مسح فرض ہو اور پورے سر کا مسح نفل (سنت)۔ اگر کسی نے پورے سر کا مسح کر لیا تو فرض بھی ادا ہو جائے گا اور ساتھ ساتھ سنت بھی پوری ہو جائے گی۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے زیادہ پیروکار اس نظریہ کے قائل ہیں کہ قطع نظر کم یا زیادہ کے جس حصہ پر لفظ رأس کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کا مسح فرض ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ معتبر مقلدین بھی اس رائے کی پیروی کرتے ہیں لیکن ایسے میں حرف باء کو تبعیضیہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کیونکہ تبعیض منافی ہے استیعاب کے جیسے من تبعیضیہ استیعاب کے منافی ہے۔ اس لئے جب پورے سر کا مسح کریں گے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے باطل ہوگی کہ باتبعیضیہ ہے مگر پھر بھی یہ رائے زیادہ قرین صواب ہے۔ اگر باء الصاق کا فائدہ دے تو جس طرح پورے سر کے مسح سے فرض ادا ہو جائے گا' بعض سر کے مسح سے بھی ادا ہو جائے گا اگرچہ بعض سر کے تین بالوں کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔

اہل لغت کے نزدیک باء کو تبعیضیہ بنانا صحیح نہیں۔ اہل تحقیق نے اس کا انکار کیا ہے حتیٰ کہ ابن برھان تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ جو یہاں باء کو تبعیضیہ کہتا ہے' وہ عربوں کی طرف ایسی بات منسوب کرتا ہے جس سے وہ ناواقف ہیں۔

ہمارے حنفی ائمہ اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک چوتھائی سر یا ہاتھ کی تین انگلیوں کے برابر سر کا مسح فرض ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ یہ قول امام محمد علیہ الرحمہ کا ہے۔ احناف اپنی رائے کو دو طرح سے ثابت کرتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ آیت کریمہ مقدار کے حوالے سے مجمل ہے کیونکہ حرف باء جب محل پر داخل ہو تو استیعاب کا فائدہ نہیں دیتا لہٰذا یہاں پورے سر کے مسح کو فرض نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی بعض سر کو مراد بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اسے بعض سر پر محمول کرنے سے یہ لازم آئے گا کہ چہرہ دھوتے ہوئے پیشانی کے بالوں پر خود بخود مسح ہو جائے اور اسی سے فرض ادا ہو جائے اس لئے ہم کہتے ہیں کہ بعض معین سر کا مسح فرض ہے لیکن معین مقدار کہاں سے معلوم ہو اس لئے حضور نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

عن انس رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يتوضأ وعليه عمامة قطرية فادخل يده تحت العمامة فمسح مقدم رأسه. (رواہ سنن ابوداؤد)

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا۔ آپ کے سر اقدس پر دھاری دھار عمامہ تھا۔ آپ عمامہ شریف کے نیچے ہاتھ لے گئے اور سر کے اگلے حصے کا مسح فرمایا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سر کے اگلے تمام حصے کا مسح فرمایا کیونکہ فعل امسحوا لفظ رأس کی طرف متعدی ہے۔

اس سلسلہ میں عام طور پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنی پیشانی پر مسح فرمایا۔ اس حدیث سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ نے پوری پیشانی کا مسح فرمایا کہ اس سے چوتھائی سر کا مسح کرنا ثابت ہو اور آیت کریمہ کا بیان ٹھہرے کیونکہ

کوئی شخص یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جسے حضرت امام مسلم نے روایت کیا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں:

انہ توضأ فمسح بناصیتہ والخفین — حضور ﷺ نے وضو کیا تو (دورانِ وضو) اپنی پیشانی مبارک اور موزوں پر مسح فرمایا۔

اب دیکھیں حرف ''با'' ناصیہ پر آیا ہے تو تمہارے بیان کردہ اصول کے مطابق کہ آیت میں حرف ''با'' چونکہ محل رؤسکم پر آیا ہے اس لئے پورا سر مراد نہیں ہے' یہاں پر پوری پیشانی ہوسکتی۔

پھر یہ طریقِ استدلال محل نظر ہے کیونکہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ آیت مجمل ہے اور سر سے مراد بعض سر کی معین مقدار ہے کیونکہ اگر آیت میں اجمال ہوتا تو صحابہ کرام اور تابعین توقف کرتے اور اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کسی بیان کو سامنے رکھنے کی ضرورت محسوس کرتے حالانکہ نہ تو اس بارے صحابہ کرام اور تابعین علیہم الرضوان کا توقف منقول ہے اور نہ ہی انہوں نے کسی وضاحت اور بیان کی ضرورت محسوس کی۔

یہ جو کہا ہے کہ اگر بعض مطلق مراد لیا جائے تو یہ فرض چہرہ دھونے سے ادا ہو جاتا ہے۔تو اس بارے گزارش یہ ہے کہ چہرہ دھونے سے مخاطب کے نزدیک یہ فرض ادا نہیں ہوتا کیونکہ اس کے نزدیک ترتیب فرض ہے' نہ اس لئے کہ بعض متعین ہے۔اب رہا وہ جس کے نزدیک ترتیب فرض نہیں تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ چہرہ دھونے سے سر کا مسح ہو جاتا ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ اس فرض کو کسی دوسرے فرض کے ضمن میں ادا نہ کیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ اسے الگ سے ادا کیا جائے کیونکہ یہ ایک مستقل فرض ہے' کسی دوسرے فرض کی ادائیگی کے تتبع میں اس فرض کی ادائیگی نہیں ہوسکتی اور اس سے مسح میں بعض کی تعیین لازم نہیں آتی کہ ہم کہیں آیت میں اجمال ہے۔پس اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لفظ مسح بذات خود فعل متعدی ہے جو کبھی تو بلا واسطہ محل کی طرف متعدی ہوتا ہے تو استیعاب کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔مسحت الوجہ بالمندیل. (میں نے رومال سے منہ پونچھا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے چہرے کو میں نے رومال سے صاف کیا اور کبھی مسح کا فعل آلہ کی طرف متعدی ہوتا ہے۔تو ایسے میں پورے آلہ کو چھونے کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔مسحت الید بالحائط. (میں نے ہاتھ دیوار پر لگایا) یعنی پورے ہاتھ کو دیوار سے مس کیا۔اب دیکھیں آیت مبارکہ میں فعل مسح حرف ''با'' کی وساطت سے محل کی طرف متعدی ہے۔یہاں مفعول کا ہونا ضروری ہے جس کی طرف یہ فعل بلا واسطہ متعدی ہے اور وہ ہے آلہ۔سو آیت کا معنی یوں ہوگا۔امسحوا ایدیکم بالرأس. (ہاتھوں کے ساتھ سر کو مس کرو)۔اس قانون کے مطابق پورا ہاتھ مراد ہوگا اور ہاتھ چوتھائی سر کے برابر ہے۔ ہر آدمی کا سر اس کے اپنے چار ہاتھ کے برابر ہوتا ہے۔حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گزارش کی جائے گی کہ آلہ ہاتھ کی انگلیاں ہیں لہٰذا تین انگلیوں کی مقدار سر کا مسح کر لینا کافی ہے اس سے فرض ادا ہو جائے گا کیونکہ اکثر پر کل کا حکم لگایا جاتا ہے۔پس سر کا مسح تین انگلیوں کی مقدار فرض ہوگا اور ایک یا دو انگلیوں سے فرض ادا نہیں ہوگا۔جیسا کہ ہمارے حنفی دوستوں کے نزدیک صحیح

ہے۔

یہ طریق استدلال اگر چہ پہلے سے بہتر ہے لیکن اس میں بھی ایک چیز دل میں کھٹکے کا باعث بنتی ہے اور وہ یہ ہے کہ فعل مسح فعل لازم کی جگہ بھی لے سکتا ہے کیونکہ یہ اصول ہے کہ جب کسی فعل متعدی کا مفعول مذکور نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسا قرینہ ہو جو مفعول کے حذف پر دلالت کرتا ہو تو وہ فعل' لازم فعل کی جگہ آ جاتا ہے جیسا کہ اصول الفقہ میں یہ بحث عام چلتی ہے اور اس سے کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں۔ جب مسح کا فعل لازم کی جگہ لے گا تو اس کا مفعول مقدر نہیں مانیں گے۔ سو آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ العقواد اوصلوا المسح بالراس تو اس سے پورے آلہ کا مس ہونا لازم نہیں آتا' آلہ تو اقتضاءً سمجھا جا رہا ہے' یہ عام تو نہیں ہے اور صرف ایک لفظ مقرر مانا جائے گا جس کے ذریعے لفظ مسح کا اطلاق صحیح ہو۔ آلہ کے حق میں اس طرح آیت مطلق ہو جائے گا۔ واللہ اعلم۔

پاؤں کا دھونا فرض ہے

چوتھا فرض پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھونا یا موزوں پر مسح کرنا ہے۔ جس نے موزے نہیں پہنے وہ پاؤں دھوئے گا اور جس نے موزے پہنے ہوئے ہیں وہ موزوں پر مسح کرے گا اور پاؤں نہیں دھوئے گا۔ (کعب (ٹخنہ) سے مراد وہ اٹھی ہوئی ہڈی ہے جو پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ کی جگہ نمایاں ہوتی ہے۔ ٹخنے پاؤں دھونے میں شامل ہیں مگر امام زفر کے نزدیک ٹخنوں کو دھونا فرض نہیں ہے۔ اس مسئلے کو کہنیوں والے مسئلے پر قیاس کیجئے۔ جو گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔

ننگے پاؤں آدمی کا پاؤں دھونا فرض ہے۔

کیونکہ رسولِ خدا ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

ویل للاعقاب من النار.	ایسی ایڑیوں کے لئے ہلاکت ہے اور جہنم کی آگ ہے۔

آپ ﷺ نے یہ بات اس شخص کے لئے کی جس نے پاؤں اچھی طرح نہیں دھوئے تھے حتیٰ کہ دھونا مسح کرنا بن گیا تھا اور پانی ایڑیوں تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ حدیث صحیحین' سنن اور مسانید میں بہت سے مختلف طرق سے روایت کی گئی ہے اور اس کے راوی اس کثرت سے ہیں کہ یہ حدیث علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ حضرت امام سیوطی نے اس کے رواۃ کو شمار کیا تو تعداد دس سے زائد صحابہ تک پہنچی۔ انہوں نے یہ واقعہ مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے لیکن تمام کا مقصد ایک ہے۔ ان الفاظ' **ویل للاعقاب من النار**" میں تمام صحابہ متفق ہیں اس لئے یہ وعید علم قطعی کا فائدہ دیتی ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ پاؤں کا دھونا فرض ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ دلیل بھی ہے کہ:

قد توضأ رسول الله صلى الله عليه وسلم مرة مرة وغسل الرجلين مرة وقال هذا وضوء لايقبل الله الصلوة الابه.	حضور ﷺ نے وضو کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر عضو کو ایک ایک بار دھویا اور پاؤں کو بھی ایک بار دھویا' پھر فرمایا: یہ وہ وضو ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

یہ حدیث صحاح میں موجود ہے اور محدثین میں کافی شہرت رکھتی ہے' اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ پاؤں

دھوئے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔

ایک اور بات تواتر سے حضور اکرم ﷺ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ پاؤں دھوتے تھے۔ جن لوگوں سے وضو سے متعلقہ احادیثِ رسول اللہ ﷺ روایت کی ہیں ان میں ایک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات اقدس بھی ہے۔ تمام راوی متفق ہیں کہ حضور ﷺ وضو میں پاؤں دھوتے تھے اور کسی حدیث سے بھی ثابت نہیں کہ سفر وحضر یا سردی وگرمی میں آپ نے پاؤں پر مسح کیا ہو۔ حضرت امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ احادیث روایت کرنے والے بیشمار لوگ ہیں جن میں ایک حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نام سے مشہور ہیں۔ تمام ناموں کو تحریر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔

حضرت علی کے نزدیک بھی پاؤں کا دھونا فرض ہے

یہاں ہم صرف حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ذکر کرتے ہیں۔

عن الامام الحسين بن علی قال دعانی ابی علی الوضوء فقربته الی ان قال فغسل رجله اليمنی الی الكعبتين ثم اليسری واما ماروی ان امير المؤمنين عليا صلی الظهر ثم قعد للناس علی كرسيه ثم اتی بماء فمسح بوجهه ويديه ومسح برأسه ورجليه وشرب فضلة قائما ثم قال ان ناسايز عمون ان هذا يكره وانی رأيت رسول الله صلی الله عليه وسلم يصنع مثل ما صنعت.

(رواہ سنن نسائی)

حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے میرے والد گرامی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلایا اور فرمایا پانی لاؤ۔ میں پانی لے کر حاضر ہوا۔ حضرت امام حسین فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے دایاں پاؤں ٹخنوں سمیت دھویا اور پھر بایاں پاؤں دھویا۔ رہی وہ حدیث کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز ظہر ادا کی پھر لوگوں کے لئے اپنی کرسی پر بیٹھے پانی لایا گیا۔ آپ نے چہرے، ہاتھوں، سر اور پاؤں کا مسح فرمایا اور بچا ہوا پانی پی لیا پھر فرمایا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ عمل ناپسندیدہ ہے۔ حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے جس طرح میں نے کیا ہے۔

یہ اس شخص کا وضو ہے جس کا پہلے سے وضو تھا (کیونکہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھ کر یہ وضو کیا) جب یہ ثابت ہو گیا تو اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وضو میں پاؤں پر مسح کرنا مشروع ہے۔ اس حدیث کی رو سے اگر پاؤں پر مسح جائز ہے تو پھر چہرے اور ہاتھوں کا مسح بھی جائز ہے۔ حضرت علی نے وضو نہیں فرمایا بلکہ آپ نے گیلے ہاتھ چہرے، سر اور پاؤں پر اس لئے پھیرے کہ گرمی تھی اور آپ ٹھنڈک حاصل کرنا چاہتے تھے اسی لئے اسے نماز کا وضو نہیں، وضوءِ تبرید کہتے ہیں۔ یہ اس لئے کہا گیا ہے تاکہ عوام الناس کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ نماز کے لئے جو وضو کیا جاتا ہے۔ اس میں چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کا مسح کافی ہے اور اسی سے پاکی حاصل ہو جاتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو یہ کہا کہ لوگ اسے ناپسند کرتے ہیں لیکن میں نے حضور اکرم ﷺ کو ایسے کرتے دیکھا ہے تو اس سے مراد وضو نہیں کھڑے ہو کر پانی پینا ہے کیونکہ لوگ اس طرح وضو کو مکروہ نہیں باطل گمان کرتے ہیں، اگر وہ اسے

باطل نہ سمجھتے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آج تک کسی شخص نے وضو کرتے وقت ہاتھوں اور چہرے کا مسح نہیں کیا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ نے کبھی ہاتھوں اور چہرے کا وضو میں مسح فرمایا ہے۔ حضرت علی کا یہ وضو ٹھنڈک کے لئے تھا' سوا سے کوئی مکروہ نہیں سمجھتا۔

پس ہمارے بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وضو میں پاؤں دھونا فرض ہے اور قطعاً مسح کی اجازت نہیں ہے' اگر مسح جائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کے جواز کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی کبھی ضرور مسح فرماتے جیسا کہ آپ کی عادت مبارکہ تھی۔

پاؤں پر مسح کرنا کسی صحابی سے ثابت نہیں

پھر پاؤں کا مسح کسی صحابی سے منقول نہیں ہے۔ سخت سرد راتوں میں بھی کسی صحابی نے کبھی پاؤں پر مسح نہیں فرمایا۔

عن عبد الملک بن سلیمان انه قال قلت بعطاء ابلغک من احد من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم انه مسح علی القدمین فقال لا. (رواہ طحاوی)

عبدالمالک بن سلیمان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے عطاء سے پوچھا کیا کسی صحابی کے حوالے سے یہ بات آپ تک پہنچی ہے کہ انہوں نے پاؤں پر مسح کیا ہو تو انہوں نے فرمایا نہیں۔

رہی وہ حدیث جو ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ وضو دو اعضاء کا دھونا اور دو اعضاء کا مسح کرنا ہے اور پاؤں کا دھونا سنت ہے تو صحیح سند سے یہ ثابت نہیں بلکہ یہ باطل ہے کیونکہ عطاء حضرت ابن عباس کے کبار دوستوں میں سے ہیں اور انہوں نے اس بات کا انکار کیا اور کہا ہے کہ کسی صحابی کا پاؤں پر مسح کرنا ان تک نہیں پہنچا۔ اگر یہ ابن عباس کا قول ہوتا تو عطاء اس سے ناواقف نہ ہوتے۔

اس قول کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں بغیر کسی سند کے نقل فرمایا ہے۔ پس روایت کیا ان سے جس نے روایت کیا۔ امام رازی کی یہ مرسل روایت کسی کھاتے میں نہیں کیونکہ حدیث کے میدان میں وہ اس شان کے مالک نہیں کہ ان کی روایت کردہ حدیث کو بلا سند قبول کرلیا جائے۔ بالفرض اگر ان سے یہ روایت ثابت ہو بھی جائے تو اس کی نوعیت ان چند مسائل کی طرح ہوگی جن میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے جمہور سے اختلاف کیا ہے مثلاً بیع صرف میں تفاضل جائز ہے' متعہ حلال ہے وغیرہ۔

پس آپ پر واضح ہو چکا کہ وضو میں دونوں پاؤں کا دھونا فرض ہے اور اس سے قطعی طور پر معلوم ہوگیا کہ آیت کریمہ میں لفظ رجلکم مغسول کے تحت آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آیت میں ارجلکم منصوب ہے رہا واؤ کا مع کے معنی میں ہونے کا احتمال تو وہ باطل ہے کیونکہ شریعت مصطفوی میں بلاشبہ پاؤں کا دھونا ثابت ہو چکا ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نحو کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ واؤ اس وقت مع کے معنی میں ہوتی ہے جب وہ زمان یا مکان کے لحاظ سے معین ہو اور جو واؤ مفعول معہ پر داخل ہوتی ہے وہ معیت زمانی یا مکانی پر دلالت کرتی ہے جبکہ آیت کریمہ میں یہ صحیح نہیں کیونکہ مسح سر کی معیت پاؤں کے مسح کے ساتھ

کسی کے نزدیک فرض نہیں۔

اب رہا مسئلہ ارجلکم کو ایک قرأت کے مطابق مجرور پڑھنے کا تو بیشک جب اسے زیر سے ارجلکم پڑھیں گے تو تب بھی اس کا عطف ایدیکم پر ہوگا اور یہ ان اعضاء کے تحت آئے گا جن کو دھونا فرض ہے اور جر کو جوار پر محمول کیا جائے گا اور فصیح کلام عرب میں قرب کی وجہ سے جر عام ہے۔ بعض قرأتوں کے مطابق قرآن کریم میں بھی کئی جگہ محض جوار کی وجہ سے زبر دی گئی ہے جیسا کہ آیت کریمہ و اذقلنا للملائکۃ اسجدوا میں تاء پر پیش ہے۔ ابوجعفر کی قرأت میں ملائکۃ مجرور ہے اور یاد رکھیئے ابوجعفر معروف دس قراء میں سے ہیں اور ان کی یہ قرأت متواتر ہے۔ یہ آیت سورۂ بقرہ اور سورۂ بنی اسرائیل میں ہے اور دونوں جگہ اسے اس طرح پیش کے ساتھ محض جوار کی وجہ سے پڑھنا جائز ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ نحویوں نے حرکت جواریہ کے لئے اپنی کتب میں باب باندھے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ فصیح عربی زبان میں حرکت جواریہ کا کوئی وجود نہیں تو ہم کہیں گے کہ وہ عربی لغت کا ذوق نہیں رکھتا۔ ابن حاجب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عربوں کی یہ عادت ہے کہ دو فعل جن کی غرض و غایت ایک ہو جب وہ دو چیزوں کی طرف متوجہ ہوں تو ان میں سے ایک کو ذکر کیا جاتا ہے۔ دونوں میں سے ایک چیز اس مذکور فعل کی طرف منسوب ہو جاتی ہے اور دوسری چیز کا لفظاً اس پر عطف کر دیا جاتا ہے' اس کا اپنا فعل حذف ہو جاتا ہے اور اس کا مقصد اس کی طرف منسوب ہو جاتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں علقتہ بتنا وماءً (میں نے اسے چرنے کو بھوسا دیا اور پانی) یعنی پینے کو پانی دیا چونکہ دونوں کا مقصد جانور کی خبر گیری تھا اس لئے ایک فعل کو ذکر کیا دوسرے کو حذف کر دیا اور عطف کے ذریعے دوسرے مفعول کو پہلے کی طرف منسوب کر دیا۔ اسی طرح آیت کریمہ میں دھونے اور مسح کرنے سے مقصود چونکہ طہارت ہے اس لئے ارجلکم رؤسکم پر عطف کر دیا لیکن یہ عطف صرف لفظی ہے۔ مقصود پاؤں کو دھونا ہے کیونکہ دھونے اور مسح سے مقصود ایک ہی چیز یعنی حدث کا ازالہ ہے اور اس پر قرینہ وہی ہے جسے ہم نے ذکر کیا کہ شرع محمدی میں پاؤں کا دھونا ثابت ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔

امام شافعی کے نزدیک پاؤں کا دھونا ضروری ہے

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آپ نے جر والی قرأت کو مسح علی الخفین پر محمول کیا کہ جس نے موزے پہنے ہوں اس کے لئے پاؤں دھونا فرض نہیں بلکہ موزوں پر مسح کرنا فرض ہے اور نصب والی قرأت کو انہوں نے ننگے پاؤں آدمی کے پاؤں دھونے پر محمول کیا۔ یعنی اگر پاؤں پر موزے نہیں تو پاؤں کا دھونا فرض ہے۔ اس طرح دونوں قرأتوں پر بیک وقت عمل ہو جائے گا۔ یہ تاویل بہت بہتر ہے کیونکہ ننگے پاؤں والے کا پاؤں کو دھونا اور موزوں والے کا موزوں پر مسح کرنا دونوں شرع محمدی میں ثابت ہیں۔ دونوں قرأتوں کا دونوں حکموں پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔ یہ بہت ہی بلیغ بات ہے کہ بیک وقت ننگے پاؤں والے اور موزوں والے کے وضو کو بھی بیان کر دیا اور بیک وقت دونوں قرأتوں پر عمل بھی ہو گیا۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ موزوں پر' پاؤں پر مسح تو نہیں' تو یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کیونکہ ایک چیز

کپڑے میں لپٹی ہوئی ہے اور نظر نہیں آ رہی اب آپ اس چیز کو چھوتے ہیں تو یہی کہیں گے نا کہ میں نے فلاں چیز کو چھوا اگرچہ آپ کے ہاتھ اور اس چیز کے درمیان کپڑا تھا۔ مثلاً آپ کسی کے بازو کو پکڑتے ہیں اگرچہ آپ کے ہاتھ اور اس شخص کے بازو کے درمیان آستین کا کپڑا ہوگا۔ پھر بھی آپ یہی کہیں گے کہ میں نے فلاں کے بازو کو پکڑا نہ کہ اس کی آستین کہیں گے' یہ اطلاق عام ہے اور اس سے کوئی بالکل غافل شخص ہی انکار کر سکتا ہے اس لئے جُنبی اور بے وضو شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر غلاف کے قرآن کو ہاتھ لگائے' جو غلاف قرآن کریم سے الگ ہو کیونکہ اس پر قرآن کو چھونے کا اطلاق ہوگا اور قرآن کو بے وضو چھونے کی ممانعت آتی ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے: لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ. (الواقعۃ: ۷۹) بس اسے سمجھ اور جاہلوں میں سے نہ بن۔

اللہ تعالیٰ حکیم ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ پاؤں پر تو مسح کا حکم دے اور چہرے کو دھونا لازمی ٹھہرائے پاؤں محل تلوث ہیں جبکہ چہرہ میں ملوث ہونے کا صرف احتمال ہے تو جو محل تلوث ہے یعنی جس عضو پر یقینی گردوغبار نے پڑنا ہے اس کے دھونے کا مشروع ہونا اولیٰ ہے۔ پھر دھونے میں احتیاط بھی ہے کیونکہ اس سے مسح بھی ہو جاتا ہے جبکہ مسح سے دھونا متحقق نہیں ہوتا۔ پس اس کو سمجھئے اور شک میں مبتلا نہ ہو جایئے۔

موزوں پر مسح

موزوں پر مسح رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے رسولِ خدا ﷺ کے ستر صحابہ کرام علیہم الرضوان سے موزوں پر مسح کے بارے احادیث سماعت کیں۔ محدثین نے موزوں پر مسح والی احادیث کے راویوں کو شمار کیا تو ان کی تعداد اسّی سے زائد نکلی۔ صحاح' سنن اور مسانید تمام قسم کی کتب احادیث موزوں پر مسح کی احادیث سے بھری پڑی ہیں۔ اگرچہ تمام روایات منقولہ کے الفاظ آحاد ہیں اور یہ ثقہ اور عادل راویوں سے روایت کی گئی ہیں لیکن ان تمام میں قدر مشترک اور متفق چیز جو تواتر کی حد تک پہنچتی ہے' وہ موزوں پر مسح کا ثبوت ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: میں نے اس وقت تک موزوں پر مسح کے بارے بات نہ کی جب تک یہ آثار صحابہ یہ سورج کی روشنی کی طرح بالکل عیاں نہ ہو گئے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ان میں اتنی طاقت ہے کہ ان میں سے قرآن کریم کی آیات کا نسخ بھی ہو سکتا ہے۔ امام ابوالحسن کرخی بیان فرماتے ہیں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی موزوں پر مسح کا انکار کر کے کافر نہ ہو جائے کیونکہ اس بارے میں آثار حد تواتر تک پہنچے ہوئے ہیں۔ امام عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں۔ میرے نزدیک موزوں پر مسح کے بارے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسح علی الخفین بالاتفاق جائز ہے۔ ایک شخص اس بارے مجھ سے پوچھتا ہے تو مجھے شک پڑ جاتا ہے کہ کہیں یہ خواہش کا بندہ تو نہیں (ورنہ اس بارے سوال کیوں کرتا کہ اس میں یوں تو کوئی اختلاف ہی نہیں)۔

مسح علی الخفین کے راویوں کے اسمائے گرامی

مسح علی الخفین کے راوی بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عمر' حضرت ابن عباس' حضرت سعید' حضرت مغیرہ بن شعبہ' حضرت ابوموسیٰ اشعری' حضرت عمرو بن العاص' حضرت ابوایوب' حضرت ابوامامہ' حضرت سہیل بن سعد' حضرت جابر بن عبداللہ' حضرت ابومعبد' حضرت بلال' حضرت صفوان بن نمال' حضرت عبداللہ ابن الحارث' حضرت سلیمان' حضرت ثوبان' حضرت عبادہ بن صامت' حضرت یعلی بن مرہ' حضرت اسامہ بن زید' حضرت عمر بن امیہ الضمری' حضرت ابوہریرہ' حضرت بریرہ' حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ فتح القدیر میں بھی اسی طرح ہے۔ یہاں رواۃ کا ہر مقصود نہیں بلکہ عدول صحابہ کرام اور اکابرین کو بیان کیا تا کہ ان کی روایت علم قطعی کا فائدہ دے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی صحابی نے مسح علی الخفین کا انکار نہیں کیا جیسا کہ علامہ ابن عبداللہ نے فرمایا ہے اور نہ فقہاء میں سے کسی فقیہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ رہا امام مالک کا یہ کہنا کہ مقیم کے لئے جائز نہیں کہ وہ موزوں پر مسح کرے' تو ان کے اپنے شاگردوں اور پیروکاروں نے ان کے اس قول کو قبول نہیں کیا اور نہ ہی ان مالکیوں نے اس قول کو قابل عمل سمجھا۔ آپ کے زیادہ تر شاگرد سفر وحضر میں موزوں پر مسح کے جواز کے قائل ہیں۔

امام محمد مؤطا میں لکھتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مقیم کے لئے مسح کرنا جائز نہیں حالانکہ اکثر آثار جن کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے' وہ مقیم کے مسح کے بارے ہیں۔ فتح الباری میں فرمایا: امام مالک سے صحیح روایت واضح کرتی ہیں کہ موزوں پر مسح مطلقاً جائز ہے' سفر وحضر کی کوئی قید نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ قیام کی صورت میں مسح علی الخفین پر توقف وہ اپنے حق میں کرتے ہوں اور صحیح یہ ہے کہ وہ حضر میں بھی اس کے جواز کے قائل تھے۔ بہر حال موزوں پر مسح کا انکار صحیح نہیں اور کسی سے کوئی ایسی صحیح روایت نہیں ملتی بالفرض اگر امام مالک سے مقیم کے بارے صحیح روایت پہنچی ہے تو وہ سابق اجماع کے خلاف ہے اس لئے امام مالک کا قول قابل عمل نہیں ہے۔

تین انگلیوں کی مقدار سے زیادہ پھٹن پر مسح درست نہیں

خف پر مسح کے لئے شرط ہے کہ پورا پاؤں موزے میں چھپا ہوا ہو کیونکہ اگر پاؤں کا کچھ حصہ ننگا ہوگا تو اس کا دھونا فرض ہوگا اور اس طرح پورے پاؤں کا دھونا لازم ہو جائے گا کیونکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی عضو کو دھویا بھی جائے اور اس پر مسح بھی کر دیا جائے' یہ چیز مشروع نہیں ہے' ہاں اگر موزہ تھوڑا سا پھٹا ہوا ہے تو وہ مسح سے مانع نہیں ہے' مسح ہو جائے گا کیونکہ عدم مسح کے حکم میں حرج ہے۔ معمولی پھٹن پر موزہ بدلنا پڑے گا اس لئے لوگوں کو رعایت کرتے ہوئے اس کی اجازت ہے لیکن تھوڑے سے مراد یہ ہے کہ پاؤں کی چھوٹی تین انگلیاں نظر نہ آئیں۔ اگر چھوٹی تین انگلیاں نظر آئیں گی تو یہ پھٹن زیادہ ہوگی اور ایسے موزے پر مسح صحیح نہیں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ موزے کامل طہارت کے بعد پہنے گئے ہوں۔ طہارتِ تام موزہ پہننے کے لئے شرط نہیں بلکہ موزہ پہننے کے بعد حدث کے وقت طہارت کاملہ کا تحقق ضروری ہے مثلاً ایک آدمی نے پاؤں دھوئے اور موزے پہن لئے۔ اس کے بعد باقی اعضاء کو

دھویا اور پاؤں پر مسح کر دیا تو یوں اس کا موزوں پر مسح کرنا جائز ہوگا مگر امام شافعی اسے ناجائز سمجھتے ہیں' ان کے نزدیک ترتیب شرط ہے' اسی طرح مسح جائز ہوگا جب کوئی آدمی ترتیب سے وضو کرے۔ ایک پاؤں دھونے کے بعد ایک موزہ پہن لئے اور دوسرا پاؤں دھونے کے بعد دوسرا موزہ پہن لے۔ حضرت امام شافعی اسے بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک موزے پہننے سے پہلے طہارت شرط ہے۔ یہی رائے امام مالک کی ہے اور ایک روایت امام احمد بن حنبل سے بھی ایسی ہے۔

ہم احناف اور حضرت امام احمد بن حنبل کی دوسری روایت یہ ہے کہ پہننے کے بعد حدث کے وقت کامل طہارت شرط ہے اس لئے ہماری یہ رائے ہے کہ شرعی طور پر موزہ پاؤں حدث کے سرایت کرنے سے مانع ہے تو طہارت کامل اس وقت شرط ہوگی جب حدث ہوگا۔ تاکہ موزے اس کے پاؤں تک سرایت کرنے سے مانع ہوں۔ اس سے پہلے اس کے شرط ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس سے تو پاؤں پاک ہے۔

ہم سے اختلاف کرنے والے علماء کرام حضرت ابی بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ:

انه صلی الله علیه وسلم رخص للمسافر ثلثة ایام ولیا لیهن وللمقیم یوما ولیلة اذا تطهر فلبس خفیه ان یمسح علیهما.	حضور ﷺ نے مسافر کو اجازت دی کہ وہ تین دن اور تین رات تک موزوں پر مسح کرے۔ اور مقیم ایک دن اور ایک رات تک جبکہ اس نے طہارت پر خف پہنے ہوں۔

مشکوٰۃ میں ہے کہ خطابی نے اس حدیث کو صحیح الاسناد کہا۔ اگر طہارت بمعنی وضو ہوتا تو پھر یہ حدیث ان کی دلیل بن سکتی تھی لیکن یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ تطہر کا معنی دھونا ہے اور مسح کی اجازت صرف اس شخص کے لئے ہے جو پاؤں دھو چکا ہے اور پھر اس نے موزے پہنے ہیں۔ جنبی کے لئے اجازت نہیں ہے اس لئے یہ حدیث ان کے نظریے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

مسح موزوں کے ظاہر پر ہوگا کیونکہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر دین میں رائے زنی کا کچھ اعتبار ہوتا تو موزوں پر مسح اوپر کی بجائے نیچے کی طرف سے اولیٰ ہوتا' میں نے رسول خدا ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے موزوں کے ظاہر پر مسح کیا۔ اس حدیث کو ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

مسح علی الخفین کا طریقہ

مسح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی انگلیاں دائیں پاؤں کے موزے پر رکھے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں کے موزے پر رکھے اور دونوں ہاتھوں کو اس طرح پنڈلی کی طرف کھینچے کہ تری کی وجہ سے خطوط ظاہر ہو جائیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ موزوں پر مسح کرنے کا یہ مسنون طریقہ ہے کیونکہ رسول خدا ﷺ ایسا ہی مسح فرماتے تھے۔ ہاتھ کی تین انگلیوں کی قدر مسح فرض ہے۔

موزوں پر مسح کی مدت

عدت مسح مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات اور مسافر کے لئے تین دن اور تین راتیں ہے' مدت گزرنے کے بعد خف کا اتارنا اور پاؤں کا دھونا واجب ہے۔

عن شریح قال سالت علی ابن ابی طالب عن المسح علی الخفین قال جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثۃ ایام ولیا لیھا للمسا فرویو ماولیلۃ للمقیم. (رواہ مسلم)

قاضی شریح فرماتے ہیں کہ میں نے علی بن ابی طالب سے موزوں پر مسح کے بارے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسافر کو تین دن اور تین رات کے لئے اجازت دیتے اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات کے لئے۔

کالوش (موزوں کے اوپر بڑے موزے پہنے جاتے ہیں تاکہ چھوٹے موزے دھول سے بچ جائیں' انہیں عربی میں جرموق اور اردو میں کالوش کہتے ہیں)۔ پر مسح جائز ہے جبکہ یہ چمڑے کے ہوں۔ امام شافعی اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ہماری دلیل یہ حدیث مبارک ہے۔

روی بلال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج فیقضی حاجۃ فاتیہ الماء فیمسح علی عمامۃ وجر موقیہ. (رواہ سنن ابوداؤد)

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ کی خدمت میں' میں نے پانی پیش کیا تو آپ نے اپنے عمامہ اور کالوش پر مسح فرمایا۔

اس حدیث میں عمامے پر مسح اجمالاً آیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں تفصیلاً مذکور ہے اور اس اجمال کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر مبارک کے اگلے حصے پر مسح فرمایا اور ہاتھ کھینچ کر عمامہ تک لے گئے۔ صرف پگڑی پر مسح جائز نہیں ہے اور اس پر اجماع ہے۔ ہاں اگر کالوش موٹے کپڑے کے ہوں تو ان پر مسح جائز نہیں ہے' اگر کپڑا اتنا باریک ہے کہ ہاتھ کی تری موزوں تک پہنچ سکتی ہے تو پھر جائز ہے۔ حدیث حکایت حال کے لئے ہے' سو یہ عام نہیں بلکہ ان کالوش کے ساتھ خاص ہے جن پر مسح کرنا صحیح ہوتا ہے۔

جرابوں پر مسح کے جواز کی صورت

اگر جرابیں اتنی سخت ہیں کہ انہیں پہن کر سفر کیا جا سکتا ہے (جوتے کے بغیر) اور پنڈلی کے ساتھ باندھے بغیر کھڑی رہ سکتی ہوں تو ایسی جرابوں پر مسح کرنا صحیح ہے۔ جراب پاؤں کا لفافہ ہوتا ہے (آج ان کا استعمال عام ہے مگر یہ اتنی سخت نہیں کہ ان کو پہن کر سفر کیا جا سکے اس لئے ان پر مسح صحیح نہیں ہے)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک جرابوں پر مسح صرف اس صورت میں جائز ہے جب وہ چمڑے کی بنی ہوئی ہوں یا ان کے نیچے نعلین ہوں۔ صاحبین (امام محمد اور امام یوسف) فرماتے ہیں کہ جرابوں پر مسح مطلقاً جائز ہے۔ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

عن المغيرة قال توضا النبی صلی الله عليه وسلم ومسح علی الجورب بين والنعلين. (رواہ جامع ترمذی' سنن ابوداؤد)

حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وضوفرمایا اور جرابوں اور نعلین پاک پرمسح کیا۔

علماء فرماتے ہیں کہ نعلین سے مراد وہ جوتے ہیں جو جرابوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں' الگ ان کا جسم نہ ہو۔ گویا حضور ﷺ نے ایسی جرابوں پر مسح کیا جن کے تلوے جوتے کی طرح تھے۔

اس حدیث پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ امام احمد' ابن مہدی اور امام مسلم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے جیسا کہ فتح القدیر اور جامع الاصول میں ہے۔ حضرت ابوداؤد فرماتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب' ابن مسعود' براء بن عازب' انس بن مالک' ابوامامہ' سہیل بن سعد اور عمر بن الحویرث رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ یہ روایت امیر المؤمنین عمر اور ابن عباس سے بھی لی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بطور نمونہ یہ آثار صحابہ کافی ہیں۔

شرعی طور پر خف وہ ہے جو بیٹھے اور چلتے ہوئے دونوں صورتوں میں ٹخنوں سمیت پاؤں کو چھپائے رکھے اور انہیں سردی سے بچائے' نہ تو سفر کرتے ہوئے کوئی کانٹا پاؤں میں چبھے اور نہ سفر کے دوران کسی قسم کی تکلیف ہو۔ سخت جراب اگر سردی اور کانٹوں سے بچائے اور سردی کی برودت سے پاؤں کو تحفظ دے تو وہ بھی موزوں کے حکم میں ہے۔ نعلین ہونا یا جرابوں کا چمڑے سے بنا ہونا شرط نہیں ہے۔ صاحبین کا قول زیادہ قرین قیاس ہے اسی لئے انہی کے قول پر فتویٰ ہے۔

محدث کے لئے موزوں پر مسح شرعاً جائز ہے اور مسح علی الخفین وضو میں پاؤں دھونے کے قائم مقام ہے۔ جنبی کے لئے موزوں پر مسح کرنا صحیح نہیں ہے۔

قدروی صفو ان بن غسال کان رسول الله صلی الله عليه وسلم يا مرنا اذا كنا سفرا ان لاتنزع خفا فنا ثلثة ايام وليا ليهن الا من جنابة لكن عن غايط وبول ونوم. (رواہ جامع ترمذی' سنن نسائی)

صفوان بن غسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سفر میں ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ تین دن اور تین رات تک موزے نہ اُتاریں سوائے حالت جنابت کے پاخانہ' پیشاب اور نیند کے بعد ہم موزوں پر مسح کرتے۔

موزوں پر مسح پاؤں دھونے کا بدل نہیں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ یہ عمل دھونے کی خفیف ترین حالت کو ظاہر کرتا ہو جیسا کہ تیمم وضو کا بدل ہے بلکہ موزوں والے شخص پر ابتداءً ہی فرض ہے کہ وہ موزوں پر مسح کرلے۔ جو آدمی خف پر مسح کر لیتا ہے اس کے لئے پاؤں کا دھونا ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ موزہ شرعی طور پر حدث کو پاؤں تک سرایت کرنے سے روکتا ہے اور حدث (وضو کا ٹوٹنا) خف تک پہنچتا ہے' نہ کہ پاؤں تک یوں موزہ کا حکم جلد کا ہو جاتا ہے۔ تو حدث کے ازالہ کے لئے جو کچھ کیا جاتا ہے یعنی مسح کو اس کا تعلق پاؤں سے ہے ہی نہیں بلکہ موزہ سے ہے کیونکہ پاؤں تک تو حدث پہنچ ہی نہیں سکتا بلکہ موزہ تک پہنچتا ہے لہٰذا موزوں پر مسح پاؤں دھونے کا بدل نہیں۔

جس طرح تیمم وضو کا بدل ہوتا ہے' یہی رائے صحیح ہے جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اب اگر کوئی شخص جس نے پاؤں میں موزے پہنے ہوئے ہیں' پاؤں دھونے کی نیت سے پانی میں غوطہ لگا دیتا ہے تو وہ گنہگار ہوگا۔ ظہیریہ وغیرہ کتب فقہ میں کہا گیا ہے کہ پاؤں دھل جائیں گے اور مسح باطل ہو جائے گا لہٰذا مدت گزرنے پر دوبارہ پاؤں نہیں دھوئے جائیں گے بلکہ غوطے لگانے کے وقت سے مدت کا اعتبار ہوگا۔ صحیح رائے جو اصول کے مطابق ہے وہ شیخ ابن الھمام کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ روایات صحیح نہیں ہیں۔ غوطہ لگانے سے مسح باطل نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ غوطہ پاؤں کا دھونا واقع ہوگا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پاؤں کا اس طرح دھونا بدن کو اندر سے دھونے کی طرح ہے کیونکہ حدث پاؤں تک نہیں پہنچتا تو یہ دھونا لغو اور بے کار ہوگا اور مسح باطل نہیں ہوگا لہٰذا جب مدت پوری ہو جائے گی تو موزے اتارنا اور پاؤں کا دھونا واجب ہو جائے گا۔ پانی میں غوطہ لگانے کی مدت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اب تک کی پوری گفتگو وضو کے فرائض سے متعلق تھی۔

وضو میں نیت

وضو اگر قربت کی نیت سے کیا جا رہا ہو تو نیت شرط ہے کیونکہ بغیر نیت کے ثواب حاصل نہیں ہوگا' اس پر تمام علماء متفق ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ. (البینۃ:۵)

اور انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ وہ دین کو اللہ تعالیٰ کیلئے خالص کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔

ہاں اگر وضو طہارت کی نیت سے اور نماز کی چابی ہونے کے ارادے سے کیا جا رہا ہے تو اس میں نیت شرط نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نماز کے وضو کے لئے تین اعضاء کو دھونے اور ایک عضو پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے۔ سو نیت کو شرط قرار دینا آیت پر بلا دلیل زیادتی ہے۔

اگر کسی نے تین اعضاء کو دھو لیا اور سر پر مسح کر لیا اور مقصود صرف ٹھنڈک کا حصول تھا تو ہمارے نزدیک اس کا وضو ہو جائے گا' ہاں اس کو اس وضو پر ثواب نہیں ملے گا' جیسے کوئی شخص محض صفائی کی نیت سے کپڑا دھوئے' اس غرض سے نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کا حکم ہے یا کپڑوں کا پاک ہونا نماز کے لئے شرط ہے تو اسے کپڑے دھونے کا ثواب نہیں ملے گا' لیکن کپڑے پاک ہو جائیں گے۔ ائمہ ثلاثہ نے فرمایا ہے کہ وضو کے طہارت ہونے کے لئے نیت شرط ہے' نیت کے بغیر پاکیزگی نہیں ہوگی۔ ان کی دلیل بخاری شریف کی یہ مشہور حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

ائمہ ثلاثہ (شافعی' مالک' احمد) علیہم الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کی صحت کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال پر ثواب کا مدار نیتوں پر ہے۔ صحیح صحیح مفہوم وہی ہے جسے ہمارے حنفی بزرگوں نے بیان کیا ہے کیونکہ یہ ارشاد مبارک ہجرت مدینہ کے موقع کا ہے جیسا کہ اس حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے:

فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها او الى امرأة يتزوجها فهجرته الى ما هاجر اليه

کہ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف شمار ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہے کہ اسے حاصل کرے یا کسی عورت کی طرف کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اس کی طرف شمار ہوگی' جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

اس حدیث سے ہجرت کی تخصیص لازم نہیں آتی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو دوبارہ ہجرت کا حکم نہیں دیا۔ جس نے دنیا یا عورت کے لئے ہجرت کی تھی حالانکہ ہجرت فرض عین تھی۔ تو معلوم ہوا ان دونوں کی ہجرت تو صحیح ہوئی لیکن اس ہجرت پر ثواب مرتب نہ ہوا لہٰذا حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بغیر نیت کے اعمال کا ثواب نہیں ملتا۔ اگر چہ ان کا وقوع متحقق ہو جاتا ہے۔ سو یہ حدیث ان کے مطلوب پر دلالت نہیں کرتی۔ میں نے یہاں اتنا ہی ذکر کرنا تھا۔

رہا یہ مسئلہ کہ انما الاعمال بالنیات سے مراد ثواب کا مرتب ہونا ہے اور رفع عن امتی الخطا والنسیان جیسے ارشادات گناہ نہ ہونے پر دال ہیں ان کا یہ مفہوم کس قاعدہ کلیہ کے تحت لیا گیا ہے تو یہ اصول الفقہ کا موضوع ہے۔ اس موضوع پر فواتح الرحموت شرح المسلم میں ہم نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

اعضاء کو پے در پے دھونے میں ائمہ کا اختلاف

رہی ترتیب اور پے در پے اعضاء وضو کا دھونا تو ہمارے نزدیک دونوں فرض نہیں ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ترتیب فرض ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پے در پے دھونے کو فرض کہتے ہیں۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وضو کے اعضاء کو حرف عطف واؤ کے ساتھ ایک دوسرے پر عطف کیا ہے اور واؤ مطلقاً جمع کے لئے ہے۔ اس میں ترتیب ضروری نہیں ہوتی اور پے در پے دھونے کو اس لئے فرض نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ نے تین اعضاء کے دھونے اور سر کے مسح کا حکم دیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ انہیں یکے بعد دیگرے دھویا جائے یا متفرق طور پر دھویا جائے اور اس بات کو عام رکھا جائے کہ ترتیب سے دھوئے جائیں یا بغیر ترتیب کے لہٰذا ترتیب اور پے در پے دھونے کی شرط باطل ہے کیونکہ قرآن کریم کی یہ نص مطلق ہے۔

امام مالک اور امام شافعی کی کوئی خاص دلیل نہیں ہے جس کو ذکر کیا جائے۔

وضو سے قبل بسم اللہ کا پڑھنا

رہا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم شریف کا وضو سے پہلے پڑھنا تو یہ بھی ہمارے نزدیک فرض نہیں ہے کیونکہ بسم اللہ شریف کو فرض قرار دینا بلا دلیل کتاب اللہ پر زیادتی ہے۔ قرآن میں تو صرف تین اعضاء کے دھونے اور سر کے مسح کا حکم ہے اور بس اور بسم اللہ شریف کے فرض ہونے کی نسبت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کرنا غلط ہے۔ اس کی تصریح شیخ ابن الھمام نے فرمائی ہے۔ انہوں نے خود اپنی روایت کردہ حدیث سے استدلال کیا ہے۔ حدیث یہ ہے:

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لاوضوء لمن لم یذکر اسم الله.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا اس کا کوئی وضو نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے تمام طرق ضعیف ہیں۔ ہم نے فتح القدیر میں اس کے تمام طرق ذکر کر کے ان کے ضعف کو بیان کیا ہے۔

لیکن اس کا یہ بھی تو جواب ہو سکتا ہے کہ کثرت طرق کی وجہ سے یہ کمی پوری ہو جاتی ہے اور یہ حدیث ضعیف کے درجہ سے ترقی کر کے حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ تو پھر بھی اس سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ فرضیت ثابت کریں گے تو کتاب اللہ پر زیادتی لازم آئے گی' زیادہ سے زیادہ اسے واجب کہا جا سکتا ہے اور اسی لئے وہ اسے واجب سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری گزارش یہ ہے کہ طرق کی کثرت زیادہ سے زیادہ ضعیف حدیث کو حسن کا درجہ دے گی اور بس مگر اس سے فرضیت یا وجوب کا ثبوت تو لازم نہیں آتا پھر مذکورہ حدیث پاک میں کمال کی نفی ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارک ہے:

کل امر ذی بال لم یبدء بحمد الله فهو اقطع.

ہر مہتم بالشان کام جو الحمد سے شروع نہ کیا گیا ہو وہ جڑ کٹا ہے۔

وضو مبارک وہ عظیم الشان کام ہے اگر آپ اسے نفی کمال پر محمول نہیں کریں گے تو یہ حدیث پہلی حدیث کے متعارض آئے گی کیونکہ ہمارے نزدیک عام اور خاص متعارض ہیں جیسا کہ اصول کی کتابوں سے ظاہر ہے۔ اس حدیث سے بسم اللہ شریف کی فرضیت یا وجوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کے ثبوت میں گفتگو کے راستے میں یہ حدیث حائل ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس حدیث سے فرضیت یا وجوب ثابت کریں گے تو یہ حدیث اس حدیث کے معارض ہو گی جسے ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ' ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کیا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ:

قال من توضأ فذکر اسم الله کان طهور الجمیع بدنه ومن توضأ ولم یذکر اسم الله کان طهور الاعضاء وضوئه.

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے وضو کیا اور اللہ کا نام لیا تو اس کا پورا جسم پاک ہو جائے گا اور جس نے وضو کیا اور اللہ کا نام نہ لیا تو اس کے صرف وضو والے اعضاء پاک ہوں گے۔

حدیث پاک کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ کمال وضو کو بیان کرتی ہے' لہٰذا وضو سے پہلے بسم اللہ شریف پڑھنا سنت اور مستحب ہے جیسا کہ شیخ عبدالحق دہلوی نے فرمایا ہے۔

یہاں تک ہم نے ان چیزوں کو بیان کیا جو وضو میں فرض تھیں اور وہ جو فرض نہیں تھیں۔ اب ہم وضو کی سنتوں کی طرف آتے ہیں۔

وضو کی سنتیں

(۱) جب انسان بیدار ہو تو سنت ہے کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے ہاتھوں کو دھوئے۔ علماء نے بطور دلیل حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث پیش کی ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا استیقظ احدکم من المنام فلا یغمس یده فی الاناء حتی یغسلها ثلثا فانه لایدری این باتت یده.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص بیدار ہو تو تین بار دھوئے بغیر اپنے ہاتھوں کو برتن میں نہ ڈالے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ رات بھر اس کے ہاتھ کہاں رہے ہیں۔

اگر تو یہ اعتراض کرے کہ اصول میں علماء نے بیان کیا ہے کہ خبر واحد اگر عموم بلوئی کا سبب بن رہی ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور مثال میں وہ یہی حدیث پیش کرتے ہیں اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: ہاون کا آپ کیا کرتے ہیں؟ علماء فرماتے ہیں کہ اس برتن سے تو پانی لینے کی واحد یہی صورت ہے کہ اس میں ہاتھ ڈالا جائے تو اس کے جواب میں' میں یہ کہوں گا کہ خبر واحد جو عموم بلوئی کا سبب بن رہی ہو اس کو اس وقت قبول نہیں کرتے جب لوگوں کے عمل کے خلاف ہو یا اس سے زیادہ تکلیف کا اندیشہ ہو کیونکہ ایک چیز کی تمام لوگوں کو ضرورت ہے اور تمام لوگ اس پر عمل کرتے ہیں اور صرف ایک آدمی جماعت سے علیحدگی اختیار کرتا ہے تو ایک آدمی کا منفرد ہو جانا انسان کو شک میں مبتلا کر دیتا ہے کہ شاید یہ حدیث نہ ہو۔ سو مذکورہ حدیث اس قبیل کی نہیں' ہاں اگر نہی کو تحریم پر محمول کریں تو پھر عموم بلوئی ہو گا اور ہم پانی میں خشک ہاتھ ڈالنا حرام نہیں سمجھتے اور حدیث میں ممانعت کی جو علت بیان کی گئی ہے وہ بھی نہی تحریم کی نفی کرتی ہے کیونکہ احتمال ہاتھ ڈبونے کی حرمت کا موجب نہیں بن سکتا۔ اصول الفقہ کی کتابوں میں اس حدیث کو بطور مثال اس لئے پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پانی میں خشک ہاتھ ڈالنے کو حرام سمجھتے تھے۔ تو ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کی غلط فہمی کو دور کیا' سو جب نہی تنزیہ کے لئے ہو تو برتن میں ڈالنے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا سنت ہو گا' ورنہ نہیں۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ ہاتھوں کا دھونا پسندیدہ عمل ہے جو سنت کے حکم میں ہے۔

(۱) اگر ہاتھ دھونا ممکن نہ ہو مثلاً پانی کسی ایسے برتن میں ہے جس میں سے ہاتھ ڈالے بغیر پانی نہیں نکل سکتا یا پانی کا برتن بڑا ہے اور کوئی چھوٹا برتن نہیں جس کے ذریعے پانی لے کر ہاتھ دھوئے جا سکیں تو کہتے ہیں کہ بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے ذریعے پانی لیا جائے اور دایاں ہاتھ دھویا جائے پھر دایاں ہاتھ جس طرح چاہے برتن میں ڈالے اور پانی استعمال کرے' اس کے بعد پورا بایاں ہاتھ دھوئے تو یہ صرف مستحب ہے' اگر دھونے سے پہلے ہاتھ برتن میں ڈال دیئے تو پانی خراب نہیں ہو گا اگرچہ برتن چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اسی طرح سمجھنا چاہئے۔

(۲) جب وضو کرنے لگے تو طہارت کی نیت کرے۔ عوارف المعارف میں ہے کہ خشوع وخضوع کے ساتھ وضو کرے اور اللہ تعالیٰ کا نام لے۔

(۳) فقہاء میں مشہور یہ ہے کہ بسم اللہ العلی العظیم کہے۔ اگر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھے تو بھی کافی ہے۔

(۴) پھر پونچوں تک ہاتھ دھوئے' یہ بیداری کے بعد ہاتھ دھونے کے بعد ہے۔ یعنی دوبارہ ہاتھ دھوئے۔

(۵) تین بار پانی لے کر تین بار کلی کرے۔

(۶) پھر مسواک کرے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

لولا أن اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوٰۃ وبتاخیر العشاء. (رواہ صحیح بخاری وصحیح مسلم)

اگر میں اپنی امت پر گراں نہ سمجھتا تو انہیں حکم دیتا کہ وہ ہر نماز کے ساتھ مسواک کریں اور عشاء کی نماز دیر سے پڑھیں۔

(۷) پھر ناک میں تین بار پانی ڈالے اور ہر بار نیا پانی لے پھر بائیں ہاتھ سے ناک صاف کرے کیونکہ:

عن امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنه انه دعا بوضوء فمضمض واستنشق ونشر بیده الیسری وقال ھذا طھور نبی اللہ صلی اللہ علیه وسلم (رواہ سنن نسائی)

امیر المؤمنین علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے کہا گیا ہے کہ انہوں نے وضو کا پانی منگوایا۔ کلی کی، ناک میں پانی ڈالا اور بائیں ہاتھ سے ناک صاف کیا اور فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے نبی کریم ﷺ کا وضو ہے۔

دوسری حدیث مبارک اس طرح ہے:

عن سلمة بن قیس اذا توضأت فاستنثر واذا استجمرت فاوتر. (رواہ جامع الترمذی، سنن نسائی)

حضرت سلمہ بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب میں وضو کرتا ہوں تو ناک صاف کرتا ہوں اور جب دھونی دیتا ہوں تو طاق عدد کا خیال رکھتا ہوں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کلی اور ناک میں پانی ایک ہی چلو سے ڈالا جائے گا اور پھر دونوں کو ملا دیا جائے گا پھر دوسرا چلو لے کر پھر تیسرا چلو لے کر منہ اور ناک میں ایک ہی چلو سے اکٹھا پانی ڈالا جائے گا کیونکہ حدیث پاک ہے۔

عن عبد اللہ بن زید رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم مضمض واستنشق بکف واحد. (رواہ جامع الترمذی)

حضرت عبداللہ بن زید سے روایت ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسولِ خدا ﷺ ایک ہی ہاتھ سے منہ اور ناک میں پانی ڈال رہے تھے۔

ہماری دلیل ابوداؤد کی حدیث ہے۔

عن طلحة بن مطرف عن جده قال دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وھو یتوضأ والماء یسیل من وجھه ولحیة فرأیته یفصل بین المضمضة والاستنشاق.

حضرت طلحہ بن مطرف سے اور انہوں نے اپنے جد امجد سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ وضو فرما رہے تھے اور پانی آپ کے چہرے اور آپ کی داڑھی مبارک سے بہہ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ آپ منہ اور ناک میں ایک ساتھ پانی ڈال رہے ہیں۔

یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ ان کے جد امجد کا اسم گرامی عمر بن کعب ہے اور محدثین کے نزدیک ان کا صحابی ہونا ثابت ہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام بیہقی کی بھی یہی رائے ہے، بطور دلیل عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام بیہقی

کے نام کافی ہیں۔

صاحب فتح القدیر فرماتے ہیں۔ ان کی صحابیت کے بارے اتنے عظیم الشان علماء کے اعتراف کے بعد مخالفین کی بات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی' جناب شمنی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ عمل دونوں طرح ثابت ہے۔

ہمارے علماء نے فصل (منہ اور ناک میں یکے بعد دیگرے الگ الگ پانی لے کر پانی ڈالنا) کو اختیار کیا کیونکہ منہ اور ناک دو مستقل عضو ہیں' انہیں دوسرے تمام اعضاء کی طرح جمع نہیں کیا جا سکتا۔

ظہیریہ سے نقل کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اختلاف افضلیت میں ہے ورنہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک وصل بھی جائز ہے۔ اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فصل کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔ سو دونوں میں سے کسی ایک طریقہ کو اختیار کر کے سنت ادا کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(۸) پھر چہرے اور داڑھی کو تین بار دھوئے جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔

(۹) داڑھی کا خلال کرے' یہ عمل امام ابو یوسف کے نزدیک سنت ہے اور امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک مستحب ہے۔ صحیح قول امام ابو یوسف کا ہے۔

خلال کا طریقہ یہ ہے کہ پانی لے اور ٹھوڑی کے نچلے حصے کو تر کرے اور پھر انہیں تر انگلیوں کو داڑھی کے بالوں میں ڈال کر نیچے سے اوپر لے آئے اور انگلیاں اکٹھی نہ ہوں بلکہ الگ الگ ہوں۔ جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے:

عن امیر المؤمنین عثمان بن عفان ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخلل لحیتہ. (رواہ جامع الترمذی)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ریش مبارک کا خلال فرماتے تھے۔

دوسری حدیث مبارک اس طرح ہے:

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا توضأ اخذ کفا من ماء فیدخلہ تحت حنکہ ویخلل بہ لحیۃ ویقول ھکذا امر فی ربی. (رواہ سنن ابوداؤد)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو فرماتے تو ہاتھ میں پانی لیتے اور اس ہاتھ کو اپنے حلقوم کے نیچے لے جاتے اور اس سے اپنی داڑھی مبارک کا خلال کرتے اور فرماتے کہ میرے رب نے مجھے ایسے ہی حکم دیا ہے۔

میرے رب نے مجھے ایسے ہی حکم دیا ہے۔ یہ الفاظ وجوب کا تقاضہ کرتے ہیں اسی لئے امام احمد وجوب کے قائل ہیں حتیٰ کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر جان بوجھ کر خلال نہیں کرے گا تو وضو دوبارہ کرنا پڑے گا اور اگر بھول گیا تو اعادہ ضروری نہیں۔ آپ نے نسیان کو عذر قرار دیا ہے لیکن ہم احناف اس کے وجوب کے قائل نہیں اور ہم امر کو

استحباب پر محمول کرتے ہیں کیونکہ وضو ایک ایسا عمل ہے جس میں ایسی قیود سے عموم بلویٰ لازم آتا ہے۔ سو اس بارے ایسی خبر واحد قبول نہیں کی جائے گی' جو امر زائد کا موجب ہو۔ یہ چیز اکثر پر مخفی ہے بلکہ اس امر کی تاویل ہو گی اور اسے استحباب پر محمول کریں گے جیسا کہ اصول الفقہ کی کتابوں میں ہے۔

(۱۰) پھر اپنا دایاں ہاتھ تین مرتبہ دھوئے پھر اسی طرح تین مرتبہ بایاں ہاتھ دھوئے۔

(۱۱) ہاتھ کی انگلیوں میں خلال کرے جس طرح ہاتھ کی انگلیوں کا خلال سنت ہے۔ اسی طرح ہمارے نزدیک پاؤں دھوتے وقت پاؤں کی انگلیوں کا خلال بھی سنت ہے۔ یہی امام شافعی کی رائے ہے۔ امام احمد کے نزدیک پاؤں کی انگلیوں کا خلال سنت ہے اور ہاتھ کی انگلیوں کے بارے میں آپ سے دو روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ ان میں سے مشہور سنت یہی ہے اور دوسری روایت کے مطابق سنت نہیں ہے۔

عن ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذا توضات فخلل اصابع يديك ورجليك. (رواہ جامع الترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تو وضو کرنے لگے تو اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کر۔

یہاں امر کو وجوب پر محمول نہیں کیا جا سکتا' اس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(۱۲) پھر نئے سرے سے ہاتھ گیلے کر لئے جائیں گے یا ہاتھ دھونے سے جو پانی بچ گیا ہے اسے کافی سمجھتے ہوئے پورے سر کا اس طرح مسح کیا جائے گا کہ پہلے گیلے ہاتھوں کو آگے سے پیچھے لے جایا جائے گا اور پھر پورے سر کو گھیرے میں لیتے ہوئے ہاتھوں کو پیچھے سے آگے لے جایا جائے گا پھر وضو کرنے والا شہادت کی انگلی سے اپنے دونوں کانوں کا مسح کرے گا' کانوں کے مسح کے لئے الگ پانی کی ضرورت نہیں بلکہ سر کے مسح کے لئے جو پانی لیا تھا وہی کانوں کے مسح کے لئے کافی ہے اور اس طرح پانی مستعمل شمار نہیں ہو گا کیونکہ سر اور کان ایک ہی عضو ہے۔

مسح کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک ہاتھ کی تین انگلیاں لے۔ انگوٹھے اور شہادت کی انگلیوں کو الگ کر لے پھر ان انگلیوں کو ملا کر سر کے اگلے حصے پر رکھے اور ہتھیلیوں کو کھلا کرتے ہوئے ہاتھوں کو سر کے پچھلے حصے تک لے جائے پھر دونوں ہتھیلیوں کو سر کے پچھلے حصے پر رکھ کر کھینچتے ہوئے سر کے اگلے حصے تک لے آئے۔ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ دونوں کانوں کا مسح کرے۔ مسح کا یہ طریقہ محیط میں مذکور ہے اور اس تکلف کی وجہ یہ ہے کہ ہاتھوں کو پیچھے سے آگے لاتے ہوئے اور کانوں کا مسح کرتے ہوئے پانی مستعمل نہ ہو جائے' لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سر اور کان ایک عضو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سر کا مسح ایک سے زائد بار کرنا بدعت ہے

ایک مرتبہ پورے سر کا مسح سنت ہے اور تین بار پانی لے کر تین بار مسح کرنا بدعت ہے' ہاں اگر پانی ایک ہی دفع لے لیکن سر کا مسح تین بار کرے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ رائے حسن کی ہے مگر ظاہر الروایۃ کے مطابق سرے سے تین بار مسح کرنا ہی نہیں چاہئے۔

ہماری دلیل حضرت امام ابوداؤد کی وہ روایت ہے جو انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے لی ہے۔

قال رأيت عليا توضأ فغسل وجهه ثلثا وغسل ذراعيه ثلثا ومسح برأسه مرة واحدة ثم قال هكذا توضأ رسول الله صلى الله عليه وسلم.

فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وضو کرتے دیکھا' آپ نے تین بار چہرہ دھویا' تین بار بازوؤں کو دھویا۔ ایک بار سر کا مسح کیا اور پھر فرمایا: رسولِ خدا ﷺ ایسے ہی وضو فرمایا کرتے تھے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ سر کا مسح تین بار کرے اور ہر بار نیا پانی لے' ہاں بعض احادیث میں تین بار مسح کا ذکر ہے لیکن علماء حدیث نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے۔ سفر السعادۃ میں ہے۔ ''تین بار مسح کے بارے کوئی حدیث صحیح نہیں ہے''۔ اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اس بارے کوئی صحیح حدیث ہے تو پھر بھی حسن کی روایت کے مطابق ایک ہی پانی سے تین بار مسح ہوگا۔ تین بار مسح کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: ''آپ نے تین تین بار وضو کیا''۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے دھونے والے اعضاء کو تین تین بار دھویا۔ مراد مسح نہیں ہے۔

اعضائے مغسولہ پر قیاس کرتے ہوئے تین بار مسح کرنا کہ یہ بھی تو ایک رکن ہے' صحیح نہیں ہے کیونکہ تین مرتبہ دھونے کی وجہ یہ ہے کہ وضو اپنی جگہ اچھی طرح ادا ہو جائے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وضو کو مکمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب یہ تکمیل اعضائے مغسولہ میں تو تین بار دھونے سے ہوگی اور سر کے مسح میں استیعاب سے یعنی پورے سر کا مسح کرنے سے۔ تین بار پانی لے کر تین بار مسح کرنا ہوسکتا ہے کہ دھونا بن جائے مسح نہ رہے اور اس طرح کرنا بدعت قرار پائے۔

کانوں کے مسح کیلئے نئے پانی کی ضرورت نہیں

(۱۴) کانوں کا مسح ہمارے نزدیک سنت ہے۔ امام شافعی' امام احمد اور امام مالک کے نزدیک نئے سرے سے ہاتھ گیلے کئے جائیں۔ ہمارے نزدیک دوبارہ پانی لینا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل ترمذی اور ابوداؤد کی وہ حدیث ہے جسے انہوں نے ابوامامہ سے روایت کیا ہے۔

توضأ رسول الله صلى الله عليه وسلم فغسل وجهه ثلثا ويديه ثلثا ومسح برأسه وقال الاذنان من الرأس.

رسول اللہ ﷺ نے وضو کرتے ہوئے تین بار چہرہ مبارک' اور تین بار ہاتھ مبارک دھوئے اور ایک بار سر کا مسح فرمایا اور فرمایا کان سر ہی کا حصہ ہیں۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حماد علیہ الرحمہ کو اس حدیث کے مرفوع ہونے میں شک ہے اور فرماتے ہیں: میں اس بارے کچھ نہیں جانتا۔

میں پوچھتا ہوں کان سر ہی کا حصہ ہیں۔ یہ ابوامامہ کا قول ہے یا رسول اللہ ﷺ کا' اگر حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے تو پھر بھی یہ حدیث ہے کیونکہ یہ ان امور میں سے ہے جن میں رائے قائم نہیں ہوتی اور اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حاکم کی روایت کردہ حدیث ہے۔

عن حبان بن واسع ان اباہ حدثہ انہ سمع عبد اللہ بن زید یذکر انہ رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توضأ فاخذ لاذنیہ ماء خلاف الماء الذی اخذ لرأسہ.

حضرت حبان بن واسع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میرے والد گرامی نے بتایا کہ میں نے عبداللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا۔ وہ فرما رہے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے دیکھا۔ آپ نے کانوں کے لئے الگ پانی لیا' اس پانی کے علاوہ جو آپ نے سر کے لئے لیا تھا۔

اس حدیث کو امام بیہقی نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا آپ ﷺ کبھی کبھی کر لیا کرتے تھے۔ جب کبھی ہاتھوں پر پانی کی تری نہ ہوئی یا کم ہوئی تو آپ کانوں کے لئے الگ پانی لیتے اور مسح فرماتے چونکہ وہ حدیث زیادہ قوی ہے جس میں مذکور ہے کہ کان سر کا حصہ ہیں۔ اس لئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر ان احادیث کا ہم موازنہ کریں تو جو ہم نے روایت کی ہے وہ زیادہ قوی اور زیادہ شہرت رکھتی ہے۔ اس حدیث کو حضرت ابوامامہ' حضرت ابن عباس' حضرت عبداللہ بن زید' حضرت ابوموسیٰ الاشعری' حضرت ابوہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے روایت کیا ہے۔

شیخ عبدالحق ''شرح کتاب الجرجی'' کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں کہ امام احمد علیہ الرحمہ کی رائے کے مطابق بھی رسول اللہ ﷺ کے وضو کی کیفیت یہ تھی کہ اکثر آپ ایک ہی پانی کے ساتھ سر اور کانوں کا مسح فرمایا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

گردن کے مسح کے متعلق علماء کی آراء

گردن کے مسح کے بارے علماء احناف کا اختلاف ہے' بعض کے نزدیک گردن کا مسح ہے ہی نہیں اور بعض کے نزدیک مستحب ہے۔ جو مستحب کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ الٹے ہاتھ سے کیا جائے۔ گردن کے مسح کے بارے ایک حدیث بھی ہے جسے محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ سفر السعادۃ میں ہے کہ گردن کے مسح کے بارے کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

(۱۴) جب سر اور کانوں کا مسح کر چکے تو پہلے دایاں پاؤں تین بار دھوئے اور پھر تین بار بایاں پاؤں دھوئے بشرطیکہ اس نے موزے نہ پہن رکھے ہوں' پاؤں دھوتے ہوئے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرے' شروع دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے کرے اور انگوٹھے پر آ کر ختم کرے پھر دوسرے پاؤں کے انگوٹھے سے شروع کرے اور پھر چھوٹی انگلی پر ختم کرے۔ جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے۔

عن المستورد بن شداد قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدلک اصابع رجلیہ بخنصرہ وان کان متخففا یمسح علی الخفین بالکیفیۃ التی بنیت من

حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو چھوٹی انگلی کے ساتھ پاؤں کو رگڑتے ہوئے دیکھا۔ اگر پاؤں میں موزے ہوں تو پھر ان پر اس طرح مسح کرے جس طرح میں

قبل۔ (رواہ جامع الترمذی' سنن ابوداؤد) نے بیان کیا۔

اب اس میں اختلاف ہے کہ افضل پاؤں کا دھونا ہے یا موزوں پر مسح کرنا۔ ہدایہ شریف میں ہے کہ موزوں والے شخص کے لئے بھی افضل یہ ہے کہ وہ موزے اتار کر اور رخصت کے سبب کو ختم کر کے پاؤں دھوئے' اس کی اور تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی سوائے اس کے دھونا انسان کو زیادہ مشقت میں ڈالتا ہے۔ باقی علماء کی رائے یہ ہے کہ موزے نہ اتارے بلکہ ان پر مسح کرے۔ خف اتار کر پاؤں دھونے میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ سفرالسعادۃ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکلف نہیں فرماتے تھے' اگر آپ موزوں میں ہوتے تو انہیں پر مسح فرما لیتے' اگر ننگے پاؤں ہوتے تو پاؤں کو دھو لیتے۔

یہی چیز قرین صواب اور اصول کے مطابق ہے۔

(۱۵) ہر عضو کو تین بار دھونا جو ترتیب سے قرآن میں مذکور ہے' اس کے مطابق دھونا اور پے در پے دھونا سنت ہے۔

سفرِ سعادت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ترتیب کو کبھی ترک نہ فرماتے اور ہمیشہ اعضاء کو پے در پے دھوتے۔

حدیث مبارک ہے:

عن ابی حیة قال رأیت علیا توضأ فغسل کفیه حتی انقاهما ثم مضمض ثلثا واستنشق ثلثا وغسل وجهه ثلثا وذراعیه ثلثا ومسح برأسه مرة ثم غسل قدمیه الی الکعبین.

ابی حیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وضو کرتے دیکھا۔ پہلے آپ نے ہاتھوں کو دھویا اور خوب صاف کیا پھر تین بار کلی کی اور تین بار ناک میں پانی ڈالا اور تین بار چہرہ دھویا اور تین بار دونوں بازوؤں کو دھویا اور ایک بار سر کا مسح کیا' پھر دونوں پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھویا۔

اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال جاء اعرابی الی النبی صلی الله علیه وسلم لیسأله عن الوضوء فاراه ثلثا وقال هکذا الوضوء فمن زاد علی هذا فقد اساء وتعدی وظلم.

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے جد امجد سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے وضو کے بارے میں پوچھنے لگا۔ (رسول اللہ ﷺ نے اسے ہر عضو کو تین بار دھو کر) دکھایا اور فرمایا: وضو اس طرح ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس سے زائد کرے گا تو برا کرے گا اور ظلم وزیادتی کا مرتکب ہوگا۔

شاید ظلم وستم سے مراد سنت کے ساتھ ظلم وستم ہے۔

زخمی عضو پر مسح کرنے کا حکم

اگر وضو کرنے والے کا کوئی عضو ماؤف ہے اور وہ اسے دھوئے تو تکلیف ہوتی ہے یا کوئی عضو ٹوٹا ہوا ہے اور اس پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں یا پچھنے لگوائے ہیں اور اس زخم پر پٹی لگی ہے یا اسے دنبل کی شکایت ہے یا ویسے کوئی عضو

زخمی ہے اور اس پر دوائی لگی ہوئی ہے یا پٹی بندھی ہے اور پٹی کھولنے سے تکلیف ہوتی ہے تو اختیار کردہ رائے یہ ہے کہ اس عضو پر اور پھٹی یا پٹی پر مسح کرے۔ یہ مسح دھونے کے حکم میں ہوگا اور اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہوگا۔ جب وہ صحت یاب ہوگا تو اس وقت یہ مسح ٹوٹے گا کیونکہ یہ تکلیف موزے اتارنے کی تکلیف سے زیادہ ہے۔ اس لئے اس صورت میں مسح کی اجازت بدرجہ اولیٰ ہوگی جیسا کہ ہدایہ شریف میں ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ منذری کے بقول ایک صحیح حدیث جو یہ ہے کہ:

عن ابن عمر موقوفا المسح علی العصابة.

حضرت عمر سے موقوفا روایت ہے کہ پٹی پر مسح ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ انہوں نے وضو کیا' ان کی ہتھیلی پر پٹی بندھی ہوئی تھی' انہوں نے پٹی پر مسح کیا اور باقی ہاتھ کو دھویا اور اس بارے گفتگو بھی کی۔

حافظ ابوبکر احمد بن حسین فرماتے ہیں کہ یہ روایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے صحیح ہے۔ جب یہ ابن عمر سے صحیح ہے تو بطور اسوہ کافی ہے۔

فتح القدیر میں اس بارے میں موقوف حدیث مرفوع حدیث کی طرح ہے کیونکہ کسی چیز کی تبدیلی میں رائے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوسکتا۔ اگر تو یہ کہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قیاس ہے اور ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اسے مسح علی الخف پر قیاس کیا ہو' اس احتمال کے ہوتے ہوئے یہ مرفوع کے حکم میں نہیں ہوسکتی تو اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ابن عمر نے اس قیاس کو مفید پایا گویا دلالت نص کو قوی کرتی ہے۔ سو پھر بھی قابل عمل ہے۔ پھر دار قطنی نے اس حدیث کو بیان کیا ہے:

عن ابن عمر مرفوعا انه صلی الله علیه وسلم مسح علی الجبائر.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پٹیوں پر مسح فرمایا۔

عن زید بن علی عن ابیه عن جده الحسین بن علی عن علی بن ابی طالب قال انکسرت احدی زندی فسألت رسول الله صلی الله علیه وسلم فامرنی ان امسح علی الجبائر. (رواہ سنن ابن ماجہ)

امام حسین بن علی سے روایت ہے کہ میرے ہاتھ کا گٹا ٹوٹ گیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے مجھے پٹیوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔

فتح القدیر میں ہے کہ ان دونوں حدیثوں کی سند ضعیف ہے۔

پہلی روایت میں ابوعمارہ محمد بن احمد بن مہدی ہیں' وہ ضعیف ہیں اور دوسری میں عمرو بن واسطی ہیں' جو منکر ہیں۔ امام نووی علیہ الرحمہ سے منقول ہے کہ دوسری حدیث کے ضعیف ہونے پر تمام علماء حدیث متفق ہیں لیکن حضرت ابن عمر کا قول پہلی حدیث کو قوی بنا دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

پھٹی یا پٹی پر مسح فرض جس طرح موزوں پر فرض ہے کیونکہ یہ دھونے کے قائم مقام ہے لہٰذا اس پر ضرور عمل ہو

گا اور اسے ترک کرنے سے وضو نہیں ہو گا۔ صاحبین کا یہی قول ہے۔

امام ابوحنیفہ سے روایت ہے کہ پھٹی یا پٹی پر مسح واجب ہے' اگر مسح نہ ہو سکا تو وضو بالکل نہیں ہو گا لیکن چھوڑنے والا گنہگار ٹھہرے گا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ صاحبین کے نزدیک یہ مسح واجب ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک مستحب ہے کیونکہ عذر کی وجہ سے دھونا ساقط ہو جاتا ہے' فرض نہیں رہتا لہٰذا اس کی جگہ کوئی دوسرا عمل صرف اسی صورت میں لے سکتا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی نص ہو۔ فتح القدیر میں ہے کہ ہدایہ شریف میں اس کی جو علت بیان کی گئی ہے وہ اس کے فرض ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

وضو کو توڑنے والی چیزیں

(۱) سبیلین سے کسی چیز کا نکلنا

جو چیز سبیلین (پاخانہ اور پیشاب والی جگہیں) سے نکلے۔ مثلاً پیشاب' پاخانہ' مذی' ودی' پیلا پانی' خون' کیڑہ' ہوا جو عام طور پر پیچھے سے خارج ہوتی ہے یا اس کی نوعیت کوئی اور ہو۔ آلۂ تناسل سے نکلنے والی ہوا اس میں شامل نہیں ہے۔ مذکورہ تمام چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی دلیل ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد ہے۔

الوضوء مما خرج. (رواہ البیہقی) (سبیلین سے) جو چیز نکلے تو وضو کرنا پڑتا ہے۔

کبھی یہی حدیث رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً بھی روایت کی جاتی ہے۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔ اگرچہ حدیث کے یہ الفاظ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر موقوف ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے' جو دوسری بہت ساری احادیث سے ثابت ہے اور اس موضوع پر دلالت کرتی ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ رب قدوس کا ارشاد گرامی ہے:

اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ. (النساء:۴۳) یا کوئی تم میں سے آئے قضائے حاجت سے۔

قضائے حاجت سے آنا عام ہے کہ وہ معتاد ہو یا غیر معتاد' اس بشری ضرورت کا تعلق آگے سے ہو یا پیچھے سے۔ جب ایک انسان قضائے حاجت کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کے جسم سے پاخانہ' پیشاب' کیڑا' زرد پانی یا بلغم وغیرہ کا اخراج ہوتا ہے یا دبر سے صرف ہوا خارج ہوتی ہے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے بارے نص موجود ہے۔

ہوا خارج ہونا

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا وجد احدکم فی بطنہ شیئا فاشکل علیہ اخرج منہ شئی ام لافلا یخرجن من المسجد حد سمع صوتا اویجد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص پیٹ میں گرانی محسوس کرے اور اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ کوئی چیز نکلی ہے یا نہیں تو وہ مسجد سے باہر ہرگز نہ

ریحا. (رواہ صحیح مسلم) آئے حتیٰ کہ اس کی آواز سن لے یا بدبو محسوس کرے۔

مطلب یہ ہے کہ ہوا نکلنے کا جب تک یقین نہیں ہو جاتا وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ پیچھے سے ہوا کا نکلنا وضو کو توڑ دیتا ہے اور یہ بھی یقین ہوا کہ شک سے یقین زائل نہیں ہوتا۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جس کے تحت اصول فقہ میں کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ لاوضوء الا من صوت اوریح. (رواہ ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وضو ضروری نہیں مگر صرف اسی صورت میں کہ آواز پیدا ہو یا بدبو محسوس ہو۔

عام حالات کا بھی استثناء نہیں ہے ورنہ بول و براز نواقض وضو میں سے نہیں ہوں گے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ پیٹ کا بھاری پن ناقض وضو نہیں۔ وضو صرف اسی صورت میں ٹوٹے گا جب ہوا خارج ہو گی جیسا کہ ہم احناف کا مذہب ہے۔

امام احمد کا مسلک

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہم سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک پیٹ کی گڑگڑ مطلقاً وضو کو توڑ دیتی ہے۔ حدیث مبارک ہے:

عن علی بن طلق قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نسا احدکم فلیتوضا ولا تاتوا النساء فی اعجازھن.

(رواہ جامع الترمذی، سنن نسائی)

علی بن طلق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو اور آواز پیدا نہ ہو تو وہ وضو کرے اور عورتوں کے ساتھ لواطت نہ کرو۔

اس گفتگو سے ثابت ہوا کہ پیچھے سے جو چیز نکلے۔ معتاد یا غیر معتاد ہو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے صحاح ستہ کی احادیث میں یہ بات بھی آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پیشاب کیا اور اس کے بعد وضو فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیشاب سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پیشاب کو عربی میں بول کہتے ہیں اور اس سے مراد وہ پانی ہے جو آگے سے نکلتا ہے اور اس کا رنگ عام پانی جیسا ہوتا ہے۔ ہاں کبھی اس کا رنگ سرخ بھی ہوتا ہے، ایسی صورت میں آدمی عموماً گردے کا مریض ہوتا ہے۔ بہرحال ہوتا یہ بھی پیشاب ہی ہے۔

مستحاضہ عورت کا وضو

مستحاضہ عورت کو بھی وضو کا حکم دیا گیا ہے حالانکہ اس کی اندام نہانی سے نکلنے والا خون ایک رگ پھٹنے کا نتیجہ ہوتا ہے گویا وہ ایک زخم کا خون ہے، تو اس سے ظاہر ہوا کہ زخم کا خون جو پیشاب کے راستے نکلے وضو کو توڑ دیتا ہے۔ عورت کی شرم گاہ مرد کے آلۂ تناسل کے حکم میں ہے۔ اس راستے سے آنے والا خون خواہ مثانے سے آ رہا ہو، بچہ دانی سے آ رہا ہو، آلۂ تناسل کے سوراخ میں کوئی زخم ہو اور اس سے خون آ رہا ہو یا فرج سے آ رہا ہو، وضو ٹوٹ جاتا

ہے۔

جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے:

عن امیر المؤمنین علی قال سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن المذی فقال من المذی الوضوء ومن المنی الغسل. (رواہ ترمذی)

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ سے مذی کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا: مذی نکلنے پر وضو کرنا ہوگا اور منی نکلنے پر غسل (واجب) ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مذی سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ودی کا بھی یہی حکم ہے۔

ان نصوص سے ثابت ہوا کہ مرد یا عورت کی شرمگاہ سے جو چیز نکلے وضو توڑ دیتی ہے سوائے کیڑے اور ہوا کے۔ سو یہ کلیہ اور قاعدہ ٹھہرا کہ دونوں راستوں سے جو چیز نکلے' وضو ٹوٹ جاتا ہے سوائے مرد کے آلۂ تناسل سے جو ہوا نکلتی ہے یا اس سے جو کیڑا نکلتا ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے اس حدیث کی ضرورت ہے جسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور ضعیف کہا ہے لہٰذا آلۂ تناسل سے نکلنے والی ہوا اور کیڑا وضو کو نہیں توڑیں گے کیونکہ وہ نجاست والی جگہ سے نہیں نکلے۔ واللہ اعلم۔

خون نکلنا

خون اور زرد پانی نکلنے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ وہ جسم کے کسی حصے سے نکل کر اس جگہ پر بہہ جائیں' جس کا دھونا ضروری ہے اور وہ پاکیزگی کے حکم میں آتا ہے اور اگر صرف ظاہر ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

امام زفر فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں وضو ٹوٹ جائے گا۔ وہ پانی جو زخم سے بہے اس کے بارے دو مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ وضو ٹوٹ جائے گا اور دوسری رائے یہ ہے کہ وضو نہیں ٹوٹے گا۔ بحرالرائق میں ہے کہ دوسری روایت مجاہدین کے لئے آسانی کا باعث بن سکتی ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ معمولی سی خراش آئی اور اس سے خون یا رکیک سا پانی ظاہر ہوا اگر بہے گا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ انہوں نے پہلی روایت کو اختیار کیا ہے۔

قے آنا

اگر قے آئے اور اس قدر زیادہ ہو کہ منہ بھر جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا' اگر منہ نہ بھرے یعنی تھوڑی ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ تھوڑی ہو یا زیادہ دونوں صورتوں میں وضو ٹوٹ جائے گا۔

قے کسی قسم کی ہو کھانے کی ہو' پتے کی ہو' جمے ہوئے خون کی ہو یا عام خون کی ہو جو تھوک پر غالب ہو' وضو کے لئے ناقض ہے ہاں بلغم کی قے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ امام ابوحنیفہ اور امام محمد دونوں کی یہی رائے ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بلغم کی قے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ بلغم لیسدار ہوتی ہے' اس میں نجاست داخل

نہیں ہوتی اس لئے اس کے نکلنے سے نجاست کا نکلنا متحقق نہیں ہوتا لہٰذا وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اگر بلغم کے ساتھ خون ظاہر ہو تو تھوڑی سی نجاست جو دونوں راستوں کے علاوہ نکلے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اس میں تامّل ہے جو انشاء اللہ عنقریب واضح ہو جائے گا۔

بعض مشائخ کی رائے یہ ہے کہ کسی شخص نے کھانا کھایا اور اس کے فوراً بعد قے ہو گئی تو وضو نہیں ٹوٹے گا کیونکہ کھانے میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کھانا نجاست میں تبدیل نہیں ہوا اس کے علاوہ وہ نجاست کے قریب بھی نہیں رہا کیونکہ معدہ کا اوپر والا حصہ نجاست کا محل نہیں۔

بعض مشائخ نے خون' زرد پانی اور رکیک پانی جو زخم سے خود بخود نکلیں اور جو نچوڑ کے نکالے جائیں ان میں فرق کیا ہے' ان کا خیال ہے جو خود بخود نکلے اس سے وضو ٹوٹ جائے گا' جو نچوڑ کے نکالا جائے اس سے نہیں ٹوٹے گا۔ ہدایہ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور یہ بڑی حیران کن چیز ہے کیونکہ قائم کردہ دلائل میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا۔ صحیح وہی ہے جس کی طرف دوسرے مشائخ گئے ہیں یعنی دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ امام شمس الائمہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

یہ ساری بحث تو مذہب حنفی کے تحت تھی اب آیئے ذرا باقی تینوں اماموں کی طرف ان کے نزدیک دونوں راستوں کے علاوہ کہیں سے بھی کوئی چیز نکلے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ہاں امام احمد یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ بول و براز اگر ان دو راستوں کے علاوہ کسی اور راستہ سے نکلے تو بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اپنی رائے کو دو طریقوں سے ثابت کرتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

عن عمرو بن عبدالعزیز عن تمیم الداری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الوضوء من کل دم سائل. (رواہ دار قطنی)

عمرو بن عبدالعزیز سے اور وہ تمیم داری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر بہنے والے خون سے وضو لازم ہو جاتا ہے۔

دار قطنی فرماتے ہیں کہ عمرو بن عبدالعزیز علیہ الرحمہ کی تمیم داری سے سماعت ثابت نہیں۔

مشکوٰۃ میں ایسا ہی ہے' یہ کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ہمارے نزدیک مرسل مطلقاً مقبول ہے۔ امام شافعی کے نزدیک جب ضعیف حدیث کی تائید کسی ایسے راوی کی حدیث سے ہوتی ہو جس کی روایت کو قوی شمار کیا جاتا ہو' اگرچہ وہ اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہو پھر بھی اس سے استدلال جائز ہوتا ہے اور یہ حدیث تو مسند ہی بیان کی گئی ہے۔

دار قطنی یزید بن خالد اور یزید بن صمد کی روایت کے بارے فرماتے ہیں کہ وہ دونوں مجہول ہیں۔ ان کی اس بات کا جواب شیخ عبدالحق محدث دہلوی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یزید بن خالد اور یزید بن محمد کی روایت کے بارے میں اختلاف ہے۔ علماء نے اس کی توثیق کی ہے۔ اب سند میں کوئی کلام نہیں رہا۔ فتح القدیر میں ہے کہ اس کو ابن عدی نے کامل میں زید بن ثابت سے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہم اسے صرف احمد بن فروح کے حوالے سے جانتے ہیں اور احمد بن فروح ایسے لوگوں میں سے ہیں جن کی حدیث حجت نہیں بن سکتی لیکن وہ لکھی جاتی ہے اور لوگ ان کے ضعیف ہونے کے باوجود سمجھتے ہیں کہ ان کی بیان کردہ روایت حدیث ہے۔ فتح القدیر میں بھی یہی ہے

لیکن ابن حاتم نے کتاب العلل میں فرمایا ہے کہ ہم نے ان سے حدیث نقل کی ہے اور ہمارے نزدیک وہ سچے ہیں۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا۔ تو اب کوئی وجہ نہیں کہ یہ حدیث دلیل بن سکتی ہے۔

عن ابن عیاش عن ابن جریج عن ابن ابی ملیکة عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة رضی الله تعالی عنها قال النبی علیه الصلوة والسلام من اصابه قئ او رعاف اوقلس اومذی فلینصرف ولیتوضائم لیبن علی صلوته مالم یتکلم.

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو قے آ جائے' نکسیر پھوٹے' قے نمار طوبت منہ کی طرف سے آئے یا مذی نکلے' اسے واپس آنا چاہئے اور وضو کرنا چاہئے۔ جب تک کلام نہیں کیا۔ اسی نماز پر بقیہ نماز کی بناء کرنی چاہئے۔

(رواہ سنن ابن ماجہ)

یہ صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ آدمی نے گفتگو نہ کی ہو۔

فتح القدیر میں ہے کہ ابن عیاش میں کلام ہے۔ بہرحال شامیوں سے حدیث روایت کرے تو اسے دلیل بنایا جاسکتا ہے لیکن حجازیوں سے نہیں۔

یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر ابن عیاش ثقہ ہے تو پھر اس کی بیان کردہ حدیث کو مطلقاً روایت کیا جائے' تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر بیہقی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے دارقطنی کے حوالے سے ابن جریج سے' انہوں نے اپنے والد گرامی سے مرسلاً روایت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ صحیح ہے۔

جو کچھ ہم نے آپ سے کہا' اس سے ظاہر ہوا کہ یہ حدیث جو مرسلاً روایت ہوئی ہے کیونکہ اس قدر عظیم الشان علماء نے اعتراف کیا ہے' یہ دلیل ہماری ہے کیونکہ مرسل خاص کر جب کوئی دوسری مسند حدیث اس کی تقویت کا باعث بن رہی ہو تو وہ ہمارے لئے حجت ہوتی ہے۔ امام ترمذی اور امام ابوداؤد حسین معلم سے اس کی مسند سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی سند جو معدان بن ابی طلحہ کے حوالے سے ہے۔

عن ابی الدرداء ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قاء وکان صائما فتوضا فلقیت ثوبان فی مسجد دمشق فسألته فقال صدق وانا صببت له وضوء.

ابی درداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روزے کی حالت میں قے کی اور پھر آپ نے وضو کیا۔ میں ثوبان سے دمشق کی مسجد میں ملا اور میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: انہوں نے سچ کہا ہے' میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو وضو کروایا۔

شافعی مذہب کے ماننے والے علماء کہتے ہیں کہ اس حدیث کو دو طرف سے روایت کیا گیا ہے' یہ حدیث مضطرب ہے۔ شیخ ابن الھمام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اثرم کہتے ہیں کہ میں نے احمد سے کہا: لوگوں نے اس حدیث کو مضطرب گردانا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ حسین المعلم نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے یعنی اس کی اس سند میں کوئی اضطراب نہیں ہے' اگر دوسری سند مضطرب ہو تو

اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

ان احادیث مبارکہ سے ثابت ہوا کہ دونوں راستوں کے علاوہ جسم کے کسی حصے سے اگر نجاست نکلے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی ہمارا مقصود ہے۔

شافعیوں کا اعتراض

شوافع اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اخبار احاد ہیں جن میں عموم بلوئی ہے اور آپ ایسی صورت میں اخبار احاد قبول نہیں کرتے۔

تو ہم اس اعتراض کے جواب میں کہیں گے کہ ان عوارض کی وجہ سے عموم بلوئی نہیں ہوتا کیونکہ ایسے عوارض تو بیماری کا نتیجہ ہوتے ہیں اور بیماری میں انسان بہت ہی کم مبتلا ہوتا ہے۔ اس میں غور وفکر کیجئے اس میں غور وفکر کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ان مذکورہ چیزوں کا ایک ایک کر کے انفرادی طور پر نکلنا اگرچہ نادر ہے لیکن خون یا اس قسم کی چیز کا نکلنا نادر نہیں بلکہ انسان بہت کم اس سے بچ سکتا ہے اور یہ بات مسلمہ ہے کہ یہ تمام عوارض کسی مرض کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر ہر ایک انسان بیماری میں مبتلا ہو جائے جو خون' زرد رنگ کے پانی یا بہت زیادہ قے کا موجب بنے تو یہ چیز عموم بلوئی کا سبب ہے۔

شوافع وغیرہ بخاری ومسلم کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لايقبل صلوة من احدث حتى يتوضا. فقال رجل من حضرت موت مالحدث يا ابوهريرة فقال فساء اوضراط.

حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: محدث جب تک وضو نہ کرے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ حضرموت کے ایک آدمی نے پوچھا: اے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدث کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: بے آواز ہوا کا نکلنا یا جسم سے ہوا نکلتے وقت آواز کا پیدا ہونا۔

یہ حدیث یہاں دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ حدث وہ ہے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفسیر کو لیں گے تو صحابی کا عام کو خاص بنانا ان کے نزدیک حجت نہیں ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بے آواز ہوا نکلنے کو بطور مثال بیان فرمایا ہے حالانکہ یہ حکم (وضو کا ٹوٹ جانا) بول وبراز اور مذی کو بالاتفاق شامل ہے لہٰذا یہ اس مسئلہ میں بالکل حجت نہیں۔ شوافع حاکم اور بخاری علیہما الرحمہ کی معلق حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

عن جابر ان النبى صلى الله عليه وسلم كان فى غزوة الرقاع فرمى رجل لسهم فرقى الدم فركع وسجد ومضى فى صلوة.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ غزوۂ ذات الرقاع میں تھے۔ ایک آدمی تیر سے زخمی ہو گیا' خون پھوٹ نکلا اور اس نے رکوع کیا' سجدہ کیا اور اپنی نماز پوری کی۔

ابوداؤد نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس وقت حجت ہوتی جب رسول اللہ ﷺ کو اس آدمی کی نماز کی اطلاع ملتی اور اس پر آپ کی تقریر (صحیح قرار دینا) ثابت ہوتی حالانکہ آپ کی تقریر ثابت نہیں۔

خطابی کہتے ہیں نہ جانے اس حدیث سے یہ لوگ کیسے استدلال کرتے ہیں حالانکہ خون جب بہتا ہے تو بدن پر لگ جاتا ہے اور بدن پر خون ہوتے ہوئے نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ وہ صحابی نماز پڑھ رہے تھے' تیر لگا مگر انہوں نے نماز ترک نہیں کی' پڑھتے رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ذوق کی وجہ سے وہ سرمست سے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے نماز کو چھوڑنا پسند نہ کیا' انہوں نے جو کچھ کیا وہ غیر اختیاری تھا' وہ مقام مشاہدہ پر فائز تھے اور اللہ تعالیٰ کی یاد نے انہیں سب کچھ بھلا دیا تھا۔ اس پر حضرت ابوداؤد کی وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جب ان سے سبحان اللہ کہا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ جب پہلی بار تیر مارا گیا تو میں ایک سورت کی تلاوت کر رہا تھا' سو میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کو چھوڑ دوں۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے خاص بندوں کے احوال سے واقف ہے۔

دوسرا طریقہ قیاس کا ہے اور اس میں مشہور بحث یہ ہے جو نجاست دونوں راستوں سے نکلتی ہے وہ طہارت کو زائل کرنے میں مؤثر ہے سو اس کی تاثیر عین اس حکم میں ثابت ہے جب وہ سبیلین سے نکلے اور جنس حکم میں بھی یہ مؤثر ہے کیونکہ جب جسم پر نجاست لگے تو اس کو پاک کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پس جب نجاست کا خروج پایا گیا تو طہارت نہ رہی اور حدث متحقق ہوا اور حدث کے متحقق ہونے کی وجہ سے لامحالہ وضو لازم ٹھہرا۔ سو اس طرح شوافع کا کہنا صحیح نہ رہا کہ وضو سے پورا بدن پاک ہوتا ہے اور دونوں راستوں سے جو چیز نکلے وہ اعضائے مغسولہ (چہرہ' ہاتھ' کہنیوں اور پاؤں) کے دھونے کا سبب بنتی ہے۔ یہ قیاس کے مخالف ہے کیونکہ نجاست کسی اور جگہ سے نکلتی ہے اور دھویا کسی اور جگہ کو جاتا ہے۔ سو اس قضیہ کو عقل نہیں سمجھتی کہ ہم ان اعضاء کو دھونا ضروری نہ سمجھیں جن پر نجاست لگی ہو اور ان اعضاء کا دھونا ضروری خیال کریں جن پر کسی قسم کی نجاست نہیں۔

بہنے والے اور نہ بہنے والے خون کے درمیان فرق

حالانکہ پیشاب اور ہوا کی نسبت خون جس سے جسم گندا ہو جاتا ہے' پاکیزگی زیادہ زائل ہونی چاہئے اس لئے ہم خون پیپ وغیرہ کو بھی ناقض سمجھتے ہیں۔ ہاں مخصوص اعضاء کو دھونے کا وجوب تو نص کی وجہ سے ہے' قیاس کی وجہ سے نہیں ہے۔ پھر بہنے والے اور نہ بہنے والے خون میں فرق کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ بہنے والے خون میں خروج ہے اور نہ بہنے والا صرف ظاہر ہوتا ہے مثلاً جسم پر خراش آئی اور نیچے سے خون ظاہر ہو گیا' یہ خون بہا نہیں صرف ظاہر ہوا ہے لہٰذا جو نجاست دونوں راستوں سے نکلتی ہے وہ ظاہر نہیں ہوتی بلکہ نکلنے سے اس کا پتہ چلتا ہے لہٰذا تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم نے اصل کے حکم کو مکمل مانا نہیں۔ اصل میں تو بہنے والا اور نہ بہنے والا وضو توڑنے میں برابر ہیں لیکن فرع میں برابر نہیں۔ اسی پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دنبل سے جو زرد پانی نکلتا ہے اور زخم کے منہ پر ٹھہر جاتا ہے اسی سے تمہارے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا پھر اگر کوئی کپڑے کا ٹکڑا لے کر اس کو پونچھ لیا جائے اس طرح کہ جسم کے بقیہ

حصے پر نہ لگے تو اس کا نکلنا متحقق ہو جاتا ہے حالانکہ تم اسے ناقض وضو نہیں سمجھتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ ظاہر ہوا تو ناقض وضو نہیں تھا لہٰذا جب الگ ہوگا تو بھی ناقض شمار نہیں ہوگا اور اصل میں یہ کہ جب وہ ظاہر ہوا تو چونکہ وہ خروج کو لازم تھا۔ اس لئے وہ ناقض ٹھہرا اور جب اس کو الگ کیا گیا تو بھی اس کے حکم میں تبدیلی نہ آئی بلکہ وہ ناقض وضو رہا یہ تھی وہ مشہور تقریر جو قیاس کے ضمن میں یہاں علماء کرتے ہیں۔

اور قیاس میں اہم ترین چیز نبی کریم ﷺ کو مستحاضہ عورت کو وضو کا حکم دینا ہے۔ آپ نے اس کی یہ علت بیان کی کہ وہ خون ہے جو رگ سے پھوٹتا ہے۔

عن عروة عن فاطمة بنت جيش انها كانت تستحاض فقال لها النبي صلى الله عليه وسلم اذا كان دم الحيض فانه دم اسود تعرف فاذا كان ذلك فامسكي عن الصلوة واذا كان الاخر فتوضى فانما هو دم عرق. (رواہ سنن ابوداؤد، سنن نسائی)

عروہ سے اور وہ فاطمہ بنت جیش سے روایت کرتے ہیں کہ انہیں استحاضہ کا خون آتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا جب حیض کا خون آتا ہے تو وہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور پہچانا جاتا ہے۔ جب حیض کا خون آرہا ہو تو نماز سے احتراز کیجئے اور جب دوسرا خون ہو تو وضو کیجئے کیونکہ وہ رگ کا خون ہوتا ہے۔

صحیحین میں بھی ایسے ہی روایت ہے۔ رگ سے خون کا نکلنا علت منصوصہ ہے۔ مستحاضہ کی طہارت کے زائل ہونے میں جب علت منصوصہ پائی جائے گی تو حکم پایا جائے گا۔

زخم سے بہنے والا خون یا پیپ

زخم یا فصد سے نکلنے والا خون بھی رگ کا خون ہوتا ہے، تو وہ بھی طہارت کو زائل کرتا ہے۔ بہنے والے خون کا یہ حکم نہیں۔ زرد رنگ کا پانی اور پیپ بھی خون ہے جس کی رنگت تبدیل ہوگئی ہے لہٰذا ان کا حکم بھی خون ہی ہوگا، ان کے بہہ جانے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ اب بہنے اور نہ بہنے والے خون کا فرق ظاہر ہوگیا اب آپ کو اشکال ہی نہ رہا کہ جواب دیا جائے پھر جب ہم نے علت کے بارے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ خاص خون کا بہنا علت ہے اب زوال طہارت میں ایک ہی چیز مؤثر ہے اور وہ نکلنے والی چیز کا نجس ہونا لہٰذا جسم سے ہر نکلنے والی نجاست پر یہ حکم لگانا لازم ہے، اس وجہ سے یہ حکم قے پر بھی لگ گیا۔

زیادہ قے سے وضو ٹوٹنے کی وجہ

اب رہا تھوڑی اور زیادہ قے تو ہم کہتے ہیں کہ زیادہ قے جوف معدہ سے آتی ہے جو محل نجاست ہے اسی لئے زیادہ قے آنے سے نجاست کا خروج لازم ہو جاتا ہے اور تھوڑی قے معدہ کے منہ سے آتی جو نجاست کی جگہ نہیں اس لئے نجاست کا خروج لازم نہیں آتا اس طرح بلغم کی قے اگرچہ منہ بھر کر آئے، طرفین کے نزدیک ناقض وضو نہیں کیونکہ بلغم نجاست نہیں اور اس میں نجاست داخل بھی نہیں ہوتی کیونکہ بلغم لیسدار ہوتی ہے اب رہی ہدایہ کی یہ عبارت کہ تھوڑی نجاست جو سبیلین کے علاوہ جسم کے کسی اور حصے سے نکلے ناقض نہیں تو اس بارے میں عرض یہ ہے

کہ یہ اصل کے حکم کو فرع میں تبدیل کرنا ہے اور بس۔ جب معلوم ہو گیا کہ زوالِ طہارت کی علت نجاست کا نکلنا ہے تو نجاست جب بھی نکلے گی طہارت ختم ہو جائے گی اور جو چیز زوالِ طہارت کا باعث نہیں ہو گی اور چیز حدث نہیں ہو گی وہ نجاست نہیں ہو گی۔ یہی الفاظ امام ابو یوسف سے مروی ہیں۔ جب خون اور زرد رنگ کا پانی جو بہنے والے نہیں بدن یا کپڑے پر لگ گئے تو بدن یا کپڑا پلید نہیں ہوں گے درہم ہو یا اس سے زیادہ' نماز ہو گی۔ یہی حکم تھوڑی قے کا ہے زخم سے زرد پانی ظاہر ہوا اور وہیں رہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا اور نہ ہی یہ نجاست شمار ہو گا۔ آنکھ میں خراش آ گئی' خون ظاہر ہوا اور آنکھ میں رہا وضو نہیں ٹوٹے گا اور نہ ہی نجاست شمار ہو گا۔ کان میں زخم تھا خون یا پیپ آئے مگر کان سے باہر نہ آئے روئی ڈالی تو ساتھ لگے ہوئے تھے تو وضو نہیں ٹوٹا اور یہ نجاست نہیں کیونکہ جس چیز سے وضو نہیں ٹوٹتا وہ نجاست نہیں وہ آدمی معذور ہے جسے ہمیشہ پیچش آتے ہیں یا مسلسل ہوا چلتی ہے یا پیشاب نکلتا رہتا ہے یا ناک سے خون آتا ہے یا زخم ہے رستا رہتا ہے یا عورت کو استحاضہ کا خون آتا ہے اور ان عوارض میں وہ اس طرح مبتلا ہے کہ اسے نماز کا وقت ملتا ہی نہیں' تو اس کے لئے جائز ہے کہ ہر نماز کے لئے الگ وضو کرے اور اس کے بعد اس عذر کے ہوتے ہوئے نماز پڑھ لے اور بیماری کا اعتبار نہ کرے۔

اس میں مستحاضہ والی حدیث ہے اور باقی عوارض کا حکم اس کی دلالت سے ثابت ہے۔

جس عورت کو ہر وقت خون آتا ہو

حدیث یہ ہے کہ:

عن ام المؤمنين عائشة قالت جاء ت فاطمة بنت جحش الى رسول الله صلى الله عليه وسلم قالت امرأة تستحاض فلا اطهرا فادع الصلوة فقال عليه السلام لاتجتنبي الصلوة ايام محيضك ثم اغتسلي وتوضئي لكل صلوة ثم صلي وان قطر الدم على حصيرك. (رواہ ابن ماجہ)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ فاطمہ بنت جحش رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا مجھے ہر وقت خون آتا رہتا ہے اور کسی وقت پاک نہیں رہتی۔ کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا حیض کے دنوں میں نماز نہ پڑھا کر حیض کے دن ختم ہو جائیں تو غسل کر لیا کرو اور نماز کے لئے وضو کیا کرو اور نماز پڑھا کرو اگرچہ خون کے قطرے چٹائی پر گرتے رہیں۔

ظاہر ہے کہ استحاضہ کا عذر اور دوسرے تمام دائمی عذر برابر ہیں لہٰذا تمام کا حکم بھی ایک جیسا ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہر نماز کے لئے وضو کرے۔ معذور آدمی کا ایک وضو کے ساتھ دو نمازیں پڑھنا صحیح نہیں۔ فجر کی قضا اور ظہر کی ادا کو ایک وضو کے ساتھ ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔ امام شافعی حدیث مبارک کے ظاہری الفاظ سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں ہر نماز کے لئے وضو کرنے کا حکم ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر نماز کے وقت کے لئے الگ وضو کرے' ایک نماز کے وقت میں دو فرض نمازوں کا ایک

وضو کے ساتھ پڑھنا جائز ہے جیسا کہ اوپر والی مثال میں کہا گیا ہے کہ فجر کی قضا اور ظہر کی ادا نماز کو ایک وقت میں ایک وضو کے ساتھ پڑھا سو احناف کے نزدیک یہ صحیح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا مستحاضہ کے لئے فرمان ہے کہ وہ ہر نماز کے وقت کے لئے الگ وضو کرے۔

شیخ ابن الھمام کہتے ہیں کہ سبط ابن الجوزی نے ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس روایت کو ذکر کیا ہے وہ مفسر ہے اور مذکورہ حدیث سے امام شافعی کے نظریئے کے ثبوت کا صرف احتمال ہے، ہوسکتا ہے کہ لام وقت کے لئے ہو، لہٰذا محتمل کو مفسر پر محمول کیا جاتا ہے کہ یہ اصول الفقہ کا قاعدہ ہے۔

معذور کا وضو کب تک برقرار رہے گا؟

امام ابوحنیفہ ہشام بن عروہ سے وہ ام المؤمنین عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فاطمہ بنت جحش سے فرمایا: ہر نماز کے وقت کے لئے وضو کر۔ حدیث میں دو روایتیں ہیں۔ ایک محتمل اور دوسری مفسر لہٰذا محتمل کو مفسر پر محمول کریں گے۔ فتح القدیر شرح مختصر الطحاوی اور الاصل میں ایسا ہی ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ معذور کا وضو وقت کے ختم ہونے سے ٹوٹ جاتا ہے جیسا کہ اسی حدیث سے ثابت ہے۔ یہ رائے امام ابوحنیفہ اور امام محمد کی ہے۔

امام زفر کہتے ہیں کہ وقت کے ختم ہونے سے نہیں بلکہ اگلی نماز کا وقت داخل ہونے سے پہلی نماز کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ امام ابو یوسف کے نزدیک دونوں صورتوں میں وضو ٹوٹ جائے گا اگر معذور نے فجر کے وضو کے ساتھ سورج کے نکلنے کے بعد کوئی نماز پڑھی تو وہ نہیں ہوگی۔ امام زفر کی رائے اس سے مختلف ہے۔ طرفین کے نزدیک چاشت کے وضو کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھ سکتا ہے مگر امام یوسف اور امام زفر کے نزدیک نہیں۔

فتح القدیر میں امام فخر الاسلام سے روایت کیا گیا ہے کہ اس لحاظ سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

رہا امام زفر کے نزدیک چاشت کی نماز کا فجر کے وضو کے ساتھ پڑھنے کا جواز تو اس کی وجہ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقت موجود ہے اور سورج کے نکلنے کے بعد دوسری نماز کا وقت نہیں ہوا، اس لئے اس کا وضو باقی ہے کیونکہ جب تک دوسری نماز کا وقت نہیں ہو جاتا پہلی نماز کا وضو برقرار ہے۔ گویا ان کے نزدیک زوال سے پہلے کے نوافل فرض کے تابع نہیں ہیں، ہاں ظہر کی نماز امام یوسف کے نزدیک چاشت کے وضو کے ساتھ نہیں پڑھی جا سکتی کیونکہ معذور کی طہارت ضرورت کے تحت ہے اور وقت سے پہلے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ اس کی طہارت ختم ہوگئی ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ معذور کا وقت سے پہلے وضو کرنا صحیح نہیں ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس نے وضو کیا وضو ہو گیا اور پھر وقت ختم ہونے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔

ہدایہ میں امام زفر کی یہ دلیل بیان کی گئی ہے کہ معذور کی طہارت ضرورت کے تحت ہے اور وقت سے پہلے حاجت متحقق نہیں ہوتی۔ امام ابو یوسف کی دلیل یہ ہے کہ حاجت وقت کے ساتھ خاص ہے لہٰذا وقت سے پہلے طہارت صحیح نہیں اور نہ ہی بعد میں صحیح ہے۔

شیخ ابن الھمام اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ امام زفر کے نزدیک ضرورت نہ ہونے کی

بناء پر معذور کا وقت سے پہلے طہارت حاصل کرنا صحیح نہیں ہے اور امام ابو یوسف کے نزدیک نہ وقت سے پہلے صحیح ہے اور نہ وقت کے بعد کیونکہ اس نے طہارت کی لیکن طہارت حاصل ہو کر ختم ہو گئی تو یہ فخر الاسلام کے نظریئے کے مطابق ہوا۔

ہم کہتے ہیں کہ کیا وقت سے پہلے یا وقت کے بعد دونوں صورتوں میں معذور کو وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے ایسی بات نہیں کیونکہ فرض نماز تو موضوع نہیں ہے طہارت کسی اور غرض کے لئے بھی کی جا سکتی ہے مثلاً ایک معذور شخص زوال سے پہلے نماز ادا کرنا چاہتا ہے جیسے چاشت کی نماز تو ضروری ہے کہ وہ پہلے طہارت حاصل کرے اور اس کی طہارت معتبر ہو۔

تو پھر ابن الھمام کا یہ قول کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ معذور کا وضو وقت سے پہلے اور وقت کے بعد معتبر ہی نہیں ہے۔ اس اصول کی بناء پر صاحب ہدایہ کے قول کا مفہوم یہ ہو گا کہ فرض کی ادائیگی کے لئے معذور کا وضو کرنا ایک ضرورت ہے کہ اس نے فرض نماز ادا کرنی ہے اور ظاہر ہے کہ وقت سے پہلے اس کی ضرورت نہیں کیونکہ وقت سے پہلے تو نماز ہو ہی نہیں سکتی لہٰذا جب کسی نے نفل نماز کے لئے وضو کیا جونہی فرض نماز کا وقت شروع ہو گا اس کا وضو جاتا رہے گا کیونکہ فرض نماز کی وجہ سے اسے نئے سرے سے وضو کرنے کی ضرورت ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک یہ ضرورت وقت کے ساتھ خاص ہے لہٰذا ہر وقت کے لئے نئے وضو کی ضرورت ہے کیونکہ ضرورت پڑنے پر معذور کیلئے وضو ضروری ہے اب پہلا وضو نہیں رہا کیونکہ ضرورت نہیں ہے جس کے لئے نیا وضو ضروری ہے۔ ہدایہ میں طرفین کی دلیلوں کو بیان کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نماز سے پہلے طہارت کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ پورا وقت نماز کا ہے اور وقت ختم ہوتے ہی ضرورت طہارت ختم ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے' اس پر کوئی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے اگر پورے وقت کو نماز کا وقت شمار کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ وقت ہونے کے ساتھ وضو نہ ٹوٹے سوائے فجر کے کیونکہ پورا وقت نماز کا ہے' عصر سے پہلے ظہر کا پورا وقت نماز کا ہے جس کے لئے طہارت کی ضرورت ہے۔ ظہر کا وقت ختم ہوتا ہے تو فوراً عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے لہٰذا وضو کی ضرورت ہے تو ضرورت کی بناء پر وضو نہیں ٹوٹنا چاہئے۔ یہی صورت مغرب اور عشاء کی ہے۔ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ معذور کے لئے سارا وقت نماز کا نہیں بلکہ طہارت اور نماز کا ہے پہلے وہ اسی وقت میں وضو کرے گا پھر نماز پڑھے گا۔ اس طرح وضو اور نماز ایک ہی وقت میں ہو جائیں گے۔ اگر صرف اس شخص اور وقت کا لحاظ رکھا جائے تو پھر ممکن ہے کہ پورا وقت نماز کا ہو مثلاً وہ شخص معذور نہیں تو ظہر کے وقت میں کسی وقت میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح ظہر سے پہلے وضو لازم آئے گا لیکن وہ مقدور ہے اس لئے وقت سے پہلے وہ وضو نہیں کرے گا بلکہ وہ وقت کے اندر وضو کرے گا اور اس کے بعد جب چاہے گا ظہر کے وقت کے اندر ظہر کی نماز ادا کرے گا۔

ہاں فجر کی نماز کے علاوہ دوسری نمازوں میں یہ بات ظاہر ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فجر بھی دوسری نمازوں کی طرح ہے۔

ایک معذور شخص کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ ہر نماز کے لئے وضو کرے اور جونہی نماز کا وقت ختم ہو گا اس کا وضو خود

بخو دٹوٹ جائے گا۔ ظہر کی نماز کے وقت کے شروع ہونے سے دوسری فجر تک مسلسل نماز کا وقت ہے ایک سیکنڈ پہلے اگر ظہر کا وقت ہوا ہے تو اس کے ختم ہوتے ہی عصر کا وقت شروع ہو گیا۔ اس طرح ظہر سے فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی ایسا وقت نہیں جس میں کوئی نہ کوئی نماز نہ پڑھی جائے تو اب معذور کا وضو نماز کے وقت کے ختم ہونے پر ٹوٹے تو گویا وہ ظہر کی نماز سے فجر کی نماز پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ کوئی اور عارضہ لاحق نہ ہو اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہر نماز کے لئے الگ وضو۔ پھر اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس طرح تو وقت سے پہلے وضو لازم آئے گا کیونکہ ظہر کا پورا وقت نماز کا وقت ہے۔ مثلاً ظہر کا وقت بارہ بج کر دو منٹ پر شروع ہوتا ہے تو گویا وہ بارہ بج کر دو منٹ پر نماز شروع کر سکتا ہے اور وضو ضرورتاً اس سے پہلے ہوگا اور وقت کے ختم ہونے سے ختم ہو جائے گا۔ اس بارے فرماتے ہیں کہ معذور کے لئے سارا وقت نماز کا نہیں بلکہ طہارت اور نماز کا ہے۔ بارہ بج کر دو منٹ پر وہ وضو کرے گا اور نماز پڑھے گا' پہلے وضو نہیں کرے گا۔

ٹیک لگا کر سونا

پہلو کے بل کسی چیز سے سہارا لے کر سونے یا کہنی وغیرہ پر ٹیک لگا کر سونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ جس چیز سے ٹیک لگا کر سو رہا ہے اسے ہٹایا اور وہ گر پڑا۔ نماز میں کھڑے کھڑے یا بیٹھے بیٹھے سو گیا یا رکوع و سجود میں سو گیا یا نماز میں نہیں ہے کھڑے کھڑے یا بیٹھے سو گیا تو وضو نہیں ٹوٹے گا' ہاں اگر سجدہ نماز سے باہر ہے اور رانوں کو پیٹ کے ساتھ لگا کر سو گیا تو وضو ٹوٹ جائے گا جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ اکڑوں بیٹھنے والے کا وضو ٹوٹ جاتا ہے جب سرین زمین سے اٹھے ہوئے ہوں سرین پر بیٹھنے کی وہ حالت جسے امام شافعی نماز میں مسنون بتاتے ہیں۔ ایسی حالت میں نیند آ گئی تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ اپنی ایڑیوں پر رکھ کر سو گیا اور اس کا پیٹ اس کی رانوں کے ساتھ لگا ہوا تھا تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ فتح القدیر نے ذخیرہ سے ایسے ہی نقل کیا ہے۔ جو آدمی بیٹھے بیٹھے سو گیا اور اسی حالت میں گر پڑا مگر زمین پر پہنچنے سے پہلے بیدار ہو گیا یا زمین کے ساتھ لگتے ہی بیدار ہو گیا تو امام ابوحنیفہ سے روایت کردہ ایک قول کے مطابق اس کا وضو نہیں ٹوٹا جبکہ امام یوسف کے نزدیک ٹوٹ گیا۔ امام محمد کی رائے یہ ہے کہ اگر زمین پر گرنے سے پہلے بیدار ہو گیا تو نہیں ٹوٹا اگر زمین پر گرنے کے بعد بیدار ہوا تو ٹوٹ جائے گا۔ فتح القدیر میں ہے کہ فتویٰ امام ابوحنیفہ کے قول پر ہے۔ اگر بیٹھے بیٹھے سو گیا اور سوچتا ہے کہ مقعد زمین سے اٹھی ہے یا نہیں اور کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پاتا تو ظاہر مذہب یہ ہے کہ اس کا وضو نہیں ٹوٹا۔ فتح القدیر میں ہے کہ اس کی صحت پر امام ابوداؤد کی حدیث دلیل ہے۔

ابوداؤد شریف میں ہے کہ:

كان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ينتظرون لصلوة حتى تخفق رؤسهم ثم يصلون ولا يتوضئون .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام نماز کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے جھک جاتے پھر وہ نماز پڑھ لیتے اور وضو نہیں کرتے تھے۔

مذکورہ صورت میں نیند کے ناقض وضو ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اذا نام احدکم مضطجعا فلیتوضأ. جب تم میں کوئی شخص پہلو کے بل سو جائے تو وضو کرے۔

اسی سلسلہ میں اصل حدیث جس سے استدلال کیا جاتا ہے دارمی کی حدیث ہے۔

عن معاویة بن ابی سفیان ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قال انما العینان وکاء السه فاذانامت العین استطلق الوکاء. معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: آنکھیں شرمگاہ کا ڈھکنا ہیں۔ جب آنکھ سو جاتی ہے تو ڈھکنا کھل جاتا ہے۔

کروٹ کے بل سونے سے یا سہارا لگا کر سونے یا اپنے ہاتھ کی ٹیک لگا کر سونے سے وضو کے ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں مفاصل ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور اس وجہ سے ہوا خارج ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں عموماً حضور علیہ السلام کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا:

اس شخص پر وضو لازم نہیں جو بیٹھے بیٹھے سویا یا کھڑا کھڑا سو گیا یا حالت سجدہ میں سو گیا جب تک کہ اپنا پہلو زمین پر نہیں رکھتا۔

جب پہلو کے بل لیٹ جائے گا تو اس کے مفاصل ڈھیلے ہو جائیں گے۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اس کی سند میں یزید دالانی ہیں۔ دوسری حدیث ابن عباس کی ہے جس میں اس بارے استدلال کیا جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

ان الوضوء علی من نام مضطجعاً فانه اذا اضطجع استرخت مفاصله. جو پہلو کے بل لیٹ کر سو گیا اس پر وضو کرنا لازم ہے کیونکہ جب پہلو کے بل لیٹ کر سو گیا تو مفاصل ڈھیلے ہو گئے۔

اسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے' یہ حدیث کا ایک حصہ ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے کیونکہ اس میں یزید دالانی ہیں۔ ابن حبان کے بقول یہ کثیر الخطا ہے' اس کی بیان کردہ حدیث کو دلیل نہ بنایا جائے۔ کچھ لوگوں نے اسے صادق کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس پر جھوٹ کی صرف تہمت ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ کمزوری کے باوجود اس سے حدیث روایت کر کے لکھی جاتی ہے۔ مہدی بن ہلال بن مہدی نے اس کی متابعت کی ہے۔

ثم اسند ابن عدی عنه الی عبد اللہ بن عمر وقال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لیس علی من نام قائما اوقاعدا وضوء حتی یضطجع جنبه الی الارض. پھر ابن عدی نے عبداللہ ابن عمر کی سند سے اسے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص کھڑے کھڑے یا بیٹھے میں سو گیا اس پر وضو لازم نہیں جب تک اپنا پہلو زمین پر نہ رکھ دے۔

فتح القدیر میں ایک اور حدیث کو ذکر کرنے اور اسے ضعیف قرار دینے کے بعد صاحب فتح القدیر نے فرمایا ہے

کہ جس حدیث کو ہم یہاں لائے ہیں جب تو اس میں غور فکر کرے گا تو اس کی کوئی حدیث درجہ حسن سے کم درجہ کی نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتب حدیث میں مذکور ہے کہ بزاز سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا گیا ہے کہ:

کان اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ینتظرون الصلوة فیضعون جنوبهم فمنهم من ینام ثم یقوم الی الصلوة.

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام علیہم الرضوان نماز کا انتظار کرتے کرتے لیٹ جاتے۔ کچھ لوگ سو جاتے اور پھر نماز کے لئے اٹھتے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے اونگھ پر محمول کیا جائے۔ حلوانی فرماتے ہیں کہ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اونگھ حدث (بے وضو ہونا) نہیں کیونکہ وہ نیند کی ہلکی سی کیفیت ہے۔ اونگھ سے وضو نہ ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان کے جسم کے اعضا ڈھیلے نہیں ہوتے۔ یہ بات یاد رکھئے کہ نیند بذات خود حدث نہیں ہے' درحقیقت یہ جسم کی سختی کو زائل کر دیتی ہے جس کی وجہ سے عموماً ہوا خارج ہو جاتی ہے' نیند میں آدمی غافل ہوتا ہے اس میں ہوا کے خارج ہونے کا گمان ہے اور ہوا نکل جائے تو پتہ نہیں چلتا' سو ایسی نیند جس سے مفاصل ڈھیلے ہو جائیں ناقض وضو ہے۔

اب وہ باکمال شخصیت جس کی آنکھ سوتی ہے مگر قلب اطہر بیدار رہتا ہے جیسے سرور کائنات ﷺ تو ان کی نیند حدث نہیں۔ صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں حضرت ابن عباس سے ایک صحیح حدیث مروی ہے۔ حدیث طویل ہے۔ جس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

فقامت صلوة رسول الله صلی الله علیه وسلم ثلث عشر رکعة ثم اضطجع فنام حتی تنضح فاتاه بلال فاذنه بالصلوة فقام فصلی ولم یتوضا.

رسول اللہ ﷺ نے تیرہ رکعت ادا کی۔ پھر آپ پہلو کے بل لیٹ کر سو گئے حتیٰ کہ آپ لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور آپ کو نماز کے لئے عرض کی۔ آپ اٹھے نماز پڑھی اور آپ ﷺ نے وضو نہ فرمایا۔

علماء کے نزدیک یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان کا دل بیدار رہتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آپ کے کسی غلام کو بھی آپ کی اتباع اور غلامی کی وجہ سے یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے کہ اس کی آنکھیں سوئیں اور دل بیدار رہے مثلاً حضور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کہ وہ آپ کے ہم مرتبہ تو نعوذ باللہ نہیں ہو سکتے لیکن غلامی کی وجہ سے بطفیل حضور ﷺ دل بیدار تو مل سکتا ہے تو ان کا کیا حکم ہے؟ ہمارے نزدیک ایسا ممکن ہے۔

بے ہوشی میں وضو جاتا رہتا ہے

بے ہوشی کی وجہ سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے' بے ہوشی کی حالت میں نیند کی نسبت مفاصل زیادہ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ بے ہوشی میں بہر حال وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسا ہی ہدایہ اور اصول فخر الاسلام میں ہے اور بے ہوشی کے ناقضِ وضو ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ شاید بے ہوشی سے مراد وہ بے ہوشی ہے جس میں کچھ ہوش نہیں رہتا۔

اگر تھوڑا بہت ہوش ہو تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ بخاری و مسلم نے اس سلسلہ میں ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں سورج گرہن کا ذکر ہے۔

عن اسماء بنت افضل الصديقين رضى الله تعالى عنها قمت حتى تجلانى الغشى وجعلت اصب فوق راسى ماء.

سیدہ اسماء بنت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی گئی ہے کہ میں کھڑی رہی یہاں تک کہ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی تو میں نے اپنے سر پر پانی ڈالا۔

عروہ فرماتے ہیں کہ حضرت اسماء نے غشی کے باوجود وضو نہ فرمایا (کیونکہ غشی معمولی تھی)۔

نشہ اور پاگل پن

نشہ اور جنون دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ان میں کسی قسم کی کوئی قید نہیں ہے کیونکہ نشہ اور جنون کی صورت میں انسان کی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور اس میں گمان ہوتا ہے کہ ہوا نکلی ہوگی اور پتہ نہیں چلا ہوگا پھر نشے والے آدمی میں کسی قسم کی کوئی احتیاط نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے اس کا وضو ٹوٹے اور وہ پرواہ ہی نہ کرے اور اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دے اور اس طرح اسے وضو کا ٹوٹنا بھول جائے بہرحال نشہ میں اگر کوئی شعور ہو بھی تو یہ ناقض وضو ہے۔

بالغ کا نماز میں قہقہہ لگانا

بالغ آدمی اگر رکوع و سجود والی نماز میں قہقہہ لگائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

من قهقه فليعد الصلوة و الوضوء.

جس نے قہقہہ لگایا وہ دوبارہ وضو کرے اور نماز پڑھے۔

فتح القدیر میں ہے کہ حدیثِ قہقہہ مرسلاً اور مسنداً روایت کی گئی ہے۔ علماء حدیث نے اعتراف کیا ہے کہ مرسل ہونے کے باوجود یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ مرسل کا اعتبار ابوالمعالیہ پر ہے۔ اگرچہ اسے تاج العرفاء حضرت حسن بصری اور ابراہیم نخعی وغیرہما نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی صحت میں مرسلاً ہونا بھی کافی ہے کیونکہ ہمارے نزدیک مرسل ہونا بھی حجت ہے خصوصاً جب ایک اور حدیث مرسل اس کی تقویت کا باعث بن رہی ہو ایسے میں تو امام شافعی کے نزدیک بھی حجت بن جاتی ہے مگر اس کی ایک سند متصل بھی ہے۔

روى الامام ابو حنيفة عن منصور بن زادان الواسطى عن معبد بن معبد الخزاعى عنه عليه الصلوة والسلام بينهما هو فى الصلوة اذا قبل اعمى يريد الصلوة فوقع فى ربيته فاستضحك القوم فقهقهوا فلما انصرف قال من كان منكم قهقه فليعد

امام ابوحنیفہ نے منصور بن زادان واسطی سے وہ معبد بن معبد خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نبی کریم ﷺ کے بارے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نماز میں تھے کہ ایک نابینا آدمی نماز پڑھنے کے لئے آئے اور گڑھے میں گر پڑے۔ لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ جب آپ پیچھے پلٹے تو فرمایا: جنہوں نے قہقہہ لگایا ہے وہ دوبارہ وضو کریں اور نماز

الوضوء والصلوۃ۔ پڑھیں۔

کہا جاتا ہے کہ معبد صحابی نہیں' وہ بصری ہے جس کے متعلق حضرت حسن بصری کا ارشاد ہے کہ معبد سے بچو وہ گمراہ اور گمراہ کن ہے۔ یہ معبد خزاعی صحابی ہیں جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہ کی روایت میں صراحت ہے کہ ان کے صحابی ہونے میں کوئی شک نہیں ابن مندہ اور ابونعیم نے انہیں صحابہ میں ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد شیخ ابن الھمام فرماتے ہیں کہ ان کی روایت مسند ہے' انہوں نے بہت سے صحابہ سے روایت کی ہے مثلاً ابوموسیٰ اشعری' ابوہریرہ' ابن عمر' انس' عمران بن حصین اور جابر رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اس سلسلہ کی محفوظ ترین حدیث ابن عمر کی ہے جسے ابن عدی نے کامل میں عطیہ بن بقیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ بقیہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمرو بن قیس سکونی نے بیان کیا کہ

عن عطاء عن ابن عمر رضی اللہ تعالی عنھما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ضحک فی الصلوۃ قھقھۃ فلیعد الوضوء والصلوۃ

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسا وہ دوبارہ وضو کرے اور نماز پڑھے۔

اس حدیث میں یہ طعن ہے کہ اس کی سند میں بقیہ نامی راوی مدلس ہے شاید اس نے کسی ضعیف آدمی سے حدیث کی سماعت کی اور اس کا نام حذف کر دیا۔ شیخ ابن الھمام اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ بقیہ نے حدثنا کے الفاظ سے روایت کی ہے اور ایک مدلس راوی جب صراحتاً ان الفاظ سے حدیث روایت کرے اور اس سے پہلے وہ سچا شمار ہوتا ہو تو تدلیس کی تہمت ختم ہو جاتی ہے۔ اس گفتگو سے بعض شوافع کا اعتراض ختم ہو گیا۔ مثلاً "مختصر حھدیٰ" کے شارح بیان کرتے ہیں کہ تمہارے نزدیک خبر واحد ایسی صورت میں واجب العمل نہیں ہوتی جب عموم بلویٰ کا سبب بنے لہٰذا قہقہہ والی حدیث کیسے قبول ہو سکتی ہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ خبر حد شہرت کو پہنچی ہوئی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نماز میں قہقہہ ایک نادر الوقوع امر ہے۔ لاکھوں لوگوں میں سے کوئی ایک شخص نماز میں قہقہہ لگا کر ہنس سکتا ہے اور وہ بھی کبھی کبھار سو یہ چیز عموم بلویٰ کا سبب کسی صورت میں نہیں بن سکتی۔

پھر یہ حدیث مطلق نماز میں قہقہہ کے بارے میں ہے۔ یعنی ہر ایسی نماز جس میں رکوع اور سجود ہو' یہ قیاس کے مخالف ہے سو ایسی نماز کے لئے یہ حکم نہیں جس میں سجدہ اور رکوع نہ ہو اس لئے ہم نے رکوع و سجود کی شرط لگائی ہے۔ نماز جنازہ میں اور سجدۂ تلاوت میں قہقہہ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔

عورت کو چھونا

شیخین کے نزدیک فاحش مباشرت ناقض وضو ہے اور امام محمد کے نزدیک اس سے وضو نہیں ٹوٹتا کیونکہ وضو توڑنے والی کوئی چیز موجود نہیں۔ فاحش مباشرت یہ ہے کہ مرد اور عورت عریاں ہو کر ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہیں اور دونوں کی شرم گاہیں باہم مل جاتی ہیں لیکن مرد کا آلۂ تناسل عورت کی شرم گاہ میں داخل نہیں

ہوتا۔ فاحش مباشرت کے بارے شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ عموماً ایسا ہو نہیں سکتا کہ ایسی صورت میں پانی نما چیز نہ نکلے۔ غالب گمان یہ ہے کہ جب مرد اور عورت ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوں گے تو کچھ نہ کچھ رکیک مادہ ضرور نکلے گا۔ اس لئے فاحش مباشرت کو مجامعت کے قائم مقام بنا دیا گیا کیونکہ غالب گمان تحقق کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ مرد کا عورت کو پیار کرنا' چومنا اور آلۂ تناسل کا شرم گاہ کے علاوہ جسم کے کسی دوسرے حصے سے مس کرنا' شہوت کے ساتھ عورت کو چھونا' بغیر شہوت کے ہاتھ لگانا تمام صورتوں میں وضو نہیں ٹوٹتا' یہ رائے احناف کی ہے۔ اس بارے تینوں اماموں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہم سے مختلف ہے۔

امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ عورت کو مطلقاً چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ دونوں بالغ ہوں۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ شہوت کے ساتھ چھوئے گا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ امام احمد بن حنبل کا نظریہ بھی امام مالک سے ملتا جلتا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ بیگانی عورت کی شرط لگاتے ہیں یعنی اجنبی عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

حضرت امام شافعی کے مقابلے میں ہماری دلیل بخاری و مسلم کی حدیث ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة انها قالت انام بین یدی رسول الله صلی الله علیه وسلم ورجلای فی قبلته فاذا سجد غمزنی فقبضت رجلی و اذا قام بسطها.

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوئی ہوئی تھی اور میرے پاؤں آپ کی سمت قبلہ میں تھے۔ حضور ﷺ جب سجدہ فرماتے تو مجھے (آنکھ سے) اشارہ کر دیتے اور میں پاؤں سمیٹ لیتی اور جب کھڑے ہوتے تو میں پاؤں پھیلا دیتی۔

ایک دوسری حدیث جو تمام لوگوں کے مقابلے میں ہماری دلیل ہے۔ ابوداؤد' ترمذی اور نسائی کی روایت کردہ ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة قالت کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقبل بعض ازواجه ثم یصلی و لایتوضا.

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ محترمہ میں سے کسی کا بوسہ لیتے پھر نماز پڑھ لیتے اور وضو نہ کرتے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ہمارے دوستوں کے نزدیک اس کی یہ سند حبیب عن عروہ عن عائشہ صحیح نہیں کیونکہ حبیب کی عروہ سے سماعت ثابت نہیں۔ اس حدیث کو ابراہیم تیمی کی سند سے بھی روایت کیا گیا ہے جو ایک زاہد اور ثقہ راوی ہیں۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ سند بھی صحیح نہیں۔ ابوداؤد کے بقول یہ مرسل ہے۔ ابراہیم تیمی نے حضرت عائشہ سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ یہ طعن کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ زیادہ سے زیادہ اس کی سند میں انقطاع اور ارسال ہے اور حدیث منقطع اور مرسل کو ہم حجت مانتے ہیں جبکہ مرسل ثقہ ہو۔ امام شافعی کے نزدیک اگر کوئی

دوسری مرسل اس کی تقویت کا باعث بن رہی ہو تو وہ حجت ہے حالانکہ شیخ ابن الھمام کے نزدیک اسے بزاز نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔

کچھ لوگ تیمم والی آیت او لمستم النساء سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ ایک قرأت او لا مستم کی بجائے او لمستم بھی ہے۔

ہمارے نزدیک آیہ کریمہ میں لفظ لمس جماع کے معنی میں ہے اور اس کی تائید اس قرأت سے ہوتی ہے۔ جس میں او لا مستم النساء ہے اور آیت سے جماع کے معنی لینا کئی صحابہ سے روایت کیا گیا ہے۔

ان میں ابوموسیٰ اشعری سرفہرست ہیں۔ انہوں نے جنابت میں تیمم کے جواز پر اس آیت سے حضرت ابن مسعود کے مقابلے میں استدلال کیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مفہوم کو صحیح قرار دیا ہے اور فرمایا: میں اسی لئے تیمم سے روکتا ہوں کہ لوگ غسل کرنے میں سستی کریں گے جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔

شرم گاہ کو ہاتھ لگانا

ہمارے نزدیک شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ نہیں ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ ہاتھ اور شرم گاہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔ امام مالک کا مذہب بھی یہی ہے۔ حضرت احمد بن حنبل کی ایک روایت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آلۂ تناسل کو یا دبر کو ہاتھ لگاتا ہے یا عورت اپنی شرمگاہ کو یا دبر کو ہاتھ لگاتی ہے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ان کی ایک دوسری روایت یہ ہے کہ وضو ٹوٹتا نہیں۔ ہاں اس کے بعد وضو کر لینا مستحب ہے۔ امام مالک کے مذہب میں عورت کی شرمگاہ کے بارے اختلاف ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کردہ حضرت امام شافعی کی یہ حدیث ہے:

عن ابی هریرة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا افضی احدکم بیده الی ذکره لیس بینه و بینها حجاب فیتوضأ.	حضرت ابوہریرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی آدمی شرمگاہ کو ہاتھ لگائے اور ہاتھ اور شرمگاہ کے درمیان کوئی پردہ نہ ہو تو وہ وضو کرے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ ایک دوسری حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔

عن بسرة بنت صفوان انها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من مس ذکره فلیتوضأ. (رواہ سنن نسائی)	بسرہ بنت صفوان رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگائے وہ وضو کرے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے مشائخ کے نزدیک اصول الفقہ کے مطابق یہ چیز عموم بلوئ کا سبب ہے کیونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ مرد اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگاتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مردوں کو اس کے حکم کو جاننے کی ضرورت تھی مگر کوئی مرد اس کے حکم پر مطلع نہ ہوا اور ایک عورت اس حکم سے آگاہ ہوئی جس کو اس کے حکم کے جاننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ مرد حکم سے ناواقف رہیں اور عورت اس سے آگاہ ہو جبکہ مسئلہ خالصتاً مرد کے متعلق ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں جہاں تک ہم جانتے ہیں کہ کسی صحابی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

ہاں حضرت ابن عمر ایک ایسی حدیث بیان کرتے ہیں لیکن آپ سے تمسک نہیں کرتے۔ فتح القدیر میں ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی، عمار، ابن مسعود، ابن عباس، حذیفہ، عمران بن حصین، ابی درداء، سعد بن وقاص رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے کہ وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ اگر یہ حدیث ہوتی تو وہ اس سے ضرور آگاہ ہوتے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے وہ بھی اس حدیث سے استدلال نہیں کرتے۔ کوئی بھی یہ نہیں فرماتا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بات سنی ہے جو بھی اس کو روایت کرتا ہے وہ بسرہ کا نام لیتا ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ رسول اللہ ﷺ ایک خاتون کو اس حکم سے مطلع کریں جس کی اسے ضرورت ہی نہیں اور وہ صرف مردوں کے لئے ہو اور کسی مرد کو آپ تعلیم نہ دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس میں باطنی انقطاع ہے اور حدیث صحیح نہیں ہے۔ پھر اس کی سند کو دیکھئے امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ مؤطا میں محمد بن عمرو بن حزم سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے عروہ کو فرماتے سنا کہ میں مروان کے پاس گیا اور باہم ان چیزوں کا تذکرہ کیا جن کی وجہ سے وضو کرنا پڑتا ہے۔ مروان نے کہا۔ جس نے اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا وہ وضو کرے۔

عروہ نے کہا مجھے اس کا علم نہیں۔ مروان نے کہا مجھے بسرہ بنت صفوان نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:

جب تم میں سے کوئی شخص اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگائے تو وضو کرے۔

ابوداؤد اور ترمذی نے مؤطا کی حدیث بیان کی ہے۔ امام نسائی نے بھی یہی روایت کیا ہے مگر اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ عروہ نے فرمایا کہ میں مروان سے چمٹا رہا حتیٰ کہ اس نے اپنے دربانوں میں سے ایک آدمی کو بلایا اور اسے بسرہ کے پاس بھیجا اور اس حدیث کے بارے اس سے دریافت کیا۔ بسرہ نے مروان کے پاس ایسی ہی خبر بھیجی جیسی مروان نے مجھ کو بتائی تھی۔ ایسا ہی جامع الاصول میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عروہ نے یہ حدیث بسرہ سے نہیں سنی بلکہ اس سے سنی ہے جس سے بسرہ نے روایت کی ہے۔ یعنی ایک سپاہی سے جو پوچھنے کے لئے گیا تھا۔

مروان اور سپاہی دونوں مجہول ہیں۔ ان کی روایت حجت نہیں بن سکتی۔ مروان سے اگرچہ محدثین کی ایک جماعت نے احادیث روایت کی ہیں اور اپنی صحاح اور مسانید میں مروان کی روایات کو قلمبند کیا ہے لیکن انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی حدیث اور گواہی قابل قبول نہیں۔ تواتر سے ثابت ہے کہ اس نے ایسے ایسے کام کئے ہیں۔ اعاذ باللہ عنہا وجمیع المسلمین۔ اس نے امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں فریب کیا، آپ کو اندازہ تک نہ ہو سکا کہ مروان کیسی چال چل رہا ہے حتیٰ کہ امیر المؤمنین کو بدبختوں نے ظلماً شہید کر دیا پھر یہ ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے یزید کے دور میں مدینہ طیبہ پر حملہ کیا، حرم نبوی کے تقدس کو پامال کیا۔ اہل مدینہ کی عزت و ناموس سے کھیلے، ان کے خون سے ہولی کھیلی۔ زبان کو بیان کا یارا نہیں۔ اس کی یہ کارستانیاں فی الواقع حرام

ہیں لہٰذا وہ فاسق معلن ہے ایسے شخص کی روایت قبول نہیں ہوتی بلکہ ایسے بدبخت کی حدیث لکھی نہیں جانی چاہئے۔ اگر وہ کسی شبہ کی وجہ سے اس فعل کو حلال جانتا ہے تو وہ خارجیوں کی مانند خواہشات کا بندہ ہے۔ پھر اتنا ہی نہیں وہ ان برائیوں کی طرف دعوت دینے والا تھا۔ اس لئے وہ بدعتی اور بدعت کی طرف دعوت دینے والا ہے۔ بالا جماع ایک بدعتی اور داعی بدعت کی روایت مقبول نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے معرض کتابت میں لایا جاتا ہے۔ پھر تاریخ میں اس واقعہ کو پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جھوٹ کا ارتکاب کیا۔ ایک بدعتی' جھوٹے اور کذب کو حلال سمجھنے والے کی روایت بالا جماع مردود ہے۔ پھر وہ امیر المؤمنین علی المرتضٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دیتا تھا نہ صرف مجالس میں بلکہ منبر پر بیٹھ کر اور ظاہر ہے کہ اسلاف کو گالی دینے والا مردود الشہادۃ اور مردود الروایۃ ہے اور اس پر علماء کا اتفاق ہے۔ اگر چھپ کر ایسا کرتا ہو تو الگ بات ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی شہادت قبول ہو گی بشرطیکہ وہ اپنے زعم میں جھوٹ اور کبائر سے اجتناب کرتا ہو۔ اکثر محدثین کے نزدیک اس کی روایت بھی قبول ہو گی بشرطیکہ وہ کبائر اور جھوٹ سے بچتا ہو۔

محققین احناف کے نزدیک اس کی روایت سرے سے قبول ہی نہ ہو گی۔ یہی مسلک صحیح ہے۔ اسے ہم نے فواتح الرحموت شرح مسلم میں بیان کیا ہے۔

اب جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کردہ حدیث صحیح نہیں ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی ضعیف ہے تو اب ایسی کوئی دلیل نہ رہی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ شرم گاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ سو شرمگاہ کو چھونا دوسرے اعضاء جسم کو چھونے کی مانند ناقض وضو نہیں۔

ایک اور حدیث ملاحظہ کیجئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

عن طلق بن علی بن طلق قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن مس الرجل ذکرہ بعد ما یتوضا قال بل ھو الابضعۃ منہ.

طلق بن علی بن طلق سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی وضو کرنے کے بعد اپنی شرمگاہ کو چھوتا ہے۔ (اس کے بارے میں کیا حکم ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ شرم گاہ جسم ہی کا حصہ ہے۔

(رواہ جامع الترمذی' سنن ابوداؤد' سنن نسائی)

تعجب ہے کہ جناب محی السنہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے منسوخ ہو گئی ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہ نے حضرت طلق کے بعد اسلام قبول کیا۔

حضرت ابوہریرہ نے سات ہجری غزوۂ خیبر میں اسلام قبول کیا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے محض تاخیر اسلام کو نسخ کا موجب ٹھہرایا جائے۔

اصول فقہ میں یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے کہ راوی کا تاخیر اسلام تاخیر مروی کا موجب نہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بعد میں اسلام قبول کرنے والا اپنے سے پہلے کسی مسلمان سے قبل کوئی حدیث سماعت کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث ضعیف ہے وہ اس حدیث کے معارض نہیں آ سکتی پھر حضرت ابوہریرہ نے سماعت کی تصریح نہیں کی بلکہ انہوں نے عن کے لفظ سے روایت کی ہے۔ ہو سکتا ہے حضرت ابوہریرہ نے بھی مروان سے

سنی ہو۔ یہ حدیث دلیل بھی نہیں بن سکتی چہ جائیکہ ناسخ ہے پھر حضرت طلق کی حدیث میں حکم کے ساتھ علت بھی مذکور ہے اور علم اصول میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جو حدیث حکم اور اس کی علت پر مشتمل ہو گی وہ اس حدیث سے قوی ہو گی جس میں حکم کے ساتھ علت بیان نہیں کی گئی ہو گی لہٰذا طلق کی حدیث پر عمل ہو گا اور اس کے مقابلے میں دوسری حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اس سے ہٹ کر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں مس کا ذکر کسی چیز کے نکلنے سے کنایہ ہو جیسا کہ **فجیء من الغائط** کنایہ ہے فضلہ کے خروج پر کیونکہ شرمگاہ کو ہاتھ لگانا صاف کرنے کے لئے ہوتا ہے جبکہ طلق کی حدیث ایسی نص ہے جس کی تفسیر بھی اس میں موجود ہے اس لئے اس کی تفسیر نہیں ہو سکتی لہٰذا اس حدیث کو جس میں تاویل کا احتمال ہے اس دوسری حدیث پر محمول کریں گے جس میں تفسیر ہے جیسا کہ علم اصول کا قاعدہ ہے۔ **واللہ اعلم باحکامہ**.

☆☆☆☆☆

غسل کا بیان

غسل کے فرائض

غسل حدث اکبر کے بعد طہارت حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ غسل نماز کے لئے شرط ہے۔ غسل کا صرف ایک ہی رکن ہے اور وہ ہے پورے جسم کا ایک مرتبہ دھونا۔ کلی اور ناک میں پانی ڈالنا دہ احناف کے نزدیک فرض ہے۔ اگر دانتوں میں خلا ہو جس میں کھانا پھنس جاتا ہو تو اس وقت تک غسل صحیح نہیں ہو گا جب تک اس کو باہر نکال کر پانی نہیں گزارے گا۔ فتح القدیر میں ایسا ہی ہے۔ فتاویٰ فقیہہ میں اس کے بارے اختلاف ہے۔ احتیاط اس میں ہے کہ دانتوں میں پھنسے ہوئے ذرات نکالے اور پانی سے اچھی طرح کلی کرے۔ ناک میں خشک ریٹھ کو نکالنا واجب ہے اور اس کو نکالے بغیر غسل صحیح نہیں ہو گا۔ اگر جنبی آدمی پانی پی لے تو اس کی کلی ہو جائے گی۔ امام یوسف فرماتے ہیں کہ نہیں جب تک منہ میں اچھی طرح حرکت نہیں دے گا کلی نہیں ہو گی۔ حالت جنابت میں کلی کے بعد اللہ کا ذکر کرنا' کھانا اور پینا جائز ہے۔ اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ یکبارگی غسل ضروری نہیں۔ ایک ایک عضو کو وقفے سے دھوئے گا تو بھی غسل ہو جائے گا۔ پس جب کلی کر لی تو منہ پاک ہو گیا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ کلی کرنا اور منہ میں پانی ڈالنا دونوں فرض نہیں۔ دلیل میں مسلم کی حدیث پیش کرتے ہیں۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم عشر من الفطرة قص الشارب واعفاء اللحیة والسواک واستنشاق الماء وقص الاظفار و غسل البراجم و نتف الابط و حلق العانة وانتقاص الماء

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دس چیزیں فطرت سے ہیں: مونچھوں کا کٹوانا' داڑھی کو بڑھانا' مسواک کرنا' ناک میں پانی ڈالنا' ناخن تراشنا' انگلیوں کی چنٹیں (جہاں دو انگلیاں آپس میں ملتی ہیں یعنی جڑیں) دھونا' بغل کے بال دور کرنا' موئے زیر ناف صاف کرنا اور استنجا کرنا۔

مصعب بن شیبہ فرماتے ہیں کہ دسویں چیز مجھے یاد نہیں رہی مگر وہ کلی ہو گی۔

حدیث میں استنجا سے مراد پتھروں اور ڈھیلوں کے بعد پانی سے استنجاء کرنا ہے۔ یہ حدیث دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ فطرت فرض اور سنت دونوں کو شامل ہے۔ کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ اسلام فطرت میں سے ہے۔ داڑھی بڑھانے کو فطرت میں شامل کرنا اس کے عموم پر دال ہے کیونکہ داڑھی کا بڑھانا یقیناً واجب ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فاطھروا فرمایا ہے جو تطہیر سے مبالغہ ہے۔ اس کا مقتضاء یہ ہے کہ پورے جسم ظاہری کو دھویا جائے سوائے اس جگہ کے جس جگہ کے دھونے سے تکلیف ہوتی ہے مثلاً آنکھیں اور کان کا سوراخ۔ قلفہ کا داخلی حصہ' منہ

اور ناک ظاہر ہیں اور ان کے دھونے میں کسی قسم کی تکلیف ہی نہیں لہٰذا امر پر عمل کرنے کے لئے ان کا دھونا واجب ہے۔ ظاہری جسم پورے کا پورا دھونا فرض ہے حتیٰ کہ تنگ بالی انگوٹھی کو حرکت دینا واجب ہے تا کہ ان کے اندر پانی داخل ہو۔ اگر کان میں بالی نہیں اور سوراخ میں پانی داخل ہو جاتا ہے تو صحیح ہے جیسے ناف کا حکم ہے۔ فتح القدیر میں ایسا ہی ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ پانی کو قلفہ کے سوراخ میں داخل کیا جائے جس کا ختنہ نہ ہوا ہو۔ عورت ظاہری شرمگاہ کو نہ دھوئے کیونکہ وہ منہ کی طرح ہے۔ اس کے اندر انگلی ڈال کر دھونا ضروری نہیں اسی پر فتویٰ ہے اور ایسا ہی فتح القدیر میں ہے۔ مرد کے لئے لازم ہے کہ اس نے مینڈھیاں گوندھی ہوں تو انہیں کھول دے اور تمام بالوں کو دھوئے اور بالوں کے نیچے سے بھی دھوئے اور اس احتیاط سے دھوئے کہ کوئی بال خشک نہ رہ جائے' یہ حکم تمام بالوں کے لئے ہے۔ خواہ وہ سر کے بال ہوں یا داڑھی کے ہوں اس کے بغیر اس کا غسل نہیں ہوگا کیونکہ حدیث پاک ہے۔

عن امیر المؤمنین علی قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ترک موضع شعرة من جنابة فعل بها کذا و کذامن النار فمن ثمه عادیت رأسی فمن ثمه عادیت رأسی ثلثا.

(رواہ سنن ابوداؤد' مسند امام احمد)

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص غسل جنابت میں ایک بال کی جگہ بے دھوئے چھوڑے گا تو اس کے ساتھ آگ سے ایسا ایسا کیا جائے گا۔ (یعنی عذاب دیا جائے گا) اسی وجہ سے میں نے سر کے ساتھ دشمنی کر لی ہے۔ آپ نے تین مرتبہ یہ کلمات فرمائے۔

دوسری حدیث حضرت ابوداوٗد کی ہے۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم تحت کل شعرة جنابة فبلوا الشعر واتقوا البشرة.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر ایک بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے بالوں کو دھوؤ اور جلد صاف کرو۔

عورت کے لئے مینڈھیاں کھولنا ضروری نہیں

عورت کے لئے مینڈھیاں کھولنا ضروری نہیں بلکہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے اگرچہ بال خشک رہ جائیں' اگر بال بندھے ہوئے نہ ہوں تو انہیں دھونا ضروری ہے یا نہیں فقیہہ ابی جعفر سے روایت ہے کہ ان تک پانی پہنچانا واجب ہے۔ فتح القدیر میں بھی ایسا ہے کہ عورت کے لئے مینڈھیاں کھولنا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل مسلم کی روایت ہے۔

عن ام المؤمنین ام سلمة قالت قلت یا رسول الله انی اشد ظفر رأسی افا نقضه لغسل الجنابة فقال لا انما بکفیک ان تحتثی علی رأسک ثلث حثیات ثم تفیضی

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں اپنے بالوں کو سختی سے گوند لیتی ہوں کیا غسل جنابت کے لئے انہیں کھولوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں۔ تیرے لئے لازم ہے کہ

علیک الماء.

اپنے سر میں تین لپ پانی ڈال پھر اپنے جسم پر پانی بہالے۔

لپ سے مراد ہاتھ بھر کر سر پر ڈالنا ہے۔ مقصد جلد کا پانی سے تر کرنا ہے' اگر تین لپ سے جلد خشک رہے تو اور پانی ڈالے۔

غسل کا مسنون طریقہ

غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو پونچوں تک دھوئے پھر اپنی شرمگاہ دھوئے اور بدن سے نجاست دور کرے پھر وضو کرے جس طرح نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے مگر دونوں پاؤں دھونا چھوڑ دے۔ ظاہر روایت یہ ہے کہ سر کا مسح کرے اور ایک روایت کی رو سے سر کا مسح نہ کرے پھر اپنے سر اور پورے جسم کو دھوئے اور اس کے بعد اپنے پاؤں کو دھوئے۔ ہدایہ میں اتنا ہی ہے۔ انہوں نے بھی بدن کو دھونے کی کیفیت بیان نہیں کی۔ بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ وضو کے بعد پہلے تین بار کلی کرے اور تین بار ناک میں پانی ڈالے پھر دائیں کندھے پر پانی ڈالے اور تین بار پانی بہائے اور پھر بائیں کندھے پر پانی ڈالے اور تین بار پانی بہائے پھر سر پر پانی بہائے اس طرح کہ سارے جسم پر پانی بہہ جائے۔ تین بار سر پر پانی ڈالنے کے بعد اب پاؤں کو دھوئے۔

ہدایہ میں ہے کہ پاؤں کو اس وقت مؤخر کرے جب پاؤں کی جگہ پانی کھڑا ہو۔ اگر کسی پتھر یا چوکڑی پر ہو تو پورا وضو کرنے کے بعد قدموں کو دھوئے اور اس کے بعد سر اور باقی جسم کو دھوئے۔ ہدایہ میں ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔

قالت وضعت للنبی صلی اللہ علیه وسلم غسلا فسترته بثوبه وصب علی یدیه فغسلهما مرتین او ثلاثا ثم صب بیمینه علی شماله فغسل فرجه فضرب بیده الارض فمسحها ثم غسلها فمضمض واستنشق و غسل وجهه و ذراعیه ثم صب علی رأسه و افاض علی جسده فغسل قدمیه فنا ولته ثوبا فلم یاخذه فانطلق وهو ینفض بدنه.

آپ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے غسل کا پانی رکھا اور کپڑے کے ساتھ آپ کے لئے پردہ کیا' آپ نے ہاتھوں پر پانی ڈالا' انہیں دو یا تین بار دھویا' پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور اپنی شرمگاہ کو دھویا۔ پھر زمین پر ہاتھ مارے ان کو ملا اور دھویا۔ اس کے بعد کلی کی' ناک میں پانی ڈالا' چہرہ مبارک اور بازوؤں کو دھویا پھر اپنے سارے جسم پر پانی ڈالا اور پورے جسم پر بہایا۔ اس کے بعد دونوں پاؤں کو دھویا میں نے جسم پونچھنے کے لئے کپڑا دیا لیکن آپ نے نہ لیا۔ جسم کو جھاڑتے ہوئے تشریف لے گئے۔

اسے بخاری نے روایت کیا یہ الفاظ بخاری کے تھے۔ مسلم اور اصحاب السنن نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں سر کے مسح کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے حسن کی روایت کی تائید ہوتی ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة قالت کان رسول اللہ ﷺ اذا اغتسل من الجنابة بدا فغسل یدیه قبل ان یدخلهما الاناء ثم

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب غسل جنابت فرماتے تو پہلے دونوں ہاتھ دھوتے اور اس کے بعد پانی کے برتن میں ہاتھ

يفرغ بيمينه على شماله فيغسل فرجه ثم يتوضاء كما يتوضأ للصلوة ثم يدخل اصابعه في الماء فيخلل بها اصول شعره ثم يصب على راسه ثلث غرفات بيديه ثم يفيض الماء على جلده كله. (رواہ مسلم)

ڈالتے پھر پانی لے کر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر ڈالتے' استنجاء کرتے' نماز کی طرح کا وضو بھی کرتے پھر پانی میں انگلیاں ڈبوتے اور بالوں کی جڑوں کا خلال کرتے پھر اپنے ہاتھوں سے تین چلو پانی سر پر انڈیلتے پھر اپنے پورے جسم پر پانی بہاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ پاؤں وضو کے ساتھ ہی دھو لیتے جبکہ حدیث میمونہ سے ثابت ہے کہ غسل کے بعد دھوتے۔ حضور ﷺ سے دونوں طرح سے ثابت ہے۔ کبھی آپ وضو کے دوران دھو لیتے اور کبھی غسل کے بعد آخر میں۔

صاحب ہدایہ کے نزدیک آخر میں دھونے چاہئیں جب پانی کھڑا ہو جاتا ہو۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو پہلے وضو کے ساتھ دھو لے۔ کسی حدیث میں نہیں کہ حضور ﷺ نے وضو کرنے کے بعد دوبارہ کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ آپ نے غسل کے لئے وضو والی کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کو کافی سمجھا۔ وضو کے بعد غسل کی ابتداء کلی اور ناک میں پانی ڈالنے سے کرنا اور اس بارے سنت کا دعویٰ کرنا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بدن پر تین بار پانی ڈالنے کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ یہ چیز بعید از قیاس ہے۔ حضور ﷺ صرف ایک صاع پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے۔

بعض علماء سے منقول غسل مسنون کی یہ کیفیت محل نظر ہے۔ صحیح وہی ہے جو ہدایہ میں ہے۔ واللہ اعلم باحکامہ۔

غسل کن چیزوں سے فرض ہو جاتا ہے؟

ا۔ منی

جن چیزوں سے غسل فرض ہو جاتا ہے ان میں سے ایک انزال ہے۔ انزال کے لئے شرط یہ ہے کہ منی ٹپک کر اور شہوت کے ساتھ نکلے' اگر ٹپک کر بغیر شہوت کے نکلے گی تو غسل فرض نہیں ہوگا مثلاً ایک آدمی بیمار ہے اور اس کی منی خارج ہوتی رہتی ہے۔

شیخ ابن الھمام کہتے ہیں کہ منی شہوت کے ساتھ ہی نکلتی ہے' ان کا یہ کہنا صحیح نہیں۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کی حدیث جس سے یہ استدلال کرتے ہیں اس میں مذی کا ذکر ہے۔ ایک آدمی اپنی بیوی سے کھیلتا ہے' اس مرد کی شرمگاہ پر کوئی چیز ظاہر ہو جاتی ہے تو وہ اپنے خصیتین اور آلۂ تناسل کو دھو دے' وضو کرے اور غسل نہ کرے۔

رہی ودی تو یہ ایک رکیک سا مادہ ہے جو پیشاب کے بعد آتا ہے۔ اس صورت میں اپنے آلۂ تناسل اور خصیتین کو دھولے' وضو کرے اور غسل نہ کرے۔ رہا منی کا مسئلہ تو یہ کافی سا رکیک پانی ہے جس سے شہوت جاتی رہتی

ہے۔ اس کے نکلنے سے غسل فرض ہو جاتا ہے۔ شاید منی سے مراد یہی زیادہ پانی ہو جو درحقیقت مذی اور ودی کی طرح رکیک سا ہوتا ہے اور شہوت کے ساتھ نکلتا ہے۔ منی کے خارج ہونے سے غسل فرض ہو جائے گا جبکہ وہ شہوت کے ساتھ نکلے ورنہ یہ زیادہ پانی بیماری کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں شہوت نہیں ہو گی' یہ بلاشبہ بیماری ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں منی اگرچہ شہوت کے بغیر بھی نکلے تب بھی غسل واجب ہو جاتا ہے۔ ان کی دلیل مسلم شریف کی حدیث ہے۔

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الماء من الماء.

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: پانی نکلنے پر غسل فرض ہو جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ الماء میں الف لام عہدی ہے یعنی ماء معہود۔ ایسا پانی جو شہوت کے ساتھ نکلتا ہے کیونکہ منی اکثر شہوت کے ساتھ ہی نکلتی ہے۔ رہا بلاشہوت نکلنا تو وہ غیر معہود ہے۔ وہ مرض کا نتیجہ ہوتا ہے۔

احناف کے دلائل

ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غسل کو جنابت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور جنابت کہتے ہیں منی خارج کر کے شہوت کو پورا کرنا' جب تک جنابت نہیں ہو گی غسل فرض نہیں ہو گا پھر اس میں تو اتفاق ہے کہ منی خارج ہونے کے بعد غسل فرض ہو گا لیکن شرط یہ ہے کہ جب اپنی جگہ سے جدا ہو' ٹپک کر نکلے یا نہ نکلے۔ یہ رائے امام ابوحنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمہ کی ہے کیونکہ بقول ان کے کہ اس پر جنابت کا اطلاق ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ اپنی جگہ سے جدا ہونا اور باہر آنا ضروری ہے اسی صورت میں غسل فرض ہو گا کیونکہ غسل کا تعلق منی کے خارج ہونے سے ہے۔ سو اس وقت شہوت کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں اس میں یہ بات ہے کہ غسل کا تعلق منی کے نکلنے سے ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس منی کے نکلتے وقت شہوت نہ ہو اس پر لفظ جنابت صادق ہی نہ آئے بلکہ جب وہ اپنے مقر سے شہوت کے ساتھ جدا ہو گی تو اسے جنابت کہیں گے۔ اس اختلاف سے جو فروعات سامنے آئیں گی وہ یہ ہیں کہ اگر کسی کو احتلام ہوا یا کسی نے فرج کے علاوہ جماع کیا اور منی شہوت کے ساتھ ٹپک کر نکلی پھر بیدار ہوا اور آلۂ تناسل کے سر کو زور سے پکڑ لیا اس وقت منی خارج نہ ہوئی لیکن کچھ دیر کے بعد بغیر شہوت کے بغیر ٹپکے منی نکلی امام ابوحنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمہ کے نزدیک غسل فرض ہو جائے گا مگر امام یوسف کے نزدیک غسل فرض نہیں ہو گا۔
اسی طرح اگر جماع کیا یا احتلام ہوا اور پیشاب نہیں کیا پھر شہوت کے بغیر منی کے قطرے نکلے امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک غسل فرض ہو جائے گا مگر امام یوسف کے نزدیک نہیں۔

اگر پیشاب کیا پھر غسل کیا اس کے بعد بغیر شہوت کے منی نکلی تو غسل واجب نہیں ہو گا کیونکہ یہ منی ٹپک کر نہیں نکلی اور یہ احتلام اور جماع کی وجہ سے نہیں۔ اگر جماع یا احتلام کا نتیجہ ہوتی تو پیشاب کے ساتھ نکل جاتی مگر اس کے برعکس جب بغیر پیشاب کیے غسل کر لیا تو گمان یہ ہے کہ جماع یا احتلام کی منی کا بقیہ حصہ ہے جو رکا ہوا تھا۔ اگر

ایسی صورت میں غسل کر کے نماز پڑھے گا اور نماز کے بعد منی خارج ہو گی تو اس پر نماز کا اعادہ ضروری نہیں کیونکہ اس پر نماز پڑھنے کے بعد غسل واجب ہوا ہے۔ اس طرح جب منی اپنی جگہ سے بغیر شہوت کے خارج ہوئی تو نماز کا اعادہ واجب نہیں ہے اور طرفین (امام ابوحنیفہ اور امام محمد) کے نزدیک منی کے خارج ہوتے ہی غسل فرض ہو جائے گا۔

۲-دخول

جن چیزوں سے غسل فرض ہو جاتا ہے ان میں سے آلۂ تناسل کے سر کا فرج (عورت کی شرم گاہ) یا دبر (انسان کے پاخانے کی جگہ) میں داخل ہونا ہے انزال ہو یا نہ ہو جونہی سر داخل ہو گا، غسل فرض ہو جائے گا۔ اس کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا جلس بين شعبها الاربع ثم جهدها فقد وجب عليه الغسل انزل اولم ينزل. (رواہ البخاری)

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: جب مرد عورت کے چار زانوں کے درمیان بیٹھے اور پھر اس سے جماع کی کوشش کرے تو اس پر غسل کرنا واجب ہے، انزال ہو یا نہ ہو۔

حدیث الماء من الماء ظاہراً اس سے معارض ہے۔

محی السنہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حدیث الماء من الماء منسوخ ہے یہ جواب صحیح ہے۔ امام ترمذی اور امام ابوداؤد حضرت ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں اگرچہ اس کی رخصت تھی مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اس سے ساری حدیث کا نسخ لازم نہیں آتا بلکہ بعض افراد کا نسخ لازم آتا ہے کیونکہ بعض دفعہ پانی نکلنے سے غسل فرض ہو جاتا ہے مثلاً مذی سے غسل فرض نہیں ہوتا اگر ختنین ملیں تو غسل فرض ہو جاتا ہے تو گویا عام کے بعض افراد منسوخ نہیں ہوئے۔ احتلام سے بھی غسل فرض ہو جاتا ہے اور ابن عباس کی حدیث الماء من الماء اسی مفہوم کو بیان کرتی ہے لیکن اسے احتلام کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ سبق کی تخصیص صحیح نہیں؟

حدیث مبارک ہے:

عن ابى سعيد قال خرجت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الاثنين الى بناء حتى اذا كنا فى بنى سالم وقف رسول الله صلى الله عليه وسلم على باب عتبان فصرخ به فخرج يجر ازاره فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اعجلنا الرجل فقال عتبان ارايت الرجل يعجل عن امرأته ولم يمن ماذا عليه قال قال رسول الله صلى

حضرت ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلا، سوموار کا دن تھا۔ ہم بناء کی طرف جا رہے تھے جب بنو سالم پہنچے تو آپ عتبان کے دروازے پر رک گئے انہیں آواز دی وہ تہبند گھسیٹتے باہر نکلے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے اس شخص کو جلدی میں ڈالا۔ عتبان نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جب مرد اپنی بیوی سے جدا ہوتا ہے تو اسے کوئی پتہ نہیں چلتا کہ اس پر غسل فرض ہے کہ نہیں۔ آپ

الله علیه وسلم انما الماء من الماء. صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ منی کا خروج ہوگا تو غسل فرض ہوگا۔

نسخ کا قول واقع ہی صحیح ہے اور ہم اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن محی السنۃ پر اعتراض ہوتا ہے کہ شوافع کے نزدیک جب خاص اور عام میں تعارض آ جائے تو عام کے ساتھ خاص کا نسخ نہیں ہوتا اور عام بلکہ خاص کا منسوخ ہونا دونوں حالتوں میں تخصص ہے جیسا کہ علماء نے اپنی اصول کی کتابوں میں بیان فرمایا ہے۔ سو یہاں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث الماء من الماء کی ناسخ نہیں بن سکتی کیونکہ یہ عام وخاص کا تعارض ہے بلکہ یہ شوافع کے اصولوں کے مطابق اس کی تخصص ہوگی نہ کہ ناسخ۔

۳۔ احتلام

غسل فرض ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آدمی جب بیدار ہو تو اپنے کپڑوں پر تری پائے اور اسے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ یہ منی ہے یا ودی خواہ احتلام یاد ہو یا نہ ہو طرفین کے نزدیک غسل فرض ہوگا۔ جبکہ امام ابو یوسف کے نزدیک غسل فرض نہیں ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک منی کا احتمال ہے اگر اسے یاد ہے کہ احتلام ہوا ہے مگر تری نہیں تو بھی غسل فرض نہیں ہوگا۔ طرفین کی دلیل امام ترمذی اور ابوداؤد کی حدیث ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة الصديقة قالت سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الرجل يجد البلل ولا يذكر احتلاما قال يغسل وعن الرجل الذى يرى انه قد احتلم ولا يجد بللا قال لا غسل عليه قالت ام سليم هل على المرأة ترى ذلك الغسل قال ان النساء شقايق الرجال.

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا۔ ایک آدمی کپڑوں پر تری پاتا ہے مگر اسے یاد نہیں کہ احتلام ہوا ہے یا نہیں تو آپ نے فرمایا کہ وہ غسل کرے۔ اسی طرح آپ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی تری نہیں پاتا لیکن اسے یاد ہے کہ اسے احتلام ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس پر غسل فرض ہے۔ حضرت ام سلیم نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ کیا عورت پر بھی غسل جنابت فرض ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عورتیں مردوں کی طرح ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب آدمی بیدار ہو اور تری پائے تو اس پر غسل فرض ہے کیونکہ نیند میں آدمی غافل ہو جاتا ہے اور فضلات کو دور کرنے کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اس طرح ذکر میں سختی آ جاتی ہے۔ وہ جماع کی خواہش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کوئی خواب دیکھتا ہے اور شہوت کے ساتھ منی خارج ہو جاتی ہے مگر جاگتے ہوئے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اس لئے سو کر اٹھنے کے بعد کپڑوں پر تری سے غالب گمان یہ ہے کہ احتلام ہوا ہے اور یہ گیلا پن منی کی وجہ سے ہے۔ اگر تری رقیق ہے جس طرح کہ مذی ہوتی ہے تو اس کی وجہ بدنی حرارت بھی ہو سکتی ہے لیکن غسل پھر بھی فرض ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ رقیق پانی شہوت کے ساتھ نکلا ہو۔

میاں بیوی ایک چارپائی پر اکٹھے سوئے' بیدار ہوئے تو بستر پر تری تھی۔ اگر اس کا رنگ سفید ہے تو مرد غسل کرے اگر رنگ زرد ہے تو عورت غسل کرے۔ اگر رنگت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تو دونوں غسل کریں' اسی میں احتیاط

ہے۔

پانی اور اس کی اقسام

پانی کے بارے میں بنیادی آیہ کریمہ جس سے اس کا حکم سامنے آتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ یہ ہے:

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا. (المائدہ:٦) اگر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کر کے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہاں پانی مطلق ہے اس میں کسی قسم کی قید نہیں لہٰذا پانی سے خواہ وہ کیسے ہی ہو طہارت جائز ہوگی۔ بارش کا ہو' ندی نالوں کا ہو' سیلاب کا ہو' حوض یا کنویں کا ہو کیونکہ یہ سب مطلق پانی ہیں۔

پھلوں کے رس سے وضو کرنا

وہ پانی جو انگور کے درخت یا کسی اور پھل یا درخت سے خود بخود نچڑے اس کے بارے اختلاف ہے۔ صاحب ہدایہ ایسے پانی کے ساتھ وضو جائز قرار دیتے ہیں۔ کافی اور فتاویٰ قاضی خان میں اسے ناجائز بتایا گیا ہے بقول ان کے رس پانی نہیں ہے بلکہ پانی کی مثل ہے اور اسی وجہ سے اس کے لئے مجازاً پانی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ البحر الرائق میں اسی کو قرین قیاس بتایا گیا ہے۔ ابراہیم حلبی کی کتاب منیۃ المصلی کی شرح سے نقل کیا گیا ہے کہ یہی محتاط رائے ہے لہٰذا فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں رس سے وضو جائز نہیں۔

عرقیات سے وضو درست نہیں

عرق گلاب اور دوسرے تمام عرقیات سے طہارت حاصل نہیں ہو سکتی مثلاً عرق بادیان' عرق کاسنی' عرق بید مشک اور اس قسم کے دوسرے عرقیات سے وضو اور غسل نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ پانی نہیں۔ اگر ان پر پانی کا اطلاق ہوتا بھی ہے تو مجازاً اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے اور کسی کا اختلاف ہے تو میرے علم میں نہیں۔

پھلوں سے جو پانی نچوڑا جاتا ہے یا انہیں کاٹنے کے بعد جو پانی خود بخود نچڑتا ہے' اس سے بھی وضو جائز نہیں۔ اس طرح گنے کا رس عام مائعات اور نمک کے پانی سے طہارت حاصل نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان پر پانی کا لفظ صادق نہیں آتا' اگر اطلاق ہوتا بھی ہے تو مجازاً۔

اگر پانی میں زعفران' ریتا یا چونا جیسی کوئی چیز مل جائے اور پانی پر اس طرح غالب آجائے کہ اس کی رقت اور سیلان ہی ختم ہو جائے تو اس سے وضو جائز نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صرف اسی پانی سے وضو جائز ہے جس میں مٹی ملی ہو۔ اگر کوئی اور ٹھوس چیز ملی ہو تو وضو جائز نہیں ہوگا۔ اسی اختلاف کی بناء پر جس پانی میں بہت زیادہ پتے پڑے ہوں امام شافعی کے

نزدیک اس سے وضو جائز نہیں کیونکہ اب وہ ماء مطلق نہیں جیسے ہم کہتے ہیں زعفران کا پانی تو زعفران کی قید لگ جاتی ہے اسی طرح یہ بھی ماء مطلق نہ رہا لیکن جس پانی میں پتے پڑے ہوں وہ پانی ہے' اس سے وضو جائز ہے مثلاً ایک شخص ایسا پانی پاتا ہے جس میں پتے پڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اس کی رنگت تبدیل ہو چکی ہے تو وہ اس پانی کو پانی ہی کا نام دے گا نہ کہ کوئی اور نام لہٰذا یہ بھی ماء مطلق ہوا' فتح القدیر نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ ہماری دلیل نسائی کی روایت کردہ حدیث ہے۔

عن ام هانی اغتسل رسول الله صلی الله علیه وسلم هو ومیمونة فی قصعة فیها اثر العجین.

حضرت ام ہانی روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک بڑے برتن میں غسل کیا جس میں آٹے کا اثر تھا۔

ظاہر ہے آٹا بہت کم ہوگا اور پانی کا سیلان باقی ہوگا اور غسل جنابت زائل کرنے کے لئے کیا گیا حالانکہ پانی مخلوط تھا مگر چونکہ اس پر اطلاق پانی کا ہوتا تھا اس لیے اسے طہارت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ صاحب ہدایہ کے بقول اگر پانی میں کوئی چیز مل جائے تو جب تک سیلان باقی ہے تو وہ پانی ہی شمار ہوگا۔ صاحب فتح القدیر نے اس قول کی نسبت امام ابو یوسف کی طرف کی ہے۔ امام محمد کے نزدیک جب تک پانی کی رنگت تبدیل نہیں ہوتی پانی غالب رہے گا اس اعتبار سے اختلاف صحیح ہے۔ اگر ٹھوس چیز پانی پر اس طرح غالب آ جاتی ہے کہ رقت ہی ختم ہو جاتی ہے تو ٹھوس چیز کا غلبہ معتبر ہوگا۔

پانی میں کسی دوسری چیز کے غلبہ کی وجہ سے وضو کرنا درست نہیں

زعفران' چونے اور ریتے والے پانی کے ساتھ وضو جائز نہیں جبکہ ان سے بدن یا کپڑے پر رنگ لگ جاتا ہو کیونکہ یہ رنگ شمار ہوگا پانی نہیں۔

جب کسی چیز کے ملنے سے پانی میں اس قدر تبدیلی آ جائے کہ وہ میدہ بن جائے تو اب وہ مطلق پانی نہیں اور نہ ہی وہ مقید رہا ہے بلکہ اس پر کسی صورت پانی کا اطلاق ہو سکتا ہی نہیں لہٰذا اس سے طہارت نہیں ہو سکتی۔

اگر پانی میں کوئی دوسری مائع چیز مل جائے اور پانی پر غالب آ جائے تو اس سے طہارت صحیح نہیں اگر مغلوب رہے تو طہارت درست ہے۔ غلبہ کا اندازہ رنگ سے ہوگا بشرطیکہ وہ مائع رنگ دار ہو مثلاً پانی میں دودھ یا زعفران مل جاتا ہے۔ اگر پانی کی رنگت متاثر نہیں ہوتی تو اس سے وضو ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

اگر پانی کے ساتھ کوئی ایسی چیز ملتی ہے جس کا کوئی رنگ نہیں مثلاً عرق گلاب سفید انگور کا رس تو غلبے کا اندازہ ذائقہ سے لگایا جائے گا۔ اگر رنگ ذائقہ تبدیل نہیں ہوا تو وضو جائز ورنہ ناجائز۔

اگر مائع کا نہ ذائقہ ہے نہ رنگت مثلاً مستعمل پانی' تو غلبے کا اعتبار مقدار سے ہوگا۔ مستعمل پانی نسبتاً کم ہوا تو وضو جائز ورنہ ناجائز۔ فتح القدیر میں کنز کی کسی شرح کے حوالے سے یوں ہی مذکور ہے۔ کیا بو کا بھی اعتبار ہوگا؟ میں نے یہ بات کسی کتاب میں نہیں دیکھی۔

اگر مطلق پانی میں پھٹکری یا مازو ڈال دیا جائے اور وہ اتنا ہے کہ اس سے لکھا جائے تو نقش بیٹھ جاتا ہے ایسے پانی سے وضو جائز نہیں۔ اگر نقش نہیں بیٹھتا تو وضو جائز ہے۔ فتح القدیر کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ غلبے کا اعتبار اجزاء کے ذریعے ہوتا ہے۔ اسی اصول کے تحت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر پانی سیاہ ہو جائے تو اس سے وضو نہیں ہونا چاہئے۔

نبیذ کے ساتھ وضو جائز نہیں

نبیذ کسی بھی چیز کی ہو اس سے وضو جائز نہیں کیونکہ اس پر پانی کا لفظ صادق نہیں آتا۔ اگر برتن میں انگور کی نبیذ ہے اور پوچھنے پر جواب ملتا ہے کہ برتن میں پانی ہے تو وہ پانی ہی شمار ہوگا لیکن ناپسندیدہ چیز کی طرف سے منسوب ہونے کی وجہ سے اس سے بھی طہارت صحیح نہیں ہے۔ اگر دوسرا پانی نہ ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہر الروایۃ کے مطابق کھجور کی نبیذ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سفیان ثوری بھی یہی کہتے ہیں۔

انہی کی ایک دوسری روایت کے مطابق امام ابو یوسف' امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اس سے کسی صورت وضو صحیح نہیں۔ پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کیا جائے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بقول امام صاحب نے اس قول سے رجوع فرمالیا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبیذ پر پانی کا لفظ صادق نہیں آتا کیونکہ اگر کسی کے پاس نبیذ ہے تو کوئی بھی اسے پانی نہیں کہے گا لہٰذا وہ تیمم کرے۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ کھجور کی نبیذ کے ساتھ وضو صحیح ہے کیونکہ اس بارے حدیث موجود ہے جس کا تذکرہ آنے والی سطور میں ہوگا ہاں احتیاطاً تیمم بھی کر لینا چاہئے تاکہ طہارت یقینی ہو جائے۔ اگر کسی کے پاس مکروہ پانی بھی ہے اور کھجور کی نبیذ بھی تو بالاتفاق نبیذ سے وضو جائز نہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بھی یہی رائے ہے یہ رائے انہوں نے امام طحاوی کے حوالے سے نقل کی ہے۔

کھجور کی نبیذ سے وضو کرنا کیسا ہے؟

کیا کھجور کی نبیذ سے غسل ہو سکتا ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ ایک قول جواز کا ہے اور اس کی دلیل حضرت ابن عباس کی یہ روایت ہے۔ فرماتے ہیں: کھجور کی نبیذ کے ساتھ وضو صرف وہی کر سکتا ہے جس کے پاس پانی نہ ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں: تمام جوامع میں یہ حدیث دارقطنی سے روایت کی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی مشہور حدیث جس سے عموماً استدلال کیا جاتا ہے ابوزید سے مروی ہے۔

عن عبد اللہ بن مسعود ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ لیلۃ الجن ما فی اداوتک قال قلت نبیذ قال تمرۃ طیبۃ وماء طھور فتوضا منہ.

عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس رات جنوں کو تبلیغ فرمائی تھی مجھے فرمایا تھا تیرے برتن میں کیا ہے؟ میں نے عرض کیا نبیذ۔ آپ نے فرمایا یہ پاک کھجور اور پاک پانی ہے پھر اسی کے

ساتھ وضو فرمایا۔ (رواہ احمد و ترمذی و ابوداؤد والی ماء طہور)

جرح

امام ترمذی کے بقول ابوزید مجہول ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ اسے امام بخاری نے ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ حاکم بھی اسے مجہول گردانتے ہیں اور علماء کہتے ہیں کہ ابوزید سے روایت کرنے والا راوی ابوفرازہ بھی مجہول ہے۔

شیخ ابن الھمام ابوزید کا دفاع کرتے ہیں' فرماتے ہیں کہ قاضی ابوبکر بن عربی نے شرح جامع ترمذی میں فرمایا ہے کہ ابوزید عمر بن حریث کے غلام ہیں اور ان سے راشد بن کیسان کوفی اور ابووفاء نے روایت کیا ہے۔ اس لئے ابوزید مجہول نہ ہوئے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ ابوفرازہ جس نے ابوزید سے روایت کیا ہے وہ بھی مجہول نہیں کیونکہ شیخ تقی الدین نے ان کے مجہول ہونے کو محل نظر لکھا ہے۔ بقول ان کے اس حدیث کو ابوفرازہ سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ مثلاً سفیان' شریک' خراج بن ملیح اور قیس بن ربیع۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ ابوفرازہ جو اس حدیث کے راوی ہیں مجہول نہیں۔ ان کا نام راشد بن کیسان ہے۔ الکاشف میں ہے کہ راشد بن کیسان الکوفی العبسی نے انس' ابن ابی لیلیٰ سے احادیث روایت کیں اور ان سے سفیان اور حماد جیسے ثقہ راویوں نے احادیث روایت کیں لہٰذا نہ ابوزید مجہول رہا اور نہ ہی ابوفرازہ اور اس بناء پر حدیث مبارکہ صحیح قرار پائی۔

المصابیح میں ہے کہ اس ضمن میں بطور اعتراض ایک صحیح حدیث پیش کی جاسکتی ہے جسے علقمہ سے لیا گیا ہے۔

عن علقمة عن عبد الله بن مسعود انه قال لم اكن ليلة الجن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم .

حضرت علقمہ نے اسے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس رات حضور علیہ السلام نے جنات کو تبلیغ کی میں آپ کے ساتھ نہیں تھا۔

جب ابن مسعود خود انکار کررہے ہیں تو پھر مذکورہ حدیث جسے ابوزید نے روایت کیا ہے' کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات طرق کثیرہ سے ثابت ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس رات ساتھ تھے اور حضور علیہ السلام نے ان کے گرد دائرہ لگا کر فرمایا تھا کہ یہاں سے باہر نہیں آنا۔ یہ واقعہ کتب احادیث اور کتب سیر میں بالتفصیل مذکور ہے۔ مثلاً ابونعیم نے اسے حلیہ میں بیان کیا ہے۔ ہاں ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام سے دور اس کھینچے گئے دائرہ میں تھے۔ آپ اس جگہ واقعی حاضر نہیں تھے جہاں حضور نے جنات سے بات چیت کی اور فریضہ تبلیغ ادا فرمایا۔

حضرت ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ ابن شاہین کی بھی یہی رائے ہے اور صاحب فتح القدیر بھی اسی بات کو ذکر کرتے ہیں۔

جنوں سے گفتگو صرف ایک رات نہیں ہوئی بلکہ متعدد بار حضور علیہ السلام انہیں اسلام کی تبلیغ اور تعلیم کی غرض سے تشریف لے گئے اور جنات آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے۔ ممکن ہے جس رات کا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ انکار کررہے ہیں وہ کوئی اور رات ہو اور جس واقع کو ابوزید حضرت ابن مسعود کے حوالے سے بیان

کر رہے ہیں وہ کسی اور رات سے تعلق رکھتا ہو لہٰذا علقمہ کی روایت اور اس روایت میں کوئی منافات نہیں۔ اب یقیناً آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ حدیث شک و شبہ سے بالاتر ہے اور اس کی سند میں کلام کی وہی نوعیت ہے جو بخاری کی بعض اسناد پر کلام کی ہے لہٰذا اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

اعتراض: شافعی اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جنوں والی رات کا تعلق مکی دور سے ہے اور آیت تیمّم مدنی لہٰذا آیت تیمّم اس حدیث کے لئے نسخ کا حکم رکھتی ہے۔

جواب: اس جواب کی کوئی حیثیت نہیں۔ حدیث میں نبیذ کو پانی کہا گیا ہے لہٰذا آپ ﷺ نے پانی کے ساتھ وضو کیا نہ کہ کسی اور چیز کے ساتھ۔ جب یہ حدیث آیت تیمّم کے معارض ہی نہیں تو نسخ چہ معنیٰ دارد اور پھر تیمّم تو پانی نہ ہونے کی صورت میں روا رکھا گیا ہے۔ مذکورہ واقع میں نبیذ کی صورت میں پانی تھا۔ سو اب بھی اگر یہ صورت پیش آ گئی تو نبیذ سے وضو ہو گا کیونکہ نبیذ پانی ہی ہے۔ یہ میری رائے ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب**۔

ہدایہ شریف میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ شبہائے جن متعدد ہیں۔ بقول شیخ ابن الھمام چھ رات آپ نے جنات سے کلام فرمایا۔ ایک بار جنت البقیع میں اس موقع پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر تھے دو دفعہ مکہ شریف میں۔ ایک دفعہ مدینہ طیبہ سے باہر۔ جس میں حضرت زبیر بن العوام حاضر تھے۔ (تین واقعات ان کے علاوہ ہیں) ایسی صورت حال میں نسخ لازم نہیں آتا۔ حدیث اور آیت میں اگر تعارض کا اعتراف کر لیا جائے تو پھر اتنی گفتگو کافی نہیں ہو گی کیونکہ ابن مسعود والے واقعہ سے پہلے اگر آیت تیمّم نازل ہو چکی ہوتی تو حضور تیمّم کرتے کیونکہ حدیث خبر واحد ہے جس سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں۔ رہا حدیث کے ساتھ آیت کا نسخ تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ حدیث کتاب اللہ کے عام حکم کے لئے مخصص نہیں بن سکتی۔ اس حدیث پر عمل ممتنع ٹھہرتا ہے۔

صاحب ہدایہ کا یہ کہنا کہ خبر مشہور کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے تو اس بارے گزارش ہے کہ اگرچہ جنوں والا واقعہ تو مشہور ہے بلکہ ہو سکتا ہے متواتر ہو لیکن آپ نے نبیذ کے ساتھ وضو کیا' یہ مشہور نہیں بلکہ اس کی صحت میں کلام ہے۔ حدیث کے بارے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں جو محض تکلف ہیں۔ صحیح وہی ہے جسے ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ حقیقت حال سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے۔

پلید پانی سے وضو جائز نہیں

جو پانی حقیقی نجاست کے لئے استعمال کیا گیا ہو امام مالک اور احناف کے نزدیک نجس ہے کیونکہ تھوڑے پانی میں جب نجاست مل جائے تو پانی پلید ہو جاتا ہے۔

اعتراض: امام شافعی فرماتے ہیں کہ وہ پانی پلید نہیں۔ ہاں اگر اس کا کوئی وصف تبدیل ہو گیا ہے تو پھر نجس شمار ہو گا کیونکہ جس پانی کے ساتھ نجاست دور کی گئی اگر وہ پاک نہ ہو تو اس سے طہارت بالکل حاصل ہی نہیں ہو گی کیونکہ گندے کپڑے کے ساتھ لگ کر پانی پلید ہو گیا' اب اس پلید پانی کو کپڑے سے زائل کرنا ضروری ہے۔

جواب: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ضرورت کے تحت جب تک پانی کپڑے سے جدا نہیں ہوا وہ پاک ہے۔ شریعت اسے حصول طہارت کے لئے پاک کرنے کی صلاحیت سے متصف سمجھتی ہے۔ سو

اس کی پاکیزگی بقدر ضرورت ہے لہٰذا جونہی کپڑے سے الگ ہوگا اسے پلید شمار کریں گے۔

مستعمل پانی

وضو اور غسل کے لئے استعمال شدہ پانی ناپاک نہیں کیونکہ وہ مستعمل ہی نہیں۔ مستعمل تب شمار ہوگا جب وضو یا غسل حصول ثواب کے لئے کیا جائے گا۔ یہ رائے امام محمد علیہ الرحمہ کی ہے۔ اگر نیت طہارت کی ہو تو غسل یا وضو کا پانی مستعمل شمار نہیں ہوگا۔ اگرچہ حدث زائل ہو جائے اور طہارت حاصل ہو جائے گی جو نماز کو مباح کر دے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پانی قربت کی نیت سے استعمال کیا جاتا ہے تو انسان کے گناہ دھلتے ہیں۔ گویا یہ پانی گناہوں کو اٹھانے والا ہے۔

بخاری اور مسلم میں موجود ہے کہ:

عن امیر المؤمنین عثمان رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من توضأ فاحسن الوضوء خرجت خطایاه من جسده حتی یخرج من تحت اظفاره.

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اچھی طرح وضو کیا اس کے جسم کے سب گناہ دھل گئے حتیٰ کہ ناخنوں کے نیچے کے گناہ بھی باقی نہ رہے۔

امام زفر فرماتے ہیں کہ پانی صرف اس وقت مستعمل ہوگا جب اس سے حدث دور ہوگا کیونکہ ایسے پانی میں حدث کی ناپاکی سرایت کر جاتی ہے لیکن وضو پر وضو میں استعمال ہونے والا پانی مستعمل نہیں ہوتا کیونکہ پاک پانی پاک عضو کے ساتھ ملتا ہے۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمتہ کے نزدیک پانی قربت کے لئے استعمال ہو یا نجاست زائل کرنے کے لئے، دونوں صورتوں میں مستعمل ہوگا کیونکہ جب قربت کے لئے استعمال ہوگا تو گناہوں کی ناپاکی سے مل جائے گا اور نجاست کو زائل کرنے کے لئے استعمال ہوگا تو اس میں نجاست مل جائے گی۔

پانی جب جسم سے الگ ہوگا تب اس پر مستعمل کا حکم لگے گا جب تک جسم پر ہے پاک ہے کیونکہ جسم سے جدا ہونے سے قبل اگر اسے ناپاک شمار کریں تو جسم پاک ہی نہیں ہوگا۔ امام محمد علیہ الرحمتہ کے قول کے مطابق جب پانی جسم سے جدا ہو کر کسی جگہ ٹھہر جائے گا تب مستعمل شمار ہوگا، اس سے پہلے نہیں۔

اگر جنبی شخص نے غسل کیا اور جسم کا تھوڑا سا حصہ خشک دیکھ کر جسم کے کسی حصے سے پانی لے کر خشک جگہ کو تر کر لیا تو بالاتفاق اس کا غسل صحیح ہوگا کیونکہ غسل کے معاملے میں پورا جسم حکماً ایک عضو شمار ہوتا ہے لیکن وضو میں یہ چیز صحیح نہیں کیونکہ وضو میں ہر عضو ایک مستقل عضو کی حیثیت سے دھویا جاتا ہے۔

اگر جنبی اور بے وضو شخص پانی لینے کی نیت سے کسی برتن میں ہاتھ ڈال دے تو پانی مستعمل نہیں ہوگا۔ اگر نیت طہارت کی تھی تو پانی مستعمل بن جائے گا۔ اگر پانی لینے کی نیت سے ہاتھ کہنیوں تک ڈبو دے تو پھر پانی مستعمل ہو جائے گا کیونکہ پانی لینے کے لئے ہاتھ کو کہنیوں تک ڈبونا ضروری نہیں۔ ہاں برتن ٹب وغیرہ میں گر جائے اور اسے نکالنے کے لئے پانی میں ہاتھ کہنیوں تک ڈبونا پڑے تو حرج نہیں، پانی مستعمل نہیں ہوگا کیونکہ نیت طہارت کی نہیں

بلکہ برتن نکالنے کی ہے۔ استعمال شدہ پانی سے طہارت حاصل نہیں ہوتی' سو اس سے نہ تو غسل صحیح ہے اور نہ ہی وضو کیونکہ اس میں گناہ اور ناپاکی ملی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ پانی پلید ہے اور پلید کسی دوسری پلید چیز کو پاک نہیں کر سکتا۔

امام محمد علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ یہ پانی بذات خود پاک ہے لیکن پاک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یعنی اگر استعمال شدہ پانی کسی کپڑے یا کسی عضو انسانی پر لگ جائے تو کپڑا یا عضو ناپاک نہیں ہوتے' اسی پر فتویٰ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے استعمال شدہ پانی کی طہارت میں کوئی شک نہیں۔ اس بابرکت پانی کو صحابہ کرام علیہم الرضوان زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے' وہ اس پر جھپٹ پڑتے اور ہاتھوں میں لے کر اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتے کیونکہ حضور ﷺ کا غسالہ پاک تھا۔ یہی نہیں بلکہ حضور ﷺ کا جسم اطہر پاک تھا اور جس چیز سے چھو جاتا تھا وہ چیز بھی پاک ہو جاتی تھی۔ جس پانی کو آپ استعمال فرماتے وہ کرامات و برکات سے بھر جاتا کیونکہ حضور انور ﷺ کا جسم اطہر محض پاکیزگی تھا۔ یہی نہیں آپ کا فضلہ اور پیشاب بھی پاک تھا۔ وہاں خطا اور گناہ کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

شیخین مستعمل پانی کو نجاست خفیفہ کو زائل کرنے والے پانی پر قیاس کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک استعمال شدہ پانی نجس ہے اس لئے نہیں کہ وہ نجاست کو زائل کرنے کی وجہ سے ناپاک ہو گیا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ شارع علیہ السلام نے نجاست کے ساتھ نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ اسی طرح وضو کے بغیر بھی نماز نہیں ہوتی۔ حدث کی صورت میں شارع علیہ السلام نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ اب جو پانی نجاست کو دور کرنے کے لئے استعمال ہوا وہ مستعمل شمار ہوا کیونکہ اس نے اس مانع کو دور کیا جس کے ساتھ نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ اسی طرح وضو نے حدث کو دور کیا جو نماز پڑھنے سے مانع ہے۔ تو جس طرح نجاست کو دور کرنے والا پانی مستعمل ہے اسی طرح حدث کو دور کرنے والا پانی بھی مستعمل ہے۔ اس سے طہارت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مقیس علیہ میں ناپاکی کا موجب نجاست ہے جس کے ہوتے ہوئے نماز نہیں ہوتی۔ سو نجاست سے مل کر پانی خود بھی مانع صلاۃ بن جاتا ہے مگر وضو اور غسل سے بچا ہوا پانی کسی ایسی چیز کے ساتھ نہیں ملتا جس کے ہوتے ہوئے نماز جائز نہ ہو بلکہ یہ پانی اس حکمی امر کو دور کرتا ہے جو مانع صلاۃ ہے۔

مستعمل پانی کون سی نجاست ہے' غلیظہ یا خفیفہ؟

اس بارے میں ائمہ اسلام علیہم الرضوان کی مختلف آراء ہیں۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک مستعمل پانی نجاست غلیظہ ہے کیونکہ اصل کا حکم ایسا ہی ہے اور امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک یہ پانی نجاست خفیفہ ہے کیونکہ اسے ضرورت کے تحت استعمال کیا گیا ہے۔

جنبی کے استعمال شدہ پانی کا حکم

جنبی آدمی ڈول نکالنے کے لئے کنویں میں اترا اور غوطہ لگایا تو اس کا جسم پاک ہو جائے گا اور پانی کی پاکیزگی میں بھی کوئی فرق نہیں آئے گا کیونکہ اس کا پورا جسم دھل گیا اور ازالۂ جنابت کے لئے نیت شرط نہیں۔ پانی اس لئے

پاک اور پاک کرنے والا رہے گا کہ اس کی نیت ڈول نکالنے کی تھی نہ کہ غسل کرنے کی۔ یہ رائے امام محمد کی ہے۔ مشائخ نے امام محمد کے قول پر ہی فتویٰ دیا ہے کیونکہ اس میں ضرورت کا خیال رکھا گیا ہے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں آدمی ویسا ہی جنبی رہے گا جیسے کنویں میں اترنے سے پہلے تھا کیونکہ ان کے نزدیک کھڑا پانی سر میں انڈیلنا شرط ہے اور پانی پاک رہے گا کیونکہ اس نے حدث کو زائل نہیں کیا۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک آدمی کا جسم اور کنویں کا پانی دونوں پلید ہیں' پانی اس لئے پلید ہو جائے گا کہ اس نے حدث کو زائل کیا اور آدمی کا جسم اس لئے پلید رہے گا کہ نجاست کی علت میں اختلاف ہے۔

ایک قول کے مطابق وہ جنبی رہے گا کیونکہ پانی اس کے کنویں میں اترتے ہی پلید ہو گیا اور اس سے نجاست زائل نہ ہوئی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا جسم پلید پانی سے ملنے کی وجہ سے پلید ہو گیا کیونکہ اس پانی سے نجاست الگ ہوئی۔ اس صورت میں اس کا قرآن پڑھنا جائز ہو گا کیونکہ اب وہ جنبی نہیں بلکہ جنابت پانی میں داخل ہوتے ہی زائل ہو گئی اور پانی پلید ہو گیا اور پلید پانی کے جسم میں موجود ہونے سے جسم پھر پلید ہو گیا۔

دونوں صورتیں محل نظر ہیں کیونکہ پانی صرف اس وقت مستعمل ہوتا ہے جب جسم سے الگ ہو لہٰذا جب تک وہ کنویں سے نکل نہیں آتا پانی مستعمل نہیں ہو گا۔ پانی میں رہنے کے باوجود اس کے جسم سے نجاست زائل نہیں ہوئی تو پانی پلید کیسے ہو گیا؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس آدمی کا جسم پاک نہیں ہوا کیونکہ اس نے کلی نہیں کی۔ اگر باہر نکل کر کلی کر لے تو جنبی نہیں رہے گا۔ اس بارے امام محمد کی رائے سے آگاہی ضروری ہے غالباً امام محمد نے ان سے اس سلسلہ میں اختلاف نہیں کیا۔

چلتا پانی

بہتا پانی پاک ہے' اس سے وضو کرنا' غسل کرنا' کپڑے دھونا سب جائز ہے۔ اگر اس میں نجاست گر بھی جائے تو وہ پلید نہیں ہوتا۔ اگر گندگی چلتے پانی کے تین اوصاف میں سے ایک وصف کو تبدیل کر دے تو نجس ہو جاتا ہے۔ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

جاری پانی کی حد میں اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق وہ چلتا پانی پاک ہے جس کو استعمال کریں تو بار بار وہی پانی استعمال نہ ہو۔ ایک قول کے مطابق جسے لوگ جاری کہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے یہی زیادہ مشابہ ہے کیونکہ اس کا اندازہ اس طرح نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جو پانی خس و خاشاک بہا لے جاتا ہو وہ جاری ہے۔ اسی پر فتویٰ ہے۔

بہتے پانی کے ساتھ صفیں بنا کر وضو کرنا جائز ہے۔ جہاں پیشاب کیا یا استنجاء کیا وہاں سے بھی وضو کیا جا سکتا ہے۔

کتا پانی کے اندر بیٹھا ہے اور پانی اس کے اوپر سے گزر کر آ رہا ہے۔ تو نیچے سے وضو کرنا جائز ہے جب تک کہ کوئی وصف تبدیل نہیں ہوتا' اسی پر فتویٰ ہے۔

اگر چھت پر غلاظت پڑی ہو بارش برسے اور پانی پرنالے کے ذریعے سے نیچے آئے تو وہ پانی پاک ہے۔ اگر ایسا پانی کپڑے پر لگے گا تو کپڑا ناپاک نہیں ہوگا۔ اگر اس سے کسی نے وضو کیا یا غسل کیا تو وضو اور غسل جائز ہوگا مگر جب اس کا ایک بھی وصف تبدیل ہو گیا۔ مثلاً رنگت میں تبدیلی پیدا ہوگئی تو پھر یہ پانی ناپاک ہے۔ اس سے طہارت جائز نہیں۔

چھت جس پر غلاظت ہے اور بارش برسنے سے وہ گیلی ہوگئی ہے۔ اگر اس پر کوئی کپڑا بچھا دیا گیا تو کپڑا ناپاک نہیں ہوگا۔ اگر چھت پر پانی کھڑا ہو گیا تو پھر کپڑا ناپاک ہو جائے گا کیونکہ بارش برس رہی تھی تو پانی چل رہا تھا۔ بارش تھم گئی تو پانی چھت پر کھڑا ہو گیا۔

چھوٹا حوض جس سے برتن کے ذریعے بار بار پانی لیا جاتا ہے اور دوسری طرف سے پانی آتا رہتا ہے تو یہ بہتے پانی کے حکم میں ہے۔

کھڑا پانی

تھوڑے پانی میں نجاست گر پڑی تو ناپاک ہو گیا۔ اس سے وضو اور غسل جائز نہیں اور نہ ہی اس سے کپڑے وغیرہ دھوئے جاسکتے ہیں۔ اس پر معتبر لوگوں کا اجماع ہے اور اصحاب ظواہر کا اختلاف کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ اس حدیث پاک سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ پانی پاک ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔

جمہور کے نزدیک اس سے مراد زیادہ پانی ہے۔ زیادہ پانی کی حد بندی میں اختلاف ہے۔ امام مالک کے نزدیک تھوڑے اور زیادہ پانی کے درمیان فیصلہ اوصاف میں تبدیلی ہے۔ اگر نجاست گرنے سے پانی کا ایک وصف تبدیل ہو گیا تو وہ تھوڑا پانی شمار ہوگا۔ اگر تین اوصاف میں سے ایک وصف بھی تبدیل نہیں ہوا تو زیادہ پانی شمار ہو گا۔ انہوں نے اوصاف کو پانی کے نجس ہونے میں مؤثر قرار دیا ہے اور عدم تغیر کو طہارت میں مؤثر ٹھہرایا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے۔

روی ابو سعید الخدری قال قیل انتوضأ من بئر بضاعة هو بئر یلقی فیه الحیض ولحوم الکلاب و النتن فقال الله طهور لاینجسه شیء. (رواہ احمد، ترمذی ونسائی)

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ اگر کوئی آدمی بضاعہ کے کنویں میں سے پانی لے کر وضو کرے حالانکہ اس میں حیض والے کپڑے دھوئے جاتے ہیں، کتوں کے گوشت اور گندے چیتھڑے پڑے ہوتے ہیں (تو اس کا کیا حکم ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرسکتی۔

جب تک کوئی وصف تبدیل نہ ہو پانی پاک ہوتا ہے

جس پانی کی رنگت، ذائقہ اور بو میں سے کوئی چیز تبدیل ہو جائے تو وہ بالا جماع ناپاک ہے۔

روی ابو امامة عنه صلی الله علیه وسلم الماء لاینجسه شیء الا ماغلب علی ریحه ولو نه وطعمه. (رواہ ابن ماجہ)

ابو امامہ حضور علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں: پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرسکتی سوائے ایسی چیز کے جو اس کی بو رنگت اور ذائقہ کو تبدیل کردے۔

دارقطنی کی روایت میں الا ما غلب کی جگہ الا ما غیر کے الفاظ ہیں۔ استثناء کے داخلِ حدیث ہونے میں محدثین نے کلام کیا ہے۔ صاحب فتح القدیر اس پر بحث کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث استثناء کے بغیر ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں۔

صاحب ہدایہ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بضاعہ کا کنواں گویا جاری پانی کی نہر تھی، اس سے باغوں کو پانی دیا جاتا تھا۔

طحاوی، واقدی سے روایت کرتے ہیں کہ بضاعہ کا کنواں باغوں کی طرف پانی کا راستہ تھا۔ فتح القدیر میں ہے کہ واقدی پر اعتماد کرنا چاہئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مرسل ہمارے لئے حجت ہے اور ہمارے مدمقابل کے لئے اس کا راوی غیر ثقہ ہے لہٰذا اس کی مرسل حدیث قابلِ قبول نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دو بڑے مٹکوں کے برابر پانی زیادہ ہے۔ وہ اس وقت تک ناپاک نہیں ہوگا جب تک اس کا کوئی وصف تبدیل نہیں ہوگا اور جو اس سے کم ہو وہ قلیل ہے۔ امام حجۃ الاسلام کے نزدیک پانچ رطل پانی یعنی عراق کے رطل کے برابر پانی ہو تو زیادہ ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عراقی رطل ایک سو اٹھائیس درہم کے برابر ہوتا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول قبول کیا جائے گا، ہاں اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نجاست پیشاب اور رقیق پاخانے کی مانند غیر مائع ہو۔ ان کی دلیل ابن عمر کی روایت کردہ حدیث ہے:

سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم عن الماء یکون فی الفلاة وماینوبه من الدواب والسباع فقال اذا کان قلتین لم یحتمل الخبث. (رواہ احمد، ابوداؤد، ترمذی ونسائی)

رسولِ خدا علیہ السلام سے بیابان کے پانی کے بارے پوچھا گیا جس سے چوپائے اور درندے پیتے ہیں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: اگر وہ دو بڑے مٹکوں کے برابر ہے تو وہ پلیدی کو نہیں اٹھا سکتا۔

صاحب ہدایہ اس حدیث کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ پانی چونکہ تھوڑا ہے اس لئے تھوڑا ہونے کی وجہ سے نجاست گرنے سے نجس ہو جائے گا لیکن ابوداؤد علیہ الرحمہ کی روایت کے الفاظ اس تاویل کی تردید کرتے ہیں کیونکہ ان کی روایت میں ''ناپاک نہیں ہوتا'' کے الفاظ ہیں پھر مذکورہ تاویل میں ایک اور خلل بھی ہے کہ اگر پانی دو مشکیزوں سے زیادہ ہو تو وہ نجاست اٹھانے سے کمزور نہیں لہٰذا نجس نہیں ہوگا، تو یہ مفہوم کسی کے مذہب کے مطابق نہیں۔ اگر اس کا یہ مفہوم نہ لیا جائے تو پھر زیادہ کا مفہوم واضح نہیں ہوتا کیونکہ سوال تو زائد کے بارے تھا۔

حدیث پر جرح

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے اس حدیث پر کلام کیا ہے۔ سفر السعادت میں ہے کہ کئی علماء حدیث

نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور کئی نے ضعیف اور کئی علماء کہتے ہیں کہ اس میں اضطراب ہے۔ شیخ ابن الھمام نے ثابت کیا ہے کہ اس حدیث کے متن میں اضطراب ہے۔ بعض روایات میں دو مٹکوں کا ذکر ہے' بعض میں دو یا تین کے الفاظ ہیں' بعض روایات میں چالیس مٹکوں کا بیان ہے اس کے علاوہ ایسی روایات بھی ہیں جن میں چالیس ڈول کی مقدار مذکور ہے۔ اس اضطراب کی وجہ سے حدیث حجت کے درجہ سے گر جاتی ہے۔ شیخ ابن الھمام یہ بھی فرماتے ہیں کہ لفظ قلتین کا معنی بھی متعین نہیں۔ قلہ کا معنی گھڑا بھی ہے' کسی چیز کا سرا بھی ہے' پہاڑ کی چوٹی بھی ہے' چھوٹا کوزہ بھی ہے۔ جب مراد یہ متعین نہ ہو تو حدیث پر عمل بھی نہیں ہوگا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے مسلم بن خالد زنجی نے خبر دی' انہوں نے ابن جریج سے ایک ایسی سند سے روایت بیان کی جو مجھے یاد نہیں رہی کہ:

انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا کان الماء قلتین لم یحمل خبثا.	نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب پانی دو مٹکے ہوتو وہ ناپاکی کونہیں اٹھا سکتا۔

اس کی سند میں ایک راوی بقلال ہجر ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں: میں نے بقلال ہجر کو دیکھا ہے۔

قلہ میں دو چھوٹی مشکیں یا دو چھوٹی مشکوں سے کچھ زائد پانی سما سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احتیاط اس میں ہے کہ اڑھائی مشکیں ہو تو اسے زیادہ پانی شمار کیا جائے۔ اگر پانی پانچ مشکوں کے برابر ہو جیسی مشکیں حجاز مقدس میں استعمال ہوتی تھیں تو اس وقت تک پانی مستعمل نہیں ہوگا جب تک اس کا کوئی وصف نہ بدل جائے۔ ہم نے پانچ مشکوں کے اندازے کو بیان کیا ہے۔ شیخ ابن الھمام کہتے ہیں یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ اس کا ایک راوی مجہول ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ بقلال ہجر کا بیان کردہ متن محفوظ نہیں ہے۔ (یعنی اس پر اعتراض ہو سکتا ہے)۔ شیخ ابن الھمام مزید فرماتے ہیں جب حدیث پاک کے متن کی صورت حال یہ ہے تو لازم آتا ہے کہ اسے غیر صحیح قرار دیا جائے۔

ائمہ احناف کے نزدیک کثیر پانی کی مقدار

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دونوں شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک جب کنواں اتنا بڑا ہو کہ گندگی ایک طرف سے دوسری طرف نہ پہنچ سکتی ہو تو وہ پانی کثیر شمار ہوگا' ایسے پانی سے وضو کیا جا سکتا ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا شرب الکلب فی اناء احدکم فلیغسلہ سبع مرات.	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں کتا پی لے تو وہ اسے سات بار دھوئے۔

حدیث مبارکہ میں برتن عام ہے جس میں دو مٹکے پانی آجائے اور اس کے تین اوصاف میں سے کوئی وصف تبدیل نہ ہو۔

اگر آپ اعتراض کریں کہ امام مالک کے نزدیک کتے کا جھوٹا نجاست نہیں ہے۔ وہ برتن کو دھونے کا حکم اس لئے نہیں دیتے کہ کتے کا جھوٹا نجاست ہے بلکہ اس لئے دیتے ہیں کہ یہ امر تعبدی ہے لہٰذا اس بارے یہ حدیث حجت نہیں بن سکتی۔

میرے نزدیک اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ امام مسلم کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ۔

اناء احدكم اذا ولغ فيه الكلب يغسله سبع مرات اولهن بالتراب.

تم میں سے کسی شخص کے برتن میں اگر کتا منہ ڈال دے تو وہ سات بار دھونے سے پاک ہو جاتا ہے۔ پہلی بار اسے مٹی سے دھویا جائے۔

طہارت نجاست کی فرع ہے، نجاست کے بعد ہی طہارت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

جس حدیث میں مذکور ہے کہ بیدار ہونے کے بعد آدمی ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں ہاتھ نہ ڈالے، اسے بھی بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ اس حدیث کے بارے ہم بیان کر آئے ہیں کہ بیداری کے بعد برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ان کا دھونا فرض نہیں۔

ایک اور حدیث مبارکہ جسے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لايبولن احدكم فى الماء الدائم ثم يغتسل فيه.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے کہ پھر اس میں غسل کرے۔

(رواہ صحیح بخاری، صحیح مسلم)

شیخ ابن الھمام نے اس کا تعاقب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بالاتفاق اس حدیث کا حکم عام نہیں ہے بلکہ یہ کثیر پانی کے ساتھ خاص ہے اور ہر آدمی اپنے مذہب کے مطابق اس کو خاص کرتا ہے۔

ایک دلیل اجماع سکوتی بھی ہے کیونکہ ابن عباس (دارقطنی کی روایت کے مطابق) اور ابن زبیر (طحاوی کی روایت کے مطابق) نے زمزم کے پورے پانی کے نکالنے کا حکم دیا۔ ہوا یوں کہ ایک حبشی زمزم کے کنویں میں گر کر فوت ہو گیا۔ صحابہ کرام کا زمانہ تھا۔ مسئلہ پوچھا گیا تو فتویٰ یہ دیا گیا کہ تمام پانی نکالا جائے۔ اس فتوے پر تمام نے خاموشی اختیار کی۔ ظاہر ہے زمزم کا پانی دو مٹکوں سے زیادہ تھا اور حبشی کی موت سے اس کا کوئی وصف بھی تبدیل نہیں ہوا تھا۔

رہا یہ اعتراض کہ ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ میں ستر سال سے مکہ میں مقیم چلا آ رہا ہوں میں نے کسی چھوٹے یا بڑے کو نہیں دیکھا جو حبشی والے واقعہ کو جانتا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں سفر پر گئے ہوں۔ ابن عیینہ کی لاعلمی سے واقعہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کہ اسے عدول نے روایت کیا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں قلت اور کثرت کی مقدار کا ذکر نہیں اسی لئے احناف نے حسی دلائل کا سہارا لیا ہے اور اس کی تعیین فرمائی، ان کے نزدیک کثرت اور قلت کا

معیار یہ ہے کہ جس میں ایک طرف پڑی ہوئی گندگی دوسری طرف نہ پہنچ سکے وہ بڑا تالاب ہے اور جس میں ایک طرف پڑنے والی گندگی دوسری طرف پہنچ جائے وہ چھوٹا تالاب ہے' یہاں اتنی گفتگو مقصود تھی۔

مصنف علیہ الرحمہ کی وضاحت

میرے نزدیک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ حدیث ''پانی پاک ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' صحیح ہے اور بلاشبہ ثابت ہے۔ بضاعہ کے کنویں کا پانی چلتا تھا اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے' سبب کے خصوص کا نہیں ہوتا جیسا کہ اصول الفقہ کا قاعدہ ہے۔ قلتین (دو مٹکے) والی حدیث اس حدیث کو تسلیم کرنے کے بعد معارض نہیں رہتی کیونکہ عام کے کسی خاص فرد پر علیحدہ حکم لگا دینا اس کے عموم کی تخصیص صرف باعتبار مفہوم کرتا ہے اور مفہوم اگر اسے تسلیم کریں تو بھی ضعیف ہے منطوق کے معارض نہیں۔

کتے کے منہ ڈالنے والی حدیث ہم حنفیوں کے نزدیک معمول بہ نہیں۔ ہم برتن کو سات مرتبہ دھونا واجب نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے نزدیک یہ حکم اسلام کے ابتدائی دور سے ہے اور اتنا سخت حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ لوگ کتوں کو اپنے آپ سے دور رکھیں۔ پس اس مقصد کے لئے پانی کو نجس قرار دینا جائز ہونا چاہئے۔ پھر کتے مردار کھاتے ہیں' مردار کھا کر جب وہ فوراً پانی میں منہ ڈالے گا تو پانی کا ذائقہ ضرور بدلے گا اور یہ کہنا کہ کتے کے پانی میں منہ ڈالنے سے پانی کا کوئی وصف تبدیل نہیں ہوتا محل نظر ہے۔

اس تمام گفتگو کے بعد ہم (یعنی احناف) کہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کتے کے منہ ڈالنے والی حدیث اس حدیث کے بعض افراد کے معارض ہوگی لیکن باقی افراد جو معارض نہیں وہ عمومی طور پر قابل عمل ہوں گے۔ اب رہے وہ افراد جن کے ساتھ دوسری حدیث معارض ہے۔ تو ان میں ترجیح کا اصول اپنائیں گے جو راجح ہوگی اس پر عمل پیرا ہو جائیں گے۔ رہی بیداری والی حدیث تو وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس میں نہی کراہت کیلئے ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ سو کر اٹھنے کے بعد ہاتھ دھونے کا حکم دینا اور پانی میں نجاست ڈالنے سے حضور علیہ السلام کا منع فرمانا محض اس لئے تھا کہ پانی صاف ستھرا رہے۔ رہی وہ حدیث جس میں کھڑے پانی میں پیشاب کرنے اور اس میں غسل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ تو آپ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ وہ حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ اس سے پانی پلید ہو جاتا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ پانی صاف رہے اور جب کوئی اس پانی سے وضو کرے یا اس سے پانی لے کر غسل کرے تو اس کا بدن صاف ہو جائے۔ ان ارشادات کے وقت آپ کے پیش نظر خلق کریم تھا۔

رہا بعض علماء کا یہ کہنا کہ صحابۂ کرام کا اجماع ہے کہ آدمی اگر کنویں میں گر کر فوت ہو جائے تو اس کا پانی پلید ہے اور پورا پانی نکالنا واجب ہے۔ یہ ادّعٰی بالکل ساقط الاعتبار ہے کیونکہ پہلے تو یہ طے کر لیا جائے کہ تمام صحابہ اس واقعہ کے وقت موجود تھے اور ان کی موجودگی میں یہ فتویٰ دیا گیا تو یہ ممکن نہیں بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ موجود نہیں تھے۔ پھر زمزم کے سارے پانی کا نکالنا تقدس کے پیش نظر بھی ہو سکتا ہے۔ زمزم کا کنواں' بیت اللہ شریف اور مسجد حرام کو جو تقدس حاصل ہے محض اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ نجاست کی نیت سے پانی نکالنے کا فتویٰ دیا گیا ہو۔ حدیث میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ فتویٰ پانی کے نجس

ہونے کی وجہ سے دیا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تالاب کی حد بندی کے لئے ائمہ کرام کے اقوال

بڑے تالاب کی حد بندی کے بارے روایات مختلف ہیں۔ امام ابوحنیفہ سے روایت کردہ ایک ظاہر روایت یہ ہے کہ آپ نے اس کی کوئی حد بندی نہیں فرمائی بلکہ اسے ان لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جن کو یہ مسئلہ پیش آنا تھا جیسا کہ اس قسم کے مسائل میں آپ کی عادت مبارکہ تھی۔ وضو کرنے والا خود اندازہ کرے کہ کیا یہ پانی جس میں نجاست ہے وہ قلیل ہے یا کثیر اور اس سے وضو جائز ہے یا ناجائز۔ آپ سے روایت کردہ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ ایسا تالاب جس کے ایک کنارے کے پانی کو حرکت دینے سے دوسرا کنارہ حرکت نہ کرے وہ بڑا تالاب ہے۔ اگر اس میں نجاست پڑی ہے تو جس سمت نجاست نہیں وہاں سے وضو اور طہارت جائز ہے اور جس سمت نجاست ہے اس کنارے سے پانی لے کر طہارت کرنا صحیح نہیں۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جہاں نجاست پڑی ہے وہاں کا پانی پلید ہے۔ امام ابو یوسف روایت فرماتے ہیں کہ معتبر غسل کی حرکت ہے وضو کی نہیں یعنی اگر غسل کرنے سے دوسرے کنارے کا پانی حرکت نہیں کرتا تو یہ تالاب بڑا ہے ورنہ چھوٹا کیونکہ غسل سے پانی زیادہ حرکت کرتا ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ وضو کا اعتبار کرتے ہیں کیونکہ وضو درمیانی قسم کی حرکت پیدا کرتا ہے۔ اگر وضو اور غسل کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے پانی چاہئے تو کیسے پانی لیا جائے؟ تو اس کے لئے درمیانی حرکت معتبر ہوگی۔

متاخرین کے نزدیک بڑے اور چھوٹے کنویں کا اندازہ لگانے کے لئے اسے ناپا جائے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے کہا جاتا ہے کہ آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اگر تالاب میری اس مسجد کے برابر ہو تو بڑا ہے۔ جب آپ چلے گئے تو لوگوں نے مسجد کی پیمائش کی تو وہ مسجد بارہ بائی بارہ تھی (۱۲×۱۲) (یعنی بارہ ہاتھ اس کی لمبائی تھی اور بارہ ہی چوڑائی تھی) لیکن متاخرین علماء نے دہ در دہ کو اختیار کیا ہے (یعنی دس بائی دس۔ دس ہاتھ لمبائی اور دس ہاتھ چوڑائی) اور اس پر فتویٰ دیا ہے۔ اس میں ان کے نزدیک بڑی وسعت ہے۔ حتیٰ کہ بیک وقت کئی آدمی ایسے تالاب سے وضو کر سکتے ہیں جہاں نجاست ہے۔ اگر اثر ظاہر نہیں ہو رہا تو اس جگہ سے وضو کرنا بھی جائز بتاتے ہیں۔ اگر تالاب گول ہو تو اس کا محیط اڑتالیس ہاتھ ہونا ضروری ہے۔ بعض چالیس ہاتھ اور بعض چھتیس ہاتھ بتاتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پہلے قول میں زیادہ احتیاط ہے اور آخری حساب کے قواعد کے زیادہ موافق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی اختلاف کی بناء پر کنویں کے ناپاک ہونے کے بارے مختلف آراء ہیں۔

ائمہ ثلاثہ (امام شافعی، امام ابن حنبل اور امام مالک) کے نزدیک پانی کا کوئی وصف تبدیل ہوگا تو کنواں ناپاک ہوگا کیونکہ پانی دو مشکیزوں سے زائد ہے۔ ہمارے نزدیک نجاست گرنے سے ناپاک ہو جائے گا اس لئے سارا پانی نکالا جائے گا۔

کنویں کے مسائل

مذکورہ اختلاف کی بناء پر کنویں کے پانی کے بارے مختلف مسائل سامنے آتے ہیں۔ائمہ ثلاثہ کے نزدیک کنویں کا پانی اس وقت تک ناپاک نہیں ہوتا جب تک اس کے تین اوصاف میں سے کوئی ایک وصف تبدیل نہ ہو جائے کیونکہ کنویں کا پانی دو مشکیزوں سے زیادہ ہے۔

احناف کے نزدیک گندگی گرنے سے کنویں کا سارا پانی نکال دیا جائے گا۔اس بارے احناف کی تفصیل کچھ یوں ہے اوراس میں قیاس کو کوئی دخل نہیں بلکہ آثار کے تتبع پر نظریات اپنائے گئے ہیں۔

۱-اگر کنویں میں مردہ چوہا یا اس جیسی کوئی چیز گر جائے اور اسے فوراً نکال دیا جائے تو بیس سے تیس ڈول نکالے جائیں گے۔اس کی دلیل حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہے کہ آپ نے چوہا گرکر مر جانے کی صورت میں بیس ڈول نکالنے کا حکم دیا۔

۲-مرغی اور بلی یا ایسی کوئی دوسری چیز گرے تو چالیس سے پچاس ڈول۔اس کی دلیل حضرت ابوسعید کا اثر ہے۔ آپ نے مرغی کے بارے چالیس ڈولوں کا فتویٰ دیا۔ہر کنویں کے لئے وہاں استعمال ہونے والا ڈول معتبر ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ یہ دونوں اثر ہمارے مشائخ نے ذکر کئے ہیں لیکن یہ کتبِ احادیث میں نہیں پائے جاتے۔

طحاوی میں موجود ہے:

عن امیر المؤمنین علی قال فی بئر وقعت فیھا فارۃ فماتت نزح الماء.	حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اگر کنویں میں چوہا گر جائے اور مر جائے تو پانی نکالا جائے گا۔

بظاہر اس سے پورے پانی کا نکالنا واجب آتا ہے۔پھر امام طحاوی ابراہیم نخعی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے مکڑی اور بلی کی صورت میں چالیس ڈول نکالنے کا حکم دیا۔یہ بات حیرانگی کی ہے کہ مکڑی پاک ہے اوراس کا کھانا جائز ہے۔انہیں سے اور امام شعبی سے بلی جیسے جانور کے بارے کئی اقوال منقول ہیں۔مثلاً چالیس ڈول یا ستر ڈول۔یہ تمام روایات حجت نہیں بن سکتیں۔

۳-اگر کنویں میں بکری یا انسان کی جسامت کی کوئی چیز گرکر مر جائے اگرچہ اس کے بدن پر کوئی نجاست نہ ہو پھر بھی پورے کا پورا پانی نکالا جائے گا۔اس کی دلیل حبشی والی حدیث ہے۔اسی طرح اگر چوہا یا اس سے بڑی جسامت کی کوئی چیز کنویں میں گری اور پھٹ گئی یا اس کا جسم پھول گیا تو سارے کا سارا پانی نکالا جائے گا۔اسی طرح اگر کوئی اور نجاست گر گئی تو بھی سارے کا سارا پانی نکالا جائے گا لیکن اونٹ اور بھیڑ بکریوں کی مینگنیاں اگر تھوڑی ہوں تو معاف ہیں کیونکہ کنویں اکثر کھلی جگہوں پر ہوتے ہیں اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کنواں مینگنیوں سے پاک ہو۔ہدایہ میں ہے کہ نرم اور سخت مینگنیوں کا ایک ہی حکم ہے۔اسی طرح گوبر اور لید' خشک اور تر کا حکم ایک جیسا ہے کیونکہ ان

چیزوں سے کنواں پاک نہیں رکھا جا سکتا۔

مشائخ نے اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ مینگنی اگر دودھ کے برتن میں گر جائے تو مینگنی کو نکال کر پھینک دیں، دودھ پاک ہے۔

۴- اگر کنویں میں مینگنیوں کی تعداد زیادہ ہو تو پھر معاف نہیں۔ کثیر کا اندازہ دیکھنے والا خود لگائے گا۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ مینگنیاں، لید اور گوبر وغیرہ زیادہ ہیں تو زیادہ شمار ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عادت مبارکہ کے یہ زیادہ موافق ہے۔ متاخرین کہتے ہیں کہ صرف دو مینگنیاں معاف ہیں دو سے زیادہ ہوں گی تو ان پر کثیر والا حکم لگے گا۔

۵- کنویں میں کوئی جانور گر گیا جس کے بارے میں معلوم نہیں کہ اس کے جسم پر کوئی نجاست لگی ہوئی تھی اور اسے زندہ نکال لیا گیا۔ اگر وہ نجس العین ہے تو پورا پانی نکالا جائے گا ورنہ نہیں۔

۶- اگر ایسا حیوان ہے جس کا جھوٹا ناپاک ہوتا ہے تو دیکھیں گے اگر اس کا منہ پانی میں ڈوبا ہے تو پورا پانی نکالا جائے گا ورنہ نہیں۔ اگر اس کا جھوٹا پاک ہے تو پانی نہیں نکالا جائے گا۔

۷- اگر بلی کی طرح کا کوئی جانور ہے جس کا جھوٹا مکروہ ہوتا ہے تو پھر بھی پانی نہیں نکالا جائے گا۔ اگر مشکوک جھوٹے والا ہو تو یہ پانی پاک تو ہے لیکن پاک کرنے والا نہیں۔ اس صورت میں پورا پانی نکالا جائے گا تاکہ پانی کو طہارت کے لئے استعمال کیا جا سکے۔

۸- اگر بکری یا کوئی دوسرا جانور گر پڑا اور یہ معلوم نہیں کہ اس کے جسم پر نجاست تھی یا نہیں لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس کے جسم پر گوبر اور پیشاب لگا ہوگا تو اس کنویں کو پاک کرنے کا حکم دیا جائے گا اور غلبہ کا اعتبار نہیں ہوگا۔ فتح القدیر میں ایسا ہی ہے۔ جو ڈول پانی نکالنے کے لئے استعمال ہوا وہ خود بخود پاک ہو جائے گا۔ کب پاک ہوگا اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک جونہی پانی سے الگ ہوگا پاک ہو جائے گا اور بعض کے نزدیک پانی نکالنے کے فوراً بعد یعنی آخری ڈول نکالتے ہی۔ ابھی وہ خالی نہیں ہوگا تو کہیں گے یہ پاک ہے۔

۹- جس کنویں میں جانور گر کر مر گیا اور پھول گیا تو تین دن سے اس کے ناپاک ہونے کا حکم دیں گے۔ تین دن میں جو نمازیں پڑھیں، غسل کیا یا کپڑے دھوئے، نمازوں کو لوٹایا جائے گا، بدن اور کپڑے کی طہارت کا اعادہ ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو جانور پھول گیا وہ کم از کم تین دن سے پانی میں پڑا ہوا ہے۔

۱۰- اگر مردہ جانور پانی میں پایا گیا تو ایک رات اور ایک دن (چوبیس گھنٹے) سے پانی ناپاک شمار ہوگا کیونکہ اس کا نہ پھولنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک دن اور ایک رات سے زیادہ پانی میں نہیں رہا۔

صاحبین کے نزدیک جب سے معلوم ہوگا کہ جانور مردہ پڑا ہے اس وقت سے پانی ناپاک شمار ہوگا کیونکہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چند لمحے پہلے کسی پرندے نے آ کر ڈال دیا ہو، اس لئے قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تین دن اور تین رات یا ایک دن اور ایک رات سے گرا ہوا ہے۔

صاحبین کا قول زیادہ قرین قیاس ہے اور بعض مشائخ نے اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

۱۱-تھوڑے سے پانی میں اگر حلال جانور کے گوشت کا ٹکڑا گر پڑے تو ہمارے نزدیک وہ پانی ناپاک نہیں جبکہ امام شافعی کے نزدیک ناپاک ہے۔ ہماری دلیل اجماع عملی ہے۔ کبوتر عموماً مساجد کو ڈاروں کے ڈار گھر بنائے رہتے ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم کے دور سے آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے لیکن مساجد کی تعظیم اور تطہیر کے واجب ہونے کے باوجود کوئی بھی اسے ناجائز خیال نہیں کرتا حالانکہ مسجد میں تھوکنا یا ناک صاف کرنا ناجائز ہے۔

۱۲-اگر پانی میں ایسا جانور مر جائے جس میں بہنے والا خون نہیں اور اس کا مردہ جسم پاک ہے تو پانی تھوڑا ہو پھر بھی ناپاک نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل ابوہریرہ سے روایت کردہ بخاری شریف کی یہ حدیث ہے۔

عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذا وقع الذباب في اناء احدكم فليغمسه كله ثم يطرحه فان في احدجناحيه شفاء وفي الاخر داء.

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں مکھی گر جائے تو اس کو مکمل ڈبو کر نکال لے اور پھینک دے کیونکہ اس کے ایک پَر میں شفا ہے اور دوسرے میں بیماری ہے۔

(ایک پَر میں موجود جراثیم صحتِ انسانی کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں اور دوسرے پَر میں موجود جراثیم فائدہ مند)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مردہ مکھی نجس نہیں ہے اور اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ حکم تمام ان حیوانوں کے لئے ہے جن میں بہنے والا خون نہیں ہوتا۔ مکھی ہر دوسرے غیر موذی جانوروں کو قیاس کیا گیا ہے حالانکہ اس بارے حدیث موجود ہے۔ جسے دار قطنی نے سلمان سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔

عن سلمان عنه صلى الله عليه وسلم قال يا سلمان كل طعام وشراب وقعت فيه دابة ليس لهادم فماتت فيه فهو حلال اكله وشربه والوضوء منه.

آپ ﷺ نے حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: اے سلمان! کھانے پینے کی چیز جس میں کوئی ایسی چیز گر جائے جس میں خون نہیں اور مر جائے تو اس کا کھانا، پینا اور اس سے وضو جائز ہے۔

جرح: دار قطنی فرماتے ہیں اس حدیث کو بقیہ کے سوا کسی شخص نے مرفوعاً روایت نہیں کیا بقیہ اسے سعید بن سعید سے روایت کرتے ہیں اور بقیہ ضعیف ہے۔ اس کے علاوہ ابن عدی کے نزدیک یہ معلل ہے کیونکہ سعید مجہول ہے۔

تعدیل: ابن الھمام فرماتے ہیں بقیہ سے مراد ابن الولید نامی شخص ہے جس سے کئی ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے مثلاً حمادین، ابن المبارک، یزید بن ہارون، ابن عیینہ، وکیع، اوزاعی، اسحاق بن راھویہ، شعبہ علیہم الرحمۃ وغیرہ۔

یحیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بغداد آئے تو بقیہ نے ان کی بے حد تکریم کی اور ایک جماعت نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے۔ امام بخاری نے ان سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ (گویا مسلم نے کی ہے)

سعید ابن سعید کا ذکر کرتے ہوئے خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ ان کا اسم گرامی عبدالجبار ہے' یہ ایک ثقہ راوی ہیں مجہول نہیں۔ بہرحال یہ حدیث حسن کے درجہ سے نہیں گرتی۔

پانی میں رہنے والے جانور کے مرنے سے پانی پلید نہیں ہوتا

جو جانور پانی کے اندر رہتے ہیں اگر وہ پانی کے اندر مر جائیں تو بھی پانی ناپاک نہیں ہوتا کیونکہ آبی جانوروں کا خون نہیں ہوتا۔

مردار کے بال اور ہڈیاں پاک ہیں

مردار کے بال اور ہڈیاں پاک ہیں وہ تھوڑے پانی میں گر بھی جائیں تو پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ البتہ امام شافعی انہیں ناپاک سمجھتے ہیں۔

ہماری دلیل دار قطنی کی حدیث ہے۔

عن عبید الله بن عبد الله بن عباس انما حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیکم لحمها فاما الجلد و الشعر و الصوف فلا باس به.

عبید اللہ بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے۔ حضور ﷺ نے ان کا (مرداروں) گوشت تم پر حرام کیا ہے۔ رہی ان کی جلد اور ان کے بال اور اون تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

جرح و تعدیل

دار قطنی اس حدیث کو معلل سمجھتے ہیں کیونکہ عبدالجبار بن مسلم جو اس حدیث کا ایک راوی ہے ضعیف ہے۔ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ عبدالجبار کو ابن حبان نے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے اس لئے حدیث حسن کے درجہ سے نہیں گرتی۔ شیخین کے نزدیک حلال جانور کا پیشاب ناپاک ہے' تھوڑے پانی میں گر کر پانی کو ناپاک بنا دیتا ہے جبکہ امام محمد کے نزدیک پاک ہے۔ ان کی دلیل عرنیین کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو (بیماری کی وجہ سے) اونٹوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا تھا۔

امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کی دلیل حاکم کی ابو ہریرہ سے روایت کردہ حدیث ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: پیشاب سے بچو' عام طور پر قبر کے عذاب کا سبب یہی چیز ہے۔

یہ حدیث صحیح ہے۔

کئی لحاظ سے یہ دونوں حدیثیں ایک دوسرے کے معارض ہیں۔ خاص اور عام کا معارضہ یعنی عام کے بعض افراد۔ اونٹوں کا پیشاب دوسری حدیث کے معارض ہے سو یہ حکم دواء کے طور پر تھا۔ اب عام کے بقیہ افراد جن کا کوئی معارض نہیں وہ حجت ہے لہٰذا امام محمد کے نظریہ کے لئے یہ حدیث دلیل نہیں بن سکتی پھر امام ابو یوسف نے

حدیث عرنیین کے ساتھ اس حدیث کی تخصیص کی ہے کیونکہ اس میں اونٹوں کے پیشاب کے پینے کا حکم دواء کے طور پر تھا بلکہ تمام حلال جانوروں کے پیشاب کو بطور دوا پینا جائز ہے بلکہ حدیث پاک میں ضرورتاً حرام چیز کو بطور دوا استعمال کرنا مطلقاً جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ اونٹوں کے پیشاب کو بطور دوا استعمال کرنے کے بھی قائل نہیں ہیں بلکہ کسی بھی حرام چیز کو بطور دوا استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتے۔

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ﷺ کی ایک صحیح حدیث سے (استدلال کرتے ہیں) لاشفاء فی المحرم. حرام چیز میں کوئی شفا نہیں۔

واقعہ عرنیین کا جواب یہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو یقینی طور پر معلوم تھا کہ ان کی تندرستی اونٹوں کے پیشاب میں ہے کیونکہ آپ کی طرف تو وحی ہوتی تھی مگر ہم کسی چیز کے بارے صرف اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ تندرستی کا سبب بن سکتی ہے لہٰذا محض ظن وتخمین کی بنیاد پر حرام چیز کا استعمال جائز نہیں ہے۔

جھوٹا

لعاب ملا جھوٹا پانی اگر کسی ایسے جانور کا ہے جس کا لعاب ناپاک ہے تو پانی ناپاک اگر لعاب پاک ہے تو پانی بھی پاک ہوگا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ نجس العین جانور کا جھوٹا بالاتفاق نجس ہے۔ کتا نجس العین ہے۔ امام ابوحنیفہ سے امام حسن شیبانی کی روایت میں یہی مذکور ہے۔ امام شافعی کی رائے بھی یہی ہے۔

ہمارے نزدیک تمام درندوں کا جھوٹا جن میں کتا بھی شامل ہے ظاہر روایت کے مطابق ناپاک ہے۔ امام احمد کی بھی یہی رائے ہے۔ کتے کے بارے حدیث گزر چکی ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ کتے کے علاوہ باقی تمام درندوں کا جھوٹا پاک ہے حالانکہ ان کا گوشت حرام ہے۔ امام مالک علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ کتے کا جھوٹا پاک ہے۔ اس سے تو یہ وہم ہوتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک کتے کا گوشت بھی پاک ہے۔ (یعنی کپڑے سے اگر گوشت چھو جائے تو ناپاک نہیں ہوتا)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ گوشت لعاب سے پیدا ہوتا ہے اور گوشت کا حرام ہونا اس کے نجس ہونے کی علامت ہے کیونکہ حرمت اگر عزت وتکریم کی بناء پر نہیں (جیسے انسان کا گوشت) تو نجاست کی بناء پر ہی ہوگی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ گوشت کا حرام ہونا نجاست کی بناء پر نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ کہیں حیوان کی فطرت میں جو برائی اور قباحت ہے۔ وہ انسان میں سرایت نہ کر جائے۔ (جو قومیں سؤر کا گوشت کھاتی ہیں وہ بے غیرت ہوتی ہیں جیسے مغربی اقوام) حرمت کی یہ علت صاحب ہدایہ کے نزدیک قریب ترین علت ہے جسے انہوں نے باب الذبائح میں بیان کیا ہے لیکن اس سے اس نظریہ کا رد لازم نہیں آتا کہ حرمت نجاست سے پاک رہنے کے لئے ہے۔ دو مشکیزوں والی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سائل نے ایسے پانی کے بارے پوچھا جس سے درندے آکر پیتے تھے۔ اس سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ درندوں کا جھوٹا ناپاک ہے۔ حضور ﷺ نے سائل کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ کتے کا جھوٹا پاک ہے بلکہ اس پانی کو پاک قرار دیا جو مشکیزوں کے برابر ہو۔ یہ امام شافعی کے مقابلے میں الزامی دلیل ہے۔

امام شافعی کے نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک اور حدیث پیش کی گئی ہے۔

عن امیر المؤمنین عمر رضی الله تعالی عنه انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول لها ما اخذت بطونها وما بقی فهو لنا طهور. (رواہ رزین)

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپ فرما رہے تھے: جو انہوں نے پی لیا وہ ان کا ہے اور جو بچ گیا ہے وہ ہمارے لئے پاک ہے۔

دوسری حدیث محی السنہ نے شرح السنہ میں بیان کی ہے کہ:

عن جابر قال سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم انتوضاء بماء افضلت الحمر قال نعم وبماء افضلت السباع کلها.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا۔ کیا جس پانی میں گدھے لید کرتے ہیں ہم اس سے وضو کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اور اس پانی سے بھی وضو کرو جس میں تمام درندے بول و براز کریں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی حدیث حوضوں کے بارے ہے جس میں زیادہ پانی کا تذکرہ ہے اور دوسری حدیث زیادہ کے ساتھ خاص ہے ورنہ لازم آئے گا کہ کتوں کا جھوٹا بھی پاک ہے اور یہ بھی لازم آئے گا کہ خنزیر کا جھوٹا بھی پاک ہے کیونکہ خنزیر بھی درندہ ہے اور خنزیر اور کتے کی تخصیص ممکن نہیں کیونکہ یہ حدیث عام ہے اور اس میں کلها کے لفظ کے ساتھ تاکید بھی ہے جس کی وجہ سے یہ حدیث عموم میں محکم ہے' سو یہ تخصیص کو قبول نہیں کرتی لیکن دوسری حدیث میں "پانی جس میں بول و براز کریں گے" کے الفاظ تخصیص کو قبول کرتے ہیں کیونکہ اس میں تخصیص سے مانع کوئی چیز نہیں ہے لہٰذا اس کو زیادہ پانی کے ساتھ خاص کیا جائے گا۔

گھروں میں رہنے والے جانوروں کا جھوٹا پاک ہے

بلی اور اس جیسے دوسرے جانور جو عموماً گھروں میں رہتے ہیں' ان کا جھوٹا پاک ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن کبشة بنت کعب ان اباقتادة دخل علیها فجاءت هرة تشرب منه فاضعنی لها الاناء قالت کبشة فرأنی انظر الیه قال اتعجبین یا ابنة اخی قالت فقلت نعم فقال ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال انها لیست بنجس انها من الطوافین علیکم او الطوافات. (رواہ مالک' ترمذی' ابوداؤد و نسائی)

کبشہ بنت کعب سے روایت کی گئی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ میرے پاس حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے۔ میں نے ان کے واسطے وضو کا پانی رکھا' بلی آ کر اس برتن میں سے پانی پینے لگی۔ حضرت ابوقتادہ نے برتن جھکا دیا۔ حضرت کبشہ فرماتی ہیں انہوں نے مجھے دیکھا کہ میں ان کو دیکھ رہی ہوں۔ فرمایا: اے میری بھتیجی کیا تو حیران ہو رہی ہے۔ کہتی ہیں میں نے عرض کی ہاں۔ فرمانے لگے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلی ناپاک نہیں ہے یہ ان میں سے ہے جو

تمہارے گھروں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

حدیث کے اندر بلی کے جھوٹے کے پاک ہونے کی علت بھی بیان کر دی گئی ہے اور وہ ہے گھر میں اس کا رہنا اور چکر لگانا۔ اب جن جانوروں میں یہ علت پائی جائے گی ان کا جھوٹا ناپاک شمار نہیں ہوگا۔

امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک بلی اور اس قسم کے دوسرے جانوروں کا جھوٹا مکروہ ہے۔ صاحب ہدایہ نے ان کی رائے کی تائید میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلی درندہ ہے''۔

ان الفاظ سے مقصد اس کے حکم کو بیان کرنا ہے۔ ہاں گھروں میں پھرنے کی وجہ سے اس کو ناپاک نہیں کہتے البتہ کراہت باقی ہے لیکن یہ اصول محل نظر ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ تشبیہ ہر اعتبار سے ہو۔ نزول حدیث کا قصہ بتاتا ہے کہ دوسرے درندوں اور بلی میں وجہ شبہ نجاست نہیں ہے۔ اب پوری حدیث ملاحظہ کیجئے۔

عن ابی هریرة قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یاتی دارقوم من الانصار ودونهم دارفشق ذلک علیهم فقالوا یارسول الله صلی الله علیه وسلم تاتی دارفلان ولاتاتی دارنا فقال لان فی دارکم کلبا قالوا فان فی دارهم سنورا فقال علیه السلام السنور سبع.

(رواہ دارِقطنی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: حضور ﷺ ایک انصاری کے گھر تشریف لاتے۔ ان کے پڑوس میں ایک اور گھر تھا۔ یہ بات ان پر گراں گزری (کہ حضور ہمارے گھر تشریف نہیں لاتے) انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! آپ فلاں کے گھر تشریف لاتے ہیں مگر ہمارے گھر قدم رنجا نہیں فرماتے۔ آپ نے فرمایا: (میں اس لئے نہیں آتا کہ) تمہارے گھر کتا ہے۔ (دوسرے گھر والے) عرض کرنے لگے: حضور ان کے گھر بھی تو بلی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بلی درندہ ہے۔

ظاہر ہے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے گھر کتا ہے جو نجس ہے اور شیطان ہے جبکہ ان کے گھر بلی ہے اور بلی ایسا درندہ ہے جو ناپاک نہیں ہے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں: بلی کا جھوٹا بالکل مکروہ نہیں' زیادہ قرین صواب یہی رائے ہے کیونکہ ابوداؤد کی حدیث ہے۔

عن صالح عن امه ان مولاتها ارسلت هریسة الی عائشة قالت فوجدتها تصلی فاشارت الی ضعها فجاءت هرة فاکلت منها فلما انصرفت اکلت من حیث اکلت الهرة فقالت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال انها لیست بنجس انها من الطوافین علیکم.

صالح سے اور انہوں نے اپنی ماں سے روایت کیا ہے (کہتی ہیں کہ) ان کی مالکن نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف ہریسہ (نوع طعام) بھیجا۔ کہتی ہیں میں نے انہیں نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ انہوں نے رکھنے کا اشارہ کیا۔ بلی آئی اور اس سے کھانے لگی جب آپ نماز پڑھ کر مڑیں تو اسی جگہ سے تناول فرمایا جہاں سے بلی نے کھایا تھا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: بلی ناپاک نہیں ہے کیونکہ

یہ تم پر پھرتی رہتی ہے۔

آدمی کا جھوٹا پاک ہے

انسان کا جھوٹا پاک ہے اگرچہ جنبی ہو' کافر ہو یا حیض والی عورت ہو۔ صاحب الہدایہ امام شافعی کے متعلق نقل کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک کافر کا جھوٹا ناپاک ہے کیونکہ کافر کا ناپاک ہونا نص سے ثابت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ. (التوبۃ: ۲۸) مشرک ناپاک ہیں۔

بیضاوی' صاحب معالم التنزیل اور قسطلانی نے تصریح کی ہے کہ یہاں مراد بدنی نجاست نہیں بلکہ اعتقادی نجاست ہے یہ تینوں مفسر شافعی ہیں۔

امام بخاری' ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ غزوات میں شہد اور انگور ہمارے ہاتھ لگتے اور ہم انہیں کھا لیتے تھے' پھینکتے نہیں تھے۔

ظاہر ہے شہد مائع ہے اگر مشرک بدنی طور پر نجس ہوتا تو شہد اس کے چھونے سے ناپاک ہو جاتا۔

گوشت کھانے والے پرندوں کا جھوٹا مکروہ ہے

گوشت خور پرندوں کا جھوٹا پاک تو ہے لیکن مکروہ ہے' پاک اس لئے ہے کہ وہ پرندہ ہے آ کر برتنوں پر بیٹھ جاتا ہے اور اس سے بچنا ناممکن ہے پھر یہ چونچ سے پیتا ہے اور چونچ ہڈی ہے جو پاک ہے۔ پاک چیز کا پاک چیز سے چھونا نجاست کا سبب نہیں بنتا اور مردار کھانے سے اس کی چونچ پر جو گندگی لگ جاتی ہے اسے وہ رگڑ کر صاف کرتا ہے چونکہ وہ حرام ہے اس لئے اس کا جھوٹا مکروہ ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کا لعاب کھانے پینے کی چیزوں میں مل جاتا ہو اور لعاب گوشت سے پیدا ہوتا ہے جب گوشت حرام ہے تو لعاب بھی حرام ہے لیکن ان پرندوں سے بچنا چونکہ ناممکن ہے اس لئے ضرورتاً ان کا جھوٹا حرام نہیں رکھا۔

حلال جانوروں اور پرندوں کا جھوٹا پاک ہے

حلال جانوروں اور پرندوں کا جھوٹا حلال ہے کیونکہ ان کا لعاب حلال گوشت سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح گھوڑے کا جھوٹا پاک ہے کیونکہ اس کے گوشت کا مکروہ ہونا کراہت کی وجہ سے ہے لہٰذا اس کا جھوٹا نجس اور مکروہ نہیں ہے۔

گدھے اور خچر کا جھوٹا مشکوک ہے

گدھے اور خچر کا جھوٹا پاک ہے لیکن اس کی طہوریت (پاک کرنے کی صلاحیت) میں شک ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس گدھے اور خچر کا جھوٹا پانی ہے تو وہ اس سے وضو کرے اور پھر تیمم کرے کیونکہ آثار میں تعارض ہے۔ بعض میں اس کی نجاست کا ذکر ہے اور بعض میں طہارت کا۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گدھا اور خچر نجس ہیں اور ان پر سواری چونکہ جائز ہے اس وجہ سے وہ پاک شمار ہوتے ہیں اس لئے ان کا جھوٹا مشکوک ہے۔ ان کے جھوٹے کا حکم وہ نہیں جو درندوں کے جھوٹے کا ہے کیونکہ درندے انسانوں میں نہیں بستے جبکہ خچر اور گدھے انسانوں کے استعمال میں رہتے ہیں اس لئے ان میں ضرورت کی ایک صورت پائی جاتی ہے لیکن بلی

انسان کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کو رکھنا ضروری نہیں اس لئے گدھے اور خچر کے جھوٹے میں شک ہے کہ نجس ہے یا پاک ہے۔

اس اصول کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ پانی میں اصل طہارت ہے۔ گدھے اور خچر کے لعاب ملنے کے بعد بھی وہ پاک ہے کیونکہ اصل شک سے زائل نہیں ہوتا۔ اب جب حدث پایا گیا تو وضو کے لئے اس کا استعمال واجب ہے اور اس کے استعمال کے بعد اب شک پیدا ہو گیا کہ حدث دور ہوا ہے یا نہیں۔ استعمال سے پہلے وہ محدث (بے وضو) تھا لہٰذا اصل پر باقی رہا (بے وضو رہا) لہٰذا اس پر تیمم واجب ہے۔ مزید تفصیلات درکار ہوں تو ہماری شرح ''فواتح الرحموت'' کا مطالعہ فرمایئے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ پہلے اس جھوٹے پانی سے وضو کرے یا پہلے تیمم اور پھر وضو تو اس میں کوئی پابندی نہیں ہے کیونکہ اگر جھوٹا پانی (مشکوک) حدث کے ازالہ کے لئے مؤثر ہے تو تیمم لغو ہوگا اور وضو پانی سے ہو جائے گا اور اگر پانی سے وضو ٹھیک نہ ہوا تو تیمم سے پاکی ہو جائے گی (بہر حال دونوں کا استعمال ضروری ہے تا کہ وضو کا یقین ہو جائے)۔

گڑھوں میں رُکنے والے پانی کا حکم

وہ پانی جو جنگل اور صحرا میں بارش کے بعد گڑھوں میں کھڑا ہوتا ہے اور گمان یہ ہوتا ہے کہ ان سے جنگلی جانور پیتے ہوں گے۔ اسی طرح کنوؤں کا پانی جن سے پانی لیتے وقت کسی قسم کی احتیاط نہیں کی جاتی۔ لوگوں کے پاؤں گندے ہوتے ہیں وہ ڈول کھینچتے ہیں اور جب ڈول پکڑتے ہیں تو پانی پاؤں پر گر کر کنویں میں گرتا ہے تو ایسا پانی پاک ہے اس سے وضو کیا جانا چاہئے اور گڑھوں میں کھڑے پانی کے بارے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر بارش کا پانی بہہ کر کنویں میں گرنے کا احتمال ہو یا یقین ہو کہ گندا پانی کنویں میں آ کر گر جاتا ہے تو اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ احتمال سے یقین پر عمل ترک نہیں ہو سکتا۔

روی یحیی بن عبدالرحمن عن امیر المؤمنین عمر خرج فی رکب فیهم عمرو بن العاص حتی ورداحوضا فقال عمرو یا صاحب الحوض هل یترد حوضک السباع فقال عمر بن الخطاب لا تخبرنا یاصاجب الحوض فانا نرد علی السباع ویرد علینا.

یحییٰ بن عبدالرحمٰن حضرت امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے روایت کرتے ہیں کہ آپ چند احباب کی معیت میں سفر کرتے ایک حوض پر جا پہنچے۔ حضرت عمرو بن العاص بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے حوض کے مالک سے پوچھا کہ کیا اس حوض سے درندے تو پانی نہیں پیتے؟ حضرت عمر نے کہا اے حوض کے مالک! ہمیں کچھ نہ بتایئے ہم درندوں کے پانی پر جا وارد ہوتے ہیں اور وہ ہم پر وارد ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ واقعہ زیادہ پانی کے بارے ہو تو اعتبار لفظ کے عموم کا ہوگا۔ بعض فتاویٰ میں ہے کہ جو لوگ اس قسم کے حالات میں شک کا شکار ہوں وہ مغرور ہیں۔

تیمّم

ربِ قدوس کا ارشادِ گرامی ہے:

فَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ۔ (المائدۃ:۶)

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا تم میں کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا (جماع کیا ہو) اور پانی نہ پایا ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔ اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو۔

اس نص سے معلوم ہوا کہ مسافر کے پاس جب پانی نہ ہو تو وہ تیمم کر سکتا ہے۔

پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہونے کی صورتیں

۱۔ ائمہ کرام کے اندازے کے مطابق ایک میل یعنی چار ہزار ہاتھ یا چار ہزار قدم پانی دور ہو تو پانی گویا مفقود ہے۔ قدموں سے مراد انسان کے نہیں بلکہ اونٹ کے قدم ہیں۔ ان کے نزدیک اس چیز کا اعتبار نہیں کہ اسے خوف ہے کہ نماز کا وقت جاتا رہے گا یعنی پانی قریب ہے لیکن وقت بہت کم ہے۔ اسے خوف ہے کہ اگر پانی لینے چلا گیا تو نماز قضا ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اس خوف کا اعتبار نہیں بلکہ پانی کا نہ ہونا شرط ہے مگر امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی نماز کے وقت میں پانی نہ پا سکتا ہو وہ تیمم کر سکتا ہے۔

ہمارے مشائخ نے یہ جواب دیا ہے کہ اگر کوتاہی اس کی طرف سے ہے کہ وہ نماز کو مؤخر کرتا رہا حتیٰ کہ وقت بہت کم رہ گیا تو تیمم نہیں کر سکتا اور اگر سو گیا اور جب اٹھا تو وقت بہت کم تھا تو یہ کوتاہی اس کی طرف سے نہیں ہے۔

یہ افراد پانی سے معذور شمار ہوں گے

۲۔ اگر کسی شخص کو خوف ہے کہ اگر وضو کے لئے پانی لینے باہر نکلا تو درندہ پھاڑ کھائے گا یا دشمن نقصان پہنچائے گا یا کوئی آ کر مال چرا لے گا تو پانی بیشک قریب ہو پھر بھی تیمم جائز ہے کیونکہ حکماً اس کے پاس پانی نہیں ہے کیونکہ شریعت نقصان سے بچانا چاہتی ہے۔

۳۔ اسی طرح ایک شخص کنویں پر کھڑا ہے لیکن اس کے پاس رسی اور ڈول نہیں کہ پانی نکالے تو وہ بھی معذور ہے۔ اس کے پاس پانی نہیں ہے۔

۴۔ اگر ہمراہی کے پاس پانی ہے تو اس کا اعتبار نہیں کیونکہ ہمراہی کے پانی پر قدرت اس کی قدرت شمار نہیں ہوگی، اس سے پانی مانگنا ضروری نہیں، اگر پانی مانگ لیتا ہے اور ہمراہی کہتا ہے کہ انتظار کر تو انتظار کرنا ضروری

ہے۔

۵۔ اگر پانی تھوڑا ہے کہ اس سے صرف آٹا گوندھا جاسکتا ہے اور پینے کے لئے بمشکل کفایت کرے گا تو تیمم جائز ہے کیونکہ پیاس اور بھوک کا ضرر مرض کے ضرر کی مانند ہے۔

۶۔ اگر کسی کے پاس پانی تو ہے لیکن اسے حرام طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے مثلاً غبن کیا گیا ہے تو اس کے لئے تیمم مباح ہے۔

۷۔ اگر پانی زیادہ دور نہیں لیکن قافلہ سے پیچھے رہ جانے کا اندیشہ ہے تو تیمم مباح ہے کیونکہ اتنا خوف بیماری کا نہیں جتنا قافلے سے بچھڑ جانے پر ہوسکتا ہے۔

۸۔ اگر کوئی بیمار ہے اور اسے خوف ہے کہ پانی استعمال کرے گا تو بیماری شدت اختیار کر جائے گی تو اس کے لئے تیمم جائز ہے۔ بیماری کے لئے ہم نے جو قید لگائی ہے وہ ضروری ہے۔ صاحب ہدایہ کے بقول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مریض کے لئے تیمم صرف اسی وقت جائز ہے جب جان جانے کا اندیشہ ہو' محض بیماری کی شدت کا خوف تیمم کو مباح نہیں کرتا۔ شافعی علماء کی کتابوں میں جو رائے مدون ہے وہ ہماری رائے سے بالکل ملتی ہے۔

جس طرح ان عذروں کے ہوتے ہوئے ایک بے وضو شخص تیمم کرسکتا ہے' ایک جنبی بھی تیمم کر کے طہارت حاصل کرسکتا ہے۔

لمس کا مفہوم

عورتوں کو چھونے سے مراد ان کے ساتھ جماع کرنا ہے' یہ رائے احناف کی ہے۔ اس بارے صحابہ کرام میں بھی اختلاف پیدا ہوا جو بعد میں اتفاق کی شکل اختیار کر گیا اور دوبارہ کبھی بھی اختلاف نہیں ہوا۔

وقد روی عمران قال كنا في سفر مع النبي صلى الله عليه وسلم فصلى بالناس فلما القلب اذا هو برجل معتزل لم يصل مع القوم فقال مامنعك يا فلان تصلي مع القوم قال اصابتني جنابة ولا ماء قال عليك بالصعيد فانه يكفيك. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی' جب آپ پیچھے مڑے تو دیکھا ایک آدمی لوگوں سے دور بیٹھا ہے اور اس نے نماز ادا نہیں کی۔ حضور ﷺ نے پوچھا اے فلاں جماعت کے ساتھ نماز ادا کیوں نہیں کی؟ عرض کرنے لگا (یا رسول اللہ ﷺ) مجھے غسل کرنا ہے اور میرے پاس پانی نہیں۔ آپ نے فرمایا: مٹی سے تیمم کرو تمہارے لئے کافی ہے۔

عنقریب حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث آئے گی جو جنبی کے لئے تیمم کو بیان کرتی ہے۔

غسل اور تیمم کو جمع نہیں کیا جائے گا

غسل اور تیمم کو جمع کرنا صحیح نہیں ہے جبکہ امام شافعی پانی اور مٹی کو جمع کرنا جائز خیال کرتے ہیں۔ دونوں کو جمع

نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فرع (مٹی) پر عمل کیلئے یہ شرط ہے کہ اصل (پانی) پر قدرت نہ ہو مثلاً ایک شخص کے بدن کا اکثر حصہ زخمی ہے جسے وہ دھو نہیں سکتا تو وہ صرف تیمم کرے گا اور جو عضو زخمی نہیں اسے دھو نہیں سکتا۔ صحیح اور زخمی تمام اعضاء پر تیمم کرے گا۔

اگر بدن کا اکثر حصہ ٹھیک ہو تو؟

۹- اگر بدن کا اکثر حصہ صحیح ہے اور چند اعضاء زخمی ہیں اور پانی کا استعمال نقصان دہ نہیں تو صحیح اعضاء کو دھوئے گا اور زخمی اعضاء پر مسح کرے گا۔ اگر مسح سے بھی تکلیف ہو تو پٹی باندھ کر مسح کرے گا۔ اگر صورت ایسی ہے کہ صحیح اعضاء کو دھونے سے بھی تکلیف ہوتی ہے' تو تیمم کرے گا' یہی حکم ہے اگر بیماری بعض اعضائے جسم تک محدود ہو۔

۱۰- اگر زخمی حصہ اور صحیح حصہ برابر ہوں تو شیخ ابن الھمام کے بقول اس بارے کوئی روایت نہیں ہے جبکہ بعض مشائخ تیمم کا فتویٰ دیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں: پانی استعمال کیا جائے گا لیکن پہلی یعنی تیمم والی رائے فقہی اصولوں کے زیادہ مطابق ہے۔

کثرت کی حد کے بارے اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اعضاء کی تعداد کا اعتبار ہوگا اور بعض کے نزدیک پورے عضو کا۔

قد روی جابر قال خرجنا فی سفر فاصاب رجلا منا حجر فشجه فسأل اصحابه هل تجدون لی رخصة فی التیمم فقالوا ما نجدلک رخصة وانت تقدر علی الماء فاغتسل فمات فلما قدمنا علی النبی صلی الله علیه وسلم اخبر بذلک فقال قتلوه قتلهم الله الا سألوا اذلم یعلموا انما شفاء العی فی السوال انما یکفیه ان یتمم ویعصب علی جرحه خرقة ثم یمسح علیها ویغسل سائر جسده.

(رواہ سنن ابوداؤد)

حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ ہمارے ایک ساتھی کو پتھر لگا اور ان کا سر زخمی ہو گیا۔ اس نے اپنے دوستوں سے پوچھا کیا مجھے تیمم کی اجازت ہے۔ صحابہ کہنے لگے۔ ہم تو آپ کے لئے تیمم کی اجازت نہیں پاتے۔ آپ پانی کے استعمال پر قادر ہیں لہٰذا انہوں نے وضو کیا جس کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو مطلع کیا تو آپ نے فرمایا: انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں قتل کرے۔ جب وہ جانتے نہیں تو پوچھ کیوں نہیں لیتے۔ گمراہی کی شفا سوال میں ہے۔ اس کے لئے تیمم کافی تھا وہ اپنے زخم پر پٹی باندھ لیتا پھر اس پر مسح کر لیتا اور اپنے جسم کے سارے اعضاء دھو لیتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پانی کے استعمال سے نقصان کا خوف ہو تو تیمم کافی ہے۔
مسح کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ گیلے کر کے زخمی عضو پر پھیر دے۔ حقیقت میں یہی مسح ہے اور باقی اعضاء کو دھو لے بشرطیکہ پانی کے استعمال سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ حدیث پاک میں دو حالتوں کے لئے دو الگ الگ حکم

موجود ہیں۔ (زخمی عضو پر مسح اور صحیح اعضاء کو دھونا) اس لئے یہ حدیث امام شافعی کے لئے حجت نہیں ہے اور مسح کو مسح بالتراب پر محمول کرنا بہت دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے کیونکہ جونہی ہم مسح کا لفظ بولتے ہیں تو توجہ ہاتھ گیلا کر کے کسی عضو پر پھیرنے کی طرف جاتی ہے۔ حقیقت میں مسح یہی ہے اگر یہ مفہوم نہ ہوتا تو پٹی باندھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور نہ ہی آپ یہ فرماتے کہ اس کے لئے تیمم کافی تھا۔

سخت سردی میں پانی کے استعمال کی صورت

۱۱- ایک تندرست آدمی جس کے پاس پانی موجود ہے۔ جب اسے سفر یا حضر میں سخت سردی سے کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے یا مرض کے لگ جانے کا خوف ہے تو وہ تیمم کر سکتا ہے۔ صاحبین فرماتے ہیں یہ حالتِ قیام میں جائز نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقامت میں ایسی صورتِ حال پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ سردی میں پانی گرم کر کے وضو کیا جا سکتا ہے۔ غسل یا وضو کے بعد لحاف سے یا آگ جلا کر گرمی حاصل کی جا سکتی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کی دلیل بخاری کی حدیث ہے۔ جو انہوں نے معلقاً روایت کی ہے۔

ویذکر ان عمرو بن العاص اجنب فی لیلة باردة فتیمم وتلاقوله ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما فذکر للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم یعنف.

آپ ذکر فرماتے ہیں کہ عمرو بن العاص کو غسل جنابت کرنا تھا' رات بہت سرد تھی تو آپ نے تیمم کر لیا اور دلیل میں یہ آیتِ کریمہ تلاوت کی: اپنے آپ کو قتل نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ تم پر بے حد مہربان ہے۔ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا۔

اگرچہ ایسی صورت حال سے واسطہ شاذ و نادر ہی پڑتا ہے لیکن بلاشبہ یہ عجز کی ایک صورت تو ہے ہی۔

پھر غسل اور وضو میں بھی اختلاف کیا جاتا ہے۔ جنابت کے لئے تیمم جائز سمجھا جاتا ہے' حدث میں نہیں کیونکہ وضو عام طور پر مرض کا سبب نہیں بنتا لیکن غسل سے بیمار ہونے کا اندیشہ ہے۔

عیدین اور نماز جنازہ فوت ہونے کی صورت میں تیمّم کر لے

۱۲- نماز جنازہ فوت ہونے کا خطرہ ہو تو تیمم جائز ہے اسی طرح عیدین کی نماز۔ بیشک آدمی تندرست ہے' مقیم ہے اور پانی بھی موجود ہے لیکن وقت بہت کم ہے تو تیمم کرے کیونکہ اس نماز کی ادائیگی کے لئے تو اس کے پاس پانی نہیں ہے۔ اگر عیدین کی نماز وضو کر کے شروع کی پھر وضو ٹوٹ گیا تو تیمم کرے اور اسی نماز پر بناء کرے کیونکہ بھیڑ کی وجہ سے اس کی نماز ضائع ہو سکتی ہے۔ یہ رائے امام ابوحنیفہ کی ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کا یہ کہنا کہ وہ تیمم نہیں کر سکتا کیونکہ وضو کر کے نماز میں شریک ہو سکتا ہے۔ مذکورہ دلیل سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر تیمم کر کے نماز عیدین شروع کی اور حدث لاحق ہو گیا تو بالاتفاق تیمّم کرے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو ظاہر ہے۔ بھیڑ کی وجہ سے نماز ضائع ہونے کا خدشہ ہے اور صاحبین کے نزدیک اس لئے کہ اگر

اس پر وضو لازم ٹھہرائیں تو بجز حکمی زائل ہو جائے گا اور دورانِ نماز وہ پانی پانے والا ہو جائے گا جس سے وہ تیمم باطل ہو جائے گا جس کے ساتھ وہ کچھ نماز پڑھ چکا ہے۔

تیمّم کا طریقہ

تیمم کا ایک ہی رکن ہے۔ یعنی زمین یا پتھر پر ہاتھ مار کر چہرے کا مسح کرنا اور پھر ہاتھ مار کر ہاتھوں کا کہنیوں سمیت مسح کرنا۔ ظاہر الروایہ کے مطابق پورے عضو کو گھیرنا شرط ہے۔ یہ رائے حضرت امام ابوحنیفہ کی اس رائے سے مختلف ہے جسے امام حسن نے روایت کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اکثر حصے پر تیمم کر لینے سے طہارت حاصل ہو جائے گی۔ اس رائے میں لوگوں کے لئے زیادہ سہولت ہے۔ امام مالک کی بھی یہی رائے ہے۔ ظاہر الروایہ کے مطابق امام شافعی کی ایک نئی رائے سامنے آئی ہے۔

کیا صرف ایک ضرب سے تیمّم ہو جائے گا؟

اکثر محدثین اور امام احمد کے نزدیک تیمم میں چہرے اور ہاتھوں کے لئے ایک ہی ضرب کافی ہے۔ انہوں نے ظاہری روایت سے استدلال کیا ہے۔

احناف کی دلیل

جن لوگوں کی رائے ہمارے مذہب کے مطابق ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التیمم ضربتان ضربة للوجه وضربة للذراعین الی المرفقین. (رواہ طبرانی، دارقطنی، مستدرک الحاکم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: تیمم دو ضربوں سے عبارت ہے۔ ایک ضرب چہرے کے لئے اور ایک ضرب کہنیوں سمیت ہاتھوں کے لئے۔

شیخ ابن الہمام نے فرمایا ہے کہ بقول حاکم یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے روایت نہیں کیا۔ دارقطنی فرماتے ہیں۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

حنابلہ کی دوسری دلیل

ان کی ایک دلیل قیاس ہے وہ تیمم کو وضو پر قیاس کرتے ہیں۔ وضو میں ہاتھ کہنیوں سمیت دھوئے جاتے ہیں تو تیمم میں بھی یہی ضروری ہے کیونکہ تیمم وضو کا خلف ہے۔

حنابلہ کی تیسری دلیل

امام احمد اور ان کے پیروؤں کی دلیل وہ حدیث ہے۔ جسے شیخین (بخاری و مسلم) اور دوسرے محدثین نے بیان کیا ہے۔

عن عمار قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انما یکفیک هکذا فضرب رسول الله صلی الله علیه وسلم بکفیه الارض ونفخ فیهما ثم مسح بهما وجهه وکفیه.

حضرت عمار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے لئے اس طرح کرنا کافی ہے۔ آپ نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے انہیں پھونکا اور پھر ان کو چہرے اور ہاتھوں پر پھیرا۔

مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

انما یکفیک ان تضرب بیدیک الارض ثم ینفخ ثم یمسح بهما وجهک وکفیک.

تیرے لئے یہ کافی ہے کہ تو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مار پھر ان کو جھاڑ دے پھر ان کے ساتھ اپنے چہرے اور ہاتھوں (کہنیوں سمیت بازوؤں) کا مسح کر۔

اعتراض: علمائے حدیث فرماتے ہیں کہ تیمم کے سلسلہ میں یہ حدیث (براویۃ جابر) صحیح ترین ہے مگر سفرالسعادۃ کے مصنف نے مبالغہ کیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ دوضربوں والی حدیث صحیح نہیں ہے۔

جواب: حنفیوں نے اپنی طرف سے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث قابلِ حجت نہیں ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تردید فرمائی ہے۔

امام بخاری ایک حدیث بیان کرتے ہیں:

عن شقیق قال کنت جالسامع عبد الله وابی موسی الاشعری فقال ابو موسی لو ان رجلا اجنب فلم یجد الماء شهرا اما کان یتمم ویصلی قال فقال عبد الله لا یتیمم وان کان لم یجد شهرا فقال له ابو موسی فکیف تصنعون بهذه الایة فی سورة المائدة فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا فقال عبد الله لورخص لهم فی هذا اوشکوا اذا برد علیهم الماء ان تیمموا الصعید قلت وانما کرهتم هذا لذا قال نعم فقال ابوموسی الم تسمع قول عمار لعمر بن الخطاب بعثنی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی حاجة فاجنبت فلم اجد الماء فتمرغت فی الصعید کما تمرغ الدابة

حضرت شقیق سے روایت کرتے ہیں کہ میں عبداللہ اور ابوموسیٰ الاشعری کے پاس بیٹھا تھا۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعری نے فرمایا: اگر کوئی شخص جنبی ہو اور ایک ماہ تک اسے پانی نہ ملے تو کیا وہ تیمم نہیں کرے گا اور نماز ادا نہیں کرے گا؟ راوی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ نے فرمایا: اگر ایک ماہ تک بھی پانی نہیں ملے گا تو وہ تیمم نہیں کرے گا۔ حضرت موسیٰ الاشعری نے فرمایا: پھر آپ سورۂ مائدہ کی اس آیت پر کیسے عمل کریں گے، جس میں ارشاد ہے: جب پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر لوگوں کو ڈھیل دی جائے تو اندیشہ ہے کہ جب پانی سخت ٹھنڈا ہوگا تو مٹی سے تیمم کرلیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا تم اس لئے اسے ناپسند کرتے ہو۔ فرمایا: ہاں۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعری نے فرمایا کہ کیا آپ نے عمر بن الخطاب سے حضرت عمار کی یہ گفتگو نہیں سنی کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک کام

فذكرت ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم فقال انما يكفيك ان تصنع هكذا وضرب بكفه ضربة على الارض ثم نفضها ثم مسح بها ظهر كفه بشماله او ظهر شماله بكفه ثم مسح بهما وجهه فقال عبد الله الم تر عمر لم يقنع بقول عمار.

کے لئے بھیجا۔ مجھے غسل جنابت کرنا پڑ گیا لیکن میرے پاس پانی نہیں تھا تو میں مٹی میں اس طرح لت پت ہوا جس طرح حیوان ہوتا ہے پھر میں نے اس بارے حضور ﷺ سے بات کی تو آپ نے فرمایا کہ اگر آپ اس طرح کرتے تو کافی تھا پھر آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا' اسے جھاڑا اور بائیں ہاتھ کے ساتھ اپنی ہتھیلی کا مسح کیا یا پانی بائیں ہتھیلی کا دائیں ہاتھ سے مسح کیا اس کے بعد دونوں ہاتھوں کے ساتھ چہرے کا مسح کیا۔ عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تو نے نہیں دیکھا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے متفق نہیں تھے۔

صحیح مسلم میں اس طرح ہے:

عن عبد الرحمن بن ابزى ان رجلا اتى عمر فقال اني اجنبت فلم اجد ماء فقال لا تصل فقال عمار اما تذكر يا امير المؤمنين اذ انا وانت في سرية فاجنبنا فلم نجد ماء فاما انت فلم تصل واما انا فتمعكت في التراب وصليت فقال النبي صلى الله عليه وسلم انما يكفيك ان تضرب بيديك الارض ثم ينفخ ثم يمسح وجهك وكفيك فقال عمر اتق الله يا عمار.

عبدالرحمٰن بن ابزی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عمر کے پاس آیا اور کہنے لگا میں جنبی ہوا اور پانی نہ پایا۔ حضرت عمر نے فرمایا: نماز نہ پڑھ۔ حضرت عمار نے عرض کی: اے امیر المؤمنین! کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک سریہ میں مجھے اور آپ کو غسل جنابت کے لئے پانی کی ضرورت ہوئی۔ پانی نہیں تھا۔ آپ نے نماز ادا نہیں کی تھی اور میں نے مٹی میں لت پت ہو کر نماز پڑھ لی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ تیرا دونوں ہاتھوں کو زمین پر مار لینا تیرے لئے کافی تھا پھر انہیں جھاڑ لیتے چہرے اور ہاتھوں پر پھیر لیتے۔ حضرت عمر (یہ سن کر) فرمانے لگے۔ اللہ سے ڈرو اے عمار!

ایک اور سند میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ہم تمہاری روایت کا بوجھ تم پر ڈالتے ہیں۔

حضرت عمار اور حضرت شقیق کی احادیث کا صحیح مفہوم

احناف کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حادثہ میں حضرت عمار کے ساتھ تھے۔ اگر واقعہ یوں ہوتا جس طرح عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا تو آپ کو ضرور یاد ہوتا کیونکہ اس کی تو اکثر ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ جب حضرت عمر نے انکار کر دیا تو معلوم ہوا کہ اس میں وہم ہے لہٰذا یہ حدیث اس بارے دلیل نہیں بن سکتی۔ فخر الاسلام نے اس سلسلے میں سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس کی تلخیص میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے' اس سے زائد نہیں ہے۔ اگر تفصیل مقصود ہو تو وہاں سے دیکھیں۔

تمام لوگوں نے اس کا وہی جواب دیا ہے۔ جو حضرت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں

کہ رسول اللہ ﷺ کا مقصود تیمم کا طریقہ بیان کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ زمین پر لوٹ پوٹ ہونا ضروری نہیں تھا۔ حضور ﷺ کے پیش نظر تیمم کے ارکان بیان کرنا نہیں تھے۔ حضرت عمار کی حدیث میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جسے بنیاد بنا کر کہا جا سکے کہ تیمم میں ایک ضرب ہے۔ ہاں اس میں یہ ضرور ہے کہ زمین پر ہاتھ مارے جائیں گے اور بخاری شریف کی روایت میں ایک ہی ضرب کے ساتھ ہاتھوں اور چہرے کے مسح کا تذکرہ ہے۔ وہاں مطلب ہے ایک ہی دفعہ ہاتھ پھیرنا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کف سے مراد ہاتھ ہے جیسے کبھی کبھی ہاتھ بول کر ہتھیلی مراد لی جاتی ہے۔ اس حدیث پر کافی قیل وقال ہوا ہے۔

مفتیٰ بہٖ قول

میرے نزدیک صحیح ترین قول امام احمد کا ہے' اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت عمار کی حدیث اور حنفیہ کے قول کو قابل حجت تسلیم نہ کرنا صحیح نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کیونکہ احادیث متواترۃ المعنیٰ اور اجماع قاطع اس پر شاہد عمل ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کی ایک ہی واقعہ کے متعلق رائے مختلف کیوں ہے؟ لامحالہ یا تو امیر المؤمنین سے نسیان واقع ہوا ہے یا حضرت عمار کے دل میں وہم پیدا ہوا ہے۔ اس بارے تو ہم سوچ ہی نہیں سکتے کہ کسی نے کذب وافتراء سے کام لیا ہو کیونکہ دونوں کی سچائی اور عدالت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ وہم تو ہو نہیں سکتا کیونکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ پیش ہی نہیں آیا اور ان کو وہم پیدا ہوا کہ ایسا ہوا ہے' یہ بات عادت کے خلاف ہے۔ عادتاً ایسا نہیں ہوتا' ہاں نسیان اکثر ہو جاتا ہے پھر ہر واقعہ جو رونما ہوا اسے یاد رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ تو نسیان ضروری ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضور ﷺ کی بارگاہ میں اس مسئلہ کو ذکر کرنا اور آپ ﷺ کا انہیں تیمم کا طریقہ سکھانا یہ اہم واقعہ ہے۔ ہوسکتا ہے۔ حضرت عمار نے ان دونوں واقعات کو یاد رکھا ہو لیکن جس وقت حضور ﷺ سے پوچھا ہو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کی مجلس شریف میں حاضر نہ ہوں۔ حضرت عمار کی حدیث میں یہ تو کہیں مذکور نہیں کہ سوال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موجودگی میں ہوا۔ حضرت عمار نے واقعہ بیان کیا' تیمّم کا طریقہ سیکھا اور اسے یاد کیا چونکہ اس کو یاد کرنا بہت ضروری تھا تو اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاعلمی نسیان کی وجہ سے تھی اور حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے یاد رکھا لہٰذا اس حدیث پر عمل کرنا لازم ہے اور یہ حدیث دار قطنی کی حدیث کے مقابلے میں راجح ہے اور اس کی سند قوی ہے۔

رہا امام نووی کے قول کے مطابق علماء کا جواب تو اس کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیمم کے طریقہ سے ناواقف تھے اسی لئے انہوں نے زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر اپنے آپ کو پاک کرنے کی کوشش کی۔ نبی کریم ﷺ کے لئے ضروری تھا کہ آپ اس کو تیمم کا صحیح طریقہ بتاتے' حدیث کا سیاق کلام بھی یہی بتاتا ہے۔

رہا ان کا یہ کہنا کہ ایک ضرب کی تصریح نہیں جب کسی فعل میں تعداد کا تذکرہ نہ ہو تو وہ ایک کے عدد کے لئے نص ہوتی ہے اور اس کے بعد عدد کا ذکر فعل کو اس کے معنی سے پھیر دیتا ہے جیسا کہ اصول الفقہ کا قاعدہ ہے۔ اسی لئے امام محمد فرماتے ہیں کہ اگر خاوند نے اپنی بیوی سے کہا: میں نے تمہیں تین طلاقیں دیں اور ابھی اس نے تین کا

لفظ ادا نہیں کیا تھا کہ فوت ہو گیا تو ایک طلاق بھی واقع نہیں ہوگی۔ یہ ساری باتیں اصول الفقہ میں واضح طور پر بیان ہو چکی ہیں۔

پھر ابوداؤد شریف کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عمار! تیرے لئے اس طرح کرنا کافی تھا۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا پھر ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارا اور اپنے چہرے اور دونوں بازوؤں کے نصف تک کا مسح کیا اور کہنیوں تک ہاتھ نہ لے گئے۔ وہ حضرت حسن کی روایت سے تمسک کرتے ہیں لیکن یہ کسی راوی کا وہم ہے کیونکہ ثقہ راویوں نے حضرت عمار سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ جس میں دونوں ہاتھوں کے مسح کا تذکرہ ہے۔

امام احمد کے قول کے زیادہ صحیح ہونے کی دوسری وجہ رب قدوس کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ. (المائدۃ:٦) اور مسح کرو اپنے چہروں کا اور اپنے ہاتھوں کا۔

اس آیت میں صرف دو اعضاء منہ اور ہاتھ کا ذکر ہے اور آیت مطلق ہے اس میں ایک یا دو ضربوں کی قید نہیں۔ تو یہ آیت دلیل ہے کہ ایک ہی ضرب کافی ہے۔ دو ضربوں والی احادیث اخبار احاد ہیں جو مطلق کتاب اللہ کو تبدیل نہیں کر سکتیں اور نہ ہی اس آیت کی ناسخ بن سکتی ہیں جیسا کہ اصول الفقہ کی کتابوں سے ثابت ہے پھر نص میں صرف ہاتھوں کے مسح کا ذکر ہے اور مسح میں شرط یہ ہے کہ ہاتھوں سے زائد حصہ پر کہنیوں سمیت مسح ہو۔ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ لفظ ید کا اطلاق پورے بازو (ہاتھ سے لے کر بغل تک) کے حصہ پر ہوتا ہے اور اس بات پر اجماع ہے کہ آیت میں مراد یہ پورا بازو نہیں ہے اور نہ ہی وہ حصہ جس پر مسح الید کا اطلاق ہو سکتا ہے اگرچہ تھوڑا ہو ورنہ لازم آئے گا کہ دونوں بازوؤں کا مسح کافی ہے اور ہاتھ اس میں شامل نہیں اور یہ اجماع کے خلاف ہے اس لئے ید سے مراد قدر معین ہو گی لیکن وہ مجہول ہے۔ ذراعین والی روایت اس کے لئے بیان ہوگی۔ میں کہتا ہوں اس مقام پر آخری توجیہہ یہی ہو سکتی ہے۔

لفظ ید کی حقیقت

میرے دل میں شک ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ ید انگلیوں سے کلائی تک کے لئے بولا جاتا ہے۔ خواہ وہ بازو کے ساتھ ہو یا بازو اور کندھے کے ساتھ ہو۔ اس کا اطلاق صرف کندھے پر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی صرف بازو پر یہ بازو بالکل ظاہر ہے۔

لفظ ید (ہاتھ) عربی زبان میں کبھی صرف کلائی تک حصہ کے لئے بولا جاتا ہے اور کبھی کہنیوں تک اور کبھی بغل تک کے لئے۔ آیت مقدسہ میں لفظ ید (ہاتھ) مطلق ہے۔ سو تیمم میں مطلق ہاتھ کا مسح واجب ہے۔ یا تو صرف ہتھیلی کا یا دونوں بازوؤں کا یا ہاتھ اور کہنیوں تک پورے بازو کا۔ کہنیوں کو بھی شامل کرے گا یا نہیں تو کہتے ہیں یہ واجب تو نہیں لیکن اسے اختیار ہے اگر کہنیوں پر بھی ہاتھ پھیر لے تو جائز ہے اور یہ کوئی بعید نہیں۔ وہ روایات جو کہنیوں تک مسح کرنے کو بیان کرتی ہیں اور وہ روایات جو بغل تک مسح کو بیان کرتی ہیں وہ اس پر منطبق ہوں گی۔

حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس کے مطابق ہتھیلی کا مسح کافی ہے اور اس کے علاوہ باقی بازو کا مسح ضروری نہیں پھر ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آیت میں اجمال ہے لیکن حضرت عمار کی حدیث اس اجمال کے لئے بیان ہے کیونکہ اس باب میں یہ کم از کم حد ہے جو بیان ہوئی ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ کہنی یا بغل تک مسح صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ قیامت کے دن یہ اعضاء زیادہ سے زیادہ چمکیں جیسا کہ حدیث ابو ہریرہ سے ثابت ہے۔ یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علماء نے خوب بحث کی ہے اور کئی لغزش کا شکار بھی ہوئے ہیں۔ تیمم کی نیت یہ ہے کہ انسان طہارت یا عبادت مقصودہ کو مباح کرنے کا قصد کرے۔

جس مقصد کے لئے تیمّم کیا جائے صرف اُسی کے لئے شمار ہوگا

اگر کسی شخص نے تلاوت کلام مجید کی غرض سے تیمم کیا یا نماز جنازہ کے لئے یا قرآن کریم کو چھونے کے لئے تو اس سے فرض نماز ادا نہیں ہوسکتی۔

وقدروی ابو جهيم قال مررت بالنبي صلى الله عليه وسلم وهويبول فسلمت عليه فلم يرد على السلام حتى قام الى جدار فحته لعصا كانت معه ثم وضع يديه على الجدار فمسح وجهه وذراعيه ثم رد علی.

ابوجہیم سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے پاس سے گزرا۔ آپ پیشاب فرما رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا مگر آپ نے سلام کا جواب نہ دیا حتیٰ کہ آپ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوگئے اور ہاتھ میں جو لاٹھی تھی اسے لہرایا۔ اپنا ہاتھ مبارک دیوار پر رکھا اور ہاتھ کو چہرے اور دونوں بازوؤں پر پھیرا پھر میرے سلام کا جواب دیا۔

اس حدیث کو محی السنۃ نے شرح السنۃ میں بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

اس حدیث کو بنیاد بنا کر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ عبادت مقصودہ کی نیت کے بغیر بھی تیمم ہوسکتا ہے مگر یہ بات تو اس وقت صحیح ہوتی جب حضور ﷺ اس تیمم سے نماز پڑھتے۔ حدیث بالا میں یہ بات مذکور نہیں کہ آپ ﷺ نے اس تیمم کے ساتھ نماز پڑھی۔ ایسی عبادت جس کے لئے طہارت مستحب ہو ہم جواز تیمم کا انکار نہیں کرتے لیکن یہ کہتے ہیں ایسے تیمم سے نماز ادا نہیں ہوسکتی۔

شیخ ابن الھمام جواب دیتے ہیں۔ اگر تیمّم عبادت مقصودہ کی غرض سے کیا تو جائز ہے کہ اسی تیمم کے ساتھ نماز پڑھے اور عبادت مقصودہ وہ ہے جو وضو کئے بغیر نہ ہوسکتی ہو لیکن حدیث کی یہ تاویل صحیح نہیں کیونکہ یہ واقعہ مدینہ طیبہ میں پیش آیا جبکہ حضور ﷺ بیمار نہیں تھے۔

تیمّم میں نیت

امام زفر کہتے ہیں۔ تیمم کے لئے نیت شرط نہیں ہے۔ وہ اسے وضو پر قیاس کرتے ہیں لیکن یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ اصول الفقہ کی کتابوں سے ثابت ہے کہ قیاس کے لئے یہ شرط ہے کہ اصل کے بارے حکم پہلے ہوا اور اسی حکم کو

کسی علت کی وجہ سے فرع میں منتقل کیا جائے۔ وضو تیمم سے پہلے شروع ہوا لیکن وضو میں نیت نہیں۔ تیمم میں نیت کرنا ضروری ہے کیونکہ پانی میں پاک کرنے کی صلاحیت ہے لہٰذا نیت کی ضرورت نہیں لیکن مٹی خود پاک کرنے والی نہیں لہٰذا نیت ضروری ہے تاکہ دونوں میں فرق ظاہر ہو جائے۔

ہدایہ میں درمختار کے لئے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ تیمم کی بنیاد قصد پر ہے اور کبھی یہ اصول ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ آیتِ وضو سے مراد بھی تو نماز کا قصہ ہے تو اس کے لئے بھی نیت شرط ہونی چاہئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیتِ وضو میں قصد ضروری ہے کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ اذا قمتم الی الصلوۃ لیکن دھونا تو مطلق ہے اس میں شرط نہیں ہے۔ اب یہاں تیمم میں قصد کا اعتبار ہوگا کیونکہ تیمم مامور بہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ قصد کرو پاک مٹی کا نماز کے لئے اور قصد فرض ہے اور یہی قصد نیت کہلاتا ہے۔ شیخ ابن الھمام فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ مٹی کا قصد لازم آتا ہے لیکن جس معنی میں آپ لیتے ہیں اس معنی میں نیت شرط نہیں ٹھہرتی۔ نیت کیا ہے کہ انسان ارادہ کرے حدث کے اٹھنے اور اس چیز کے جائز ہونے کا جو بغیر طہارت کے جائز نہیں ہے۔

اگر کافر نے قبولِ اسلام کے لئے تیمم کیا پھر اسلام قبول کر لیا تو اب قبول اسلام کے بعد اس کا تیمم نہیں رہا۔ امام یوسف بتاتے ہیں کہ نہیں اس کا تیمم باقی ہے کیونکہ اس نے عبادت مقصودہ کی نیت سے وضو کیا ہے۔ ہدایہ میں طرفین (ابوحنیفہ، محمد) کی یہ دلیل بیان کی گئی ہے کہ تیمم کی مشروعیت ضرورت کے تحت ہے۔ یعنی عبادت کی ادائیگی جو بغیر طہارت کے نہ ہو سکتی ہو ورنہ مٹی تو اعضاء کو غبار آلود کر دیتی ہے لہٰذا تیمم صرف اسی صورت میں جائز ہے جب عبادت مقصودہ کو ادا کرنا ہو۔ جبکہ قبولیتِ اسلام کے لئے وضو ضروری نہیں ہے۔

صحیح مذہب کے مطابق غسل جنابت کے لئے بھی نیت شرط نہیں ہے کیونکہ حدث کا زائل ہونا اور نماز کا مباح ہو جانا زوال جنابت کے لئے کافی ہے۔ بعض روایات کے مطابق زوال جنابت کی نیت واجب ہے۔

تیمم میں سنت یہ ہے کہ زمین پر ہاتھ مار کر انہیں جھاڑ دیا جائے تاکہ مٹی سے چہرہ خاک آلود نہ ہو جائے۔ حدیث پاک سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین پر ہاتھ مارنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو جھاڑا۔

تیمم کا مسنون طریقہ

تیمم کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ زمین پر دونوں ہاتھ مارے جائیں پھر انہیں جھاڑا جائے پھر دونوں ہاتھوں کو چہرہ پر اس طرح پھیرا جائے کہ چہرے کی کوئی جگہ ایسی نہ رہے جس پر مسح نہ ہو پھر دونوں ہاتھ زمین پر مارے جائیں پہلے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے ساتھ دائیں ہاتھ کے ظاہر کا مسح کیا جائے۔ اس میں بھی دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے شروع کیا جائے اور ہاتھ کو کھینچتے ہوئے کہنیوں تک لایا جائے پھر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے دائیں ہاتھ کے باطن کا مسح کیا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ کہنی سے ہاتھ کھینچا جائے اور ہاتھ کے پہنچی تک لایا جائے پھر اس طرح پہلے بائیں ہاتھ کے ظاہر اور پھر باطن کا مسح کیا جائے۔ آخر میں ہاتھ کی انگلیوں کا خلال کیا جائے۔ اگر مسح کرتے ہوئے ہاتھ پر مٹی کے اثرات نہیں رہتے تو تیسری بار ہاتھ مارنا ضروری ہے۔ اگر تیمم کرتے وقت ہاتھ میں انگوٹھی ہے تو اس کا اتارنا ضروری ہے۔

کن اشیاء سے تیمّم کرنا درست ہے؟

جو چیز زمین کی جنس سے تعلق رکھتی ہے اس سے تیمم کرنا جائز ہے۔ زمین کی جنس سے مراد ایسی چیز جو زمین کے اجزاء میں سے ہو اور اسے آگ میں پکایا نہ گیا ہو اور نہ ہی یہ راکھ کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ مثلاً پتھر' اس پر غبار ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح پڑتال یا چاندی جب کان میں ہو اور اس پر مٹی لگی ہو۔ یہی حکم دوسری دھاتوں کا ہے۔

تیمم ریت سے اور اس کپڑے سے کرنا جائز ہے جس پر گرد و غبار ہو کیونکہ ریت اور گرد زمین کی جنس سے ہیں۔ جنس ارض سے تیمّم کے جواز کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے۔

قوله صلى الله عليه وسلم جعلت لی الارض مسجدا وطهورا. (رواہ بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے لئے ساری زمین مسجد اور پاک بنائی گئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ اس کی مٹی پاک ہے۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ عام کے بعض افراد کو الگ کرنا عموم کے لئے نقصان دہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے تخصیص کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ امام شافعی کا یہ قول ضعیف ہے کہ تیمم مٹی کے بغیر کسی چیز سے جائز ہی نہیں۔ اسی طرح امام ابو یوسف کا قول کہ تیمّم صرف مٹی اور ریت سے ہو سکتا ہے' ضعیف ہے۔

عن ابی هريرة رضى الله عنه ان ناسامن اهل البادية اتوا رسول الله صلى الله عليه وسلم فـقـالـوا انانكون بالرمال الاشهر الثلثة والاربعة ويكون فينا الجنب والحائض ولسنانجدماء فقال عليكم بالارض ثم ضرب بيده الارض بوجهه ضربة واحدة ثم ضرب ضربة اخرى فمسح بها على يديه الى المرفقين.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ دیہات کے کچھ لوگ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم تین چار ماہ تک ریتلے علاقے میں قیام کرتے ہیں۔ ہم سے کچھ لوگوں کو غسل جنابت کی ضرورت پڑتی ہے اور حیض والی عورتیں (طہارت حاصل کرنا چاہتی ہیں) ہم پانی نہیں پاتے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: زمین سے طہارت حاصل کرو۔ آپ ﷺ نے زمین پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے پر پھیرا' پھر زمین پر ہاتھ مارے اور کہنیوں سمیت ہاتھوں کا مسح کیا۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس حدیث کو امام احمد نے بیان کیا ہے اور اس کے سلسلۂ سند میں مثنی بن صباح نامی راوی کو متاخرین میں ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کو معجم الطبرانی میں ایک اور سند سے روایت کیا گیا ہے۔ وہ سلسلہ یہ ہے۔ طبرانی نے سلیمان الاحول سے روایت کی۔ انہوں نے سعید بن المسیب سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اس سند کے بعد مذکورہ حدیث کو بیان کرنے کے بعد طبرانی کہتے ہیں کہ سوائے اس حدیث کے سلیمان احول نے سعید سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ تیمم طہارت مطلقہ ہے' اس سے پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے اور حدث باقی نہیں رہتا۔ تیمم کے ساتھ مختلف اوقات میں کئی نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ جب تک حدث لاحق نہیں ہوتا یا پانی کے استعمال پر قادر نہیں ہو جاتا' تو طہارت باقی رہتی ہے۔

امام شافعی کی رائے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک ایک تیمم سے صرف ایک ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ دوسری نماز کے لئے دوبارہ تیمم فرض ہے۔

ہماری دلیل ابوداؤد کی یہ حدیث ہے۔

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الصعيد وضوء المسلم ان لم يجد الماء فاذا وجد الماء فليمسه بشره فان ذلك خير. (رواہ الترمذی وابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: مٹی (سے تیمم) مسلمانوں کا وضو ہے۔ اگر اس کے پاس پانی نہ ہو تو جب پانی پالے تو پھر اپنی جلد کو دھولے۔ بیشک اس میں بہتری ہے۔

پانی ملنے کی اُمید پر نماز مؤخر کرنا مستحب ہے

جس آدمی کے پاس پانی نہیں اور اسے امید ہے کہ کہیں سے مل جائے گا تو آخری وقت تک اس کے لئے نماز مؤخر کرنا مستحب ہے۔ اگر آخری وقت میں پانی مل جائے تو وضو کر لے ورنہ تیمم سے نماز پڑھے۔ اس کی نماز ادا ہو جائے گی۔ اگر نماز پڑھ لینے کے بعد پانی مل جائے تو نماز کا اعادہ نہ کرے کیونکہ حدیث پاک ہے۔

روى ابو سعيد الخدري قال خرج رجلان في سفر فحضرت الصلاة وليس معهما ماء فتيمما ثم وجدا الماء في الوقت فاعاد احدهما الصلوة بوضوء ولم يعد الاخر فاتيا رسول الله صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك فقال للذى لم يعد اصبت السنة واجزء تك صلوتك وقال للذى توضأ واعادلك الاجر مرتين. (رواہ سنن ابوداؤد)

حضرت ابوسعید خدری راوی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر گئے' نماز کا وقت ہو گیا۔ ان کے پاس پانی نہیں تھا' دونوں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی' جب نماز پڑھ چکے تو پانی مل گیا' ابھی نماز کا وقت تھا ایک نے وضو کیا اور دوبارہ نماز پڑھ لی دوسرے نے اعادہ نہ کیا۔ جب دونوں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو اپنی بپتا کہہ سنائی۔ جس نے دوبارہ نماز نہیں پڑھی تھی۔ حضور اس سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: تم نے سنت کو پالیا۔ تیری نماز جائز ہو گئی اور جس نے وضو کر کے نماز کا اعادہ فرمایا تھا۔ اس سے فرمایا کہ: آپ کو دوگنا ثواب ملے گا۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد ''تو نے سنت کو پا لیا'' کا مطلب یہ ہے کہ دین میں جو مسنون طریقہ ہے۔ تو نے اسے اختیار کیا اور دوسرے صحابی کو جو دوگنا اجر کا فرمایا تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے تیمم کر کے نماز ادا کی۔ ایک اجر تو اس فرض نماز کی ادائیگی کا اور دوسرا اجر اجتہاد کا' کہ انہوں نے اجتہاد کیا۔ اگرچہ اس سلسلے میں ان سے خطا ہو گئی لیکن وہ ثواب کے مستحق تو قرار پائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوسرا اجر نفلی عبادت کا ہے کیونکہ فرض نماز ہو چکی تھی۔ دوسری نماز نفل قرار پائی اور اس پر انہیں اجر دیا گیا۔

پانی ملنے پر نماز کا اعادہ ضروری نہیں

ایک مسافر جس کے سامان میں پانی موجود ہے۔ بھول جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے پاس پانی نہیں' وہ تیمم

کرتا ہے اور نماز پڑھ لیتا ہے مگر بعد میں یاد آ جاتا ہے کہ پانی تو موجود تھا' اس پر اعادہ لازم نہیں۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ وہ دوبارہ نماز پڑھے گا خواہ پانی خود رکھا تھا یا کسی اور نے اس کے حکم سے رکھا تھا یا حکم کے بغیر' ہر صورت میں وضو کر کے نماز پڑھے گا۔ اگر نماز کا وقت نکل چکا ہے تو قضا کرے گا کیونکہ حقیقت میں تو اس کے پاس پانی موجود ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مسافر اپنے ساتھ پانی رکھتے ہیں بھولنے کی کوئی وجہ نہیں اس پر لازم تھا کہ وہ اپنے سامان میں پانی تلاش کرتا۔

طرفین کی دلیل یہ ہے کہ اس کے پاس پانی نہیں تھا کیونکہ قدرت علم کی فرع ہے اور سفر میں پانی عموماً پینے کے لئے رکھا جاتا ہے' عام استعمال کے لئے نہیں ہاں کپڑے زیادہ رکھے جاتے ہیں جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

اگر ہم سفر کے پاس پانی تھا اور اس نے پانی نہیں مانگا اور تیمّم کر کے نماز پڑھ لی تو نماز ہو گئی۔ یہ رائے امام ابو حنیفہ کی ہے کیونکہ غیر کی ملکیت کا طلب کرنا لازم نہیں ہے۔ اگر وہ مانگنا چاہتا ہے تو تیمّم سے پہلے مانگے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ پانی دے دے اور اکثر ایسے ہی ہوتا ہے کہ وضو کے لئے پانی مل جاتا ہے۔

صاحبین کہتے ہیں کہ اگر وہ نہیں مانگتا تو تیمّم جائز نہیں۔ پہلے اپنے ہمراہی سے پانی مانگے' اگر وہ انکار کرے تو پھر تیمّم کرے۔ مشائخ' صاحبین کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔ موجودہ دور میں صحرائی علاقوں میں عام طور پر پانی نہیں دیا جاتا سو اس بارے غور و فکر کرنا چاہئے۔

قیدی اگر پانی نہ پائے

ایک شخص تندرست ہے لیکن قید کی کوٹھڑی میں بند ہے وہ پانی حاصل نہیں کر سکتا حالانکہ پانی قریب ہے یا اسے وضو کرنے کی اجازت نہیں تو وہ تیمّم کر کے نماز پڑھے۔ اگر پانی مل جائے یا باہر نکلنے پر قدرت پالے تو وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھے کیونکہ یہ عذر بندوں کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حق کی ادائیگی کے لئے وہ پاک نہیں ہے۔

اسی طرح مسافر دشمن کے خوف سے تیمّم کر کے نماز پڑھتا ہے تو اس پر قضا لازم ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

واللہ اعلم بحقیقۃ الحال.

جن چیزوں سے تیمّم ٹوٹ جاتا ہے

جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ بعینہٖ انہیں چیزوں سے تیمّم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور چیز ہے جس سے تیمّم ٹوٹ جاتا ہے' وہ اتنے پانی کے استعمال پر قدرت پاتا ہے جس سے طہارت ہو سکتی ہو۔ پانی پانے کا مطلب وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔

امام شافعی کی رائے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک پانی اگرچہ طہارت کے لئے ناکافی ہے تب بھی اسے استعمال کیا جائے گا اور اس کے ہوتے ہوئے تیمّم جائز نہ ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں جو اعضاء اس پانی سے دھل سکتے ہیں وہ دھوئے اور اس کے بعد تیمّم کرے لیکن عملاً یہ لغو ہے۔ کسی آدمی نے حدثِ اصغر (بے وضو ہونا) کیلئے تیمّم کیا پھر اسے تھوڑا سا پانی مل گیا۔ اس نے اس تھوڑے سے پانی کے ساتھ وضو کیا لیکن ایک پاؤں دھونا باقی تھا کہ پانی ختم ہو گیا'

اب دیکھا جائے گا اگر اس نے وضو کرتے وقت ہر عضو کو تین بار دھویا تو تیمم ٹوٹ گیا کیونکہ اگر وہ تین بار کی بجائے صرف ایک بار اعضاء کو دھوتا تو پاؤں بھی دھل جاتے۔ گویا اس نے پانی کا صحیح استعمال نہیں کیا ورنہ پانی تو اس کو میسر تھا۔ اب اسے دوبارہ تیمم کرنا پڑے گا۔ اگر ہر عضو کو ایک ہی بار دھویا اور ایک پاؤں دھونے سے رہ گیا تو تیمم باقی ہے کیونکہ اس کو پانی میسر نہیں آیا۔

اگر سوتے ہوئے پانی کے پاس سے گزر جائے

اگر پانی کے پاس سے سوتے ہوئے گزر گیا تو بقول علماء امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا تیمم نہیں رہا۔ وہ پانی پر پوری طرح قادر ہوا لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ قدرت علم کی فرع ہے اور سونے کی وجہ سے علم نہیں پایا جا رہا۔ کہتے ہیں کہ اگر مسافر نے تیمم کر لیا اور بھول گیا کہ اس کے زادِ راہ میں پانی ہے، تو تیمم نہیں ٹوٹے گا۔ نیند جس کی صورت میں وضو نہ ٹوٹنے کی بات کی گئی ہے وہ حقیقت میں نیند کی سی کیفیت ہے۔ ایسی کیفیت میں اگر وضو ٹوٹے تو پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جنبی کنویں کے بالکل قریب ہے لیکن اسے اس کنویں کا علم نہیں تو اس کا تیمم محض پانی قریب ہونے کی وجہ سے نہیں ٹوٹے گا۔ اس پر اتفاق ہے اور نہ ٹوٹنے کی وجہ لاعلمی ہے۔ اسی طرح سونے والا جو بیدار کے حکم میں ہے۔ اس کا تیمم باقی رہے گا۔

واللہ اعلم باحکامہ.

☆☆☆☆☆

حیض' نفاس اور استحاضہ

حیض' نفاس اور استحاضہ کی تعریف

حیض سے مراد وہ خون ہے جسے ایک صحت مند عورت کا رحم بغیر کسی بیماری کے باہر پھینکتا ہے۔ نفاس ایسے خون کو کہتے ہیں جو بچے کی ولادت کے بعد جاری ہوتا ہے اور استحاضہ بیماری کا خون ہے جو عورت کی شرمگاہ کے راستے باہر آتا ہے۔

مدتِ حیض

حیض (ماہواری کا خون) کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔ یہ مذہب احناف کا ہے۔ شوافع کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں عورتوں کے دینی نقصان کا تذکرہ ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی عورت اپنی زندگی کا ایک حصہ نماز نہیں پڑھتی۔

پس معلوم ہوا کہ نماز چھوڑنے کا عرصہ حیض کے ایام ہیں جو ان دنوں کے برابر ہیں جن میں نماز فرض ہوتی ہے۔ یعنی طہر کے ایام اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ طہر کی کم سے کم مدت پندرہ دن ہے سو حیض کی مدت بھی پندرہ دن ہوئی' یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث کمزور ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: ہم اسے نہیں پاتے۔ ابن جوزی کے بقول یہ حدیث غیر معروف ہے۔

بالغرض اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ استدلال اس بات پر موقوف ہے کہ لفظ شطر کا معنی نصف ہے لیکن شطر کا معنی نصف نہیں ہے۔ ایام طہر کا ایام حیض کے مساوی ہونا ممکن نہیں۔ حمل اور عمر یاس کے ایام میں نماز فرض ہوتی ہے پھر یہ بھی لازم نہیں کہ ہمیشہ طہر کی مدت پندرہ دن ہو اور نہ یہ لازم ہے کہ ہمیشہ پندرہ دن سے زائد ہو۔ حقیقت میں شطر کا لفظ بعض کے معنی میں ہے لہٰذا یہ کوئی دلیل نہیں۔

ہماری دلیل دارقطنی کی روایت کردہ حدیث ہے۔

عن ابی امامة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اقل الحیض للجاریة البکر والثیب الثلث واکثره عشرة ایام فاذا زاد فهی مستحاضة.

ابو امامہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: باکرہ اور شوہر دیدہ لونڈی کے حیض کی کم سے کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اگر دس دن سے زائد خون جاری رہے تو وہ استحاضہ کا خون ہے۔

وقدروی عن ابن مسعود موقوفا ومرفوعا الحیض ثلثة واربع وخمس وست وسبع وثمان وتسع وعشر فاذا زاد فمستحاضة.

حضرت ابن مسعود سے موقوفاً اور مرفوعاً روایت ہے کہ حیض تین' چار' پانچ' چھ' سات' آٹھ' نو اور دس دن ہے۔ جب بڑھ جائے تو وہ عورت مستحاضہ ہے۔

ابن عدی سے اسی طرح حضرت انس کے حوالے سے موقوفاً اور مرفوعاً روایت ہے۔

عن انس موقوفا هی حائض فیما بینها وبین عشرة وما زاد فهی بمنزلة المستحاضة. (رواہ دارقطنی)

حضرت انس سے موقوفاً روایت کرتے ہیں کہ حیض دس دن کے اندر ہوتا ہے جو اس سے زائد ہو وہ استحاضہ ہے۔

من حدیث وابلة بن الاخقع عنه علیه السلام اقل الحیض ثلثة ایام واکثره عشرة ایام واقل مابین الحیضتین خمسة عشر یوما. (رواہ دارقطنی)

وابلہ بن اخقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے اور وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کرتے ہیں کہ حیض کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے اور دو حیضوں کے درمیان (مدت طہر) کم سے کم پندرہ دن ہے۔

شیخ ابن الہمام ان روایات اور ان کے ضعف کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ تعدد طرق کی وجہ سے یہ حدیث حسن کے درجہ کو پہنچ گئی ہے۔ امام شافعی کی رائے اس سے مختلف ہے لیکن شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں' نہ ضعیف میں اور نہ ہی صحیح میں۔

مدّتِ نفاس

نفاس کی کم سے کم مدت کوئی نہیں کیونکہ بچے کی پیدائش اس بات کی علامت ہے کہ یہ خون رحم سے آ رہا ہے اس لئے مدت کی تعیین کی ضرورت نہیں۔

نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے

عن ام سلمة قالت کانت النفساء تقعد علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم اربعین. (رواہ جامع الترمذی' سنن ابوداؤد)

حضرت ام سلمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: عہد رسالت میں عورتیں چالیس دن تک بیٹھا کرتی تھیں۔

بقول شیخ ابن الہمام رضی اللہ تعالیٰ عنہ' بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تعریف کی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے۔

دارقطنی اور ابن ماجہ میں ہے:

عن انس انه صلی الله علیه وسلم وقت

حضرت انس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

للنفساء اربعین الا ان تری الطھر قبل ذلک.
فرمایا: عورتوں کی مدت نفاس چالیس دن ہے۔ مگر یہ کہ اس سے پہلے طہر دیکھ لیں۔

شیخ ابن الھمام اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اسے متعدد طرق سے روایت کیا گیا ہے اور یہ طعن سے خالی نہیں ہے لیکن طرق کی کثرت کی وجہ سے یہ حسن کے درجہ کو پہنچ گئی ہے۔ نفاس کے دنوں میں کچھ دن کے لئے خون رک گیا پھر چند دن کے بعد جاری ہو گیا تو درمیان کے یہ دن نفاس کے دن ہی شمار ہوں گے۔ یہ مذہب امام ابوحنیفہ کا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفاس کا خون کبھی آتا ہے اور کبھی رک جاتا ہے لہٰذا مدت نفاس کے درمیان میں طہر کا اعتبار نہیں ہوگا۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ اگر مسلسل پندرہ دن خون نہ آئے تو عورت نماز ادا کرے۔ پندرہ دن کے بعد جو خون نظر آ رہا ہے۔ اگر وہ صحیح ہے تو حیض ہے ورنہ استحاضہ ہے۔

ایک عورت کے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے تو نفاس پہلے کی پیدائش سے شمار ہوگا کیونکہ نفاس حیض ہی کا خون ہوتا ہے۔ جو رحم کا منہ بند ہونے کی وجہ سے رک جاتا ہے اور اس خون میں سے کچھ تو بچے کی خوراک بنتا ہے اور بقیہ نفاس کی صورت میں پیدائش کے بعد نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ بچے کی ولادت کے بعد جب رحم کا منہ کھلتا ہے اور خون نکلنا شروع ہو جاتا ہے تو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ فالتو خون ہے۔ اگر چالیس دن کی مدت پوری ہو گئی اور اس کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا تو یہ خون نفاس شمار نہیں ہوگا کیونکہ پہلے بچے کی ولادت کے بعد جو خون جاری ہوا اس کی مدت نفاس پوری ہو چکی ہے لہٰذا اب معلوم ہے کہ یہ وہ خون نہیں۔ اگر اسے حیض بنانا ممکن ہو تو یہ حیض ہے ورنہ استحاضہ ہے۔

اگر مدت سے پہلے جنین ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی خلقت مکمل ہے۔ (اعضائے انسانی نظر آتے ہیں) تو یہ خون نفاس ہے کیونکہ یہ مردہ بچہ ہے اور اس کے بعد نکلنے والا خون حیض کا رکا ہوا وہ خون ہے جو اس کی خوراک سے بچ گیا ہے۔

ایامِ حیض میں چند دن خون نہ آنا

مدتِ حیض میں چند دن اگر خون نہیں آیا اور پھر سے شروع ہو گیا ہے تو وہ چند دن حیض ہی کے شمار ہوں گے، اس میں بہت اختلاف ہے۔ پوری بحث شرح وقایہ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

عبادات پر اثر

حیض و نفاس نماز، روزے، جماع سے مانع ہیں۔ عورت ان دنوں کے روزے رکھے گی لیکن نماز معاف ہے۔
نماز اور روزے کے بارے اس حکم کی دلیل یہ ہے:

فلما روت معاذة سألت عائشة فقلت ما بال الحائض لاتقضی الصلوة وتقضی الصوم فقالت احرورية انت قلت لست
معاذہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کردہ حدیث ہے۔ کہتی ہیں کہ میں نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ حیض والی عورت نماز کی قضا

بحرورية ولكني اسأل قالت كان يصيبنا ذلك فنومر بقضاء الصوم ولانومر بقضاء الصلوة. (رواہ صحیح بخاری وصحیح مسلم)

نہیں کرتی لیکن روزے کی قضا کرتی ہے؟ انہوں نے فرمایا: کیا تو حروریہ (دیہات کا نام جو کوفہ کے قریب تھا اور جہاں خارجیوں کا پہلا اجتماع ہوا تھا چونکہ وہ نمازوں کی قضا کے بھی قائل تھے اس لئے ام المؤمنین نے سوال کیا) ہے۔ میں نے عرض کیا: میں حروریہ تو نہیں ہوں لیکن ویسے پوچھ رہی ہوں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: ہمیں ایسی صورت حال پیش آتی تھی اور ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا جاتا ہے اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔

عن ام المؤمنين ام سلمة كانت المرأة تقعد في النفاس اربعين ليلة ولا يامرها النبي صلى الله عليه وسلم بقضاء صلوة النفاس. (رواہ سنن ابوداؤد)

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ عورت نفاس میں چالیس رات تک بیٹھتی تھی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اسے ان دنوں کی نماز کی قضا کا حکم نہیں فرماتے تھے۔

اسی طرح جامع الاصول میں ہے۔ علماء نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ نماز کی قضاء میں حرج ہے لیکن روزوں کی قضاء میں حرج نہیں پھر نماز کی ادائیگی یا قضا کے عدم وجوب سے معلوم ہوا کہ حیض اور نفاس وجوبِ صلاۃ کی اصل کو اٹھانے والے ہیں کیونکہ نفس وجوب یا تو صحت اداء کے لئے ہوتی ہے یا قضا کے واجب ہونے کے لئے جبکہ یہ دونوں چیزیں نہیں پائی جارہیں تو نفس وجوب بھی نہیں ہوگا۔

روزے کی قضا کے واجب ہونے سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اصل میں روزہ حائض عورت پر فرض تھا۔ اسی طرح نفاس والی عورت پر بھی فرض تھا لیکن اس مانع کی وجہ سے وہ ادا نہیں کرسکتی تھیں اور نہ ہی ان کی ادائیگی صحیح ہوسکتی تھی لیکن نماز میں جب اصل فرضیت ثابت ہی نہیں تو قضا کس چیز کی۔

مباشرت کا حکم

جیسا کہ گزشتہ سطور میں آپ ملاحظہ کرچکے ہیں کہ حیض اور نفاس والی عورت کے ساتھ مباشرت جائز نہیں۔ اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیتِ کریمہ ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ. (البقرۃ:۲۲۲) اور انکے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ وہ پاک ہوجائیں۔

حالتِ حیض میں عورت سے جماع گناہ کبیرہ ہے، مرتکب کو توبہ کرنی چاہئے۔ ایک آدھ دینار کا صدقہ کردینا مستحب ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وطی شروع حیض میں ہے تو ایک دینار اور اگر آخر حیض میں جماع کیا تو نصف دینار صدقہ کرنا مستحب ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ تھوڑے اور زیادہ میں کسی قسم کا اختیار نہیں ہے۔ اس کے بارے حدیث مبارک کافی ہے۔

روی ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم فی الذی یاتی اهله وهو حائض قال یتصدق بدینار اونصف دینار.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک حدیث ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص حیض کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کرے تو وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔ یہ حدیث پہلی روایت کے لئے حجت ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں کہ:

انه قال صلی الله علیه وسلم اذا اصابها اول الدم والدم دم احمر فدینار وان اصابها فی انقطاع الدم والدم دم اصفر فنصف.

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب مرد عورت کے ساتھ شروع حیض میں جماع کرتا ہے تو خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ سو ایک دینار (صدقہ کرے) اور اگر خون کے خاتمے کے دوران جماع کیا تو ان دنوں زردی مائل خون آتا ہے سو نصف دینار (صدقہ کرے)۔

یہ حدیث دوسری روایت کے لئے حجت ہے۔

جب عورت بتائے کہ میں حیض سے ہوں لیکن مرد اس کی تکذیب کرے اور جماع کرلے یا اس کی تصدیق کے باوجود جماع کرے تو دونوں صورتوں میں حرمت میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ایسے معاملات میں عورت کی خبر مقبول ہوتی ہے اور اس کے باوجود جماع کیا تو یہ حرام کا مرتکب ہوا۔

استمتاع کا حکم

بغیر جماع کے مباشرت امام ابوحنیفہ، امام یوسف، امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک ناف سے لے کر گھٹنوں تک حرام ہے اور اس سے اوپر بوس و کنار اور لمس وغیرہ حلال ہے۔

عن ام المؤمنین میمونة قالت کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا اراد ان یباشر امرأة من نسائه امرها فازرت وهی حائض.

ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ اپنی کسی زوجہ محترمہ سے مباشرت کرنا چاہتے تو اسے حکم دیتے اور وہ حیض کی صورت میں ازار باندھ لیتی۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

امر وجوب کے لئے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جسم کا جو حصہ ازار سے نیچے ہے، وہ حرام ہے۔

عن عبد الله بن سعد سألت رسول الله صلی الله علیه وسلم مایحل لی من امرأتی وهی حائض قال لک مافوق الازار.

(رواہ سنن ابوداؤد)

عبداللہ بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ سے پوچھا کہ حیض کی حالت میں میری بیوی کے جسم کا کون سا حصہ میرے لئے حلال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اوزار سے اوپر کا حصہ تیرے لئے ہے۔

عن زید بن اسلم قال مایحل لی من امرأتی وھی حائض قال تشد علیھا ازارھا ثم شانک ماعلاھا.

زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: میری بیوی کے جسم کا کون سا حصہ میرے لئے حلال ہے جب وہ حالت حیض میں ہو؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اپنا آزار باندھ لے پھر اس سے اوپر کا حصہ تیرا ہے۔

اسے امام مالک نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث نص ہے کہ ازار باندھنا واجب ہے اور اس سے اوپر کا حصہ حلال ہے۔ اس سے آگے کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

امام محمد اور امام احمد فرماتے ہیں کہ فرج کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ مسلم وغیرہ محدثین نے روایت کیا ہے کہ یہودی حالتِ حیض میں نہ تو عورت کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور نہ ہی ان کے ساتھ ایک گھر میں قیام کرتے۔ صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے پوچھا تو یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ (البقرۃ:۲۲۲) اور آپ سے حیض کے بارے سوال کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جماع کے علاوہ سب کچھ کرو۔ ایک روایت میں نکاح کے لفظ کی جگہ جماع کا لفظ آیا ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ عام کے ساتھ خاص معارض آ جائے تو حرمت والی کو ترجیح ہوگی۔

شاید حدیث پاک میں جماع سے مراد ازار کے نیچے کے حصہ سے لطف اندوز ہونا ہے کیونکہ وہ جماع کے حکم میں ہے یا غالباً جماع کی طرف لے جانے والا عمل ہے۔

وطی کرنا کب درست ہوگا؟

دس دن مکمل ہونے پر جب خون رک گیا تو وطی حلال ہے۔ اگر تین دن کے بعد عادت سے کم مدت میں خون ختم ہوا تو وطی حلال نہیں اگرچہ وہ غسل کر لے جب تک عادت کے مطابق مدت پوری نہیں ہو جاتی (بعض عورتوں کو پانچ دن آتا ہے اور کچھ عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ انہیں حیض کا خون سات' آٹھ دن آتا ہے اگر عادت سے پہلے رک گیا تو ہوسکتا ہے کہ دوبارہ شروع ہو جائے اس لئے وطی حلال نہیں جب تک عادت کے دن گزر نہیں جاتے)۔

اگر دس دن مکمل ہونے سے پہلے خون رک گیا لیکن عادت کے دن گزر چکے ہیں تو اس وقت تک وطی جائز نہیں جب تک وہ غسل نہیں کر لیتی یا غسل اور نماز کا وقت گزر نہیں جاتا۔ اگر وقت صرف اتنا پایا کہ غسل کر کے تکبیر تحریمہ کہہ سکتی تھی' غسل کر کے نماز کے لئے کھڑی نہیں ہوتی تو جماع بغیر غسل کے حلال ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ کسی صورت غسل سے پہلے وطی حلال نہیں۔ ان کی دلیل قرآن کریم کی آیت میں حرف تشدید ہے۔ حتی یطھرن. اس میں ایک قرأت تشدید کے ساتھ بھی ہے یعنی جب تک اچھی طرح پاک نہیں ہو جاتیں۔ (الفاظ کی کثرت معانی کی کثرت یعنی مبالغہ پر دال ہوتی ہے۔ تشدید کی قرأت میں معنی ہوگا پوری طرح پاک ہونا) ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ ھُوَ اَذًی فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ. (البقرة:۲۲۲)	آپ سے حیض کے بارے سوال کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ وہ تکلیف ہے (اس لئے) حیض میں عورتوں سے الگ رہو۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حلت سے مانع تکلیف ہے ورنہ عورت فی نفسها حلال ہے۔ جب حیض سے پاک ہوگئی تو تکلیف نہ رہی تو حلت لوٹ آئی جس طرح پہلے حلال تھی۔ غسل تک ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر دس دن تک خون آتا رہا تو اب تو یقین ہو گیا ہے کہ تکلیف نہیں رہی۔ اگر دس دن سے کم مدت میں بند ہو گیا ہے تو انتظار کرے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ دوبارہ آنا شروع ہو جائے اس لئے تاخیر واجب ہے تاکہ تکلیف ختم ہو جانے کا یقین ہو جائے۔ اب جب عورت نے غسل کر لیا تو شرعاً اس کا پاک ہونا معتبر ہے کیونکہ اس کا نماز پڑھنا صحیح ہو گیا۔ اب شارع کی نظر میں کوئی تکلیف نہیں لہٰذا اس کے ساتھ وطی جائز ہے اور اسی طرح جب اس نے غسل نہ کیا اس عورت کی طرح جس پر غسل اور نماز کا وقت گزر چکا اور نماز اس کے ذمہ قرض ہوگئی تو وہ شارع کی نظر میں پاک ہے اور ان کی نظر میں اب کوئی اذیت کا معاملہ نہیں لہٰذا جماع حلال ہو گیا۔

اگر سابقہ معمول سے پہلے خون بند ہو گیا تو یہ احتمال بھی ہے کہ دوبارہ شروع ہو جائے۔ ایسی صورت میں جماع حلال نہیں۔ جب تک گمان یقین میں نہیں بدل جاتا وطی حرام رہے گی لیکن اس کے باوجود عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ غسل کرے اور نماز پڑھے کیونکہ نماز بہت عظیم حکم ہے محض احتمال سے ساقط نہیں ہوسکتی۔ احتیاطاً وہ نماز پڑھے۔ مذکورہ آیتِ کریمہ کو اگر تشدید نہیں بلکہ تخفیف والی قرأت سے پڑھیں تو ایسی صورت میں عورت پاک شمار ہوگی۔ اگر یطھرن کو تشدید کے ساتھ پڑھیں تو اس کا مطلب ہوگا پوری طہارت حاصل ہو جائے اور وہ مانع ختم ہو جائے جس کی وجہ سے نماز، روزہ اور اجماع نہیں ہوسکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورت غسل کرے۔ اس موضوع پر کتبِ فقہ میں طویل مباحث ہیں۔ یہاں اتنا ہی مقصود تھا۔ اگر تفصیل مقصود ہو تو ہماری شرح فواتح الرحموت دیکھئے۔

جنابت مباشرت سے مانع نہیں

جنبی اپنی اہلیہ سے جماع کرسکتا ہے کیونکہ حدیث مبارک بطور دلیل ہے۔

لما روی انس ابن مالک ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یطوف بغسل واحد علی نساء. (رواہ صحیح بخاری)	حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام ایک ہی غسل کے ساتھ اپنی تمام ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔

(یعنی تمام ازواج سے جماع کرنے کے بعد صرف ایک دفعہ غسل فرماتے)۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ پہلے جماع کے بعد وضو کرلے پھر دوسری بار جماع کرے۔ ایک دوسری حدیث سے بھی یہی ثابت ہے۔

لما روی ابو سعید الخدری ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اذا اتی	حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص

احدکم اهله ثم بدا له ان یعود فلیتوضا بینهما. (رواہ صحیح مسلم)

اپنی اہلیہ سے جماع کرے پھر وہ دوبارہ وطی کا خواہش مند ہو تو دونوں کے درمیان وضو کر لے۔

جنابت میں کھانا پینا

جنبی کے لئے کھانا، پینا اور گفتگو کرنا جائز ہے۔

عن عبد الله بن ابی قیس قال سألت عائشة عن وتر رسول الله صلی الله علیه وسلم فذکر الحدیث وفیه قلتُ کیف یصنع فی الجنابة اکان یغتسل قبل ان ینام او ینام قبل ان یغتسل قالت کل ذلک قد کان یفعل فربما یغتسل فنام وربما توضأ فنام فقلت الحمد لله الذی جعل فی الامر سعة.

(رواہ صحیح مسلم)

عبداللہ بن ابی قیس سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی نماز وتر کے بارے پوچھا۔ اس کے بعد انہوں نے پوری حدیث بیان کی۔ اس حدیث میں جنابت کے بارے بھی سوال تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: حالتِ جنابت میں آپ کیا کرتے تھے، کیا سونے سے پہلے غسل فرما لیتے تھے یا غسل سے پہلے سو جاتے تھے؟ فرمانے لگیں: آپ ﷺ یہ سب کچھ کرتے۔ کبھی غسل فرما کر سو جاتے اور کبھی وضو فرما کر سوتے۔ (راوی کہتے ہیں کہ) میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی کہ اس نے اس معاملہ میں وسعت فرمائی ہے۔

بہتر یہ ہے کہ شرم گاہ سے نجاست کو دھو ڈالے، وضو کرے اور پھر سوئے کیونکہ حدیث مبارک ہے۔

لما روی ابن عمران امیر المؤمنین عمر ذکر لرسول الله صلی الله علیه وسلم ان یصیبه الجنابة من اللیل فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم توضأ واغسل ذکرک ثم نم.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ رات کو انہیں غسل جنابت کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وضو کر لیا کریں، شرمگاہ کو دھو لیا کریں اور پھر سویا کریں۔

شیخ اکبر فتوحاتِ مکیہ میں فرماتے ہیں کہ میں محمد بن یوسف عزیزی کے واقعہ میں پڑھ رہا تھا کہ انہوں نے فرمایا: مجھے اپنے مرشد محمد بن اسماعیل بخاری نے فرمایا ہے کہ حالت جنابت میں غسل کرنے سے پہلے نہ سویا کریں۔ فرماتے ہیں پھر میں نے محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ میں دیکھا تو انہوں نے غسل سے پہلے سو جانے سے منع فرمایا تو میں نے سونے سے پہلے غسل لازم کر لیا۔ اگر رات سرد ہو تو میں گرم پانی سے غسل کر لیتا ہوں۔

ایامِ مخصوصہ اور جنابت کی حالت میں تلاوت قرآن

حیض، نفاس اور حالت جنابت میں قرآن کریم کی تلاوت جائز نہیں۔

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاتقرء الحائض والجنب القران.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حائضہ عورت اور جنبی قرآن نہ پڑھیں۔

اسے ترمذی اور نسائی نے حائض کے حکم میں بیان کیا ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں: آیت کا کچھ حصہ پڑھنا جائز ہے۔ صاحبِ ہدایہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث امام طحاوی کے خلاف حجت ہے حالانکہ صاحبِ ہدایہ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ حیض، نفاس اور جنابت کی حالت میں قرآن کریم کی تلاوت ممنوع ہے اور آیت سے کم حصہ کی تلاوت کو تلاوت قرآن نہیں کہہ سکتے اسی لئے آیت سے کم تلاوت کے ساتھ نماز نہیں ہوتی حالانکہ نماز میں قرأت کا حکم مطلق ہے۔

امام کرخی فرماتے ہیں اگر کسی ایک کلمہ کا تلفظ کیا تو کوئی حرج نہیں۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ جو عورت قرآن کریم پڑھاتی ہے وہ امام کرخی کے بقول ایک ایک کلمہ الگ الگ کر پڑھائے۔ امام طحاوی کے نزدیک آدھی آدھی آیت پڑھائے۔

اگر کسی نے شکر کی نیت سے الحمد لله رب العالمین کہا یا تبرک کے لئے بسم الله الرحمن الرحیم پڑھا تو جائز ہے۔ یہ آیات کیونکہ اس نے تلاوت کی نیت سے نہیں پڑھیں اس لئے یہ قرآن کی تلاوت نہ ہوئی۔ گویا نیت کا عمل دخل بھی ہے۔ حیض اور جنابت کی حالت میں آیت سے کم پڑھنا جائز ہے۔

ناپاکی کی حالت میں قرآن کو چھونا

بے وضو شخص قرآن کریم کی تلاوت کر سکتا ہے (ہاتھ لگائے بغیر) اس کی دلیل یہ ہے۔

لما روی عبد الله بن سلمة قال اتیت علیا انا ورجلان فقال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یخرج من الخلاء ویقرء القرآن ویاکل معنا اللحم ولم یکن حجاب من القرآن شئی لیس الجنابة.

(رواہ سنن نسائی)

عبداللہ بن مسلم سے روایت کردہ حدیث ہے۔ فرماتے ہیں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ساتھ دو اور آدمی بھی تھے۔ (حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو قرآن کریم پڑھتے اور ہمارے ساتھ (بیٹھ کر) گوشت تناول فرماتے۔ آپ ﷺ کو سوائے جنابت کے کوئی چیز قرآن کریم کی تلاوت سے نہ روکتی۔

حیض، نفاس، جنابت اور حدث (بے وضو) کی صورت میں قرآن کریم کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ سوائے اس غلاف کے جس میں لپٹا ہو کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَايَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ. (الواقعہ:۷۹)

اسے نہیں چھوتے مگر پاک لوگ۔

غلاف کے ساتھ چھونا

ہاں اگر قرآن کریم غلاف میں لپٹا ہو تو اسے چھونا جائز ہے کیونکہ ایسی صورت میں محسوس غلاف ہے نہ کہ قرآن کریم۔ اگر غلاف جلد کے ساتھ سلا ہوا ہو تو پھر جائز نہیں کیونکہ ایسی صورت میں عرف عام کے مطابق قرآن کریم کا چھونا شمار ہوگا نہ کہ غلاف کا۔ اسی طرح آستین کے کپڑے کے ساتھ قرآن کو چھونا جائز نہیں کیونکہ آستین ہاتھ کے تابع ہے۔

بعض مشائخ کے نزدیک قرآن کریم کے حروف کو چھونا ممنوع ہے نہ کہ اوراق کو کیونکہ قرآن اوراق یا جلد کا نام نہیں حروف کا نام ہے لیکن صحیح رائے جسے اختیار کیا گیا ہے وہ پہلی ہے کیونکہ ناپاک آدمی کے لئے اس چیز کو چھونا ممنوع ہے جسے عرف عام میں قرآن کہتے ہیں۔ ورنہ حروف تو وہ نقش ہیں جو قرآن پر دلالت کرتے ہیں لیکن قرآن نہیں۔ عرف عام میں اوراق اور جلد کے مجموعے پر قرآن کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جو شخص قرآن کریم کی جلد کو ہاتھ لگائے گا یہی کہا جائے گا کہ اس نے قرآن کریم کو ہاتھ لگایا ہے۔

ناپاکی کی حالت میں مسجد میں جانا

حیض، نفاس اور حالت جنابت میں مسجد کے اندر جانا جائز نہیں۔ اگرچہ صرف گزرنے کا ہی ارادہ کیوں نہ ہو۔ اگر مسجد میں سویا ہوا تھا اور احتلام ہو گیا تو بیدار ہوتے ہی فوراً باہر آ جائے۔ ایسی صورت میں باہر آنے کے لئے تیمم کرے اور پھر باہر نکلے۔ اس کی دلیل یہ ہے۔

لما روى ام المؤمنين عائشة الصديقة قالت جاء رسول الله صلى الله عليه وسلم ووجوه بيوت اصحابه شارعة في المسجد فقال وجهوا هذه البيوت عن المسجد ثم دخل ولم يصنع القوم شيئا رجاء ان ينزل فيهم رخصة فخرج اليهم فقال وجهوا هذه البيوت عن المسجد فاني لا احل المسجد لحائض والجنب.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کردہ حدیث ہے۔ آپ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے (تو دیکھا کہ) آپ کے صحابہ کرام کے گھروں کے دروازے مسجد کی طرف تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان گھروں کے دروازے مسجد سے دوسری طرف لگاؤ پھر آپ مسجد میں تشریف لائے۔ لوگوں نے اس امید پر کچھ نہ کیا کہ آپ انہیں رخصت دے دیں گے۔ آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: ان گھروں کے دروازوں کو مسجد سے پھیر دو میں مسجد کو حیض والی عورتوں اور جنبی مردوں کے لئے حلال قرار نہیں دیتا۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

خطابی نے اس حدیث کو ضعیف کہہ کر غلطی کی ہے۔ ان کے نزدیک اس حدیث کا ایک راوی مجہول ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج والی بات نہیں۔ پوری گفتگو فتح القدیر میں مذکور ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسجد میں جنبی داخل ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ گزرنے کا ارادہ ہو۔ ان کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیتِ کریمہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا. (النساء : ۴۳)

اے ایمان والو! نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ جب تک اتنا ہوش نہ ہو کہ جو کہو اسے سمجھو اور نہ ناپاکی کی حالت میں بے نہائے مگر مسافری میں۔

امام شافعی کے نزدیک لا تقربوا الصلوۃ میں لفظ موضع محذوف ہے۔ اصل میں موضع الصلوٰۃ ہے۔ یعنی نماز کی جگہ (مسجد) کے قریب مت آؤ' نشہ کی حالت میں اور ناپاکی کی حالت میں۔ ان کے نزدیک عابر سبیل سے مراد مسافر نہیں بلکہ مسجد سے گزرنے والے ہیں جنہیں اس حکم سے مستثنیٰ کیا گیا ہے لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح تو جنبی کے لئے نماز پڑھنے کا جواز نکلتا ہے۔

دراصل یہ آیتِ کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب شراب کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے دعوت کی' مہمانوں نے کھانے کے بعد شراب پی اور جب نماز پڑھی تو نشہ کی وجہ سے لا اعبد ما تعبدون کی جگہ اعبد ما تعبدون پڑھ گئے تو یہ آیت نازل ہوئی (شراب بعد میں قطعی طور پر حرام کردی گئی بلکہ اس کے برتن کا استعمال بھی ممنوع ہوگیا)۔

پھر ولا جنبا کا عطف انتم سکاری پر ہے جو حال ہے لہٰذا معطوف اور معطوف علیہ پر ایک ہی حکم لگے گا۔ نماز کو مسجد پر عطف کی صورت میں کیسے محمول کیا جاسکتا ہے۔

رہا یہ اعتراض کہ اس سے جنبی کا جواز صلوٰۃ لازم آتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ اس کا التزام کرے گا تب۔

نماز کے لئے طہارت ضروری ہے

عابر السبیل سے مراد مسافر ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ جنبی کبھی بھی نماز کے قریب نہ جائے الا یہ کہ مسافر ہو۔ تو مسافر کے لئے کبھی کبھار جنابت کی حالت میں جبکہ پانی نہ ملے' نماز پڑھنا جائز ہے۔

یہ حکم آیت تیمم کے نزول سے پہلے کا ہے' اس سے پہلے پانی نہ ہونے کی صورت میں حالت جنابت میں نماز جائز تھی۔ یہ آیت حضرت حمزہ کی شہادت سے پہلے کی ہے جبکہ تیمم والی آیتِ کریمہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد نازل ہوئی لہٰذا آیت تیمم کے نزول کے بعد پانی نہ ہونے کی صورت میں جنبی کا بغیر طہارت کے نماز پڑھنا لازم نہیں آتا جیسا کہ اس آدمی کے حق میں فتویٰ دیا جاتا ہے جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہیں اور کوئی اس کو وضو کرانے والا نہیں۔ آیت تیمم کے نزول کے بعد استثناء کا حکم منسوخ ہوگیا۔ اب اگر پانی نہیں تو تیمم کر کے نماز پڑھنا فرض ہوگا اور جنبی طہارت کے لئے تیمم کرے گا۔ اس آیت کی تفسیر میرے نزدیک اتنی ہی ہے۔

شیخ ابن الھمام رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب دیتے ہوئے کہ آیت میں صلوٰۃ اپنے حقیقی معنی میں ہے فرماتے ہیں: آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جنبی نماز نہ پڑھے' ہاں مسافر ہو تو پڑھ سکتا ہے مگر وہ بھی تیمم کر کے نماز پڑھے گا۔ اکثر

مفسرین مثلاً بیضاوی اور صاحب معالم التنزیل وغیرہما اسی طرف گئے ہیں لیکن یہ اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت تیمم مشروع نہ ہو۔ اور یہ بھی ہے کہ جب مسافر تیمم کرلے گا تو وہ جنبی نہیں رہے گا اس لئے استثناء صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ الا ' لکن کے معنی میں ہو۔ ایسی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جنبی نماز کے قریب نہ جائے لیکن مسافر جب اس کے پاس پانی نہ ہو تو تیمم کے ساتھ جنابت دور کرکے وہ نماز کے قریب جاسکتا ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ تیمم کرنے والا حالت جنابت پر رہتا ہے صرف اتنا ہوتا ہے کہ نماز کی ادائیگی کی ضرورت کے تحت اس کے لئے نماز مباح ہو جاتی ہے جیسے استحاضہ والی عورت کے لئے ضرورتاً نماز پڑھنا جائز ہوتا ہے مگر امام بیضاوی کے نظریہ کو حضور ﷺ کی یہ حدیث رد کرتی ہے۔

قولہ صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجدا وطھورا

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے لئے زمین مسجد اور پاک بنائی گئی ہے۔

دوسری حدیث پاک میں ہے:

قولہ ﷺ التراب طھور المسلم ما لم یجد الماء.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مٹی مسلمان کے لئے پاکیزگی ہے جب تک پانی نہیں پالیتا۔

ایامِ خاص کے بعد غسل اور خوشبو کا استعمال

حیض اور نفاس کے خون کے بعد غسل فرض ہے۔ اس پر امت کا اجماع ہے اور یہ چیز ضروریاتِ دین کی حیثیت رکھتی ہے۔ عورت کو چاہیے کہ حیض کا خون بند ہو تو غسل کرے اور پورے جسم پر خوشبو لگائے اور شرمگاہ پر بھی خوشبو لگائے۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة ان امرأة من الانصار سألت نبی اللہ عن غسلها من الحیض فامرها کیف یغتسل ثم قال خذی فرصة من مسک فتطهری بها قالت کیف اتطهر فقال تطهری بها قالت کیف اتطهر بها قال سبحان اللہ تطهری فقلت تتبعی بها اثر الدم.

(رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک انصاری عورت نے اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ سے غسل حیض کے بارے پوچھا تو آپ نے اسے بتایا کہ وہ کیسے غسل کرے۔ فرمایا: خوشبو کی ڈلی لے اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو پاک کر۔ وہ عورت عرض کرنے لگی۔ کیسے اچھی طرح پاک کروں؟ آپ نے پھر فرمایا کہ اس کے ساتھ اچھی طرح پاکیزگی حاصل کر۔ کہنے لگی کیسے اچھی طرح پاکیزگی حاصل کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! اپنے آپ کو اچھی طرح پاک کر۔ (حضرت عائشہ فرماتی ہیں) میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا خوشبو کی اس ڈلی سے خون کے اثر کو ختم کر۔

استحاضہ اور اس کی مدت کا تعین

مستحاضہ (وہ عورت جو بیمار ہے اور بیماری کی وجہ سے شرم گاہ کے راستے اسے مسلسل خون آتا ہے۔ یہ خون درحقیقت رحم سے نہیں ایک رگ سے آتا ہے) لو اگر مسلسل خون آرہا ہے تو دیکھیں گے اگر پہلی بار آنا شروع ہوا ہے تو ہر مہینے دس دن حیض کے شمار کرے۔ ان دنوں میں نماز اور روزہ سے اجتناب کرے اور باقی دن طہر کے گمان کرتے ہوئے غسل کرلے اور نماز پڑھے۔ اگر حیض کے لئے کوئی معروف عادت ہے (مثلاً اس کی عادت ہے کہ ساتویں دن خون بند ہو جاتا ہے)۔ تو عادت کے مطابق حیض شمار کرے اور ان ایام کے گزر جانے کے بعد غسل کرے اور عادت کے مطابق جو دن طہر کے بنتے ہیں ان میں وضو کر کے نماز ادا کیا کرے۔

فقد روی ام المؤمنین عائشة الصديقة جاء ت فاطمة بنت جيش الى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت يا رسول الله انى استحاض فلا اطهر افادع الصلوة فقال لا انما ذلک عرق وليس يحض فاذا اقبلت حيضتک فدعى الصلوة واذا...... ادبرت فاغسلى عنک الدم ثم صلى.

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت جیش بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئیں اور عرض کناں ہوئیں۔ اے اللہ کے رسول! مجھے بیماری کا خون مسلسل آتا ہے میں پاک نہیں ہوتی کیا نماز چھوڑ دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ یہ محض رگ سے رستا خون ہے، حیض نہیں ہے۔ جب حیض کے دن آئیں تو نماز چھوڑ دیا کرو اور جب یہ دن گزر جائیں تو اپنے آپ سے خون دھولیا کرو اور نماز پڑھا کر۔

اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔

اگر پہلی بار خون آیا ہے اور دس دن کے بعد جاری ہے تو پورے دن حیض کے شمار ہوں گے اگر پہلے ماہواری کا خون آتا تھا اور عورت کی ایک عادت تھی تو پھر عادت کا لحاظ کرے۔

ام المؤمنين ام سلمة قالت امرأة كانت تهراق الدم على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فاستفقت لها ام سلمة النبى صلى الله عليه وسلم فقال لتنظر عدو الليالى والا يام التى كانت تحيض من الشهر قبل ان تصيب الذى اصابها فلتترک الصلوة قدر ذلک من الشهر فاذا خلفت ذلک فتغتسل ثم تستفر بثوب ثم لتصل.

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ عہد نبوی میں ایک عورت کو بہت زیادہ خون وغیرہ آتا تھا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کے بارے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس بیماری سے پہلے جس میں وہ مبتلا ہوئی ہے دیکھے کہ مہینے کے کن دنوں اور راتوں میں اسے حیض آتا تھا۔ مہینے میں اسی قدر دن اور راتیں نماز ترک کر دے اور جب یہ دن گزر جائیں تو غسل کرے پھر اچھی طرح زیر ناف حصہ مخصوصہ پر اچھی طرح کپڑا باندھ لے اور نماز پڑھے۔

اسے ابوداؤد اور امام مالک نے روایت کیا ہے۔

حیض اور استحاضہ میں فرق کرنے کے لئے خون کی رنگت کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ جب خون کا رنگ حیض کے خون جیسا رہے تو نماز چھوڑے رکھے اور جب رنگت میں تبدیلی آئے تو اسے استحاضہ کا خون خیال کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عورت خون کی رنگت میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ یہ نہایت مشکل ہے اس لئے اسے بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ جو لوگ رنگت کا اعتبار کرتے ہیں۔

ان کی دلیل حضرت عروہ کی یہ حدیث ہے۔

عن بنت ابی جیش انها کانت تستحاض فقال لها النبی صلی الله علیه وسلم اذا کان دم الحیض فانه دم اسود فاذا کان ذلک فامسکی عن الصلوة فاذا کان الاخر فتوضی وصلی فانما هو عرق.

(رواہ سنن ابوداؤد)

ابو جیش کی بیٹی سے روایت کیا ہے۔ انہیں (بنت ابی جیش) کو استحاضہ کا خون آتا تھا۔ ان سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب حیض کا خون ہوتا ہے تو اس کی رنگت سیاہ ہوتی ہے۔ جب سیاہ رنگ کا خون آ رہا ہو تو نماز سے رک جایا کرو اور جب کوئی اور رنگ ہو تو وضو کر کے نماز پڑھا کرو کیونکہ وہ ایک رگ کا خون ہوتا ہے۔

یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ حضرت عروہ کی فاطمہ بنت جیش سے ملاقات محل نظر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا والی حدیث ہو اور انہوں نے حضرت ام المؤمنین کا اسم گرامی حذف کر دیا ہو پھر یہ حدیث ان کے مؤقف کی دلیل بھی نہیں بن سکتی کیونکہ اس میں صرف حیض کے خون کی رنگت کو بیان کیا گیا ہے اور ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ حیض کا خون سیاہ ہوتا ہے۔ **فاذا کان ذلک** کے الفاظ حیض کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی جب حسبِ عادت حیض کو پائے جیسا کہ دوسری حدیث سے واضح ہے تو نماز ترک کر دے۔

اگر عورت کی ایک عادت ہے (مثلاً ہر ماہ اس کو یکم سے چھ تک خون آتا تھا) لیکن استحاضہ کے بعد وہ ان تاریخوں کو بھول گئی ہے اور اسے کوئی یاد نہیں رہا کہ کس تاریخ کو شروع ہوتا تھا اور کس تاریخ کو ختم ہوتا تھا۔ دن کو کس وقت شروع ہوتا تھا اور کس وقت ختم ہو جاتا تھا تو اس پر واجب ہے کہ ہر نماز پڑھنے سے پہلے غسل کرے کیونکہ ہر نماز سے پہلے احتمال ہے کہ اسی وقت خون رکا ہو۔

عن ابی سلمة ان امرأة کانت تهراق الدم وکانت تحت عبدالرحمن بن عوف ان رسول الله صلی الله علیه وسلم امرها ان تغتسل عند کل صلوة (رواہ سنن ابوداؤد)

حضرت ابو سلمہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت کو بہت زیادہ خون آتا تھا۔ وہ عورت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ حضور ﷺ نے اس عورت کو حکم دیا کہ وہ ہر نماز غسل کر کے ادا کرے۔

یہ حدیث ہماری بات کی تائید کرتی ہے لیکن ابوداؤد روایت کرتے ہیں کہ یا تو ہر ایک نماز کے لئے غسل کر یا جمع بین الصلوتین کر۔

عن حمنة قالت کنت استحاض حیضة

حضرت حمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ مجھے

كثيرة شديدة فاتيت النبي صلى الله عليه وسلم استفتيه فوجدته في بيت اختي زينب بنت جحش فقلت اني استحاض حيضة شديدة فما تامرني قد منعتني الصلوة والصيام قال الفت لك الكرسف فانه يذهب الدم قالت هو اكثر من ذلك قال فتلجمي قالت هو اكثر من ذلك قال فاتخذي ثوبا قالت هو اكثر من ذلك انما اثج ثجا فقال النبي صلى الله عليه وسلم سأمرك بامرين ايما فعلت اجزء عنك من الاخرو ان قويت عليهما فانت اعلم قال انما هذه ركضة من ركضات الشيطان فيتحضي ستة ايام اوسبعة ايام حتى اذا رايت ذلك فقد طهرت واستنقأت وصلي ثلثا وعشرين ليلة اوار بعاوعشرين ليلة وايامها فان ذلك تجزيك كذلك فافعلي من كل شهر كما تحيض النساء وكما تطهرن وان قويت على ان توخرين الظهر وتعجلين العصر فتغتسلين وتجمعين بين الصلوتين الظهر والعصروتوخرين المغرب وتعجلين العشاء ثم تغتسلين وتجمعين بين الصلوتين فافعلي وتغتسلين مع الفجر فافعلي ان قدرت على ذلك. (رواہ مسند امام احمد، سنن ابوداؤد)

بہت زیادہ شدت سے بیماری کا خون آتا۔ میں مسئلہ پوچھنے کے لئے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئی۔ میں نے آپ ﷺ کو اپنی بہن زینب بنت جحش کے گھر پایا۔ میں نے گزارش کی۔ (حضور!) مجھے شدت سے استحاضہ کا خون آتا ہے۔ آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے (خون کی حالت میں) نماز روزہ سے روک دیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: روئی لپیٹ لے اس سے خون جاتا رہے گا۔ میں نے عرض کی وہ اس سے زیادہ ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے اچھی طرح بند کر لیجئے (لگام دیجئے کے الفاظ ہیں) کہنے لگیں اس سے بھی زیادہ ہے۔ فرمایا: تو پھر کوئی کپڑا رکھ لے۔ عرض کرنے لگیں اس سے بھی زیادہ ہے میرا خون (ہر وقت) بہتا رہتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تجھے دو امور کا حکم دیتا ہوں۔ ان میں سے جس پر عمل پیرا ہوگی تیرے لئے جائز ہوگا۔ ان دونوں میں سے کس پر تجھے طاقت ہے تو خود خوب جانتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ شیطان کی حرکت ہے۔ چھ یا سات دن حیض کے شمار کر حتیٰ کہ جب تو ان کو دیکھ لے (یعنی چھ یا سات دن گزر جائیں) تو تو پاک ہے۔ طہارت حاصل کر اور تیئیس یا چوبیس دن رات تک نماز پڑھ۔ پس تیرے لئے اسی طرح جائز ہے۔ ہر مہینے اسی طرح کر جس طرح عورتوں کو حیض آتا ہے اور جس طرح وہ طہر گزارتی ہیں اور اگر یہ کر سکتی ہے کہ ظہر میں تاخیر کر اور عصر میں جلدی اور پھر غسل کر کے دونوں کو اکٹھے ادا کرے۔ (اسی طرح) مغرب میں دیر کر اور عشاء میں جلدی اور غسل کر کے دونوں کو اکٹھا پڑھ لے۔ تو اسی طرح کر لے اور فجر کی نماز کے لئے (الگ) غسل کر اور ادا کر لے۔ اگر تو اس طرح کر سکتی ہے تو کر لے۔

میں اس حدیث کا معنی نہیں سمجھ سکا۔ اگر سائلہ کو اپنی خون کی عادت معلوم تھی تو تفصیل کی کوئی وجہ نہیں بنتی بلکہ ایام حیض گزرنے کے بعد ایک ہی غسل کافی تھا اور اس کے بعد ہر ایک نماز کے لئے وضو کر لیتی۔ یا ہر نماز کے وقت کے لئے وضو کر لیتی (اختلاف فقہاء کی طرف اشارہ ہے) جیسا کہ فاطمہ بنت جحش کی حدیث میں مذکور ہے۔ اگر

اسے عادت کے متعلق کچھ یاد نہیں رہا تو پھر چھ یا سات دن حیض شمار کرنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔

پھر حدیث کی شرح کرنے والے اسے جمع حقیقی پر محمول کرتے ہیں۔ یعنی دو نمازوں کو اس طرح جمع کیا جائے کہ عصر جلدی پڑھی جائے اور ظہر میں دیر کی جائے کہ ظہر عصر کے وقت میں پڑھی جائے۔

اس پر یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ اگر حقیقی جمع ہی مقصود ہے (اور ظہر کو عصر کے وقت میں پڑھنا مقصود ہے) تو پھر عصر میں جلدی کی کیا وجہ ہے؟ بس ظہر کی تاخیر ہی کافی ہے۔

حنفی شارحین حدیث اسے اس معنی پر محمول کرتے ہیں کہ ظہر کی نماز کو آخری وقت تک مؤخر کیا جائے اور عصر کو پہلے وقت میں جلدی جلدی اس طرح ادا کیا جائے کہ ظہر کا وقت ختم ہوتے ہی عصر کی نماز ادا ہو جائے۔ اس طرح دونوں نمازوں ظہر اور عصر کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوگا جس طرح عموماً وقفہ ہوتا ہے۔ اسے جمع صوری کہتے ہیں۔ اس طرح عصر کو جلدی پڑھنے میں جو فائدہ ہے وہ ظاہر ہے۔

لیکن ان دونوں صورتوں پر اعتراض ہوتا ہے۔ آدمی نے جب ظہر کی نماز پڑھ لی تو حیض کا احتمال پایا گیا تو اس احتمال کے ہوتے ہوئے وہ عصر کی نماز کیسے پڑھے گی؟

غور و خوض کے بعد حدیث مبارکہ کا جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ عورت اپنی عادت کے ایام بھول گئی ہے تو تحری کرے اور کوشش کرے کہ ان کا تعین ہو جائے پھر کوشش کے بعد چھ یا سات دن حیض والی عورتوں کی طرح نماز اور روزہ ترک کر دے کیونکہ اکثر عورتوں کا حیض اتنا ہی ہوتا ہے اور مہینے کے بقیہ دنوں کو طہر شمار کرتے ہوئے نماز، روزہ کرے۔

دوسری شق یہ ہے کہ وہ کوشش نہ کرے پھر عزیمت اس میں یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے لئے الگ وضو کرے جیسا کہ اس سے پہلے ہم روایت کر چکے ہیں لیکن یہاں بھی وہ احتمال موجود ہے کہ ہو سکتا ہے حیض کے انقطاع کا وقت نماز کے دوران ہو مگر دفع حرج کے لئے اس احتمال کا اعتبار نہیں کیونکہ پھر تو نماز کی ادائیگی سرے سے ہی ناممکن ہو جائے گی۔ جس طرح یہ احتمال ایک نماز میں پایا جا رہا ہے تو ان دونوں نمازوں میں بھی ہے جن کو یکے بعد دیگرے ایک ہی وقت میں ادا کیا جا رہا ہے۔ دفع حرج کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک نماز کی تاخیر کا حکم دیا ہے تاکہ دونوں کے درمیان زیادہ وقت حائل نہ ہو جیسا عموماً دو نمازوں میں ہوتا ہے۔

حدیث پاک میں جمع حقیقی مراد نہیں بلکہ جمع صوری مراد ہے یعنی دونوں کو ان کے اصل وقت میں ایک کو آخری وقت میں اور دوسری کو ابتدائی وقت میں ادا کرنا مقصود ہے۔ حضور ﷺ صاحب شریعت ہیں۔ آپ ﷺ جو حکم فرمائیں وہ شریعت ہے۔ دوسرے طریقے کو اختیار کرنا بہتر ہے کیونکہ اس میں تحری ہے۔ حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ اگر تو ان دونوں پر طاقت رکھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقوع تحری کے بعد اگر تو دوسرے طریقے پر عمل پیرا ہو تو وہ بہتر ہے کیونکہ اس میں احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر تو ان پر طاقت رکھتی ہے تو تو اپنی حالت سے زیادہ آگاہ ہے ان میں سے کسی ایک طریقہ کو اپنا لے۔ میرے نزدیک حدیث کا یہی مفہوم ہے لیکن یہ حدیث حنفیوں کے اس قول کے مخالف ہے کہ عورت پر ہر نماز کے لئے غسل کرنا واجب ہے۔

ناپاک چیزوں کو پاک کرنے کا طریقہ

نماز پڑھنے سے پہلے کپڑوں، بدن اور جگہ کا پاک کرنا فرض ہے اور نماز کے لئے شرط ہے۔ نماز کے عدم جواز کے لئے اس نجاست کا اعتبار ہوگا جس کو نماز پڑھنے والے نے خود اٹھا رکھا ہے۔ اگر نجاست کسی اور بدن پر ہے جسے نمازی نے اٹھا رکھا ہے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ مثلاً نمازی نماز پڑھ رہا تھا اس کے سر پر کبوتر یا کوئی اور پرندہ آ کر بیٹھ گیا جس کے پاؤں یا پروں پر نجاست لگی ہوئی ہے یا بچہ آ کر گود میں بیٹھ گیا جس کے ہاتھ یا پاؤں گندگی سے لتھڑے ہوئے ہیں تو اس کی نماز نہیں ٹوٹے گی۔ ہاں اگر نمازی نے کسی نجس برتن کو یا کسی ایسی چیز کو اٹھا رکھا ہے جو ناپاک ہے تو نماز فاسد ہو جائے گی (کیونکہ کبوتر خود آ کر بیٹھ گیا جبکہ برتن اس نے اٹھا رکھا ہے)۔

نمازی کے لئے جگہ پاک ہو

نماز کے لئے جگہ کا پاک ہونا شرط ہے۔ قدموں کی جگہ کا بالاتفاق پاک ہونا شرط ہے۔ اسی طرح سجدہ کی جگہ میں بھی اتفاق ہے۔ رہا ہاتھوں اور گھٹنوں کی جگہ تو اس کا پاک ہونا شرط نہیں ہے کیونکہ ہاتھوں اور گھٹنوں کو سجدہ میں زمین پر رکھنا ضروری نہیں ہے۔ اکثر مشائخ کی یہی رائے ہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ بالفرض اگر تسلیم کر لیا جائے کہ نماز میں ہاتھوں اور گھٹنوں کا زمین پر رکھنا ضروری نہیں ہے تو پھر بھی نماز میں نجاست کا اٹھانا لازم آتا ہے۔ انشاء اللہ ہم عنقریب بیان کریں گے کہ ہاتھوں اور گھٹنوں کا زمین پر رکھنا ضروری ہے۔

فقیہہ ابواللیث کا مسلک یہ ہے کہ ہاتھوں اور گھٹنوں کی جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے اور پہلی روایت صحیح نہیں ہے۔ ان کے نزدیک سجدہ میں ہاتھوں اور گھٹنوں کا زمین پر ٹکنا ضروری ہے۔ یہی چیز زیادہ قرین ثواب ہے۔

ہمارے نزدیک نجاست کی دو قسمیں ہیں۔ نجاستِ غلیظہ اور نجاستِ خفیفہ۔

نجاستِ غلیظہ اگر درہم کے برابر ہو

نجاستِ غلیظہ درھم کے برابر ہو تو معاف ہے۔ استنجاء والی جگہ کا لحاظ کرتے ہوئے درھم کی مقدار معاف کی گئی ہے کیونکہ پتھر استعمال کرنے کے باوجود بھی درھم کے برابر یہ جگہ ناپاک رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اگر آدمی تھوڑے پانی میں ڈبکی لگائے تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اتنی مقدار کو معاف رکھا گیا ہے حالانکہ استنجاء والی جگہ اور دوسرے پورے جسم کا پاک ہونا واجب ہے اور اس میں ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں لیکن ضرورتاً یہ معاف ہے۔ جب استنجاء والی جگہ معاف ہے تو باقی جسم میں اگر اتنی جگہ پر گندگی لگی ہو تو کیوں معاف نہ ہو۔

استنجاء والی جگہ کبھی کبھی ایک درھم کے برابر ہوتی ہے (جب پاخانہ پتلا نہ ہو) اور اس سے زائد نہیں ہوتی تو درھم کی مقدار معاف ہے۔

بعض علماء کے نزدیک مطلقاً گندگی کے وزن کا اعتبار ہے اور بعض کے نزدیک اگر کثیف ہو تو وزن کا اعتبار ہے اور رقیق ہو تو پیائش کا اعتبار ہوتا ہے اور اکثر کے نزدیک وزن کا اعتبار ہے ہی نہیں۔ نجاست کثیف ہو یا رقیق

دونوں صورتوں میں پیمائش کا اعتبار ہوگا۔ ہدایہ میں آخری نظریہ کو صحیح کہا گیا ہے۔ مذکورہ دلیل (استنجاء کی جگہ والی) اسی کو واجب کرتی ہے۔ درھم ہاتھ کی ہتھیلی کے تقریباً برابر جگہ گھیرتا ہے۔

کپڑے پر نجاست غلیظہ کس قدر معاف ہے

اگر دو الگ الگ کپڑوں پر الگ الگ نجاست لگی ہوئی ہے تو انہیں جمع کیا جائے گا۔ اگر یہ دونوں جگہیں مل کر درھم کے برابر ہیں تو معاف ہے اگر درھم سے زیادہ جگہ کو گھیر لیا ہے تو معاف نہیں ہے۔

کپڑے پر نجاست لگی اور دوسری طرف نکل گئی (کپڑے کی دو تہیں تھیں) اور دوسری تہہ بھی پلید ہوگئی۔ دونوں کو اگر ملائیں تو درھم کے برابر ہے زیادہ نہیں تو معاف ہے اور اس کپڑے سے نماز پڑھنا صحیح ہے کیونکہ یہ ایک نجاست نہیں ہے اور اگر ہر ایک تہہ میں لگی نجاست ایک درھم کے برابر ہے تو اس کپڑے کے ساتھ نماز جائز نہیں کیونکہ یہ دو کپڑے ہیں پس دونوں نجاستوں کو جمع کیا جائے گا۔

اگر کپڑے پر نجاست لگی اور اس کے دوسری طرف بھی نفوذ کر گئی اور ہر طرف سے درھم کی مقدار ہے تو ایک کپڑے کی دونوں طرفوں میں لگی نجاست کو جمع نہیں کیا جائے گا۔ اسے ایک درھم کے برابر سمجھا جائے گا اور نماز جائز سمجھی جائے گی کیونکہ یہ ایک ہی نجاست ہے' الگ الگ نہیں ہیں۔

کپڑے یا بدن پر درھم کے برابر نجاست اگرچہ معاف ہے لیکن اس کو صاف کئے بغیر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے حتیٰ کہ علماء کہتے ہیں کہ اگر تھوڑی نجاست لگی ہو تو بھی اسے دھونا ضروری ہے جب تک وقت یا جماعت نکلنے کا اندیشہ نہ ہو۔ فتح القدیر میں ایسے ہی ہے۔

نجاست خفیفہ کس قدر معاف ہے

نجاست کی دوسری قسم نجاست خفیفہ ہے۔ اگر بہت زیادہ نہ ہو تو معاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کسی مقدار کا تعین نہیں فرمایا بلکہ جس کو مسئلہ پیش آئے اسے اسی کی رائے پر موقوف قرار دیا ہے۔ ایک روایت چوتھائی کپڑے کی ہے۔ مشائخ نے اسی رائے کو اختیار فرمایا ہے اور اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔ اب اس میں اختلاف ہے' اکثر کی رائے یہ ہے کہ جس کپڑے پر نجاست لگی ہوئی ہے اس کا چوتھائی حصہ یا اس تھوڑے سے تھوڑے کپڑے کی چوتھائی جس کو پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ چوتھائی حصہ سے مراد ایک بالشت طول میں اور ایک بالشت عرض میں ہے (ایک مربع بالشت)۔ ان سے دوسری روایت ایک ہاتھ لمبائی اور ایک ہاتھ چوڑائی کی نقل کی گئی ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو قدموں کے برابر چوتھائی ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ پہلی رائے زیادہ بہتر ہے۔ اگر چوتھائی کپڑا اس قدر زیادہ ہو کہ کل لباس کی شکل اختیار کرلے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا جیسا کہ وہ پلید کپڑا جس کے علاوہ نمازی کے پاس اور کوئی کپڑا نہیں۔ شرم گاہ کے کھلے رہ جانے میں بھی علماء نے یہی فرمایا ہے۔

خفت وغلظت کا یہ اختلاف یا تو نصوص کے درمیان اختلاف کی وجہ سے ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے

یا اس کا سبب ائمہ کے درمیان اختلاف ہے جیسا کہ صاحبین کی رائے ہے۔

میں اس مقام کو نہیں سمجھ سکا۔ احکام شرعیہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں جنہیں ان منصوص دلائل سے ہی سمجھا جا سکتا ہے جو اس کی طرف سے بندوں تک پہنچتے ہیں یا بنیاد کی بنا پر قیاس کئے جاتے ہیں۔

علماء کا یہ فرمانا کہ درھم کی مقدار نجاست معاف ہے یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ اس کے بارے دلیل شرعی موجود ہے اور وہ قیاس ہے بلکہ استنجاء کے بارے جو نص ہے وہ اس کی صحت پر دلیل ہے۔

یہ جو علماء نے کہا ہے کہ بعض نجاستیں اگر بہت زیادہ نہ ہوں تو وہ معاف ہیں اس بارے کوئی دلیل شرعی چاہئے جس سے معلوم ہو کہ نجاست خفیفہ شارع علیہ السلام کی نظر میں بہت زیادہ نہ ہو تو معاف ہے۔

احادیث کے اندر تعارض اور اختلاف شارع علیہ السلام کی طرف سے تخفیف کا موجب نہیں بن سکتا۔ کیونکہ آپ کے نزدیک تو تعارض اور اختلاف نہیں تھا بلکہ جس میں تعارض اور اختلاف ہے اگر وہ شارع علیہ السلام کے نزدیک نجس ہے تو اس کا حکم آپ ﷺ کی نظر میں تمام نجاستوں جیسا ہے۔ اگر وہ پاک ہے تو اسے پاک کرنا واجب نہیں۔ پس نجاست غلیظہ کے زیادہ ہونے کی صورت میں تطہیر کے واجب ہونے اور کم ہو تو معاف ہونے کے لئے دلیل شرعی چاہئے۔

جو اشیاء نجاست غلیظہ میں شمار ہوتی ہیں

شراب' آدمی کا پیشاب' گھوڑے کو چھوڑ کر باقی حلال جانوروں کا پیشاب' پاخانہ' بہنے والا خون یہ سب نجاست غلیظہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ جو خون بہنے والا نہیں وہ پاک ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔

کستوری پاک ہے اور کستوری کی تھیلی لے کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ بھڑ وغیرہ کا خون بھی پاک ہے (کیونکہ وہ بہتا نہیں)

مرغی' بطخ اور مرغابی کی بیٹ غلیظہ ہے۔

اگر قے منہ بھر ہو تو غلیظہ ہے ورنہ خفیفہ۔

مذی' ودی اور منی تینوں بالاتفاق ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نجاست غلیظہ ہیں کیونکہ ان کے بارے نصوص میں کوئی تعارض نہیں اور نہ ہی کسی قسم کا اختلاف ہے۔ ظاہر ہے صدر اول کا اختلاف ہی معتبر ہے ورنہ منی کے نجس ہونے میں امام شافعی کا اختلاف ہے۔ (ان کے نزدیک منی ناپاک نہیں ہے)

گدھے' گھوڑے کی لید' گائے کا گوبر اور اونٹ اور بھیڑ بکری کی مینگنیاں نجاست غلیظہ کے ضمن میں آتی ہیں۔

یہ امام ابوحنیفہ کی رائے ہے اور ان کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے۔

عن ابن مسعود فی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الغائط فامرنی ان ایه بثلاثة احجار فوجدت حجرین والمست الثالث فلم اجد واخذت الروثة فاتیته بها فاخذ الحجرین	حضرت ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رفع حاجت کے لئے تشریف لے جانے لگے تو مجھے تین پتھر لانے کا حکم دیا' مجھے دو پتھر تو مل گئے لیکن تیسرا پتھر تلاش کے باوجود نہ ملا' میں نے گوبر اٹھایا اور لے کر

والقی الروثة وقال هذا رکس.

آپ کے پاس آیا' آپ نے دونوں پتھر لئے اور گوبر پھینک دیا اور فرمایا: یہ ناپاک ہے۔

اسے بخاری علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

یہ حدیث گوبر کے نجس ہونے پر نص ہے اور دوسری کوئی ایسی نص نہیں ہے جو اس کی معارض ہو لہٰذا یہ نجاست غلیظہ ہے۔

صاحبین کے نزدیک گوبر' لید اور مینگنیاں نجاست خفیفہ ہیں کیونکہ ان کے نجس ہونے کے بارے اختلاف ہے اس کی دلیل حضرت ابوموسیٰ اشعری کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے اونٹوں اور بکریوں کے باڑے میں نماز ادا فرمائی جیسا کہ بخاری شریف کی ایک معلق حدیث سے ظاہر ہے اور ان سے ان اشیاء کا پاک ہونا مروی ہے لہٰذا اختلاف پایا گیا اور اس اختلاف کی وجہ سے ان اشیاء کا نجاست خفیفہ ہونا ثابت ہوا۔

راستے میں پڑی گندگی کا حکم

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ راستوں میں عموماً گوبر وغیرہ کثرت سے پڑا ہوتا ہے۔ ضرورت کے تحت اسے نجاست خفیفہ کہا جاتا ہے۔

صاحبِ ہدایہ نے جواب دیا ہے کہ مجبوری صرف جوتوں کی حد تک ہے اور ان کی طہارت کی صرف یہ صورت ہے کہ انہیں رگڑا جاتا ہے تو صاف ہو جاتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ ضرورت کا تعلق صرف جوتوں سے ہے' محل نظر ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب آپ ''رے'' میں داخل ہوئے تو لوگوں کو لید میں دیکھ کر فتویٰ دیا کہ بہت زیادہ لید مانع نماز نہیں ہے اور مشائخ نے اسی طرح بخارا کی مٹی کو قیاس کیا ہے اور فتویٰ دیا ہے کہ وہ پاک ہے۔

عن ام سلمة قالت لها امرأة انی اطیل ذیلی وامشی فی مکان القذر قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یطهر مابعده.

(رواہ جامع الترمذی' مسند امام احمد' مؤطا امام مالک)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے ان سے عرض کیا کہ میں بہت زیادہ طویل دامن ہوں اور میں گندگی کی جگہ سے گزرتی ہوں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کے بعد والا پاک ہوتا ہے۔

عن امرأة من عبد الاشهل قالت قلت یا رسول الله ان لنا طریقا الی المسجد منتنة فکیف نفعل اذا مطرنا قال الیس بعدها طریقا هی اطیب منا قلت بلی قال فهذه بهذه. (رواہ ابوداؤد)

عبدالاشہل کی ایک عورت سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: جس راستے ہم مسجد میں آتے ہیں وہ گندا ہے۔ جب بارش ہو تو ہم کیا کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں جو زیادہ پاک ہو۔ میں نے کہا: ہاں ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب

بارش ہو تو اس راستہ کو اختیار کر لیا کرو۔

یہ دونوں حدیثیں صراحتاً دلالت کر رہی ہیں کہ راستے کا کوڑا کرکٹ جب مٹی سے مل جاتا ہے اور اس پر سے آدمی گزرنے کی وجہ سے پاک مٹی اور یہ گندگی یک جان ہو جاتے ہیں تو دونوں پاک شمار ہوتے ہیں اور گزرنے والے کے کپڑے وغیرہ ناپاک نہیں ہوتے۔

گندگی سے خشک گندگی مراد لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ دوسری حدیث میں بارش کی بات ہو رہی ہے تو بارش کے بعد گندگی خشک کیسے رہ سکتی ہے۔ بخارا کی مٹی کا پاک ہونا بھی اس سے ظاہر ہے کیونکہ وہ بھی راستے کی مٹی ہوتی ہے جس میں گندگی ملی ہوتی ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ بخارا کی مٹی کی طہارت کا فتویٰ صحیح ہے۔ تمام ان شہروں کے لئے بھی یہی حکم ہے جن میں عموم بلویٰ ہو۔

حلال جانور کے پیشاب کے بارے ائمہ احناف کا مؤقف

حلال جانور اور گھوڑے کا پیشاب شیخین کے نزدیک نجاست خفیفہ ہے جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پاک ہے۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل روایات میں تضاد ہے اور امام ابو یوسف کی دلیل اس کے پاک و ناپاک ہونے میں اختلاف ہے۔

آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ آئے ہیں کہ اختلاف صرف اونٹوں کے پیشاب میں ہے اور وہ بھی حلت مطلق نہیں، صرف دواء کے طور پر اس کا استعمال حدیث میں حلال قرار دیا گیا ہے لیکن اونٹوں کے علاوہ دوسرے حلال جانوروں کا پیشاب نجس ہے اور اس پر نص موجود ہے اور کوئی دوسری نص اس کے معارض بھی نہیں ہے۔

حرام پرندوں کی بیٹ کا حکم

اگر کپڑے یا بدن پر حرام پرندے کی بیٹ لگ جائے اور درھم سے زائد ہو تو بھی معاف ہے اور اس سے نماز جائز ہے، یہ رائے شیخین کی ہے۔ امام محمد کے نزدیک یہ بیٹ نجاست مغلظہ ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ شیخین کے نزدیک حرام پرندوں کی بیٹ پاک ہے۔ تو اختلاف اس کے نجس ہونے میں ہے۔ اکثر کی رائے یہ ہے کہ شیخین کے نزدیک یہ نجاست مخففہ ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ یہی قول صحیح ہے کیونکہ اس میں نہ تو کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی پرندے انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں کہ ضرورتاً اسے نجاست خفیفہ شمار کیا جائے۔ شیخین کہتے ہیں کہ نہیں یہ نجاست خفیفہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پرندے ہوا میں اڑتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان سے بچنا مشکل ہے اس لئے ضرورتاً ان کی بیٹ نجاست خفیفہ شمار ہوگی۔

برتنوں کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ برتنوں کے حق میں پرندوں کی بیٹ نجاست خفیفہ ہے کیونکہ پرندے ہوا میں اڑتے رہتے ہیں اور برتنوں میں بیٹ کر دیتے ہیں جبکہ دوسرا قول ان کی بیٹ ناپاک ہونے کا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پرندے رات کو نہیں اڑتے اور دن کو برتن ڈھانپ کر رکھے جا سکتے ہیں۔ اگر کہیں اس بارے سستی کی جاتی ہے تو وہ انسان کی طرف سے ہے لہٰذا ضرورت نہیں ہے اس لئے برتن میں اگر پرندے کی بیٹ گر گئی تو وہ ناپاک ہو جائے گا۔

گھوڑے اور خچر کا لعاب مشکوک ہے اس لئے اس سے کپڑا قطعاً پلید نہیں ہوتا۔ اگر پیشاب کے چھینٹے جو سوئی کے سوراخ کے برابر ہوتے ہیں کپڑے یا بدن پر پڑیں تو کپڑا اور بدن پلید نہیں ہوں گے خواہ یہ نجاست غلیظہ ہو یا خفیفہ۔

ناپاک اشیاء کو پاک کرنے کے مختلف طریقے

ناپاک چیز کو پاک کرنے کے مختلف طریقے ہیں مثلاً دھونا' رگڑنا' پونچھنا' پانی سے ہاتھ تر کر کے مسح کرنا' خشک کرنا' دباغت کرنا اور اصل کو ہی تبدیل کر دینا۔

پانی کے ساتھ دھونے سے ہر چیز پاک ہو جاتی ہے۔ اگر نجاست مرئیہ (دکھائی دینے والی) ہے تو اس کے عین کو زائل کرنا ضروری ہے۔ ہاں اگر بار بار دھونے کے باوجود رنگ نہیں اترتا تو حرج نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ بار بار دھونے یا صابن وغیرہ کے ساتھ دھونے سے یہ یقین پیدا ہو جائے کہ نجاست دھل گئی ہے اور یہ صرف اس کی رنگت ہے عین نجاست نہیں ہے۔ اسی بناء پر علماء فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے کپڑے رنگے یا عورت نے اپنے ہاتھوں پر مہندی لگائی اور اس کے بعد ان کپڑوں یا ہاتھوں کو دھویا اور اس وقت تک برابر دھویا گیا حتیٰ کہ نچوڑنے پر صاف پانی ٹپکنے لگا تو کپڑے اور ہاتھ دونوں پاک ہیں۔

اگر نجاست مرئیہ ایک بار دھونے سے پاک ہو جائے تو کافی ہے اور اسے بار بار دھونا واجب نہیں ہے لیکن بعض بزرگانِ دین کہتے ہیں کہ اس کے بعد تین بار دھویا جائے' بعض اسلاف دو مرتبہ کے قائل ہیں۔

تجنیس میں جو یہ کہا ہے وہ مشکل ہے کہ ایسا برتن جس میں شراب ہو اگر اسے تین بار دھویا جائے تو وہ پاک نہیں ہو گا جب تک کہ اس سے شراب کی بو ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ جب اس کی بو ختم ہو جائے تو لامحالہ اثر ختم ہو جاتا ہے۔ جب تک اس برتن میں بو ہے کسی اور مائع کا ڈالنا مناسب نہیں۔ ہاں' سرکہ ڈالا جائے تو برتن بھی صاف ہو جائے گا کیونکہ سرکہ اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

اگر نجاست غیر مرئی ہو تو اس وقت تک دھونا ضروری ہے جب تک دھونے والے کو یہ گمان غالب نہیں ہو جاتا کہ اب یہ چیز پاک ہے کیونکہ کسی چیز کو اس لئے دھویا جاتا ہے کہ اس سے نجاست نکل جائے اس لئے بار بار دھونا ضروری ہے حتیٰ کہ گمان غالب ہو جائے کہ اب نجاست باقی نہیں رہی۔

علماء فرماتے ہیں کہ غلبہ ظن کے لئے ضروری ہے کہ کپڑے کو تین بار دھویا جائے اور ہر بار خوب نچوڑا جائے اور آخری مرتبہ دھونے والا اپنی پوری قوت سے نچوڑے حتیٰ کہ ایک قطرہ بھی نہ نچڑے تو وہ اس دھونے والے شخص کے لئے پاک ہے۔ اس میں دھونے والے کی قوت کا اعتبار ہو گا اگر دھونے والے نے پوری قوت سے نچوڑا لیکن پانی نہیں نکلا مگر اسی کپڑے کو کسی دوسرے آدمی نے نچوڑا تو پانی نکلا' کپڑا پاک شمار ہو گا کیونکہ دھونے والے کا نچوڑنا معتبر ہو گا۔

امام یوسف کے نزدیک حمام کا کپڑا پانی بہانے سے پاک ہو جاتا ہے۔ (جو کپڑا دروازے پر لٹکتا ہے) جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ یہ اس لئے کہ مجبوری ہے' اندیشہ ہے کہ سرننگا ہو گا اس لئے اس پر قیاس صحیح نہیں ہے۔

ایسی چیز جس کو نچوڑنا ناممکن ہو تو اسے دھویا جائے گا اور چھوڑ دیا جائے گا حتیٰ کہ اس سے پانی ٹپکنا بند ہو جائے۔ اسے پھر دھویا جائے گا اور چھوڑ دیا جائے گا حتیٰ کہ پانی ٹپکنا بند ہو جائے۔ تین بار یہ عمل کرنے سے وہ چیز پاک ہو جائے گی۔ علماء فرماتے ہیں کہ چمڑا' موزے اور جرموق دھونے کا یہی طریقہ ہے۔

وہ برتن جو استعمال میں آ چکے ہیں اور جن میں کھایا پیا نہیں جاتا انہیں تین مرتبہ مانجھ کر دھویا جائے گا۔ فتح القدیر میں یہ قید لگائی گئی ہے کہ یہ اس وقت ہے جب نجاست تر ہو۔ اگر نجاست خشک ہو تو گویا برتن نیا ہے۔

چٹائی اگر ناپاک ہو جائے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس پر تین بار پانی بہایا جائے۔ تین بار پانی بہانا ہی نچوڑنے کے قائم مقام ہو گا۔

دری یا قالین کو اگر ایک رات تک بہتی نہر میں ڈال دیا جائے تو وہ بالکل پاک ہو جاتی ہے۔ فتح القدیر میں ایسا ہی ہے۔

اگر برتن مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور کورے ہیں تو امام محمد کے نزدیک کبھی بھی پاک نہیں ہوں گے۔

اسی طرح وہ چمڑا جس کو ناپاک پانی سے دباغت کیا گیا کبھی پاک نہیں ہو گا۔ امام ابو یوسف کے نزدیک پاک ہو جائے گا۔

گندم جو شراب میں گوندھ کر پکائی گئی ہو کبھی پاک نہیں ہو گی۔ یہ رائے امام ابو حنیفہ کی ہے اور اسی پر فتویٰ دیا گیا ہے۔

گوشت جب کسی ناپاک برتن میں پکایا جائے تو سالن پاک نہیں رہے گا' ہاں اگر برتن میں شراب تھی اور اس میں گوشت پکایا گیا اور سرکہ بھی ڈالا گیا تو سالن حلال ہے۔

تیل میں جب کوئی نجاست گر جائے تو بقول امام ابو یوسف کے اس میں تین بار پانی ڈال کر پانی انڈیل دیا جائے تو پاک ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر ہاتھ پر ناپاک تیل لگ جائے تو اسے تین بار رگڑ کر دھویا جائے۔ اس طرح ہاتھ بھی پاک ہو جائے گا اور اس پر جو چکناہٹ ہے وہ بھی پاک ہے۔ فتح القدیر میں ایسے ہی ہے۔

پانی کے علاوہ ہر وہ مائع جو نجاست کو زائل کر سکتا ہے اس کا استعمال جائز ہے مثلاً سرکہ' عرق گلاب وغیرہ۔

دودھ کا استعمال اس سلسلے میں صحیح نہیں کیونکہ اس میں چکناہٹ ہوتی ہے' یہ رائے صاحبین کی ہے۔

کیا کپڑا اور بدن پانی کے ساتھ پاک ہو جاتے ہیں؟

اسی طرح بدن کو پاک کرنے کے لئے ہر مائع جو نجاست دور کر سکتا ہے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ قول امام ابو حنیفہ کا ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک ایسی ہی روایت منقول ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سوائے پانی کے کسی چیز کا استعمال جائز نہیں۔ یہی رائے امام شافعی کی ہے کیونکہ قیاس یہ ہے کہ ناپاک کپڑا پانی سے بھی پاک نہ ہو کیونکہ جب پانی ناپاک کپڑے سے لگے گا تو خود ناپاک ہو جائے گا۔ سو یہ کپڑے کو زیادہ نجس کرنے کا سبب بنے گا لیکن ہم قیاس پر عمل نہیں کرتے کیونکہ اس بارے نص موجود ہے کہ کپڑا پانی سے پاک ہو جاتا ہے' سو کپڑا کا پاک ہونا غیر معقول ہے اس لئے اس پر دوسرے کسی مائع کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ پانی نجاست کو کپڑے سے دھوڈالتا ہے اور جب یہ دھوڈالتا ہے تو پاک رہتا ہے لہٰذا یہ امر معقول ہے غیر معقول نہیں اور کپڑے پر لگی نجاست کے زوال سے کپڑے کا پاک ہو جانا ایسی بات نہیں جسے سمجھا نہ جا سکتا ہو۔ پانی کی طرح دوسرے مائع بھی نجاست زائل کرنے والے ہیں سو جب نجاست نہ رہی تو کپڑا پاک ہو گیا۔ پانی جب تک کپڑے میں ہے شرعاً وہ نجاست کے حکم میں نہیں کیونکہ اس طرح تو پھر کوئی چیز پاک ہی نہیں ہو سکے گی اسی طرح پانی کے علاوہ دوسرے مائع کا حکم ہے کہ چونکہ وہ نجاست کو زائل کرتے ہیں اس لئے نجاست سے مل کر ضرورتاً وہ نجس نہیں ہوتے اور دوسری اشیاء کو پاک کر دیتے ہیں۔ امام فخر الاسلام کی یہی تحقیق ہے۔

وقد روی اسماء بنت ابی بکر افضل الصدیقین قالت سألت امرأۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رأیت احدا اذا اصاب ثوبھا الدم من الحیضۃ فکیف فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا اصاب ثوب احدکن الدم من الحیض فلتقرضہ ثم لتنضحہ ثم لتصل فیہ. (رواہ صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ جب کسی عورت کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو آپ کے حکم کے مطابق وہ اسے کس طرح صاف کرے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی عورت کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو وہ اسے مل ڈالے پھر اسے دھوئے اور نماز پڑھ لے۔

حضور ﷺ نے دھونے کے لئے پانی کی قید نہیں لگائی۔ جو چیز بھی نجاست کو زائل کر سکتی ہے اس سے کپڑا دھویا جا سکتا ہے۔ یہ حدیث ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے کہ دھونے کے لئے پانی ضروری نہیں۔ کسی دوسرے مائع سے بھی طہارت حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ حدیث ہمارے لئے حجت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کپڑے کو یا کسی بھی ناپاک چیز کو پانی کے علاوہ کسی اور مائع سے بھی دھویا جا سکتا ہے۔

شیخین کی ایک دوسری روایت میں تحتیہ ثم تقرضیہ بالماء ثم تنضحیہ ثم تصلی فیہ (اسے ہاتھ سے ملیئے، پانی ڈالے اور دھوئے اور پھر اس میں نماز پڑھے) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

اس حدیث پاک میں دھونا مطلق ہے اگرچہ پانی ڈالنے میں پانی کی قید لگائی گئی ہے۔ پہلی حدیث میں دھونا بھی غیر مقید تھا۔ یعنی ہر وہ چیز جو دھونے کے کام آ سکتی ہے اس سے کپڑا دھویا جا سکتا ہے۔ دوسری حدیث میں مائع کے ایک فرد پانی کو خاص کیا گیا ہے۔ دھونے میں اگرچہ پانی کی قید لگائی گئی ہے۔ (دوسری حدیث میں) لیکن اس سے استدلال پر کچھ فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ کھنگالنے میں کسی قسم کی قید نہیں ہے۔

عن ام قیس سألتہ عن دم الحیض فقال علیہ السلام حکیہ بطلع واغسلیہ من ماء وسدر. (رواہ سنن ابوداؤد، سنن نسائی)

ام قیس سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حیض کے خون کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے خرما کے کچے شگوفہ کے ساتھ رگڑیئے اور دھو دیجئے پانی اور بیری (کے پتوں) سے۔

حضور ﷺ نے یہاں خرما کے کچے شگوفہ سے رگڑنے کی قید لگائی ہے۔

خرما کے شگوفے سے رگڑنے کی قید اس بات کا قرینہ ہے کہ صفائی ہر اس چیز سے صحیح ہے جس سے نجاست کو زائل کرنا ممکن ہو۔ دھونے میں اگرچہ پانی کی قید لگائی گئی ہے لیکن عام کے افراد میں سے ایک فرد کو الگ کرنا عموم کو کچھ نقصان نہیں دیتا پھر دھونے میں پانی اور بیری کے پتوں کی قید ہے اور یہ قید واجب نہیں ہے سب کا اتفاق ہے کہ یہ صرف صفائی کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ تو جہاں پانی کی قید ہے وہاں وجوب مقصود نہیں' صفائی مقصود ہے۔ بہرحال پانی کا ذکر بطور مثال ہے۔ اس سے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ پانی کی طرح دوسرے مائع بھی طہارت میں کام آ سکتے ہیں پھر حضور ﷺ کا فرمانا کہ ''دھوئے'' عام ہے' جس چیز سے بھی دھویا جا سکتا ہو۔ یہ اسی طرح عام ہے جس طرح کوئی کہے میں نے کھایا۔ اب کھانا تمام ماکولات کے لئے عام ہے۔ حدیث پاک میں دھونے کے آلہ کو بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اسے لوازم کے طور پر سمجھا جائے گا جیسا کہ علم معانی کے قواعد میں غور و فکر کرنے والوں پر مخفی نہیں۔

یہ کہنا کہ غسل صرف پانی سے ہو سکتا ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی تخصیص صحیح نہیں ہے اگرچہ ایک دوسری روایت میں پانی کا ذکر ہے لیکن عدم قبول تخصیص کی وجہ سے یہ مخصص نہیں بن سکتی بلکہ پانی کا تذکرہ اس لئے ہے کہ عموماً پانی ہی سے غسل کیا جاتا ہے اور وافر مقدار میں مل جاتا ہے۔

جوتے اور موزے رگڑنے سے پاک ہو جاتے ہیں

رگڑنے سے صرف موزے اور جوتے پاک ہوتے ہیں ان کے علاوہ کوئی تیسری چیز نہیں اور موزوں اور جوتوں کو پاک کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

فلما روی ابو سعید الخدری انه علیه السلام قال اذا جاء احدکم الی المسجد فان رای فی نعله اذی اوقذرا فلیمسحه ولیصل فیهما.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص مسجد کو آئے اور اسے اپنے جوتے میں کوئی غلاظت نظر آئے تو اسے رگڑ دے اور انہیں پہن کر نماز پڑھ لے۔

اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

عن ابی هریرۃ اذا وطی احدکم الاذی بنعله اوخفه فطهور هما لتراب.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے جوتے یا موزے میں گندگی لگی دیکھے تو ان کو مٹی سے پاک کر لے۔

اسے ابن حزیمہ نے روایت کیا ہے۔ فتح القدیر میں بھی ایسے ہی ہے۔

امام ابوحنیفہ اسے خشک گندگی سے خاص کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جوتے یا موزے پر اگر تر غلاظت لگی ہو گی تو رگڑنے سے وہ زیادہ پھیلے گی اس لئے رگڑنا تر غلاظت کے حق میں پاک کرنا نہیں ہو گا۔

امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ تر غلاظت بھی رگڑنے سے پاک ہو جائے گی بشرطیکہ اسے اس زور سے رگڑا جائے کہ اس کا اثر ختم ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث عام ہے اور عموم بلویٰ بھی ہے۔ ہدایہ میں یہی بیان ہوا۔ اسی

پر ہمارے مشائخ کا عمل ہے۔

اگر نجاست رقیق ہو اور اس کا جرم بھی نہ جیسے پیشاب اور شراب تو رگڑنے سے پاکی حاصل نہیں ہوگی۔

کبھی کبھی جوتے اور موزے پر ایسی گندگی لگ جاتی ہے تو محض رگڑنا ناکافی ہوگا مگر مشائخ فتویٰ دیتے ہیں کہ جب رقیق نجاست سے مٹی لگ جاتی ہے تو مٹی سے مل کر اس کا جسم ظاہر ہو جاتا ہے لہٰذا جرم والی ہونے کی وجہ سے رگڑنے سے پاک ہو جاتی ہے۔ حدیث مبارکہ کا عموم بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ عموم بلویٰ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ رگڑنے سے پاک ہو جانا چاہئے۔

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ موزہ رگڑنے سے پاک نہیں ہوتا' ہاں اگر جوتے پر مٹی لگ جائے تو وہ رگڑنے سے پاک ہو سکتا ہے کیونکہ موزے اور جوتے پر نجاست کی تری لگتی ہے اگر وہ جرم والی ہے تو رگڑنے سے پاک نہیں ہو سکتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر تعبدی (جس کی علت معلوم نہ ہو) ہے اس لئے اس میں رائے کو دخل نہیں۔ اس بارے حدیث مبارکہ آ چکی ہے۔ بہر حال اس رائے سے امام محمد کا رجوع ثابت ہے۔ اس کی تائید آپ کے "رے" والے فتویٰ سے بھی ہوتی ہے۔

موزوں اور جوتوں کے علاوہ کسی اور چیز کو رگڑ کر صاف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس بارے کوئی نص موجود نہیں ہے۔ جو نجاست چمڑے کے مسام میں سرایت کر جاتی ہے اسے رگڑ کر صاف نہیں کیا جا سکتا۔

منی کا کھرچنا

کھرچنے سے کپڑے یا کسی ایسی چیز کو صاف کیا جا سکتا ہے جس پر منی لگی ہو۔ یہ اسی سے خاص ہے کسی اور چیز کو کھرچا نہیں جا سکتا۔

اس کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے:

لما روت ام المؤمنين عائشة الصديقة كنت افرك المنى من ثوب رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كان يابسا وامسحه او اغسله.

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ جب منی خشک ہوتی تو میں آپ ﷺ کے کپڑے سے اسے کھرچ دیتی اور جب تر ہوتی تو اس پر گیلا ہاتھ پھیر دیتی یا اسے دھو دیتی۔

حمیدی کو شک ہے کہ حضرت عائشہ نے امسحه فرمایا یا اغسله فرمایا۔ اسے ابوعوانہ نے روایت کیا ہے۔

دار قطنی نے بغیر شک کے دھو دیا کرتی کے الفاظ روایت کیے ہیں جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة كنت افرك المنى من ثوب رسول الله صلى الله عليه وسلم. (رواہ صحیح مسلم)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں سے منی کھرچ دیا کرتی تھی۔

منی ناپاک ہے

ہمارے نزدیک منی ناپاک ہے اور امام مالک اور ایک روایت امام احمد کے مطابق منی پاک ہے۔ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں۔

لما روی ام المؤمنین عائشة الصديقة انه عليه السلام كان يغسل المنی ثم يخرج الی الصلوة وانا انظر الی اثر الغسل فيه.

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ منی کو دھو دیا کرتے تھے پھر نماز کو تشریف لے جاتے تو میں آپ کے کپڑوں میں دھونے کا اثر دیکھتی۔

عن سلمان بن يسار قال سألت عائشة عن المنی يصيب الثوب قالت كنت اغسله من ثوب رسول الله صلی الله عليه وسلم فيخرج الی الصلوة وان اثر الغسل فی ثوبه.

سلمان بن یسار کی روایت میں ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں کپڑے پر لگی منی کے بارے عرض کیا تو انہوں نے فرمایا: میں اسے رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے دھو دیا کرتی تھی۔ آپ نماز کو تشریف لے جاتے اور دھونے کا اثر کپڑے میں موجود ہوتا۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ منی کے بارے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں اسے دھو دیا کرتی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ منی کا دھونا واجب ہے ورنہ سوال کا جواب ان الفاظ میں نہ دیا جاتا اور نہ ہی یہ اس سوال کا جواب بنتا۔ اگر منی پاک ہوتی تو حضور ﷺ اسے نہ دھوتے اور نہ ہی ام المؤمنین اسے صاف فرماتیں۔ جب دھونا اور اسے کھرچنا ثابت ہے تو بیشک ایک بار ہی کیوں نہ ہو یہ قطعی حجت ہے۔

اس سے بھی واضح تر دلیل عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث ہے جس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔

عن عمار بن ياسرؓ قال اتی علی رسول الله صلی الله عليه وسلم وانا علی بئرا دلو ماء فی ركوة قال يا عمار ماتصنع قلت يا رسول الله صلی الله عليه وسلم بابی انت وامی اغسل ثوبا من نخامة اصابة فقال يا عمار انما يغسل الثوب من خمس من الغائط والبول والدم والقیئ والمنی يا عمار ما كامتك ودموع عينك والماء الذی فی ركوتك الاسواء.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میں ایک چھوٹے برتن سے کنویں سے پانی نکال رہا تھا کہ میرے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور پوچھا: اے عمار! کیا کر رہے ہو؟ میں نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان کپڑے پر بلغم لگ گئی ہے اسے دھو رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمار! پانچ چیزوں کے لگنے سے کپڑا دھویا جاتا ہے۔ پاخانہ، پیشاب، خون، قے اور منی۔ اے عمار! تیری بلغم، تیری آنکھوں کے آنسو اور وہ پانی جو تیرے ڈول میں ہے وہ تو برابر ہیں۔ (یعنی تینوں چیزیں پاک ہیں)

دارقطنی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ثابت بن حماد' علی بن زید سے راوی ہیں جو ضعیف ہیں۔
صاحب فتح القدیر نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث کی متابع ایک اور حدیث ہے لہٰذا راوی کا ضعف کوئی نقصان نہیں دیتا۔ طبرانی حماد بن سلمہ سے اور وہ علی بن زید سے اسی حدیث کو سنداً اور متناً روایت کرتے ہیں۔ طعن علی بن زید میں ہے۔ اس طعن کو فتح القدیر میں یہ کہہ کر ختم کیا گیا ہے کہ وہ مسلم ہے۔ حاکم نے اس سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق ہے۔

امام شافعی اور امام احمد سے منقول ایک روایت کے مطابق جو ان کے متبعین کے نزدیک پسندیدہ روایت ہے' منی پاک ہے۔ ان دونوں کی دلیل یہ ہے کہ منی انبیاء کی اصل ہے یہ ناپاک کیسے ہوسکتی ہے لیکن یہ دلیل کچھ وزن نہیں رکھتی۔ اگر اس وجہ سے منی پاک ہے تو پھر خون بھی پاک ہونا چاہئے لیکن ایک دوسری حدیث امام شافعی اور امام احمد کے نظریہ کی تائید کرتی ہے۔

عن ابن عباس عنه علیه السلام انه سئل عن المنی یصیب الثوب قال انما هو بمنزلة المخاط والبزاق وقال انما یکفیک ان یمسحه بخرقة اوباذخر.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ سے کپڑے پر لگی منی کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: منی تھوک اور رینٹ کی مانند ہے اور آپ نے اس کے بارے یہ بھی فرمایا کہ اسے کسی کپڑا سے یا گھاس سے پونچھ دیا کرو۔

اسے دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔
اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے مرفوع ہونے میں کلام ہے۔ دوسری چیز یہ سامنے رہنی چاہئے کہ ہم بھی یہی کہتے کہ منی کھرچ دینی چاہئے یا کسی کپڑے وغیرہ سے صاف کردینی چاہئے۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ منی رینٹ کی مانند ہے یہ اس کے پاک ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دونوں کے درمیان وجہ شبہ طہارت نہ ہو۔ ''تیرے لئے کافی ہے'' کے الفاظ اس کے حکم کو بیان کرتے ہیں' وجہ شبہ کو بیان نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ اس اصول کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جب کسی چیز کے حرام اور مباح ہونے میں اختلاف ہوجائے تو حرام کو غلبہ ہوتا ہے۔
شمس الائمہ فرماتے ہیں منی کو کھرچنے والا مسئلہ مشکل ہے کیونکہ پہلے آدمی کو مذی آتی ہے اور اس کے بعد منی خارج ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے منی سے مغلوب کہا جائے اور منی سے الگ اس کے وجود کو کوئی حیثیت نہ دی جائے۔ تو ایسی صورت میں وہ منی کے تابع ہوگی۔ فتح القدیر میں ہے کہ جب کسی شخص کو منی سے پہلے مذی نہ آتی ہو تو شرعاً منی جب خشک ہوجائے گی تو صرف کھرچنے سے کپڑا پاک ہوجائے گا۔ شریعت مطہرہ نے مذی کا اعتبار ضرورت کے تحت نہیں کیا۔

کھرچنا صرف اسی صورت میں کافی ہوسکتا ہے کہ ذکر کے سر پر پیشاب نہ لگا ہو کیونکہ اگر ذکر کے منہ پر پیشاب لگا تھا پھر منی خارج ہوئی اگر وہ پیشاب مخرج سے متجاوز نہیں تھا تو پھر پتھر سے استنجاء ہوسکتا تھا لہٰذا کھرچنا کافی ہوگا کہ غلاظت صرف مخرج تک ہے اور اگر پیشاب مخرج سے متجاوز ہے تو پھر کھرچنا کافی نہیں کیونکہ مخرج سے

تجاوز کرنے کی صورت میں پانی کا استعمال لازم ہوتا ہے۔

تلوار اور شیشے کو پاک کرنے کا طریقہ

اگر تلوار اور شیشے پر گندگی لگ جائے تو وہ صرف پونچھنے سے پاک ہو جاتے ہیں کیونکہ نجاست ان دونوں چیزوں کے اندر سرایت نہیں کرتی لیکن لوہے یا شیشے کے علاوہ کسی اور چیز کو پونچھ کر پاک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نجاست اندر سرایت کر جاتی ہے اور پونچھنے سے وہ زائل نہیں ہوتی۔

پانی کے ساتھ مسح صرف فصد' پھوڑوں اور زخموں کے اردگرد کیا جا سکتا ہے جبکہ دھونے سے تکلیف ہوتی ہو اور پانی پہنچنے سے زخموں کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو چونکہ اس صورت میں مجبوری ہے اس لئے مسح جائز ہے لیکن ایسی مجبوری کہیں اور نہیں ہے۔

زمین پاک ہونے کی صورت

پاک کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ناپاک چیز خشک ہو جائے۔ خشک ہونے سے زمین پاک ہو جاتی ہے۔ وہ کچی اینٹیں جو زمین پر ہیں۔ وہ درخت جو زمین میں پیوست ہے۔ دیوار اور چھت یہ تمام چیزیں جب خشک ہو جاتی ہیں تو خود بخود پاک ہو جاتی ہیں انہیں پاک نہیں کرنا پڑتا لیکن شرط یہ ہے کہ خشک ہونے سے نجاست کا اثر زائل ہو جائے۔ ان چیزوں کے علاوہ اور کوئی ناپاک چیز محض خشک ہونے سے پاک نہیں ہوتی۔

امام شافعی فرماتے ہیں ان چیزوں کو پاک کرنے کے لئے بھی پانی کا استعمال ضروری ہے۔

قد روی انس قال بینا نحن فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم اذجاء اعرابی فقام یبول فی المسجد فقال اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم مه مه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاتذرموه دعوه فترکوه حتی بال ثم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم دعاه فقال ان هذا المسجد لایصلح بشئی من هذا البول والقذر انما هی لذکر الله والصلوة وقرأة القران او کما قال صلی الله علیه وسلم قال وامر رجلا من القوم فجاء بدلو من ماء فشنه علیه.

(رواہ صحیح بخاری وصحیح مسلم)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم مسجد نبوی میں بیٹھے تھے' ایک دیہاتی آیا اور مسجد میں کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کہنے لگے رک جا رک جا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا غصہ نہ کرو' جانے دو۔ صحابہ کرام منع کرنے سے رک گئے حتیٰ کہ اعرابی پیشاب کر کے فارغ ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے پاس بلایا اور فرمایا: یہ مسجد ہے' اس میں پیشاب کرنا اور گندگی پھیلانا صحیح نہیں۔ مسجد اللہ تعالیٰ کے ذکر' نماز اور قرآن کریم کی تلاوت کے لئے ہوتی ہے۔ اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں میں سے ایک آدمی کو حکم دیا۔ وہ پانی کا ڈول لایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب پر پانی چھڑک دیا۔

اس حدیث کو پڑھ کر امام شافعی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ چھڑکاؤ زمین کو پاک کرنے کے لئے تھا۔ ہمارے نزدیک تو پانی چھڑکنے سے نجاست میں اضافہ ہوا (پیشاب کے ساتھ پانی مل کر نجس ہو گیا اور اس نے زیادہ جگہ گھیر لی جس سے زیادہ زمین ناپاک ہو گئی) چھڑکاؤ نے زمین سے نجاست کو زائل تو نہیں کیا۔ ہمارے نزدیک یہ چھڑکاؤ اس غرض سے کیا گیا کہ پیشاب کا داغ نہ پڑ جائے اور خشک ہونے کے بعد پاک و صاف ہو جائے۔ ہاں اگر کسی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ پانی چھڑکنے کے بعد حضور ﷺ نے جگہ خشک ہونے سے پہلے وہاں نماز بھی پڑھی تو پھر بات بنتی ہے۔

ہماری قطعی دلیل جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ابوداؤد کی حدیث ہے۔

عن ابن عمر قال كنت في المسجد على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وكنت فتى شابا وكانت الكلاب تبول وتمرني المسجد وكانوا لايرشون شيئا.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں میں مسجد میں بیٹھا تھا۔ ان دنوں میں جوان تھا۔ کتے مسجد میں پیشاب کرتے تھے اور گزر جاتے تھے اور لوگ بالکل چھڑکاؤ نہیں کرتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوا زمین پانی چھڑکے بغیر بھی پاک ہو جاتی ہے ورنہ مسجدیں ناپاک ہوتیں اور حضور ﷺ انہیں پاک کرنے کا حکم دیتے۔

دباغت سے چمڑہ پاک ہو جاتا ہے

دباغت سے صرف چمڑہ پاک ہوتا ہے:

روى ابن عباس عنه عليه السلام ايما اهاب دبغ فقد طهر.

حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جو چمڑی دباغت کی جائے وہ پاک ہو جاتی ہے۔

اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں جب کسی چمڑے کو دباغت کیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے لیکن ہر چمڑی دباغت سے پاک نہیں ہو جاتی۔ نجس العین کی جلد دباغت سے بھی پاک نہیں ہوتی اور نجس العین خنزیر ہے کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ. (الانعام: ۱۴۵) یا خنزیر کا گوشت' تو وہ ناپاک ہے۔

امام ابوحنیفہ (حضرت حسن کی نقل کردہ روایت) اور امام شافعی کے نزدیک ہٗ ضمیر کا مرجع خنزیر اور کتا ہے۔

انسان کی جلد سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں

آدمی کی جلد پاک ہے لیکن اس کو دباغت کرنا اور اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑی تکریم بخشی ہے۔ اس حدیث کے الفاظ عام ہیں۔ اس کے تحت تمام درندوں کی جلد اور اس جانور کی جلد آتی ہیں

جس کو مجوسی نے ذبح کیا ہو۔

عن ابن وعلة قال سألت عبدالله بن عباس قلت انا تكون بالمغرب ومعناالبربر والمجوس توتى بالكبش فذبحوه ونحن لا ناكل ذبائحهم وتؤتى بالسقاء يجعلون فيه الودک فقال ابن عباس قد سألنا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذلک فقال دباغها طهورها. (رواہ صحیح مسلم)

ابن وعلہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا اور کہا: ہم مغرب میں رہتے ہیں اور ہمارے ساتھ بربر قوم اور مجوسی بستے ہیں۔ وہ مینڈھے لاتے ہیں اور انہیں ذبح کرتے ہیں' ہم ان کے ذبح شدہ جانوروں کا گوشت نہیں کھاتے۔ وہ ایسا پانی کا برتن لاتے ہیں جس میں چربی ہوتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: ہم نے اس بارے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا: ان کی دباغت ان کے لئے طہارت ہے۔ (یعنی چمڑوں کی دباغت ان کو پاک کر دیتی ہے)۔

اس حدیث سے بھی ظاہر ہوا کہ مجوسی مشرک ہونے کے باوجود نجس نہیں ہیں۔ (یعنی ان کا جسم نجس نہیں ہوتا)۔

مردار جانور کی جلد بھی مذکورہ عموم میں داخل ہے۔ اس میں امام احمد بن حنبل کے بعض پیرو اختلاف رکھتے ہیں اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

عن عبد الله بن حكيم قال اتانا كتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لاتنفعوا من الميتة باهاب ولا بعصب.

عبداللہ بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک آیا کہ مردار جانور کے چمڑے اور پٹھوں کو کام میں نہ لانا۔

اسے ترمذی' ابوداؤد اور نسائی نے بیان کیا ہے۔

محدثین کے نزدیک اس حدیث کی صحت میں کلام ہے۔ فتح القدیر میں اس پر کچھ گفتگو ہوئی ہے پھر اگر اس کی صحت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی یہ دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ اہاب کا لفظ مردار کی چمڑی کے لئے ہی آتا ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة الصديقة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم امران نستمتع بجلود الميتة اذا دبغت.

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم مردار جانوروں کے چمڑوں کو کام میں لائیں جبکہ وہ دباغت ہو چکے ہوں۔

اسے امام مالک اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

وعن سلمة بن المحق قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم جاء في غزوة تبوک على اهل بيت فاذا قربة معلقة فسال

سلمہ بن المحق سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں حضور ﷺ ایک گھر تشریف لے گئے تو اچانک آپ کی نگاہ ایک مشکیزے پر پڑی جو لٹک رہا تھا۔ حضور ﷺ

الماء فقالوا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انها میتة قال دباغها طهورها.

نے پانی طلب فرمایا۔ اس گھر کے باسیوں نے عرض کی: حضور! یہ مشکیزہ تو مردار جانور کے چمڑے کا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی دباغت اس کے لئے طہارت ہے۔

اسے امام احمد بن حنبل اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

چمڑے سے گندی رطوبات کے ازالے کو دباغت کہتے ہیں۔ مختلف طریقوں سے رطوبتوں کو ختم کر کے چمڑے کو خراب ہونے سے بچایا جاتا ہے۔ اس کو یا تو خشک کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ کسی قسم کی رطوبت باقی نہیں رہتی یا پھر مختلف دواؤں کے ذریعے اسے خشک کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات دباغت کے لئے مٹی بھی استعمال ہوتی ہے۔ بہر حال کسی بھی طریقہ سے یہ رطوبتیں ختم ہو جائیں تو اسے دباغت کہتے ہیں اور دباغت سے چمڑا پاک ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے:

عن ام المؤمنين ميمونة قالت مر على رسول الله صلى الله عليه وسلم رجال من قريش ويجرون شاة لهم مثل الحمار فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم يطهرها الماء والقرظ.

ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ قریش کے کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو گدھے جیسی ایک بڑی (مردہ) بکری کو گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: پانی اور قرظ (ایک قسم کی گھاس ہے جو دباغت کے کام آتی ہے) اس کو پاک کر دیتے ہیں۔ (یعنی چمڑا دباغت کر کے کام میں لایا جا سکتا ہے)۔

اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ دباغت صرف اسی گھاس سے ہی ہو سکتی ہے۔ حضور ﷺ نے مختلف افرادِ دباغت میں سے ایک کا نام ذکر فرمایا ہے اور یوں ایک فرد کو باقی افراد سے ذکر کرنے سے عموم پر کچھ فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی وہ عام، خاص میں تبدیل ہوتا ہے۔

ہاتھی دانت کی مصنوعات کا حکم

شیخین کے نزدیک ہاتھی نجس العین نہیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ خنزیر کی مانند ہے۔
شیخین کی دلیل حضرت عمر بن خالد کی حدیث ہے۔

عن قتادة عن انس انه عليه السلام كان تمشيط بمشط العاج.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہاتھی دانت سے بنی کنگھی استعمال فرمایا کرتے تھے۔

اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور اس پر کچھ کلام کیا ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ میرے نزدیک ہاتھی دانت سے بنی ہوئی چیزیں پاک ہیں۔

امام ابو یوسف کے نزدیک انقلاب عین (ماہیت تبدیل ہونے سے) سے کوئی چیز پاک نہیں ہوتی۔ جو حرام ہے اس کو جلا کر راکھ بنا دیں یا کسی مصنوعی طریقہ سے اسے نمک میں تبدیل کر دیں۔ راکھ اور نمک حلال نہیں ہوں گے۔ فتویٰ امام محمد کے قول پر ہے اور اس کی نظیر موجود ہے۔ دیکھیں نطفہ ناپاک ہے پھر جب یہ نطفہ خون بنتا ہے تو ناپاک رہتا ہے۔ لوتھڑا بنتا ہے تو ناپاک رہتا ہے۔ گوشت کی شکل اختیار کرتا ہے تو پاک ہو جاتا ہے پھر اس سے حیوان میں تبدیل ہوتا ہے تو پاک ہوتا ہے۔ اب وہ چیز جس کو شارع علیہ السلام نے نجس قرار دیا تھا جب اس کی ماہیت تبدیل ہوگئی تو وہ پاک ہو گیا۔

اسی کو بنیاد بنا کر علماء فقہ نے فتویٰ دیا ہے کہ نجس تیل سے جو صابن بنتا ہے وہ پاک ہے۔ ایسا ہی فتح القدیر میں ہے۔

مٹی جس میں ناپاک بھوسہ ملا وہ پاک ہے بشرطیکہ بھوسہ زمین میں گل سڑ کر اپنا وجود کھو چکا ہو اور خشک ہو گیا ہو۔

موزوں کو رگڑ کر پاک کر دیا گیا' کپڑے سے منی کھرچ کر اسے پاک کیا گیا اور جلد کو سورج میں خشک کر کے یا مٹی میں لت پت کر کے دباغت کیا گیا اب اگر یہ چیزیں پانی سے گیلی ہو جائیں تو کیا پاک ہوں گی یا ناپاک؟

اس کے بارے دو روایتیں ہیں اور دونوں ہی امام ابو حنیفہ سے منقول ہیں۔ فتویٰ اس قول پر ہے کہ گیلا ہونے کے بعد بھی یہ پاک ہوں گی کیونکہ گیلا ہونے سے پہلے وہ اس چیز سے پاک ہو چکی ہیں جس کو شارع علیہ السلام نے ذریعہ طہارت قرار دیا ہے لہٰذا پانی کسی ناپاک چیز سے نہیں ملا بلکہ پاک چیز پاک چیز سے مل رہی ہے اس لئے ناپاکی کی کوئی وجہ نہیں۔ موزے' جلد اور کپڑا پاک ہیں۔ گیلا ہونے پر ناپاک نہیں ہوں گے۔

واللہ اعلم باحکامہ.

استنجاء کا بیان

رفع حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا

رفع حاجت کے آداب بیان کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنا مکروہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق رفع حاجت کے وقت قبلہ شریف کی طرف پیٹھ کرنا مکروہ اور ایک روایت کے مطابق پیٹھ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ قول امام احمد بن حنبل کا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ آبادی میں قبلہ رو ہو کر یا قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے پیشاب یا پاخانہ کرنا جائز ہے' مکروہ نہیں لیکن صحراء میں اس کی اجازت نہیں۔

یہاں روایت (رفع حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا مکروہ ہے) کو امت نے اختیار کیا ہے اور اسی پر علماء کرام فتویٰ دیتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے:

عن ابی ایوب الانصاری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتیتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها ولکن شرقوا اوغربوا.

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم رفع حاجت کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ شریف کی طرف منہ کرو اور نہ ہی پیٹھ بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرو۔

اسے بخاری اور مسلم نے بیان کیا ہے۔ (مدینہ طیبہ سے قبلہ جنوب کی طرف واقع ہے)

پیشاب کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا ممنوع ہے اور پاخانہ کے وقت پیٹھ۔

دوسری روایت جس کو امام احمد نے اختیار کیا ہے کہ یہ پابندی صرف صحراء میں ہے۔ اس کی دلیل حضور ﷺ کی یہ حدیث ہے:

عن ابن عمر ارتقیت فوق بیت حفصة لبعض حاجتی فرأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقضی حاجة مستدبرا القبلة مستقبل الشام.

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان کی چھت پر کسی کام کے لئے چڑھا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ رفع حاجت فرما رہے ہیں۔ آپ کی پیٹھ مبارک قبلہ کی طرف ہے اور منہ شام کی طرف۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث کو دلیل بناتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ چار دیواری میں قبلہ رو بیٹھ کر رفع حاجت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ پہلی حدیث کو صحراء پر محمول کرتے ہیں لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے

کیونکہ چار دیواری میں کعبہ کی طرف پیٹھ کر کے رفع حاجت اگر اس نیت سے ہے کہ آدمی اور قبلہ کے درمیان آڑ ہے تو اس میں تو آبادی اور ویرانہ یکساں ہیں اور اگر صحراء میں عدم جواز کی وجہ تعظیم ہے کہ انسان قبلہ شریف کی جہت کو مقدس سمجھتے ہوئے اس کی طرف پیٹھ نہیں کرنا چاہتا تو پھر یہ تقدس تو آبادی اور ویرانے دونوں میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ان دونوں احادیث میں قول اور فعل کا تعارض ہے اور اصول فقہ کے مطابق جب کسی چیز کے بارے میں قول و فعل کا تعارض آ جائے تو قول پر عمل کیا جاتا ہے لہٰذا مذکورہ صورت میں قبلہ شریف کی طرف استقبال اور استدبار دونوں ناجائز ہوئے اور دوسری حدیث پاک میں یہ بھی احتمال پایا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے پوری طرح قبلہ شریف کی طرف پیٹھ نہ کی ہو بلکہ آپ ﷺ کی پیٹھ قبلہ شریف سے قدرے پھری ہو کیونکہ آپ اللہ کے نبی تھے ایک نبی تو اس طرح کا اہتمام کر سکتا ہے لیکن غیر نبی کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔ تو دوسری حدیث کو جب ادنیٰ انحراف پر محمول کریں گے تو یہ حدیث نہی والی حدیث کے معارض نہیں ہوگی۔ دوسری حدیث کو ادنیٰ انحراف پر محمول کرنے کی وجہ دونوں کے درمیان تطبیق ہے چونکہ پہلی حدیث نص اور مفسر ہے اس لئے اس کی تحویل ممکن نہیں ہے۔

مسجد کی چھت پر بول و براز اور جماع کرنا حرام ہے

مسجد کی چھت پر بول و براز اور جماع مکروہ تحریمی ہے کیونکہ مسجد کی چھت مسجد کے حکم میں ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مسجد کی چھت پر چڑھنے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔ وہ مکان جو نماز کے لئے تیار کیا گیا ہو اس کی چھت پر رفع حاجت کرنا یا جماع کرنا مکروہ نہیں کیونکہ جائے نماز مسجد کے حکم میں نہیں۔

عذر کی بنا پر کھڑے ہو کر پیشاب کیا جا سکتا ہے

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مکروہ ہے۔

عن امیر المؤمنین عمر قال رأنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وانا ابول قائما فقال یا عمر لاتبل قائماً فما بلت قائما.

امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو فرمایا: اے عمر کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا کرو۔ تو میں نے (اس کے بعد) کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔

اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

بخاری شریف کی وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا' محی السنۃ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ عذر کی وجہ سے تھا۔ ان دنوں رسول اللہ ﷺ کو تکلیف تھی۔ حضرت امام شافعی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ اس تکلیف کی وجہ سے معمول کے مطابق بیٹھ کر پیشاب نہیں فرما سکے تھے۔ حاکم ابن عمر کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے گھٹنے میں درد تھا تو انہوں نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ یہ حدیث صحیح ہے تو دوسری حدیث جس میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے ایک کوڑے کرکٹ پر کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

وہاں نجاست بہت زیادہ تھی تو بیٹھ کر پیشاب کرنا ممکن نہ تھا۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة انها قالت من حدثکم ان النبی صلی الله علیه وسلم کان یبول قائما فلاتصدقوه ما کان یبول الا قاعدا.

حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر کوئی تم سے یہ بیان کرے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے تو اس کی بات کی تصدیق نہ کیجئے گا کیونکہ حضور ﷺ بیٹھ کر ہی پیشاب فرمایا کرتے تھے۔

اسے امام احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث پاک اس بات کی بین دلیل ہے کہ حضور ﷺ کی عادت مبارک بیٹھ کر پیشاب کرنے کی تھی مگر کبھی تکلیف ہوتی تو کھڑے ہو کر بھی پیشاب فرما لیتے لیکن ایسا بہت ہی کم ہوا ہے۔

رفع حاجت کے وقت گفتگو کرنا مکروہ ہے

رفع حاجت کے وقت گفتگو کرنا مکروہ ہے۔

عن ابی سعید قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لایخرج الرجلان یضربان الغائط کاشفین عورتهما یتحدثان فان الله یمقت علی ذلک.

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو آدمی رفع حاجت کی غرض سے اپنی شرمگاہوں کو ننگا کئے گفتگو کرتے ہوئے نہ نکلیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہوتا ہے۔

اسے امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

ہمارے مشائخ نے استنجاء کرتے ہوئے گفتگو کے مکروہ ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ جب تک آدمی استنجاء سے فارغ نہیں ہو جاتا اس سے گفتگو کرنا جائز نہیں ہے۔

پتھر اور پانی کے ساتھ استنجاء کرنا زیادہ درست ہے

پتھر کے ساتھ استنجاء کرنا سنت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ یقین ہو کہ استنجاء نہ کرنے کی صورت میں نجاست درہم کی مقدار سے تجاوز نہیں کرے گی اور جب اس بات کا خوف ہو تو پتھر استعمال کرنے کے بعد پانی کا استعمال فرض ہو جاتا ہے اور پانی کا استعمال اس لئے فرض ہے کہ جب نجاست درھم کی مقدار سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس کا ازالہ فرض ہو جاتا ہے اور درھم کی مقدار کے لئے پتھر کا استعمال اس لئے کافی ہے کہ اس کے معاف ہونے میں نص موجود ہے جیسا کہ آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں پتھر کا استعمال بہرحال ضروری ہے اور پتھر اور پانی دونوں کا استعمال نہ کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اسی سے عام طور پر عذاب قبر ہوتا ہے۔ پتھر سے استنجاء کے بعد پانی کا استعمال کر لینا چاہئے کیونکہ پیشاب کے قطرے آنے کا احتمال رہتا ہے اور جب آدمی دونوں چیزوں کو استعمال کرتا ہے تو قطرات کے ختم ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔

عن مولی امیر المؤمنین عمر قال کان عمر اذا قال ناولنی شیأ استنجی به فانا وله العود والحجرا ویاتی حائطا یمسح به او یمس الارض (رواہ بیہقی)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک غلام سے روایت ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیشاب کرتے تو فرماتے کہ کوئی چیز لاؤ کہ میں اس سے استنجاء کروں تو میں کوئی لکڑی' پتھر لے جاتا یا آپ کسی دیوار کی طرف تشریف لے جاتے اور اس کے ساتھ مسح کرتے یا آلہ تناسل کو زمین پر رگڑ دیتے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی صحیح ترین حدیث ہے جیسا کہ شیخ عبدالحق نے نقل فرمایا۔ اس سے لکڑی کے ساتھ استنجاء کرنے کا جواز بھی نکلتا ہے لیکن اس سے مراد عام لکڑی نہیں بلکہ ایسی لکڑی ہے جو پیشاب کے قطرات کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

پاخانہ کے بعد استنجاء کے بارے آپ حدیث پڑھ آئے ہیں کہ آپ ﷺ نے دو پتھر استعمال فرمالئے اور گوبر کو پھینک دیا الغرض پیشاب ہو یا پاخانہ دونوں صورتوں میں پتھر کا استعمال صحیح ہے اور سنت سے ثابت ہے۔

پتھر سے استنجاء کرنے کا طریقہ

استنجاء کا طریقہ یہ ہے کہ اگر پیشاب کیا ہے تو بائیں ہاتھ میں پتھر لے اور دائیں ہاتھ سے مدد لئے بغیر اسے اس جگہ پر رگڑے جس سوراخ سے پیشاب نکلتا ہے اور اس وقت تک پتھر کو اس مخرج سے نہ ہٹائے جب تک یہ جگہ خشک نہیں ہو جاتی اور یقین نہیں ہو جاتا کہ اب پیشاب کی رطوبت خارج نہیں ہوگی۔ دائیں ہاتھ سے شرمگاہ کو پکڑنا ضروری نہیں بلکہ اس سے روکا گیا ہے۔ دائیں ہاتھ سے استنجاء جائز نہیں۔ اگر پیشاب مخرج سے تجاوز نہ کرے اور آدمی پتھر سے استنجاء کرے تو اس کے بعد پانی کا استعمال ضروری نہیں لیکن کمال پاکی اور صفائی کے لئے مستحب ضرور ہے۔

شوافع استنجاء کرنے کا یہ طریقہ بتاتے ہیں کہ شرمگاہ بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیں ہاتھ میں پتھر لے کر شرمگاہ کو پتھر پر رکھ کر دائیں بائیں حرکت دی جائے اور پتھر اپنی جگہ پر رہے کہ دایاں ہاتھ شرمگاہ سے نہ چھوئے یہ محض تکلف ہے اور اس میں بلاوجہ دائیں ہاتھ کا استعمال لازم آتا ہے۔ استنجاء کا صحیح ترین طریقہ وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

شافعی عالم طیبی فرماتے ہیں کہ دائیں ہاتھ کا استعمال پاخانہ کے بعد استنجاء کرنے کے وقت ممنوع ہے اور دائیں ہاتھ کے ساتھ شرمگاہ کو چھونا جائز نہیں لہٰذا شافعی علماء کے نزدیک استنجاء کرنے کا جو طریقہ ہے اس پر کسی قسم کا اشکال پیدا نہیں ہوتا' لیکن علامہ طیبی کی یہ تخصیص بلامخصص ہے (یہ کہیں مذکور نہیں کہ دائیں ہاتھ کو آگے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن پیچھے نہیں) استنجاء میں دائیں ہاتھ کا استعمال منع ہے قطع نظر اس کے کہ آگے استعمال ہو رہا ہے یا پیچھے۔

رفع حاجت کے بعد استنجاء کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بائیں ہاتھ میں ایک پتھر لے اور اسے آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آگے لے جائے اور اس وقت تک پتھر استعمال کرتا رہے جب تک گمان غالب نہیں ہو جاتا کہ اب وہ جگہ صاف ہوگئی ہے۔ اگر پاخانہ مینگنیوں کی طرح ہو اور مخرج سے تجاوز نہ کرے تو پتھر استعمال کرنے سے استنجاء ہو گیا' اس کے بعد زیادہ صفائی کی غرض سے اگر کوئی پانی استعمال کرتا ہے تو مستحب ہے۔

صاحبِ ہدایہ فیہ رجال یحبون ان یتطھروا۔ کے بارے لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیتِ کریمہ ان لوگوں کی تعریف میں نازل ہوئی جو پتھروں کے بعد پانی کے ساتھ استنجاء کرتے تھے۔ فتح القدیر میں ہے کہ آیت کے اس شانِ نزول کو بزاز اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے اور یہ حدیث ضعیف ہے۔

استنجاء میں تین پتھروں کا استعمال شرط نہیں

ہمارے نزدیک تین پتھروں کا استعمال شرط نہیں بلکہ مقصود طہارت ہے۔ حدیث پاک میں جیسا کہ مذکور ہے۔ حضور ﷺ نے دو پتھر لئے اور ان کے ساتھ استنجاء فرمایا اور گوبر کو پھینک دیا کہ یہ نجس ہے۔ اسی طرح کی ایک دوسری حدیث حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے۔ حدیث طویل ہے۔ امام ابوداؤدؒ ابن ماجہ اور دارمی نے اسے روایت کیا ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ طاق پتھروں کا استعمال بہتر ہے لیکن کمی بیشی ہو جائے تو حرج نہیں۔

امام شافعی کے نزدیک تین پتھروں کا استعمال شرط ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة عنه علیه السلام قال اذا ذھب اورکم الی الغایة فلیذھب معه بثلثة احجار فانھا یجزی عنه. (رواہ ابوداؤد و نسائی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی رفع حاجت کے لئے جائے تو اپنے ساتھ تین پتھر لے جائے، یہ تین پتھر اس کے لئے کافی ہوں گے۔

شاید اس سے مراد یہ ہو کہ تین سے زائد پتھر استعمال نہ کئے جائیں کیونکہ دین میں کسی چیز کا بے جا استعمال صحیح نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ تین پتھروں والی حدیث قابل عمل نہیں۔

اگر کسی پتھر کے تین کنارے ہوں تو ایک ہی پتھر تین کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ تین کا تعین صفائی کے لئے ہے اور یہ مقصد ایک ہی پتھر سے پورا ہو رہا ہے۔

جب بول و براز مخرج سے تجاوز کر جائیں لیکن مقدار درھم سے نہ بڑھیں تو پتھر کے بعد پانی کا استعمال سنت ہے۔ پیشاب کے بعد پتھر کا استعمال ضروری ہے، کیونکہ دیر تک قطرے آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

میرے خیال میں علماء کرام کے نزدیک استنجاء کا یہ سنت طریقہ ہے جس کی پیروی ضروری ہے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اگر نجاست درھم سے کم ہو تو اس کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے اور نماز کا وقت ہو تو اعادہ ضروری ہے۔ تھوڑی سی نجاست کے ہوتے ہوئے بھی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اس کا ازالہ واجب ہے۔

ہمارے زمانے میں استنجاء ہر حالت میں سنت واجبہ ہے جیسا کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ:

عن امیر المؤمنین علی ان من کان من قبلکم کانوا یبعرون بعرا وانتم تثلطون ثلطاً فاتبعوا الحجارۃ بالماء.

حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم سے پہلے لوگ اونٹ کی مینگنیوں کی طرح رفع حاجت کرتے تھے اور تم بیل کی مانند گوبر کرتے ہو اس لئے پتھروں کے استعمال کے بعد پانی ضرور استعمال کیا کرو۔

اسی طرح تاج العرفاء حضرت حسن بصری سے بھی روایت ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں پانی کا استعمال سنت تھا۔

عن انس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدخل الخلاء فاحمل انا وغلام اداوۃ من ماء وغیرہ یستنجی من ماء. (رواہ بخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ بیت الخلاء میں تشریف لے جاتے تو میں اور ایک اور غلام پانی وغیرہ اٹھا کر لے جاتے۔ حضور ﷺ پانی سے استنجاء کرتے تھے۔

شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ پتھر استعمال کرنے کے بعد حضور ﷺ پانی کا بھی استعمال فرماتے۔ یہی صحیح ہے کیونکہ پتھروں سے صفائی حاصل کرنا ثابت ہے۔ حضور ﷺ پتھروں کا استعمال فرماتے تھے۔

پانی کا استعمال کب ضروری ہوتا ہے؟

حاصل گفتگو یہ ہے کہ اگر نجاست مخرج سے تجاوز نہ کرے تو پتھروں کے بعد پانی کا استعمال سنت مستحبہ ہے اور اگر تجاوز کر جائے مگر درھم سے کم رہے تو سنت واجبہ ہے۔ ایسی صورت میں اگر پانی استعمال نہ بھی کیا تو نماز ہو جائے گی لیکن وقت کے اندر اعادہ ضروری ہوگا جیسا کہ درھم سے کم نجاست میں حکم ہے اور اگر درھم کی مقدار سے بھی تجاوز کر جائے تو پھر پتھروں سے استنجاء مکمل نہیں ہوگا بلکہ پانی کا استعمال ضروری ہوگا۔

ہدایہ کے نسخوں میں اختلاف ہے۔ ایک نسخہ میں ہے کہ پانی کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوگی اور دوسرے نسخے میں ہے کہ کسی مائع کو جب تک استعمال نہیں کرے گا نماز نہیں ہوگی۔ اس سے اس اختلاف کا اشارہ ملتا ہے کہ کیا پانی کے علاوہ کسی مائع سے بدنی صفائی حاصل کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

شیخین کے نزدیک مخرج کو چھوڑ کر درھم کی مقدار کا اندازہ ہوگا اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مخرج شامل ہے۔ یہی چیز زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ درھم کی مقدار معاف ہے اور اس میں مخرج کا بھی اعتبار کیا گیا ہے اس لئے اس کو اس مقدار میں شامل کیا جائے گا' اگر اسے شامل نہ کریں اور اس کے علاوہ درھم کی مقدار کو معاف شمار کریں تو پھر یہ مقدار درھم کے برابر تو معاف نہ ہوئی۔ فتح القدیر میں ایسے ہی مذکور ہے۔

استنجاء میں دائیں ہاتھ کا استعمال

دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا اور شرمگاہ کو استنجاء کے وقت چھونا مکروہ ہے

عن المؤمنین عائشۃ الصدیقۃ قالت کان ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیمنی لطھورہ وطعامہ وکانت یدہ الیسری لخلائہ وما کان من اذی. (رواہ ابوداؤد)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا دایاں ہاتھ مبارک وضو اور کھانے کے لئے تھا اور بایاں ہاتھ پاخانہ اور نجاست کے لئے تھا۔

عن ابی قتادة قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا شرب احدکم فلا لیتنفس فی الاناء واذا اتی الخلاء فلامس ذکره بیمینه ولا یمسح بیمینه. (رواہ البخاری ومسلم)

ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: جب تم میں سے کوئی شخص پانی پیئے تو برتن میں سانس نہ لے اور جب بیت الخلاء سے آئے تو دائیں ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو مت چھوئے۔

کن چیزوں سے استنجاء کرنا درست نہیں

ہڈی، گوبر، لید وغیرہ سے استنجاء جائز نہیں کیونکہ حدیث مبارک میں ہے کہ:

عن ابن مسعود قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاتستنجوا بالروث والعظام فانهما زاد اخوانکم من الجن. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گوبر اور ہڈی سے استنجاء مت کرو کیونکہ گوبر اور ہڈی تمہارے ان (دینی) بھائیوں کی خوراک ہے جو جن ہیں۔

ستر کا بیان

نماز میں ستر کا ڈھانپنا شرط ہے۔ ستر کھلا ہو تو نماز نہیں ہوتی۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لایقبل صلوة حائض الاسنجمار. (رواہ ابوداؤد والترمذی)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حیض والی (یعنی عورت) کی نماز نہیں ہوتی مگر دوپٹے کے ساتھ۔

فرض نماز شارع علیہ السلام کے نزدیک ایک ایسی عبادت ہے جو مخصوص ارکان اور مخصوص شرائط سے مرکب ہے۔ اگر یہ شرائط اور ارکان نہ پائے جائیں تو نماز نہیں ہوتی لیکن شرائط اور ارکان کی جہت سے یہ حقیقت مجمل ہے۔ اب مذکورہ حدیث اس شرط کے لئے بیان ہے، سو ستر شرط ہے اور یہ اصول ہے کہ مجمل کا بیان کوئی ایسی آیت یا حدیث بن سکتی ہے جو قطعی الثبوت یا قطعی الدلالت ہو۔

ہدایہ میں خذوا زینتکم عند کل مسجد کو بطور دلیل ذکر کیا گیا ہے لیکن اس پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے جیسا کہ فتح القدیر میں بھی یہ سوال وارد کیا گیا ہے کہ یہ آیت طواف کے بارے میں ہے، اگر یہ نماز میں ستر کو واجب ٹھہراتی ہے تو طواف میں بھی ستر کو واجب قرار دیتی ہوگی حالانکہ طواف میں ستر عورت شرط نہیں ہے۔ یہ سوال بالکل صحیح ہے پھر فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت ظنی ہے اور اس کا مقتضاء یہ ہے کہ ستر نماز میں واجب ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ظنی دلیل سے کوئی چیز شرط نہیں بن سکتی کیونکہ نماز شرائط کے اعتبار سے ظنی ہے۔

یہاں فرض سے مراد یہ ہے کہ ایسی چیز جس کے نہ ہونے سے نماز نہ ہوتی ہو نہ کہ ایسی چیز جو دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ آخری قعدہ فرض ہے حالانکہ یہ دلیل ظنی سے ثابت ہے۔ یہی گفتگو صاحب الکشف نے کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انہوں نے اس مذہب کے قائل کے مطابق گفتگو کی ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ جب مجمل قطعی الثبوت ہو

تو مجمل کے واضح ہونے سے دلیل ظنی سے بھی قطعیت ثابت ہو جاتی ہے لیکن ایسے میں یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے' ہاں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ آیتِ کریمہ ستر کے شرط ہونے پر دال نہیں بلکہ ہر نماز کے وقت ستر کی طلب پر دال ہے اور یہ عام ہے' شرط نہیں ہے۔ صاحب فتح القدیر نے فرمایا ہے کہ بہترین استدلال یہ ہے کہ ستر عورت کا شرط ہونا اجماع سے ثابت ہے جیسا کہ کئی علماء نے اس کی وضاحت کی ہے۔ اگرچہ بعض مالکی علماء کی رائے اس سے مختلف ہے لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اجماع کے بعد مخالفت' اجماع کی مخالفت ہے لیکن شیخ اکبر قدس سرہ نے فتوحاتِ مکیہ میں اس کے خلاف رائے نقل فرمائی ہے۔ ان کے نزدیک بھی ستر عورت شرط نہیں لیکن شیخ کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتے کہ اجماع کی مخالفت کریں اور ایسے اجماع کے مقابلے میں اپنی رائے کا اظہار کریں جو پہلے قائم ہو چکا ہے اور شریعت میں معتبر ہے۔

اس بارے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاید ستر عورت کے بارے جو اجماع ہے وہ صحابہ کی بجائے تابعین کا ہو اور تابعین کے اجماع کو حضرت شیخ حجت نہیں مانتے' ان کے نزدیک صحابہ کرام کا اجماع معتبر ہے اسی لئے شاید انہوں نے اسے شرط نہیں سمجھا۔

مرد کا ستر

مرد کی شرمگاہ کی حد ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ امام مالک کے نزدیک ران اس میں شامل نہیں۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ:

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه ان رسول الله ﷺ قال لاتبرز فخذک ولا تنظر الی فخذحی ومیت. (رواہ سنن ابوداؤد)

حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنی ران کو ننگا نہ کر اور کسی زندہ اور مردہ کی ران کو نہ دیکھ۔

دوسری حدیث یہ ہے:

عن ابن عباس ان النبی صلی الله علیه وسلم قال الفخذ عورة. (رواہ جامع الترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ران شرمگاہ ہے۔

ناف ہمارے نزدیک شرمگاہ نہیں ہے لیکن گھٹنے شرمگاہ ہیں۔ امام شافعی کا مذہب اس کے برعکس ہے۔

عن عمرو ابن شعیب عن ابیه عن جده ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ما تحت السرة الی رکبتیه عورة.

حضرت عمرو ابن شعیب سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو حصہ ناف سے نیچے گھٹنے تک کا ہے (وہ) شرمگاہ ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے دارقطنی نے روایت (بیان) کیا ہے اور یہ ایک طویل حدیث کا جزو ہے۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی سواد بن داؤد عقیلی ہیں جن کو ابن معین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ یہ ناف کے شرمگاہ نہ ہونے میں نص صریح ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ گھٹنے کیوں شامل ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ غایت الاسقاط کے حکم میں ہے۔ اگر غایت نہ ہو تو ان کا بھی یہی حکم ہو۔ غایۃ الاسقاط مغیا میں شامل نہیں ہوتی۔

عورت کا ستر

آزاد عورت کا پورا بدن شرمگاہ ہے سوائے اس کے چہرے اور ہتھیلیوں کے۔ پاؤں شرمگاہ میں شامل نہیں۔ ہدایہ میں ہے کہ یہی رائے صحیح ہے۔ صاحب ہدایہ نے باب الکراھتہ میں فرمایا ہے کہ پاؤں پاؤں ہیں اور ان کی طرف دیکھنا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ انہیں سے اباحت کی بھی ایک روایت ہے۔

ضرورت کے تحت عورت کے جسم کا کچھ حصہ دیکھا جا سکتا ہے۔

عن ابن مسعود قال ان النبی صلی الله علیه وسلم قال المرأة عورة فاذاخرجت استبتسر فیها الشیطان.

حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت شرمگاہ ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے۔

اسے ترمذی نے روایت کیا ہے لیکن اس حکم سے چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں جیسا کہ آپ گزشتہ سطور میں پڑھ چکے ہیں۔

قد روی مرسلاعنه صلی الله علیه وسلم ان الجاریة اذا حاضت لم یصلح ان یری الا وجهها ویدها.

حضور ﷺ سے مرسلاً روایت ہے کہ لونڈی جب بالغ ہو تو اس کے چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ جسم کے کسی حصہ کی طرف نہیں دیکھا جا سکتا۔

لونڈی کا پیٹ اور وہ حصہ جو مردوں کی شرمگاہ شمار ہوتا ہے (یعنی ناف سے گھٹنوں تک) اس کے لئے ڈھانپنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ باقی جسم شرمگاہ نہیں ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ بیہقی نے نافع سے روایت کیا ہے کہ:

ان صفية بنت ابی عبید حدثة قال خرجت امرأة متجلببة متخمرة فقال عمر من هذه فقیل له جارية لفلان رجل من اهل بیته فارسل الی حفصة وقال ما حملک علی ان تخمری هذه المرأة وجلببها وتشبها بالمحصنات حتی سمعت ان اقع بها لا احسبها الا من المحصنات لا تشبهوا الاماء بالمحصنات.

صفیہ بنت ابی عبید نے بیان کیا ہے کہ ایک عورت برقعہ اوڑھے اور اپنے پورے جسم کو کپڑے سے ڈھانپے گھر سے باہر نکلی۔ حضرت عمر نے پوچھا: یہ عورت کون ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ فلاں شخص کی لونڈی ہے۔ جس کا تعلق اہل بیت سے تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حفصہ کی طرف پیغام بھیجا کہ اس لونڈی کو چادر اور برقعہ پہنا کر آزاد عورتوں کی طرح بنانے کی وجہ کیا ہے؟ میں نے تو اسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ میں یہ سب کچھ صرف آزاد عورتوں کے لئے پسند کرتا ہوں۔ لونڈی کو آزاد عورتوں کی طرح نہ بنادو۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر سے یہ آثار صحیح ہیں۔

عورت بلند آواز سے گفتگو نہ کرے

آزاد عورت کے گانے کی آواز بھی عورت ہے اور اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث مبارک ہے:

التسبیح من الرجال والتصفیق من النساء۔ (کہ جب کوئی نمازی کے آگے سے گزر رہا ہو تو) مرد تسبیح (سبحان اللہ) سے اُسے آگاہ کرے اور عورتوں کی طرف سے (آگاہی کے لئے) تالی بجانا ہے۔

اسے امام بخاری نے ایک طویل حدیث میں بیان فرمایا ہے۔
عورت کی آواز کو سننے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ فتح القدیر میں ایسے ہی ہے۔ اس سے کئی مسائل نکلتے ہیں۔
ایک یہ ہے کہ ایک عورت جب بلند آواز سے قرأت کرتی ہے تو اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

شرمگاہ کا کھلا رہنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے

اگر تھوڑی سی شرمگاہ کھلی رہ گئی یا تھوڑے وقت کے لئے کھلی رہ گئی تو نماز نہیں ٹوٹے گی اگرچہ مکروہ ہو جائے گی۔ زیادہ سے مراد عضو کا چوتھائی حصہ ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک نصف عضو سے زائد کثیر ہے۔ نصف عضو کے بارے تو روایتیں ہیں۔ زیادہ وقت سے مراد اتنا وقت ہے جس میں ایک رکن ادا ہو سکتا ہے اسے مسح میں چوتھائی سر پر اور احرام کے بعد چوتھائی سر کے حلق کرانے پر قیاس کیا گیا ہے۔ چوتھائی حصہ کو دیکھنا پورے عضو کو دیکھنا ہے۔ مثلاً جس نے چہرے کے چار اطراف میں سے کسی ایک کو دیکھا تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا کیونکہ چہرہ کروی ہوتا ہے اور ایک جانب سے دیکھنے سے پورا چہرہ نظر آ جاتا ہے۔
جن اعضاء کو ڈھانپنا ضروری ہے ان میں سے کسی ایک عضو کا ننگا ہو جانا رؤیت ہے۔ ران عضو ہے۔ ناف سے نیچے پیڈو تک کا حصہ ایک عضو ہے۔ ذکر اور اس کا سر ایک عضو ہے۔ خصیتین ایک الگ عضو ہے۔ ایک قول کے مطابق ذکر اور خصیتین دونوں مل کر ایک عضو بنتے ہیں۔ ہدایہ میں ہے کہ صحیح قول پہلا ہے۔
دبر کے دونوں چوتڑ الگ الگ عضو ہیں دونوں مل کر ایک عضو نہیں۔ فتح القدیر میں پہلے قول کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔
عورت کا پیٹ عضو ہے' آزاد عورت کی پیٹھ عضو ہے' اس کے بال عضو ہیں۔ ان تمام میں سے کسی ایک کا اتنی دیر کے لئے کھلا رہنا جتنی دیر میں ایک رکن ادا ہو سکتا ہے' نماز کو توڑ دیتا ہے۔
چوتھائی سے کم کا کھلنا نماز کے لئے مکروہ ہے اگرچہ نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اسی لئے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایصلین احدکم فی الثوب الواحد لیس علی عاتقہ شئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھوں پر کوئی کپڑا نہ ہو۔

اس کو شیخین نے حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے روایت کیا ہے کیونکہ کندھے پر کچھ نہ ہو تو شرمگاہ کے کھلے رہ

جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

عریانی میں نماز کا طریقہ

جس کے پاس شرمگاہ کو ڈھانپنے کے لئے کپڑا نہ ہو وہ ننگے ہی نماز پڑھے کیونکہ نماز کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر پڑھے اور رکوع اور سجود کے لئے اشارہ کرے کیونکہ اس طرح کی حد تک اس کی شرمگاہ چھپی رہے گی۔

عن انس ان اصحاب رسول الله ﷺ رکبوا فی السفینة فانکسرت بهم فخرجوا من البحر عراة فصلوا قعودا بالماء.

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کچھ صحابہ کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی ٹوٹ گئی اور وہ پانی سے ننگے باہر آ گئے تو انہوں نے بیٹھ کر ننگے بدن نماز ادا کی۔

فتح القدیر میں ہے کہ سبط ابن الجوزی کے نزدیک کھڑے ہو کر پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ بیٹھ کر نماز پڑھنے میں اگر ایک شرط پوری ہو رہی ہے تو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں ارکان ادا ہو رہے ہیں۔ بہر حال دونوں صورتیں جائز ہیں لیکن بیٹھ کر پڑھنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ارکان کا تو قائم مقام ہے لیکن ستر کے قائم مقام کوئی چیز نہیں۔

ناپاک کپڑے کا استعمال

اگر نمازی کے پاس صرف ایک ہی کپڑا ہو اور وہ بھی ناپاک ہو اور اس کے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہ ہو جس سے کپڑا پاک کیا جا سکتا ہو تو اگر اس کپڑے کا چوتھائی یا زائد حصہ پاک ہے تو ننگے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے بلکہ اسی ناپاک کپڑے میں نماز پڑھے اور اس کا اعادہ نہ کرے کیونکہ چوتھائی حصہ کل کے قائم مقام ہوتا ہے جبکہ عذر کی حالت ہو۔

اگر چوتھائی سے کم پاک ہو تو امام محمد کے نزدیک اور امام شافعی کے ایک قول کے مطابق کپڑے پہن کر نماز پڑھنا بہتر ہے کیونکہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے تطہیر کا امر اس سے ساقط ہو گیا ہے۔

شیخین کے نزدیک اسے اختیار ہے کہ ننگے پڑھے یا ناپاک کپڑے پہن کر پڑھے کیونکہ اس طرح سے تطہیر یا ستر ڈھانپنے کا امر ساقط ہو جاتا ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کی تعیین ممکن نہیں کیونکہ اگر ستر کا تعین ہو جائے تو ناپاک کپڑے میں نماز لازم ہو جاتی ہے اگر ناپاک کپڑے سے احتراز کرنا چاہتا ہو تو ننگے بدن پڑھنا پڑے گی۔ بہر حال ایک چیز کو ترک کرنا ہو گا۔ اس میں کسی قسم کی اولیت نہیں ہے۔ ایک خطاب ساقط ہو گا کیونکہ نماز کو مؤخر نہیں کیا جا سکتا اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تطہیر کا خطاب ساقط ہو جائے گا بلکہ اسے اختیار ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کر لے لیکن افضل کپڑے پہن کر پڑھنا ہے کیونکہ ستر فرض ہے۔

☆☆☆☆☆

استقبالِ قبلہ کا بیان

استقبالِ قبلہ شرط ہے

قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا شرط ہے اگر کسی اور طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا تو نماز نہیں ہو گی۔ اگر عملاً ایسا کرے گا تو کافر ہو جائے گا کیونکہ عملاً جہت قبلہ کو ترک کر کے اس نے دیت کو ہلکا خیال کیا ہے۔ قرآن کریم میں قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے کا واضح حکم ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ کہ اپنے رخ قبلہ کی طرف پھیر لو۔

(البقرۃ:۱۷۷)

اگر کوئی حرم پاک سے باہر ہے تو صرف سمت قبلہ کافی ہے اگر کعبہ شریف میں ہے تو کعبہ شریف پر نگاہ کا ہونا ضروری ہے۔ ہدایہ اور فتح القدیر میں یہی کہا گیا ہے۔ فقہی کتب کے متنوں میں مکی اور غیر مکی کے الفاظ شاید اسی بات کو ظاہر کرتے ہیں جو ہم نے بیان کی ہے۔

قبلہ کی طرف منہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ چہرے کی سطح کا کچھ حصہ کعبہ شریف کے برابر ہو یا اس کی فضا کے عین سامنے ہو کیونکہ دور سے جہت قبلہ کی طرف منہ معمولی سے انحراف سے متاثر نہیں ہوتا کیونکہ بالکل کعبہ کی سیدھ میں دور والوں کیلئے نماز پڑھنا ممکن نہیں۔ اسی لئے علماء فرماتے ہیں کہ مشارق اور مغارب سے تجاوز نہ کرے (مختلف موسموں میں طلوع وغروب کی جگہیں بدلتی رہتی ہیں انہیں کو مشارق اور مغارب کا نام دیا گیا ہے)۔

کعبہ شریف کے اندر نماز ادا کرنا کیسا ہے؟

جس طرح نماز کعبہ شریف کے مکان کے باہر اس کی طرف منہ کر کے پڑھی جاتی ہے اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ کعبہ شریف کے اندر کھڑے ہو کر کسی دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے۔ برابر ہے کہ نماز فرض ہو یا نفل۔

امام شافعی فرض نماز کی صورت میں اختلاف کرتے ہیں جیسا کہ شافعی علماء کی کتب سے واضح ہے۔ امام شافعی فرض اور نفل دونوں نمازوں کا کعبہ شریف کے اندر پڑھنا ناجائز سمجھتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ کعبۃ اللہ شریف کی طرف پیٹھ کرنا ممنوع نہیں ہے۔ ہمیں صرف یہ حکم ہے کہ کعبہ کے کسی ایک حصہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو اور بس۔ اندر نماز پڑھتے ہوئے بھی اسی حکم پر عمل ہو رہا ہے۔

ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ: پوری زمین کو میرے لئے مسجد بنا دیا گیا ہے۔ کعبہ کے اندر کی جگہ بھی زمین کا حصہ ہونے کی وجہ سے مسجد ہے یہ دلیل قطعی ہے اور اس پر اعتراض ممکن نہیں۔ حضور ﷺ نے خود نماز نفل کعبہ شریف کے اندر ادا فرمائی اور ظاہر ہے فرض نماز ہو یا نفل قبلہ رو ہو کر پڑھتے ہیں تو یکساں ہیں اور اس اعتبار سے تو ان میں کوئی فرق نہیں ہاں اگر عذر ہو تو وہ الگ بات ہے۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت سے ثابت

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ شریف کے اندر نماز ادا فرمائی۔

عن ابن عمر قال دخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم البیت ھو واسامۃ بن زید وبلال وعثمان بن طلحۃ فاغلقوا علیھم فلما فتحوا کنت اول من ولج فلقیت بلالا فسألتہ ھل صلی فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نعم بین العمودین

حضرت ابن عمر سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، اسامہ بن زید، بلال اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہوئے اور دروازہ بند کر لیا اور جب کھولا تو سب سے پہلے میں اندر گیا اور میں حضرت بلال سے ملا اور پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ نے اندر نماز ادا فرمائی ہے؟ حضرت بلال نے فرمایا ہاں دو اگلے ستونوں کے درمیان۔

حضرت امام بخاری اور امام مسلم کی ایک اور حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے بیت اللہ شریف کے اندر نماز نہیں پڑھی۔

عن اسامۃ بن زید ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما دخل البیت دعا فی نواحیہ کلھا ولم یصل فیہ.

حضرت سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے تو ہر سمت میں جا کر دعا فرمائی مگر اس میں نماز ادا نہیں فرمائی۔

تو یہ حدیث پہلی حدیث کے معارض نہیں ہے کیونکہ یہ واقعہ حجۃ الوداع کا ہے اور حضرت ابن عمر کی روایت کردہ حدیث جس میں حضرت بلال کے بقول حضور ﷺ نے دونوں اگلے ستونوں کے درمیان نماز پڑھی ہے۔ فتح مکہ کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

اگر امام مسجد حرام میں نماز پڑھے اور لوگ کعبۃ اللہ کے اردگرد کھڑے ہو کر اس کی اقتداء کریں تو ان کی نماز صحیح ہے اگر وہ بنسبت امام کے کعبۃ اللہ کے زیادہ قریب ہوں تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن امام جس طرف کھڑا ہے اس جانب سے بنسبت امام کے کعبہ شریف سے کوئی بھی زیادہ قریب نہ ہو کیونکہ اس طرح امام سے آگے کھڑا ہونا لازم آئے گا اور امام سے آگے کھڑا ہونا جائز نہیں لیکن تقدم صرف اسی صورت میں معتبر ہے جب امام اور مقتدی کی جہت ایک ہو۔ اگر جہتیں مختلف ہیں تو پھر تقدم ثابت نہیں ہوتا۔

کعبہ شریف کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے

کعبہ شریف کی چھت پر نماز پڑھنا جائز ہے کیونکہ اس صورت میں تمام شرائط پائی جا رہی ہیں کیونکہ کعبہ شریف اس جگہ کا نام ہے جو آسمانوں کی بلندیوں تک اسی طرح محاذ میں موجود ہے جس طرح تحت الثریٰ موجود ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے جبل ابی قیس پر نماز ادا کی اور قبلہ رو ہو کر نماز ادا کی تو نماز ہو جائے گی کیونکہ وہ اگرچہ بیت اللہ شریف کی عمارت کی طرف متوجہ نہیں لیکن اس فضا کی طرف تو منہ کئے ہوئے ہے جسے کعبہ کہتے ہیں لیکن یہ بات بھی یاد رہے کہ کعبہ شریف کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ یہ تعظیم کعبہ کے منافی ہے۔

اشتباہ کی صورت میں تحری ضروری ہے

اگر کسی شخص پر سمت قبلہ مشتبہ ہو جائے۔ صحراء یا جنگل میں اسے یہ اندازہ نہیں ہو رہا کہ سمت قبلہ کیا ہے' اس کی وجہ تاریک رات بھی ہوسکتی ہے یا دن کے وقت بھی اس قسم کا شک پڑ سکتا ہے تو وہ کسی آدمی سے پوچھے' اگر کوئی آدمی بھی نہیں تو کوشش کرے کہ سمت قبلہ معلوم ہو جائے اور بغیر کوشش کے نماز شروع نہ کرے' اگر کوشش کر کے اس نے جہت قبلہ کا اندازہ لگایا تو یہی اس کے لئے سمت قبلہ ہے جیسا کہ حدیث پاک سے ثابت ہے۔

عن عامر بن ربيعة قال كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في سفر في ليلة مظلمة فلم ند راين القبلة وصلى كل رجل منا على جهالة فلما اصبحنا ذكرنا ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم فنزلت فاينما تولوا فثم وجه الله. (رواہ جامع ترمذی)

عامر بن ربیعہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے' رات تاریک تھی اور ہم نہیں جانتے تھے کہ سمت قبلہ کیا ہے تو ہم میں سے ہر شخص نے کچھ معلوم کئے بغیر نماز پڑھ لی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے اس بات کا ذکر حضور ﷺ سے کیا تو یہ آیت نازل ہوئی: تم جس طرف رخ کرو گے اللہ تعالیٰ کو اسی سمت پاؤں گے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ترمذی اور دوسرے محدثین نے ضعیف گردانا ہے مگر معتبر مفسرین نے اس پر اعتبار فرمایا ہے۔

تحری میں غلطی کا حکم

اگر کوشش کر کے اندازہ لگایا لیکن یہ اندازہ غلط نکلا تو جو نماز پڑھ چکا ہے اس کا اعادہ نہ کرے کیونکہ اس کا قبلہ جہت تحری تھا۔

تاریک رات میں کسی نے لوگوں کی امامت کرائی۔ امام نے بھی تحری کی اور مقتدیوں نے بھی تحری کی تو ہر شخص کی اپنی تحری معتبر ہوگی اور ایسی صورت میں امام کی جہت سے ہٹ کر کسی اور جہت کو منہ کرنا صحیح ہوگا اور نماز صحیح ہوگی کیونکہ مقتدیوں کا قبلہ ان کی اپنی جہت تحری ہے۔ گویا تمام لوگوں نے قبلہ رو ہو کر نماز ادا کی جس طرح کہ کعبہ شریف کے اندر نماز پڑھیں گے تو اپنی اپنی جہت پر منہ ہوگا اور اقتداء صحیح ہوگی۔

اگر کسی کو تاریکی کے باوجود امام کی جہت کا علم ہو جائے تو اگر اس کا اندازہ امام کے اندازے سے مختلف ہے تو وہ اقتداء نہ کرے اور اکیلے نماز پڑھ لے۔

ایسی صورت میں اگر کوئی اقتداء کرے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی اسی طرح جو امام سے آگے بڑھ جائے گا اس کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی کیونکہ جس جگہ اس کا کھڑا ہونا فرض تھا وہ وہاں کھڑا نہیں ہوا۔

جب نمازی قبلہ رو ہونے سے معذور ہو تو؟

اگر کسی کو دشمن یا درندوں کا خوف ہے یا کشتی میں سوار ہے اور خائف ہے کہ قبلہ رو ہوگا تو کشتی ڈوب جائے گی یا مریض ہے اور قبلہ رو ہو نہیں سکتا کوئی دوسرا شخص بھی نہیں جو اسے قبلہ رو کر دے تو مجبوری کی وجہ سے وہ جس سمت

منہ ہے نماز پڑھ لیں کیونکہ ان عذروں کی وجہ سے وہ قبلہ رو نہیں ہو سکتے تو ان کا حال بھی ان لوگوں جیسا ہے جن پر سمت قبلہ مشتبہ ہو جاتی ہے۔

نیت کا بیان

نیت کرنا شرط ہے

نماز عبادت مخصوصہ ہے اس لئے اس میں نیت شرط ہے' جب نیت نہیں تو پھر نماز' عبادت ہی نہیں جس طرح کہ حدیث مشہور سے ثابت ہے۔ جب یہ عبادت نہیں رہی تو نفس صلاۃ ہی معتبر نہ ہوئی۔ نیت کو تکبیر تحریمہ کے ساتھ ملانا ضروری ہے کیونکہ اگر نیت مؤخر ہوگئی تو اس سے پہلے جو نماز ادا ہوگی وہ نماز شمار نہیں ہوگی۔

اگر تکبیر تحریمہ سے پہلے نیت کی جائے تو وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ نماز کے وقت نیت ہی نہیں مثلاً کوئی شخص وضو کرتے ہوئے نیت کرتا ہے کہ میں ظہر کی نماز ادا کروں گا' امام کی اقتداء میں ادا کروں گا اور نیت کے بعد کسی ایسے کام میں مشغول نہیں جو جنس نماز سے نہیں ہے تو اس کی نیت درست ہوگی اگرچہ نماز میں داخل ہوتے وقت نیت نہیں کی۔ جنس نماز میں نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام کسی ذاتی غرض سے ہے۔

نیت دل سے کرے کہ کون سی نماز ادا کر رہا ہے اور اس طرح اس کی توجہ نیت کی طرف مبذول ہو کہ اس سے اگر پوچھا جائے تو فوراً بتا سکے کہ میں کون سی نماز ادا کر رہا ہوں اگر سوچ کر بتائے گا تو نیت معتبر نہ ہوگی۔

زبان کے ساتھ نیت کرنا بہتر ہے

موجودہ دور میں زبان سے نیت بہتر ہے کیونکہ زبان کے ساتھ دل بھی شامل ہوتا ہے۔ نیت ہر رکن کی ادائیگی کے وقت ضروری نہیں۔ نماز کی ابتداء میں ایک ہی بار کی گئی نیت کافی ہے لیکن افضل یہ ہے کہ دل سے (نہ کہ زبان سے) ہر رکن کے وقت نیت کرے کہ یہ نماز اللہ تعالیٰ کے لئے پڑھ رہا ہوں اور یہ نماز میں حضور قلب کا ادنیٰ درجہ ہے۔

پھر فرض اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک اس کے لئے مخصوص نیت نہ کی جائے جو خاص فرض سے متعلق ہو وہ اس طرح نیت کرے کہ میں اس وقت کے فرضوں کو ادا کرنے کی نیت کرتا ہوں کیونکہ اس وقت میں ادا کے علاوہ قضاء فرض بھی پڑھے جا سکتے ہیں اس لئے تعیین ضروری ہے لیکن روزے میں تعیین ضروری نہیں کیونکہ رمضان شریف میں صرف فرض روزے اور اسی رمضان کے ہی رکھے جا سکتے ہیں۔

اگر کسی کی نماز ظہر قضا ہوگئی' عصر کا وقت ہوا تو اس نے نیت کی کہ میں ظہر اور عصر کے فرضوں کی نیت کرتا ہوں تو نہ ظہر کی ادا ہوگی اور نہ عصر کی۔ ایک ضعیف قول یہ ہے کہ اگر وقت کافی ہے تو یہ نماز ظہر جو اس کے ذمہ لازم تھی' ہو گی۔

اگر امام کو قعدہ میں پایا اور نیت کی کہ اگر وہ پہلے قعدہ میں ہے تو میں نماز میں داخل ہوا ورنہ نہیں تو نماز صحیح نہیں

کیونکہ ادا کی تعیین بھی ضروری ہے کیونکہ اس نماز کو وقت گزر جانے کے بعد قضاء کی صورت میں پڑھا جا سکتا ہے۔

ہر قضاء نماز کی نیت کرنا ضروری ہے

اگر کسی کے ذمہ ایک سے زائد نمازیں ہیں تو تعیین ضروری ہے کہ فلاں دن کی ظہر کی نماز ادا کر رہا ہوں یا یوں کہے کہ میرے ذمہ جو ظہر کی پہلی نماز ہے اسے ادا کر رہا ہوں۔ اگر نماز پڑھنے والا مقتدی ہے تو امام کی اقتداء کی نیت ضروری ہے کیونکہ امام کی نماز کے فساد کے ساتھ اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے اس لئے اس کا التزام ضروری ہے۔

اگر یہ نیت کی کہ میں امام کی نماز کی نیت کرتا ہوں تو یہ نیت کافی ہو گی۔ نفل نماز میں صرف نماز کی نیت کافی ہو گی کیونکہ ادنیٰ درجہ کی نماز نفل ہے۔ محض نماز کی نیت کریں گے تو وہ نفل نماز ہی ہو گی۔

روزمرہ کی سنتوں میں بھی مطلق نیت یا نفل نماز کی نیت کافی ہے کیونکہ سنت بھی تو نفل نماز ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے ایک خاص طریقہ سے ادا فرمایا ہے۔ اگر صرف نماز کی نیت کی یا نفل کی نیت کی اور اس نماز کو ایک خاص طریقے پر پڑھا تو یہ نماز سنت کی ادائیگی ہو گی۔

وتروں کی نیت کیسے کرے؟

علماء نے فرمایا ہے کہ وتر میں نیت کرتے وقت اس رات کے وتر کی تعیین ضروری ہے لیکن یہ نیت کرے کہ یہ نماز واجب ہے کیونکہ اس بارے ائمہ کا اختلاف ہے اگر واجب کہہ کر بھی نیت کرے گا تو یہ نیت معتبر ہو گی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک تو اس کی وجہ ظاہر ہے۔ دوسروں کے نزدیک اس لئے نیت معتبر ہو گی کہ واجب والے الفاظ لغو ہو جائیں گے اور باقی نیت معتبر ٹھہرے گی۔

اوقاتِ نماز کا بیان

وقت نماز کے لئے شرط نہیں کہ بغیر وقت کے یہ صحیح نہ ہو۔ ہاں نماز کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے (وضو قضاء اور ادا دونوں کے لئے شرط ہے لیکن وقت قضاء کے لئے شرط نہیں۔ قضاء نماز یا نفل نماز کسی وقت بھی پڑھی جا سکتی ہے تو گویا نفس نماز کے لئے وقت شرط نہیں)۔

وقت کے فوت ہو جانے سے ادا فوت ہو جاتی ہے اور نماز کو جان بوجھ کر وقت سے مؤخر کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

رب قدوس کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○ (النساء:۱۰۳) — نماز اہل ایمان پر وقت مقررہ پر فرض ہے۔

اور وقت سے پہلے نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح وہ ادا ہی نہیں ہوئی اور اس کے ذمہ باقی ہے۔

نماز ظہر کا وقت

ظہر کا وقت زوال سے شروع ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت میں ظہر ادا فرمائی جیسا کہ حدیث

جبریل سے ثابت ہے اور ظہر کا آخری وقت مثل اول تک ہے یعنی جب ہر چیز کا سایہ اس کی مثل ہو جائے۔ امام محمد اور امام ابو یوسف اور امام ابو حنیفہ کی ایک روایت سے یہی ثابت ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ ائمہ ثلاثہ کا بھی یہی مؤقف ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز ادا فرمائی جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو گیا جیسا کہ حدیث جبریل میں مذکور ہے۔ اس حدیث کی تائید دوسری احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

عن انس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی العصر والشمس مرتفعة حیة فیذھب الذاھب الی العوالی والشمس مرتفعة وبعض العوالی من المدینة علی اربعة امیال.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز پڑھتے تو سورج بلندی پر پوری آب سے چمک رہا ہوتا تھا اور کوئی جانے والا عوالی کی طرف جاتا تب بھی سورج بلند ہوتا اور مدینہ منورہ سے بعض عوالی تقریباً چار میل تھے۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے اور انہیں سے یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ ہم میں سے جانے والا قبا جاتا۔ ان سے ہی روایت ہے کہ:

صلی لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العصر فلما انصرف اتاہ رجل من بنی سلمة فقال یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا نحر جزور النا وانا نحب ان تحضرھا قال نعم فانطلق وانطلقنا معه فوجدنا الجزور لم ینحر فنحرت ثم قطعت ثم طبخ منھا ثم اکلنا قبل ان یغیب الشمس. (رواہ صحیح مسلم)

حضور ﷺ نے ہمیں نماز عصر پڑھائی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو بنی سلمہ سے ایک آدمی آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ﷺ ہم اپنے جانور ذبح کرنا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ وہاں تشریف فرما ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ حضور ﷺ چل پڑے اور ہم بھی آپ کے ساتھ ہو لیے۔ تو جب ہم پہنچے تو جانور ذبح نہیں ہوئے تھے۔ میں نے جانور ذبح کئے پھر ان کا گوشت کاٹا اور پھر اس میں سے کچھ پکایا اور اسے سورج غروب ہونے سے پہلے کھایا۔

اتنا کام صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ عصر کے بعد بہت سا وقت ہو۔ صاحب ہدایہ نے اس کی دلیل میں بخاری و مسلم کی یہ حدیث پیش کی ہے۔

عن ابی ھریرة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اشتد الحرا بردوا بالصلوة.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب گرمی زیادہ ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے پڑھا کرو۔

بخاری کی حدیث میں ظہر کی نماز ٹھنڈی کیا کرو کے الفاظ ہیں کیونکہ گرمی کی شدت دوزخ کے جوش کی وجہ سے ہوتی ہے اور ان علاقوں میں زیادہ گرمی اس وقت ہوتی ہے جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو۔ پس یہ حدیث دوسری حدیث کے معارض آ گئی جس کو حدیث جبریل کہتے ہیں سو یہ حدیث اس کی ناسخ ہو گی کیونکہ دونوں حدیثیں اوقات سے متعلقہ ہیں چونکہ یہ حدیث جبریل کے بعد کی ہے اس لئے یہ ناسخ ہو گی' تعارض کی بنیاد اس وقت میں گرمی کی

شدت پر ہے مگر ایک اور حدیث سے یہ گفتگو مخدوش ہو جاتی ہے۔

عن ابن مسعود قال کان قدر صلوة رسول الله صلی الله علیه وسلم الظهر فی الصیف ثلثة اقدام الی خمسة وفی الشتاء خمسة اقدام الی سبعة اقدام.

(رواہ سنن نسائی، سنن ابو داؤد)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ظہر کی نماز گرمیوں میں تین قدموں سے پانچ قدموں تک ہوتی (یعنی سایہ جب تین سے پانچ قدم ہو جاتا) اور سردیوں میں پانچ سے سات قدموں تک ہوتی۔

پانچ قدم مثل اول سے کم ہے۔ پس ثابت ہوا جب آدمی کا سایہ پانچ قدم ہو جائے تو عصر کا وقت ہو جاتا ہے۔ پس یہ حدیث جبریل کے معارض نہیں ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ ہدایہ کے استدلال سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ ظہر کا وقت ایک مثل سایہ تک کے اور دو چند سے پہلے تک باقی رہتا ہے۔

نمازِ عصر کا وقت

عصر کا وقت مذکورہ دونوں نظریوں کے خلاف کی بناء پر اس وقت شروع ہوگا جب ظہر کا وقت ختم ہوگا اور غروب آفتاب تک باقی رہے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے۔

لما روی ابو هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من ادرک رکعة من العصر فقد ادرک العصر.

اس کو ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے عصر کی ایک رکعت پائی تو اس نے عصر کی پوری نماز کو پالیا۔

نمازِ مغرب کا وقت

مغرب کا اوّل وقت غروب آفتاب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے غروب آفتاب کے وقت نماز مغرب ادا فرمائی جیسا کہ حدیث جبریل سے ثابت ہے اور اس کا آخری وقت شفق غائب ہونے تک ہے۔ امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ مغرب کا وقت بہت ہی کم ہوتا ہے کہ اس میں صرف وضو، اذان اور تین فرض ادا ہو سکتے ہیں کیونکہ جبریل نے دونوں دنوں میں اسے ایک ہی وقت میں ادا فرمایا۔ ہماری دلیل مسلم کی روایت ہے۔ حضرت ابو موسیٰ ایک طویل حدیث روایت کرتے ہیں جس میں ایک سائل کو اوقاتِ نماز سکھائے گئے ہیں۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ پھر مغرب کو مؤخر کرے حتیٰ کہ وہ سقوطِ شفق کے وقت ہو۔

آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ جو حدیث بھی حدیث جبریل کے معارض ہے وہ اس کی ناسخ ہے۔ ہدایہ میں جبریل کے ایک ہی وقت میں آنے کو افضلیت پر محمول کیا گیا ہے (یعنی مغرب کا افضل وقت یہی ہے) اس لئے یہ حدیث دوسری احادیث سے معارض نہیں ہے۔

شفق سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب آفتاب کے بعد مغرب میں دکھائی دیتی ہے۔ صاحبین کے نزدیک یہی

صحیح ہے۔ امام ابوحنیفہ سے اسد بن عمرو نے بھی ایک روایت ایسے ہی بیان کی ہے اور اسی پر علماء کا فتویٰ ہے۔ اس سلسلے میں علماء دار قطنی کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الشفق الحمرة فاذا غاب وجبت الصلوۃ.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شفق سرخی ہے۔ جب یہ چھپ جائے تو نماز واجب ہو جاتی ہے۔

فتح القدیر میں امام بیہقی اور امام نووی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور ابن عمر پر موقوف ہے لیکن اس باب میں موقوف حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کی ظاہر روایت یہ ہے کہ شفق وہ سفیدی ہے جو سرخی کے بعد نظر آتی ہے۔ ان کی دلیل میں فتح القدیر نے وہ حدیث پیش کی ہے جسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اسے عنقریب ہم بیان کریں گے۔

لہٰذا مغرب کا وقت غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور خفاء افق تک باقی رہتا ہے اور افق اس وقت نظروں سے اوجھل ہوتا ہے جب سفیدی ختم ہو جاتی ہے لیکن اس میں مزید غور وفکر کی ضرورت ہے کیونکہ سفیدی کبھی کبھی افق پر باقی رہتی ہے اور افق سیاہ ہو جاتا ہے۔

نماز عشاء کا وقت

عشاء کا وقت غروب شفق سے شروع ہوتا ہے اور صبح صادق کے طلوع تک باقی رہتا ہے۔ امام شافعی آدھی رات تک کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل ترمذی کی یہ حدیث ہے ''اور اس کا آخری وقت نصف رات ہے''۔

ہماری دلیل یہ حدیث ہے۔

عن عائشة ام المؤمنین قالت اعتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلة حین ذهب عامة اللیل حتی نام اهل المسجد ثم خرج فصلی فقال انهما لوقتها لو لان اشق به علی امتی.

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور ﷺ نے رات گئے تک نماز میں تاخیر کی حتیٰ کہ مسجد میں موجود لوگ سو گئے پھر آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: عشاء کا وقت یہی ہوتا اگر میں اپنی امت کے لئے اسے مشکل نہ سمجھتا تو۔

اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث امام ترمذی کی روایت کردہ حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ عنقریب اس پر گفتگو ہوگی۔ رات گئے سے مراد رات کا آخری پہر صبح صادق کے قریب کا وقت ہے۔

نمازِ فجر کا وقت

فجر کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور صبح صادق سے مراد افق پر چھا جانے والی روشنی ہے جو رات کے ختم ہونے پر پھوٹتی ہے اور جس کے پھوٹتے ہی روزہ رکھنے والا کھانا پینا ترک کر دیتا ہے جیسا احادیث سے ثابت ہے۔ حدیث جبریل میں طلوع صبح کا وقت ایسے ہی بیان ہوا ہے اور صبح کا آخری وقت طلوع آفتاب ہے۔ اس بارے ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ فجر کا وقت طلوع آفتاب تک ہے۔

احادیثِ مبارکہ کی رو سے نماز کے اوقات

اب ہم ان احادیث کو بیان کرتے ہیں جن میں پانچوں نمازوں کے اوقات کو بیان فرمایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے ان سے اقتباسات لے کر ان کو بیان فرمایا ہے۔

ان میں سے ایک حدیث یہ ہے:

عن عبد الله بن عمرو ان نبی الله صلی الله علیه وسلم قال اذا صلوتم الفجر فانه وقت الی ان تطلع قرن الشمس الاول ثم اذا صلیتم الظهر فانه وقت الی ان تحضر العصر فاذاصلیتم العصر فانه وقت الی ان تصفر الشمس اذا صلیتم المغرب فانه وقت الی ان تسقط الشفق فاذا صلیتم العشاء فهو وقت الی نصف اللیل.

عبداللہ بن عمرو سے روایت کی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم فجر کی نماز پڑھو تو اس کا وقت سورج کی پہلی ٹکیا کے طلوع ہونے تک ہے پھر جب تم ظہر ادا کرو تو اس کا وقت عصر کی نماز کے شروع ہونے تک ہے پھر جب عصر پڑھو تو اس کا وقت سورج کے زرد ہونے تک ہے پھر جب تم مغرب پڑھو تو اس کا وقت شفق کے ختم ہونے تک ہے اور جب تم عشاء پڑھو تو اس کا وقت آدھی رات تک ہے۔

اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے اور اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظہر اور عصر کے درمیان کوئی مہمل وقت نہیں جس میں نہ ظہر کی نماز ادا ہو سکتی ہو اور نہ ہی عصر کی۔ وہ روایت جس میں ظہر اور عصر کے درمیان کے وقت کو مہمل قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ظہر کا وقت مثل اول تک ہے اور عصر کا وقت مثل ثانی سے شروع ہوتا ہے وہ روایت قابل اعتبار نہیں۔

حدیث پاک میں سورج کے زردی مائل ہونے کو وقت عصر کے لئے غایت مقرر کیا گیا ہے یعنی یہ غایت اسقاط ہے اور مغیا میں شامل ہے لہٰذا زردی کا وقت عصر کے وقت میں شامل ہے اور عصر کا وقت سورج غروب ہونے پر ختم ہوگا۔ سقوط شفق میں بھی یہی گفتگو پیش نظر رہے (یعنی جب تک شفق کی سرخی موجود ہے مغرب کا وقت ہے سرخی ختم ہوگئی تو مغرب کا وقت ختم ہو جائے گا)۔

نصف اللیل بھی اس قاعدہ کی رو سے وقت عشاء میں داخل ہے اور نصف سے مراد صبح تک رات کا آخری حصہ ہے۔ گویا عشاء کا وقت مغرب سے صبح تک ہے اور حضرت امام شافعی کے پاس اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں کہ نصف رات کے بعد عشاء کی نماز نہیں پڑھی جا سکتی' ہاں اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امام شافعی نے رات کے آخری حصے کو غایت بنایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے' بہتر یہ ہے کہ مغرب اور عشاء کی نماز کو آدھی رات اور غروب شفق تک مؤخر نہ کیا جائے۔

ایک اور حدیث مبارک کا مطالعہ کیجئے جس میں پانچوں نمازوں کے اوقات کا ذکر ہے۔

حدیث ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الصلوة اولا واخرا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کا ایک اول وقت ہوتا

وان اول وقت صلوة الظهر حين يزول الشمس واخر وقتها حين يدخل وقت العصر وان اول وقت العصر حين يدخل وقتها وان اخر وقتها حين بصفر الشمس وان اول وقت المغرب حين تغرب الشمس وان اخر وقتها حين تغيب الافق وان اول وقت العشاء حين تغيب الافق واخر وقتها حين انتصيف الليل وان اول وقت الفجر حين تطلع الفجر وان اخر وقتها حين تطلع الشمس. (رواہ الترمذی)

ہے اور ایک آخری وقت۔ نماز ظہر کا اول وقت زوالِ آفتاب ہے اور اس کا آخری وقت وہ ہے جب عصر کا وقت شروع ہو جائے اور عصر کا اول وقت وہ ہے جب اس کا وقت شروع ہو جائے اور اس کا آخری وقت وہ ہے جب سورج زردی مائل ہو جائے۔ مغرب کا اول وقت غروب آفتاب ہے اور آخری وقت افق کا غائب ہونا ہے۔ عشاء کا اول وقت افق کا غائب ہونا ہے اور آخری وقت آدھی رات ہے۔ فجر کی ابتداء طلوع صبح سے ہوتی ہے اور اس کا آخری وقت سورج کا طلوع ہونا ہے۔

اس حدیث میں کلام ہے۔ پوری بحث اور اس کا جواب فتح القدیر میں بالتفصیل منقول ہے۔

حدیث پاک کے یہ الفاظ کہ عشاء کا آخری وقت آدھی رات تک ہے۔ ہماری سابقہ گفتگو سے معارض نہیں ہے جو ہم نے مسلم کی روایت کے بارے کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رات گئے نماز ادا فرمائی۔ مسلم کی یہ حدیث صحیح ہے اور اس پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوا اس لئے ہم مسلم کی روایت پر عمل کرتے ہیں۔

پھر یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ عشاء کا آخری وقت آدھی رات ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ انتہائی وقت آدھی رات ہے کیونکہ آدھی رات ایک کھلا وقت ہے وہ نماز کے وقت کے لئے ایک خاص نقطہ نہیں بن سکتی بلکہ یہ تو ایک لمبا وقت ہے جو کئی لمحوں پر محیط ہے اس لئے اس سے مراد صبح تک کا وقت ہوگا۔ نصف شب کے بعد نماز عشاء کی قضاء کی کوئی وجہ نہیں جیسا کہ امام شافعی کا نظریہ ہے۔ بہرحال نصف شب کے بعد عشاء کی نماز پڑھنا مکروہ ہے لیکن ہے عشاء کا ہی وقت۔ نماز ادا ہوگی قضاء شمار نہیں ہوگی۔

مذکورہ بالا حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ظہر کا آخری وقت اور عصر کا ابتدائی وقت ایک ہی وقت بن رہا ہے۔ اسی طرح مغرب کا آخری وقت اور عشاء کا اول وقت ایک ہی ہے۔ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کے درمیان تقریباً چار رکعتوں کی ادائیگی کے برابر مشترک وقت ہے۔ شیخ اکبر خاتم الولایۃ المحمدیۃ رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے۔

حدیثِ جبرئیل اور اس کی وضاحت

اب ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کردہ حدیث جبریل ذکر کرتے ہیں۔

عن ابن عباس ان النبي صلى الله عليه وسلم قال امني جبرئيل عند البيت مرتين فصلى الظهر في الاولى منهما حين كان الفئى مثل الشراك ثم صلى العصر حين

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جبریل امین نے کعبۃ اللہ شریف کے نزدیک دو مرتبہ میری امامت کرائی۔ آپ نے ظہر کے دو وقتوں (اول و آخر) میں پہلے وقت میں

كان كل شئ مثل ظله ثم صلى المغرب حين وجبت الشمس وافطر الصائم ثم صلى العشاء حين غاب الشفق ثم صلى الفجر حين بزق الفجر وحرم الطعام على الصائم وصلى المرة الثانية الظهر حين كان ظل كل شئ مثله كوقت العصر بالامس ثم صلى العصر حين كان ظل كل شئ...... مثليه ثم صلى المغرب لوقته الاول ثم صلى العشاء الاخير حين ذهب ثلث الليل ثم صلى الصبح حين اسفر ثم التفت جبرئيل فقال يا محمد هذا وقت الانبياء من قبلك والوقت فيما بين الوقتين.

نماز ظہر اس وقت ادا فرمائی جب سورج ڈوب گیا اور روزہ دار نے روزہ افطار کیا پھر عشاء کی نماز پڑھی جب شفق غائب ہو گئی پھر آپ نے فجر کی نماز ادا فرمائی جب پو پھٹی اور روزہ دار پر کھانا حرام ہو گیا۔ دوسرے دن آپ نے ظہر اس وقت ادا کی جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو گیا جیسا کہ ایک دن پہلے عصر کی نماز پڑھی تھی پھر عصر کی نماز ادا کی جس وقت ہر چیز کا سایہ دو چند ہو گیا تھا پھر مغرب پہلے وقت میں ہی ادا کی' عشاء کو اس کے آخری وقت میں ادا کیا جب رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا پھر صبح کی نماز ادا کی جب روشنی چھا گئی اس کے بعد پیچھے مڑے اور کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آپ سے پہلے انبیاء کا وقت تھا۔ ان دو وقتوں کے درمیان آپ کا وقت ہے۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوتا ہے کہ عصر کا پہلا وقت ظہر اور عصر کے درمیان مشترک ہے جیسا کہ شیخ اکبر قدس سرہ کا مذہب ہے۔ حدیث پاک کا مشہور مفہوم یہ ہے کہ ہر نماز کا وقت دونوں ایام میں ادا کی جانے والی نمازوں کا درمیانی وقت ہے لیکن مغرب میں ایسا نہیں' مغرب کی نماز پہلے اور دوسرے دن میں ایک ہی وقت ادا کی گئی لہٰذا پہلے اور دوسرے دن کی نماز مغرب کے درمیان کوئی وقت نہیں ہے۔ انبیاء اور عامۃ الناس کا وقت ایک ہی ہے حالانکہ حدیث افتراق کی طرف اشارہ کرتی ہے پھر اس توجیہہ کی بنیاد پر یا تو حدیث مستحب اور افضل وقت کے لئے بیان ہو گی تو ایسے میں گویا جبریل نے اوقات نماز تعلیم نہیں کئے بلکہ مستحب وقت سے آپ کو آگاہ کیا حالانکہ حضرت جابر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اوقات نماز سے آگاہ فرمایا (باذن اللہ) اور ظاہر ہے یہ تعلیم فرض اوقات کی تھی یا پھر یہ حدیث فرض وقت کی تعلیم کا بیان ہو گی۔ ایسی صورت میں مذکورہ احادیث اس کی ناسخ ہوں گی کیونکہ یہ حدیث ان سے پہلے کی ہے اور ان سے معارض ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "یہ انبیاء کا وقت ہے"۔ کے الفاظ اس وقت کی طرف اشارہ کرتے ہوں جن دو دنوں میں جبریل نے نماز پڑھائی ہے وہ نمازوں کا افضل وقت ہے۔

جبریل امین کا یہ کہنا کہ (آپ کی امت کے لئے) دونوں وقتوں کے درمیان کا وقت ہے' سے مراد پہلے دن کو ادا کی جانے والی دونوں نمازیں ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت ہے۔ ظہر کی نماز کا وقت پہلے دن کی ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت ہے۔ عصر کا وقت' نماز مغرب اور نماز عصر کے درمیان کا وقت ہے جو جبریل امین نے پہلے دن ادا کیں اور مغرب کا وقت اس مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت ہے جو پہلے دن جبریل نے ادا کیں۔ اسی طرح عشاء کی نماز کا وقت پہلے دن ادا کی جانے والی عشاء اور فجر کے درمیان ہے۔ اب رہ گئی صرف فجر کی نماز تو اس کا

آخری وقت طلوع آفتاب ہے کیونکہ اس کے بعد نماز حرام ہے۔ اس توجیہہ کے مطابق یہ حدیث فرض اور مستحب دونوں وقتوں کو بیان کرتی ہے۔

اسی طرح کی ایک اور حدیث ملاحظہ کریں۔

عن ابی موسی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اتاه سائل یسأله عن مواقیت الصلوة فلم یرد علیه شیئا وقال امر بلالا فما قام الفجرحین انشق الفجر والناس لا یکاد یعرف بعضهم بعضا ثم امر فاقام الظهرحین زالت الشمس والقائل بقول قد انتصف النهارا هو کان اعلم منهم ثم امرهم فاقام العصر والشمس مرتفعة ثم امره فاقام بالمغرب حین وقعت الشمس ثم امره فاقام العشاء حین غاب الشفق ثم اخر الفجر من الغد حتی انصرف منها والقائل یقول طلعت الشمس او کادت ثم اخر الظهرجین کان قریبا من وقت العصر بالامس ثم اخر العصر حتی انصرف منها والقائل یقول قد احمر الشمس ثم اخر المغرب حتی کان عند سقوط الشفق وفی روایة فصلی المغرب قبل ان لغیب الشفق ثم اخر العشاء حتی کان ثلث اللیل الاول ثم اصبح فدعا السائل فقال الوقت بین هذین (رواہ صحیح مسلم)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اوقاتِ نماز کے بارے سوال کیا۔ آپ نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ راوی کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بلال کو حکم دیا۔ انہوں نے فجر کی اقامت کہی جبکہ فجر کی روشنی پھوٹی اور لوگ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال کو حکم دیا تو انہوں نے ظہر کے لئے اس وقت اقامت کہی جب سورج ڈھل گیا اور کہنے والا کہتا تھا کہ آدھا دن ہو گیا اور وہ ان کی نسبت زیادہ جاننے والا تھا پھر آپ نے ان کو حکم دیا تو انہوں نے عصر کی نماز کے لئے اقامت کہی جبکہ سورج بلند تھا پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا تو انہوں نے مغرب کے لئے اقامت کہی جبکہ سورج غروب ہو گیا پھر حضور اکرم ﷺ نے حضرت بلال کو حکم دیا تو انہوں نے عشاء کی نماز کے لئے اقامت کہی جبکہ شفق غائب ہو چکی تھی پھر حضور ﷺ نے دوسرے دن فجر کی نماز میں اتنی تاخیر فرمائی کہ پیچھے مڑے تو کہنے والا کہتا تھا کہ سورج طلوع ہو گیا یا سورج طلوع ہوا چاہتا ہے پھر حضور ﷺ نے ظہر کی نماز میں تاخیر فرمائی حتیٰ کہ گزشتہ دن کی عصر کی نماز کے وقت کے قریب ادا فرمائی پھر عصر کو اتنا مؤخر فرمایا کہ کہنے والا کہتا تھا کہ سورج زرد ہو گیا پھر آپ نے مغرب کی نماز کو سقوطِ شفق تک مؤخر فرمایا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے شفق غائب ہونے سے پہلے نماز مغرب ادا فرمائی پھر عشاء میں پہلی رات کی تہائی تک دیر فرمائی جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے سائل کو بلایا اور فرمایا: نمازوں کا (صحیح) وقت ان دونوں وقتوں کے درمیان ہے۔

اس حدیث میں نمازوں کے مستحب اوقات بیان ہوئے ہیں' فرض اوقات بیان نہیں ہوئے کیونکہ ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ عشاء کا وقت پہلی رات کی آخری تہائی کے بعد ختم نہیں ہوتا۔اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سورج کے سرخ ہونے سے پہلے عصر میں تاخیر کرنا مکروہ نہیں ہے۔اسی طرح تہائی تک عشاء میں تاخیر کرنا بھی مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فجر کی نماز طلوع صبح سے لے کر طلوع آفتاب تک ہے۔واللہ اعلم باحکامہ۔

جن علاقوں میں سورج غروب ہوتے ہی طلوع ہوجاتا ہے وہاں نمازوں کا حکم

بعض علماء فقہ فرماتے ہیں کہ جس خطے کے رہنے والے لوگ عشاء کا وقت نہیں پاتے (ادھر سورج غروب ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد صبح کا اجالا پھوٹ پڑتا ہے) تو ان پر عشاء کی نماز فرض نہیں ہے۔صاحبِ کنز کا یہی فتویٰ ہے کیونکہ جب سبب نہیں تو اس کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی لیکن صاحب فتح القدیر عشاء کی نماز کو فرض گردانتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ تواتر سے ثابت ہے کہ معراج کی رات حضور ﷺ پر پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔اب ان میں سے ہر ایک نماز کا ادا کرنا ضروری ہے۔پانچ نمازوں سے کم کسی صورت نہیں ہوسکتیں بہر حال جب سبب نہ پائے جانے کی وجہ سے عشاء کی نماز فرض نہ ہوئی تو اسے قضاء کی نیت سے بھی نہیں پڑھ سکتے اور چونکہ مغرب اور فجر کا وقت اس کی فرضیت کے لئے سبب نہیں اس لئے اس کی ادائیگی ممکن نہیں سو عشاء کی نماز ایسے علاقہ کے لوگوں پر فرض نہیں ہے۔

نمازِ فجر کا مستحب وقت

ہمارے نزدیک فجر کو روشن کر کے پڑھنا مستحب ہے۔فتح القدیر میں ہے کہ افضل یہ ہے کہ صبح کی نماز جب شروع کرے تو روشنی ہو اور جب ختم کرے تو بھی روشنی ہو۔ہمارے ائمہ ثلاثہ سے علماء نے ایسے ہی روایت کیا ہے۔ امام طحاوی کی رائے اس سے مختلف ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ابتداء اندھیرے میں ہونی چاہئے اور اختتام روشنی میں۔ امام طحاوی اسے ائمہ ثلاثہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ان کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے۔

لما روی رافع بن خدیج قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر.	رافع بن خدیج کی روایت کردہ حدیث ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: فجر کی نماز روشنی میں پڑھو کیونکہ اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔

اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔روشنی سے مراد یہ ہے کہ اتنی تاخیر کرے کہ اگر کسی وجہ سے پہلی نماز ٹوٹ جائے تو اسے دوبارہ پڑھ سکے اور سنت کے مطابق قرأت کر سکے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ فجر کی نماز میں جلدی کرنی چاہئے اور اسے اندھیرے میں پڑھ لینا چاہئے بلکہ وہ ہر نماز کو جلدی پڑھنے کے قائل ہیں کبھی تو اس کے لئے عمومات سے استدلال کرتے ہیں مثلاً **سابقوا الی مغفرة** (مغفرت کی طرف جلدی کرو) کی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔یہاں جلدی سے مراد اسبابِ مغفرت میں

جلدی ہے۔ اسی طرح فاستبقوا الخیرات سے استدلال کرتے ہیں لیکن یہ آیت ہماری دلیل ہے' ہماری مخالف نہیں کیونکہ کسی واجب کو مسنون طریقے سے ادا کرنا بخشش کا سبب ہے اور یہی خیر ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ موت آنے سے پہلے ان واجبات و فرائض کو ادا کرنے میں جلدی کرو جن کو تاخیر یا تعجیل سے ادا کرنا سنت ہے۔ ان نیکیوں کو موت سے پہلے جلدی جلدی کر لو۔ اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

عن ابن عمر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال الوقت الاول من الصلوة رضوان الله و الاخر عفو الله. (رواہ جامع ترمذی)

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نماز کا اول وقت رضائے خداوندی ہے اور آخری وقت اللہ کی بخشش ہے۔

ہوسکتا ہے اول وقت سے مراد مستحب وقت کا اول ہو کہ وہ رضائے الٰہی کا سبب ہے اور آخری وقت گناہوں کی بخشش اور عفو و درگزر کا موجب ہے۔

اگر کوئی نماز مستحب وقت کے علاوہ اپنے وقت میں ادا ہو تو بھی فرض ساقط ہو جاتا ہے مگر اس پر رضائے الٰہی اور عفو و درگزر سے آدمی محروم رہتا ہے جو مستحب وقت میں حاصل ہوسکتا ہے۔

اسی طرح امام شافعی حدیث پیش کرتے ہیں کہ:

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه ووجوه اله الکرام ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال له یا علی ثلث لاتوخرها الصلوة اذا دخل وقتها والجنازة اذا حضرت والایم اذا وجدت لها کفوا.

امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: اے علی! تین چیزوں میں دیر نہ کرنا۔ نماز جب اس کا وقت شروع ہو جائے' جنازہ جب وہ پہنچ جائے اور بے شوہر عورت جب تو اس کے لئے برابر کا رشتہ پائے۔

(رواہ ترمذی)

نماز کا وقت شروع ہو جائے' سے مراد نماز کا مستحب وقت شروع ہو جائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کی تائید کے لئے فجر کی نماز کے سلسلہ میں خصوصیت سے یہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔

عن انس قال ان رسول الله صلی الله علیه وسلم صلی صلوة الصبح بغلس یوم خیبر وهو قریب منهم فاغار علیهم قال الله اکبر خربت خیبر انا اذا انزلنا بساحة قوم نساء صباح المنذرین. (رواہ النسائی)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خیبر کے دن صبح کی نماز تاریکی میں ادا فرمائی۔ آپ ﷺ دشمن سے قریب تھے تو آپ نے ان پر حملہ فرمایا اور فرمایا: اللہ اکبر' جب ہم کسی قوم کے آنگن میں اتریں گے تو ڈرائے جانے والوں کی کیا ہی بری صبح ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صبح اس لئے تاریکی میں ادا کی گئی تھی کہ آپ ﷺ نے یہودیوں پر حملہ کرنا تھا اور

ضرورت تھی کہ نماز بہت صبح پڑھ لی جائے۔اس سے اسفار بالصبح (روشنی میں صبح کی نماز پڑھنا) کے مستحب ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔

ایک اور حدیث امام شافعی کے مذہب کی تائید میں پیش کی جاتی ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة قالت کن نساء المؤمنات یشهدن مع رسول الله صلی الله علیه وسلم صلوة الفجر متلففات بـرد طهن ثم تنقلین الی بیوتهن وما یعرفن من تغلیس رسول الله صلی الله علیه وسلم بالصلوة. (رواہ بخاری ومسلم)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔فرماتی ہیں کہ ہم مؤمن عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز فجر میں شامل ہونے کی خاطر چادروں میں لپٹی ہوئی حاضر ہوا کرتی تھیں۔ جب نماز سے فارغ ہو جاتیں تو اپنے گھروں کو واپس آتیں اور اندھیرے کے باعث کوئی بھی ہمیں پہچان نہیں سکتا تھا۔

عن ابن مسعود قال مارأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم صلی صلوة بغیر میقاتها الا صلوتین جمع بین المغرب والعشاء بجمع وصلی الفجر یومئذٍ لمیقاتها بغلس.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے کوئی نماز بے وقت ادا فرمائی ہو۔سوائے مغرب اور عشاء کی دو نمازوں کے کہ آپ نے انہیں اکٹھے ادا فرمایا اور اس دن آپ نے فجر کی نماز فجر کے وقت میں ادا فرمائی جبکہ ابھی تاریکی تھی۔

اسے مسلم نے روایت کیا ہے' اسی طرح امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام بخاری ایک اور حدیث روایت کرتے ہیں۔فرماتے ہیں یہ دونوں نمازیں اپنے وقت سے ہٹا دی گئی ہیں۔مغرب کی نماز جبکہ لوگ مزدلفہ میں آئیں اور فجر کی نماز' جب پو پھٹے۔

فی حدیث الوقوف بمزدلفة ثم صلی الفجر حین طلع الفجر قائل یقول طلع وقائل یقول لم تطلع ثم قال ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ان هاتین الصلوتین حولتا عن وقتیهما فی هذا المکان المغرب والعشاء ولا یقدم الناس جمعا حتی تقیموا وصلوا صلوة الفجر هذه بساعة. (رواہ بخاری)

ایک اور روایت قیام مزدلفہ کے بارے میں ہے۔(اس میں مذکور ہے) کہ فجر طلوع ہونے پر فجر کی نماز پڑھی جبکہ کوئی کہتا کہ فجر طلوع ہو گئی ہے اور کوئی کہتا فجر طلوع نہیں ہوئی (پھر راوی فرماتے ہیں) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ دونوں نمازیں (مغرب اور عشاء) اس جگہ اپنے وقت سے ہٹا دی گئی ہیں لہٰذا لوگ اندھیرا ہونے تک مزدلفہ نہ آئیں اور فجر کی نماز اس وقت پڑھیں۔

یہ حدیث قطعی دلیل ہے کہ حضور ﷺ کی عادت مبارکہ یہ نہیں تھی کہ فجر کی نماز اندھیرے میں ادا فرماتے ہوں۔ام المؤمنین سے مروی جن احادیث میں بہت صبح نماز پڑھنے کی جو احادیث آئی ہیں وہ ایک یا دو مرتبہ

اندھیرے میں نماز پڑھنے کو ظاہر کرتی ہیں اور ان کی حیثیت شذوذ کی ہے۔ بحر الرائق میں ہے کہ اتنے اندھیرے میں نماز پڑھنا کہ ابھی آسمان پر ستارے باہم گتھے نظر آ رہے ہوں مکروہ تحریمی ہے۔ شاید اسی لئے حضور ﷺ نے اس وقت نماز پڑھنے کو وقت سے ہٹ کر نماز پڑھنا فرمایا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ روشنی میں فجر کی نماز افضل ہے اور اس کی دلیل امام طحاوی کی بیان کردہ حدیث ہے۔

عن ابراھیم وقال ما اجتمع اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم على شئی کما اجتمعوا على التنوير بالفجر.

ابراہیم سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ جس طرح روشنی میں نماز فجر پڑھنے پر یک رائے ہیں اس قدر کسی اور چیز کے بارے یک رائے نہیں۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور یہ حدیث صبح کی نماز روشن کر کے پڑھنے پر اجماع کو ظاہر کرتی ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ صحابہ کرام کسی ایسی چیز پر اجماع کریں جو خلاف سنت ہو لہٰذا ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کا معمول یہ تھا کہ صبح دیر سے پڑھتے لیکن کبھی کبھار بہت صبح بھی آپ نے یہ نماز ادا فرمائی۔ گویا بہت صبح نماز فجر ادا کرنے کا عمل شاذ ہے، روزمرہ کا معمول نہیں ہے۔

ظہر کی نماز کا مستحب وقت

موسم گرما میں ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھنا مستحب ہے جبکہ سردیوں میں اس کے برعکس جلدی پڑھنا مستحب ہے کیونکہ حضور ﷺ گرمیوں میں ٹھنڈی کر کے پڑھتے اور سردیوں میں جلدی پڑھ لیتے' اسے نسائی نے بیان کیا ہے۔ ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھنے کے بارے حدیث گزر چکی ہے۔

عصر کی نماز کا مستحب وقت

عصر کی نماز میں تاخیر مستحب ہے لیکن یہ تاخیر اس قدر نہیں ہونی چاہئے کہ سورج کی روشنی ماند پڑ جائے اور مکروہ وقت شروع ہو جائے۔ تاخیر عصر کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے۔

عن علی بن سنان قال قدمنا على رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان يؤخر الصلوة مادام نقية بيضاء.

علی بن سنان سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ نماز کو اس وقت تک مؤخر کرتے جب سورج صاف سفید ہوتا (یعنی زرد نہیں ہوتا تھا)

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ عصر کی نماز کو اس قدر دیر سے پڑھنا مکروہ ہے کہ ساری نماز یا اس کا کچھ حصہ اس وقت ہو جب سورج زرد پڑ جائے۔

عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تلك صلوة المنافق ويجلس

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ منافق کی نماز ہے وہ سورج کو دیکھتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ

بترقب الشمس حتى اذا اصفرت الشمس وكان بين قرني الشيطان فنقرا ربعاً لايذكر الله الا قليلا.

زرد ہو جاتا ہے اور اس وقت سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو منافق چار رکعتیں جلدی جلدی اس طرح ادا کرتا ہے کہ جس طرح مرغ دانے چگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت کم کرتا ہے۔

نماز مغرب کا مستحب وقت

مغرب کی نماز میں جلدی کرنا مستحب ہے اور اس کی دلیل یہ مبارک ہے۔

عن رافع بن خديج قال كنا نصلي المغرب مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فينصرف احدنا وانه ليبصر مواقع نبله.

رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ پس ہم میں سے جب کوئی شخص واپس لوٹتا تو اپنے تیر لگنے کی جگہ کو دیکھ لیتا (یعنی تیر کا ہدف ابھی نظر آ رہا ہوتا اور زیادہ اندھیرا نہ ہوتا)۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ انہیں سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ:

قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي المغرب ساعة يغرب الشمس اذا غاب حاجبها. (رواہ سنن ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ مغرب کی نماز غروب آفتاب کے وقت پڑھتے جبکہ اس کے ڈوبنے کی جگہ غائب ہو چکی ہوتی۔

مغرب میں اس قدر دیر کرنا کہ ستاروں کا آسمان پر جال سا بن جائے مکروہ تحریمی ہے۔

عن مرثد بن عبد الله قال قدم علينا ابو ايوب غازيا وعقبة بن عامر يومئذٍ على مصر فاخر عقبة المغرب فقام اليه ابو ايوب فقال ماهذه الصلوة يا عقبة قال انا شغلنا قال اما سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لايزال امتي بخير اوقال على الفطرة مالم يوخر المغرب الى ان شيتبك النجوم.

حضرت مرثد بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ کی نیت سے ہمارے پاس تشریف لائے۔ ان دنوں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مصر کے والی تھے۔ آپ (حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے مغرب کی نماز دیر سے ادا کی۔ حضرت ابوایوب نے انہیں مخاطب کیا اور فرمایا: اے عقبہ یہ کون سی نماز ہے؟ وہ عرض کرنے لگے ہم مصروف تھے۔ حضرت ابو ایوب نے فرمایا: کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا کہ میری امت اس وقت تک بھلائی پر رہے گی یا فرمایا (راوی کو شک ہے) فطرت پر رہے گی جب تک مغرب کو اس وقت تک مؤخر نہیں کرے گی کہ ستاروں کا (آسمان پر) جال سا بن جائے۔

نمازِ عشاء کا مستحب وقت

عشاء کی نماز کو تہائی رات تک مؤخر کرنا مستحب ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة الصديقة قالت كانوا يصلون العتمة تغيب الشمس الى ثلث الليل.

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ لوگ عشاء کی نماز شفق کے غائب ہونے سے تہائی رات تک پڑھا کرتے۔

اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

عن ابى هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لو لا ان اشق على امتى لامرتهم ان يوخروا العشاء الى ثلث الليل او نصفه.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: اگر میں اپنی امت کے لئے اسے مشکل نہ سمجھتا تو انہیں حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز کو تہائی یا آدھی رات تک مؤخر کریں۔

اسے امام احمد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ پھر نماز عشاء میں تہائی رات تک دیر کرنا مستحب ہے اور آدھی رات تک تاخیر بھی جائز ہے مگر آخری نصف تک تاخیر کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ خلافِ سنت ہے۔

ابر کی حالت میں مستحب اوقات

جس دن مطلع ابر آلود ہو اس دن عصر اور عشاء کی نمازوں کو جلدی پڑھنا چاہئے۔ نماز عصر اس لئے کہ مکروہ وقت شروع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور عشاء اس لئے کہ لوگ سو جاتے ہیں اور جماعت میں بہت کم شریک ہوتے ہیں۔

مکروہ اوقات

طلوع آفتاب کے وقت جبکہ سورج بلند نہیں ہو جاتا ہر قسم کی نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اسی طرح جب سورج سر کے برابر ہو یا عصر کے بعد زردی مائل ہو جائے تو مغرب تک نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

عن عقبة بن عامر ثلث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا ان نصلى فيهن اونقبر موتانا فيهن حين تطلع الشمس بازغة حتى يرتفع وحين تقوم قائم الظهيرة حتى تميل الشمس وحين تضيفت الغروب حتى يغرب.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین اوقات میں ہمیں نماز پڑھنے اور مردے دفن کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ جب سورج طلوع ہو حتیٰ کہ بلند ہو جائے، جب دوپہر کا وقت ہو جائے حتیٰ کہ سورج ڈھل جائے، جب غروب آفتاب کا وقت ہو جائے حتیٰ کہ سورج غریب ہو جائے۔

اسے مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ "ہم اپنے مردوں کی تدفین کریں" سے مراد نماز جنازہ ہے۔ ابوداؤد فرماتے ہیں کہ ان

اوقات میں میت کو دفن کرنا بھی مکروہ ہے۔

امام مالک اور امام نسائی روایت کرتے ہیں کہ:

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ان الشمس تطلع ومعها قرن الشیطان فاذا ارتفعت فارقتها ثم اذا استوت قارنتها فاذا زالت فارقتها فاذا دنت للغروب قارنتها فاذا غربت فارقتها ونهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن الصلوة فی تلک الساعات.

رسول اللہ علیہ نے فرمایا: سورج جب طلوع ہوتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان کا سینگ ہوتا ہے' جب وہ بلند ہو جاتا ہے تو شیطان کا سینگ الگ ہو جاتا ہے پھر جب سورج سر کے برابر پہنچتا ہے تو شیطان کا یہ سینگ اس کے قریب ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب پر الگ ہو جاتا ہے۔ (اسی لئے) حضور علیہ نے ان (تین) اوقات میں نماز پڑھنے سے روکا ہے۔

یہ حدیث جہاں ان تین اوقات کے منھی عنہ ہونے پر دلالت کرتی ہے' وہاں اس بات کو بھی واضح کرتی ہے کہ ایسے وقت میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے اور شیطان کی عبادت کے مترادف ہے۔

ان اوقات میں نفل نماز شروع کی تو واجب ہو جائے گی

نماز کی دو قسمیں ہیں: فرض اور نفل۔ ان اوقات میں نفل نماز شروع کرنا جائز ہے۔ اگر کسی نے نفل شروع کر دیئے تو اس پر واجب ہے کہ نفل توڑ دے اب چونکہ ان اوقات میں نفل شروع کرنا جائز تھا اس لئے قضا واجب ہو گی (مقصد یہ ہے کہ ان ممنوع اوقات میں جو نماز شروع ہو گئی وہ معتبر ہو گی۔ اب چونکہ اس وقت میں نماز پڑھنا منع ہے اس لئے نفلی نماز توڑ دے گا لیکن شروع کرنے کی وجہ سے قضاء لازم آئے گی کیونکہ نفل شروع کر کے چھوڑ دیئے جائیں تو قضا واجب ہو جاتی ہے)۔

اگر اس نے ان اوقات میں نفل نماز مکمل کر لی تو نماز ہو جائے گی لیکن گنہگار ہو گا اسی طرح اگر کسی نے ان اوقات میں نماز کی نذر مانی تو نذر کو پورا کرنا لازم ہو جائے گا اور نذر ماننے والے پر لازم ہو گا کہ وہ نذر کی نماز کو ان اوقات کے بعد پڑھے کیونکہ ان اوقات میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے۔ اگر کسی نے ان اوقات میں نذر کی نماز پڑھ لی تو عہدہ برا ہو جائے گا کیونکہ شرعی امور میں نہی صحت کا تقاضا کرتی ہے اور حرمت کی وجہ کوئی اور ہوتی ہے۔ یہاں نماز یا نذر مشروع امور ہیں لیکن وقت حرمت کا سبب بن رہا ہے لہٰذا یہ فساد کا تقاضا نہیں کرتا' ہاں وہ گنہگار ضرور ہو گا اس لئے جو آدمی ان اوقات میں نماز شروع کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ نماز توڑ دے اور نذر ماننے والا نذر کی نماز کو مؤخر کر دے۔

رہی فرض نماز تو وہ ان اوقات میں صحیح نہیں ہے' اگر کوئی پڑھے گا تو نہیں ہو گی' ہاں عصر کی اسی دن کی نماز سورج کے غروب ہونے سے تھوڑی دیر قبل بھی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ ادائیگی عصر کا آخری وقت ہے اور نص سے ثابت ہے کہ یہ وقت عصر کے وقت میں شامل ہے اس لئے اس کی ادائیگی صحیح ہے ورنہ لازم آئے گا کہ یہ عصر کے لئے وقت نہیں ہے۔ مشائخ نے بیان فرمایا ہے کہ نماز عصر کی فرضیت کا سبب عصر کے وقت کا آخری جزء ہے اور وہ ناقص وقت ہے

تو اس وقت میں ادائیگی معتبر شمار ہوگی جس طرح فرضیت معتبر ہے اور اس کی بنیاد اس پر ہے کہ سببت پہلے جزء سے آخری جزء کی طرف منتقل ہوئی ہے۔ اس کے بارے اگر تفصیل مطلوب ہو تو فواتح الرحموت شرح المسلم دیکھئے جس میں ہم نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

فرض نمازوں کی قضاء مکروہ اوقات میں درست نہیں

عصر کے فرضوں کے علاوہ اور کوئی نماز ان اوقات میں جائز نہیں۔ اگر کوئی اور فرض نماز شروع کرے گا تو وہ نہیں ہوگی کیونکہ قضاء کا وقت بہت وسیع ہے۔ قضاء نماز زندگی میں کسی وقت بھی پڑھ سکتا ہے لہٰذا مکروہ وقت میں پڑھ کر اس کی قضاء کو ناقص کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ فرائض کامل واجب ہوئے ہیں اس لئے ان کو کامل وقت میں پڑھنا چاہئے اور جب ممکن ہے کہ انہیں کامل وقت میں پڑھا جائے تو ناقص وقت میں پڑھنا صحیح نہ ہوا لیکن اس دن کی عصر کا پڑھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بعد ادا کا کوئی وقت نہیں اور ادائے ناقص' قضائے کامل سے بہر حال بہتر ہے اس لئے اسے قضا نہیں کرنا چاہئے لیکن جو قضا ہو چکی ہے تو اسے ناقص وقت میں پڑھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے کامل وقت میں وسعت ہے۔

ہاں اگر اس کی فرضیت کسی طرح ناقص ہے تو پھر قضا بھی ناقص وقت میں ہو سکتی ہے مثلاً سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے حیض یا نفاس کا خون ختم ہوا تو ناقص وقت کی وجہ سے فرضیت ناقص ہے لہٰذا ایسی عورت ناقص وقت میں بھی قضا کر سکتی ہے اسے امام فخر الاسلام نے اختیار کیا ہے کیونکہ عصر کی یہ نماز ناقص واجب ہوئی اس لئے کہ اس کے پورے وقت عصر کی طرف نسبت نہیں کی جا سکتی اس لئے اس کی ادائیگی بھی ناقص ہو سکتی ہے۔ امام شمس الائمہ فرماتے ہیں کہ اس کی قضاء ناقص وقت میں صحیح نہیں کیونکہ وقت میں فی نفسہٖ کوئی نقص نہیں بلکہ نقص اس وقت نماز ادا کرنے میں ہے اس لئے کہ اس وقت میں نماز پڑھنا شیطان کی عبادت سے مشابہت رکھتا ہے۔ حدیث کی رو سے ایسے وقت میں شیطان کا سینگ سورج سے ملا ہوتا ہے اور اس وقت کافر سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ پس اس پر ہر لحاظ سے کامل نماز واجب ہے اگرچہ اس کے واجب ہونے کا سبب ناقص وقت ہے کہ اس کے ساتھ شیطان کا سینگ ملا ہوتا ہے یہ کامل واجب اس لئے ہے کہ یہ وقت کامل نماز کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے۔ اب ادا میں یہ کمال اس آدمی کے لئے ساقط ہو گیا ہے کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اسے کامل طریقے سے ادا کرے اس لئے کہ کامل ادائیگی کا وقت گزر چکا ہے لیکن قضا میں تو کاملین کا امکان موجود ہے پھر اسے کیوں نہ کامل طریقے سے قضاء کیا جائے۔ اسی پر فتویٰ ہے اور کتب اصول فقہ میں اس موضوع پر بہت زیادہ بحث کی گئی ہے۔

سورج ڈوبنے کے وقت شروع کی جانے والی عصر کی نماز کا حکم

اگر کسی نے عصر کی نماز اس وقت ادا کی جب سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ دو رکعتیں اس نے سورج ڈوبنے سے پہلے پڑھ لیں اور دو رکعتیں یا بعض حصہ غروب آفتاب کے بعد پڑھا تو نماز ہو جائے گی کیونکہ بعض ناقص وقت

میں پڑھی گئی۔ نماز شرف وقت کی وجہ سے نقصان کی متحمل ہوگی اور وقت کے بعد پڑھی گئی وہ کامل ہے کیونکہ مغرب کا وقت شروع ہو چکا ہے جو کامل وقت ہے تو اس لئے نماز کے ٹوٹ جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

فجر کی نماز کا حکم

رہی فجر کی نماز تو اس کا کچھ حصہ وقت میں ہو اور کچھ حصہ وقت کے بعد (یعنی سورج طلوع ہونے سے پہلے شروع کی اور پڑھتے پڑھتے سورج طلوع ہو گیا) تو جو حصہ وقت کے اندر ادا ہوا اگر چہ وہ کامل ہے لیکن جو وقت کے بعد ادا ہو رہا ہے وہ ناقص ہے اس لئے خارج الوقت حصہ وقت کے شرف نہ پائے جانے کی وجہ سے اس نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے ایسی صورت میں فجر کی نماز نہیں ہوئی۔

اب اس پر ایک سوال ہوتا ہے کہ:

بقول رسول الله صلى الله عليه وسلم من ادرك ركعة من الفجر فقد ادرك الفجر ومن ادرك ركعة من العصر فقد ادرك العصر. (رواہ البخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: جس نے فجر کی ایک رکعت پالی اس نے فجر (کی نماز) کو پالیا اور جس نے عصر کی ایک رکعت کو پایا اس نے عصر کی پوری نماز کو پالیا۔

رہی وہ روایت جو حضرت امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ جب کوئی صبح کی نماز پڑھ رہا ہو اور سورج طلوع ہو جائے تو وہ اس رکن کو اس قدر طول دے کہ سورج بلند ہو جائے تاکہ دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے۔ یہ رائے اگر چہ مضبوط ہے لیکن اس سے ارکان اپنی جگہ سے مؤخر ہو جائیں گے اور ارکان کی اپنے محل سے تاخیر بھی ممنوع ہے پھر اگر وہ نماز کو اس طرح طول دے کہ نماز سے نکل کر کسی اور کام میں مشغول ہو جائے تو اس سے ارکان کی ادائیگی میں تسلسل نہیں رہتا جس سے شریعت مطہرہ نے روکا ہے۔ اگر نماز کے رکن کو طویل کرنا نماز میں ہی رہ کر ہو تو پھر نماز کا کچھ حصہ مکروہ وقت میں پڑھا گیا۔

اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ امام احمد کی رائے زیادہ قرین صواب ہے کہ اگر نماز فجر کا کچھ حصہ صحیح وقت میں ادا ہو اور کچھ حصہ وقت سے باہر تو فجر کی نماز ہو جاتی ہے۔ میں نے جو اس بارے بیان کرنا تھا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کو زیادہ جانتا ہے۔

یہ تو تھا فجر اور عصر کی نماز کے بارے میں۔ باقی تین نمازوں میں سے کوئی نماز اگر اس طرح پڑھی جائے کہ کچھ حصہ وقت کے اندر ہو اور کچھ حصہ وقت سے باہر تو بلاشبہ بالاتفاق وہ نماز ادا ہو گئی اس لئے کہ نماز کا ہر حصہ کامل وقت میں پڑھا گیا لیکن ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا کیونکہ نماز کا کچھ حصہ شرف وقت سے خالی ہے ایسی نماز کا حکم ادا شدہ نماز کا حکم ہوگا جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے:

عن ابی هريرة ان النبی صلى الله عليه وسلم قال من ادرك ركعة من الصلوة فقد ادرك الصلوة. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی۔

امام شافعی اس حدیث کے ظاہری الفاظ کو لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس نے ایک رکعت سے کم نماز پائی اس نے اس نماز کو نہیں پایا بلکہ وہ قضاء کے حکم میں ہے جبکہ ہمارے نزدیک اگر نماز کا پہلا جزو کسی نے نماز کے وقت میں ادا کر لیا اگرچہ رکعت سے کم تھا تو اس نص کی رو سے اس نے اس نماز کو پالیا۔

نماز میں تاخیر کرنے پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف

یہ بندۂ مسکین (مصنف) کہتا ہے کہ ہوسکتا ہے ہمارے ائمہ ثلاثہ نے اسی لئے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہو کہ ایک شخص نماز کے آخری وقت میں نماز پڑھنے کا اہل بنتا ہے مثلاً عورت کو ماہواری کا خون آ رہا تھا' سورج کے غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے اس کا خون ختم ہوا تو اس پر اس نماز کا پڑھنا لازم ہے' اگر نہیں پڑھے گی تو قضا لازم آئے گی۔ امام زفر کی رائے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک تکلیف کے لئے قدرت شرط ہے۔ مذکورہ صورت میں اسے نماز پڑھنے کی قدرت ہی نہیں کہ وقت ختم ہوا چاہتا ہے لہٰذا اس پر ادائیگی واجب ہے اور نہ ہی قضاء۔ وجوب کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص کے لئے (جس نے تھوڑا سا وقت پایا) ممکن ہے کہ نماز کی ابتداء اس کے وقت میں کرے اور اسے مکمل وقت کے بعد کرے۔ شارع علیہ السلام کی نظر میں یہ بھی ادا کی ایک قسم ہے اور ادا کی یہ قسم اس پر لازم ہے اور رہ جانے کی صورت میں اس کی قضاء لازم ہوگی کیونکہ اس نے ادائیگی پر قدرت پائی یعنی نماز کے سبب کو پایا۔ وقت کا آخری جزو نماز کی فرضیت کے لئے سبب ہے کہ آخری وقت میں اس کی بالفعل ادائیگی کے لئے سبب ہے کہ اس سے بغیر قدرت کے تکلیف لازم آئے یہی ائمہ کے نزدیک سب سے بڑی وجہ ہے لیکن یہ چیز فجر میں نہیں ہے کیونکہ فجر کی نماز کو اس طرح پڑھنا ان کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو اس کی وجہ واضح ہے۔

رہا بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ آخری وقت صرف فرضیت نماز کے لئے سبب ہے' ادائیگی کے وجوب کے لئے نہیں۔ نفس فرضیت تو قدرت کا تقاضا نہیں کرتا جیسے سونے والا کہ اگر اس کی نماز رہ جائے تو اس کی قضاء ضروری ہوتی ہے۔ اس میں بھی یہی بات ہے کہ نفس فرضیت اس وقت ہوتی ہے جس وقت ادائیگی ممکن ہو۔ جب یہاں ادائیگی ممکن نہیں تو کون سی چیز اس کے ذمہ لازم ہوئی مگر سوتے آدمی کا مسئلہ مختلف ہے۔ نیند کے دورانیے میں اس سے نماز پڑھنا ممکن ہے (اٹھے اور پڑھ لے ممکن ہے) لیکن نیند کی شرط کے ساتھ ممکن نہیں۔ ایسے ہی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جس نماز کا ایک جزو واجب ہو گیا اس کی قضاء ہوگی مثلاً ایک شخص نفل شروع کر کے توڑ دیتا ہے تو اس نماز کا پہلا جزو واجب ٹھہرا اور اس کے وجوب کی وجہ سے قضاء لازم ٹھہری۔ مذکورہ صورت میں وقت موجود ہے اور اس وجہ سے نماز کا پہلا جزو جو اس وقت میں پڑھا جا سکتا ہے' واجب ہے اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ شارع علیہ السلام نے وقت کو پوری نماز کی فرضیت کا سبب ٹھہرایا ہے نہ کہ الگ کسی ایک جزو کا اور جزو کی فرضیت کل کی فرضیت کے ضمن میں ہے جبکہ یہاں کل کی فرضیت ممکن نہیں اور نفل نماز جس کو توڑ دیا پورے نفل واجب ہوں گے کیونکہ اس کی تکمیل واجب ہے اس لئے قضاء مرتب ہوگی' اگر اس کی تکمیل اس لئے واجب ہے کہ ادا شدہ نماز باطل نہ ہو تو اس نماز میں تکمیل کو واجب ٹھہرانے کا قول صحیح نہیں کیونکہ اس کا امکان ہی نہیں اس لئے جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس کے بغیر یہ کلام مکمل نہیں ہو پاتا۔

اب رہی وہ بات جو اکثر مشائخ کہتے ہیں کہ ادائیگی کے وجوب کے لئے قدرتِ موہوم شرط ہے۔ یہاں ہم فرض کر لیں گے کہ یہ نماز اس تھوڑے سے وقت میں ادا ہو سکتی ہے مثلاً سورج رُک سکتا ہے اور اس طرح وقت میں وسعت آ سکتی ہے۔ پس قدرتِ موہومہ کی بناء پر اس پر قضاء مرتب ہوتی ہے جیسے کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ آسمان کو ہاتھ لگائے گا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا کیونکہ اس میں قدرتِ موہومہ پائی جاتی ہے یعنی فرض کر لیا جائے گا کہ وہ آسمان کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔

شیخ ابنِ الھمام کے بقول یہ محض مناظرانہ بات ہے' شریعت کا کوئی بھی حکم اس وقت تک لازم نہیں آتا جب تک آدمی عادتاً اسے سرانجام دینے کا اہل نہ ہو اور جب وقت بہت کم ہے تو اس وقت بالفعل پوری نماز ادا نہیں ہو سکتی اس لئے ادا واجب نہیں اور جب وجوب کی شرط نہیں پائی جائے گی' قضاء مرتب نہیں ہوگی۔

مکروہ اوقات میں نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت کا حکم

ایسے مکروہ وقت میں نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت بھی جائز نہیں ہے کیونکہ نماز جنازہ کے ناجائز ہونے کے بارے تو نص موجود ہے اور سجدۂ تلاوت اس لئے صحیح نہیں کہ وہ بھی نماز کے معنی میں ہے۔ ہدایہ شریف میں ہے کہ جب اوقاتِ مکروہہ میں جنازہ آ جائے یا کوئی شخص آیتِ سجدۂ تلاوت کر دے تو یہ دونوں عمل صحیح ہو جائیں گے' مکروہ نہیں ہوں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز جنازہ مکروہ وقت میں لازم ٹھہرا کیونکہ خطاب اسی وقت متوجہ ہوا سو جس طرح یہ دونوں فرض ہوئے اسی طرح ادا ہو گئے لیکن اس میں کراہت صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کی کامل ادائیگی ممکن ہے۔

اگر جنازہ مکروہ وقت میں شروع ہونے سے پہلے پہنچ گیا یا آیت سجدہ مکروہ وقت سے پہلے پڑھی تو اب مکروہ وقت میں ان کو ادا کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کو ادا کرنے کا خطاب کامل وقت میں ہوا۔ یہ گفتگو ہمارے مذہب کی رو سے ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ان اوقات میں فرض مکروہ نہیں اور نہ ہی نفل نماز مکہ مکرمہ میں اور جمعہ کے دن مکروہ ہے جبکہ سورج سر پر ہو۔ امام یوسف بھی جمعہ کے دن استواء کے وقت نفل نماز کو مکروہ نہیں سمجھتے۔ کیونکہ:

لقوله صلى الله عليه وسلم من نام عن صلوة اونسيها فليصلها اذا ذكرها.

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جو نماز پڑھے بغیر سو گیا یا نماز پڑھنا بھول گیا تو جب اسے یاد آئے نماز پڑھ لے۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

امام شافعی اس سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جونہی آدمی بیدار ہوگا یا بھولنے کی صورت میں اسے نماز یاد آئے گی تو اس پر فوراً اس نماز کو ادا کرنا لازم ہوگا مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ صرف اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے۔ جب اذا صرف متی کی طرح تمام ازمنہ کے لئے ظرف ہوتا مگر یہاں وہ محض شرط کے معنی میں ہے اور عموم کا فائدہ نہیں دے رہا۔ کوفیوں کے نزدیک صرف اذا ان دونوں میں مشترک ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی یہی صحیح ہے جیسا کہ علم الاصول میں بیان ہوا ہے پس حدیث پاک کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب کوئی شخص نماز پڑھے

بغیر سو جائے یا نماز پڑھنا بھول جائے تو زندگی میں جب بھی اسے یاد آئے صحیح طریقہ سے ادا کرے۔ سو وہ شخص جس وقت بھی اس نماز کو ادا کرے گا وہی اس نماز کا وقت ہوگا۔ اس سے مراد کوئی وقت بھی ہو سکتا ہے جس میں نماز ادا ہو سکتی ہے اس سے قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ جونہی یاد آئے تو فوراً نماز ادا کی جائے۔

شیخ ابن الھمام اس حدیث اور اس حدیث کے درمیان جس میں نماز سے روکا گیا ہے۔ تعارض کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں خاص و عام کا معارض ہے اور خاص، عام کو خاص نہیں کر سکتا مگر صرف اسی صورت میں کہ اس کے موافق ہو۔ تعارض کی صورت میں حرام کو مباح پر مقدم کیا جاتا ہے جیسا کہ حنفی اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

امام شافعی کے اصول کے مطابق اگرچہ یہ حدیث فرض نماز کے ساتھ خاص ہے اور نہی والی حدیث تمام نمازوں میں عام ہے لیکن یہ حدیث اوقات کے اعتبار سے عام ہے اور نہی والی حدیث اوقات کے اعتبار سے خاص ہے، اگر نہی والی حدیث کو اس بناء پر نفل نماز کے ساتھ خاص کریں گے کہ ان کے نزدیک خاص مطلقاً مخصص ہے کہ ہم کہیں گے کہ یہ حدیث اوقاتِ غیر مکروہہ کے ساتھ بھی خاص ہے کیونکہ نہی والی حدیث خصوص کا فائدہ دیتی ہے تو اس طرح ترجیح کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

میرے نزدیک ان دونوں صورتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ مذکورہ حدیث سے مراد یہ ہے کہ یاد آنے یا بیدار ہونے پر نماز کو کامل طریقہ سے ادا کیا جائے، اگر اس سے مراد فوراً یاد آنے پر لیا جائے تو لازم آئے گا کہ عورت حیض کی حالت میں بھی نماز ادا کرے گی جبکہ یہ جائز نہیں ہے تو اس سے واضح ہوا کہ اس سے مراد کاملہ نہیں ہے اور اوقاتِ مکروہہ میں نماز پڑھنے سے روکنے والی حدیث ہمارے نزدیک ان اوقات میں فرض نماز کے بطلان کا موجب بنتی ہے۔ تو اس لئے مکروہ اوقات میں وہ مامور ہی نہیں لہٰذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں اور اگر یہ کیا جائے تو مکروہ وقت میں نماز فاسد نہیں ہوتی تو پھر اسی حدیث کا اثبات لازم آتا ہے اور فوراً نماز پڑھنا لازم ٹھہرتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ مکہ میں نفل نماز پڑھنا اوقاتِ مکروہہ میں صحیح ہے تو اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

روی ابوذر قال وقد صعد علی درجۃ الکعبۃ من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا جندب سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوۃ بعد الصبح حتی تطلع الشمس ولا بعد العصر حتی تغرب الشمس الابمکۃ.

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کعبہ شریف کی سیڑھی پر کھڑے ہو کر فرمانے لگے جس نے مجھے پہچان لیا سو اس نے مجھے پہچان لیا اور جس نے مجھے نہیں پہچانا تو میں جندب ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ: صبح کے بعد کوئی نماز نہیں یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے اور عصر کے بعد کوئی نماز نہیں حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے سوائے مکہ مکرمہ کے۔

امام شافعی اور امام ابو یوسف جمعہ کے دن عین دوپہر کے وقت نفل نماز کا پڑھنا مکروہ نہیں سمجھتے اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت نماز کو مکروہ سمجھتے تھے۔ سوائے جمعہ کے دن کے آپ ﷺ فرماتے تھے کہ جہنم

بھڑکتی ہے سوائے جمعہ کے دن کے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

یہ دونوں استدلال اس وقت صحیح ہوں گے جب مستثنیٰ میں عبارۃ النص سے حکم ثابت ہو رہا ہو' اگر عبارۃ النص سے حکم ثابت نہ ہو رہا ہو تو استدلال صحیح نہیں ہے جیسا بعض حنفی علماء کہتے ہیں کیونکہ ایسے میں جواز اصل سے ثابت ہو گا اور نہی والی حدیث سے تعارض لازم نہیں آئے گا' اگر اس میں حکم اشارۃ النص سے ثابت ہو رہا ہو جیسا کہ ہمارے محقق مشائخ کی رائے ہے کیونکہ عبارۃ النص تعارض کے وقت اشارۃ النص پر مقدم ہوتی ہے۔ شیخ ابن الھمام نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ دونوں حدیثیں اس حدیث کے معارض ہیں جس میں نہی وارد ہوئی ہے اور تعارض کے وقت حرمت والی حدیث کو ترجیح دی جائے گی۔

فجر اور عصر کی نماز کے بعد نفل پڑھنا مکروہ ہے

فجر اور عصر کی نماز کے بعد نفل پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے۔

قال ابن عباس شهد عندی رجال مرضیون وارضاهم عندی عمران رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن الصلوة بعد الصبح حتی یشرق الشمس وبعد العصر حتی یغرب.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میرے پاس اللہ کے نیک بندے تشریف فرما تھے اور ان میں سے سب سے نیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے صبح (کی نماز) کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے حتیٰ کہ سورج چمکنے لگے اور عصر کے بعد (بھی نماز سے منع فرمایا ہے) حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ ایسے ہی ایک حدیث صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور نسائی میں حضرت معاذ سے روایت کی گئی ہے۔ ان روایات اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کو اگر سامنے رکھا جائے تو قطعیت کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

عن سائب بن یزید انه رأی عمر بن الخطاب یضرب المنکدر فی الصلوة بعد العصر. (رواہ مؤطا امام مالک)

حضرت سائب بن یزید سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ وہ عصر کے بعد جلدی جلدی نماز پڑھتے تھے۔

روی ام المؤمنین عائشة الصدیقة رکعتان لم یکن رسول الله صلی الله علیه وسلم یدعها سرا ولا علانیة رکعتان قبل صلوة الصبح ورکعتان بعد العصر.

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ دو رکعتیں حضور ﷺ سراً اور علانیۃً (کسی صورت) نہیں چھوڑتے تھے۔ دو رکعتیں صبح کی نماز سے پہلے اور دو رکعتیں عصر کی نماز کے بعد۔

اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ عصر کے بعد نماز پڑھنا جائز ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ اس کی دلیل ابوداؤد کی روایت ہے۔

عن ذكوان مولى ام المؤمنين عائشة الصديقة حدثته ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي بعد العصر ركعتين وينهى عنهما ويواصل وينهى عن الوصال.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آزاد کردہ غلام حضرت ذکوان سے روایت ہے کہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان فرمایا: حضور ﷺ عصر کی نماز کے بعد دو رکعتیں نفل پڑھتے اور (دوسروں کو اس سے) روکتے۔ آپ ﷺ صوم وصال رکھتے اور اس سے (دوسروں کو) روکتے۔

ان دونوں وقتوں میں قضا نماز پڑھنا، سجدۂ تلاوت کرنا اور نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

ہدایہ میں ہے کہ ان اوقات میں کراہت فرض کے حق کی وجہ سے ہے کیونکہ فرض کی ادائیگی کے بعد کا وقت ایسے ہی ہے جیسے نمازی اس وقت میں اس فرض کو ادا کر رہا ہے۔ کراہت اس وجہ سے نہیں کہ وقت میں کسی قسم کا نقص ہے۔ فرائض اس وقت میں اس لئے قضا ہو سکتے ہیں کہ اس کا حق باقی رہتا ہے۔

فتح القدیر میں اس پر اعتراض کیا گیا ہے۔ یہ تعلیل نص کے معارض ہے کیونکہ نص میں یہ حکم عام ہے۔ کسی قسم کی نماز فجر اور عصر کے بعد نہیں ہو سکتی۔ صاحب فتح القدیر کہتے ہیں کہ قضا کو فساد سے بچانا کافی ہے حالانکہ یہ بات تو معلوم ہے کہ نہی اس وجہ سے نہیں کہ وقت میں فی نفسہ کوئی خرابی ہے۔ رہا اس کو کراہت سے نکالنا تو اس میں سابقہ گفتگو کو سامنے رکھئے۔

حدیث پاک میں ان اوقات میں نماز کے بارے جو نہی ہے، وہ عام ہے۔ اس بارے تحقیق یہ ہے کہ افعال شرعیہ کے بارے نہی صحت کا فائدہ دیتی ہے لہٰذا ان دونوں وقتوں میں کسی نماز کے پڑھنے کے بارے نہی کا وارد ہونا نماز کی مشروعیت کا فائدہ دیتی ہے، اگر کوئی ان دو اوقات میں نماز پڑھے گا تو نماز ہو جائے گی لیکن مکروہ ہو گی جیسے غصب شدہ زمین میں نماز ہو جاتی ہے، ان دونوں وقتوں میں طلوع و غروب کی طرح فی نفسہ کوئی نقص نہیں اسی لئے ان میں نماز ہو جاتی ہے کیونکہ اگرچہ یہ مکروہ اوقات ہیں لیکن ہیں تو عصر اور صبح کی نماز کے وقت لہٰذا ان میں بلا کراہت نماز ہو جائے گی۔

مغرب کی نماز سے قبل نوافل پڑھنا درست نہیں

غروب آفتاب کے بعد مغرب کی نماز سے پہلے نماز پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ اس سے مغرب کی نماز میں دیر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ہو سکتا ہے نفل نماز اس قدر طویل ہو جائے کہ مغرب کی فرض نماز مکروہ وقت میں ادا ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

عن ابراهيم النخعي انه نهى عنهما وقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم وابابكر وعمر لم يكونوا يصلونهما هذا.

حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (مغرب کی نماز سے پہلے) دو نفل پڑھنے سے روکا ہے اور فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مغرب سے پہلے نفل

نہیں پڑھتے تھے۔

دوسری حدیث یہ ہے:

وقد روی عبد الله بن معقل قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم صلوا قبل المغرب ثم قال صلوا قبل المغرب قال فی الثالثة لمن شاء خشية يتخذها الناس سنة.

حضرت عبداللہ بن معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مغرب کی نماز سے پہلے (نفل) نماز پڑھا کرو۔ پھر فرمایا: مغرب کی نماز سے پہلے (نفل) نماز پڑھا کرو۔ تیسری مرتبہ آپ نے فرمایا: جس کا جی چاہے۔ یہ الفاظ آپ ﷺ نے اس لئے فرمائے کہ کہیں لوگ اسے سنت نہ بنالیں۔

اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ روایت میں ''مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھو'' کے الفاظ ہیں' باقی الفاظ وہی ہیں جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کئے ہیں۔

عن انس كان المؤذن اذا اذن قدم ناس من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم يبذرون السواری حتی یخرج النبی صلی الله علیه وسلم وهم كل ذلک يصلون ولم يكن بين الاذان والاقامة شئی. (رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب مؤذن اذان کہتا تو نبی کریم ﷺ کے اصحاب کھڑے ہو کر ستونوں کے پاس چلے جاتے حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ باہر تشریف لاتے اور لوگ (مغرب کی نماز سے پہلے) دو رکعتیں پڑھ رہے ہوتے حالانکہ اذان اور اقامت میں کچھ وقفہ نہ ہوتا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اذان اور اقامت میں بہت تھوڑا وقت ہوتا ہے۔

ان احادیث کی ایک اور حدیث معارض ہے۔

عن طاؤس سئل ابن عمر عن الركعتين قبل المغرب قال مارأیت احدا علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم يصليهما ورخص فی الركعتين بعد العصر.

طاؤس سے روایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مغرب (کی نماز) سے پہلے دو رکعت (نفل) کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں نے عہد رسالت میں کسی کو یہ دو رکعتیں پڑھتے نہیں دیکھا اور آپ نے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کی اجازت دی ہے۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

یہ حدیث عبداللہ بن معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے معارض نہیں ہے بلکہ حضرت انس کی روایت کردہ حدیث کے معارض ہے کیونکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد میں نماز کی بات کی ہے اگر لوگ مسجد میں نماز پڑھتے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ضرور دیکھتے۔

فتح القدیر میں اس کے جواب میں خوب گفتگو ہوئی ہے۔ انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی

روایت کو راجح قرار دیا ہے مگر اس گفتگو کو پڑھ کر قلق دور نہیں ہوتا اسی لئے ہم یہاں مزید کچھ گفتگو کرنا مناسب خیال نہیں کرتے۔ جو اس ضمن میں زیادہ معلومات کا خواہاں ہو وہ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

بہر حال اگر رسول اللہ ﷺ نے عصر کے بعد نماز سے روکا ہے حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے کیونکہ غروبِ آفتاب تک نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے اور غروبِ آفتاب کے بعد اجازت ہے سو اس سے مغرب سے پہلے نماز کا جواز نکلتا ہے لیکن اس سے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مغرب کی نماز مقصود ہو۔

فجر کی سنتوں کے علاوہ فرضوں سے پہلے نفل پڑھنا مکروہ ہے

طلوعِ فجر کے بعد فرض نماز سے پہلے فجر کی دو سنتوں کے علاوہ نفل پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ ان دو سنتوں کے علاوہ کسی قسم کی نفل نماز نہ تو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اور نہ ہی صحابہ کرام علیہم الرضوان سے۔

اذان کا بیان

اذان کا حکم

اذان نماز کے لئے شرط نہیں، نفس نماز کے لئے اور نہ ہی اس کی ادائیگی کے لئے لیکن نماز سے پہلے اذان کہنا سنت ہے اور شرط کے مشابہ ہے۔ شرط نہیں البتہ سنت مؤکدہ اور دین اسلام کی علامت ہے۔ حتیٰ کہ کسی شہر کے باسی ترک اذان پر اجماع کر لیں تو امام محمد کے نزدیک ان سے اہل اسلام لڑیں گے اور امام یوسف کے نزدیک باغی شمار کریں گے اور قید کریں گے۔

فتح القدیر میں ہے کہ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ پہلے ان سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اپنے آپ کو حوالے کرو اور توبہ کرو اگر انہوں نے پیش ہونے اور توبہ کرنے سے انکار کر دیا تو ان سے جنگ کی جائے گی اور اس پر دونوں اماموں کا اتفاق ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسی بستی پر حملہ نہیں فرماتے تھے جس سے اذان کی آواز سن لیتے تھے، اگر کسی سے اذان کی آواز نہ آتی تو آپ حملہ کرتے۔

اذان کے کلمات

اذان کے کلمات مشہور و معروف ہیں۔ ہمارے نزدیک اذان میں ترجیع نہیں (ایک بار کلماتِ اذان کو آہستہ کہنا اور دوسری بار بلند آواز سے کہنا)۔

جیسا کہ حدیث مبارک سے ثابت ہے:

عن معاذ بن جبل حدیثا طویلا مشتملا علی حال الصلوۃ والصوم وفیہ فجاء عبد اللہ بن زید رجل من الانصار فقال لما رأیت من اھتمامک رایت رجلا کان علیہ ثوبان

معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے جس میں نماز اور روزے کے متعلق مذکور ہے اس حدیث میں (یہ الفاظ بھی ہیں) کہ عبداللہ بن زید نامی انصاری حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ جب

اخضران فاستقبل القبلة وقال الله اکبر الله اکبر الله اکبر الله اکبر اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان محمدا رسول الله اشهد ان محمدا رسول الله مرتین حی علی الصلوة حی علی الصلوة حی علی الفلاح حی علی الفلاح مرتین الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله ثم امهل هنهنة ثم قال فقال مثلها الا انه زاد بعد ما قال حی علی الفلاح قد قامت الصلوة قد قامت الصلوة قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لقهنا بلالا فاذن بها بلال.

(رواہ سنن ابوداؤد)

میں نے آپ کا اہتمام دیکھا ہے تو میں نے (خواب میں) ایک آدمی دیکھا جس پر دو سبز کپڑے تھے وہ قبلہ رُو ہوا اور یہ کلمات کہے: اللہ اکبر. اللہ اکبر. اللہ اکبر. اللہ اکبر. اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان محمدا رسول الله. اشهد ان محمدا رسول الله. حیی علی الصلوٰة. حیی علی الصلوٰة. حیی علی الفلاح. حیی علی الفلاح. الله اکبر. الله اکبر. لا اله الا الله. پھر وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا اور پھر وہی کلمات کہے جو پہلے کہے تھے مگر حیی علی الفلاح. حییٰ علی الفلاح کے بعد قد قامت الصلوة. قد قامت الصلوة کا اضافہ کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ کلمات بلال کو سکھاؤ۔ پس حضرت بلال نے انہی کلمات کے ساتھ اذان پڑھی۔

عن عبد الله ابن زید قال امر رسول الله صلی الله علیه وسلم بالنا قوس یعمل لیضرب به للناس لجمع الصلوة طاف بی وانا نائم رجل یحمل ناقوسا وفی روایة لابی داؤد من ابی لیلی ولو لا ان یقول الناس لقلت انی یقظان غیر نائم فقلت یا عبد الله ابتیع الناقوس قال وما تصنع به قلت ندعوا به الی الصلوة قال افادلک علی ماهو خیر من ذلک فقلت له بلی قال فقال تقول الله اکبر اه وکذا الا قامة فلما اصبحت اتیت النبی صلی الله علیه وسلم فاخبرته بما رأیت قال انها لرؤیا حق فقم مع بلال فالق مارأیت فلیؤذن فانه اندی صوتا منک فقمت مع بلال فجعلت القی علیه ویؤذن به قال فسمع عمر بن

عبداللہ بن زید سے پورا قصہ یوں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ناقوس بنانے کا حکم دیا تا کہ اسے بجا کر لوگوں کو نماز کے لئے جمع کیا جائے۔ میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی ناقوس اٹھائے ہے۔ ابی یعلیٰ کے حوالہ سے حضرت ابوداؤد کی روایت میں ہے اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ باتیں بنائیں گے تو میں کہتا کہ میں بیدار تھا سویا ہوا نہیں تھا میں نے اس شخص سے کہا: اے بندۂ خدا! کیا ناقوس بیچو گے؟ وہ شخص کہنے لگا۔ اسے کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ اس کے ذریعے لوگوں کو نماز کی طرف بلائیں گے۔ اس نے کہا: کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو اس ناقوس سے بہتر ہو؟ میں نے کہا: ضرور بتایئے۔ کہنے لگا (یوں) کہا کرو۔ الله اکبر اور اسی طرح اس نے اقامت کے الفاظ بھی بتائے۔ جب صبح ہوئی تو میں بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور جو کچھ دیکھا تھا آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ سچا خواب ہے۔ بلال کے ساتھ کھڑے ہو کر جو

الخطاب هو فی بیته فخرج یجر رداء ہ یقول یا رسول الله صلی الله علیه وسلم والذی بعثک بالحق لقد رأیت مثل مارأی عبد الله بن زید فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم فللّٰه الحمد. (رواہ سنن ابوداؤد، دارمی)

دیکھا ہے اسے بتاؤ تا کہ وہ اذان کہے کیونکہ وہ تم تمام سے بلند آواز ہے۔ میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کھڑا ہوا اور یہ کلمات بتاتا گیا اور وہ اذان پڑھتے گئے۔ راوی فرماتے ہیں کہ یہ کلمات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے گھر میں سنے تو اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے (تیزی سے) نکلے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ یا رسول اللہ ﷺ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے میں نے بھی عبداللہ ابن زید کی طرح خواب میں دیکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ ہی کے لئے ہے سب تعریف۔

اذان میں ترجیع

امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک اذان میں ترجیع سنت ہے۔ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

عن ابی محذورة قال قلت یا رسول الله علمنی سنة الاذان قال تقول الله اکبر الله اکبر الله اکبر الله اکبر اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان محمدا رسول الله تخفض بها صوتک ثم ترفع بها صوتک. (رواہ سنن ابوداؤد)

ابی محذورہ سے روایت کردہ حدیث ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے اذان کا طریقہ سکھایئے۔ تو آپ نے فرمایا: یوں کہا کرو: الله اکبر. الله اکبر. الله اکبر. الله اکبر. اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان محمدا رسول الله. اشهد ان محمدا رسول الله. یہ کلمات پہلے آہستہ کہا کرو پھر بلند آواز سے۔

عن ابی محذورة قال علمنی الأذان تسع عشر کلمة والا قامة سبع عشر کلمة.

ابومحذورہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اذان کے انیس کلمات سکھائے اور اقامت کے سترہ کلمات۔

ہمارے مشائخ (حنفی علماء) نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ مشہور مؤذنوں کی اذان میں ترجیع نہیں ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو تمام اذان دینے والوں کے سردار ہیں۔ نہ تو ان کی اذان میں ترجیع ہے اور نہ ابن مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان میں اور نہ ہی مسجد قبا کے مؤذن سعد القرظ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان میں۔ ترجیع صرف ابن محذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان میں ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی یہی فرماتے ہیں۔ ترجیع حضرت ابومحذورہ کا وہم بھی ہوسکتا ہے کیونکہ یہ تعلیم کے لئے تھا جسے انہوں نے ترجیع گمان کیا۔ یہی رائے صاحب ہدایہ کی ہے۔

سنن نسائی میں واقعہ یوں مذکور ہے کہ:

ابامحذورة الا ذان ما روی النسائی قال خرجت فی سفر فکنا ببعض طریق حنین مقفل رسول الله صلی الله علیه وسلم من حنین فلقینا رسول الله صلی الله علیه وسلم فی بعض الطریق. فاذن مؤذن رسول الله صلی الله علیه وسلم بالصلوة عند رسول الله صلی الله علیه وسلم فسمعت صوت المؤذن ونحن عنه مکتبؤن فظلنا نحکیه ونهزاء به فسمع رسول الله صلی الله علیه وسلم فارسل الینا رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی وقفنا بین یدیه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم انکم الذی سمعت صوته قد ارتفع فاستار القوم الی وصدقوا فارسلهم کلهم وحبسنی قال قم فاذن بالصلوة فقمت فالقی علی رسول الله صلی الله علیه وسلم التاذین بنفسه قال قل الله اکبر الله اکبر الله اکبر الله اکبر اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان محمدا رسول الله اشهد ان محمدا رسول الله حی علی الصلوة حی علی الصلوة حی علی الفلاح حی علی الفلاح الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله ثم دعانی حین قضیت التاذین ثم اعطانی صرة فیه شئی من فضة فقلت یا رسول الله مرنی بالتاذین بکمة فقال قد امرتک به فقدمت علی عتاب بن اسید عامل رسول الله صلی الله علیه وسلم فاذنت معه بالصلوة عن امر رسول الله صلی الله علیه وسلم.

ابومحذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک سفر پر نکلا۔ ہم حنین کے ایک راستے پر تھے اور رسول اللہ ﷺ اسی راستہ سے حنین سے واپس آ رہے تھے' ہماری راستہ میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔ حضور ﷺ کے مؤذن نے حضور ﷺ کے قریب کھڑے ہوکر نماز کے لئے اذان کہی تو میں نے مؤذن کی آواز سن لی۔ ہم مسلمانوں سے سخت متنفر تھے لہٰذا ہم استہزاءً ان کی نقل اتارنے لگے۔ حضور ﷺ نے ہماری آواز سنی۔ ہمارے پاس آدمی بھیجا حتیٰ کہ ہم آپ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: تم میں سے وہ بلند آواز کون ہے جس کی میں نے آواز سنی' لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا اور انہوں نے سچ کہا۔ حضور ﷺ نے تمام کو چھوڑ دیا' مجھے پکڑ لیا اور فرمایا: کھڑے ہوکر نماز کے لئے اذان کہو' میں کھڑا ہوا اور اپنی طرف سے حضور ﷺ کے سامنے بلند آواز سے لوگوں کو بلانا شروع کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہو: اللہ اکبر. اللہ اکبر. اللہ اکبر. اللہ اکبر. اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان محمدا رسول الله. اشهد ان محمدا رسول الله. پھر آپ نے فرمایا: دوبارہ کہے اور آواز کو کھینچے۔ پھر فرمایا: اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان محمدا رسول الله. اشهد ان محمدا رسول الله. حیی علی الصلوة. حیی علی الصلوة. حیی علی الفلاح. حیی علی الفلاح. الله اکبر. الله اکبر. لا اله الا الله. جب میں نے اذان مکمل کی تو آپ نے مجھے بلایا اور ایک تھیلی عطا فرمائی جس میں کچھ چاندی تھی۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ مجھے حکم دیجئے کہ میں مکہ میں اذان کہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں اس کا حکم دیا۔ میں عتاب ابن سعید کے پاس آیا جو رسول اللہ ﷺ کے متعین کردہ امیر تھے تو میں نے حضور ﷺ

کے حکم سے ان کے ساتھ نماز کے لئے اذان کہی۔

یہ ہے تعلیم اذان کا پورا واقعہ۔ ہوسکتا ہے جب حضور ﷺ نے انہیں حکم دیا ہو کہ کھڑا ہو جاؤ اور اذان پڑھو تو انہوں نے عرض کیا ہو مجھے اذان کا طریقہ سکھاؤ اور جب شہادتین پر گئے ہوں تو لوگوں سے شرم کی وجہ سے آواز پست ہوگئی ہو اور رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہو کہ بلند آواز سے کہو تا کہ دل میں جو کدورت ہے وہ صاف ہو جائے اور لوگوں پر بھی عیاں ہو جائے کہ ابومحذورہ مؤمن ہیں اور اسی کو ابومحذورہ نے سنت سمجھا ہو اور کہا ہو کہ ترجیع اذان میں شامل ہے۔

پھر ترجیع بھی مختلف الفاظ سے مروی ہے اس لئے حضرت بلال جو رئیس المؤذنین ہیں' کی طرف رجوع ضروری ہے۔

فجر کی اذان

فجر کی اذان میں حیی علی الفلاح. حیی علی الفلاح کے بعد الصلوۃ خیر من النوم دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ ابوداؤد اور نسائی کی روایت سے یہ اضافہ ثابت ہے۔ ابومحذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر فجر کی نماز ہوتی تو میں کہتا۔ الصلوۃ خیر من النوم. الصلوۃ خیر من النوم

ابن ماجہ سعید ابن میتب کے حوالے سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے بیان کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے تا کہ آپ ﷺ فجر کی نماز کے لئے آواز دیں۔ بتایا گیا کہ آپ سوئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے دو مرتبہ الصلوۃ خیر من النوم کہا تو یہ الفاظ اذان کا حصہ بن گئے۔

فتح القدیر میں ہے کہ حضرت سعید ابن میتب کی حضرت بلال سے ملاقات ثابت نہیں لہٰذا یہ حدیث منقطع ہے۔ بہرحال حدیث منقطع ہمارے لئے حجت ہے۔

عن حفص عن بلال انه اتی النبی صلی اللہ علیه وسلم یوذنه بالصبح فوجده راقد فقال الصلوۃ الصلوۃ خیر من النوم مرتین فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم ما احسن هذا یا بلال اجعله فی اذنک. (رواہ طبرانی)

حضرت حفص سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت بلال کے بارے بیان کیا کہ آپ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے تا کہ صبح کی نماز کے لئے اذان کہیں۔ آپ نے حضور ﷺ کو آرام کرتے پایا تو الصلوۃ خیر من النوم کے الفاظ دو مرتبہ کہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے بلال! یہ الفاظ کتنے خوبصورت ہیں' اپنی اذان میں یونہی کہا کرو۔

عن انس قال من السنة اذا قال لمؤذن فی صلوۃ الفجر حی علی الفلاح قال الصلوۃ خیر من النوم مرتین.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فجر کی نماز کے لئے اذان دیتے ہوئے جب مؤذن حیی علی الفلاح کہے تو الصلوۃ خیر من النوم دو بار کہنا سنت ہے۔

اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ روایات فتح القدیر میں مذکور ہیں۔

اذان دیتے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنا

اذان دیتے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنا سنت ہے جیسا کہ حدیث مبارک سے ثابت ہے:

عن سعد مؤذن رسول الله صلى الله عليه وسلم امر بلالا ان يجعل اصبعيه في اذنيه.

حضرت سعد مؤذن رسول ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ کانوں میں انگلیاں ڈالا کریں۔

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ یہ سنت مؤکدہ نہیں کہ جس کے ترک سے گناہ لازم آئے گا' اگر کوئی شخص اذان پڑھتے ہوئے کانوں میں انگلیاں نہیں ڈالتا تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

اقامت

اقامت اذان کی طرح کہی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اقامت میں حیی علی الفلاح کے بعد دو مرتبہ قد قامت الصلوۃ کہا جاتا ہے اور یہ حضرت عبداللہ بن زید سے روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے۔

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گزشتہ حدیث میں مذکور ہے کہ اقامت کے سترہ کلمات ہیں۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بتواتر ثابت ہے کہ آپ اقامت میں ہر کلمہ دو مرتبہ کہتے تھے حتیٰ کہ آپ کا انتقال ہوگیا۔ ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ اقامت اذان کی طرح ہے مگر بادشاہوں نے اسے الگ الگ کلمہ بنادیا ہے۔ امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اذان اور اقامت کے الفاظ دو دو تھے مگر بنوامیہ کے دور میں اقامت میں ایک کلمہ کو رواج دیا گیا۔ فتح القدیر میں بھی یہی مذکور ہے۔

آئمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ اقامت میں ہر ایک کلمہ اکیلا اکیلا پڑھا جاتا ہے۔ اس کی دلیل حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ وہ اذان کے کلمات جفت پڑھا کریں اور اقامت کے کلمات طاق۔

اسماعیل بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ میں نے اس بات کا تذکرہ ایوب سے کیا تو انہوں نے فرمایا سوائے اقامت کے۔ اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔

صاحب فتح القدیر نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ طاق کا اطلاق کبھی آواز کے طاق ہونے پر بھی ہوتا ہے۔ ہم نے جو حدیث ذکر کی وہ نص مفسر ہے لہٰذا یہ حدیث آواز کے طاق ہونے پر بھی محمول ہوسکتی ہے لیکن اس گفتگو سے بھی پوری طرح اطمینان حاصل نہیں ہوتا کیونکہ عبداللہ بن زید کی بعض روایات میں تکبیر کو چھوڑ کر اقامت کے الفاظ ایک بار کہنے کا تذکرہ ہے جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث ہے لہٰذا یہ جواب کافی نہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن زید کی روایات میں باہم اختلاف ہے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اذان کی طرح اقامت کہنا قوی دلائل سے ثابت ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اقامت کے الفاظ کا ایک ایک بار کہنا بعض راویوں کا وہم ہے۔

اذان کے آداب

۱۔ اذان کے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر کہے جاتے ہیں جبکہ اقامت میں جلدی کی جاتی ہے۔ ٹھہر کر سے مراد یہ ہے کہ اذان کے کلمات میں وقفہ کیا جاتا ہے جیسا کہ:

عن جابر انه علیه السلام قال لبلال اذا اذنت فترسل فی اذانک واذا اقمت فاحدر. (رواہ جامع الترمذی)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ اذان کہو تو کلمات کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کرو اور اقامت کہو تو کلمات کو جلدی جلدی ادا کرو۔

مؤذن کو چاہئے کہ قبلہ رو ہو کر اذان کہے کیونکہ عبداللہ بن زید نے خواب میں فرشتے کو قبلہ رو ہو کر اذان پڑھتے دیکھا اور اسی پر تواتر سے عمل ہو رہا ہے' اگر کسی نے قبلہ کی طرف منہ کر کے اذان نہ پڑھی تو سنت کی مخالفت کی وجہ سے مکروہ کا مرتکب ہوگا۔

۲۔ حیی علی الصلوٰۃ پر دائیں طرف گردن پھیرنا اور حیی علی الفلاح پر بائیں طرف سنت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

عن جحیفة اتیت النبی صلی اللہ علیه وسلم مخرج بلال فاذن فجعل یقول فی اذا نه هکذا ینحرف یمینا وشمالا. (رواہ سنن نسائی)

حضرت جحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا' حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ باہر تشریف لے گئے۔ اذان پڑھی اور اذان میں ایسا (حیی علی الصلوٰۃ حیی علی الفلاح) کہتے ہوئے دائیں اور بائیں منہ پھیرا۔

اگر اذان کے خاص کمرے میں اذان پڑھی جا رہی ہو اور کسی وجہ سے دائیں بائیں گردن پھیرنا ممکن نہ ہو تو خود پھر جائے تاکہ سنت پر عمل رہ نہ جائے۔

۳۔ وقت سے پہلے اذان نہ پڑھے کیونکہ اذان آگاہ کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ وقت سے پہلے نماز کے فرض نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت ہی نہیں۔

عن بلال ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال لاتؤذن حتی لتبین لک الفجر کذا ومد به عرضا.

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اذان نہ کہئے حتیٰ کہ آپ کے لئے فجر اس طرح واضح ہو جائے۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو عرض میں پھیرا۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

عن ابن عمر ان بلال اذن قبل طلوع الفجر فامره النبی صلی اللہ علیه وسلم ان ینادی الا ان العبد قدنام.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فجر طلوع ہونے سے پہلے اذان پڑھ دی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ

آواز دیں کہ سنو (لوگو!) یہ بندہ سو گیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آخری نصف یا تہائی رات کے بعد طلوع فجر سے پہلے فجر کی اذان کہنا جائز ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔

اس ضمن میں ترمذی کی ایک حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔

عن سمرة ابن جندب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لايمتعكم من سحور كم اذان بلال و لا الفجر المستطيل ولكن الفجر الستطير في الافق.

حضرت سمرہ ابن جندب سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: بلال کی اذان تمہیں سحری سے نہ روکے اور نہ ہی لمبائی میں نمودار ہونے والی روشنی بلکہ افق پر چھا جانے والی فجر (کا اجالا ظاہر ہو تو رک جایا کرو)۔

لیکن یہ حدیث دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہ اذان نماز کے لئے نہیں بلکہ سحری کے وقت سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے دی جاتی تھی اسی لئے یہ اذان صرف ماہ رمضان میں ہوتی اسی لئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ اذان لوگوں کو سحری کے لئے جگانے کے لئے دی جاتی تھی اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلال کی اذان تمہیں سحری سے نہ روکے۔

ایک توجیہہ یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ رمضان شریف میں رات کی نماز (تہجد) کے لئے دی جاتی تھی تاکہ لوگ اس اذان کو سن کر عبادت میں مشغول ہوں۔

اگر اذان وقت سے پہلے پڑھ دی گئی تو اعادہ کرنا پڑے گا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کے دورِ خلافت میں مؤذن نے وقت سے پہلے اذان پڑھ دی تو آپ نے حکم دیا کہ اذان دوبارہ پڑھی جائے۔ امام ابوداؤد ایسی ہی ایک حدیث روایت کرتے ہیں۔

تثویب

صرف فجر کی نماز میں تثویب اچھا عمل ہے۔ تمام نمازوں میں نہیں۔ اس کی دلیل حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث ہے۔

عن بلال قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لاتثويب في شئي من الصلوات الا في صلوة الفجر.

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فجر کی نماز کے علاوہ دوسری کسی نماز میں تثویب نہیں۔

اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ تثویب یہ ہے کہ مؤذن یہ الفاظ کہے: **الصلوة جامعة** (لوگو! نماز ہونے والی ہے) یہ درحقیقت اذان کے بعد دوبارہ نماز کے لئے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے اس لئے اعلام کے لئے دوسرے معروف الفاظ سے بھی تثویب ہو سکتی ہے۔

متاخرین کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ تمام نمازوں کے لئے تثویب کی جائے کیونکہ لوگ دین کے معاملے میں بہت سست ہو گئے ہیں۔

مؤذن، اذان اور اقامت کے درمیان بیٹھ جائے (یعنی اذان اور اقامت کے درمیان وقفہ ضروری ہے) لیکن مغرب کی نماز کے لئے نہ بیٹھے کیونکہ مغرب میں تاخیر ہوگی۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے بیٹھے جتنا امام دو خطبوں کے درمیان بیٹھتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کوئی بھی نماز ہو اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعتوں کا وقفہ ضروری ہے کیونکہ عبداللہ بن معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ دونوں اذانوں (اذان اور اقامت) کے درمیان نماز ہے، دونوں اذانوں کے درمیان نماز ہے۔ تیسری بار آپ نے ''جس کا جی چاہے'' کے الفاظ کا اضافہ فرمایا۔

ہدایہ میں ہے کہ یعقوب فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ کو مغرب کی اذان کہتے دیکھا اور قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ اذان کے بعد نہیں بیٹھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مؤذن کا امامت کرانا صحیح ہے۔ ایک ہی شخص اذان اور امامت کی خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔

۴- مؤذن کو چاہئے کہ وہ اذان سے پہلے کامل طہارت کرے

عن ابی هريرة لاينادى بالصلوٰة الامتوضی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نماز کے لئے صرف باوضو شخص بلائے (یعنی اذان پڑھے)۔

اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے۔ مرفوع روایت میں ''نہ اذان کہے مگر باوضو ہو کر'' کے الفاظ ہیں۔ امام ترمذی فرماتے ہیں پہلی حدیث زیادہ صحیح ہے (یعنی مرفوع نہیں ہے)۔

اگر کسی نے بے وضو اذان کہہ دی تو اذان ہو جائے گی کیونکہ اذان ذکر ہے اور قرأت کی طرح اس کے لئے وضو شرط نہیں۔ بے وضو اقامت مکروہ ہے کیونکہ اس سے اقامت اور نماز کے درمیان وقفہ لازم آئے گا۔

حالتِ جنابت میں اذان دینا مکروہ ہے۔ (مسجد میں داخل ہونا حرام ہے) حالتِ حدث (بے وضو) میں اذان دینے کے بارے دو روایتیں ہیں کیونکہ اذان اگرچہ ذکر ہے لیکن نماز سے قدرے مشابہت رکھتی ہے اسی لئے حدث (بے وضو ہونا) کی تو متحمل ہو سکتی ہے کیونکہ یہ پلیدی کی خفیف صورت ہے لیکن جنابت (بے غسل ہونا) کی متحمل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں زیادہ غلاظت ہوتی ہے اسی لئے جنابت کی حالت میں اذان کہنا مکروہ ہے۔

اگر جنبی آدمی اذان پڑھے

صحیح ترین روایت یہ ہے کہ اگر جنبی نے اذان کہہ دی تو اذان دوبارہ پڑھی جائے گی لیکن بے وضو پڑھی تو دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی۔ اقامت کسی صورت میں دوبارہ نہیں کہی جائے گی کیونکہ اقامت میں تکرار جائز نہیں۔

عورت نے اذان پڑھی تو وہ لغو ہے اس کا اعادہ ضروری ہے کیونکہ عورت کا آواز بلند کرنا جائز نہیں۔ ہے جیسا کہ ستر کے بیان میں آپ پڑھ آئے ہیں۔

۵- اذان کی خدمت میں اجرت لینا مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ حدیث میں موجود ہے:

عن عثمان بن ابی العاص قال ان اخرما

حضرت عثمان بن ابی العاص سے روایت ہے۔ فرماتے

عهد الی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان اتخذت مؤذنا فلا تاخذ علی الاذان اجرا. (رواه الترمذی)

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے جو آخری وعدہ لیا وہ یہ تھا کہ میں اذان دیا کروں گا اور اس پر اجرت نہیں لوں گا۔

۶- مؤذن کا عالم ہونا اور متقی ہونا مستحب ہے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ولیؤذن خیارکم ولیؤمکم اقرئکم.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے بہترین لوگ اذان کہیں اور بہترین قاری امامت کرائیں۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

۷- مؤذن اور اقامت کہنے والا ایک ہونا چاہئے۔

روی زید بن الحارث الصدائی قال امر نی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان اؤذن فی صلوة الفجر فاذنت فاراد بلال ان یقیم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان افاصداء قد اذن ومن اذن فهو یقیم.

زید بن حارث صدائی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ فجر کی نماز کے لئے اذان کہوں۔ میں نے اذان کہی اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اقامت کہنے کا ارادہ کیا تو رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ صدائی نے اذان پڑھی ہے اور جس نے اذان پڑھی ہے وہی اقامت کہے گا۔

اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔

مسافر نماز کے لئے اذان اور اقامت دونوں کہے

مسافر اذان اور اقامت کہے جیسا کہ حدیث مبارک سے ثابت ہے۔

عن مالک بن الحویرث قال اتیت رسول الله صلی الله علیه وسلم وصاحب لی فلما اردنا الانتقال من عنده قال لنا اذا حضرت الصلوة فاذنا واقیما ولیؤمکما اکبر. (رواه البخاری ومسلم)

مالک بن حویرث سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ میرے ساتھ ایک دوسرا شخص بھی تھا۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان کہنا اور اقامت کہنا اور تم دونوں میں سے جو بڑا ہے وہ امامت کرائے۔

اگر مسافر صرف اقامت پر اکتفا کرے تو بھی جائز ہے کیونکہ اذان ان لوگوں کو حاضر کرنے کے لئے کہی جاتی ہے جو موجود نہیں ہوتے تا کہ وہ نماز میں شریک ہو جائیں جبکہ اقامت وہاں پر موجود لوگوں کو جماعت میں شریک کرنے کے لئے پڑھی جاتی ہے اس لئے سفر میں اقامت کی ضرورت ہے۔ اس پر حضرت ابن عمر کا ایک اثر بھی ہے۔

فقد روی نافع ان ابن عمر کان لایزید علی الاقامة فی السفر الا فی الصبح فانه

نافع سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سفر میں صرف اقامت کہتے سوائے فجر کی نماز کے۔ فجر کی

كان ينادي فيها ويقوم و كان يقول للامام الذي يجتمع اليه الناس. (رواہ مالک)

نماز کے لئے اذان بھی پڑھتے اور اقامت بھی کہتے اور اس امام کو اس بات کا حکم بھی دیتے جس کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے لوگ جمع ہوتے تھے۔

کیا گھر میں نماز پڑھنے کیلئے اذان اور اقامت ضروری ہیں؟

اگر کوئی شخص گھر میں نماز ادا کرے تو وہ اذان اور اقامت کہے تا کہ اس کی نماز جماعت کی ہیئت پر ہو' اگر گھر میں کسی نے اذان اور اقامت کے بغیر نماز پڑھی تو بھی جائز ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ حضرت ابن مسعود فرمایا کرتے تھے: محلّہ کی اذان ہمارے لئے کافی ہے' یہ تنہا نماز پڑھنے کی صورت میں ہے' اگر گھر میں باجماعت نماز پڑھی تو اذان اور اقامت ضروری ہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ امام ابو یوسف' حضرت امام ابوحنیفہ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ شہر کے اندر کسی گھر میں نماز ادا کریں اور محلّہ میں ہونے والی اذان پر اکتفا کریں تو صحیح ہے لیکن اس صورت میں گناہ گار ہوں گے۔

اذان کا جواب دینا

اذان سننے والے پر اذان کا جواب واجب ہے۔ مؤذن کے ساتھ اذان کے الفاظ دہراتا جائے۔ جب مؤذن حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کہے تو ایک روایت کے مطابق یہی الفاظ دہرائے اور ایک روایت کے مطابق لا حول ولا قوة الا بالله کہے۔

فعن عبد الله بن عمرو بن العاص قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما قال ثم صلوا على صلوة صلى الله عليه عشرا ثم سلوا الله بي الوسيلة فانها منزلة في الجنة لاينبغي الا لعبد من عباد الله وارجوا ان اكون انا هو فمن سأل بي الوسيلة حلت عليه الشفاعة. (رواہ مسلم)

عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم مؤذن کی آواز سنو تو اسی طرح کہو جس طرح وہ کہہ رہا ہے پھر مجھ پر درود پڑھو۔ جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت نازل فرمائے گا۔ پھر میرے لئے بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ کا سوال کرو۔ وسیلہ جنت میں ایک مقام ہے جو اس کے کسی خاص بندے کے لئے مقدر ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ خاص بندہ میں ہوں سو جس نے میرے لئے وسیلہ کی دعا کی اس کے لئے میری شفاعت حلال ہوگئی۔

عن امير المؤمنين عمر رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قال المؤذن الله اكبر فقال احدكم الله اكبر ثم قال اشهد ان لا اله الا الله قال

امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جب مؤذن اللہ اکبر کہے اور تم میں سے کوئی شخص اللہ اکبر کہے پھر مؤذن اشھد ان لا الہ الا اللہ کہے تو وہ بھی اشھد ان لا

اشھد ان لا الــه الا الـلــه ثم قـال اشھد ان مـحـمـدا رسـول الله قال اشھد ان محمدا رسول الله ثم قال حی علی الصلوۃ قال حی علی الصلوۃ قال لا حول ولا قوۃ الا باللہ ثم قال حی علی الفلاح قال لاحول ولا قوۃ الا باللہ ثم قال الله اکبر الله اکبر قال الله اکبر الـلـه اکبر ثم قال لا اله الا الله قال لا اله الا الله من قلبه دخل الجنة. (رواہ مسلم)

اله الا الله کہے۔ مؤذن اشھد ان محمدا رسول الله کہے تو وہ بھی اشھـد ان مـحـمـدا رسول الله کہے۔ پھر مؤذن حیی علی الصلوۃ کہے تو وہ لاحول ولا قوۃ الا بـالـلـه کہے۔ پھر مؤذن حیی عـلـی الفلاح کہے تو وہ لا حـول ولا قوۃ الا باللہ کہے۔ پھر مؤذن الـلـه اکبر الله اکبر کہے تو وہ بھی الله اکبر الله اکبر کہے۔ پھر مؤذن لا الـه الا الله کہے اور وہ اپنے دل سے لا الـه الا الله کہے تو وہ ضرور جنت میں جائے گا۔

اس حدیث سے بعض لوگوں کے دل میں یہ گمان پیدا ہوا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ حیـی عـلـی الـصلوۃ اور حیی علی الفلاح کے علاوہ باقی الفاظِ اذان دہرائے جائیں اور حیـی عـلـی الصلوۃ اور حیی عـلـی الفلاح پر لا حول ولا قو ۃ الا بـالـلـه کہا جائے گا کیونکہ یہ حدیث خاص ہے اور مفسر ہے لہٰذا حیعلتین کو دہرانا صحیح نہیں ہے۔

شیخ ابن ہمام اس کا رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اصول اس کی تائید نہیں کرتے کیونکہ خاص جب عام کا معارض ہو اور تاریخ کا پتہ نہ ہو تو خاص عام کا مخصص نہیں ہوتا۔

اس پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قولوا مثل ما قال کی حدیث وجوب کا فائدہ دیتی ہے جبکہ یہ حدیث وجوب کا فائدہ نہیں دیتی بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ استحباب ثابت ہوتا ہے اور جب ایک نص وجوب کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری حدیث استحباب کا تقاضا کرتی ہو تو اس نص پر عمل کیا جائے گا جس سے وجوب ثابت ہو رہا ہو۔ اس اعتبار سے بھی حدیث قولوا مثل ما قال رائج ہوگی اور اس پر عمل ہوگا۔

بعض لوگ احتیاطاً دونوں کلمات یعنی حیی علی الصلوۃ اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ کو جمع کرتے ہیں اور بعض واجب اور مستحب کو جمع کرتے ہیں (یعنی حیـی عـلـی الصلوۃ کہنا واجب ہے اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہنا مستحب ہے)۔

سقوط کا حکم

جو شخص مسجد میں ہے اس سے اذان کا جواب ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اذان سے پہلے مسجد میں حاضر ہے اور اذان ان لوگوں کے لئے ہے جو غائب ہیں۔ مسجد میں موجود لوگوں کے لئے نہیں' اگر کوئی شخص اذان سے پہلے نماز پڑھ چکا ہے تو اس کے لئے بھی جواب دینا ضروری نہیں ہے کیونکہ اذان کے ذریعے اسے نہیں بلایا جا رہا' اگر کوئی شخص تلاوتِ کلام مجید میں مشغول ہے تو اس بارے دو قول ہیں۔ قرین احتیاط یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت موقوف کر دے اور اذان کا جواب دے۔

نماز پڑھنے کے طریقے کا بیان

سب سے پہلے ہم ایک مقدمہ بیان کریں گے جسے حنفی قواعد شرعیہ کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔

شرائط اور فرائض

نماز ہو یا دوسری عبادات' شارع علیہ السلام کے نزدیک ان کی ایک حقیقت ہے اور اس کے وجود کا اعتبار ہوتا ہے۔ نماز کے ارکان اس کے وجود اور قوام میں داخل ہیں۔ کسی ایک رکن کے نہ پائے جانے کی وجہ سے پوری حقیقت کا وجود ختم ہو جاتا ہے ان حقائق کے نام ہیں اور ان کو نام دینے کے لئے لغوی الفاظ کو استعارۃً استعمال کیا گیا ہے جو اب عرفِ شرعی میں ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کا وجود ان چیزوں پر موقوف ہے' اگر ان میں سے ایک بھی فوت ہو جائے تو اس حقیقت کا وجود باطل ہو جاتا ہے اور وہ امکان کی حد سے نکل جاتی ہے حتیٰ کہ ان اشیاء کے بغیر حقیقت کا کوئی فرد عالم محسوسات میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس حقیقت پر ثواب مرتب ہوتا ہے اسی لئے اس کو خارج میں لانے کا حکم ہے اور اگر کوئی اس کو خارج میں نہیں لائے گا تو وہ عقاب کا مستحق ہوگا پہلے کو حنفی اصطلاحات کے مطابق داخلی فرض کہتے ہیں اور دوسرے کو شرائط اور خارجی فرائض کہتے ہیں اور عموماً ارکان اور شرائط کو فرائض کا نام دیا جاتا ہے۔

واجبات

ان فرائض کے علاوہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو نماز کی حقیقت میں شامل نہیں اور نہ ہی ان پر نماز کا وجود موقوف ہے البتہ وہ نماز کو کامل کرتی ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے سے ثواب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان مکملات کی ہے کہ اگر انہیں ترک کر دیا جائے تو ان کے ترک کی وجہ سے تارک عقاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ عقاب اس حقیقت کے ترک کرنے پر نہیں ہوتا بلکہ اس حقیقت کو عملی جامہ پہنانے پر تو ثواب ہو رہا ہوتا ہے اور فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ ان مکملات کو اس حقیقت کے ذریعے ہی معرضِ وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ سو یہ حقیقت ان مکملات کے لئے شرط ہے نہ کہ یہ اس حقیقت کے لئے شرط ہوتے ہیں۔ ان مکملات کو واجبات کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے فوت ہو جانے سے یہ حقیقت فوت نہیں ہوتی بلکہ اس حقیقت کا کمال فوت ہوتا ہے۔

سنن

دوسری قسم ایسے مکملات کی ہے کہ ان کے ساتھ اگر اس حقیقت کو عملی جامہ پہنایا جائے تو ثواب زیادہ ہو جاتا ہے بنسبت ان کے بغیر حقیقت کو عملی جامہ پہنانے کے اور ان پر عمل پیرا ہو کر اللہ تعالیٰ کا قرب خاص حاصل ہوتا ہے اور یہ عمل شفاعت اور آخری حساب کا موجب بنتا ہے۔ ان مکملات کے ترک سے گناہ ہوتا ہے لیکن آگ کا عذاب نہیں ہوتا اور قرب خاص اور بلند درجات کے حصول سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔ انہیں سنن کہا جاتا ہے۔

مستحبات

تیسری قسم ایسے مکملات کی ہے جن کے ترک پر نہ گناہ ہوتا ہے نہ عذاب بلکہ ثواب کم ہوتا ہے اور ادائیگی کی صورت میں ثواب میں اضافہ ہوتا ہے انہیں مندوبات اور مستحبات کہتے ہیں۔ انہیں سنن زوائد کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

فرائض و مکملات میں فرق کی صورت

یہ شرعی حقیقت (یعنی نماز) فرائض یعنی شرائط اور ارکان و مکملات یعنی واجب، سنت اور مستحب کے مجموعہ سے عبارت ہے۔ اس کا علم شارع علیہ السلام کے بیان سے ہوتا ہے اور یہ نماز سے تعلق رکھنے والی حقیقت کی طرح ہے جس کی شرائط اور ارکان ہیں جنہیں فرائض اور مکملات یعنی واجب سنت اور مستحب کہتے ہیں۔ نماز ان تمام کے مجموعے کا نام ہے اور ان کو رسول اللہ ﷺ نے بدرجہ اتم بیان فرمایا ہے اور بیان کا قطعی ہونا ضروری نہیں ہے جیسا کہ علم اصول کی کتب میں مذکور ہے۔ بیان کبھی قرآن کریم کی آیت ہوتی ہے جو کسی خاص چیز کی وضاحت کرتی ہے، کبھی حدیث قولی ہوتی ہے جو دوسرے بعض کے لئے بیان ہوتی ہے، کبھی سنتِ فعلی ہوتی ہے جس میں کوئی ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کا تعلق بیان سے ہے۔ وہ چیز جس کے بارے حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہو کہ حقیقتِ نماز اس کے بغیر نہیں پائی جاسکتی تو وہ شرط ہے، اگر یہ بیان فرمایا ہو کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ حقیقت نماز میں داخل ہے تو وہ رکن ہے خواہ یہ بیان قطعی الثبوت ہو یعنی آیت قرآنی ہو، حدیث متواتر ہو یا حدیث مشہور ہو یا یہ بیان ظنی الثبوت ہو مثلاً قطعی الدلالت خبر واحد جیسے نص مفسر یا وہ ظنی الدلالت ہو۔ نماز میں اگر کوئی ایسا حکم پایا جائے لیکن یہ بیان نہ کیا گیا ہو کہ اس کے فوت ہونے سے نماز فوت ہو جاتی ہے اور نہ ہی کوئی قرینہ ہو جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ رکن ہے یا شرط تو ایسے امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے خواہ وہ امر منقول ہو خبر واحد سے یا متواتر سے۔ پھر قرآن ہو یا حدیث۔ فرض اور واجب میں فرق کی بنیاد یہی چیز ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ نہ کہ وہ جو فتح القدیر کی ظاہری عبارت سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ فرض اور واجب میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں جو متواتر سے ثابت ہو رکن ہو یا شرط وہ فرض ہے اور جو اخبار احاد سے ثابت ہو اگر وہ دخول پر دال ہے تو واجب ہے۔ فرض اور واجب میں یہ تفریق ہمارے نزدیک ہے کیونکہ قطعیت اور ظنیت ہمارے نزدیک ہے۔ خدائے علیم وخبیر کے نزدیک یہ تقسیم کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ رائے صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بات تو تمام مسالک کے نزدیک مسلم ہے کہ مجمل کا بیان کبھی ظنی بھی ہوتا ہے۔

یہ خیال ہرگز نہ کیجئے کہ ہمارے نزدیک دو نمازیں ہیں۔ ایک کے ارکان قطعی ہیں اور ایک کے ارکان ظنی۔ جب فرائض ادا ہو جاتے ہیں تو پہلی نماز ساقط ہو جاتی ہے لیکن دوسری نماز باقی رہتی ہے کیونکہ ہم صرف اس نماز کے مکلف ہیں جو ارکان پر مشتمل ہوتی ہے اور ارکان شارع علیہ السلام کے ایسے بیان سے ثابت ہوتے ہیں جو رکنیت کا درجہ رکھتا ہے جبکہ واجبات صرف صیغہ امر سے ثابت ہوتے ہیں اور اس بارے ایسا بیان نہیں ہوتا جو انہیں رکن بنا دے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان کو ترک کر دیا جائے تو نماز کی ادائیگی درست ہو اور نماز بجا لانے کا حکم پورا ہو

جائے اور ان کے ترک پر آدمی گناہ گار ہو لہٰذا شارع علیہ السلام کی نظر میں بھی ارکان اور واجبات میں تفریق تھی۔

اس کے بعد دوسرے امور آتے ہیں جو نماز میں زیادہ ثواب کا سبب بنتے ہیں۔ ان امور میں سے اگر کسی پر مواظبت پائی جائے تو وہ سنت ہے اور اگر مواظبت نہ ہو بلکہ ایک بار یا چند مرتبہ کیا ہو یا ایسا قول ہو اس بارے جو زیادہ ثواب پر دلالت کرتا ہو تو اسے مندوب اور مستحب کہتے ہیں۔

شوافع کی غلطی

شوافع جب واجب مکملات کو نہ پا سکے تو انہوں نے ارکان جن کے رہ جانے سے نماز نہیں ہوتی اور واجبات جن کے رہ جانے سے نماز ہو جاتی ہے کے درمیان کوئی تفریق نہ کر سکے اور دونوں کو ارکان بنا دیا۔ وہ اس بات سے بھی ناواقف رہے کہ امر وجوب کا فائدہ دیتا ہے اور یہ واجب کبھی شرط ہوتا ہے اور کبھی رکن کہ اگر یہ رہ جائے تو نماز نہیں ہوتی۔ ان کے پاس امر زائد کی کوئی دلیل نہیں۔ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جس حکم کے بارے کوئی دلیل نہ ہو وہ حکم اٹھ جاتا ہے۔

ہمارے اور شوافع کے درمیان یہی اختلاف ہے۔ اس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علماء احناف کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر دقت نظر عطا فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور انہیں حقیقتوں کو سمجھنے کی توفیق بخشے۔

نماز کے فرائض کا بیان

۱۔ تکبیر تحریمہ

اس کی فرضیت قرآن کریم کی اس آیت سے ثابت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ وربک فکبر. جب تکبیر تحریمہ نماز میں داخل ہونے کا موجب ہے تو یہ فرض ہوئی جیسا کہ حدیث سے ظاہر ہے:

عن امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجھہ وجوہ الہ الکرام قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفتاح الصلوۃ الطھور وتحریمھا التکبیر وتحلیلھا التسلیم.

حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: طہارت نماز کی چابی ہے، تکبیر اس میں داخل ہونے کا موجب ہے اور سلام اس سے نکلنے کا ذریعہ ہے۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی)

حنفی مشائخ کی رائے یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ نماز سے باہر ہے اور نماز کے لئے شرط ہے۔ رکن نہیں۔ ہدایہ میں اس کی دلیل رب قدوس کا ارشاد "وذکر اسم ربہ فصلی" ہے۔ اس آیت میں نماز (صلی) کا عطف اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر (ذکر اسم ربہ) پر ہے اور عطف میں اصل یہ ہے کہ معطوف علیہ معطوف کے حکم سے خارج ہوتا ہے، اگرچہ کبھی دونوں ایک ہی حکم کے تحت آتے ہیں لیکن اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اصل بغیر دلیل کے ترک نہیں ہو سکتا۔

بعض مشائخ مثلاً طحاوی اور امام شافعی کے نزدیک تکبیر تحریمہ رکن ہے کیونکہ اس کے لئے وہی شرائط ہیں جو نماز کے لئے ہیں۔ ہدایہ میں ہے کہ تکبیر تحریمہ مابعد عبادت کے لئے شرط ہے اور یہ تکبیر نماز ہے حالانکہ شرائط کا اشتراک رکنیت کا موجب نہیں بنتا۔

تفرع مسائل

اگر اس کو شرط قرار دیں تو کئی مسائل سامنے آتے ہیں مثلاً دونوں فرضوں کے لئے تکبیر تحریمہ کہی تو نفل کی ادائیگی صحیح ہو جائے گی اور نفل کے لئے تکبیر تحریمہ کہی گئی تو ان کے علاوہ دوسرے نوافل کی ادائیگی صحیح ہو گی۔

فتح القدیر میں اس پر یہ اعتراض وارد کیا گیا ہے کہ اس طرح تو ایک فرض کے لئے کہی گئی تکبیر تحریمہ کے ساتھ دوسرا فرض ادا ہو جائے گا حالانکہ ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہو سکتا صرف وہی فرض ادا ہو گا جس کے لئے تکبیر تحریمہ کہی جائے گی۔

پھر اس سے یہ مسائل بھی سامنے آتے ہیں کہ اگر یہ صحیح ہے تو لازم آتا ہے کہ رکنیت کے قائلین ان فروعات کے بارے بات نہ کریں حالانکہ ہمارے مشائخ کے درمیان ان فروعات میں کوئی اختلاف نہیں۔ پھر ان فروعات کی وجہ بھی ظاہر نہیں ہے کیونکہ یہ رکن فرض اور نفل میں مشترک ہے اور نفل ایسی نماز ہے جس میں کافی وسعت ہے لیکن فرض ایک ایسی نماز ہے جس کے لئے مستقل نیت اور مستقل رکن کی ضرورت ہے۔

تکبیر تحریمہ کے الفاظ

تکبیر تحریمہ کے لئے کوئی خاص لفظ استعمال کرنا ضروری نہیں، کوئی بھی لفظ تکبیر تحریمہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً الله اجل. الرحمن اکبر. یا فارسی کا کوئی لفظ مثلاً خدا بزرگ است (یا کسی بھی عجمی زبان کا لفظ مثلاً اللہ سب سے بڑا ہے)

طرفین کے نزدیک کوئی بھی لفظ تکبیر کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن امام یوسف کے نزدیک صرف الله اکبر نکرہ یا معرفہ استعمال ہو سکتا ہے۔ (یعنی الله اکبر یا الله الاکبر) یا الله الکبیر. ان کے علاوہ اور کوئی لفظ تکبیر میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں تکبیر صرف الله اکبر یا الله الاکبر کے الفاظ سے کہی جا سکتی ہے۔ امام مالک کے نزدیک الله اکبر کے علاوہ کسی اور لفظ کا استعمال جائز نہیں کیونکہ یہ عہد نبوی سے برابر استعمال ہو رہا ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ لفظ الله الاکبر (معرف باللام) کے معنی میں زیادہ تعظیم ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں الکبیر اور اکبر کا مفہوم ایک ہی ہے۔ دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں۔ کبیر سے مراد بھی سب سے بڑا ہے اور اکبر سے مراد بھی یہی ہے۔ امام شافعی اور امام یوسف فرماتے ہیں کہ وربک فکبر کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی بیان کیجئے اس لئے ہر وہ لفظ جو الله اکبر کے معنی میں ہے اس کا استعمال جائز ہے لیکن جس نے اس لفظ کے علاوہ کسی اور لفظ کو مشروع قرار دیا وہ گناہ کا مرتکب ہو گا کیونکہ اس نے صدیوں سے جاری سنت کی مخالفت کی۔

کسی ایسے لفظ کے ساتھ جو اللہ اکبر کے معنی میں ہو۔ امام ابو یوسف اور امام شافعی کے نزدیک نماز شروع کرنا صحیح ہے بشرطیکہ وہ اسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہو اور اس کا استعمال غیر اللہ کے لئے جائز نہ ہو۔ یہ تصریح امام فضیلی کی ہے۔

اگر لفظ اکبر کو پہلے اور اللہ کو بعد میں ذکر کیا گیا تو جائز نہیں ہوگا اور نماز شروع نہیں ہوگی کیونکہ ایسی صورت میں تعظیم کے لئے یہ لفظ خاص ہو جاتا ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ کے کئی دوسرے اسماء بھی تعظیم پر دلالت کرتے ہیں۔ اسے خاص کرنے سے یہ تاثر ابھرے گا گویا باقی صفاتی نام عظمت کو بیان نہیں کرتے)۔

۲- قیام

دوسرا فرض قیام ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔

۳- قرأت

تیسرا فرض قرأت ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی سے ظاہر ہے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ. یہ آیت نماز میں طویل قیام اور طویل قرأت کی ناسخ ہے۔ قرأت رکن ہے اور عذر کی صورت میں ساقط ہو جاتا ہے مثلاً ایک شخص ان پڑھ ہے جو صحیح طریقہ سے تلاوت نہیں کر سکتا یا گونگا ہے جو کچھ بول نہیں سکتا تو وہ قیام میں خاموش رہے گا، اگر ان پڑھ عجمی، فارسی یا دوسری مادری زبان میں پڑھ سکتا ہے تو اپنی مادری زبان میں قرأت کر سکتا ہے کیونکہ اس طرح قرآن کا معنی ادا ہو جاتا ہے اور عذر اتنا ہے کہ لفظ کی تلاوت ساقط ہے لیکن معنی کی تلاوت ساقط نہیں کیونکہ وہ معنی ادا کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

بعض ثقہ لوگوں سے میں نے یہ بات سنی ہے کہ حضرت شیخ حبیب عجمی جو طریقت کے امام اور ایک معروف عارف کامل گزرے ہیں نماز میں تلاوت فارسی زبان میں کرتے تھے کیونکہ عجمی ہونے کی وجہ سے قرآن کریم کی صحیح تلفظ کے ساتھ قرأت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت شیخ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حبیب کو مغرب کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ قرأت اچھی طرح نہیں کر رہے تھے۔ آپ نے حضرت شیخ حبیب رحمۃ اللہ علیہ کی اقتداء میں نماز نہ پڑھی کہ قرأت میں غلطی کرتے ہیں۔

حضرت حسن بصری کو خواب میں رب العزت کی زیارت ہوئی عرض کیا بار الٰہ تیرے قرب کا ذریعہ کیا ہے؟ رب العزت نے فرمایا: وہ موقعہ تم نے ضائع کر دیا، اگر حبیب عجمی کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تو تمہیں میرا قرب حاصل ہو جاتا۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز میں قرأت کسی بھی زبان میں ہو سکتی ہے لیکن ایسا کرنا گناہ ہے۔ گویا امام ابوحنیفہ کے نزدیک عربی میں قرأت لازم نہیں ہے۔ صاحبین کے نزدیک تلاوت صرف عربی میں ہو سکتی ہے۔ آئمہ ثلاثہ امام مالک، امام ابن حنبل اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک کسی اور زبان میں تلاوت جائز نہیں اور یہ رکن صرف عربی نظم کی صورت میں ادا ہوگا کیونکہ رب قدوس کا ارشاد ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لہٰذا قرأت نماز میں صرف وہی معتبر ہے جو عربی میں ہو۔ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے (یعنی عربی میں قرأت ضروری ہے)۔

ہدایہ میں ہے کہ امام ابوحنیفہ کا اپنی رائے سے رجوع مروی ہے اور اسی پر علماء کا اعتماد ہے۔

قرآنِ کریم میں سے اتنا حصہ تلاوت کرنا فرض ہے جس پر تلاوتِ قرآن کا اطلاق ہو سکے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایک آیت اور صاحبین کے نزدیک ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیات۔ آئمہ ثلاثہ مالک' شافعی اور احمد بن حنبل کی مشہور روایت یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ تو متعین ہے اور اس کا پڑھنا نماز کا رکن ہے۔ امام احمد کی ایک دوسری روایت ہماری موافقت کرتی ہے (قرآن کریم کا غیر متعین حصہ رکن ہے)۔

قرأت الفاتحہ

ہدایہ میں امام مالک سے روایت ہے کہ سورۂ فاتحہ اور کسی اور سورۃ کا پڑھنا فرض ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورۃ کی تلاوت کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں ہے۔

جو لوگ سورۂ فاتحہ کی تلاوت فرض کہتے ہیں ان کی دلیل یہ حدیث ہے:

روی عبادة بن الصامت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لاصلوة لمن لم يقرء بفاتحة الكتاب.

حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے سورۂ فاتحہ کی تلاوت نہیں کی اس کی کوئی نماز نہیں۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

صاحبین کے علاوہ باقی آئمہ (تینوں امام) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قطعی الدلالت ہے اور واضح کرتی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی۔

ہم کہتے ہیں کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ محکم آیت ہے جس کے معنی میں کوئی اشتباہ نہیں اسے پڑھتے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں مطلقاً قرآن کریم کی تلاوت کا حکم ہے اور سورۂ فاتحہ کی تعیین اس اطلاق کو باطل کر دیتی ہے اور قرآن کریم کے مطلق کو خبر واحد سے باطل کرنا (مقید کرنا) صحیح نہیں ہے اس لئے لامحالہ حدیث کو نفی کمال پر محمول کیا جائے تاکہ خبر واحد سے نص قرآنی کا باطل ہونا لازم نہ آئے۔

پھر اس خبر کی بعض روایات میں ہم پاتے ہیں کہ اس سے مراد قطعی طور پر کمال کی نفی ہے

قد روی ابو هريرة قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى صلوة لم يقرء فيها بام القراٰن فهو خداج غير تام. (رواہ صحیح مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت نہیں کی تو اس کی نماز ناقص' ناتمام ہے۔

نماز کا ناقص اور ناتمام ہونا اس کی صحت کے منافی نہیں ہے۔ سو سورۂ فاتحہ کا چھوڑ دینا نماز میں کمی کا سبب ہے' فساد کا نہیں اس لئے سورۂ فاتحہ کی تلاوت رکن نہیں۔

پھر فاتحہ شریف کی تلاوت ہمارے نزدیک واجب ہے اور اس کا تارک گناہ گار ہے اس لئے کہ کئی احادیث میں اس کا حکم دیا گیا ہے اور اس قدر کمال کی نفی ذات کی نفی کے قریب تر ہے۔ اس حدیث کو کمال کی نفی پر محمول کرنا

زیادہ مناسب ہے کیونکہ جو مجاز حقیقت کے زیادہ قریب ہو وہ حقیقت کے متعذر ہونے کی صورت میں متعین ہو جاتا ہے۔

یہ اعتراض جیسا کہ فتح القدیر میں کہا گیا ہے کہ شافعی علماء فرض اور واجب میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ تقسیم صرف تمہارے نزدیک ہے ان کے ہاں واجب کوئی چیز نہیں کیونکہ وہ قطعیت کے قائل نہیں۔ جب تم نے سورۂ فاتحہ کو واجب مان لیا تو تم نے تسلیم کر لیا کہ یہ رکن ہے اگرچہ شافعیوں کی اصطلاح کے مطابق ظنی ہے۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے اس بیان کی ابتداء میں ذکر کردہ مقدمہ میں بیان کر دیا ہے۔

ہم وجوب کے قائل ہیں اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کو رکن نہیں سمجھتے۔ ہم فرضیت یعنی رکنیت کی نفی کرتے ہیں جبکہ وہ رکنیت کے قائل ہیں لہٰذا نزاع تو پھر بھی باقی ہے۔ ہم یہاں فرض میں قطعیت کو شرط قرار نہیں دیتے مثلاً ہم آخری قعدہ کو فرض یعنی رکن کہتے ہیں۔

اگر تو یہ اعتراض کرے کہ اگر سورۂ فاتحہ کی تلاوت واجب ہے تو تمہارے نزدیک فاتحہ کے ترک پر فرض نماز کے ساقط ہونے کے باوجود واجب نماز ساقط نہیں ہوتی جیسے ان کے نزدیک فاتحہ کے ترک سے نماز ساقط نہیں ہوتی تو میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ نمازیں دو نہیں کہ ایک فرض ہو اور دوسری واجب ہو۔ نماز ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کی ہے جو مختلف ارکان پر مشتمل ہے۔ فاتحہ کو چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ ساقط ہو جاتی ہے اور نماز کا خطاب سرے سے متوجہ رہتا ہی نہیں اگرچہ فاتحہ کی تلاوت کا خطاب متوجہ رہتا ہے اور اس کے ترک پر گناہ ہوتا ہے جیسے غصب شدہ زمین میں نماز پڑھنا۔ آئمہ ثلاثہ کے نزدیک نماز ذمہ سے ساقط نہیں ہوتی جب تک سورۂ فاتحہ کی تلاوت نہ کی جائے اور نماز کا خطاب (اقیموا الصلوۃ) متوجہ رہتا ہے۔ اس مقام کو اس گفتگو کی روشنی میں سمجھنا چاہئے۔

ایک اور اعتراض جو امام فخر الاسلام بزدوی کی کسی اصول کی کتاب کی شرح میں اٹھایا گیا ہے کہ نماز کے حکم میں اجمال ہے اور خبر واحد "لا صلوۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب" اس مجمل کا بیان ہے اور خبر واحد مجمل کے لئے بیان بن سکتی ہے اس لئے اس کی رکنیت لازم آتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ آیت مجمل ہے لیکن اس اجمال کا بیان قرأت میں قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۔ اس لئے قرأت کے اعتبار سے اس آیت میں کوئی اجمال نہیں اگرچہ دوسرے ارکان کے لحاظ سے اب بھی اجمال باقی ہے اس لئے اس آیت کے بیان ہونے کے بعد مزید کسی بیان کی ضرورت نہیں۔

لہٰذا یہ خبر واحد عدم اجمال کی وجہ سے بیان نہیں بلکہ اگر اسے بیان کے معنی میں لیا جائے تو یہ ایک قطعی بیان کو باطل کرنے کا سبب بنے گی اور خبر واحد سے ایک قطعی بیان کو باطل کرنا جائز نہیں ہے۔

پھر جس طرح ہمارے نزدیک سورۂ فاتحہ واجب ہے اسی طرح کسی دوسری سورۃ کی تلاوت بھی واجب ہے۔ سورۂ فاتحہ اور اس کے علاوہ ایک اور سورۃ یا اس کا کچھ حصہ دونوں کا وجوب ثابت ہے۔

عن ابی سعید قال امرنا ان نقرء بفاتحة الکتاب وما تیسر. (رواہ سنن ابوداؤد) حضرت ابوسعید کی روایت کردہ حدیث ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمیں فاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ) اور جو آسانی سے پڑھا جاسکے کی تلاوت کا حکم دیا گیا۔

اصول کی کتابوں سے واضح ہے کہ صحابی کا اس طرح کا قول اپنے ذہن کی اختراع یا قیاس نہیں ہوتا بلکہ جب وہ امرنا (ہمیں حکم دیا گیا) فرماتے ہیں تو امر حضور ﷺ ہوتے ہیں کوئی اور نہیں ہوتا اور ہمارے نزدیک امر وجوب کے لئے آتا ہے اور مستحب کو مجازاً ماموربہ کہتے ہیں۔

فرض کی دو رکعتوں میں قرأت فرض ہے۔ پہلی دو رکعتوں کا تعین فرض نہیں۔ ہمارے نزدیک پہلی دو رکعتوں میں قرأت واجب ہے اور یہ وجوب عہد نبوی سے برابر نقل ہوتا آرہا ہے۔

مرد کے لئے جہری نمازوں میں بلند آواز سے اور سری نمازوں میں آہستہ آواز سے قرأت کرنا واجب ہے

جہری نمازوں میں مردوں کے لئے بلند آواز سے قرأت کرنا اور خفی نمازوں میں آہستہ تلاوت کرنا بھی واجب ہے کیونکہ ارشادِ ربانی ہے: **ولا تجهر بصلوتک ولا تخافت بها وابتغ بین ذلک سبیلا.** اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام نمازوں میں بلند آواز سے قرأت نہ کرو اور نہ ہی تمام نمازوں میں پست آواز سے تلاوت کرو بلکہ بعض نمازوں میں بلند آواز سے اور بعض میں پست آواز سے تلاوت کرو۔ لفظ صلوٰۃ اسم جنس ہے جو کاف (ضمیر) کی طرف مضاف ہے (**بصلوتک**) جس سے عموم کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے اس کے شرط یا رکن ہونے کا فائدہ ہوتا ہو اس لئے اس سے قرأت بالجہر یا قرأت بالخفاء کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی۔ آیت کریمہ میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ نہ بہت بلند آواز سے تلاوت کرو اور نہ ہی بالکل مخفی طریقہ ہے بلکہ ان دونوں کا درمیانی راستہ اپناؤ لیکن اس طرح لفظ ظاہر معنی سے نکل جاتا ہے اور لفظ **صلوتک** کی بالجہر تخصیص لازم آتی ہے اور یہ ظاہر کے خلاف ہے۔

عورت ہر حال میں قرأت آہستہ آواز میں کرے گی

عورت کے لئے اخفاء واجب ہے۔ کسی نماز میں وہ بلند آواز سے تلاوت نہیں کرے گی کیونکہ اس کے لئے آواز کا چھپانا ضروری ہے۔

رکوع و سجود اور اس کا طریقہ

(۴) چوتھا فرض رکوع۔

(۵) اور پانچواں سجدہ ہے۔

ان دونوں کے فرض ہونے پر امت کا اجماع ہے کیونکہ قرآن حکیم میں ہے۔ **ارکعوا واسجدوا.** (رکوع کرو اور سجدہ کرو)

رکوع کا مطلب جھکنا ہے اور سجود کا مطلب پیشانی یا ناک کا زمین پر رکھنا ہے۔ پیشانی یا ناک کے علاوہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک دونوں قدم بھی زمین پر رکھنا ضروری ہیں جبکہ صاحبین فرماتے ہیں سجدہ اس وقت تک نہ ہو گا جب تک نمازی ناک کے ساتھ ساتھ پیشانی زمین پر نہیں رکھے گا' صرف ناک پر اکتفاء کرنا کافی نہیں ہے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم امرت ان اسجد علی سبعة اعظم علی الجبهة والیدین والرکبتین واطراف القدمین. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں۔ پیشانی' دونوں ہاتھ' دونوں گھٹنے' پاؤں کے کنارے۔

ایک روایت میں پیشانی کی جگہ چہرہ آیا ہے اور چہرہ سے مراد بھی پیشانی ہے۔ اس سے رخسار قطعاً مراد نہیں۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے نص قرآنی میں سجود کا حکم دیا گیا ہے اور سجدہ نام ہے چہرہ کے کچھ حصہ کو ازراہِ تعظیم زمین پر رکھنے کا اور اس کی تکمیل پاؤں' پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھنے سے ہوتی ہے۔ رہا زمین پر قدم رکھے بغیر پیشانی رکھنا تو وہ استہزاء کے زیادہ مشابہ ہے۔ پیشانی کی تعیین کی شرط نص قرآنی پر خبر واحد سے زیادتی ہے جیسا کہ علماء نے بیان کیا ہے۔

اس بندۂ (مسکین) کے نزدیک (یعنی مصنف کتاب کی رائے میں) شرعی سجدہ میں اجمال ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ کسی طریقہ سے چہرہ زمین پر رکھنا سجدہ ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ناک یا پیشانی کو زمین پر رکھنا' دونوں گھٹنوں کو زمین پر ٹکانا اور پاؤں کو ایک یا دو انگلیوں کے برابر زمین سے اٹھائے رکھنا استہزاء کے مشابہ نہیں حالانکہ اس طرح بالاتفاق سجدہ نہیں ہوتا اسی طرح قبلہ سمت سے ہٹ کر کسی اور طرف سجدہ کرنا شرعی سجدہ نہیں جس کا قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے سو شرعی سجدہ نام ہے مخصوص اعضاء کو ایک مخصوص طریقہ سے مخصوص شرائط کے مطابق زمین پر رکھنے کا۔ مذکورہ حدیث میں مذکور ہے کہ نماز میں سات اعضاء پر سجدہ کیا جائے' ان کے علاوہ باقی کوئی ایسی چیز نہیں جس کو چھوڑ دینے سے سجدہ نہ ہو اس لئے ان اعضاء کے علاوہ اور کسی عضو کا زمین پر رکھنا مامور بہ نہیں۔ سجدہ شرعی اسی طریقہ سے ادا ہو گا پس پیشانی کا' دونوں ہاتھوں' گھٹنوں اور پاؤں کے ساتھ زمین پر رکھنا نماز میں فرض ہے' اگر ان میں سے کوئی ایک عضو بھی زمین پر لگنے سے رہ گیا تو سجدہ نہیں ہو گا۔ هذا ما عندی ولعل الله یحدث بعد ذلک امرا. پھر رکوع اور سجود میں......

کیا قومہ اور جلسہ دونوں رکن ہیں؟

امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک مطلقاً جھکنا فرض ہے۔ اعضاء کا زمین پر رکھنا' رکوع اور سجدہ کے درمیان سیدھا کھڑا ہونا' دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا' رکوع اور سجدہ کو صحیح طریقہ سے ادا کرنا (تعدیل) فرض نہیں ہے۔ رکوع اور سجدہ میں تعدیل واجب ہے جبکہ قومہ اور جلسہ دونوں سنت ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ دو آخری عمل واجب ہیں۔ شیخ ابن الھمام کا اسی پر اعتماد ہے اور بعض مشائخ کا اسی پر فتویٰ ہے۔

دونوں سجدوں کے درمیان اتنا وقفہ فرض ہے جس کے ذریعے دونوں کے درمیان تفریق ہو سکے۔ ہدایہ میں ہے کہ زمین سے اس طرح سر اٹھانا کہ بیٹھنے کے قریب تر ہو جائے' فرض ہے' اگر سجدہ کے زیادہ قریب ہوا تو دونوں سجدے ایک ہی سجدہ شمار ہوگا لہٰذا یہ جائز نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ چہرے اور زمین کے درمیان ہوا گزر جائے یا پہلا سجدہ دوسرے سجدہ سے جدا ہو جائے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رکوع اور سجدہ میں تعدیل فرض ہے اور قومہ اور جلسہ دونوں رکن ہیں۔ دلیل یہ حدیث پاک ہے:

عن ابی هریرة ان رجلا دخل المسجد ورسول الله صلى الله عليه وسلم جالس في ناحية المسجد فصلى ثم جاء فسلم عليه فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم ارجع فصل فانك لم تصل فرجع فصلى ثم جاء فسلم فقال وعليك السلام ارجع فصل فانك لم تصل فقال في الثالثة او التي بعدها علمني يا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال اذاقمت الى الصلوة فاسبغ الوضوء ثم استقبل القبلة فكبر ثم اقرء بما تيسر معك من القرآن ثم اركع حتى تطمئن راكعاثم ارفع حتى تستوى قائما ثم اسجد حتى تطمئن ساجدا ثم ارفع حتى تطمئن جالساثم سجد حتى تطمئن ساجدا ثم ارفع حتى تستوى قائما افعل ذلك في صلوتك كلها.

(رواہ البخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی مسجد میں آیا۔ رسول اللہ ﷺ مسجد کے ایک کونے میں تشریف فرما تھے۔ اس نے نماز پڑھی۔ پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: واپس جا اور دوبارہ نماز پڑھ۔ تو نے نماز نہیں پڑھی' وہ شخص واپس چلا گیا' دوبارہ نماز پڑھی اور آ کر سلام عرض کیا۔ نبی کریم ﷺ نے (جواب میں) وعلیک السلام کہا اور فرمایا: دوبارہ جا کر نماز پڑھ کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ تیسری بار یا اس کے بعد اس شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے (نماز پڑھنا) سکھاؤ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم نماز کے ارادہ سے اٹھو تو اچھی طرح وضو کرو پھر قبلہ رو ہو کر تکبیر کہو پھر آسانی سے قرآن کریم میں سے جو پڑھ سکتے ہو پڑھو پھر پورے اطمینان کے ساتھ رکوع کرو پھر سر اٹھاؤ حتیٰ کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ پھر پورے اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو پھر سجدہ سے سر اٹھاؤ حتیٰ کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ پھر سجدہ کرو حتیٰ کہ سجدہ کی حالت میں اطمینان ہو جائے پھر سجدہ سے اٹھو حتیٰ کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ' اپنی پوری نماز میں اسی طرح کرو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باقی ارکان کی طرح قومہ اور جلسہ میں تعدیل فرض ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بغیر نماز کی نفی فرمائی ہے اور صحابی کو حقیقتِ نماز سے آگاہ کرتے ہوئے قومہ اور جلسہ کو نماز کے دو رکن بیان فرمایا ہے۔

طرفین کی طرف سے علماء نے اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اس سے ''ارکعوا واسجدوا'' کا اطلاق باطل نہیں ہوتا۔ امام ترمذی کی نقل کردہ روایت میں ان مذکورہ الفاظ کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں' اگر تو اس طرح کرے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی' اگر اس میں سے کسی چیز کی کمی کر دی تو تیری نماز میں کمی آ

جائے گی۔

یہ حدیث پہلی حدیث سے زیادہ واضح ہے پہلی میں صرف اتنا بیان ہے کہ نماز دوبارہ پڑھو لیکن اس میں بتا دیا کہ اگر قومہ اور جلسہ صحیح طریقہ سے نہ ہو تو نماز میں کمی آ جاتی ہے جس کی وجہ سے نماز کو مکمل کرنے کے لئے دوبارہ پڑھنا بہتر ہے۔

حدیثِ پاک کا یہ حصہ واضح دلالت کر رہا ہے کہ تعدیل میں خلل واقع ہونے سے نماز ٹوٹتی نہیں البتہ اس میں کمی آ جاتی ہے کیونکہ مقصود جلسہ اور قومہ نہیں' رکوع اور سجدہ ہے۔ قومہ اور جلسہ کی مشروعیت تو رکوع و سجود اور دونوں سجدوں کو الگ الگ کرنے کے لئے ہے اس لئے یہ رکن نہیں ہیں۔

صحیح رائے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور میری معلومات کے مطابق ائمہ ثلاثہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ رکوع اور سجود کی کیفیت میں اجمال ہے اور یہ حدیث مبارک اس کیفیت کے لئے بیان ہے۔ رکوع و سجود والی آیت مطلق نہیں کہ خبر واحد سے اس کا اطلاق باطل ہو۔

حدیثِ پاک بیان کرتی ہے کہ رکوع اور سجدہ جو نماز کے رکن ہیں ان سے مراد پورے اطمینان سے جھکنا اور سات اعضاء کو اطمینان کے ساتھ زمین پر رکھنا ہے۔ یہ مفہوم اس وقت ہوگا جب ان سے ان کا حقیقی معنیٰ مراد ہو اور اگر ان سے مراد کنایۃً نماز ہو جیسا کہ اکثر اہل تفسیر کی رائے ہے تو پھر معاملہ اظہر من الشمس ہے کیونکہ رکوع اور سجدہ سے مراد ہے نماز اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے اور اپنے ارشاد سے رکوع اور سجود اعتدال کے ساتھ کرنے کو رکن قرار دیا ہے' اگر "وارکعوا واسجدوا" سے مراد خضوع و خشوع ہو تو حدیث مبارک نماز کی حقیقت کے لئے بیان ہوگی اور آیت میں خضوع کا حکم ہوگا' رہا امام ترمذی کا نقل کردہ ارشادِ نبوی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تو میرے حکم کے مطابق تعدیل پر عمل پیرا ہوگا تو تیری نماز مکمل نماز ہوگی اور اگر تعدیل میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع ہوگئی مگر تعدیل کی اصل کسی حد تک قائم رہی تو جتنی کمی ہوگی اتنی نماز میں بھی کمی واقع ہو جائے گی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تعدیل کو ترک کر دیا گیا تو بھی نماز باطل نہیں ہوگی اور تعدیل میں مکمل کمی نماز میں کمی کا باعث ہوگی۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ شرعی نماز میں اجمال ہے اگر رکوع اور سجود اس اجمال کا بیان ہیں تو ان دو ارکان کے علاوہ باقی نماز تو پھر بھی مجمل رہے گی کیونکہ بعض ارکان کا بیان حقیقت کے لئے بیان نہیں ہو سکتا سو حدیثِ پاک قومہ اور جلسہ کے لئے بیان ہے اسے بالکل رد نہیں کیا جا سکتا۔

رہا ان کا یہ کہنا کہ قومہ اور جلسہ مقصود نہیں تو یہ رائے چونکہ نص کے مخالف ہے اس لئے اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

آخری قعدہ

(٦) چھٹا فرض قعدہ آخیرہ ہے اس کے رکن ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

ابن مسعود کی روایت کردہ حدیث جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔

جب تو یہ کہے یا یہ ادا کر چکے تو تیری نماز ہو چکی' اب تو چاہے تو کھڑا ہو جا بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جا۔ نماز کا مکمل ہونا تشہد یا دوسرے لفظوں میں آخری قعدہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ آخری قعدہ کی ادائیگی پر نماز کا تمام ہونا موقوف ہے' اس لئے یہ رکن ہے یہ الفاظ اگر حدیث کا حصہ ہیں تو پھر تو بات واضح ہے' اگر حضرت ابن مسعود کا کلام ہے جیسے بعض علماءِ حدیث کی رائے ہے تو بھی دینی معاملات جن میں قیاس اور اجتہاد کو دخل نہ ہو مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے۔

ترتیبِ ارکان

ارکان میں ترتیب کا مسئلہ تفصیل طلب ہے کیونکہ نماز کے ارکان کی چار قسمیں ہیں۔ بعض ارکان ایسے ہیں جو پوری نماز میں بار بار آتے ہیں' بعض ایسے ہیں جو ہر رکعت میں بار بار آتے ہیں' تیسرے وہ ہیں جو رکعت میں مکرر نہیں ہوتے اور چوتھی قسم کے ارکان وہ ہیں جن کا سرے سے تکرار ہی نہیں ہوتا۔

جو ارکان پوری نماز میں بار بار آتے ہیں مثلاً نماز کی رکعتیں تو ان کی ترتیب فرض نہیں بلکہ واجب ہے کیونکہ مسبوق اس ترتیب کو قائم نہیں رکھ سکتا' آخری رکعتیں پہلے پڑھتا ہے۔ جس رکن کا سرے سے تکرار ہی نہیں وہ آخری قعدہ ہے تو اسے دوسرے تمام ارکان اور رکعتوں کے بعد ادا کرنا فرض ہے' اگر نماز کے دوران کوئی بیٹھے گا تو یہ قعدہ آخیرہ شمار نہیں ہوگا' اگر نماز کے آخر میں بیٹھے گا تو نماز صحیح ہوگی ورنہ نماز ٹوٹ جائے گی۔

وہ رکن جس کا ایک ہی رکعت میں تکرار ہوتا ہے وہ سجدہ ہے۔ دونوں سجدوں میں ترتیب واضح ہے جو پہلے ادا ہوگا وہ پہلا شمار ہوگا اور دوسرا کو دوسرا شمار کریں گے اسی طرح سجدہ اور دوسری رکعت کے ارکان کے درمیان ترتیب فرض نہیں بلکہ واجب ہے' اگر کسی نے پہلی رکعت کا دوسرا سجدہ چھوڑ دیا اور اسے دوسری یا تیسری رکعت میں ادا کیا تو نماز ہو جائے گی اور دوسری رکعت کے ارکان کی ادائیگی میں بھی کوئی خلل نہیں آئے گا (لیکن سجدۂ سہو لازم ہوگا) اگر اس سجدہ کو آخری قعدہ کے بعد ادا کرے گا تو آخری قعدہ باطل ہو جائے گا (اور سجدہ کے بعد آخری قعدہ پھر ادا کرنا پڑے گا) کیونکہ آخری قعدہ کو تمام ارکان سے مؤخر کرنا فرض ہے۔ ہاں جس رکعت کا یہ قعدہ ہے اس کے دوسرے ارکان کے ساتھ اس کی ترتیب فرض ہے جیسا کہ فتح القدیر میں تصریح کی گئی ہے اگرچہ نہایہ کی ظاہری عبارت اس کے خلاف ہے۔ رہا وہ رکن جس کا ایک رکعت میں تکرار نہیں جیسے قیام' قرأت اور رکوع تو ان کے درمیان ترتیب فرض ہے۔ اسی طرح ان کے درمیان اور ایک رکعت میں ایک سے زائد بار آنے والے ارکان کے درمیان بھی فرض ہے۔ وقایہ کے شارح نے اس ترتیب کو واجب قرار دے کر غلطی کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ ترتیب فرض نہیں ہے۔ البحر الرائق کے مصنف نے اس غلطی کی نشاندہی کی ہے۔ مزکورہ حدیث میں لفظ ثم ترتیب کے فرض ہونے پر دال ہے۔

تفریعِ مسائل

ترتیب کے فرض ہونے سے کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں۔ جنہیں حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔ ایک آدمی نے نماز شروع کی' قرأت کی' رکوع کیا اور سجدہ نہیں کیا بلکہ دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا۔ دوسری رکعت کی قرأت کی اور سجدہ کیا اور رکوع چھوڑ دیا تو اس کی ایک رکعت ہوئی کیونکہ دوسری رکعت کا قیام اور

قرأت باطل ہو گئے کیونکہ اس نے رکوع اور پہلی رکعت کے پہلے سجدہ کے درمیان ترتیب کا خیال نہیں رکھا لہٰذا دوسری رکعت میں رکوع پر جو دو سجدے مرتب ہوئے ہیں ان دو سجدوں کو اس رکوع کے ساتھ ملا دیں گے جو پہلی رکعت میں کیا گیا اس طرح دو رکعتیں ایک رکعت بن جائیں گی اگر اس کے بعد بقیہ رکعتیں پوری کر لیں تو نماز ہو گئی ورنہ باطل ٹھہری۔

اسی طرح اگر رکوع پہلے کیا اور اس کے بعد کھڑے ہو کر قرأت کی اور پھر رکوع اور سجدہ کیا تو بھی ایک رکعت ہو گی۔ (پہلا رکوع باطل ہو جائے گا) ایسے ہی اگر سجدہ پہلے کیا پھر کھڑے ہو کر قرأت کی اور رکوع کیا اور دوسری رکعت شروع کر دی اور دوسری رکعت میں قرأت کی' رکوع کیا لیکن سجدہ نہیں کیا پھر کھڑا ہو کر تیسری رکعت میں قرأت کی اور رکوع نہ کیا تو اس نے صرف ایک رکعت پڑھی۔ بعینہٖ اگر پہلی رکعت میں رکوع کیا اور سجدہ نہ کیا پھر دوسری رکعت میں رکوع کیا اور سجدہ چھوڑ دیا پھر تیسری رکعت میں سجدہ کیا اور رکوع نہ کیا تو بھی اس کی ایک رکعت مکمل ہوئی تین نہیں۔ یہ چاروں مسائل فتح القدیر میں مذکور ہیں۔ مصنف نے انہیں کافی الحاکم ابی الفضل سے نقل فرمایا ہے۔

ہم نے پہلے مسئلہ کی وجہ بیان کر دی ہے۔ اسی سے باقی مسائل کی وجوہ کو سمجھئے۔

جب کوئی شخص مسنون طریقہ کے مطابق نماز پڑھنا چاہے تو وہ اچھی طرح وضو کرے' طہارت (لباس' جگہ اور بدن) کا پوری طرح اہتمام کرے اور گزشتہ صفحات میں جس طرح ہم نے بیان کیا ہے بدن کو ڈھانپے (یعنی لباس پہنے) اس کے بعد قبلہ رو ہو کر کھڑا ہو جائے' دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو' نماز کی نیت کرے کہ فلاں نماز میں صرف اللہ کریم کے لئے پڑھ رہا ہوں' اپنے دونوں ہاتھ اس طرح اٹھائے کہ اس کے دونوں انگوٹھے دونوں کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں۔ عورت کندھوں کے برابر ہاتھ اٹھائے اور اس کے بعد اللہ اکبر کہے' تکبیر ہاتھ اٹھانے کے بعد کہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ہاتھ اٹھاتے ہی تکبیر کہہ دے۔ ایک قول یہ ہے کہ تکبیر پہلے کہے۔

تکبیر تحریمہ کے وقت مرد کا کانوں کی لو تک ہاتھ اُٹھانا سنت ہے

مرد کا کانوں کی لو تک ہاتھ اٹھانا یہ ہمارے نزدیک سنت ہے اور روایت مشہورہ کے مطابق امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہی سنت ہے۔ اس کے برعکس امام امالک' امام شافعی اور امام ابن حنبل فرماتے ہیں کہ مرد بھی ہاتھ کندھوں تک اٹھائے اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

عن ابی حمید الساعدی فی حدیث طویل فی بیان صلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رأیتہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کبر جعل یدیہ حذاء منکبیہ.

ابوحمید الساعدی سے مروی ہے۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں نماز کے طریقہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ نے تکبیر تحریمہ کہی تو اپنے دونوں مبارک ہاتھ کندھوں تک اٹھائے۔

ابوحمید کی حدیث پر امام طحاوی نے گفتگو فرمائی ہے' اگر تفصیل مقصود ہو تو فتح القدیر کا مطالعہ کیجئے' اگرچہ فتح القدیر نے اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے لیکن ہمارے لئے وہ گفتگو مفید نہیں ہے کیونکہ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث

میں یہ صراحت بھی موجود ہے۔

عن ابن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يرفع يديه حذاء منكبيه.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کندھوں تک ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔

ہماری دلیل یہ احادیث مبارکہ ہیں:

عن مالك بن الحويرث قال كان صلى الله عليه وسلم اذا كبر يرفع يديه حتى يحاذى اذنيه. (رواہ صحیح بخاری، صحیح مسلم)

مالک بن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تکبیر (تحریمہ) کہتے تو اپنے ہاتھ اٹھاتے حتیٰ کہ وہ کانوں کے برابر آجاتے۔

عن وائل ابن حجر انه راه صلى الله عليه وسلم رفع يديه فجعلهما حيال اذنيه و كبر.

وائل بن حجر سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا۔ آپ دونوں ہاتھ کانوں کے برابر تک اٹھاتے تھے اور تکبیر کہتے تھے۔

عن انس كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا فتتح الصلو ة كبر ثم رفع يديه حتى يحاذى با بهاميه اذنيه.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو تکبیر کہتے اور ہاتھ اٹھاتے حتیٰ کہ انگوٹھے کانوں کے برابر آجاتے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔ ابوالفرح فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

عن البراء قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا فتتح الصلو ة رفع يديه الى قريب من اذنيه ثم لايعود.

حضرت براء سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو (نماز پڑھتے) دیکھا۔ جب آپ نماز شروع کرتے تو کانوں کے قریب تک ہاتھ اٹھاتے۔ دوبارہ رفع یدین نہ کرتے۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اگرچہ لایعود کے الفاظ کے زائد ہونے پر گفتگو کی گئی ہے (لیکن ثقہ کی زیادتی قبول ہوتی ہے)۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کانوں تک ہاتھ اٹھانا سنت ہے، کندھوں تک ہاتھ اٹھانے والی حدیث سے اس کا تعارض نہیں کیونکہ جب ہاتھ کے انگوٹھے کانوں کی لو تک اٹھیں گے تو ہاتھ کا کچھ حصہ کندھوں کے برابر ہوگا اس لئے جس حدیث میں کندھوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کانوں تک ہاتھ اٹھائے اس لئے ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔ دوسرا جس حدیث میں کانوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے وہ نص مفسر ہے، اسے کسی اور معنی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے۔

عن وائل بن حجر قال انى ابصر النبى صلى الله عليه وسلم حين قام الى الصلوة

وائل بن حجر سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے

فرفع یدیہ حتی کانتا بحیال منکبیہ وحاذی بابھامیہ اذنیہ۔ — تو اپنے ہاتھ اٹھائے حتی کہ وہ دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر آ گئے اور دونوں انگوٹھے کانوں کے برابر ہو گئے۔

فتح القدیر میں ہے کہ بیہقی کی روایت دلالت کرتی ہے کہ ہاتھ تکبیر کے بعد اٹھائیں جائیں۔ ہدایہ میں اس کے برعکس پہلے ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے مگر یہ کہ حدیث میں موجود ثم کے کلمہ کو ایک مطلب سے دوسرے مطلب کی طرف انتقال پر محمول کیا ہے۔

وائل کی حدیث کے ظاہری الفاظ تکبیر سے پہلے ہاتھ اٹھانے کا فائدہ دیتے ہیں کیونکہ فا کا کلمہ وصل کے لئے ہے اور ہاتھ اٹھانا قیام سے ملا ہوا ہے اس لئے ہاتھ اٹھانا تکبیر سے پہلے ہوگا ورنہ تکبیر قیام سے موصول ہوگی نہ کہ ہاتھ اٹھانا تکبیر کے بعد۔

نماز میں مرد اور عورت کے ہاتھ باندھنے کا طریقہ

نمازی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ پر اس طرح رکھے گا کہ چھوٹی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ بائیں ہاتھ کی کلائی کو پکڑے گا اور ہاتھ اس طرح ناف کے نیچے باندھے گا۔ عورت ہاتھ سینے پر باندھے گی کیونکہ یہ طریقہ زیادہ پردہ پوشی کا سبب بنے گا۔

دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا کئی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ امام مالک ہاتھ چھوڑنے کے قائل ہیں۔ ان احادیث سے حضرت امام مالک کی رائے کا بطلان لازم آتا ہے۔

عن وائل بن حجر قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان قائما فی الصلوۃ قبض یمینہ علی شمالہ۔ (رواہ نسائی) — وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو میں نے دیکھا جب آپ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا۔

دوسری حدیث شریف یہ ہے کہ:

عن سھل بن سعد کان الناس یؤمرون یضع الرجل الید الیمنی علی ذراعہ الیسری فی الصلوۃ۔ — سہل بن سعد سے روایت ہے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ مرد نماز میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھیں۔

اسے بخاری اور امام مالک نے روایت کیا ہے۔

مرد ہاتھ ناف کے نیچے باندھے

رہا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا تو یہ ہمارا مذہب ہے اور امام احمد بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق ان کی بھی یہی رائے ہے۔

امام شافعی اور امام احمد کی دوسری روایت یہ ہے کہ ہاتھ سینے کے نیچے باندھیں جائیں۔

ہماری دلیل یہ حدیث مبارک ہے:

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه ووجوه اله الکرام السنة وضع الاکف علی الاکف تحت السرة.

حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ ایک ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی پر رکھ کر ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا سنت ہے۔

اسے ابوداؤد اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ جامع الاصول میں یہ حدیث ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

السنة وضع الکف علی الکف ویضعهما تحت السرة. (رواہ رزین)

سنت یہ ہے کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھا جائے اور (پھر) انہیں ناف کے نیچے باندھا جائے۔

امام نووی فرماتے ہیں بالاتفاق یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کے راوی عبد الرحمٰن بن اسحاق واسطی کے ضعیف ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔ فتح القدیر میں ایسے ہی مذکور ہے۔

سفر السعادۃ میں وضع الکف علی الکف تحت الصدر کو ابن حزیمہ کی صحیح کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

شیخ ابن ہمام فرماتے ہیں ایسی کوئی صحیح حدیث موجود نہیں جو سینے پر ہاتھ باندھنے کی تائید کرتی ہو۔ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا محض تعظیم کی وجہ سے اور تعظیم کا مروج طریقہ یہی ہے کہ ہاتھ ناف کے نیچے باندھے جاتے ہیں۔

نماز کا آغاز ثناء سے ہوگا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرے اور یہ الفاظ کہے۔

سبحانک اللهم وبحمدک و تبارک اسمک و تعالی جدک ولا اله غیرک.

ہمارے نزدیک نمازی انی وجهت وجهی للذی نہیں پڑھے گا۔ یہی رائے امام احمد' سفیان ثوری اور اسحاق بن راہویہ کی ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ نمازی یہ الفاظ پڑھے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ثناء اور توجہ (انی وجہت......) دونوں کو جمع کرے۔

ثناء والی حدیث صحیح ہے اور اس کی صحت میں کوئی شک نہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ امام بیہقی حضرت انس اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ' ابوسعید خدری' حضرت جابر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ نماز سبحانک اللهم سے شروع ہوتی ہے۔ اسے دارقطنی نے امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو سعید بن منصور نے افضل الصدیقین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

حضرت امام مسلم بیان کرتے ہیں:

عن انس ان عمر بن الخطاب کان یجهر بهؤلاء الکلمات یقول سبحانک اللهم بحمدک الی الاخر.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان الفاظ کو آواز بلند پڑھتے تھے اور یوں کہتے تھے۔ سبحانک اللهم

بحمدک آخر تک۔

ان صحابہ کرام نے اسی عمل کو اختیار فرمایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے لوگوں کو سکھانے کی خاطر بلند آواز سے ثناء پڑھتے تھے۔ اس حدیث سے شافعیوں کے اس نظریہ کا بھی واضح رد ہوتا ہے کہ ثناء نوافل کے ساتھ مختص ہے اس لئے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز میں اکثر ثناء پڑھتے ورنہ صحابہ کرام کا اس پر عمل نہ ہوتا۔

امام شافعی کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے:

عن امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجھہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام الی الصلوۃ قال انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا من المسلمین اللھم انت الملک لا الہ الا انت ربی وانا عبدک ظلمت نفسی واعترفت بذنبی فاغفرلی ذنوبی جمیعا لا یغفر الذنوب الا انت واھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدینی لاحسنھا الا انت واصرف عنی سیئھا لا تصرف عنی سیئھا الا انت لبیک وسعدیک والخیر کلہ فی یدیک والشر لیس الیک انا بک والیک استغفرک واتوب الیک. (رواہ مسلم والترمذی)

امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی یہ روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو کہتے انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی رب العالمین لا شریک لہ و بذلک امرت وانا من المسلمین. اللھم انت الملک لا الہ الا انت ربی وانا عبدک ظلمت نفسی واعترفت بذنبی فاغفرلی ذنوبی جمیعا. لا یغفر الذنوب الا انت واھدنی لا حسن الاخلاق لایھدنی لا حسنھا الا انت واصرف عنی سیئھا لا تصرف عنی سیئھا الا انت لبیک و سعدیک والخیر کلہ فی یدیک والشر لیس الیک انابک و الیک استغفرک واتوب الیک۔

صاحب ہدایہ جواب دیتے ہیں کہ یہ کلمات صرف تہجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ پانچ فرض نمازوں میں ان کے پڑھنے میں کلام ہے۔ نسائی کی ایک روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

عن محمد بن سلمۃ اذا قام یصلی تطوعا قال اللہ اکبر وجھت وجھی للذی وقال مکان واصرف عنی وقنی سیئی الاعمال وسیئی الاخلاق لاتقی شیئا الا

محمد بن سلمہ سے روایت ہے کہ آپ نفل نماز پڑھنے لگتے تو کہتے اللہ اکبر وجھت وجھی للذی اور اصرف عنی کی جگہ وقنی سیئی الاعمال و سیئی الاخلاق لا تقی شیئاً الا انت پڑھتے جبکہ (لبیک)

انت ولم یذکر وسعدیک الی الاخر. و سعدیک...... کے کلمات نہیں پڑھتے تھے۔

مگر صاحب ہدایہ کی اس توجیہ کو ترمذی کی ایک روایت مشکوک بنا دیتی ہے۔

عن امیر المؤمنین علی ان رسول الله ﷺ کان اذا قام الی الصلوة المکتوبة رفع یدیه حذو منکبیه ویصنع ذلک اذا قضی قرأته واراد ان یرکع ویصنعه اذا ارادان یسجد ولا یرفع یدیه فی شئی من صلوته وهوقاعد واذا قام من سجدتین رفع یدیه کذلک وکبر ویقول حین یفتتح الصلوة انی وجهت وجهی.

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب فرض نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو کندھوں تک ہاتھ اٹھاتے اور جب قرأت مکمل کر لیتے اور رکوع کرنے لگتے تو بھی ہاتھوں کو اٹھاتے۔ سجدہ کرنے لگتے تو بھی رفع یدین کرتے جبکہ بیٹھ کر نماز میں رفع یدین نہیں فرماتے تھے اور جب دونوں سجدوں سے اٹھتے تو بھی رفع یدین کرتے تھے اور تکبیر کہتے تھے جب نماز شروع کرنے لگتے تو انی وجهت وجهی پڑھتے۔

جامع الاصول میں ایسے ہی ہے۔ نسائی کی روایت اس کے معارض نہیں ہے کیونکہ اس میں فرض نماز میں یہ کلمات پڑھنے کی نفی نہیں ہوسکتا ہے آپ ﷺ فرض اور نفل دونوں نمازوں میں یہ کلمات پڑھتے ہوں جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے۔

تمام نمازوں میں ان کلمات کا پڑھنا بعید از قیاس ہے کیونکہ مغرب کی نماز کا وقت بہت ہی تھوڑا ہے۔ مسنون قرأت کو اگر اس دعا کے ساتھ ملایا جائے تو ان کے لئے بہت سا وقت درکار ہے جو حضرت کی نماز میں قرین قیاس نہیں۔

نماز شروع کرنے کی کئی دعائیں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں۔ بعض دعائیں کسی نماز میں بھی پڑھی جا سکتی ہیں وہ کسی خاص نماز کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔

عن ابی هریرة قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا کبر فی الصلوة سکت هنیئة قبل ان یقرء قلت یا رسول الله صلی الله علیه وسلم بابی انت وامی ارأیت سکوتک بین التکبیر والقرأة ما تقول قال اقول اللهم باعد بینی وبین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب اللهم نقنی من خطایای کما ینقی الثوب الابیض من الدنس اللهم اغسلنی من خطایای بالثلج والماء البرد.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اللہ اکبر کہتے تو قرأت سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان میں دیکھتا ہوں کہ آپ تکبیر اور قرأت کے درمیان خاموش ہو جاتے ہیں۔ (یا رسول اللہ) اس دوران آپ کیا پڑھتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں یہ دعا پڑھا ہوں۔ اے اللہ! میرے اور میری خطاؤں کے درمیان مشرق و مغرب جیسی دوری کر دے۔ مجھے میری خطاؤں سے اس طرح بچا جس طرح سفید کپڑے کو میل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! مجھ سے میری خطاؤں

کو برف اور ٹھنڈے پانی (عفو) سے دھو ڈال۔

اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے بھی روایت کیا ہے لیکن ان کی روایت میں باعدالی المغرب کے الفاظ نہیں ہیں۔

عن جبیر بن مطعم انه رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى صلوة قال عمر والراوى لا اورى اى صلوة هى قال الله اكبر كبيراً الله اكبر كبيراً والحمد لله كثيراً ثلثا وسبحان الله بكرة واصيلا ثلثا اعوذ بالله من الشيطان من نفخه ونفثة وهمزه. (رواہ ابوداؤد)

جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو کوئی نماز پڑھتے دیکھا۔ راوی حدیث عمرو بیان کرتے ہیں کہ نہ جانیں وہ کون سی نماز تھی۔ آپ ﷺ نے الله اكبر كبيراً. الله اكبر كبيراً. والحمد لله كثيراً تین بار کہا اور سبحان الله بكرة واصيلا تین بار کہا اور (اس کے بعد) اعوذ بالله من الشيطان من نفخهٖ و نفثهٖ و همزه کہا۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ راوی نفخهٗ اور نفثهٗ اور همزهٗ کی تفسیر بالترتیب کبر، شعر اور جنون کی ہے۔

عن ابن عباس كان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول اللهم لك الحمد انت نور السموات والارض ولك الحمد انت قيام السموات والارض وفى رواية قيم السموات والارض ولك الحمد انت رب السموات والارض ومن فيهن انت الحق ووعدك الحق وقولك الحق ولقائك والجنة حق والنار حق والساعة حق اللهم لك اسلمت وبك امنت وعليك توكلت واليك انبت وبك خاصمت واليك حاكمت فاغفرلى ما قدمت و اخرت واسررت واعلنت انت الهى لا اله الا انت. (رواہ مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہا کرتے تھے۔ اے اللہ! سب تعریف تیرے لئے ہے تو آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ تیرے لئے سب تعریفیں ہیں۔ تو آسمانوں اور زمین کو قائم رکھنے والا ہے۔ ایک روایت میں: آسمانوں اور زمین کو قائم رکھنے والا۔ تیرے لئے سب تعریفیں ہیں۔ تو آسمانوں اور زمین اور ان کے اندر پوری مخلوق کا رب ہے۔ تو حق ہے۔ تیرا وعدہ سچا ہے۔ تیرا فرمان حق ہے۔ تیرے حضور حاضری حقیقت ہے۔ جنت ایک حقیقت ہے۔ جہنم حقیقت ہے۔ قیامت حقیقت ہے۔ اے اللہ! تیری رضا کی خاطر میرا سر جھکا ہے۔ تجھ پر ایمان لایا تجھ پر بھروسہ کیا، تیری بارگاہ میں جھکا۔ تیرے لئے دشمنی کی تیری بارگاہ میں فیصلہ لایا۔ میرے اگلے پچھلے گناہ بخش دے۔ ظاہر اور تو ہی میرا معبود ہے۔ کوئی معبود نہیں سوائے تیرے۔ کے الفاظ ہیں۔

جامع الاصول میں یہ الفاظ ہیں۔ اللهم ربنا لك الحمد انت قيم السموات والارض ومن فيهن ولك الحمد انت نور السموات والارض ومن فيهن ذالك الحمد. انت ملك السموات والارض ومن فيهن ولك الحمد. انت الحق...... النار حق کے بعد اس روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

والنبیون حق و محمد حق والساعة حق...... جامع الاصول کے مصنف اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ مؤطا کی روایت بھی ایسے ہی ہے لیکن اس میں والنبیون حق کے الفاظ نہیں ہیں۔

عن ابی سلمة ابن عبد الرحمن بن عوف قال سئلت عائشة ام المؤمنین بای شئی کل نبی الله یفتتح صلوته قالت اذا قام من اللیل افتتح صلوته اللھم رب جبرائیل ومیکائیل واسرافیل فاطر السموت والارض عالم الغیب والشھادة انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیه یختلفون اھدنی لما اختلف فیه باذنک تھدی من تشاء الی صراط مستقیم.

ابو سلمہ ابن عبد الرحمٰن بن عوف سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کس چیز سے نماز شروع کیا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: جب آپ ﷺ رات کے وقت نماز کے لئے اٹھتے تو ان کلمات سے نماز شروع فرماتے۔ اے اللہ! جبریل، میکائیل، اسرافیل کے پیدا کرنے والے۔ آسمانوں اور زمین کے خالق۔ غیب و ظاہر کے جاننے والے۔ تو اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جن چیزوں میں وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ اپنے اذن سے ان اختلافی امور میں میری رہنمائی فرما تو جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

ان تمام احادیث سے یہ چیز سامنے آتی ہے کہ نماز شروع کرنے کے لئے کوئی خاص دعا نہیں ہے، نمازی جس دعا سے چاہے نماز شروع کرسکتا ہے، اگر کسی دعا کو پڑھتے ہوئے کچھ الفاظ رہ جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔

ابن عمر قال بینما نحن نصلی مع رسول الله صلی الله علیه وسلم اذ قال رجل فی القوم الله اکبر الله اکبر کبیرا والحمدلله کثیرا وسبحان الله بکرة واصیلا فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم من القائل کلمة کذا وکذا قال رجل من القوم انا یا رسول الله قال عجبت لها فتحت لها ابواب السماء قال ابن عمر فما ترکتھن منذسمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ذلک. (رواہ مسلم والترمذی)

ابن عمر فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ اس دوران کسی آدمی نے اللہ اکبر اللہ اکبر کبیراً والحمد للہ کثیراً و سبحان اللہ بکرۃ واصیلاً کہا۔ حضور ﷺ نے پوچھا ایسے کلمات کہنے والا کون ہے؟ لوگوں میں سے ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول! ﷺ وہ شخص میں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں ان کلمات (کی برکت پر) حیران ہوں۔ ان کی وجہ سے آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ابن عمر فرماتے ہیں کہ جب سے حضور ﷺ کو میں نے یہ کلمات کہتے سنا ہے میں نے انہیں ترک نہیں کیا۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ گفتگو فرض نماز کی ہے۔ یہ دعا اس دعا کا حصہ ہے جو جبیر بن مطعم کی حدیث میں روایت کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ ثناء سے فراغت کے بعد تعوذ پڑھے۔ دس قراء کے نزدیک ماثور تعوذ اعوذ

بـالـلـه من الشيطن الرجيم ہے۔ ہدایہ میں استعیذ بـالـلـه من الشيطن الرجيم منقول ہے مگر اس کی وجہ نامعلوم ہے (یعنی انہوں نے کس حدیث سے یہ کلمات نقل کئے ہیں) قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنا سنت ہے کیونکہ قرآن کریم میں ہے۔ اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔

مسبوق باقی رکعتوں میں تعوذ پڑھتا ہے لیکن مقتدی نہیں پڑھتا۔ امام ابو یوسف کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

تعوذ کے بعد بسم اللہ شریف آہستہ آواز میں پڑھنی چاہیے

تعوذ کے بعد آہستہ سے بسـم الـلـه الرحمن الرحيم پڑھے اگرچہ نماز جہری ہی کیوں نہ ہو کیونکہ حدیث پاک میں ہے:

روى انس قال صليت خلف رسول الله صلى الـلـه عـلـيـه وسـلـم وابى بكر وعمر وعثمان فلم اسمع احدا منهم يقول بسم الله الرحمن الرحيم.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ ابوبکر، عمر اور عثمان علیہم الرضوان کے پیچھے نماز ادا کی میں نے کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے نہیں سنا۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ ایسی ہی ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جسے مسلم نے نقل فرمایا ہے۔

عن ابن عبد الله ابن معقل سمعنى ابى وانا اقرء بسم الله الرحمن الرحيم فقال اى بنى اياك والحدث قال ولم اراحدامن اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم بغض اليهم من الحدث فى الاسلام يعنى منه وقد صليت خلف النبى صلى الله عليه وسلم وابى بكر وعمر وعثمان فلم اسمع احدا منهم يقولها فلا تقلها اذا انت صليت فقل الحمدلله رب العالمين.

ابن عبد اللہ ابن معقل سے روایت ہے کہ میرے والد نے سنا کہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ رہا تھا۔ فرمایا اے بیٹے! نئی نئی چیزوں سے بچو۔ پھر فرمایا: میں نے حضور ﷺ کے صحابہ کو اس بات سے زیادہ کسی اور بات پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا کہ اسلام میں کوئی چیز پیدا کی جائے یعنی بلند آواز سے باسم اللہ پڑھنا۔ میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے پیچھے پڑھی لیکن کسی کو یہ کہتے نہیں سنا (بلند آواز سے بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا) یوں نہ کہا کرو۔ جب نماز پڑھو تو الحمد للہ رب العالمین کہا کرو۔

اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یہ گفتگو بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے متعلق ہے ورنہ بسم اللہ شریف کا نماز میں پڑھنا ثابت ہے جسے کسی صورت رد نہیں کیا جا سکتا۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں بسم اللہ بلند آواز سے پڑھی جائے کیونکہ یہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور اس کا حصہ ہے ہمارے نزدیک یہ ایک مستقل آیت ہے سورۂ فاتحہ کا جز نہیں ہے اور نہ دوسری سورتوں کا جز

ہے اس کا نزول دو سورتوں کو الگ کرنے کے لئے ہوا ہے۔ امام شافعی کی دوسری دلیل یہ ہے:

عن نعيم المجمر صليت خلف ابى هريرة فقرء بسم الله الرحمن الرحيم الحمدلله الى اخر السورة وقال ثم يقول اذا سلم والذى نفسى بيده انى لاشبهكم صلوة برسول الله صلى الله عليه وسلم.

نعیم بن مجمر سے روایت ہے۔ نعیم فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کی تو انہوں نے یوں قرأت کی۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین راوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب سلام پھیرا تو فرمانے لگے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں تم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی طرح نماز پڑھتا ہوں۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس حدیث کو نسائی' ابن حبان' اور ابن حزیمہ نے بیان کیا ہے۔

ایک اور حدیث جس سے امام شافعی استدلال کرتے ہیں۔

عن ابن عباس قال كان النبى صلى الله عليه وسلم يفتح صلوة بسم الله الرحمن الرحيم.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نماز کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع فرماتے تھے۔

اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے بلند آواز سے بسم اللہ شریف کا پڑھنا ثابت نہیں ہوتا۔ رہیں وہ احادیث جن میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کی تصریح ہے تو ان میں سے کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔ علماءِ حدیث کی تحقیق یہی ہے۔

آمین بالجہر کا حکم

بسم اللہ شریف کے بعد نمازی سورۂ فاتحہ پڑھے گا اور اس کے اختتام پر آمین کہے گا۔ آمین آہستہ کہے گا اگرچہ نماز جہری ہی کیوں نہ ہو۔ امام کے علاوہ مقتدی بھی آمین کہے گا۔ امام اور مقتدی دونوں کا آمین کہنا مسلم کی حدیث سے ثابت ہے۔

عن ابى هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا امن الامام فامنوا فانه من وافق تامينه تامين امامه غفر له ماتقدم من ذنبه.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہا کرو۔ پس جس کی آمین امام کی آمین کے موافق ہوئی تو اس کے پہلے تمام گناہ بخش دیئے گئے۔

آمین آہستہ کہنا ہمارا مذہب ہے اور اس کی تائید میں صرف ایک حدیث ہے۔

عن علقمة بن وائل عن ابيه انه صلى مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فاذا بلغ

علقمہ بن وائل سے اور وہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی

ولا الضالین قال امین واخفی بھا صوتہ۔ جب آپ ﷺ ولا الضالین پر پہنچے تو آمین کہا اور اپنی آواز کو پست کیا۔ (رواہ مستدرک الحاکم)

یہ حدیث ضعیف ہے اور فتح القدیر میں اس کے ضعف کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے۔ امام شافعی اور امام احمد آمین بالجہر کے قائل ہیں۔ اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا تلا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ قال امین حتی یسمع من یلیہ من الصف الاول۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ پڑھتے تو آمین کہتے جسے پہلی صف میں کھڑے لوگ سنتے۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

عن وائل بن حجر قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرء غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فقال آمین مدبھا صوتہ۔

وائل بن حجر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا۔ جب آپ نے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ پڑھا تو آمین کہا اور آواز کو بلند کیا۔

اسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

مگر اس میں معاملہ آسان ہے۔ آمین کہنا سنت ہے اور آہستہ کہنا اور آواز پست کرنا مستحب ہے۔

آمین کے بعد تین آیات یا ایک بڑی آیت کی تلاوت کرے۔ سنت یہ ہے کہ ایک پوری سورت کی تلاوت کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ ایک پوری سورت کی تلاوت کرتے تھے اور سورت سے کم کی تلاوت حضور ﷺ سے بہت ہی کم مروی ہے۔ فقہاء نے بڑی سورت کو دو رکعتوں میں پڑھنا جائز قرار دیا ہے لیکن ان کے بقول افضلیت پوری سورت پڑھنے میں ہے۔

جن جگہوں پر نماز میں خاموش ہونا ضروری ہے

ہمارے نزدیک سورت اور رکوع کے درمیان خاموش ہونا ضروری نہیں ہے۔ امام احمد اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایک رکعت میں تین جگہ خاموشی ہے ایک تکبیر تحریمہ کے بعد اور قرأت سے پہلے دوسرا سورۂ فاتحہ کے بعد' تیسرا قرأت کے بعد اور رکوع سے پہلے۔ پہلا اور دوسرا سکتہ (خاموشی) کے ہم بھی قائل ہیں کیونکہ ایک سکتہ ثناء کے لئے ہے اور دوسرا آمین کے لئے رہی تیری خاموشی تو ہم اس کے قائل نہیں کیونکہ:

عن سمرۃ بن جندب قال سکتتان حفظھما عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانکر ذلک عمران بن حصین قال

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ انہوں نے دو سکتے حضور ﷺ سے یاد کیے۔ عمران بن حصین نے ان کی اس بات کا انکار کیا اور

حفظنا سکتة فکتبنا الی ابی بن کعب بالمدینة فکتب الی ان حفظ سمرة فقلنا لقتادة ما هاتان السکتتان قال اذا دخل فی صلوته واذا فرغ من القرائة ثم قال بعد ذلک واذا قرء ولا الضآلین وکان لیحبه اذا قرء من القرأة ان یسکت حتی ینزاد الیه نفسه. (رواہ جامع الترمذی)

فرمایا: ہم نے صرف ایک سکتہ یاد کیا ہے۔ ہم نے مدینہ طیبہ میں حضرت ابی بن کعب کی طرف عریضہ لکھ بھیجا تو انہوں نے (جواباً) لکھا کہ سمرہ نے یاد رکھا ہے ہم نے قتادہ سے کہا وہ دو سکتے کون سے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ایک جب انسان نماز شروع کرتا ہے اور دوسرا جب قرأت سے فارغ ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ جب نمازی ولاالضالین پڑھتا ہے اور آپ اسے پسند کرتے تھے کہ جب قرأت کر چکیں تو خاموش ہو جائیں حتیٰ کہ سانس درست ہو جائے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ قرأت کے بعد خاموشی ضرورت کی وجہ سے ہے تاکہ سانس لیا جا سکے' سنت نہیں ہے۔

جب نمازی قرأت سے فارغ ہو تو تکبیر کہے اور رکوع کرے اور جھکتے ہی تکبیر کہے۔ رکوع میں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر جسم کو سہارا دے' انگلیوں کو کشادہ رکھے اور پیٹھ کو اس طرح بچھائے کہ بالفرض اگر اس کی پیٹھ پر پانی کا بھرا ہوا برتن رکھا جائے تو پانی نہ گرے۔ رکوع کی حالت میں نہ تو سر کو بلند کرے اور نہ ہی پست کرے۔ پنڈلیوں اور رانوں کو ٹھہرا نہ کرے اور تین بار سبحان ربی العظیم کہے' اگر ہو سکے تو اس سے زیادہ بار تسبیح کہے لیکن بہتر یہ ہے کہ طاق بار ہو کیونکہ:

عن ابی هریرة انه کان یکبر کلما رفع وخفض ویحدث ان رسول الله صلی الله علیه وسلم لیفعل کذلک. (رواہ صحیح مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اٹھتے اور جھکتے تکبیر کہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ یوں ہی کیا کرتے تھے۔

رہا اس ہیئت پر رکوع کرنا تو اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ابی مسعود البذری ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا رکع فوضع یدیه علی رکبتیه فتحاما هما عن جنبیه.

حضرت ابومسعود بذری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا تو اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے دونوں گھٹنوں پر اس طرح رکھے کہ بازو پہلو سے جدا تھے۔

اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ رکوع میں تعدیل فرض ہے کیونکہ پیٹھ کو سیدھا رکھنا تعدیل ہے۔

وعن ابی حمید ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا رکع فوضع یدیه علی رکبتیة فتحاما هما عن جنبیه (رواہ الترمذی)

ابوحمید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع کرتے تھے تو اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھتے اور انہیں پہلوؤں سے جدا رکھتے۔

وعن مصعب بن سعد بن ابی وقاص صلیت الی جنب ابی وطبقت بین کفی ثم وضعتهما بین فخذی نهنی عنها ابی وقال کنا نفعل فنهینا عنه وامران تضع ایدینا علی

مصعب بن سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے' کہ میں نے اپنے والد گرامی کے پہلو میں نماز پڑھی اور دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر ران پر رکھ لیا۔ والد گرامی نے مجھے اس سے روکا اور فرمایا: ہم ایسا کرتے تھے تو ہمیں اس

الرکب الا فی السجود. (رواہ صحیح بخاری وصحیح مسلم)

سے منع کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ہم ہاتھ گھٹنوں پر رکھیں سوائے سجدہ کے۔

عن وابصة بن معبد قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فکان اذا رکع سوی ظهره حتی اذا اصب الماء استقر. (رواہ ابن ماجہ)

وابصہ بن معبد سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا۔ جب آپ ﷺ رکوع کرتے تو اپنی پیٹھ کو اس طرح برابر کرتے کہ بالفرض اگر پانی ڈالا جائے تو ٹھہر جائے۔

فتح القدیر میں ایسے ہی ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة وکان اذا رکع لم یشخص رأسه ولم یعلوه وکان بین ذلک (رواہ مسلم)

ام المؤمنین حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ جب آپ ﷺ رکوع کرتے تو نہ سر کو جھکاتے اور نہ ہی زیادہ اٹھاتے بلکہ اعتدال پر رکھتے۔

رکوع اور سجدہ میں کم از کم تین بار تسبیح کہے

رہا تسبیح کا مسئلہ تو اس کی دلیل عون بن عبداللہ سے روایت کردہ حدیث ہے۔

عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رکع احدکم فقال فی رکوعه سبحان ربی العظیم ثلث مرات فقد تم رکوعه وذلک ادناه واذا سجد فقال فی سجوده سبحان ربی الاعلی ثلث مرات ثم سجوده وذلک ادناه.

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص رکوع کرے تو رکوع میں تین بار کہے۔ سبحان ربی العظیم۔ (جس نے تین بار تسبیح کی) اس نے اپنا رکوع مکمل کر لیا۔ یہ کم سے کم تسبیح ہے اور جب سجدہ کرے تو سبحان ربی الاعلیٰ تین بار کہے۔ (جس نے ایسا کیا) اس کا سجدہ مکمل ہوا اور یہ کم سے کم تسبیح ہے۔

اسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند منقطع ہے کیونکہ عونؒ حضرت ابن مسعود سے نہیں ملے لیکن حدیث کے منقطع ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ منقطع حدیث ہمارے نزدیک حجت ہے۔

وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رکع احدکم فلیقل ثلث مرات سبحان ربی العظیم وذلک ادناه واذا سجد فلیقل سبحان ربی الاعلی ثلث مرات وذلک ادناه.

(رواہ ابوداؤد بسند متصل)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص رکوع کرے تو تین بار سبحان ربی العظیم کہے۔ یہ کم سے کم تسبیح ہے اور جب سجدہ کرے تو تین بار سبحان ربی الاعلیٰ کہے اور یہ کم سے کم تسبیح ہے۔

عن عقبة بن عامر قال لما نزلت فسبح باسم ربک العظيم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اجعلوها في ركوعكم ولما نزلت سبح اسم ربک الاعلى قال اجعلوها في سجودكم. (رواہ ابوداؤد)

عقبہ بن عامر سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب فسبح باسم ربک العظیم کا نزول ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے اپنے رکوع میں پڑھا کرو اور جب سبح اسم ربک الاعلیٰ کا نزول ہوا تو فرمایا: اسے اپنے سجدہ میں پڑھا کرو۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

بہر حال تسبیح فرض نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ نے اس کا حقیقتِ نماز کے بیان کے وقت ذکر نہیں فرمایا: آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ نماز کی حقیقت قیام۔ آسانی سے جس کی تلاوت ہو سکے قرآن کریم کی قرأت' رکوع' سجدہ' قومہ اور جلسہ کو تعدیل کے ساتھ ادا کرنا ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے لیکن ایک احتمال باقی ہے کہ تسبیح واجب ہو لہٰذا اس میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔

جب رکوع کی تسبیحات سے فارغ ہو تو سمع الله لمن حمده ربنا لک الحمد کہے۔ صاحبین کے نزدیک امام ہے یا مقتدی دونوں یہ کلمات کہیں گے اور اسی پر اعتماد ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ امام ہے تو تحمید (ربنا لک الحمد) نہیں کہے گا اور اگر مقتدی ہے تو تمام آئمہ کے نزدیک تحمید کہے گا۔ قومہ میں ہاتھ چھوڑ دے گا اور اتنی دیر ٹھہرے گا جتنی دیر رکوع میں ٹھہرا ہے۔

تسبیح اور تحمید (سمع الله لمن حمده ربنا لک الحمد) کی دلیل یہ حدیث ہے

عن عبد الله بن ابی اوفی قال کان رسول الله ﷺ اذا رفع ظهره من الركوع قال سمع الله لمن حمده اللهم ربنا لک الحمد ملأ السموت وملأ الارض وملأ ماشئت من شئي بعد. (رواہ مسلم)

عبد اللہ بن ابی اوفیٰ کی حدیث ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے اپنی پیٹھ اٹھاتے تو اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی تعریف کی۔ اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! تیرے لئے سب تعریفیں ہیں۔ آسمانوں کی مخلوق' زمین کی مخلوق اور ان کے بعد جو کچھ تو پیدا فرمائے گا سب تیری تعریف میں رطب اللسان ہیں' فرماتے۔

مقتدی صرف ربنا لک الحمد کہے گا

مقتدی صرف تحمید پر اکتفاء کرے گا۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ابی هريرة اذا قال الامام سمع الله لمن حمده فقولوا اللهم ربنا لک الحمد فانه ان وافق قوله قول الملائكة غفر له ماتقدم من ذنبه (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے۔ جب امام سمع الله لمن حمده کہے تو تم اللهم ربنا لک الحمد کہو۔ جن کی آواز فرشتوں کی آواز سے مل گئی تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف ہو گئے۔

رہی یہ بات کہ قومہ میں رکوع کے برابر ٹھہرے تو اس کی دلیل یہ ہے۔

عن البراء بن عازب قال کان رکوع رسول الله صلی الله علیه وسلم وسجوده و بین السجدتین واذا رفع من الرکوع ماخلا القیام والقعود قریبا من السواء.

(رواہ البخاری ومسلم)

براء بن عازب کی یہ حدیث ہے۔فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا رکوع' سجود دونوں سجدوں کے درمیان کا وقفہ اور جب رکوع سے اٹھتے (قومہ) قیام اور قعدہ کے علاوہ تقریباً برابر ہوتے۔

قومہ کے ساتھ صرف یہی دعا مخصوص نہیں' اس کے علاوہ اور بھی کئی دعائیں ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔

عن ابی سعید الخدری قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا رفع رأسه من الرکوع قال اللهم ربنا لک الحمد ملأ السموت وملأ الاض وملأ ماشئت من شئی بعد اهل الثناء والمجد احق ماقال العبد وکلنا لک عبد اللهم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولاینفع ذا الجد منک الجد. (رواہ مسلم)

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے۔فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو کہتے۔

اللهم ربنا لک الحمد ملأ السموت وملأ الاض وملأ ماشئت من شئی بعد اهل الثناء واهل المجد احق ما قال العبد و کلنا لک عبد اللهم لا مانع لما اعیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد۔

سجدہ کرنے کا سنت طریقہ

قومہ کے بعد تکبیر کہے اور سجدہ کرے۔سجدہ کرنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے دونوں گھٹنوں کو زمین پر رکھے پھر ہاتھوں کو پھر ناک اور چہرہ دونوں ہاتھوں کے درمیان ہو جبکہ ہاتھ کانوں کے برابر ہوں۔بازو پہلو سے جدا ہوں پیٹ رانوں سے نہ لگا ہو۔دونوں پاؤں کھڑے ہوں' انگلیاں قبلہ کے رخ پر ہوں اور سجدہ کرتے وقت یہ کلمات کہے۔سبحان ربی الاعلی۔یہ کلمات تین بار کہے یہ تسبیح کی کم سے کم تعداد ہے' اگر کوئی اس سے زائد بار تسبیح کہے گا تو افضل ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ تسبیح طاق مرتبہ ہو۔

اگر نمازی امام ہے تو مقتدیوں کا خیال رکھے۔نماز کو اتنا لمبا نہ کرے کہ مقتدی اکتا جائیں۔

ہمارے نزدیک سنت طریقہ یہ ہے کہ گھٹنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر لگیں۔امام احمد اور امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے۔اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن وائل بن حجر قال رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سجد وضع رکبتیه قبل یدیه واذا نهض رفع یدیه قبل رکبتیه.

(رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

حضرت وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو میں نے دیکھا۔جب آپ نے سجدہ فرمایا تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنوں کو زمین پر رکھا اور جب سجدہ سے اٹھے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو زمین سے اٹھایا۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ پہلے ہاتھ زمین پر رکھے گا اور پھر گھٹنے اور دلیل میں حدیث مبارک پیش کرتے ہیں۔

عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سجد احدکم فلا یبرک کما تبرک الابل ولیضع یدیہ قبل رکبتیہ. (رواہ ابوداؤد والنسائی)

حضرت ابوہریرہ سے روایت کردہ حدیث پیش کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص سجدہ کرے تو اس طرح نہ بیٹھے جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے۔ اسے چاہئے کہ گھٹنوں سے پہلے ہاتھ (زمین پر) رکھے۔

علماء فرماتے ہیں کہ حضرت وائل کی حدیث زیادہ صحیح ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کردہ حدیث بعض راویوں کا وہم ہے کیونکہ جب ہاتھوں کو زمین پر پہلے رکھے گا اور گھٹنے بعد میں ٹیکے گا تو یہ اونٹ کے بیٹھنے سے زیادہ مشابہ ہوگا چونکہ اس میں تناقض ہے اس لئے اسے کچھ راویوں کا وہم ہی کہیں گے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ:

عن ابی ھریرة قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سجد احدکم فلیبدء برکبتیہ قبل یدیہ ولا یبرک بروک الابل. (رواہ سفر السعادہ بدون سند)

حضرت ابوہریرہ سے (حدیث) مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص سجدہ کرے تو ہاتھوں سے پہلے اپنے گھٹنے رکھے اور اونٹ کی طرح مت بیٹھے۔

اسے سفر السعادۃ میں بغیر کسی سند کے بیان کیا گیا ہے۔ اس حدیث کے ثبوت کے بعد پہلی حدیث میں راوی کے وہم کا تعین ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث وائل بن حجر کی حدیث سے منسوخ ہے۔ اس کی تائید یہ حدیث مبارک کرتی ہے۔

عن سعد بن ابی وقاص کنا نضع الیدین قبل الرکبتین فامرنا بر کبتین قبل الیدین.

سعد بن ابی وقاص سے روایت کرتے ہیں کہ ہم (سجدہ کرتے وقت) گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھتے تھے تو ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے سنن میں روایت کیا ہے۔

سجدہ کے وقت ہاتھ کہاں رکھے جائیں؟

رہا اس کا ثبوت کہ ہاتھ کانوں کے برابر رکھیں جائیں تو اس کی دلیل ترمذی کی یہ حدیث ہے۔

فقد سئل البراء بن عازب این کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یضع وجھہ فقال بین کفیہ.

براء بن عازب سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ (سجدہ میں) چہرہ کہاں رکھتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا دونوں ہاتھوں کے درمیان۔

فتح القدیر میں ہے کہ مسلم کی روایت ہے۔

من حدیث وائل سجد ووضع وجھہ

حضرت وائل سے روایت ہے کہ انہوں نے سجدہ کیا اور

بين كفيه. اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان چہرہ رکھا۔

في حديث ابي حميدانه عليه السلام لما سجد وضع كفيه حذو منكبيه.

ابوحمید کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا تو ہاتھوں کو کندھوں کے برابر رکھا۔

(رواہ بخاری' ابوداؤد' الترمذی)

فتح القدیر میں ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی فلیح بن سلیمان ہے' اگر چہ اس سند کے ثبوت کو ترجیح حاصل ہے لیکن اس راوی میں کلام ہے۔ نسائی' ابن معین' ابو حاتم' ابوداؤد اور یحییٰ القطان نے اسے ضعیف کہا ہے اس لئے یہ حدیث اس طرح قوی نہیں جس طرح مسلم کی حدیث قوی ہے اس لئے عمل مسلم کی حدیث پر ہوگا۔

پھر یہ بات بھی منقول ہے کہ اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں وائل سے روایت کیا ہے کہ جب حضور ﷺ سجدہ کرتے تو دونوں ہاتھوں کو کانوں کے برابر رکھتے۔ عبد الرزاق کی روایت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ہاتھ کانوں کے برابر ہوتے۔ طحاوی کی روایت وہی ہے جو ہم نے ترمذی کے حوالے سے بیان کی ہے۔

سجدہ کی ہیت اس حدیث سے ثابت ہے۔

عن ام المؤمنين ميمونة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سجد جافى بين جنبيه حتى لو ان بهيمة ارادت ان تمربين جنبيه لمرت. (رواہ ابوداؤد)

ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو بازوؤں کو پہلو سے جدا رکھتے حتی کہ اگر بکری کا بچہ آپ کے پہلو سے گزرنا چاہتا تو گزر جاتا۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ جب سجدہ کرتے تو......

عن سعد بن وقاص ان النبي صلى الله عليه وسلم وضع اليدين ونصب القدمين. (رواہ الترمذی)

حضرت سعد بن وقاص سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھتے اور پاؤں کو گاڑ دیتے۔

اس حدیث کو کبھی عامر سے مرسلاً بھی روایت کیا جاتا ہے۔

عن احمر بن جزء ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سجد جافى عضديه.

احمر بن جزء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنے بازوؤں کو کشادہ رکھتے۔

(رواہ ابوداؤد)

تسبیح کے بارے احادیث گذشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں۔

پگڑی یا ٹوپی کی ایک طرف پر سجدہ کرنا کیسا ہے؟

ہمارے نزدیک پگڑی کے بل پر اور فالتو کپڑے پر سجدہ کرنا جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک ایسے کپڑے پر سجدہ جائز نہیں جو سجدہ کرنے والے سے ملا ہوا ہو۔ ہماری دلیل ابونعیم کی حدیث ہے۔

عن ابن عباس ان النبي صلى الله عليه

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ

وسلم کان یسجد علی کور عمامته. نبی کریم ﷺ اپنے عمامہ شریف کے بل پر سجدہ فرماتے تھے۔

عن عبد اللہ بن ابی اوفی قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یسجد علی کور عمامته. (رواہ ابوداؤد) عبد اللہ بن ابی اوفی سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عمامہ شریف پر سجدہ فرماتے دیکھا۔

فتح القدیر میں ایسے ہی ہے۔ ہماری دلیل وہ روایت بھی ہے جسے امام بخاری نے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ:

قال الحسن کان القوم یسجدون علی العامة والقلنسوة ویداہ فی کیه. حضرت حسن فرماتے ہیں لوگ عمامہ اور ٹوپی پر سجدہ کرتے تھے اوران کے ہاتھ ان کی آستین میں ہوتے تھے۔

علماءِ فقہ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ سجدہ پگڑی کے بل یا ایسے کپڑے پر نہ کیا جائے جو نمازی کے بدن سے ملا ہوا ہو کیونکہ اس کے جائز ہونے میں اختلاف ہے' اگر عذر کے بغیر کسی نے ایسا کیا تو وہ مکروہ کا مرتکب ہوا کیونکہ اس میں ترک تعظیم کا شبہ ہے۔

عورت کے سجدہ کرنے کا طریق

عورت سجدہ میں اپنے جسم کو بچھا دے' اپنے پیٹ کو رانوں سے ملا کر سجدہ کرے کیونکہ اس میں زیادہ پردہ داری ہے۔

سجدہ کی تسبیح سے فارغ ہو کر نمازی اللہ اکبر کہے' پہلے اپنے سر کو اٹھائے اور پھر ہاتھوں کو اس کے بعد بیٹھ جائے اور اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے' جتنی دیر سجدہ کرتے لگی اتنی دیر بیٹھے جیسا کہ حدیث گزر چکی ہے پھر تکبیر کہے اور پہلے سجدہ کی طرح دوسرا سجدہ کرے۔

دونوں سجدوں کے درمیان ذکر نہیں ہے

فقہاء نے دونوں سجدوں کے درمیان کسی ذکر کو نقل نہیں فرمایا۔ لیکن اس ضمن میں احادیث موجود ہیں۔

عن ابن عباس قال کان النبی یقول بین السجدتین اللھم اغفرلی وارحمنی وعافنی وارزقنی. (رواہ سنن ابوداؤد) حضرت ابن عباس سے روایت کردہ ایک حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے۔ اے اللہ! مجھے بخش دے مجھ پر رحم فرما مجھ سے درگذر کر اور مجھے عطا کر۔

عن حذیفة ان النبی صلی اللہ علیه وسلم کان یقول بین السجدتین رب اغفرلی. (رواہ جامع الترمذی' سنن ابوداؤد) حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان اے میرے رب! مجھے بخش دے کہا کرتے تھے۔

یاد رکھیے کہ رکوع اور سجود میں نبی کریم ﷺ سے کئی دعائیں مروی ہیں لیکن کسی امام نے انہیں فرض نمازوں میں مستحب قرار نہیں دیا۔ ان دعاؤں کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

فعن ام المؤمنين عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول فى ركوعه وسجوده سبحانك اللهم ربنا وبحمد واغفرلى يتاول القران.

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکثر رکوع اور سجدہ میں یہ دعا کرتے تھے۔ ہمارے پروردگار اے اللہ تو پاک ہے تیرے لئے تعریفیں ہیں مجھے بخش دے اور آپ قرآن کا مفہوم جانتے تھے۔

امام مالک کے علاوہ پانچوں محدثین نے اسے روایت کیا ہے۔

عنها كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول فى ركوعه وسجوده سبوح قدوس ربنا ورب الملائكة والروح.

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجود میں یہ کلمات پڑھتے تھے۔ ہر عیب ونقص سے پاک۔ نہایت ہی پاک ہمارا اور ملائکہ اور روح القدس کا پروردگار۔

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ ان کے علاوہ یہ حدیث سنن نسائی اور ترمذی میں بھی آئی ہے۔

وعنها قالت فقدت رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة من الفراش فالتمسة فوقعت يدى على بطن قدميه وهو فى السجدة وهما منصوبتان وهو يقول اللهم انى اعوذ برضاک من سخطک وبمعا فاتک من عقوبتک واعوذبک منک لا احصى ثناء عليک انت كما ثنيت على نفسک. (رواہ مسلم)

انہیں سے روایت ہے کہ میں ایک رات رسول اللہ ﷺ کو بستر پر نہ پا کر تلاش کرنے لگی۔ اچانک میرے ہاتھ آپ ﷺ کے تلوؤں سے جا لگے۔ آپ ﷺ حالت سجدہ میں تھے' دونوں پاؤں زمین پر سیدھے ٹکے ہوئے تھے اور آپ یہ کلمات کہہ رہے تھے۔ اے اللہ! میں تیری ناراضگی سے تیری رضا کی پناہ مانگتا ہوں۔ تیری بخشش کی تیری سزا سے اور تجھ سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ میں کما حقہ تیری تعریف نہیں کرسکتا جیسا کہ تو خود اپنی تعریف کرسکتا ہے۔

عن جابر ان النبى صلى الله عليه وسلم كان يقول فى سجوده اللهم لک سجدت وبک امنت ولک اسلمت ولک وانت ربى سجد وجهى للذى خلقه وصوره وشق سمعه وبصره تبارک الله احسن الخالقين. (رواہ النسائی)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ اے اللہ! میں نے تجھے سجدہ کیا تجھ پر ایمان لایا تیرے لئے گردن جھکائی تو میرا رب ہے۔ میری ذات کا سجدہ اس ذات کے لئے ہے جس نے اسے پیدا کیا اسے صورت دی اسے سماعت' بصارت کی قوت بخشی۔ بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا۔

امام نسائی کی ایک دوسری روایت ہے۔

عن محمد بن سلمة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان اذا قام يصلى تطوعا

محمد بن مسلمہ سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نفل نماز پڑھتے تو رکوع میں یہ کہتے۔ اے اللہ! میں نے

یقول اذا رکع اللھم لک رکعت وبک امنت ولک اسلمت وعلیک توکلت خشع سمعی وبصری ولحمی ودمی ومخی وعصبی للہ رب العالمین۔

تیرے لئے رکوع کیا۔ تجھ پر ایمان لایا۔ تیرے حضور گردن جھکائی۔ تجھی پر بھروسہ کیا۔ میرے کان، آنکھیں، گوشت، خون، مغز اور پٹھے اللہ پروردگارِ عالم کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔

عنہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام من اللیل یصلی تطوعا قال اذا سجد اللھم لک سجدت وبک امنت ولک اسلمت اللھم انت ربی سجد وجھی للذی خلقہ وصورہ وشق سمعہ وبصرہ تبارک اللہ احسن الخالقین۔ (رواہ النسائی)

محمد بن مسلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو جب نفل پڑھتے تو سجدہ میں یوں دعا کرتے۔ اے اللہ! میں نے تیرے لئے سجدہ کیا۔ تجھے پر ایمان لایا۔ تیری رضا کی خاطر سر جھکایا۔ اے اللہ! تو میرا رب ہے۔ میرا چہرہ اُس ذات کے سامنے جھکا ہے جس نے اسے پیدا کیا۔ صورت دی اور سمع و بصر کی قوت عطا کی۔ اللہ بابرکت ذات ہے اور بہترین خالق ہے۔

عن انس قال قمت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما رکع مکث قدر سورۃ البقرۃ ویقول فی رکوعہ سبحان ذی الجبروت والکبریاء والعظمۃ۔ (رواہ النسائی)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (نماز کے لئے) کھڑا ہوا جب آپ ﷺ نے رکوع کیا تو سورۂ بقرہ کی مقدار ٹھہرے رہے اور رکوع میں یہ الفاظ کہتے رہے۔ سبحان ذی الجبروت والکبریاء والعظمۃ۔

گذشتہ صفحات میں آپ ایک حدیث پڑھ آئے ہیں جس میں انی وجھت وجھی ...... کے کلمات سے نماز شروع کرنے کا بیان ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب آپ ﷺ رکوع کرتے تو ان الفاظ سے دعا کرتے۔ **اللھم لک رکعت وبک آمنت ولک اسلمت خشع لک سمعی و بصری و مخی وعظمی وعصبی** (اے اللہ! میں نے تیرے لئے رکوع کیا۔ تجھ پر ایمان لایا۔ تیرے حضور گردن جھکائی۔ تجھی پر بھروسہ کیا۔ میرے کان، آنکھیں، گوشت، خون، مغز اور پٹھے اللہ پروردگارِ عالم کے سامنے جھکے ہوئے ہیں) اور قومہ میں یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللھم ربنا لک الحمد ملأ السموت والارض و ملأ ما بینھما و ملأ ما شئت من شیئی بعد (اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! تیرے لئے سب تعریفیں ہیں۔ آسمانوں کی مخلوق، زمین کی مخلوق اور ان کے بعد جو کچھ تو پیدا فرمائے گا سب تیری تعریف میں رطب اللسان ہیں) اور جب سجدہ کرتے تو کہتے **اللھم لک سجدت و بک آمنت ولک اسلمت شق وجھی للذی خلقہ و صورہ و شق سمعہ و بصرہ تبارک اللہ احسن الخالقین** ۔ پھر آخر میں سلام اور تشہد کے درمیان بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے تھے۔ **اللھم اغفرلی ما قدمت و ما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما انت اعلم بہ منی انت**

المقدم وانت المؤخر لا الہ الا انت۔ اسے مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

دوسرے سجدہ کے بعد بغیر سہارا لئے اُٹھنا چاہیے

پھر جب دوسرے سجدہ سے سر اٹھائے تو دوسری رکعت کے لئے بغیر بیٹھے اٹھ کھڑا ہو اور زمین پر ہاتھوں سے سہارا نہ لے کیونکہ حدیث مبارک میں ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینھض فی الصلوۃ علی صدور قدمیہ. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز میں پنجوں کے بل اٹھتے تھے۔

جلسۂ استراحت کا حکم

امام شافعی فرماتے ہیں کہ دوسرے سجدہ کے بعد بیٹھے گا اور پھر دوسری رکعت کے لئے قیام کرے گا' اسے جلسۂ استراحت کہتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن مالک بن الحویرث انہ رأی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فاذا کان فی وتر من صلوتہ لم ینھض حتی یستوی قاعدا. (رواہ البخاری وابوداؤد والترمذی والنسائی)

مالک بن حویرث سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا جب آپ ایک یا تین رکعت پڑھ چکتے (اور اٹھنا ہوتا) تو اس وقت تک نہ اٹھتے جب تک سیدھے بیٹھ نہ جاتے۔

ہدایہ میں ہے کہ یہ بیٹھنا بڑھاپے میں کمزوری کی وجہ سے تھا۔

فتح القدیر میں حضرت ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ:

عن ابن مسعود انہ کان ینھض فی الصلوۃ علی صدور قدمیہ ولم یجلس.

حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ پاؤں کے پنجہ کے بل اٹھتے تھے اور بیٹھتے نہیں تھے۔

اسی طرح حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر اور حضرت علی اور رسول اللہ ﷺ کے دوسرے صحابہ علیہم الرضوان نماز میں پنجوں کے بل اٹھتے تھے۔

عن النعمان بن ابی عیاش ادرکت غیر واحد من اصحاب رسول اللہ فکان اذا رفع احدھم راسہ من السجدۃ الثانیۃ والثالثۃ ینھض کما ھو ولم یجلس.

نعمان بن ابی عیاش سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک سے زائد صحابہ کرام کو پایا کہ ان میں سے جب کوئی شخص دوسری یا تیسری رکعت کے لئے اٹھتا تو سجدہ سے سیدھا اٹھ جاتا اور بیٹھتا نہیں تھا۔

اکابر صحابہ کرام کا اس عمل پر اتفاق ہے جو مالک بن حویرث سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کا قرب رکھتے تھے۔ ان سے زیادہ آپ کی اتباع کے حریص اور آپ کی صحبت کا حظ اٹھانے والے تھے اس لئے اکثر اہل علم کا عمل اکابر صحابہ

کرام کے طریقہ پر ہے جیسا کہ ترمذی اور فتح القدیر میں مذکور ہے۔

دوسری رکعت کے لئے جب نمازی کھڑا ہوتو پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے اور پھر سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرے۔ دوسری اور پہلی رکعت میں کوئی فرق نہیں، صرف دوسری رکعت میں ثناء اور تعوذ نہیں ہے۔

بسم اللہ شریف بھی احتیاطاً پڑھی جاتی ہے کیونکہ کئی علمائے کرام کے نزدیک یہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے کہ ہر سورۃ کی ابتداء میں احتیاطاً بسم اللہ شریف پڑھی جائے کیونکہ جن لوگوں کے نزدیک بسم اللہ سورت فاتحہ کا جزء ہے ان کے نزدیک یہ ہر سورت کا جزء ہے چونکہ سورت فاتحہ کو پورا پڑھنا واجب ہے، اگر ایک آیت بھی رہ گئی تو واجب رہ جائے گا اس لئے اس کا پڑھنا احتیاطاً ضروری ہے تاکہ واجب کا ترک نہ آ جائے۔

نماز میں رفع یدین کرنا درست نہیں

تکبیر تحریمہ کے علاوہ انتقال کی تکبیروں میں رفع یدین نہ کرے یہ ہمارا مذہب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے اس کے برعکس امام احمد بن حنبل اور امام شافعی رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد رفع یدین ضروری سمجھتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اس کے خلاف ہے جبکہ ان کے متبعین کے نزدیک اٹھتے وقت اور دوسری رکعت کے قیام کے وقت رفع یدین کرنا سنت ہے۔

فتح القدیر میں امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کے ایک مباحثہ کو ذکر کیا گیا۔ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی مکہ شریف میں درزیوں کے گھر اکٹھے ہوئے جیسا کہ ابن عیینہ نے بیان کیا ہے۔ امام اوزاعی نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا آپ لوگ نماز میں رکوع کرتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین نہیں کرتے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ رفع یدین کے بارے رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے۔ امام اوزاعی کہنے لگے کیسے صحیح روایت موجود نہیں۔ مجھ سے زہری نے بیان کیا اور انہوں نے اپنے والد گرامی سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو بھی رفع یدین کرتے اور رکوع کے لئے جھکتے اور اس سے اٹھتے تو بھی رفع یدین کرتے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہم سے حماد نے بیان کیا۔

عن ابراهيم عن علقمة و الاسود عن عبد الله بن مسعود ان النبى صلى الله عليه وسلم كان لا يرفع يديه الا عند افتتاح الصلوة ثم لا يعود بشئى من ذلك

انہوں نے ابراہیم سے، انہوں نے علقمہ اور اسود سے روایت کیا اور انہوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ رفع یدین نہیں فرماتے تھے سوائے افتتاح نماز کے اور اس کے بعد اس کا اعادہ نہ کرتے۔

امام اوزاعی اور امام ابوحنیفہ کا مناظرہ

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں آپ سے زہری عن سالم عن ابیہ کی سند سے حدیث بیان کرتا ہوں اور آپ نے حماد عن ابراہیم کے حوالے سے بیان کی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا کہ حماد زہری سے زیادہ فقیہ ہیں اور

ابراہیم سالم سے زیادہ دین کی سمجھ رکھتے ہیں۔ رہے علقمہ تو وہ حضرت ابن عمر سے فقہ میں کم نہیں ہیں، اگر حضرت ابن عمر کو صحبت رسول ﷺ کا شرف ہے اور اس وجہ سے وہ افضل ہیں تو حضرت اسود کو کئی لحاظ سے فضیلت حاصل ہے۔ رہے عبداللہ تو وہ عبداللہ ہیں (یعنی ان کا تفقہ کسی سے پوشیدہ نہیں)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے رواۃ کی فقاہت کی بنیاد پر اس حدیث کو ترجیح دی جبکہ امام اوزاعی نے علو اسناد کو ترجیح کی بنیاد بنایا۔ ہمارے نزدیک فقاہت کو علو اسناد پر ترجیح ہے اور یہ ہمارا مذہب ہے۔ اس واقعہ سے فریقین کی حجیت سامنے آئی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ابن مسعود کی حدیث مرفوع نہ بھی ہو تو صحیح ہے اور اس کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے ترمذی اور ابوداؤد کی سند کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس میں عاصم بن کلیب ہے اور اس پر جرح ہوئی ہے حالانکہ وہ ثقہ ہے کیونکہ ابن معین نے اسے ثقہ شمار کیا ہے۔

اس بارے مسلم نے بھی حدیث روایت کی ہے۔ اس حدیث کی سند پر بھی یہ طعن ہے کہ اس کا راوی عبدالرحمٰن بن الاسود علقمہ سے روایت کرتا ہے مجہول ہے اور اس نے علقمہ سے نہیں سنا حالانکہ ابن حبان نے اسے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس نے علقمہ کو پایا اس لئے سماع بعید نہیں ہے۔

بہرحال حدیث کے مرفوع نہ ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ابن مسعود کا قول ثابت ہی نہیں، محض تعصب اور ایک ثابت شدہ امر کا انکار ہے۔

رفع یدین تعدد طرق سے نقل کیا گیا ہے اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان میں سے بعض راوی زیادہ فقاہت کے حامل ہیں۔ اسی طرح عدم رفع یدین بھی حضور ﷺ سے ثابت ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں آپ کا عمل مختلف رہا۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام کے عمل میں بھی رفع یدین اور عدم رفع دونوں چیزیں ہیں۔ عدمِ رفع حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بصحت ثابت ہے جیسا کہ جامع ترمذی وغیرہ سے ظاہر ہے اور عدم رفع خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہے سوائے تکبیر تحریمہ کے آپ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ دار قطنی کبھی ابراہیم عن عبداللہ کی سند سے اور کبھی عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر فلم یرفعوا ایدیھم الا عند استفتاح الصلوة.

میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے نماز شروع کرنے کے علاوہ رفع یدین نہیں فرمایا۔

دار قطنی نے تصریح فرما دی کہ ابراہیم عبداللہ بن مسعود سے مرسلاً روایت کرتے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مرسل حدیث بھی حجت ہے۔ اس کی سند میں یہ طعن بھی ہے کہ محمد بن جابر ضعیف ہے۔ فتح القدیر میں اس سلسلہ میں بہترین گفتگو کی گئی ہے۔

عن امیر المؤمنین عمر عدم الرفع الا عند الافتتاح.

امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے (بصحت) مروی ہے کہ وہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

فتح القدیر میں ہے کہ طحاوی اور بیہقی نے بیان کیا ہے۔

عن الاسود قال رأیت عمر بن الخطاب رفع یدیه فی اول تکبیرة ثم لا یعود.

حضرت اسود سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے عمر بن خطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو دیکھا کہ انہوں نے صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کیا اور پھر اس کا اعادہ نہیں کیا۔

ان اکابر صحابہ کرام سے عدم رفع ثابت ہے جبکہ ابن عمر، ابو ہریرہ، مالک بن الحویرث علیہم الرضوان وغیرہ سے تکبیر تحریمہ کے علاوہ رکوع کرتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت اور رکعتوں کی ابتداء میں رفع یدین ثابت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مختلف روایات مروی ہیں طحاوی نے بیان کیا ہے۔

عن عاصم بن کلیب عن ابیه ان علیا رفع یدیه فی اول التکبیر ثم لم یعد.

عاصم بن کلیب سے، وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی شروع نماز میں رفع یدین کرتے تھے اور اس کے بعد اس کا اعادہ نہیں فرماتے تھے۔

عاصم بن کلیب ثقہ راوی ہیں جیسا کہ پیچھے آپ پڑھ آئے ہیں۔ امام ترمذی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے روایت کرتے ہیں کہ:

کان اذا قام الی المکتوبة کبر ورفع یدیه حذو منکبیه ویصنع مثل ذلک اذا قضی قرأته واراد ان یرکع ولا یرفع یدیه فی شیء من الصلوة وهو قاعد واذا قام من السجدتین رفع یدیه.

جب آپ فرض نماز پڑھنے لگتے تو تکبیر کہتے اور کندھوں تک ہاتھ اٹھاتے اور جب قرأت کرتے اور رکوع میں جانے کا ارادہ کرتے تو بھی ایسا ہی کرتے۔ ان دو کے علاوہ نماز میں بیٹھ کر اور کہیں آپ رفع یدین نہیں کرتے تھے اور جب دونوں سجدوں سے اٹھتے تو رفع یدین کرتے۔

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کا عمل بھی مختلف تھا۔ اس سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ مختلف تھا۔ اسی طرح تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے ارکان میں رفع یدین اور عدم رفع کے بارے صحابہ کرام کا عمل بھی مختلف تھا۔ شاید رفع یدین بہت ہی قلیل ہو کہ جس وجہ سے اکابر صحابہ نے اسے اختیار نہیں کیا۔ بہر حال رفع یدین، تکبیر تحریمہ کے علاوہ سنت نہیں ہے۔ دوسرے ارکان میں رفع یدین نہ کرنا زیادہ بہتر ہے اگر کوئی رفع یدین کرتا ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ احناف نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ عدم رفع کو اختیار کیا ہے کیونکہ پہلے پہل جھکتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کیا جاتا تھا لیکن بعد میں سجدہ میں منسوخ ہو گیا چونکہ صحابہ کرام کا اس پر عمل نہیں ہے اس لئے منسوخ ہونے کا احتمال راجح ہے۔ رفع یدین کے ترک میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ علماء نے اسے احتیاطاً ترک کیا ہے۔

ہدایہ کی بعض شروح میں مذکور ہے کہ:

قال ابن مسعود رفعهما رسول الله صلى الله عليه وسلم فرفعنا هما وتركه فتركنا.

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رفع یدین کیا تو ہم نے بھی رفع یدین کیا، حضور ﷺ نے اسے ترک کیا تو ہم نے بھی ترک کر دیا۔

اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر تو واضح ہے کہ رفع یدین والی حدیثیں منسوخ ہیں۔

والله اعلم باحكامه.

دوسری رکعت کے سجدہ سے فارغ ہو کر اس طرح بیٹھے گا کہ بایاں پاؤں بچھا ہو اور اس پر سرین ہو جبکہ دایاں پاؤں کھڑا ہو گا اور دائیں پاؤں کی انگلیوں کا رخ قبلہ شریف کی طرف ہو گا۔ دایاں ہاتھ دائیں ران پر اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا ہو اور وہ تشہد پڑھے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

شہادت کی انگلی کب اور کیسے اُٹھائی جائے گی؟

تشہد پڑھتے ہوئے جب شہادتین "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده و رسوله" پر پہنچے گا تو دو چھوٹی انگلیوں کو بٹھا دے، درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنائے اور شہادت کی انگلی کو اس وقت اٹھائے جب اشهد ان لا اله کہے اور جب الا الله کہے تو انگلی کو نیچا کر لے۔ ہمارے نزدیک یہ قعدہ اور تشہد دونوں واجب ہیں۔ ان کو ترک کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی بشرطیکہ نماز دو رکعتوں والی نہ ہو۔

بیٹھنے کی یہ ہیئت حدیث سے ثابت ہے۔

روى وائل ابن حجر قدمت المدينة فقلت لانظرن الى صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما جلس يعني للتشهد افترش رجله ليسرى ووضع يده يعني على فخذه اليسرى ونصب رجله اليمنى.

وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ حاضر ہوا اور دل میں کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کو ضرور دیکھوں گا جب آپ ﷺ تشہد کے لئے بیٹھے تو اپنا بایاں پاؤں بچھایا، اپنا ہاتھ رکھا یعنی بائیں ران پر اور دائیں پاؤں کو سیدھا کھڑا کیا۔

اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ اپنی دائیں کہنی کو دائیں ران سے اٹھا ہوا رکھا۔ دو (چھوٹی) انگلیوں کو بند کر لیا اور (درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ) حلقہ بنایا پھر اپنی (شہادت کی) انگلی کو اٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ آپ اسے حرکت دے رہے تھے اور اس کے ساتھ دعا کر رہے تھے۔

وعن عبد الله بن الزبير قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قعد يدعو وضع يده اليمنى على فخذه اليمنى ويده اليسرى على فخذه اليسرى واشار بالسبابة ووضع ابهامه على اصبعه الوسطى

عبد اللہ بن زبیر سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بیٹھتے تو اپنا دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر۔ شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے۔ انگوٹھا درمیانی انگلی پر رکھتے اور بائیں ہاتھ سے گھٹنے کو پھیرتے (جس طرح لقمہ کو منہ میں پھیرا جاتا ہے)۔

ویلقم کفه الیسری رکبته. (رواہ مسلم)

تشہد کی دلیل یہ حدیث شریف ہے۔

عن ابن مسعود قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فاذا جلس احدکم فی الصلوة فلیقل التحیات لله والصلوات والطیبات السلام علیک ایها النبی ورحمة الله وبرکاته السلام علینا وعلی عباده الصالحین فاذا قال ذلک اصاب کل عبد صالح فی السماء والارض اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله ثم لیخیر من الدعاء اعجبه الیه فیدعوه. (رواہ البخاری ومسلم)

ابن مسعود کی حدیث ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں بیٹھے تو کہے۔ تمام قولی' بدنی اور مالی عبادتیں اللہ کے لئے ہیں۔ سلام ہو آپ پر اے نبی اور اللہ کی رحمت و برکتیں ہوں۔ ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔ جب نمازی یہ کلمات کہتا ہے تو زمین و آسمان میں ہر نیک بندے کو سلام پہنچ جاتا ہے۔ پھر کہے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سواء کوئی خدا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اس کے بعد اسے جو دعا پسند ہو اسے اختیار کرے اور دعا کرے۔

اس حدیث پر چھ ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔ ابن عباس کی بہ نسبت جس پر امام شافعی کا عمل ہے اس حدیث پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے۔ امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جس پر حضرت امام مالک کا عمل ہے اس کی نسبت بھی مذکورہ حدیث پر عمل اولیٰ ہے کیونکہ ابن عباس کی روایت مسلم کے افراد سے مروی ہے۔ حدیث یوں ہے۔

قال ابن عباس کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یعلمنا التشهد کما یعلمنا السورة من القرآن فکان التحیات المبارکات الصلوات الطیبات لله السلام علیک ایها النبی السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً رسول الله.

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں تشہد اس طرح سکھاتے جس طرح قرآن کریم کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔ تشہد یوں ہوتا۔ تمام مبارک قولی عبادتیں' بدنی اور مالی عبادتیں اللہ کے لئے ہیں۔ سلام ہو آپ پر اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔

امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت امام مالک کے افراد سے مروی ہے۔

عن عبد الرحمن ابن القاری انه سمع عمر بن الخطاب وهو علی المنبر یعلم الناس التشهد قولوا التحیات لله الزاکیات

عبدالرحمٰن ابن انصاری سے روایت ہے کہ اس نے عمر بن الخطاب کو منبر پر بیٹھ کر لوگوں کو یہ تشہد سکھاتے سنا۔ (آپ فرما رہے تھے) تمام قولی' بدنی اور مالی عبادتیں اللہ کے لئے

قال ابن مسعود رفعهما رسول الله صلى الله عليه وسلم فرفعنا هما وتركه فتركنا.

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رفع یدین کیا تو ہم نے بھی رفع یدین کیا' حضور ﷺ نے اسے ترک کیا تو ہم نے بھی ترک کر دیا۔

اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر تو واضح ہے کہ رفع یدین والی حدیثیں منسوخ ہیں۔

واللہ اعلم باحکامہ۔

دوسری رکعت کے سجدہ سے فارغ ہو کر اس طرح بیٹھے گا کہ بایاں پاؤں بچھا ہو اور اس پر سرین ہو جبکہ دایاں پاؤں کھڑا ہو گا اور دائیں پاؤں کی انگلیوں کا رخ قبلہ شریف کی طرف ہو گا۔ دایاں ہاتھ دائیں ران پر اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا ہوا اور وہ تشہد پڑھے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

شہادت کی انگلی کب اور کیسے اُٹھائی جائے گی؟

تشہد پڑھتے ہوئے جب شہادتین ''اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد اعبده ورسوله'' پر پہنچے گا تو دو چھوٹی انگلیوں کو بٹھا دے' درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنائے اور شہادت کی انگلی کو اس وقت اٹھائے جب اشهد ان لا اله کہے اور جب الا الله کہے تو انگلی کو نیچا کر لے۔ ہمارے نزدیک یہ قعدہ اور تشہد دونوں واجب ہیں۔ ان کو ترک کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی بشرطیکہ نماز دو رکعتوں والی نہ ہو۔

بیٹھنے کی یہ ہیئت حدیث سے ثابت ہے۔

روى وائل ابن حجر قدمت المدينة فقلت لانظرن الى صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما جلس يعني للتشهد افترش رجله ليسرى ووضع يده يعني على فخذه اليسرى ونصب رجله اليمنى.

وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ حاضر ہوا اور دل میں کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کو ضرور دیکھوں گا جب آپ ﷺ تشہد کے لئے بیٹھے تو اپنا بایاں پاؤں بچھایا' اپنا ہاتھ رکھا یعنی بائیں ران پر اور دائیں پاؤں کو سیدھا کھڑا کیا۔

اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ اپنی دائیں کہنی کو دائیں ران سے اٹھا ہوا رکھا۔ دو (چھوٹی) انگلیوں کو بند کر لیا اور (درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ) حلقہ بنایا پھر اپنی (شہادت کی) انگلی کو اٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ آپ اسے حرکت دے رہے تھے اور اس کے ساتھ دعا کر رہے تھے۔

وعن عبد الله بن الزبير قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قعد يدعو وضع يده اليمنى على فخذه اليمنى ويده اليسرى على فخذه اليسرى واشار بالسبابة ووضع ابهامه على اصبعه الوسطى

عبد اللہ بن زبیر سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بیٹھتے تو اپنا دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر۔ شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے۔ انگوٹھا درمیانی انگلی پر رکھتے اور بائیں ہاتھ سے گھٹنے کو پھیرتے (جس طرح لقمہ کو منہ میں پھیرا جاتا ہے)۔

کشادہ رکھے اس لئے یہ اس کے منافی نہیں کہ شہادت پر پہنچ کر حلقہ بنا کر انگلی سے اشارہ کیا جائے۔ یہی صحیح اور اسی کو اہل تحقیق نے اختیار کیا ہے۔

اس پر مسلم کی مذکورہ روایت بھی دلالت کرتی ہے۔ سو حلقہ بنانا اور اشارہ کرنا دونوں سنت ہیں اور ان کا ترک گناہ ہے ہمارے آئمہ کا بلا اختلاف یہی مذہب ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں چھوٹی دو انگلیوں اور درمیانی انگلی (یعنی) تینوں کو بند کرے۔ درمیانی انگلی کو انگوٹھے سے ملائے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

عن ابن عمر قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قعد في التشهد وضع يده اليسرى على ركبته اليسرى ويده اليمنى على ركبته اليمنى وعقد ثلثة وخمسين واشار بالسبابة.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد میں بیٹھتے تو بائیں ہاتھ کو اپنے بائیں گھٹنے پر رکھتے اور دائیں ہاتھ کو دائیں گھٹنے پر۔ تین انگلیوں کو اور درمیانی انگلی کو بند کرتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے۔

اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ کبھی ہاتھ پہلی کیفیت پر بند کرتے تھے اور کبھی دوسری ہیئت کو اپناتے تھے اس لئے دونوں طریقے سنت ہیں۔ دونوں میں سے جو طریقہ کوئی اپنانا چاہے اپنا سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں سنت پر عمل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم باحکامہ۔

جب نمازی تشہد سے فارغ ہو تو چار یا تین رکعتوں والی نماز میں زمین پر ہاتھ ٹیکے بغیر سیدھا کھڑا ہو جائے بلکہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر سہارا لے۔

فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھنا سنت ہے

تیسری رکعت میں صرف سورت فاتحہ پڑھے اسی طرح چوتھی رکعت میں بھی صرف سورت فاتحہ پڑھے، تیسری اور چوتھی رکعت میں سورت فاتحہ کی تلاوت سنت ہے، اگر چاہے تو خاموش رہے چاہے تو سبحان اللہ کا ورد کرے۔

سورۃ فاتحہ کا سنت ہونا اس حدیث سے ثابت ہے۔

روى ابو قتادة قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يقرء في الظهر في الاولين بام الكتاب وسورتين وفي الركعتين الاخريين بام الكتاب ويسمعنا الاية احيانا ويطول في قرأة الاولى مالا يطول في الركعة الثانية وهكذا في الصبح. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو قتادہ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور کوئی دو سورتیں پڑھتے اور دوسری دو رکعتوں میں صرف سورت فاتحہ کی تلاوت فرماتے کبھی کبھی ہمیں کوئی آیت سنا بھی دیتے۔ جتنی لمبی قرأت پہلی رکعت میں فرماتے اتنی دوسری رکعت میں نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ صبح کی نماز میں بھی ایسے ہی کرتے تھے۔

ان دو رکعتوں میں قرأت واجب کیوں نہیں اس کی دلیل ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے۔

عن ابن مسعود و امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہما قالا اقرء فی الاولیین وسبح فی الاخرین.

حضرت ابن مسعود اور امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قرأت کرو اور دوسری دو رکعتوں میں تسبیح کرو۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس کی سند منقطع ہے لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ منقطع حجت ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ مؤطا میں فرماتے ہیں کہ:

عن علقمة ان عبد الله بن مسعود کان لایقرء خلف الامام فیما یجهر فیه وفیما یخافت فیه لا فی الاولیین ولا فی الاخریین واذا صلی وحده قرء فی الاولیین بفاتحة الکتاب وسورة ولم یقرء فی الاخریین بشئی.

حضرت علقمہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن مسعود جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی ان نمازوں میں جن میں قرأت آہستہ کی جاتی ہے نہ پہلی دو رکعتوں میں اور نہ ہی دوسری دو رکعتوں میں اور جب اکیلے نماز پڑھتے تو پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور کسی دوسری سورت کی تلاوت کرتے جبکہ دوسری دو رکعتوں میں کچھ نہیں پڑھتے تھے۔

آخری قعدہ

جب تین رکعتوں والی نماز کی تیسری رکعت کے سجدہ سے اور چار رکعتوں والی نماز کی چوتھی رکعت کے سجدہ سے فارغ ہو تو مذکورہ طریقہ کے مطابق بیٹھے، تشہد پڑھے پھر حضور ﷺ پر درود پڑھے اور اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے لیکن یہ دعا لوگوں کے کلام کے مشابہ نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ماثورہ دعا پڑھے ایک ماثورہ دعا یہ ہے۔ اللھم انی اعوذبک من عذابک جهنم ومن عذاب القبر ومن فتنة المحیا والممات ومن فتنة المسیح الدجال (اے اللہ میں تیرے عذاب یعنی جہنم سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور عذابِ قبر، زندوں مردوں اور مسیح دجال کے فتنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں) دعا کے بعد پہلے دائیں طرف سلام پھیرے اور نیت کرے کہ اس طرف جتنے مقتدی اور محافظ فرشتے ہیں سب کو سلام کر رہا ہوں پھر بائیں طرف سلام پھیرے اور یہی نیت کرے، اگر اکیلے نماز پڑھ رہا ہے تو صرف محافظ فرشتوں کو سلام کرنے کی نیت کرے۔

قعدہ کا یہ طریقہ اس حدیث سے ثابت ہے۔

عن ابن عمر ان من سنة الصلوة ان تضجع رجلک الیسری وتنصب الیمنی واستقباله باصابعها القبلة والجلوس علی الیسری. (رواہ النسائی)

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ نماز میں سنت طریقہ یہ ہے کہ تو بائیں پاؤں کو بچھائے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور دائیں پاؤں کی انگلیاں قبلہ کے رخ پر ہوں اور بائیں پاؤں پر بیٹھا ہو۔

امام شافعی کے نزدیک قعدہ آخیرہ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھنا سنت ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سرین زمین پر لگی ہو، بائیں ٹانگ دائیں ران کے نیچے ہو اور دائیں ٹانگ اس کے اوپر رکھی ہو اور کوئی پاؤں کھڑا نہ ہو۔

بخاری شریف میں ابو حمید کی حدیث کے حوالے سے آخری قعدہ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کو سنت طریقہ قرار دیا گیا ہے اس موضوع پر اور بھی روایات ہیں' لیکن یہ اس وقت حجت ہوتیں جب اس طرح بیٹھنا عذر کے بغیر ہوتا کبھی کبھار اس طرح بیٹھنا حضرت ابن عمر کی تصریح کے معارض نہیں یہی طریقہ نماز میں سنت ہے۔ و اللہ اعلم.

عورتوں کے لئے آلتی پالتی مار کر بیٹھنا جائز ہے کیونکہ اس میں پردہ کا زیادہ اہتمام ہے۔

نماز میں درود شریف پڑھنا سُنت ہے

رہا نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا تو یہ اہم ترین عبادت ہے اور اس کی قبولیت کی زیادہ امید کی جا سکتی ہے لیکن ہمارے نزدیک درود پاک سنت ہے اور اس کا ترک سخت گناہ ہے۔ اس میں یہ اندیشہ بھی ہے کہ نماز کے فوائد مرتب نہیں ہوں گے امام شافعی کے نزدیک درود پاک فرض ہے مگر احیاء العلوم میں حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اسے فرض نہیں لکھتے۔ آج تک مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ امام شافعی کے نزدیک درود پاک کا پڑھنا فرض کس بناء پر ہے؟ رب قدوس کے ارشاد یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا سے تو اس کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اس سے تو عمر میں ایک بار درود کی فرضیت ثابت ہوتی ہے کیونکہ امر مطلق تکرار کا فائدہ نہیں دیتا۔ پس جب آپ ﷺ کا نام نامی یا صفاتی نام یا کوئی لفظ جو آپ پر دال ہو' لیا جائے یا سنا جائے تو درود واجب ہو جاتا ہے۔

فقد روی امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم البخیل من ذکرت عندہ فلم یصل علی. (رواہ الترمذی)

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص بخیل ہے جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور مجھ پر دورد نہ بھیجے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رغم انف رجل ذکرت عندہ ولم یصل علی ورغم انف رجل اتی علیہ رمضان ثم انسلخ قبل ان یغفر لہ ورغم انف رجل دخل ابواہ الکبر او احدھما فلم یدخلہ الجنۃ. (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر دود نہ بھیجے۔ اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جو رمضان کا مہینہ پائے اور اس کی مغفرت سے پہلے گزر جائے' اس شخص کی (بھی) ناک خاک آلود ہو جو اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پائے اور (ان کی خدمت) اسے جنت میں نہ لے جائے۔

دونوں طرف سلام پھیرنا

رہا سلام تو وہ امام حسن کی روایت کے مطابق سنت ہے جبکہ ظاہر روایت کے مطابق امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے' سلام امام شافعی کے نزدیک فرض ہے۔ تبیان المذاھب میں ایسے ہی ہے۔

بلاشبہ امام شافعی کی رائے اور امام ابو حنیفہ کی ظاہری روایت میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ امام شافعی فرض سے وہی چیز مراد لیتے ہیں جو ہم واجب سے مراد لیتے ہیں' اگر رکنیت یا شرطیت کا امام شافعی دعویٰ کرتے تو پھر اختلاف ہوتا لیکن رکن یا شرط ہونے کا دعویٰ ان کا بھی نہیں ہے۔

اس کی دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے اور اس سے باہر آنا سلام (کے ساتھ) ہے اور جب تک تحلیل (نماز سے باہر آنا) سلام میں منحصر نہ ہو یہ بات پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ یہاں بات مشروع اور مسنون تحلیل کی ہے مطلقاً تحلیل کی نہیں کیونکہ مطلقاً تحلیل تو گفتگو سے بھی ممکن ہے پہلی صورت ظاہر الروایت کی تائید کرتی ہے۔ مشروع تحلیل کے منحصر ہونے سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اس کے بغیر نماز سے نکلنا صحیح نہیں ہے۔ نماز سے باہر آنے کے لئے سلام واجب ہے دوسری صورت میں تحلیل مسنون انحصار لازم آتا ہے سو بغیر سلام کے نماز سے باہر آنا مسنون طریقہ نہیں ہے اور اس سے حسن کی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ میرے نزدیک صحیح رائے حسن کی روایت ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں اگر ان کے اس کلام کو شامل کیا جائے جب تم نے یہ کلمات کہے یا یہ کلمات ادا کئے تو تیری نماز مکمل ہوگئی اگر چاہے تو کھڑا ہو جا جیسے ہم ذکر کر چکے ہیں تو سلام سنت ہے فرض نہیں اور ایک سلام دو کے قائم مقام نہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں طرف سلام پھیرنا سنت ہے۔

عن سعد قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يسلم عن يمينه وعن يساره حتى ارى بياض خده. (رواہ مسلم والنسائی)

حضرت سعد سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں اور بائیں سلام پھیرتے تو آپ کے رخساروں کی سفیدی نظر آتی۔

عن ابن مسعود ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يسلم عن يمينه وعن يساره السلام عليكم ورحمة الله.

(رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں بائیں سلام پھیرتے (اور کہتے) السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

وائل بن حجر سے بھی ایسے ہی روایت ہے۔

عن جابر ابن سمرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما يكفي احدكم ان يضع على فخذه ثم يسلم على اخيه من عن يمينه وشماله. (رواہ مسلم وابوداؤد)

جابر بن سمرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہاتھ اپنی ران پر رکھے اور دائیں بائیں بیٹھے اپنے بھائی پر سلام کرے۔

امام مالک کے نزدیک صرف سامنے ایک ہی سلام ہے ان کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يسلم في الصلوة تسليمة واحدة تلقاء وجهه ثم يميل الى

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ سامنے کی طرف صرف ایک سلام کرتے تھے پھر قدرے دائیں طرف مڑتے تھے۔

الشق الایمن شیئا. (رواہ الترمذی)

دوسلاموں والی احادیث کو کئی اعتبار سے ترجیح حاصل ہے ترجیح کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دوسلاموں والی حدیث مشہور ہے جبکہ ایک سلام والی حدیث خبر واحد ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسلاموں والی حدیث کو بخاری کے علاوہ پانچ آئمہ صحاح نے روایت کیا ہے جبکہ ایک سلام والی کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ دوسلاموں والی حدیث قولی ہے اور دوسری فعلی اور یہ اصولی بات ہے کہ جب قولی اور فعلی حدیث میں تعارض ہوتو قولی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے۔

بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے کے متعلق گفتگو

اب تک کی گفتگو تندرست آدمی کے لئے تھی۔ مریض اپنی طاقت کے مطابق عمل کرے گا' اگر قیام پر قادر نہیں یا ڈرتا ہے کہ تندرست ہونے میں دیر ہو جائے گی یا بیماری بڑھ جائے گی یا درد میں اضافہ ہو جائے گا تو بیٹھ کر نماز پڑھے۔ قیام اس سے ساقط ہو جائے گا لیکن اس پر رکوع اور سجدہ ضروری ہے' اگر کوئی شخص اتنا بیمار ہے کہ بیٹھ بھی نہیں سکتا تو لیٹ کر نماز پڑھے اور پاؤں کعبہ شریف کی طرف کر لے۔ (کیونکہ قبلہ رو ہونا شرط ہے) یا پہلو کے بل لیٹے اور چہرہ قبلہ کی طرف کر لے۔ جب آدمی لیٹے لیٹے نماز پڑھے گا تو رکوع اور سجود کے لئے اشارہ کرے گا۔ اس طرح اس سے رکوع اور سجدہ بھی ساقط ہو جائیں گے۔

عن عمران بن الحصین قال کانت بی بواسیر فسألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الصلوۃ قال صل قائما فان لم تستطع فقاعدا فان لم تستطع فعلی جنب.

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ مجھے بواسیر تھی میں نے نبی کریم ﷺ سے نماز کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا: کھڑے ہو کر پڑھو اگر کھڑا ہونے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر اگر بیٹھنے کی بھی طاقت نہیں تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے مسلم کے علاوہ محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ نسائی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں' اگر بیٹھنے کی طاقت نہیں تو سیدھا لیٹ کر پڑھو (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو صرف وہی حکم دیتا ہے جس کی وہ استطاعت رکھتا ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ جب پہلو کے بل لیٹنا مشکل ہو جائے تو مریض سیدھا لیٹ کر نماز پڑھے۔ ہمارے نزدیک تکیہ لگا کر پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھنا پہلو کے بل لیٹ کر پڑھنے سے افضل ہے کیونکہ پیٹھ کے بل لیٹے ہوئے رکوع اور سجود کے لئے اشارہ قبلہ رخ پر ہوگا جبکہ پہلو کے بل لیٹ کر اشارہ پاؤں کی طرف ہوگا۔

حدیث کی مذکورہ توجیہ کہ جب پہلو کے بل نہ لیٹ سکے گا تو تب پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز ادا کرے صحیح نہیں کیونکہ جو شخص بواسیر کی تکلیف میں مبتلا ہو اس کے لئے پہلو کے بل لیٹنا بنسبت پیٹھ کے بل لیٹنے کے آسان ہے اسی لئے شاید حضور ﷺ نے ''اگر پیٹھ کے بل نہ لیٹ سکے'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ''اگر طاقت نہ ہو'' نہیں

فرمایا پھر حدیث پاک میں فا کا کلمہ ہے: ''ان لـم تستطع علی القعود فمستلقیاً اگر بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر''۔ اَوْ یعنی یا نہیں فرمایا کیونکہ اس طرح لیٹنے اور بیٹھنے میں کوئی فرق نہ رہ جاتا۔ مقصود یہ ہے کہ اصل پیٹھ کے بل لیٹنا ہے اگر مریض بیٹھ تو سکتا ہے لیکن رکوع اور سجدہ نہیں کر سکتا تو بیٹھ کر نماز پڑھے اور رکوع و سجود کے لئے جھک کر اشارہ کرے لیکن یہ یاد رہے کہ سجدہ کے لئے رکوع کی نسبتاً زیادہ جھکے کیونکہ احکام طاقت کے مطابق لاگو ہوتے ہیں اور بیٹھنا مطلوب ہے جبکہ نمازی کھڑا نہ ہوسکتا ہو۔

زمین سے کسی چیز کو اٹھا کر اس پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ:

ابن عمر كان يقول اذا لم يستطع المريض السجود اومی برأسه ايماء ولم يرفع الى جبهة شيئا. (رواہ مالک)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ جب مریض سجدہ نہ کر سکے تو سر کے ساتھ سجدہ کے لئے اشارہ کرے اور اپنی پیشانی کی طرف کوئی چیز اٹھا کر نہ لے جائے۔

فتح القدیر میں بزاز اور بیہقی کے حوالے سے ہے۔

عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عاد مريضا يصلی علی وسادة فاخذها فرمی بها فاخذ عودا ليصلی عليه فاخذه فرمی به قال صلی الارض ان استطعت والا فاء م ايماء واجعل سجودک اخفض من رکوعک.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مریض کی عیادت کی جو تکیہ پر نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے تکیہ اٹھا کر پھینک دیا اس نے ایک لکڑی اٹھا لی تا کہ اس پر نماز پڑھے حضور ﷺ نے وہ لکڑی بھی اٹھا کر پھینک دی اور فرمایا: زمین پر نماز پڑھ اگر طاقت ہے تو ورنہ اشارہ کر اور رکوع کے اشارہ سے سجدہ کا اشارہ پست ہو۔

اگر مریض کھڑا ہوسکتا ہو لیکن رکوع و سجود نہ کر سکتا ہو تو اس پر قیام لازم نہیں بلکہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا اور رکوع و سجود کے لئے اشارہ کرے گا۔ ''قیام لازم نہیں'' کے الفاظ میں جواز کا اشارہ ہے۔ یعنی اگر قیام کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ ہدایہ میں قیام لازم نہ ہونے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ قیام کی رکنیت رکوع و سجود کی وجہ سے ہے کیونکہ اس میں تعظیم ہے جب رکوع و سجود کا وسیلہ نہ رہا تو قیام لازم نہ رہا۔

ہدایہ کی اس توجیہ میں کلام ہے۔ قیام کا رکن صرف توسل کی بناء پر ہونا صحیح نہیں ہے۔ اس کے لئے دلیل چاہئے۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ اس کی رکنیت صرف رکوع و سجود کی تعظیم کے لئے ہو اگر ایسا ہوتا تو طویل قیام لازم کیوں ہوتا' معمولی سا کھڑا ہونا کافی ہوتا۔ اس کا فی نفسہ رکن ہونا صحیح ہے کیونکہ اس میں تعظیم بھی ہے اور اسی کے توسل سے رکوع و سجود بھی ادا ہوتا ہے لہٰذا قیام کا عدم لزوم' لازم نہیں آتا۔ اسے سمجھیے۔

اگر مریض بالکل اشارہ بھی نہ کر سکتا ہو تو نماز کو مؤخر کرے۔ اللہ تعالیٰ عذر کو زیادہ قبول کرنے والا ہے۔ ہدایہ شریف میں ہے کہ اس سے نماز ساقط نہیں ہوئی کیونکہ وہ خطاب کو سمجھنے والا ہے' اگر چہ یہی حالت ایک دن اور ایک رات سے زائد مدت کے لئے طاری رہتی ہے۔ کلام اس مریض کے بارے میں ہے جو ہوش میں ہے اور بعد میں

صحیح ہو جاتا ہے لیکن جو اس بیماری میں مر گیا تو اس سے قضاء ساقط ہو جاتی ہے اور اس کے ذمہ وصیت لازم نہیں رہتی۔ فتح القدیر میں ایسے ہی ہے۔ قضاء کی وصیت اس لئے اس پر لازم نہیں کیونکہ وہ ادا پر قادر نہیں تھا اور قدرت مکلّف ہونے کے لئے شرط ہے بلکہ اس کے ذمہ نفس وجوب ہے تاکہ اس پر قضاء مرتب ہو سکے۔ جس طرح سونے والے پر اور جب مریض قضاء پر بھی قادر نہ ہوا تو نفس وجوب کا کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس سے مواخذہ نہیں فرمائے گا۔ اسے سمجھئے۔

اگر مریض نے بیٹھ کر نماز شروع کی، رکوع و سجود کر رہا تھا لیکن کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اچانک کھڑا ہونے پر قادر ہو گیا تو بقیہ نماز کھڑے ہو کر پڑھے۔ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک اسی پر بناء کرے لیکن امام محمد کے نزدیک نئے سرے سے پڑھے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس اختلاف کی بنیاد کھڑے ہونے والے کی بیٹھنے والے کی اقتداء ہے۔ شیخین کے نزدیک مقتدی اگر کھڑا ہو سکتا ہے لیکن امام کھڑا نہیں ہو سکتا تو اقتداء جائز ہے جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسے امام کی اقتداء صحیح نہیں۔ مذکورہ مسئلے میں اختلاف کی بنیاد بھی یہی اختلاف ہے۔

اگر نمازی اشارہ سے نماز پڑھ رہا تھا کہ رکوع و سجود کرنے پر قادر ہو گیا تو تمام کے نزدیک نئے سرے سے نماز پڑھے کیونکہ علماء فرماتے ہیں کہ اصل میں رکوع اور سجدہ کرنے والا اشارہ کرنے والے کی اقتداء نہیں کر سکتا۔

اگر کھڑے ہو کر رکوع و سجود کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ قیام سے عاجز آ گیا تو بیٹھ کر نماز پڑھے اور اسی نماز کو جاری رکھے یا کھڑے ہو کر رکوع و سجود کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ رکوع و سجود سے عاجز آ گیا تو نماز جاری رکھتے ہوئے بقیہ نماز اشارے سے ادا کرے کیونکہ اس میں ادنیٰ کی اعلیٰ پر بناء کی گئی ہے۔

کشتی میں نماز کا حکم

کوئی شخص کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھ رہا تھا اور کشتی کنارے سے بندھی ہوئی تھی۔ نمازی معذور بھی نہیں تھا یا کشتی چل رہی تھی۔ صاحبین کے نزدیک اس کی نماز نہیں ہو گی کیونکہ کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ عموماً کشتی میں سر چکرا جاتا ہے اگر ہو سکے تو بہتر یہ ہے کہ کشتی سے اتر کر باہر آ کر نماز پڑھے۔

نماز پڑھتے ہوئے بے ہوش ہو جانا

اگر کوئی شخص بے ہوش ہو گیا اگر بے ہوشی ایک دن اور رات سے زائد نہیں تو اس کا حکم نیند کا ہے، افاقہ پر قضاء کرے گا اگر ایک دن اور رات سے زائد مدت تک بے ہوش رہتا ہے تو اس کے ذمہ سے نماز ساقط ہو جائے گی کیونکہ اب وہ جنون کے قائم مقام ہے کیونکہ بے ہوشی عموماً ایک دن اور رات سے زیادہ طاری نہیں رہتی۔ اس سے زائد بے ہوشی دماغی خلل کا باعث ہوتی ہے مثلاً سرسام میں آدمی کئی کئی دن تک بھی بے ہوش رہ سکتا ہے لہٰذا اسے جنون کے قائم مقام رکھیں گے۔

امام محمد کے نزدیک دن اور رات کا حساب اوقات کے مطابق ہوگا اور شیخین کے نزدیک اس کا حساب گھنٹوں کے اعتبار سے ہوگا۔ فتح القدیر میں امام محمد کی سند سے حضرت ابن عمر کے بارے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو ایک دن اور رات بے ہوش رہے اس پر قضاء ہے۔ اور ابراہیم حربی روایت کرتے ہیں۔

ان ابن عمر اغمی علیہ یوما ولیلۃ فافاق فلم یقض۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک دن اور ایک رات تک بے ہوش رہے لیکن انہوں نے نماز کی قضاء نہیں کی۔

ہوسکتا ہے ایک دن اور ایک رات سے کچھ وقت زیادہ ہوگیا ہو اور اس لئے افاقہ آنے پر انہوں نے قضاء نہ کی ہو اور راوی نے اس قلیل وقت کا خیال نہ رکھا ہو۔ فقہاء اس اثر کو ایک دن اور ایک رات سے زائد کے الفاظ سے نقل کرتے ہیں۔ دار قطنی کی روایت ہے کہ:

ان عمار بن یاسر اغمی علیہ فی الظہر والعصر والمغرب والعشاء فافاق فی نصف اللیل فقضاھن۔

عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں بے ہوش رہے۔ آدھی رات کے وقت انہیں افاقہ ہوا تو انہوں نے ان نمازوں کی قضاء فرمائی۔

یہ آثار امام شافعی کے خلاف دلیل ہیں کہ ایک نماز کا کامل وقت اگر بے ہوشی میں گزر جائے تو قضاء ساقط ہو جاتی ہے۔ امام شافعی کا قول شرعی اصولوں کے عین مطابق ہے کیونکہ مکلف ہونے کیلئے سمجھنا شرط ہے۔ جب آدمی بے ہوش ہے اور خطاب کا فہم ہی نہیں رکھتا تو مکلف ہونا کیسا؟

ہم بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عدم فہم کی وجہ سے مکلف نہیں لیکن اس کے ذمے نفس وجوب تو ہے جیسے سونے والے پر نماز فرض ہے۔ اس کا تعلق مکلف ہونے سے نہیں یہ معاملہ خبر سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے خلاف دلیل چاہیئے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ سونے والے پر بھی نماز فرض نہ ہو لیکن اس بارے اثر موجود ہے۔ واللہ اعلم

مفسداتِ نماز کا بیان

گفتگو

جن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے ان میں سے ایک گفتگو ہے۔ ہمارے نزدیک کوئی گفتگو بھول کر کرے یا جان بوجھ کر کرے، گفتگو سے اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ امام شافعی فرماتے ہیں بھول کر گفتگو کی تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔ ان کی دلیل یہ مشہور حدیث ہے۔

رفع عن امتی الخطاء والنسیان۔

میری امت سے غلطی اور بھول کو اٹھالیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی بھول چوک میں غلطی کا ارتکاب کرے گا تو گناہ گار نہیں ہوگا۔ علم اصول میں یہی چیز صحیح قرار دی گئی ہے۔ اس پر روزے میں بھول کر کھانے پینے کو قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مقیس علیہ خلاف قیاس ہے اس لئے نماز میں بھول کر گفتگو کرنے کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے روزے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اسے یاد دلائے کہ وہ روزے سے ہے جبکہ نماز میں نماز کی ہیئت اسے نماز میں ہونا

یاد دلاتی ہے۔ یاد دلانے والی چیز کے ہوتے ہوئے بھول چوک کا اعتبار نہ کرنا اس بات کا موجب نہیں بن سکتی کہ یاد دلانے والی چیز کے ہوتے ہوئے بھول چوک کا اعتبار نہ کیا جائے۔ یہ اصولی بحث تھی۔ اب آتے ہیں آثار کی طرف ہماری دلیل یہ حدیث ہے:

عن زید بن ارقم کنا نتکلم فی الصلوۃ یکلم الرجل صاحبہ وھو الی جنبہ حتی نزلت وقوموا للہ قانتین فامرنا بالسکوت ونھینا عن الکلام. (رواہ البخاری ومسلم)

زید بن ارقم سے روایت ہے کہ ہم نماز میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ ایک آدمی اپنے ساتھ والے آدمی سے بات چیت کر لیتا تھا حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ وقوموا للہ قانتین. اس کے بعد ہمیں سکوت کا حکم دیا گیا اور ہم نے گفتگو کرنا چھوڑ دیا۔

اور خاموش رہنے کا یہ حکم عام ہے، اگر کوئی غلطی سے، بھول کر یا خطاً کسی طرح بھی بولے گا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ آیت نماز میں کلام سے روکنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عدم کلام نماز میں شرط ہے حتیٰ کہ اگر کوئی کلام کرے تو نماز ٹوٹ جائے گی کہ شرط نہیں پائی جارہی کیونکہ ہم کہتے ہیں آیت کریمہ میں نماز کے ایک رکن قیام کو بیان کیا جارہا ہے اور شارع نے اسے اس حال میں رکن بنایا ہے کہ وہ کلام سے خالی ہو۔ جب اس میں کلام پایا گیا تو نماز کا ایک رکن نہ پایا گیا اور رکنیت کے نہ پائے جانے کی وجہ سے نماز فاسد ہوگئی۔ میرے نزدیک تو یہی ہے۔ دوسرے علماء نے اس مقام پر طویل گفتگو کی ہے جس کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

آہیں بھرنا

اگر کسی نے نماز میں آہ کی اگر وہ آخرت کی یاد یا یادِ الٰہی کی وجہ سے ہے تو نماز نہیں ٹوٹے گی اور اسے خشوع کہیں گے اور اگر کسی ذاتی مصیبت یا جسمانی درد کی وجہ سے ہے تو نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ یہ آہ انسانی کلام سے تعلق رکھتی ہے۔

بغیر عذر کے کھانسنا

اگر کوئی نماز میں بغیر عذر کے کھانسا اور کھانسی سے حرف پیدا ہو گئے تو نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ کھانسی کلام بن جائے گی، اگر کھانسی عذر کی وجہ سے ہو کہ روکی نہ جاسکے تو چھینک اور ڈکار کی طرح معاف ہے جبکہ اس سے حرف بھی پیدا ہو جائے۔

چھینک کا جواب دینا

اگر کسی نے کسی شخص کے جواب میں سبحان اللہ کہا یا چھینک کا جواب دیا یا سلام کا جواب دیا۔ یا یحییٰ نامی شخص کو یہ کہنے کے لئے کتاب لے جاؤ اشارۃً آیت کا یہ حصہ پڑھا یا یحییٰ خذ الکتاب تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ نیت پر انحصار ہے اگر یہی لفظ تلاوتِ قرآن کی غرض سے ہوں گے تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ قرآن کریم اور تسبیح (سبحان اللہ) نیت سے تبدیل نہیں ہو جاتے کہ نماز ٹوٹ جائے لیکن صحیح یہ ہے کہ نیت کی تبدیلی سے یہ الفاظ قرآن سے غیر قرآن بن جاتے ہیں۔ حضرت سری سقطی جو امام العرفاء ہیں فرماتے ہیں کہ: جب دوسرے مسلمانوں کی دکانیں جل جائیں اور میری دکان آگ کی لپیٹ سے بچ جائے اور میں اس پر الحمدللہ کہوں تو میں ایسی الحمدللہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معافی کی درخواست کرتا ہوں۔

نماز میں چھینک کا جواب دینا جائز نہیں کیونکہ حدیث میں اس سے روکا گیا ہے۔

عن معوية بن الحكم قال بينا انا نصلي مع رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا عطس رجل من القوم فقلت يرحمك الله فرماني القوم بابصارهم فقلت واثكل امياه ماشانكم تنظرون الي فجعلوا يضربون بايديهم على افخاذهم فلمارا يتهم ليصمتونني لكني سكت فلما صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم دعانى فبابى هو وامى مارأيت معلما قبله ولا بعده مثله فوالله ماكرهني ولاضربني ولاشتمني وقال ان هذه الصلوة لا يصلح فيها شيء من كلام انما هي التسبيح والتكبير وقرأة القرآن اوكما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم. (رواہ مسلم)

معاویہ بن حکم سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک نمازی کو چھینک آ گئی اور میں نے یرحمک اللہ کہہ دیا۔ لوگوں نے مجھے تیز آنکھوں سے دیکھا تو میں نے کہا کاش مجھ پر میری ماں رو چکتی تم کیوں مجھے یوں گھور رہے ہو تو وہ اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے لگے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش کرا رہے ہیں تو میں خاموش ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو مجھے طلب فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ایسا استاد نہ میں نے پہلے دیکھا اور نہ بعد میں دیکھوں گا بخدا نہ آپ نے مجھ سے نفرت کی' نہ مارا اور نہ ہی مجھے برا بھلا کہا فرمایا: یہ نماز ہے۔ اس میں کسی قسم کی انسانی گفتگو جائز نہیں ہے۔ نماز تو صرف تسبیح' تکبیر اور قرآن کی تلاوت کا نام ہے۔ او کمال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حدیث پاک کے مذکورہ الفاظ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چھینک کے جواب کو انسانی کلام قرار دیا ہے اور فرمایا کہ گفتگو سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

سلام کے جواب سے نماز کے ٹوٹنے کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے:

عن ابن مسعود قال كنا نسلم على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو في الصلوة فيردعلينا فلما رجعنا من عند النجاشي سلمنا عليه فلم يردعلينا فقلنا يا رسول الله صلى الله عليه وسلم كنا نسلم

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم عہد رسالت میں آپ کو سلام کرتے حالانکہ آپ نماز پڑھ رہے ہوتے لیکن ہمیں جواب مرحمت فرماتے پھر جب ہم نجاشی کے پاس سے واپس آئے تو ہم نے آپ کی خدمت میں سلام پیش کیا لیکن آپ نے

علیک فی الصلوۃ قال ان فی الصلوۃ شغلا. (رواہ البخاری ومسلم وابوداؤد)

جواب نہ دیا۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم حالتِ نماز میں سلام عرض کرتے تھے (اور آپ جواب دیتے تھے مگر اب نہیں) فرمایا اس سے نماز میں خلل واقع ہوتا ہے۔

اگر چھینک مارنے والے یا سننے والے نے الحمد للہ کہا تو فقہاء کے بقول نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ عرف میں یہ الفاظ چھینک کا جواب نہیں۔ ہدایہ میں بھی ایسے ہی ہے مگر فتح القدیر میں اشارہ اس کے خلاف ملتا ہے کیونکہ امام ابو حنیفہ سے روایت ہے کہ ہونٹوں کی حرکت سے بھی نماز ٹوٹ جاتی ہے (یعنی ضروری نہیں کہ گفتگو ساتھ والے آدمی کو سنائی دے)۔

غیر امام کو لقمہ دینا

اپنے امام کے علاوہ کسی اور قرآن پڑھنے والے کو غلطی پر لقمہ دینا بھی نماز کو توڑ دیتا ہے کیونکہ یہ قرأت نہیں، سیکھنا اور سکھانا ہے جو نماز کے افعال کی جنس سے نہیں ہے۔ کچھ لوگ تکرار کو شرط قرار دیتے ہیں یعنی اگر لقمہ ایک سے زائد مرتبہ ہوگا تو نماز ٹوٹے گی۔ الجامع میں ہے کہ تکرار شرط نہیں، ایک بار لقمہ دینے سے بھی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ یہ گفتگو ہے اور گفتگو سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، اگر چہ بہت ہی کم ہو جیسا کہ ہدایہ شریف میں ہے۔

صاحبِ فتح القدیر نے الجامع کی رائے کو صحیح ترین قرار دیا ہے، اگر اپنے امام کو لقمہ دیا کہ نماز کی اصلاح کرے تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔

عن المسور ان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرء في الصلوة فيترك منه شيئا لم يقرؤه فقال له رجل يا رسول الله صلى الله عليه وسلم تركت آية كذا كذا قال فهلا ذكرتنيها قال كنت ارى انها قد نسخت. (رواہ ابوداؤد)

حضرت مسور (ابن یزید مالکی) رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں قرأت فرمائی اور آپ سے کچھ الفاظ چھوٹ گئے جن کی قرأت آپ نے نہ کی۔ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ آپ نے فلاں آیت چھوڑ دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے مجھے وہ آیت یاد کیوں نہیں کروائی؟ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا میں تو یہ سمجھتا تھا کہ وہ منسوخ ہوگئی ہے۔

اگر امام دوسری آیت کی طرف چلا گیا (اور پھر بھی مقتدی لقمہ دیتا رہا) تو مقتدی کی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ یہ تلقین ہے اور تلقین بلا عذر ہے جیسا کہ ہدایہ شریف میں مذکور ہے۔

لیکن حدیث کا حکم اس سے مختلف ہے جو کسی سے مخفی نہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ یہ رائے بعض مشائخ کی ہے۔ عامۃ الفقہاء مبسوط کے نظریئے پر ہیں کہ اس سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ مقتدی کو لقمہ دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے اور امام کو ایک ہی آیت میں نہیں الجھا رہنا چاہئے، اگر رکوع آ گیا ہے تو رکوع کر لے یا کسی اور آیت کو شروع کرے۔ رکوع کا وقت اتنی قرأت کا

کر چکنا ہے جس سے نماز ہو سکتی ہو اور ایک قول یہ ہے کہ مستحب قرأت اگر کر چکا ہے تو رکوع کا وقت ہو گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی سے فرمایا کہ تو نے لقمہ کیوں نہ دیا حالانکہ فاتحہ کے بعد سورت مؤمنین تھی۔

مصحف سے دیکھ کر پڑھنا

اگر کوئی شخص قرآن کریم سے دیکھ کر تلاوت کرے گا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ یہ رائے امام ابوحنیفہ کی ہے کیونکہ یہ مصحف سے قرآن کریم کی قرأت سیکھنے کے مترادف ہے۔ گویا وہ مقتدیوں سے سیکھ رہا ہے یا اس وجہ سے نماز ٹوٹ جائے گی کہ قرآن کریم سے دیکھ کر پڑھنا عمل کثیر ہے کیونکہ اس کے ہاتھوں میں قرآن ہے اور وہ اوراق پلٹ رہا ہے۔ ہدایہ میں نماز ٹوٹنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ قرآن سیکھنے کے مترادف ہے اس لئے ان کے نزدیک دونوں صورتوں میں کہ اس کے ہاتھ میں قرآن ہے یا سامنے پڑا ہے' نماز ٹوٹ جائے گی' اگر عمل کثیر کو نماز ٹوٹنے کی وجہ بنائیں تو نماز صرف اسی صورت میں ٹوٹے گی کہ اس کے ہاتھ میں قرآن کریم ہو' اگر وہ قرآن کریم کو اٹھا کر نہیں پڑھ رہا تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔

صاحبین کے نزدیک مصحف سے دیکھ کر پڑھنے سے نماز نہیں ٹوٹتی کیونکہ وہ بیک وقت دو عبادتیں کر رہا ہے۔ ہاں مکروہ ضرور ہے کیونکہ اس میں اہل کتاب کے ساتھ مشابہت ہے۔

صاحبین کی اس گفتگو کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایک عبادت کو دوسری عبادت کے ساتھ ملانے سے فساد لازم آتا ہے مثلاً طواف اور نماز کو آپس میں ملائیں گے تو نماز ٹوٹ جائے گی اس لئے دو عبادتوں کو ملانا تو عدم فساد کی کوئی وجہ نہ ہوئی۔

عمل کثیر

عمل کثیر سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں' عمل کثیر کے تعین میں اختلاف ہے۔ فتویٰ اس رائے پر ہے کہ دیکھنے والا یہ خیال کرے کہ آدمی نماز نہیں پڑھ رہا وہ عمل کثیر ہے' اگر صرف شک پڑے تو عمل کثیر نہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ جو شخص عمل کر رہا ہے قلیل اور کثیر میں اس کی رائے معتبر ہے۔ ایک قول کے مطابق جو کام دونوں ہاتھوں سے ہو گا وہ عمل کثیر ہے۔

قرأت میں لحن جلی

قرأت میں غلطی سے بھی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ غلطی کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک اعرابی غلطی ہے' اگر اعراب کی غلطی سے معنی نہیں بدلا تو نماز نہیں ٹوٹی کیونکہ اعراب میں ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے اس لئے یہ عذر ہے' اگر اعراب کی غلطی سے معنی تبدیل ہو گا اور اس طرح تبدیل ہوا کہ اعتقادی کفر ٹھہرا بڑی بدعت قرار پائی تو نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ یہ ایسا کلمہ ہوا جس میں نیت شامل ہو تو آدمی کافر یا کفر کے قریب چلا جائے۔ ایسی خطاء سے نماز کا ٹوٹ جانا ظاہر ہے۔ یہ قول قدماء کا ہے۔

بعض متاخرین نے جب دیکھا کہ عوام الناس اعراب میں اکثر غلطیاں کرتے ہیں اور زبر زیر میں تمیز نہیں کر پاتے تو انہوں نے عموم بلویٰ کی بناء پر یہ فتویٰ دیا کہ اعراب کی غلطی سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ قرأت میں ایک غلطی کی ایک صورت یہ ہے کہ حرف ہی تبدیل ہو جائے' اگر یہ غلطی خطا ہے اور معنی تبدیل ہو گیا تو نماز ٹوٹ گئی' خواہ حرف کی تبدیلی سے جو لفظ بنا ہے وہ قرآن میں ہے یا نہیں۔ یہ رائے طرفین کی ہے اور اگر معنی تبدیل نہیں ہوا تو نماز نہیں ٹوٹی۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ اگر وہ لفظ قرآن میں ہے تو نماز نہیں ٹوٹے گی ورنہ ٹوٹ جائے گی۔

مد اور شد کے ترک سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ نماز نہیں ٹوٹتی' اگر کسی نے اصحاب السعیر کو شین کے ساتھ اصحاب الشعیر پڑھ دیا تو نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ قرآن کریم میں اصحاب الشعیر نہیں ہے اور حرف تبدیل ہونے سے معنی تبدیل ہو گیا ہے' اگر قیام کی جگہ قیوم پڑھ دیا تو طرفین کے نزدیک نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ معنی نہیں بدلا جبکہ امام ابو یوسف کے نزدیک ٹوٹ جائے گی کیونکہ ایسا لفظ قرآن میں نہیں ہے۔

متاخرین کے نزدیک اگر دونوں حرفوں میں فرق کرنا آسان ہو جیسے صالحات کی جگہ طالحات پڑھ دیا تو نماز ٹوٹ جائے گی اور اگر فرق کرنا مشکل ہو جیسے صاد اور سین' تاء اور طا تو اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ نماز نہیں ٹوٹے گی۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس اصل پر ان کی فروعات منضبط نہیں ہوتیں۔ خلاصہ میں اس کے بالکل برعکس ہے اس لئے قدماء کی رائے اولیٰ ہے۔

حرف میں تبدیلی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ نمازی قاری نہیں اور حروف کی صحیح ادائیگی سے عاجز ہے ایسی صورت میں اگر کوشش کے باوجود حرف تبدیل ہو جاتا ہے تو نماز نہیں ٹوٹتی اور اگر کوشش ہی نہیں کرتا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ علماء نے یہی کہا ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ نماز کو متاخر کرنا گناہ ہے اس لئے جو عاجز ہے وہ کوشش کرے یا نہ کرے اس کی نماز ہو جائے گی ہاں اس کے لئے بہر حال یہ واجب ہے کہ وہ اتنی قرأت ضرور سیکھے جس سے اس کی نماز صحیح ہو سکتی ہو' اگر وہ کوشش نہیں کرتا تو مسلسل گناہ کرتا رہے گا۔

تلاوت میں غلطی کی ایک صورت یہ ہے کہ لفظ میں تقدیم و تاخیر کر دے مثلاً قسورة کو قوسرة پڑھ دے' اگر معنی تبدیل ہو گیا تو نماز ٹوٹ جائے گی معنی تبدیل نہ ہوا تو نماز نہیں ٹوٹے گی یہ رائے امام محمد کی ہے' امام ابو یوسف کی رائے اس سے مختلف ہے۔

غلطی کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک حرف زیادہ پڑھ دیا یا ایک حرف کم کر دیا۔ فک ادغـــام بھی حرف کی زیادتی ہے۔ (ضل کو ضلل پڑھنا فک ادغام ہے) اگر اس سے معنی تبدیل نہ ہو تو نماز نہیں ٹوٹے گی مثلاً وانه عن المنكر کی جگہ وانها پڑھ دیا۔ جاءتهم کی جگہ جاء هم پڑھ دیا' اگر معنی تبدیل ہو گیا تو نماز ٹوٹ جائے گی مثلاً وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ حالانکہ دوسری واؤ قرآن میں نہیں ہے۔ اسی طرح وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى۔ حالانکہ تجلی کے بعد ما سے پہلے واؤ ہے۔

اگر رہ جانے والا کلمہ ہو یا حرف اصلی ہو اور معنی تبدیل ہو جائے تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ یہ رائے امام ابو حنیفہ

اور امام محمد کی ہے مثلاً رزقنا هم کو بغیر زا کے رقنا هم پڑھ دیا یا بغیر راء کے زقنا هم پڑھ دیا۔ جعلنا هم کو علنا هم بغیر جیم کے پڑھ دیا۔ علماء کے بقول امام ابو یوسف کے قیاس کے مطابق ایسی غلطی سے نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ ایسے الفاظ قرآن کریم میں موجود ہیں۔

اگر لفظ ایسا ہو جو تین حروف سے مل کر بنا ہو اور اس کا پہلا اور درمیان والا حرف چھوڑ دیا تو نماز ٹوٹ جائے گی اس طرح لامحالہ یا تو اس کا معنی تبدیل ہو جائے گا یا حرف لغو (بے معنی) ہو جائے گا' اگر آخری حرف چھوڑ دیا اور کلمہ ایسا ہے جس میں ترخیم اور ایجاز جائز ہے تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ نداء کی جا رہی ہو یا کلمہ زائد از ثلاثی ہو۔

قرأت میں غلطی کی ایک صورت لفظ میں غلطی ہے کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ پڑھ دیا' اگر ان دونوں کا معنی قریب قریب ہے مثلاً حکیم اور علیم تو طرفین (ابو یوسف اور ابو حنیفہ) کے نزدیک نماز نہیں ٹوٹے گی اس کی مثل قرآن میں لفظ ہو کہ نہ ہو' اگر قرآن کریم میں اس جیسا لفظ نہ ہو تو امام ابو یوسف سے دو روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ (ایک فساد کی اور ایک عدم فساد کی) اگر دونوں لفظ قریب المعنی نہ ہوں اور نہ ایسا لفظ قرآن میں ہو تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ اس پر اتفاق ہے اگر قرآن میں اس کی مثال موجود ہو اور معنی اس طرح بدلے کہ اعتقاداً کفر بن جائے تو طرفین کے نزدیک اکثر علماء کے خیال کے مطابق نماز ٹوٹ جائے گی اور امام ابو یوسف کے نزدیک نہیں ٹوٹے گی مثلاً تخشوهم واخشون کی جگہ کسی نے واخشوهم ولا تخشون پڑھ دیا' اگر نسب میں تبدیلی ہوگئی مثلاً موسیٰ ابن لقمان پڑھ دیا تو نماز نہیں ٹوٹے گی' بشرطیکہ لفظ قرآن میں ہو اور اگر نسب میں ایسی غلطی کی کہ وہ لفظ قرآن میں ہے ہی نہیں مثلاً مریم بنت عمران کی جگہ مریم بنت غیلان پڑھ دیا تو اتفاقاً نماز ٹوٹ جائے گی' کسی کو کسی مرد کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں اور ایسے نام کی نسبت کر دی تو نماز ٹوٹ جائے گی مثلاً عیسیٰ بن لقمان کہہ دیا۔ کیونکہ عمداً ایسا کہنے سے کفر لازم آئے گا۔

قرآن میں غلطی اس طرح کی کہ لفظ بڑھا دیا' اگر معنی تبدیل نہیں ہوا تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔ اس کی مثل قرآن میں ہو جیسے وبالوالدین احسانا و برا یا اس کی مثل قرآن میں نہ ہو جیسے و برا کی جگہ کوئی نخل فاكهة اور تفاح کا لفظ پڑھ دے۔ امام ابو یوسف کی رائے یہاں بھی مختلف ہے اگر معنی تبدیل ہو گیا تو نماز ٹوٹ جائے گی اس کی مثل قرآن میں ہو جیسے عمل صالحا و کفرا پڑھ دیا یا اس کی مثل قرآن میں نہ ہو مثلاً اما ثمود فهدیناهم وعصیناهم پڑھ دیا۔

گا کر قرآن کی تلاوت کی جائے تو بھی حرف زیادہ ہو جاتے ہیں مثلاً جب حرکات کو کھینچ کر پڑھا جاتا ہے تو ہمزہ زیادہ ہو جاتے ہیں اگر فحش غلطی ہوئی تو نماز ٹوٹ جائے گی جیسا کہ فتح القدیر کا مصنف خلاصہ سے نقل کرتا ہے۔

اور صحاح کی احادیث کا یہ بیان کہ رسول اللہ ﷺ کی قرأت بہت ہی جاذبیت رکھتی تھی اور آپ قرآن کریم کو خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرتے تھے تو حضور ﷺ اس طرح گا کر قرآن نہیں پڑھتے تھے کہ لفظ بدل جائے۔

قرأت میں غلطی کی ایک صورت یہ ہے کہ آیت کے ایک حصہ کو آیت کے دوسرے حصہ کے ساتھ ملا کر پڑھے اگر معنی تبدیل نہ ہو تو نماز نہیں ٹوٹے گی اگر معنی تبدیل ہو گیا لیکن پڑھنے والے نے دونوں کے درمیان وقف کیا تھا تو نماز نہیں ٹوٹے گی اگر دونوں کو ملا کر پڑھا تھا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ عام علماء فقہ کا یہی نظریہ ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے مثلاً ایک شخص کو آیت میں جنتی گردانا گیا غلطی سے قاری نے اسے جہنمی کہہ دیا یا اس کے برعکس جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

اگر قاری دس متواتر قرأتوں کو چھوڑ کر کسی اور قرأت کے مطابق تلاوت کرتا ہے تو نماز نہیں ٹوٹے گی لیکن اسے قرآن کی تلاوت نہیں کہیں گے۔ نماز نہ ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے کہ معنی تبدیل نہیں ہوا۔

اگر نمازی نے قرأت کرتے ہوئے اوقاف کو ترک کر دیا اور آیات کو ملا کر تلاوت کی تو نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ قرأت متواترہ میں ہر آیت کا بعد والی آیت سے وصل جائز ہے۔ مدوں کو چھوڑ دینا اور ھمزہ میں تخفیف کرنا بھی نماز ٹوٹنے کا سبب نہیں بنتا۔

قبلہ سمت سے پھر جانا

نماز پڑھتے ہوئے نماز کی شرائط میں سے کسی شرط کا اٹھ جانا نماز کو توڑ دیتا ہے مثلاً نماز پڑھتے ہوئے قبلہ شریف کی طرف سے سینہ پھیر دیا تو نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ قبلہ رو ہونا شرط ہے اور سینہ کا قبلہ شریف کی طرف سے پھرنا مکمل پھرنا ہے اگر نمازی نے قبلہ شریف کی طرف سے صرف چہرہ پھیرا لیکن سینہ قبلہ رو رہا تو نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ یہ قلیل پھرنا ہوا۔

دیگر مفسدات

اگر دورانِ نماز گندگی سے لت پت ہو گیا تو نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ بدن اور کپڑوں کا پاک ہونا شرط ہے اگر ڈھانپے جانے والے اعضاء میں سے کوئی عضو ننگا رہ گیا اور کسی ایک رکن کی ادائیگی کی مقدار ننگا رہا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ دورانِ نماز حدث سے نماز ٹوٹ جائے گی یا نہیں۔ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے کیونکہ نماز میں نمازی کو حدث کا لاحق ہونا یا وضو کا موجب ہوگا یا غسل کا مثلاً نماز میں کھڑے کھڑے سو گیا اور نیند کی حالت میں احتلام ہو گیا تو غسل واجب ہو جائے گا اور نماز ٹوٹ جائے گی۔ رہا وضو کا ٹوٹنا تو اس کے کئی اسباب ہیں۔ یا سماوی ہوگا کہ وضو ٹوٹنے میں نمازی کا کوئی اختیار نہیں ہوگا اور نہ اس کے سبب میں اس کا کوئی دخل ہوگا اور نمازی اپنے اختیار سے وضو نہیں توڑے گا یا وہ حدث سماوی نہیں ہوگا۔ دوسری صورت میں نماز ٹوٹ جائے گی خواہ حدث سماوی ہو یا سماوی نہ ہو لیکن اس نے وضو خود توڑا ہو۔

اگر نمازی نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسا یا اس نے جان بوجھ کر وضو توڑا۔ یا سر کے زخم سے خون بہہ نکلا یا نماز سے پہلے اس نے کوئی نشہ آور چیز پی اور نماز میں مدہوش ہو گیا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ یا حدث سماوی ہوگا جس میں اس کے قصد کو دخل نہیں ہوگا پھر اس کی دو صورتیں ہیں یا نادر الوقوع ہوگا جیسے بے ہوشی یا اکثر لاحق ہونے والا ہوگا اگر

نادر الوقوع ہے تو نماز ٹوٹ جائے گی اگر ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے جیسے ہوا کا خارج ہونا' نکسیر' پیشاب' مذی یا مرض کی وجہ سے پاخانہ نکل جانا تو ہمارے نزدیک نماز نہیں ٹوٹے گی۔ نمازی وضو کرے گا اور پہلی نماز پر بناء کرے گا بشرطیکہ کوئی بناء سے مانع نہ ہو۔ ان تمام صورتوں میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ نماز ٹوٹ جائے اور نئے سرے سے پڑھنا پڑے۔ یہی مذہب امام شافعی کا ہے۔ ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو نواقض وضو میں پہلے گزر چکی ہے۔

قوله صلى الله عليه وسلم من قاء او رعف اوامذى فى صلوته فلينصرف وليتوضأ وليبن.

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جس کو قے آ گئی یا نکسیر پھوٹ پڑی یا نماز میں مذی نکل آئی تو وہ جا کر وضو کرے اور پہلی نماز کو جاری رکھے۔

احادیث کے اندر تطبیق پہلے گزر چکی ہے۔ فتح القدیر میں ابن ابی شیبہ کے حوالے سے حضرات عمر' علی' ابوبکر صدیق' ابن عمر' سلمان فارسی پر موقوف حدیث گزر چکی ہے جس سے ہمارے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ تابعین میں سے علقمہ' طاؤس' سالم بن عبداللہ' سعید بن جبیر' شعبی' ابراہیم نخعی' عطاء' مکحول اور سعید بن مسیب کی روایات سے ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے اور اتنے جلیل القدر صحابہ کرام اور تابعین کا اسوۂ ہمارے لئے کافی ہے۔

امام کا وضو ٹوٹ جائے تو کیا کرے؟

جب امام کو حدث لاحق ہو تو اس پر ضروری ہے کہ کسی کو اپنا نائب بنائے اور خود وضو کر کے اس کی اقتداء کرے۔ نیابت کی دلیل یہ ہے کہ امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب بد بخت ابولولؤ نے نیزہ مارا تو آپ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے۔ آپ نے عبدالرحمٰن بن عوف کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔ صحابہ کرام اور دوسرے لوگوں نے ان کے پیچھے نماز پڑھی۔ بخاری شریف میں یہ واقعہ درج ہے اور دوسری حدیث کی کتابوں میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ نیابت پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ ابن منذر نے اسے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بیان کیا ہے۔

عن ابن عباس قال خرج علينا عمر لصلوة الظهر فلما دخل فى الصلوة اخذ بيد رجل كان عن يمينه ثم رجع يخرق الصفوف فلما صلينا اذا نحن بعمر يصلى خلف سارية فلما قضى الصلوة قال لما دخلت فى الصلوة وكبرت رأى شئى فلمست فوجدت بلة.

ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ظہر کی نماز کے وقت حضرت عمر ہمارے پاس تشریف لائے۔ جب نماز شروع کی تو ایک آدمی جو دائیں طرف کھڑا تھا اس کا ہاتھ پکڑا اور صفوں کو چیرتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ جب ہم نماز پڑھ چکے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر ستون کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ جب آپ نماز پڑھ چکے تو فرمایا جب میں نے نماز شروع کی اور تکبیر کہی تو میں نے کچھ محسوس کیا سو میں نے ہاتھ لگایا تو تری پائی۔

اگر محض گمان ہوتا تو آپ مڑتے اور صفوں سے باہر نہ جاتے اور نہ خلیفہ مقرر کرتے کہ غلطی ظاہر ہو جاتی تو نماز نہ ٹوٹتی اور اسی نماز پر بناء کرتے کیونکہ آپ کا مڑنا ضرورت کے تحت ہوتا تو ضرورت کے تحت مڑنا معاف ہے جیسے

حدث کی صورت میں آدمی پیچھے آتا ہے اگر معلوم ہو جائے کہ حدث لاحق ہو گیا ہے تو نماز نہیں ٹوٹی۔ یہاں بھی یہی صورت حال ہے اگر نمازی صفوں کو چیرتا ہوا نکل گیا یا نائب مقرر کیا (اور معلوم ہوا کہ وضو باقی ہے) تو نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ ان افعال کی ضرورت نہیں تھی۔

بناء کی شرائط

بناء کے لئے شرط ہے کہ نمازی کلام نہ کرے اور نہ ہی وضو سے زیادہ حرکت کرے' اگر پانی تھا اور وضو نہ کیا بلکہ اس جگہ سے آگے چلا گیا اور وہاں جا کر وضو کیا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی وہ پہلی نماز کو جاری نہیں رکھ سکتا بلکہ نئے سرے سے نماز پڑھے گا کیونکہ اس نے بلا ضرورت ایسا کام کیا جو نماز کے منافی تھا۔ وضو کے بعد اسے اختیار ہے چاہے تو وضو کی جگہ نماز پڑھے تاکہ زیادہ حرکت نہ ہو اور چاہے تو پہلی جگہ آکر بقیہ نماز پوری کرے تاکہ ایک ہی جگہ نماز مکمل ہو۔ امام اور مقتدی کا پہلی جگہ پر آکر نماز مکمل کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ مقتدی ہیں' اگر امام یا اس کا خلیفہ ان کے وضو کرتے ہی نماز سے فارغ ہو جاتے ہیں تو اب اسی جگہ بھی نماز پڑھ سکتے ہیں کیونکہ اب وہ مقتدی نہیں رہے۔

مسبوق بھی نائب بن سکتا ہے۔ اسی رکن سے شروع کرے گا یہاں سے نائب مقرر ہوا ہے پھر جب تشہد سے فارغ ہو تو کسی مدرک کو خلیفہ بنائے تاکہ وہ سلام کے ساتھ نماز ختم کرے اور مسبوق اٹھ کر اپنی نماز مکمل کرے کیونکہ اس کی تکبیر تحریمہ اس بات کی بنیاد ہے کہ جو نماز اس نے پائی ہے وہ پہلے پڑھے اور جو رہ گئی ہے وہ بعد میں پڑھے' امام کے وضو ٹوٹ جانے سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آجاتی۔ اب مسبوق اور مدرک برابر ہیں اس لئے اس کو نائب بنانا صحیح ہے اور چونکہ اس کی نماز رہتی ہے اور اس وجہ سے وہ سلام نہیں پھیر سکتا اس لئے کسی مدرک کو آگے کرنا بھی ضروری ہے جس کا وضو ٹوٹ جائے اس کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ نئے سرے سے نماز پڑھے جیسا کہ:

عن طلق بن علی قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا فساء احدکم فی الصلوة فلینصرف ولیتوضأ ولیعد الصلوة.	طلق بن علی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو جائے تو اسے چاہئے کہ پیچھے مڑے' وضو کرے اور نماز کا اعادہ کرے۔

(رواہ ابوداؤد)

اس حدیث میں امر استحباب کے لئے ہے اس لئے کہ بناء کرنے کا جواز بھی معلوم ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر امام یا مقتدی ہو تو دونوں کے لئے افضل یہ ہے کہ اسی نماز کو جاری رکھے تاکہ نماز کا ثواب ضائع نہ ہو جائے۔ جماعت کی فضیلت والی احادیث اس حدیث کے لئے مخصص ہیں تاکہ تعارض نہ آئے۔

آخری قعدہ کے بارے اختلافی مفسدات

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہاں بارہ مسائل ایسے ہیں جن میں نماز ٹوٹ جاتی ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک نماز ٹوٹتی نہیں بلکہ پوری ہو جاتی ہے۔ تیمم کرنے والا آخری قعدہ میں تشہد سے فراغت کے بعد پانی دیکھ

لے یا مسح کرنے والے کی مدت مسح پوری ہو جائے یا پٹی پر مسح کرنے والے کی پٹی زخم کے ٹھیک ہونے کے بعد گر جائے یا معمولی سے عمل سے اس کے موزے اُتر جائیں یا امی کو سورت یاد ہو جائے یا ننگے کو کپڑے مل جائیں یا اشارہ کرنے والا رکوع و سجود پر قادر ہو جائے یا امام کا وضو ٹوٹ جائے اور وہ امی کو نائب بنا دے۔ یا فجر کی نماز میں سورج طلوع ہو جائے یا جمعہ پڑھتے ہوئے عصر کا وقت شروع ہو جائے یا معذور تندرست ہو جائے یا فوت شدہ نماز یاد آ جائے اور وقت کافی ہو اور یہ سب امور آخری قعدہ میں تشہد سے فراغت کے بعد پائے جائیں۔

فتح القدیر میں یہ اضافہ ملتا ہے کہ تشہد کے بعد پانی مل گیا جس سے نجاست دھل سکتی ہے اور جب قضاء نماز کو پڑھتے ہوئے تشہد کے بعد وقت مکروہ شروع ہو جائے اور چادر کے بغیر نماز پڑھنے والی لونڈی تشہد کے بعد آزاد ہو گئی اور اس نے فوراً چادر نہ لی۔ شیخ ابو سعید بردعی اس کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں کہ نمازی کا اپنے فعل کے ساتھ نماز سے باہر آنا فرض ہے۔ جب تک وہ اپنے فعل سے باہر نہ آیا وہ نماز میں ہے۔ یہ عوارض نماز میں پیش آ رہے ہیں اس لئے نماز ٹوٹ جائے گی۔ صاحبین کے نزدیک ان عوارض کی وجہ سے وہ نماز سے باہر آ گئے ہیں اور نماز مکمل ہو گئی ہے۔ اکثر نے شیخ ابو سعید کے قول کو اختیار کیا ہے جن میں ایک صاحب الہدایہ ہیں۔ نمازی کا اپنے فعل سے نماز سے باہر آنا صاحب ہدایہ کے نزدیک فرض اور اس کی دلیل یہ ہے کہ پہلی نماز کے بعد کسی نماز میں داخل ہونا فرض ہے اور دوسری نماز میں داخل ہونے کی صرف یہ صورت ہے کہ پہلی نماز سے نمازی باہر آئے۔ سو پہلی نماز سے باہر آنا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی تب ہی ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے فعل سے نماز سے باہر آئے۔

اس بندے (مصنف) کو یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ سلام کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ انسان پہلی نماز سے نکل کر دوسری نماز شروع کر سکے لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ پہلی نماز سلام سے ہی ختم ہو مثلاً دوسرا روزہ رکھنے کے لئے پہلے روزہ کا افطار کرنا ضروری ہے۔ جب تک پہلا روزہ افطار نہیں ہوگا دوسرا روزہ نہیں رکھا جا سکتا لیکن پہلے روزہ سے باہر آنے کے لئے رات کا آنا کافی ہے۔ اسی طرح پہلی نماز سے باہر آنے کے لئے تمام ارکان کی ادائیگی کافی ہے اس لئے سلام سے پہلے اگر کوئی عارضہ لاحق ہو گیا تو نماز مکمل ہو گئی اور زیادہ سے زیادہ مستحب امر رہ گیا۔

امام کرخی فرماتے ہیں کہ اس بارے علماء میں کوئی اختلاف نہیں کہ اپنے فعل سے نمازی کا نماز سے باہر آنا فرض نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اپنا کوئی قول مروی نہیں بلکہ یہ قول شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا گیا ہے لیکن ان کی یہ رائے صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ چیز فرض ہوتی تو کسی ایسے فعل کے ساتھ مختص ہوتی جو قربت خداوندی کا سبب ہوتا۔ مذکورہ مسائل میں امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی نماز باطل ہو جاتی ہے کیونکہ مفسد دوران نماز لاحق ہو رہا ہے۔ دورانِ نماز اس لئے کہ ابھی نمازی کے ذمہ ایک واجب ہے اور وہ ہے سلام۔

ہم امام کرخی سے اتفاق کرتے ہیں کہ نمازی کا فعل نماز سے باہر آنے کے لئے فرض نہیں ہے لیکن امام کرخی کے اس قول میں غور و فکر کی ضرورت ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی اگر تشہد کے بعد کوئی عارضہ لاحق ہو جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عارضہ اس حصہ نماز کو فاسد کرتا ہے جو اس سے متقارن ہے۔ تشہد کے بعد اگر عارضہ لاحق ہوا تو تشہد کے بعد کوئی رکن نہیں تمام رکن ادا ہو چکے ہیں اس لئے نماز نہیں ٹوٹے گی۔ صاحبین کا

قول زیادہ صحیح ہے اور ابن مسعود کا اثر بھی اس کی تصریح کرتا ہے کیونکہ ان کا ارشاد ہے اگر تو نے ایسا کیا تو تیری نماز مکمل ہوگئی۔ صاحبِ ہدایہ نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ تیری نماز مکمل ہونے کے قریب ہے۔ یہ تاویل بلا وجہ نص کے ظاہر سے عدول ہے۔

مکروہاتِ نماز کا بیان

کپڑے یا جسم کے ساتھ کھیلنا

بے وجہ کپڑے اور جسم کو حرکت دینا۔ عموماً کھیل کے انداز میں کپڑے یا جسم کو حرکت دی جاتی ہے۔ یہ اس لئے مکروہ ہے کہ اس سے نماز میں خشوع ضائع ہو جاتا ہے۔

لقوله صلى الله عليه وسلم ان الله كره اليكم ثلثا العبث في الصلوة والرفث والضحك على المقابر.

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: تمہاری تین چیزیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ نماز میں کھیلنا، بری باتیں کرنا اور قبروں پر (کھڑے ہوکر) ہنسنا۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے قضاعی نے یحییٰ بن کثیر سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

کنکریوں کو الٹ پلٹ کرنا

کنکریوں کو الٹ پلٹ کرنا۔ ہاں اس صورت میں جائز ہے کہ سجدہ کرنا ناممکن ہو لیکن صرف ایک بار۔

عن معيقيب قال ذكر النبي صلى الله عليه وسلم المسح في المسجد يعني الحصا قال ان كنت لابد فواحدة. (رواہ مسلم)

حضرت معیقیب سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے مسجد میں یعنی کنکریوں پر ہاتھ پھیرنے کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر ضروری ہو تو صرف ایک بار۔

انگلیوں کو چٹخانا

انگلیوں کا چٹخانا مکروہ ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ ابن ماجہ حارث سے روایت کرتے ہیں کہ:

عن علي امير المؤمنين قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تفرقع اصابعك وانت في الصلوة.

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حالتِ نماز میں انگلیوں کو نہ چٹخایا کرو۔

یہ حدیث حارث کی وجہ سے معلول ہے۔ (راوی کے ضعف کی علت کی وجہ سے اس پر اعتراض ہے۔)

کولہوں پر ہاتھ رکھنا

کولہوں پر ہاتھ رکھنا بھی مکروہ ہے جسے عربی میں التخصر کہتے ہیں کیونکہ اس طرح ہاتھ رکھنے سے سنت کا ترک لازم آتا ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

عن زیاد بن صبیح الحنفی قال صلیت الی جنب ابن عمر فوضعت یدی علی خاصرتی فلما صلی قال ھذا الصلت فی الصلوۃ ؟ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھی عنہ.

زیاد بن صبیح حنفی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پہلو میں نماز پڑھی اور میں نے ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھ لئے۔ جب آپ نماز پڑھ چکے تو فرمایا: نماز میں اتنی بڑی غلطی؟ حضور ﷺ اس سے روکا کرتے تھے۔

امام نسائی کی ایک حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ تخصر مکروہ ہے۔
شیخین کی روایت میں ہے کہ:

عن ابی ھریرۃ نھی عن الاختصار.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کولہوں پر ہاتھ رکھنے سے روکا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں تخصر کی بجائے الاختصار کا لفظ ہے (نھی عن الاختصار) اس لفظ کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ مشہور وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ اختصار کا ایک معنی یہ کیا گیا ہے کہ سورت کو مکمل نہ پڑھنا۔ کبھی اس کا معنی آیتِ سجدہ کو چھوڑنا کیا جاتا ہے۔ کبھی صرف آیتِ سجدہ کو تلاوت کرنا ہوتا ہے۔ یہ تمام صورتیں مکروہ ہیں۔ پہلی صورت مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح آیت سجدہ کو چھوڑنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔ باقی صورتوں میں مکروہ تنزیہی ہے۔

گردن کو دائیں بائیں پھیرنا

گردن کو دائیں بائیں پھیر کر دیکھنا بھی مکروہ ہے۔

لما روت ام المؤمنین عائشۃ الصدیقۃ قالت سالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الالتفات فی الصلوۃ فقال ھو اختلاس یختلسہ الشیطان. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز میں دائیں بائیں گردن پھیر کر دیکھنے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اچک لینا ہے۔ جس کے ذریعے شیطان آدمی کی نماز اچک لیتا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لینتھین اقوام عن رفعھم ابصارھم عند الدعاء فی الصلوۃ الی السماء او لیخطفن ابصارھن. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نماز میں دعا کرتے ہوئے لوگوں کو آسمان کی طرف دیکھنے سے رک جانا چاہئے ورنہ ان کی بینائی اچک لی جائے گی۔

گردن کو دائیں بائیں حرکت دیئے بغیر اگر کن اکھیوں سے کوئی شخص اِدھر اُدھر دیکھتا ہے تو اس سے نماز مکروہ نہیں ہوتی کیونکہ:

عن ابن عباس رضی اللہ عنھما کان علیہ السلام یلحظ فی الصلوۃ یمینا وشمالا ولا یلوی عنقہ. (رواہ الترمذی وقال ھذا الحدیث غریب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز میں دائیں بائیں دیکھتے تھے اور گردن کو نہیں پھیرتے تھے۔

فتح القدیر میں ہے کہ ابن قطان کے بقول یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔

کتے کے بیٹھنے کے انداز میں بیٹھنا

زمین پر اس طرح بیٹھنا کہ سرین زمین پر لگی ہو اور دونوں پاؤں کھڑے ہوں مکروہ ہے۔عربی میں اسے الاقعاء کہتے ہیں۔ ہدایہ میں الاقعاء کی اس تفسیر کو صحیح کہا گیا ہے۔اس کی کراہت اس حدیث مبارک سے ثابت ہوتی ہے:

عن امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجھہ ووجوہ آلہ الکرام ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا علی انی احب لک ما احب لنفسی واکرہ لک ما اکرہ لنفسی لا تقع بین السجدتین. (رواہ الترمذی)

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے علی! میں تمہارے لئے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں اور تمہارے لئے وہ چیز ناپسند کرتا ہوں جسے اپنے لئے ناپسند کرتا ہو دونوں سجدوں کے درمیان سرین کے بل پاؤں کھڑے کر کے نہ بیٹھا کرو۔

رہی امام مسلم کی روایت جس سے ایک اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔

عن عطاء قلت لابن عباس فی الاقعاء علی القدمین قال ھی السنۃ فقلنا لہ نراہ جفاء بالرجل قال ھی سنۃ نبیک صلی اللہ علیہ وسلم. (رواہ مسلم)

عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس سے پاؤں پر بیٹھنے کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا یہ سنت ہے۔ہم نے کہا ہم تو اس طرح بیٹھنے کو مشقت کا سبب سمجھتے ہیں۔ (حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے فرمایا کہ تیرے نبی کی سنت ہے۔

اس میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے واضح ہو کہ الاقعاء سنت ہے۔ ہوسکتا ہے نماز سے باہر رسول اللہ ﷺ اس طرح بیٹھے ہوں۔ فتح القدیر میں ہے کہ اقعاء کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت مستحب ہے اور وہ یہ ہے کہ گھٹنے زمین پر ٹکے ہوں۔ پاؤں زمین پر نصب ہو اور سرین ایڑیوں پر رکھی ہو۔اس طرح بیٹھنا مستحب ہے۔ممنوع طریقہ یہ ہے کہ سرین زمین پر ہو اور پنڈلیاں کھڑی ہوں۔ یہ طریقہ مکروہ ہے۔

بازو زمین پر بچھانا

سجدہ میں بازوؤں کو زمین پر بچھانا مکروہ ہے۔

عن ابی هریرة ان النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا سجد احدکم فلایفترش یدیه افتراش الکلب ولیضم فخذیه. (رواہ سنن ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص سجدہ کرے تو اپنے بازوؤں کو زمین پر بچھائے جس طرح کتا اپنی اگلی ٹانگیں بچھاتا ہے اور نہ ہی بازوؤں کو رانوں کے ساتھ ملائے۔

تسبیح مکمل کرنے سے پہلے سجدہ سے سر اُٹھانا

سنت کے مطابق تسبیح پوری کرنے سے پہلے سجدہ سے سر اٹھانا۔

عن عبد الله بن سهل نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن نقرة الغراب وافتراش السبع وان یوطن الرجل المکان فی المسجد.

حضرت عبداللہ بن سہل سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے مرغ کی طرح دانا چگنے (جلدی سجدہ کرنے) بازو بچھانے اور مسجد میں کسی کا اپنے لئے جگہ مختص کرنے سے منع فرمایا ہے۔

آلتی پالتی مار کر بیٹھنا

آلتی پالتی مار کر بیٹھنا۔

عن عبد الله بن دینار انه سمع ابن عمرو صلی رجل ابی جنبه فلما جلس الرجل فی اربع تربع وثنی رجلیه فلما انصرف عبد الله عاب ذلک علیه فقال الرجل فانک لتفعل ذلک فقال عبد الله انی اشتکی. (رواہ مؤطا امام مالک)

عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ انہوں نے ابن عمر سے سنا ہے۔ ایک آدمی نے ان کے پہلو میں نماز پڑھی۔ جب وہ بیٹھا تو آلتی پالتی مار لی اور پاؤں کو کھڑا کر لیا۔ جب عبداللہ نماز سے مڑے تو اس فعل کو معیوب قرار دیا۔ اس آدمی نے کہا۔ آپ بھی تو ایسا کرتے ہیں عبداللہ بن سہل نے فرمایا: مجھے تکلیف ہے (اس لئے اس طرح بیٹھتا ہوں)۔

مردوں کے لئے بالوں کا جوڑا بنانا

بالوں کا جوڑا باندھنا بھی مکروہ ہے۔

عن ابی رافع قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان یصلی الرجل وشعره معقوص.

حضرت ابورافع سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں نماز پڑھے کہ اس کی چوٹی بندھی ہو۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے۔

کپڑوں کا اڑوسنا کیونکہ اس میں تجبر کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

بقوله صلى الله عليه وسلم امرت ان اسجد على سبعة ولا اكف شعرا ولا ثوبا.

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے: مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کروں اور بال اور کپڑے نہ سمیٹوں۔

کپڑے کی دونوں اطراف کو لٹکانا

سدل بھی مکروہ ہے۔

عن ابى هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن السدل فى الصلوة.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے نماز میں سدل سے منع فرمایا ہے۔

اسے ترمذی اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ سدل یہ ہے کہ کوئی شخص کپڑا اپنے سر یا کندھوں پر اس طرح ڈالے کہ اس کے دونوں پلو لٹکا دے۔ یا جبہ اس طرح پہنے کہ دونوں ہاتھ آستین سے باہر ہوں۔

تصویر پر سجدہ کرنا

تصاویر پر سجدہ کرنا کیونکہ اس میں تصویر کی عبادت کی مشابہت ہے یا تصویر چھت میں ہو' سامنے ہو یا برابر ہو۔ ہدایہ میں ہے کہ تصویر کا سامنے ہونا سب سے زیادہ مکروہ ہے پھر اوپر پھر بائیں' پھر دائیں اور اس کے بعد پیچھے۔ (ہر حال میں تصویر کی موجودگی میں نماز مکروہ ہے) اگر ایسا کپڑا پہنا جس میں تصاویر ہیں تو بھی مکروہ ہے کیونکہ اس کی بت اٹھانے والے کے ساتھ مشابہت ہے۔ اس کے مکروہ ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن ام المؤمنين عائشة الصديقة واعد رسول الله صلى الله عليه وسلم جبرئيل فى ساعة ياتيه فيها وجاء ت تلك الساعة ولم ياته وفى يده عصا فالقا هاقال مايخلف الله وعده ولا رسوله ثم التفت فاذا كلب تحت سريره فقال ما هذا يا عائشة متى دخل هذا الكلب ههنا فقالت فوالله مارأيت فامر به فاخرج فجاء جبرئيل عليه السلام فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم واعدتنى فجلست لك فلم تأت قال منعنى الكلب الذى كان فى بيتك انالاندخل بيتا فيه كلب ولاصورة. (رواہ مسلم)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے باہم وعدہ کیا کہ وہ فلاں وقت میں حاضر خدمت ہوں گے۔ جب وہ وقت ہوا تو جبرائیل نہ آئے۔ رسول اللہ علیہ السلام کے ہاتھ میں عصا تھا۔ آپ نے اسے پھینک دیا اور فرمایا: اللہ اور اس کا فرستادہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتے۔ یہ کہہ کر آپ ایک طرف متوجہ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا آپ کی چارپائی کے نیچے ہے۔ فرمایا عائشہ! یہ کیا ہے' یہ کتا کب اندر آ گیا؟ حضرت عائشہ نے عرض کیا: بخدا میں نے تو نہیں دیکھا۔ آپ نے حکم دیا کہ اسے نکال دو جب کتے کو باہر نکال دیا گیا تو جبرائیل حاضر خدمت ہوئے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا آپ نے مجھ سے آنے کا وعدہ کیا میں آپ کے انتظار میں بیٹھا رہا اور آپ نہیں آئے۔ عرض کیا مجھے اس کتے نے آنے سے روکے رکھا جو آپ کے گھر میں موجود تھا۔

میں اس گھر میں نہیں آتا جس میں کتا ہو اور نہ اس گھر میں آتا ہوں جس میں تصویر ہو۔

یہ حدیث مطلوب پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ یہ حدیث بیان کرتی ہے کہ گھر میں کتا یا تصویر رکھنا مکروہ ہے۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ تصویر والے مکان میں نماز مکروہ ہے کیونکہ پھر ماننا پڑے گا کہ اس گھر میں بھی نماز مکروہ ہے جس میں کتا ہو۔

اگر تصویر بہت چھوٹی ہو کہ واضح نظر نہ آتی ہو یا اس کا سر کٹا ہو یا تکیہ پر تصویر منقش ہو یا قالین پر جانوروں کی تصاویر نقش ہوں جو نیچے بچھی ہو تو حرج نہیں۔

فتح القدیر میں ہے کہ ابن حبان اور نسائی کی روایت ہے کہ:

استاذن جبرئیل علیه السلام علی النبی صلی الله علیه وسلم فقال ادخل قال کیف ادخل وفی بیتک ستر فیه تصاویر فان کنت لابد فاعلا فاقطع رؤسها و امطعها وسائدا و اجعلها بسطا.

جبرائیل امین نے بارگاہِ رسالت میں حاضری کے لئے اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا: اندر آ جایئے۔ جبرائیل امین نے عرض کیا۔ کیسے اندر آ جاؤں کہ گھر میں ایک ایسا پردہ لٹک رہا ہے جس پر تصاویر کڑھی ہیں' اگر اس پردہ کو لٹکانا ہی ہے تو تصاویر کے سروں کو کاٹ دیجئے یا اس پردہ کو کاٹ کر بچھونا بنا دیجئے۔

امام نسائی نے آخری الفاظ روایت نہیں کئے۔

امام کا الگ جگہ کھڑا ہونا

امام کا چبوترہ پر کھڑا ہونا جبکہ مقتدی نیچے ہوں یا محراب میں اکیلے کھڑا ہونا مکروہ ہے کیونکہ یہ طریقہ اہل کتاب کا ہے۔ ان مکروہات کو بیان کرنے کے بعد صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ ان تمام صورتوں میں نماز صحیح خیال کی جائے گی بشرطیکہ صحت کی تمام شروط پائی جائیں' لیکن کراہت سے بچنے اور ہر لحاظ سے نماز کی صحیح ادائیگی کے لئے اس کا اعادہ کیا جائے گا۔ پھر اس کی عمومیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: کہ یہی حکم ہر مکروہ طریقہ سے ادا ہونے والی نماز کا ہے۔ یہ لفظ وجوب کا فائدہ دیتا ہے۔ کئی علماء نے لفظِ وجوب کی تصریح کی ہے۔ جمہور علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ ہر وہ نماز جو کراہت کے ساتھ ادا کی گئی ہو یا ترک واجب کے ساتھ ادا ہوئی ہو' اس کا اعادہ ضروری ہے۔

مذکورہ بالا تمام صورتیں مکروہ تحریمی کی ہیں۔ اعادہ اس لئے لازم ہوتا ہے کہ واجب کے ترک سے واجب نمازی کے ذمہ واجب الادا ہوتا ہے۔ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے اس کی ادائیگی ضروری ہے اور چونکہ واجب صرف نماز کی صورت میں واجب ہوتا ہے الگ سے واجب نہیں ہوتا اس لئے اس کی ادائیگی کے لئے نماز کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ مکروہ تحریمی سے بچنا واجب ہے۔ جب کسی وجہ سے نماز مکروہ طریقہ سے ادا ہوگئی تو واجب ترک ہوگیا اور اعادہ لازم ٹھہرا اگر کوئی شخص ایسی صورت میں نماز کا اعادہ نہیں کرے گا تو اس سے فرض نماز کا مؤاخذہ نہیں ہوگا کیونکہ اس نے تمام ارکان ادا کر دیئے ہیں۔ اب صرف واجب کی ادائیگی کا مؤاخذہ باقی ہے۔ سو تجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بعض مشائخ کے نظریہ کے مطابق اعادہ واجب نہیں بلکہ مستحب ہے کیونکہ اگر اسے ضروری قرار

دیں تو پھر رکن اور واجب کے ترک میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

اس گفتگو کو بنیاد بنا کر یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان کے ذمہ دو نمازیں ہیں۔ ایک فرض اور دوسری واجب۔ جب فرائض ادا ہو گئے تو فرض نماز ادا ہو گئی اور واجب نماز باقی ہے جو واجبات پر مشتمل ہے بلکہ نماز ایک ہی ہے جو فرض ہے جیسا کہ پہلے بھی اس پر گفتگو کی گئی ہے۔

تھوڑی نجاست والے کپڑے میں نماز

ایسے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھنا جس پر ایک درہم سے کم نجاست لگی ہو جو معاف ہے مکروہ تحریمی ہے' اگر نماز کے رہ جانے کا اندیشہ ہو کہ وقت بہت ہی کم ہے یا جماعت سے رہ جانے کا اندیشہ ہو اور یہ امید بھی نہ ہو کہ اس کے بعد دوبارہ جماعت ہو گی تو پھر ایسے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

قضائے حاجت کے بعد جان بوجھ کر پانی کا استعمال نہ کرنا

پاخانہ کرنے کے بعد پتھر استعمال کئے اور قدرت کے باوجود پانی سے استنجاء نہ کیا اور وضو کر کے نماز پڑھ دی تو بھی نماز مکروہ ہوئی۔ ہاں حنفی اور شافعی علماء فرماتے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے پتھروں کے استعمال کے بعد استنجاء کی جگہ کو پاک قرار دیا ہے اس لئے ایسی صورت میں نماز مکروہ تنزیہی ہو گی۔

نماز میں سورتوں کو آگے پیچھے کر دینا

سورتوں کو آگے پیچھے کر دیا (مثلاً پہلی رکعت میں سورت ناس پڑھی اور دوسری میں سورت فلق پڑھ دی) تو نماز مکروہ ہو گئی۔

بحر الرائق میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ دو سورتوں کی ترتیب کی رعایت واجب ہے اور یہ واجب قرأت کے قبیل سے ہے کیونکہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس ترتیب کی رعایت کریں۔ قرآن کریم کی ترتیب توفیقی ہے اس کو بدلا نہیں جا سکتا' اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ علماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ نفلوں میں ترتیب کا لحاظ ضروری نہیں۔ واللہ اعلم.

جس نماز میں عمل قلیل کیا گیا ہو

ایسی نماز جس میں عمل قلیل کیا گیا ہے مکروہ ہے کیونکہ اس سے خشوع متاثر ہوا ہے۔ ہاں عمل کثیر سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

سجدہ کرنے کے لئے زمین پر پھونک مارنا

سجدہ کرنے کے لئے زمین پر پھونک مارنا۔

عن ام سلمة قالت رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم غلاما لنا يقال له افلح اذا سجد نفخ فقال يا افلح ترب

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک غلام کو دیکھا۔ یہ غلام ہمارا تھا اور اس کا نام افلح تھا کہ جب اس نے سجدہ کیا تو زمین پر پھونکا

وجھک. (رواہ جامع الترمذی) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے فلح تیرا چہرہ خاک آلودہ ہو۔

بول و براز کو روک کر نماز پڑھنا

پیشاب اور پاخانہ روک کر نماز پڑھنا۔ اسی طرح ہوا کو روکنا بھی مکروہ ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا صلوة عند حضرة الطعام و لا لمن یدافعه الاخبثان. (رواہ مسلم)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کھانا آ چکے تو کوئی نماز نہیں اور نہ ہی اس شخص کی نماز، نماز ہے جس نے پیشاب اور پاخانہ روکا ہوا ہے۔

یہاں نفی سے مراد کمال کی نفی ہے عذر کی صورت میں نماز مکروہ نہیں ہوگی مثلاً وقت بہت کم ہے کہ مشغولیت کی صورت میں نماز کے قضاء ہونے کا اندیشہ ہے اسی طرح معمولی حاجت ہو یا آدمی مریض ہو یا اس طرح ہوا کا زور ہو کہ اگر نہیں روکے گا تو نماز میں نکل جائے گی تو ایسی صورتوں میں پیشاب، پاخانے اور ہوا کا روکنا مکروہ نہیں ہے۔ یہ بیان کردہ مکروہات تمام کے تمام مکروہاتِ تحریمہ ہیں اس لئے ان صورتوں میں نماز کا اعادہ واجب ہے۔

نمازی کے سامنے سے گزرنا اور سترہ کا بیان

نمازی کے آگے سے گزرنا سخت گناہ ہے

نمازی کے سامنے سے اس طرح گزرنا کہ گزرنے والے کے اعضاء نمازی کے اعضاء کے برابر آ جائیں حرام ہے اور گزرنے والا گناہ گار ہے۔

عن ابی جھیم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو یعلم المار بین یدی المصلی ماذا علیه لکان ان یقف اربعین خیرا له من ان یمر بین یدیه.

حضرت ابوجہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نمازی کے سامنے سے گزرنے والا اگر جانتا کہ وہ کتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہوا ہے تو چالیس تک کھڑا رہنا نمازی کے سامنے سے گزرنے سے اس کے لئے بہتر ہوتا۔

ابونضر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہیں حضور ﷺ نے چالیس دن، مہینے یا چالیس سال فرمایا۔ اسے راویوں کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے پھر نمازی کے سامنے سے اس جگہ سے گزرنا حرام ہے جو نمازی اور اس کی سجدہ والی جگہ کے درمیان ہے۔ سجدہ والی جگہ سے مراد نمازی اور اس کی منتہائے نظر کے درمیان کی جگہ ہے۔ یعنی جب نمازی کھڑے ہو کر سجدہ والی جگہ کی طرف دیکھے اور اس کی نظر جس حد تک جائے یہاں سے گزرنا ممنوع ہے۔ یہی پسندیدہ رائے ہے۔ ایک قول ایک صف کا ہے اور ایک قول تین صفوں کا ہے یہ گفتگو صحراء کے بارے تھی لیکن جب نمازی مسجد میں کھڑا نماز پڑھ رہا ہو تو نمازی اور مسجد کی دیوار کے درمیان کی جگہ سے گزرنا ممنوع ہے۔ حرمت صرف اسی صورت میں ہے کہ نمازی اور گزرنے والے کے اعضاء بالکل برابر ہو جائیں۔ نماز پڑھنے والا اگر بالکونی میں کھڑا ہو اور

گزرنے والا سامنے سے گزرے اور دونوں کے اعضاء ایک دوسرے کے برابر نہ ہوں تو گزرنے والا گناہ گار نہیں ہو گا۔

انسان یا حیوانات کا گزرنا مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے

حیوان کے گزرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی بیشک گدھا یا کتا گزرے اور نہ ہی کسی انسان کے گزرنے سے نماز ٹوٹے گی اگر چہ عورت ہو۔

عن ابی الصهباء قال تذاكرنا ما يقطع الصلوة عند ابن عباس قال جئت انا و غلام من عبد المطلب على حمار ورسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى فنزل ونزلت فتركت الحمار امام الصف فما بالاه وجاء ت جاريتان من بنى عبد المطلب قد خلتابين الصف فما بالى ذلک.

(رواہ ابوداؤد)

حضرت ابی الصہباء سے روایت ہے کہ ہم حضرت عباس کی خدمت میں بیٹھے ان امور کا ذکر کر رہے تھے جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اور عبد المطلب کے خاندان کا ایک لڑکا گدھے پر سوار آئے تو رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے وہ لڑکا گدھے سے اترا اور میں بھی اتر پڑا۔ ہم نے گدھے کو صف کے سامنے چھوڑ دیا۔ حضور ﷺ نے کچھ پرواہ نہ کی پھر بنی عبد المطلب کی دو بچیاں آئیں اور صف میں گھس گئیں حضور ﷺ نے ان کی بھی کچھ پرواہ نہ کی۔

عن الفضل بن عباس قال اتانا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن فى بادية لنا ومعه عباس نصلى فى صحراء ليس بين يديه سترة وحمارة و كلبة بعثتان بين يديه فما بالى ذلک. (رواہ ابوداؤد والنسائی)

حضرت فضل بن عباس سے روایت ہے کہ ہم اپنے جنگل میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے آپ نے صحراء میں نماز پڑھی، سامنے سترہ بھی نہیں تھا جبکہ ہماری ایک گدھی اور ایک کتیا آپ ﷺ کے سامنے کھیل رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے کچھ پرواہ نہ کی۔

نسائی نے اسے عصر کی نماز کا نام دیا ہے۔

عن ابى سعيد قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لايقطع الصلوة شئى وادرءوا ما استطعتم فانما هو شيطان.

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی چیز نماز کو نہیں توڑتی۔ جتنا ہو سکے اسے روکو وہ ضرور شیطان ہے۔

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حدیث لایقطع الصلوٰۃ شیء پر علماء نے گفتگو کی ہے۔ فتح القدیر میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث کسی صورت حسن کے درجہ سے نہیں گرتی۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے یہ بات ہم تک پہنچی ہے کہ نمازی کے سامنے سے جو چیز بھی گزر جائے اس کی نماز نہیں ٹوٹتی۔ ایسی ہی ایک حدیث امام مالک نے بیان فرمائی ہے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنھما فقد تحقق انه لایفسد الصلوۃ بمرورامرأۃ ولا بمرور کلب اوحمار.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نمازی کے سامنے سے جو بھی چیز گزرے عورت' کتا یا گدھا اس کی نماز میں کوئی فرق نہیں آتا

اور رہی مسلم کی یہ حدیث۔

عن ابی ھریرۃ قال النبی صلی اللہ علیه وسلم اتقطع الصلوۃ الکلب والمرأۃ والحمار وبقی من ذلک مثل مؤخرۃ الرحل.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کتا' عورت اور گدھا نماز کو توڑ دیتے ہیں اور ان سے بچاؤ کی صرف یہ صورت ہے کہ نمازی کے سامنے پلان کی پچھلی لکڑی کے برابر کوئی چیز ہو۔

اس سے پہلے حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ تہجد کی نماز ادا فرماتے اور میں ان کے سامنے لیٹی ہوتی۔

ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سونے والے کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

سترہ کیسا ہو اور کیسے گاڑھا جائے

صحراء میں نماز پڑھتے ہوئے نمازی کو سترہ گاڑھنا چاہئے جو ایک ہاتھ کی مقدار لمبا ہو جیسا کہ حدیث مبارک سے ثابت ہے۔

عن طلحۃ بن عبید اللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال اذا وضع احدکم بین یدیه مثل موخرۃ الرجل فلیصل ولا یبال من مرورا ذلک. (رواہ مسلم)

طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جب کوئی شخص اپنے سامنے پلان کی پچھلی لکڑی کے برابر کوئی چیز رکھ لے تو وہ نماز پڑھے اور جو اس سے دوسری طرف گزرے کوئی حرج نہیں ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ سترہ انگلی کی طرح موٹا ہو کیونکہ اس سے کم موٹا سترہ دور سے دکھائی نہیں دے گا اور مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا اور مناسب یہ ہے کہ نمازی سترہ کے قریب کھڑا ہو۔

عن سھل بن ابی خیثمة یبلغ به النبی صلی اللہ علیه وسلم قال اذا صلی احدکم الی سترۃ فلیدن منھا لا یقطع الشیطان علیه صلوته. (رواہ مسلم)

حضرت سہل بن ابی خیثمہ سے روایت ہے کہ انہیں یہ بات پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص سترہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے قریب کھڑا ہو (اس طرح) شیطان اس کی نماز کو نہیں توڑے گا۔

سترہ بالکل سیدھ میں نہیں گاڑھنا چاہئے بلکہ مناسب یہ ہے کہ دائیں یا بائیں ہو۔

عن المقداد بن الاسود مارأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى الى عود ولا عمود ولاشجرة الا جعله من حاجبه الايمن او الا يسر ولا يصمده صمدا. (رواہ ابوداؤد)

حضرت مقداد بن اسود سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو لکڑی' ستون اور درخت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے نہیں دیکھا مگر یہ کہ وہ اسے دائیں یا بائیں ابرو کے سامنے رکھتے تھے اور بالکل سیدھ میں کھڑے نہیں ہوتے تھے۔

مقتدی کا سترہ

امام کا سترہ مقتدی کے لئے کافی ہے۔

عن ابن عمر قال كان النبى صلى الله عليه وسلم يغدوالى المصلى والعزة بين يديه يحمل وينصب بالمصلى بين يديه فيصلى اليها. (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد کو جاتے تو آپ کے ہاتھ میں نیزہ ہوتا جسے آپ اپنے سامنے گاڑھ کر نماز پڑھتے۔

سترہ اور اپنے درمیان سے کسی کو نہ گزرنے دے۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔ جس قدر ہو سکے روکو۔ علماء فرماتے ہیں کہ روکنے کے لئے اشارہ اور تسبیح کافی ہے۔ دونوں کو جمع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ آگاہ کرنے کے لئے ایک ہی کافی ہے۔ واللہ اعلم باحکامه.

اگلے آدمی کا پچھلے کے لئے سترہ ہونا

کسی کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے اس کا وضو ہو یا نہ ہو۔ سامنے بیٹھنے والا آدمی سترہ کا فائدہ دیتا ہے۔

عن نافع قال كان ابن عمر اذا لم يجد سبيلا الى سارية قال لى ول ظهرك. (رواہ ابن ابی شیبہ)

نافع سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ابن عمر جب نکلنے کا کوئی راستہ نہ پاتے تو فرماتے اپنی پیٹھ پھیر لے۔

فتح القدیر میں بھی ایسے ہی ہے' اگر سامنے بیٹھنے ہوئے آدمی کو اس قسم کی گفتگو میں مشغول پائے کہ پیچھے کھڑے ہونے والے کی توجہ بٹ جاتی ہو اور وہ دل جمعی کے ساتھ نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ گویا بات کرنے والے کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

☆☆☆☆☆

سجدۂ سہو کا بیان

کب سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے؟

ایک صحیح حدیث میں ہے۔

عن عبد اللہ بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قام من اثنتین من الظھر لم یجلس بینھن فلما قضی صلوتہ سجد سجدتین ثم سلم بعد ذلک. (رواہ البخاری ومسلم)

عبداللہ بن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی دو رکعتیں پڑھ کر کھڑے ہو گئے اور ان (چار رکعتوں) کے درمیان قعدہ نہ فرمایا جب آپ نے نماز پڑھ لی تو دو سجدے کئے اور اس کے بعد سلام پھیرا۔

اس سے پہلے آپ جان چکے ہیں کہ پہلا قعدہ اور تشہد دونوں واجب ہیں۔ اس حدیث سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ نے ان کے ترک پر سجدۂ سہو کیا تو معلوم ہوا کہ سجدۂ سہو واجب کے ترک پر جائز ہے اور اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ سجدۂ سہو واجب ہے۔ امام شافعی اسے سنت کہتے ہیں۔ بھولنے کی صورت میں یہ سجدہ جائز ہے۔ بھول جانا ادھوری غلطی ہے جس کا ازالہ سجدۂ سہو سے ہو جاتا ہے جبکہ جان بوجھ کر کسی واجب کو چھوڑ دینا پوری غلطی ہے جس کا ازالہ اس سے نہیں ہوتا۔

سجدۂ سہو کرنے کا طریقہ

سجدۂ سہو کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آخری قعدہ کے بعد دو سلام پھیرے پھر تکبیر کہے (اللہ اکبر) اس کے بعد ایک سجدہ کرے۔ دوبارہ تکبیر کہے اور سجدہ سے سر اٹھائے اور بیٹھ جائے ایک بار پھر تکبیر کہے اور دوسرا سجدہ کرے پھر بیٹھ کر تشہد پڑھے درود پاک پڑھے دعا مانگے اور سلام پھیر کر نماز سے باہر آ جائے۔

سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کرنا افضل ہے

ہمارے نزدیک سلام کے بعد سجدۂ سہو کیا جاتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ سجدۂ سہو سلام سے پہلے کرنا چاہئے یہ اختلاف افضلیت کا ہے۔ ورنہ دونوں صورتیں جائز ہیں اور دونوں عمل حدیث سے ثابت ہیں۔

فقد روی فی حدیث عبد اللہ بن مالک صلی لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکعتین من بعض الصلوۃ ثم قام فلم یجلس فقام الناس معہ فلما قضی صلوتہ ونظرنا تسلیمہ کبر قبل التسلیم وسجد سجدتین

عبداللہ بن مالک کے حوالے سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی نماز کی ہمیں دو رکعتیں پڑھائیں پھر کھڑے ہو گئے اور نہ بیٹھے لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے جب آپ نماز پڑھ چکے اور ہم آپ کے سلام پھیرنے کے انتظار میں تھے کہ آپ نے سلام سے پہلے تکبیر کہی اور بیٹھ

وهو جالس. (رواہ البخاری ومسلم)

کر دو سجدے کیے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام سے پہلے سجدۂ سہو فرمایا۔

عن ابی هريرة قال صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم احدى صلوتى العشى قال محمد بن سيرين واكثرظنى العصر ركعتين ثم سلم ثم قام الى خشبة فى مقدم المسجد فوضع يده عليها وفيهم ابوبكر وعمر فهاباه ان يكلماه وخرج سرعان الناس فقالوا قصرت الصلوة ورجل يدعوه النبى صلى الله عليه وسلم ذا اليدين فقال يا نبى الله انسيت ام قصرت فقال لم انس ولم نقصر قال بلى قد نسيت فقال صدق ذواليدين فقام فصلى ركعتين ثم سلم ثم كبر فسجد مثل سجوده اواطول ثم رفع رأسه وكبر. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی۔ محمد بن سرین کے بقول گمان یہ ہے کہ عصر کی دو رکعتیں تھیں پھر آپ نے سلام پھیر دیا اس کے بعد آپ اس لکڑی کی طرف آئے جو مسجد میں قبلہ کی طرف گڑی تھی اور اس پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ (مقتدیوں میں) حضرت ابو بکر اور عمر بھی تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ہیبت کی وجہ سے گفتگو نہ کی جلدی جانے والے حضرات یہ کہہ کر نکل گئے کہ نماز میں کمی ہو گئی ہے۔ ایک شخص جسے رسول اللہ ﷺ ذوالیدین کہتے تھے بولا یا نبی اللہ! کیا آپ بھول گئے ہیں یا نماز میں کمی کا حکم ہو گیا ہے یہ سن کر آپ نے دائیں بائیں دیکھا اور فرمایا: ذوالیدین کیا کہتا ہے۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! وہ سچ کہتا ہے آپ نے صرف دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ یہ سن کر آپ نے دو رکعتیں مزید پڑھا دیں اور سلام پھیر دیا پھر تکبیر کہی سجدہ کیا ایک اور تکبیر کہہ کر دوبارہ سجدہ کیا پھر تکبیر کہی اور سجدے سے سر اٹھایا۔

مجھے عمران بن حصین کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے خبر دی ہے کہ اس کے بعد (تشہد پڑھ کر) حضور ﷺ نے سلام پھیر دیا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سجدۂ سہو سلام کے بعد جائز ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔

عن ثوبان قوله صلى الله عليه وسلم لكل سهو سجدتان بعد السلام.

حضرت ثوبان سے حضور ﷺ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ہر سہو کیلئے سلام کے بعد دو سجدے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سلام کے بعد سجدہ کرنا افضل ہے۔ حضور ﷺ کا سلام سے پہلے سجدۂ سہو کرنا تعلیم کی غرض سے تھا اور اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ سلام سے پہلے بھی سجدۂ سہو کرنا جائز ہے۔ [illegible]

[illegible]

مستغنی کر دیتا ہے۔ ذوالیدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث ان کے علاوہ دو اور امور پر دلالت کرتی ہے۔ ایک گفتگو کے بعد سجدۂ سہو کے جواز پر جس طرح کہ امام مالک کا مذہب ہے۔ علماء فرماتے ہیں یہ اس دور کا عمل ہے جب نماز میں گفتگو کرنا منسوخ نہیں ہوا تھا۔ دوسرا امر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز میں حرکت کرنا ممنوع نہیں ہے اگرچہ وہ فعل کثیر کی حد تک ہی کیوں نہ ہو۔ جو چیز ہمارے علماء کے فروعی مسائل سے ظاہر ہوتی ہے کہ نماز میں حرکت کرنا اور قبلہ کی طرف سے منہ موڑنا نماز کے منافی نہیں ہیں جبکہ یہ دونوں عمل نماز کے بعد ہوں جب تک کہ نمازی نے گفتگو نہیں کی اور اس کے خیال میں نماز ہو چکی ہے اور وہ مسجد میں ہے۔

جب سجدۂ سہو کرنا بھول جائے

اگر ایسی صورت کھلی جگہ یا صحراء میں پیش آتی ہے تو جب تک صفوں سے باہر نہیں آ جاتا یا آگے بڑھ کر سترہ یا سجدہ والی جگہ سے تجاوز نہیں کر جاتا' سجدہ کر سکتا ہے اسی لئے علماء فقہ فرماتے ہیں کہ جب نمازی یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ نماز مکمل کر چکا ہے' سلام پھیر دیتا ہے حالانکہ اس کے ذمے سجدۂ سہو ہے یا نماز کا کوئی فرض سجدہ رہتا ہے یا سجدۂ تلاوت کرنا ہے اور انحراف کے بعد اسے یاد آتا ہے تو قبلہ رو ہو کر سجدہ کرے اور اس کے بعد دوبارہ سجدۂ سہو کر کے تشہد مکمل کر کے سلام پھیر دے لیکن شرط یہ ہے کہ سجدہ والی جگہ سے یا صفوں سے یا صحراء میں صفوں سے آگے نہ گزرا ہو۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ سجدۂ سہو واجب کے ترک کی وجہ سے لازم آتا ہے تو اب ہم چند مسائل کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

سجدۂ سہو لازم ہونے کی صورتیں

سورت فاتحہ اور اس کے بعد کسی اور سورت کی تلاوت واجب ہے۔ اگر پہلی رکعت میں سورت فاتحہ اور اس کے بعد والی سورت رہ گئی اور پہلی رکعت کے رکوع میں یا اس کے بعد یاد آیا تو دوبارہ کھڑا ہو جائے اور سورت فاتحہ اور سورت کی تلاوت کرے پھر رکوع اور آخر میں سجدۂ سہو کر لے کیونکہ پہلا رکوع کالعدم ہوا اس لئے کہ اس کا محل قرأت کے بعد ہے۔ اگر رکعت مکمل کرنے پر یاد آیا کہ میں نے تلاوت نہیں کی۔ اگر سورت فاتحہ رہ گئی ہے تو دوسری دو رکعتوں میں اس کی تلاوت نہیں کر سکتا کیونکہ سورت فاتحہ کا تکرار لازم آئے گا اور اگر دوسری سورت رہ گئی ہے جو فاتحہ کے بعد پڑھی جاتی ہے تو دوسری کسی رکعت میں اس کی تلاوت کرے کیونکہ وہ محل قرأت ہے اور سجدۂ سہو کرے۔

اگر سورت فاتحہ کو بھول کر کوئی اور سورت پڑھ دی پھر یاد آیا کہ فاتحہ رہ گئی ہے تو سورت فاتحہ پڑھے اور اس کے ساتھ سورت ملائے اور سجدۂ سہو کرے کیونکہ فاتحہ اور سورت کے درمیان ترتیب لازمی ہے۔

اگر قرأت بلند آواز سے کرنا تھی اور آہستہ کر دی یا آہستہ کرنا تھی اور بلند آواز سے کر دی اگر یہ قرأت اس مقدار سے کم ہے جس سے نماز ہو جاتی ہے تو معاف ہے کیونکہ ایسی صورت سے احتراز مشکل ہے جیسا کہ پہلے بیان

کیا جا چکا ہے کہ حضور ﷺ کی قرأت کے کچھ الفاظ صحابہ کرام سن لیتے تھے۔ اگر جہر یا اخفا اتنا ہے کہ اس سے نماز ہو سکتی ہے تو سجدۂ سہو لازم آئے گا کیونکہ امام پر جہر (بلند آواز سے پڑھنا) واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح اخفاء بھی امام پر واجب ہے۔

قیام کی حالت میں تشہد پڑھ دیا۔ اگر پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے پڑھا تو سجدۂ سہو لازم نہیں کیونکہ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان ثناء کا محل ہے اور تشہد ثناء ہے۔ اس سے آپ کو یہ اندازہ بھی کر لینا چاہئے کہ شروع والی دعا کے لئے کوئی الفاظ متعین نہیں ہیں جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اختلاف صرف اولویت کا ہے۔

اگر قیام میں تشہد قرأت کے بعد پڑھ دیا اور رکعت پہلی ہے یا دوسری رکعت میں قرأت سے پہلے پڑھ دیا یا بعد میں پڑھ دیا تو سجدۂ سہو لازم ہوگا کیونکہ رکوع کو قرأت سے ملانا واجب ہے اسی طرح دوسری رکعت میں قرأت سے ابتدا بھی واجب ہے۔ دونوں سورتوں میں واجب کا ترک آ رہا ہے اس لئے آخر میں سجدۂ سہو کرنا ہوگا۔

اگر حالت قیام میں ہے اور دوسری دو رکعتوں میں تشہد پڑھتا ہے تو سجدۂ سہو لازم نہیں کیونکہ دوسری دو رکعتوں کا قیام محل ثناء ہے اور تشہد ثناء ہے۔

تعدیل ارکان کے ترک سے بھی سجدۂ سہو لازم آ جاتا ہے اگر رکوع یا سجود میں تعدیل ارکان بھول گیا تو طرفین کے نزدیک سجدۂ سہو واجب ہوگا جبکہ امام ابو یوسف کے نزدیک نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ ان کے نزدیک تعدیل ارکان فرض ہے۔

اگر عدم تعدیل کو سجدہ میں اس طرح بھولا کہ سر بلند نہیں کیا اور رکوع میں قومہ ترک کر دیا تو امام ابو یوسف کے نزدیک نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ قومہ ان کے نزدیک فرض ہے اور آپ یہ جانتے ہیں کہ اس مسئلہ میں امام ابو یوسف کی رائے صحیح ہے۔ طرفین کے نزدیک اس صورت میں سجدۂ سہو لازم ہوگا جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طرفین (امام ابو حنیفہ اور امام محمد) کے نزدیک قومہ واجب ہے۔ اسی پر مشائخ فقہ کا فتویٰ ہے۔

وہ ارکان جن میں تکرار ہے ان میں ترتیب واجب ہے۔ اگر کوئی اس ترتیب کی رعایت کو بھول گیا تو سجدۂ سہو واجب ہو جائے گا مثلاً نمازی دوسرا سجدہ بھول گیا اور دوسری یا اس کے بعد کسی رکعت میں یاد آ گیا یا آخری قعدہ میں تشہد سے پہلے یاد آ گیا تو پہلے فرض سجدہ کرے اور اس کے بعد سجدۂ سہو کرے۔ اگر فرض سجدہ کا ترک تشہد کے بعد سلام سے پہلے یا سلام کے بعد مسجد سے نکلنے سے پہلے یاد آیا تو فرض سجدہ پہلے کرے اور اس کے بعد آخری قعدہ اور تشہد کا اعادہ کرے اور پھر سجدۂ سہو کرے کیونکہ سجدہ کرنے کی وجہ سے یہ قعدہ باطل ہوا اس لئے کہ یہ ترتیب فرض ہے، آخری قعدہ تمام ارکان کی تکمیل کے بعد آتا ہے۔

اگر ان افعال میں ترتیب بھول جائے جن میں تکرار نہیں مثلاً رکوع سے پہلے سجدہ کر دیا اور دوسری رکعت کے قیام سے پہلے یا اس کے بعد یاد آ گیا تو پہلی رکعت کا رکوع کرے اور اس کے بعد دوبارہ سجدہ کرے کیونکہ ترتیب فرض تھی جسے وہ قائم نہیں رکھ سکا پھر دوسری رکعت کے لئے اٹھے اور نماز مکمل کر کے سجدۂ سہو کرے۔

اگر دوسری رکعت کے رکوع میں یاد آیا کہ پہلی رکعت کا رکوع نہیں کیا تو یہ دونوں رکعتیں ایک رکعت متصور ہو

گی اور دوسری رکعت کا پڑھنا لازم ہوگا اور اس کے بعد بقیہ نماز مکمل کر کے سجدۂ سہو کرے کیونکہ پہلی رکعت کے رکوع اور سجدہ میں کئی زائد افعال خلل انداز ہو گئے ہیں اور سجدۂ سہو ترتیب میں فرق واقع ہونے کی وجہ سے لازم ہوتا ہے جیسا شرح وقایہ میں ہے کہ اس سے یہ بات سامنے آ گئی کہ افعال غیر متکررہ میں (یعنی ایک رکعت میں جن کا تکرار نہیں) ترتیب واجب ہے، فرض نہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ اگر دو رکعتوں کو ایک رکعت تصور نہ کریں تو ترتیب میں خلل واقع ہونے کی وجہ سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے مذکورہ مسائل میں گفتگو کی گئی ہے۔

پہلا قعدہ واجب ہے۔ اگر کوئی پہلا قعدہ بھول کر تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا تو قعدہ کی طرف نہ پلٹے۔ آخر میں سجدۂ سہو کر لے۔ اگر سجدہ کے زیادہ قریب ہو اس طرح کہ اس کے گھٹنے زمین سے جدا نہ ہوئے ہوں تو قعدہ کی طرف لوٹ آئے اور سجدۂ سہو نہ کرے کیونکہ جب تک سجدہ کے قریب ہے گویا وہ سجدہ میں ہے۔

قد روی المغیرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اذا قام الامام فی الرکعتین فان ذکر قبل ان یستوی قائما فلیجلس واذا استوی قائما فلا یجلس ویسجد سجدتی السهو. (رواہ ابوداؤد)

حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دو رکعتوں کے بعد امام کھڑا ہو جائے اگر سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے یاد آ جائے تو بیٹھ جائے اور جب سیدھا کھڑا ہو جائے تو نہ بیٹھے اور بھول کے دو سجدے کرے۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس اور عمر بن عبدالعزیز کا فتویٰ اسی پر ہے۔

حنفی فقہاء فرماتے ہیں قربِ قیام کا حکم سیدھا کھڑا ہونے کے زمرے میں آتا ہے اور قربِ سجود کا حکم سجدہ کا ہے۔

ایک رکن کو دوسرے رکن سے ملانا بھول گیا تو بھی سجدۂ سہو لازم ہو جائے گا۔ اس بناء پر علماء نے فرمایا ہے کہ اگر کسی نے قرأت کی اور اتنی دیر کھڑا رہا جتنی دیر میں کوئی ایک رکن ادا ہو سکتا ہے تو سجدۂ سہو کرے گا۔ بخلاف ان لوگوں کے جو سکتہ کو سنت سمجھتے ہیں۔ اگر اتنی دیر کھڑا ہوا کہ جس میں سانس لے سکتا ہے تو سجدۂ سہو بھی لازم نہیں جیسا کہ اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اگر سورت فاتحہ کے بعد سوچنے لگا کہ کونسی صورت پڑھوں اور ایک رکن کی ادائیگی کی مقدار ٹھہرا رہا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

اگر تیسری رکعت کے لئے اٹھنے میں تاخیر ہو گئی اور بھول کر درود پاک پڑھنے لگا یا دعا مانگنے لگا یا خاموش بیٹھا رہا اور اس وجہ سے تیسری رکعت کے لئے اٹھنے میں دیر ہو گئی تو سجدۂ سہو واجب ہے کیونکہ قعدہ اولی اور تیسری رکعت کو ملانا واجب ہے امام شافعی کی رائے اس سے مختلف ہے۔ ان کی رائے میں درود پاک پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم نہیں آتا اگر پہلے قعدہ میں سلام پھیر دیا اور بھول گیا کہ ابھی نماز باقی ہے تو اس کا حکم آپ جانتے ہیں۔

اگر آخری قعدہ بھول گیا اور زائد رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا لیکن زائد رکعت کا سجدہ کرنے سے پہلے بیٹھ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہے کیونکہ آخری قعدہ رکن ہے اور یہ رکن اپنی جگہ سے مؤخر ہو گیا ہے۔ اگر اس زائد رکعت کو سجدہ کر کے مکمل کر دیا تو فرض نماز فاسد ہو جائے گی کیونکہ فرض کے ارکان کو پورا کرنے سے پہلے نفل نماز شروع کر دی اور

سجدہ کر کے اس کو محکم بنا دیا۔

پھر اس میں یہ اختلاف ہے کہ امام محمد کے نزدیک تو نماز ٹوٹ جائے گی لیکن شیخین کے نزدیک فرض سے نفل میں تبدیل ہو جائے گی۔

اگر آخری قعدہ میں تشہد پڑھ کر کھڑا ہو گیا تو زائد رکعت کا سجدہ کرنے سے پہلے واپس آ جائے اور سلام میں تاخیر کی وجہ سے سجدہ کرے۔ اگر زائد رکعت کا سجدہ کر دیا تو اب نفل کو مستحکم کرنا فرض ہوا۔ چونکہ فرض نماز کے تمام ارکان کو مکمل کرنے کے بعد زائد رکعت کو ملایا ہے اس لئے ایک اور رکعت پڑھے تا کہ دو نفل ہو جائیں اگر رکعت نہیں ملاتا تو بھی جائز ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں دونوں صورتوں میں نماز ہو جائے گی اور صرف سجدۂ سہو کرنا پڑے گا ان کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے۔

عن ابن مسعود ان رسول الله صلی الله علیه وسلم صلی الظهر خمسا فقیل ازید فی الصلوٰة فقال ما ذلک قالو اصلیت خمسا فسجد سجدتین بعد ماسلم. (رواہ ابن ابی شیبہ)

حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھ دیں۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ کیا نماز میں اضافہ کر دیا گیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اضافہ تو نہیں ہوا صحابہ نے عرض کیا آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں۔ (یہ سن کر) آپ ﷺ نے سلام کے بعد سجدۂ سہو کیا۔

اس میں امام شافعی کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ یہ ایک حالت کو بیان کیا گیا ہے اس میں عموم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے حضور ﷺ نے آخری قعدہ کے بعد پانچویں رکعت پڑھی ہو۔ اگر کسی کو رکعتوں کی تعداد میں شک پڑ گیا اور شک اس کی عادت نہیں تو نئے سرے سے نماز پڑھے۔

لان ابن عمر قال فی الذی لا یدری اصلی ثلثا ام اربعا یعید.

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں جو نہیں جانتا کہ تین پڑھی ہیں یا چار پڑھی ہیں فرمایا کہ وہ دوبارہ نماز پڑھے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابی شیبہ نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے۔

نمازی کو اگر بھولنے یا شک میں مبتلا ہونے کی عادت ہو

اگر بھولنا اور شک میں مبتلا ہونا اس کی عادت ہے تو نئے سرے سے پڑھنا اس کے لئے تکلیف کا باعث ہو گا اس لئے وہ تحری کرے اور اس کو بنیاد بنائے۔

عن ابن مسعود ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اذا کنت فی صلوٰة فشککت فی ثلث او اربع واکثر ظنک

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تو نماز پڑھ رہا ہو اور شک پڑ جائے کہ تین پڑھی ہیں یا چار اور غالب گمان یہ ہو کہ چار پڑھی ہیں

علی اربع تشھدت ثم سجدت سجدتین وانت جالس قبل ان تسلم ثم تشھدت ایضاً ثم تسلم. (رواہ ابوداؤد)

تو تشہد کے بعد بیٹھ کر دو سجدے کرے، اس کے بعد دوبارہ تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے۔

اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

اگر غالب گمان کسی طرف نہیں تو اقل کو بنیاد بنا کر نماز مکمل کرے اور آخر میں سجدۂ سہو کرے۔

عن الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا شک احدکم فی صلوتہ فلم یدر کم صلی ثلثا او اربعا فلیطرح الشک ولیبن علی ما استیقن ثم یسجد سجدتین قبل ان یسلم فان کان صلی خمسا شفعن لہ صلوتہ وان کان صلی اتما ما للاربع کانتا ترغیما للشیطان. (رواہ مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھتے ہوئے شک میں مبتلا ہو جائے اور اسے کچھ اندازہ نہ ہو کہ تین پڑھ چکا ہے یا چار تو شک کو جھٹک دے اور اپنے یقین پر بنیاد رکھے اور سلام سے پہلے دو سجدے کرے۔ اب اگر اس نے پانچ رکعتیں پڑھ دیں تو اس کی یہ نماز اس کے لئے سفارش کرے گی اگر چار رکعتوں کو مکمل کرنے کے لئے پڑھی تو دو سجدے شیطان کے لئے رسوائی اور ذلت کے لئے ہو جائیں گے۔

کم سے کم پر بناء کرتے ہوئے رکعتوں کو مکمل کرے اور اس جگہ آخری قعدہ کرے جہاں آخری قعدہ کا گمان ہے اس کے بعد سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کرے۔ اگر فجر میں شک ہو کہ ایک پڑھی ہے یا دو یا ظہر میں یہ شک ہو کہ تیسری پڑھی ہے یا چوتھی اور غالب گمان بھی نہیں تو فجر میں پہلی اور ظہر میں تیسری کو بنیاد بنائے اور اس کے بعد ایک رکعت اور پڑھ کر نماز مکمل کرے اور سجدۂ سہو کرے اگر ظہر کی نماز میں یہ شک پڑ جائے کہ تیسری پڑھی ہے یا دوسری تو بیٹھ جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دو پڑھ چکا ہو پھر ایک رکعت پڑھے جس میں احتمال ہے کہ وہ تیسری ہو یا چوتھی پھر بیٹھ جائے کیونکہ یہ احتمال ہے کہ وہ چوتھی رکعت ہو پھر ایک اور رکعت پڑھ کر بیٹھ جائے، سلام پھیرے اور سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کرے۔

نماز باجماعت کا بیان

جماعت کا حکم

جماعت کا حکم کیا ہے؟ اس کے بارے علماء کی مختلف آراء ہیں۔ امام احمد اور بعض ظاہری علماء اسے نماز کے لئے شرط قرار دیتے ہیں لیکن یہ بعید از قیاس ہے کیونکہ صحابہ کرام سے جماعت کا ترک ثابت ہے اور حدیث مبارک "جعلت لی الارض روئے زمین کو میرے لئے مسجد بنایا گیا ہے"۔ بھی اس نظریہ کی تردید کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ نماز کے لئے مسجد میں جانا شرط نہیں۔

امام شافعی کے نزدیک واجب کفایہ ہے۔ یہ رائے صحیح ہو سکتی ہے۔

ہمارے مذہب میں بھی مختلف روایات ہیں۔ متون میں ہے کہ یہ سنت مؤکدہ ہے جس پر دوسری سنتوں سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ نماز باجماعت کی سنت قریب الی الواجب ہے۔ بعض فتاویٰ میں اسے واجب کہا گیا ہے۔ اس پر بہر حال علماء کا اتفاق ہے کہ اگر ایک مسجد میں نماز باجماعت رہ گئی تو جماعت کے لئے دوسری مسجد میں جانا واجب نہیں ہے۔

شیخ ابن الہمام کے نزدیک جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے۔ آپ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لقد هممت ان امر بالصلوة فيقام ثم امر رجلا فيصلي بالناس ثم انطلق معي رجال معه حزم من حطب الى قوم لايشهدون الصلوة فاحرق عليهم بيوتهم.

(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ مؤذن کو حکم دوں کہ وہ اقامت کہے پھر کسی آدمی کو حکم دوں کہ وہ میری جگہ نماز پڑھائے۔ میں آگ کے فتیلے لے کر جاؤں اور ان لوگوں کو جو اس (اذان اور اقامت کے) بعد بھی نماز میں شرکت کے لئے گھروں سے نہیں نکلتے جلادوں۔

اس حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے حیران کن امر ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول خود ایک واجب چیز کو چھوڑ کر ان لوگوں کے پاس جائیں اور انہیں گھروں سمیت جلائیں جو اسی واجب کے تارک ہیں۔

گھر جلانے کے ارادہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ جماعت واجب ہے، ترک اذان کے قتال پر علماء کا اجماع ہے حالانکہ اذان سنت ہے، واجب نہیں ہے۔ گھر جلانا وجوب کے پیش نظر نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ جماعت اگرچہ سنت ہے لیکن شعائر دین میں سے ہے۔ حضور ﷺ کے دور میں جماعت منافق اور مؤمن حقیقی کے درمیان وجہ امتیاز تھی جس طرح آج بدعتی اور سنی کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور جس نے دین کے شعائر کو پس پشت ڈالا اس کے گھر کو جلانا باعث حیرت نہیں ہونا چاہئے۔

ظاہریہ میں سے کچھ علماء نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے جماعت کے شرط ہونے کی رائے قائم کی ہے۔ نماز کے لئے جماعت کو شرط قرار دینے کی رائے قائم کرنا فاسد ہے کیونکہ اس میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے یہ نظریہ قائم ہو سکے کہ نماز باجماعت شرط ہے اور نہ ہی اس کی فرضیت ثابت ہوتی ہے اور فتح القدیر میں جو یہ کہا گیا ہے کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک تو فرض اور واجب میں کوئی فرق نہیں۔ جو حکم شارع سے صادر ہو وہ قطعی فرض ہے اور اس کا ترک ہونا نماز کی صحت کے منافی ہے۔ فرض اور واجب کے درمیان فرق ہماری طرف سے قائم کردہ ہے۔ اگر کوئی چیز قطعیت سے ثابت ہو تو وہ فرض ہے اور اس کا ترک صحت نماز کے منافی ہے۔ اگر اس میں ظن کو دخل ہے تو وہ واجب ہے اور صحت کے منافی نہیں ہے کیونکہ شارع کی طرف سے اس کا نماز کے منافی ہونا قطعیت سے ثابت نہیں ہے فتح القدیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ ہر فرض کا ترک صحت نماز کے منافی نہیں مثلاً غصب شدہ چیز کو اصل مالک کے حوالے کرنا فرض ہے اور اس کا ثبوت قطعی ہے۔ اگر کسی نے غصب شدہ زمین میں نماز

پڑھی تو فرض ترک ہوگا لیکن اس فرض کا ترک نماز کی صحت کے منافی نہیں ہوگا غصب شدہ زمین میں نماز ہو جائے گی بلکہ اس کا شرط ہونا قطعیت کے باوجود ایک زائد معنی کی حیثیت رکھتا ہے۔

شرط اگر دلیل ظنی سے ثابت ہو تو اس کا نہ پایا جانا فساد کا موجب بنتا ہے جس طرح قطعی دلیل سے ثابت شرط کا انتفاء فسادِ نماز کا موجب ہوتا ہے۔ جیسے حلال جانور کے پیشاب سے پاک ہونے کی شرط اگر نہ پائی جائے تو نماز کے فساد کا موجب ہوگا۔

اس میں راز کی بات یہ ہے کہ نماز شروط اور ارکان کے حوالے سے ایک مجمل عبادت ہے اس لئے ظنی دلیل سے بھی اس کی شرائط کو بیان کیا جاسکتا ہے جس طرح اس کی شرائط کو قطعی دلیل سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ حدیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو جماعت کے شرط کا موجب ہو بلکہ حدیث مبارک سے جماعت کی تاکید کا حکم ثابت ہوتا ہے اور جماعت کے تارک کیلئے تہدید ہے۔ اگر جماعت کو لازم ٹھہرایا جائے اور کہا جائے کہ جماعت شرط ہے تو لازم آئے گا کہ ترک شرط کے باوجود بھی نماز پڑھنا صحیح ہے۔

جو لوگ جماعت کو واجب کفایہ کہتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ ہر آدمی پر واجب ہونے سے حرج لازم آتا ہے۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان کا گھر میں نماز پڑھنا ثابت ہے اسی لئے ان لوگوں نے اسے واجب علی الکفایہ کے زمرے میں رکھا ہے۔

جو لوگ جماعت کو سنت کہتے ہیں اور وجوب کی نفی کرتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃ الجماعۃ تفضل صلوۃ الفذبسبع وعشرین درجۃ.	حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ حدیث ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس درجے افضل ہے۔

(رواہ البخاری ومسلم)

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اکیلے نماز پڑھنا جائز ہے لیکن افضل جماعت سے پڑھنا ہے۔ اگر جماعت واجب ہوتی تو ترک واجب پر نہی وارد ہوتی اور ایسا کہیں نہیں کہ شارع علیہ السلام نے مامور بہ کو کسی ممنوع چیز پر فضیلت دی ہو اور اس حقیقت کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا کہ اکیلے نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کا جواز جماعت کے وجوب کے منافی نہیں کیونکہ اس کا مقتضاء جواز ہے لیکن مفضولیت کے ساتھ اور شارع علیہ السلام کے عرف میں اس کا اطلاق منہی عنہ پر نہیں ہوتا۔

سنت کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر مواظبت اختیار فرمائی ہے اور نماز باجماعت کی بڑی تاکید کی ہے۔

جماعت عذر کے سبب ساقط ہو جاتی ہے

پھر جماعت واجب ہو یا سنت' عذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔ بیماری مختلف سمتوں سے ہاتھ اور پاؤں کا کٹا ہونا' مفلوج' دشمن یا درندہ وغیرہ سے خوف بڑھاپا جس کی وجہ سے چل نہ سکتا ہو۔ تاریکی' بارش اور کیچڑ ان تمام

صورتوں میں جماعت ساقط ہو جاتی ہے۔ مؤطا شریف میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے رخصت والی حدیث کو نقل فرمایا ہے۔ یعنی وہ حدیث پاک جس میں مذکورہ بالا صورتوں میں پڑاؤ میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اندھا آدمی گھر میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف سے اجازت دی گئی ہے مثلاً حضور ﷺ نے ایک نابینا صحابی حضرت عتبان بن مالک کو اجازت دی کہ وہ جماعت میں شریک نہ ہوں۔ فتح القدیر میں بھی یہی ہے۔

ما روی ابو داؤد ان ابن ام مکتوم قال یا رسول اللہ انی ضریر شاسع الدار ولی قائد لایلائمنی فھل تجد رخصۃ ان اصلی فی بیتی قال اتسمع النداء قال نعم قال ما اجد لک رخصۃ.

ابو داؤد نے روایت کیا ہے کہ جناب ابن ام مکتوم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ میں نابینا ہوں، میرا گھر دور ہے اور کوئی ایسا آدمی بھی نہیں جو میری رہنمائی کرے کیا آپ رخصت پاتے ہیں کہ میں اپنے گھر میں نماز پڑھ لیا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا آپ اذان کی آواز سنتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا ہاں آپ ﷺ نے فرمایا میں آپ کے لئے رخصت نہیں پاتا۔

فتح القدیر میں اس کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ میں ایسی کوئی رخصت نہیں پاتا کہ جماعت کو ترک کر کے آپ کو جماعت کا ثواب مل جائے۔

اکثر حنفی مشائخ فرماتے ہیں کہ جماعت کا ثواب صرف مسجد میں حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی گھر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھے گا تو بھی جماعت کا ثواب نہیں پائے گا۔

بعض علماء نے اس سلسلہ میں سختی کی ہے اور فرمایا ہے کہ گھر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بدعت ہے۔

امام قدوری فرماتے ہیں کہ جو شخص مسجد میں نماز باجماعت سے رہ گیا اور اس کے اہل خانہ اکٹھے ہو گئے اور اس نے انہیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھا دی تو انہیں جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ عنقریب حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر ہو گی جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے گھر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔

ایک مسجد میں دوسری جماعت کب ہو سکتی ہے؟

کیا ایک مسجد میں دوبارہ جماعت ہو سکتی ہے؟ اگر مسجد کسی سرا میں ہو جو راستے پر ہو یا ایسی مسجد ہو جس میں کوئی معین امام نہ ہو تو حنفی علماء کا اتفاق ہے کہ دوسری جماعت ہو سکتی ہے لیکن بعض دوسرے علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ فتویٰ احناف کے قول پر ہے یہی امام شافعی کا قول ہے اور اس کے ممنوع ہونے پر کوئی حدیث نہیں ہے۔

اذان کے بعد بغیر نماز پڑھے مسجد سے نکلنا

جس مسجد میں اذان ہو چکی ہو اس سے نماز پڑھے بغیر نکلنا مکروہ تحریمی ہے۔

لما روی ابو ھریرۃ قال امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کنتم فی المسجد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا۔ جب تم مسجد میں ہو اور اذان ہو

فنودی الصلوۃ فلا یخرج احدکم حتی یصلی.

اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔

جائے تو تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے مسجد سے نہ نکلے۔

عن امیر المؤمنین عثمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ادرک الاذان فی المسجد ثم خرج لم یخرج لحاجۃ وھو لا یرید الرجعۃ فھو منافق.

حضرت امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مسجد میں اذان کو پایا پھر بغیر کسی ضرورت اور واپس آنے کی نیت کے مسجد سے نکلا وہ منافق ہے۔

(رواہ ابن ماجہ)

اگر تو کہے کہ یہ حدیث ضرورت کے تحت مسجد سے نکلنے کو جائز ٹھہراتی ہے اور اس میں کسی مسئلہ کی قید نہیں ہے تو میں کہوں گا کہ جو ضرورت کی بناء پر جائے گا وہ اس سخت وعید کا مستحق نہیں ہوگا۔ اذان کے بعد مسجد سے نکلنا مطلقاً مکروہ ہے جس طرح اس پر پہلی حدیث دلالت کرتی ہے۔ اگر کسی دوسری مسجد میں امام' مؤذن یا منتظم ہے کہ جماعت کا انتظام اسی کی بدولت ہوتا ہے تو اس کے لئے نکلنا جائز ہے کیونکہ یہ جماعت سے اعراض نہیں ہے۔

جس شخص نے اذان سے قبل نماز پڑھ لی ہو

اگر کسی نے اذان سے پہلے نماز پڑھ لی تو اب مسجد سے نکلنا مکروہ نہیں کیونکہ اذان کے بعد مسجد میں رکنا جماعت کی غرض سے ہے اور وہ ایک بار نماز پڑھ چکا ہے۔ اگر اقامت ہو جائے تو پھر نکلنا جائز نہیں ہے اگر چہ پہلے نماز پڑھ چکا ہو۔

عن محجن انہ کان فی مجلس مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذن بالصلوۃ فقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی ورجع محجن فی مجلسہ فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامنعک ان تصلی بالناس الست برجل مسلم فقال بلی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکنی کنت صلیت فی اھلی فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جئت المسجد وکنت قد صلیت واقیمت الصلوۃ فصل مع الناس وان کنت قد صلیت.

حضرت مجن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں تھے کہ اذان ہوئی۔ پس رسول اللہ ﷺ اٹھے اور نماز پڑھی۔ حضرت مجن رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ﷺ کی مجلس میں لوٹ کر آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا وجہ ہے تو نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی کیا تو مسلمان نہیں؟ عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ! ﷺ میں مسلمان ہوں لیکن میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مسجد میں آؤ اور پہلے نماز پڑھ چکے ہو اور اقامت ہو جائے تو لوگوں کے ساتھ نماز پڑھا کرو اگر چہ پہلے پڑھ چکے ہو۔

(رواہ مالک والنسائی)

علماء فرماتے ہیں کہ یہ حکم صرف ظہر اور عشاء کی نماز کے لئے ہے۔ فجر اور عصر کی نمازیں اگر پڑھ چکا ہے اور

اقامت ہوگئی ہے تو مسجد سے نکل سکتا ہے کیونکہ فرضوں کے بعد ان دو وقتوں میں نفل نماز مکروہ ہے۔ رہی مغرب کی نماز اگر تین پڑھے گا تو نفل کی نماز تین نہیں ہوتی اگر چوتھی ملائے گا تو امام کی مخالفت لازم آئے گی اس لئے مغرب کی نماز میں بھی ٹھہرنا ضروری نہیں ہے۔

عن یزید بن الاسود قال شهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم حجة فصليت معه صلوة الصبح في مسجد الخيف فلما قضى صلوته انحرف فاذا هو برجلين في اخرى القوم لم يصليا معه فجيء بهما يرعد فرائضهما فقال مامنعكما ان يصليا معنا فقالا يا رسول الله صلى الله عليه وسلم انا قد كنا صلينا قال فلا تقعدا اذا صليتما في رحالكما ثم اتيتما مسجدا جماعة فصليا معهم فانها لكم نافلة.

(رواہ ابوداؤد والترمذی)

یزید بن اسود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس سال حج کیا میں بھی شریک تھا۔ میں نے مسجد خیف میں آپ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ جب آپ نماز پڑھ کر پیچھے مڑے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کسی اور قوم سے تعلق رکھنے والے دو آدمی (بیٹھے ہیں) یہ دونوں آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں شریک نہیں ہوئے انہیں لایا گیا۔ ان کی پسلی کا گوشت پھڑک رہا تھا۔ حضور ﷺ نے پوچھا آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنے گھروں میں نماز پڑھ چکے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم اپنے گھروں میں نماز پڑھ چکو پھر مسجد میں آؤ اور جماعت کھڑی ہو جائے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ لیا کرو۔ یہ نماز تمہارے لئے نفل ہو جائیں گے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ فجر میں بھی نفلوں کی نیت کر کے امام کی اقتداء ضروری ہے۔

جو لوگ فجر کی اقتداء صحیح نہیں سمجھتے ان کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث اس حدیث سے متعارض ہے جس میں فجر کی نماز کے بعد نفل پڑھنے سے منع کیا گیا ہے اور اصول یہ ہے کہ جب جواز اور حرمت والی حدیثیں آپس میں متعارض ہوں تو حرمت والی کو ترجیح ہوتی ہے۔ یہ گفتگو قابل غور ہے کیونکہ مذکورہ حدیث کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے اور فجر کے بعد نفل کی ممانعت والی حدیث یقینی طور پر اس سے پہلے دور کی ہے اس لئے مذکورہ حدیث لامحالہ نہی والی حدیث کی ناسخ ہوگی۔ ہاں اس کے جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہی والی حدیث خبر مشہور ہے بلکہ متواتر کے قریب ہے اور مذکورہ حدیث خبر واحد ہے اصولی طور پر خبر واحد نہ تو خبر مشہور کی ناسخ ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے حکم کو خاص کر سکتی ہے۔

اکیلے نماز پڑھ رہا تھا کہ نماز کھڑی ہو گئی

ایک شخص نے مسجد میں اکیلے نماز شروع کی۔ ابھی وہ نماز مکمل نہیں کر پایا تھا کہ اقامت ہوگئی۔ اگر فجر کی نماز ہے تو جب تک دوسری رکعت کا سجدہ نہیں کیا نماز توڑ دے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اگر فجر کے علاوہ کوئی اور نماز ہے اور پہلی رکعت کا سجدہ نہیں کیا تو نماز توڑ دے۔ اگر سجدہ کر دیا ہے تو دوسری رکعت بھی مکمل کرے اور اس کے بعد سلام پھیر کر امام کی اقتداء کرے۔ اگر تیسری رکعت میں ہے اور ابھی تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا تو سلام

پھیر دے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھے۔ اگر تیسری رکعت کا سجدہ کر دیا ہے یا فجر کی نماز میں دوسری رکعت کا سجدہ کر دیا ہے تو نماز مکمل کرے اور ظہر اور عشاء میں نفلوں کی نیت کر کے امام کی اقتداء کرے۔

اس گفتگو کی بنیاد یہ حدیث ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا اقیمت الصلوة لاصلوة الا المکتوبة. (رواہ المسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اقامت ہو جائے تو پھر فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔

(اذا اقیمت الصلوة لا صلوة الا المکتوبة) المکتوبۃ میں لام عہد کا ہے یعنی جب اقامت ہو جائے تو سوائے اس فرض نماز کے کوئی نماز نہیں ہو سکتی جس کے لئے اقامت کہی گئی ہے۔ جب کوئی اکیلے فرض نماز پڑھ رہا ہو اور اقامت ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ فرض نماز کو توڑ کر امام کی اقتداء کرے لیکن شرط یہ ہے کہ نماز اس وقت توڑے جب نماز نقض کو قبول کرتی ہو یعنی فجر کی دوسری رکعت نہیں پڑھی تو نماز نقض (توڑنے) کا احتمال رکھتی ہے اور فجر کے علاوہ جب تک تیسری رکعت کا سجدہ نہیں کیا تو نماز کو توڑا جا سکتا ہے لیکن جب فجر کی دوسری اور باقی نمازوں کی تیسری رکعت کا سجدہ ہو گیا تو نماز مکمل ہو گئی کیونکہ اکثر پر کل کا حکم لاگو ہوتا ہے اس لئے ایسی صورت میں نماز نقض کو قبول نہیں کرتی۔

صرف ظہر اور عشاء کی نمازوں میں جماعت کے ساتھ نفلوں کی نیت کر کے شرکت جائز ہے کیونکہ ان دو نمازوں کے علاوہ فرائض کے بعد نفل پڑھنا صحیح نہیں ہے۔

اگر ظہر کی سنتیں پڑھ رہا ہے تو دو رکعتیں مکمل کر کے سلام پھیر دے کیونکہ اس سے پہلے نماز توڑنے میں عمل کو باطل کرنا لازم آتا ہے رہا فرضوں کو توڑنا تو یہ ان کی تکمیل کی غرض سے ہے اس لئے حقیقت میں یہ ابطال ہی نہیں۔

جماعت کے لئے سنتوں کو مؤخر کرنا

اگر ایک شخص مسجد میں آیا اور اقامت ہو گئی تو نماز شروع کر دے اور ظہر کی سنتوں کو چھوڑ دے اور سنتوں کو فرضوں کے بعد ادا کرے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے دو سنتوں کے بعد پڑھے تاکہ وہ دو سنتیں فرضوں سے جدا نہ ہوں۔

فجر کی نماز میں مسجد میں پہنچا تو اقامت ہو گئی۔ اگر یقین ہے کہ سنتیں ادا کر کے فرضوں میں شامل ہو جائے گا تو سنتیں پڑھے پھر جماعت کے ساتھ شریک ہو جائے تاکہ سنتوں کا ثواب بھی پا لے لیکن جماعت کے نزدیک سنتیں نہ پڑھے بلکہ مسجد سے نکل کر پڑھے۔ اگر الگ کوئی جگہ نہیں تو دروازے میں کھڑے ہو کر پڑھ لے۔

اگر یقین نہیں بلکہ اندیشہ ہے کہ جماعت ضائع ہو جائے گی تو سنتیں چھوڑ دے اور فرض نماز میں شریک ہو جائے کیونکہ سنتوں کی نسبت نماز باجماعت کا ثواب زیادہ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سنتوں کی نسبت جماعت زیادہ ضروری ہے۔

اگر فجر کی سنتیں فرضوں سے پہلے نہیں پڑھ سکا تو بالاتفاق سورج کے طلوع ہونے سے پہلے نہ پڑھے کیونکہ فجر

کی نماز کے بعد نماز منع ہے لیکن طلوع آفتاب کے بعد ممنوع نہیں کیونکہ نفلوں کو ادا کرنے کا کوئی خاص وقت نہیں ہے۔امام محمد فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ زوال سے پہلے سنتیں پڑھ لے۔ یہ گفتگو حنفی فقہ کے مطابق تھی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جماعت کے ساتھ مل جانے کا یقین ہو یا نہ ہو دونوں میں امام کی اقتداء کرے اور سنتوں کو چھوڑ دے۔انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے ظاہر کو لیا ہے کہ جب فرض نماز کے لئے اقامت ہو جائے تو کوئی نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔

امامت کا زیادہ حقدار کون ہے؟

امام ابوحنیفہ کے نزدیک امامت کا زیادہ حق دار وہ شخص ہے جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو۔امام محمد کی بھی یہی رائے ہے۔عالم کے بعد زیادہ حق دار زیادہ قاری ہے کیونکہ نماز کے تمام ارکان ٗسنن اور مستحباب کو صحیح طریقہ سے ادا کرنے کے لئے قرأت سے زیادہ سنت کے علم کی ضرورت ہے۔قرأت میں تبحر کی ضرورت صرف ایک رکن کے لئے ہے۔

امام ابو یوسف اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ عالم سے زیادہ قاری امامت کا حق رکھتا ہے۔قاری کے بعد جو سنت کا علم رکھتا ہے زیادہ حقدار ہے ان کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ابی مسعود.ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال يؤم القوم اقرء هم بكتاب الله فان كانوا فى القرائة سواء فاعلمهم بالسنة فان كانوا سواء فاقدمهم هجرة فان كانوا فى الهجرة سواء فاقدمهم سنا ولا يومن الرجل فى اهله ولا فى سلطانه ولا يقعد فى بيته على تكرمة. (رواہ مسلم)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کی امامت وہ کرے جو کتاب اللہ کا نسبتاً بڑا قاری ہے۔اگر قرأت میں سب برابر ہیں تو جوان میں سنت سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔اگر علم میں بھی برابر ہیں تو جس نے ان سب سے پہلے ہجرت کی ہو۔اگر ہجرت کرنے میں برابر ہیں تو جو سب سے پہلے مشرف باسلام ہوا اور کوئی انسان کسی انسان کی امامت کی جگہ جا کر امامت نہ کرے اور نہ اس کے مکان میں اس کی مسند پر بیٹھے مگر ان کی اجازت کے ساتھ۔

اسی طرح ایک اور حدیث ہے کہ:

عن ابی سعید قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كان ثلثة فليو مهم احدهم واحقهم بالامامة اقرء هم. (رواہ مسلم)

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تین آدمی ہوں تو ان میں سے ایک امامت کرائے اور امامت کا زیادہ حقدار وہ ہے جو ان سب سے بڑا قاری ہے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليؤذن خيار كم وليؤمكم اقرء كم. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے بہترین لوگ اذان پڑھیں اور اچھے قاری امامت کا فریضہ سرانجام دیں۔

ہدایہ میں ہے کہ اس دور میں ایک اچھا قاری اچھا عالم بھی ہوتا تھا کیونکہ قرأت کے ساتھ ساتھ علم شریعت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ہدایہ میں یہ بھی ہے کہ یہ تعبیر لفظ کے عموم سے ہے کسی خاص سبب سے نہیں۔ اسی طرح ان احکام کے سیکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سیکھنے والا سنت کا نسبتاً بڑا عالم بھی ہو پھر حدیث کا سیاق بھی اس کی نفی کرتا ہے۔ شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں بہترین استدلال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت سے ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے امام مقرر فرمایا حالانکہ آپ سے بڑے قاری موجود تھے لیکن یہ بات طے ہے کہ ان سے بڑا سنت کا عالم کوئی نہیں تھا۔

اسی بات کی دلیل کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑے قاری موجود تھے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ تم سب میں سے بڑے قاری ابی ہیں اور اس بات کی دلیل کہ حضرت افضل الصدیق ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام میں سب سے بڑے عالم تھے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد ہے: ابوبکر ہم سب میں زیادہ جاننے والے تھے۔ یہ ارشاد رسول اللہ ﷺ کے آخری ارشادات میں سے ہے اس لئے اسی پر بھروسہ کیا جائے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت اہل سنت کا اہم عقیدہ ہے اور حضرت ابی کا بڑا قاری ہونا اور قرأت میں حضرت ابوبکر سے افضل ہونا یہ ایسا معاملہ ہے جسے شافعی تسلیم نہیں کرتے اور جس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا وہ صرف اتنا بتاتی ہے کہ حضرت ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مخاطبین میں سب سے زیادہ قرأت کو جاننے والے تھے۔ کیا حضرت ابوبکر بھی ان مخاطبین میں شامل ہیں یہ واضح نہیں۔ اگر حضرت ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بڑا قاری مان لیا جائے تو بھی قاری کی نسبت عالم کی امامت کے مستحب ہونے پر یہ واقعہ دلالت نہیں کرتا کیونکہ بعض اوقات کسی خاص ضرورت کے تحت مستحب چیز کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ اس واقعہ میں حضرت ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح بڑے بڑے قاری تھے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت سے کوئی انکار نہ کرتا اسی لئے ایک اعلیٰ مقصد کے لئے استحباب کو چھوڑا گیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امام مقرر کیا گیا اسی لئے بعد میں صحابہ میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی بیعت کو عار نہیں سمجھا جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم انی اخاف ان یتمنی متمن ویقول انا اولی ویابی اللہ والمسلمون الا ابابکر. (رواہ مسلم)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہے گا کہ میں زیادہ حقدار ہوں۔ اللہ تعالیٰ اور مسلمان سوائے ابوبکر کی خلافت کے انکار کریں گے۔

اسی غرض سے حضور ﷺ نے انہیں امام مقرر فرمایا۔ اسی وجہ سے ان کو بڑے قاریوں پر ترجیح دی گئی۔ لہٰذا اس واقعہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ زیادہ علم والا ایک بڑے قاری کی نسبت امامت کا زیادہ مستحق ہے۔ واللہ اعلم بحقیقتہ۔

اگر علم اور قرأت میں سب برابر ہوں تو پھر ان میں سے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے وہ امامت کا مستحق ہے۔ متقی سے مراد یہ ہے کہ مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرتا ہو۔ عزیمت کو اپناتا ہوں اور اکثر مستحباب پر بھی عمل کرتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی عبادت و ریاضت دنیاوی غرض سے نہ ہو بلکہ محض رضائے خداوندی کے

لئے ہو۔ ظاہر ہے ایسے متقی آدمی کو امام بنانے کی وجہ حصول برکت ہے۔ ایسے آدمی کے پیچھے جو نماز پڑھی جائے گی اس کے قبول ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔

حدیث پاک میں ہجرت میں اولیت کو امامت کے زیادہ حق دار ہونے کا سبب بتایا گیا ہے تو یہ ہجرت رسول اللہ ﷺ کے دور کے ساتھ خاص تھی۔ اب چونکہ ہجرت نہیں رہی اس لئے یہ چیز سبب نہیں۔ اس کی جگہ اب مشتبہات اور محارم سے ہجرت کو سبب سمجھا جائے گا جیسے کہ حدیث میں ہے۔

المهاجر من هجر مانهي الله عنه. مہاجر وہ ہے جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔

ان تمام کے بعد پھر سب سے زیادہ مستحق امامت عمر میں بڑا شخص ہے جیسا کہ ایک حدیث سے ثابت ہے۔

اندھے کی امامت

اندھے کی امامت مکروہ ہے کیونکہ اس کی پاکیزگی مشکوک ہے۔ وہ نہیں دیکھ سکتا کہ کپڑے یا بدن پر نجاست کہاں لگی ہے اور دھونے سے اس کا ازالہ ہوا ہے یا نہیں لیکن ایسا نابینا شخص جو مقتدائے قوم ہے اللہ تعالیٰ نے اسے بصیرت سے نوازا ہے اور وہ علم و فضل کا مجمع ہے اس کی اقتداء مکروہ نہیں ہے کیونکہ عوام الناس سے کہیں زیادہ وہ طہارت اور نماز کے امور میں احتیاط برتتا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کنز کی بعض شروع سے بحوالہ مبسوط نقل کیا ہے کہ نابینا شخص کی امامت مکروہ نہیں ہے بشرطیکہ مقتدی متقی اور پرہیزگار ہوں۔ حضور ﷺ نے جناب عبداللہ ابن ام مکتوم کو مقرر فرمایا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ (عبداللہ بن ام مکتوم نابینا تھے)۔

جن کی امامت مکروہ ہے

غلام اور حرامی کی امامت مکروہ ہے کیونکہ انہیں عوام میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلثة لايقبل صلوتهم من تقدم قوما وهم له كارهون ورجل اتى الصلوة وبار اوالدبار بان ياتيها بعان تفوته ومن اعتبد محررة. (رواہ ابوداؤد عن عبداللہ بن عمر ابن العاص)

حضور ﷺ نے فرمایا: تین آدمیوں کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ ایک وہ جو قوم سے آگے بڑھے حالانکہ لوگ اسے ناپسند کرتے ہوں۔ دوسرے وہ جو اس وقت آئے جب نماز ہو چکی ہو اور تیسرا وہ جو آزاد کو غلام بنائے۔

فاسق کی امامت

فاسق کی امامت مکروہ ہے جبکہ یقین ہو کہ وہ نماز کی تمام شرائط کو احتیاط سے پورا کرے گا۔ (ورنہ فساد کا اندیشہ ہے) اور یہ صرف اس صورت میں ہے جب ایک متقی شخص موجود ہو اور اس کے باوجود فاسق کو مصلیٰ امامت

سونپ دیا جائے۔ اگر پیچھے کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو اس سے زیادہ متقی ہو تو پھر فاسق کے پیچھے نماز مکروہ نہیں ہوگی۔
اگر کسی نے فاسق یا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھی تو نماز ہو جائے گی اور اسے جماعت کا ثواب بھی مل جائے گا لیکن وہ ثواب نہیں ملے گا جو متقی امام کے پیچھے پڑھنے سے ملتا ہے۔ فتح القدیر میں محیط کے حوالہ سے ایسے ہی نقل کیا گیا ہے۔

قد روی عبد الله بن عدی انه دخل علی عثمان وهو محصور فقال انک امام العامة ونزل بک ماتری ویصلی لنا امام فتنة ونتخرج من الصلوة معه فقال الصلوة حسن مایعمله الناس فاذا احسن الناس فاحسن معهم واذا اساؤا فاجتنب اساء تهم. (رواہ البخاری)

عبداللہ بن عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں آپ کے گھر کا محاصرہ ہو چکا تھا میں نے عرض کیا کہ آپ لوگوں کے امام ہیں آپ پر یہ مصیبت نازل ہو چکی ہے اور ہمیں فتنہ باز امام نماز پڑھاتا ہے ہم اس کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے اور نکل جاتے ہیں۔ (حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے) فرمایا: جو کچھ لوگ کرتے ہیں اس سے نماز پڑھنا بہتر ہے۔ جب وہ لوگ ایک اچھا کام کریں تو تو بھی ان کے ساتھ اچھا کام کر اور جب وہ برا کام کریں تو ان کی برائی سے اجتناب کر۔

عموماً ایک حدیث علماء کی زبان سے اکثر سنی جاتی ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

صلوا خلف کل بروفاجر وصلوا علی کل برو فاجر وجاهدوا مع کل بروفاجر.

ہر اچھے اور برے شخص کے پیچھے نماز پڑھو۔ ہر نیک و بد آدمی کی نماز جنازہ پڑھو' ہر نیک و بد کے ساتھ مل کر جہاد کرو۔

علماء نے اس کو قبول کیا ہے اور اس پر وہ اجماع ہے جسے شریعت میں اجماع شمار کیا جاتا ہے۔
فتح القدیر میں ہے کہ اسے دار قطنی نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت مکحول کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ یہ حدیث مرسل ہے' اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ حدیث ہمارے لئے دلیل ہے۔
اس حدیث کی شہرت' ائمہ کی قبولیت اور اجماع اس کی قطعی صحت کی دلیل ہے۔

بدعتی کی امامت

بدعتی کی امامت مکروہ ہے۔ یاد رہے کہ وہ شخص بدعتی ہے جو قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اور ائمہ اربعہ نے اسے کافر نہ کہا ہو۔ امام ابوحنیفہ سے یہ روایت کہ جس نے کہا قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے تو یہاں کفر سے مراد کفرانِ نعمت ہے۔ کفر وہ نہیں جو ایمان کے مقابلے میں ہے۔ بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے سے جماعت کا ثواب مل جاتا ہے لیکن سنی شخص ہوتے ہوئے بدعتی کو امام بنانا مکروہ ہے۔ یہ گفتگو ایسے بدعتی کے بارے میں ہے جو سنیوں کے

بارے متشدد نہ ہو۔ اگر بدعتی ایسا متشدد شخص ہو جو سنی شخص کو مقتدی دیکھے تو بغیر نیت کے نماز پڑھا دے۔ نماز میں سنیوں کے مقتداء پر لعن طعن کرے یا گندگی سے طہارت کیئے بغیر نماز پڑھا دے یا یہ اندیشہ ہو کہ اس کا وضو اور غسل معتبر نہیں تو ایسے بدعتی کی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

شیعہ امام کی اقتداء

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا یہ فرمانا کہ شیعہ امام کے پیچھے نماز جائز نہیں ان کی مراد ایسا شیعہ ہے جو صحابہ کرام کو سب وشتم کرنا اپنا دین خیال کرتا ہو۔ نماز کی دعاؤں میں صحابہ کرام الاخیار پر لعنت بھیجتا ہو اور امامت کو جائز نہ سمجھتا ہو۔ ایسے شیعہ کے پیچھے نماز یقیناً فاسد ہوگی۔ رہا شیعوں کا وہ فرقہ جو حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شیخین پر فضیلت دیتا ہے اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کو سب وشتم نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرتا ہے جیسے زیدیہ تو اس کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن سخت مکروہ ہے۔

تواتر سے ثابت شدہ امور کے منکر کی اقتداء

اہل کبائر کے لئے شفاعت سے ارتکاب کرنے والے۔ رؤیت باری تعالیٰ کے منکر' عذابِ قبر کے منکر' کراماً کاتبین کے انکار کرنے والوں کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں کیونکہ یہ امور تواتر سے ثابت ہیں اور ان کا منکر کافر ہے۔

مسح علی الخفین کے منکر کی اقتداء

مسح علی الخفین کے منکر کے پیچھے نماز جائز نہیں اسی طرح جو اللہ تعالیٰ کی تجسیم کے قائل ہیں ان کے پیچھے بھی نماز جائز نہیں اس قسم کے نظریات ائمہ مجتہدین کے دور میں نہیں تھے۔ یہ سب خیال ونظریات بعد کی پیداوار ہیں۔ اس لئے ان کی طرف التفات جائز نہیں چہ جائیکہ ان پر فتویٰ دیا جائے۔

مناظر کی اقتداء

علم کلام میں جسے تبحر حاصل ہے اگر چہ وہ سنی ہی کیوں نہ ہو اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ اس مسئلہ میں سلف صالحین نے بڑی سختی کی ہے جیسا کہ امام ابو یوسف سے روایت ہے کہ متکلم کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں اگر چہ وہ صحیح بات کہتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ متکلم کی اقتداء سخت مکروہ ہے لیکن متکلم کی اقتداء میں نماز کے عدم جواز پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

فتح القدیر میں مجتبیٰ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ یہ امام ابو یوسف کا قول ہے امام ابو یوسف کی دلیل شاید یہ واقعہ ہو کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹے حماد کو علم کلام میں مناظرہ کرتے دیکھا تو فرمایا: مناظرہ نہ کیا کرو۔ حماد نے عرض کیا میں آپ کو مناظرہ کرتے دیکھتا ہوں اور پھر بھی آپ مجھے اس سے منع فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہم جب مناظرہ کرتے تھے تو اس خوف کے مارے کہ ہمارا مدمقابل کہیں لغزش کا شکار نہ ہو جائے ہماری حالت یہ ہوتی تھی جیسے ہمارے سروں پر پرندے ہیں جبکہ آپ لوگ مناظرہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مدمقابل لغزش کا

شکار ہو۔ جس نے مد مقابل کی لغزش کا ارادہ کیا تو اس نے کفر کا ارادہ کیا اور اس طرح مد مقابل سے پہلے کافر ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے مناظر کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہو۔ ایسے متکلم کی اقتداء جائز نہیں ہے جو علم کلام میں بحث کرتا ہو اگر چہ مسلمان مناظر باطل فرقوں سے اس لئے مناظرہ کرتا ہے کہ ان پر ان کے عقائد باطلہ واضح ہو جائیں کیونکہ عام طور پر یہ چیز نفسانیت اور خشونت کا سبب بنتی ہے۔ بعض اوقات لوگ کذب و افتراء اور حسد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مناظر صرف غلبہ چاہتے ہیں خواہ ان کا قول صحیح ہو یا غلط یہ بھی ممکن ہے کہ لاعلمی سے وہ بدعت یا کفر کا ارتکاب کر بیٹھے اور اسے علم تک نہ ہو۔ اگر چہ ایسی صورت میں وہ کافر نہیں ہو گا کیونکہ لزوم کفر' کفر نہیں التزام کفر' کفر ہے لیکن پھر بھی دینی امور میں تہاون کا سبب تو ہے ہی اسی لئے مناظر کے پیچھے نماز جائز نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ اگر لزوم کفر' کفر شمار ہوتا تو مناظر کے پیچھے نماز نہ ہوتی لیکن جب کفر نہ ہوئی تو نماز صرف مکروہ ہوئی۔

نابالغ کی امامت

فرائض میں بچے کی امامت بالاتفاق جائز نہیں کیونکہ بچے کی نماز مستحب ہے اور بالغ کی نماز فرض ہے۔ لہٰذا فرض کی بنیاد نفل پر نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح نفل میں بھی اقتداء جائز نہیں ہے لیکن بلخ کے علماء فقہ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ بالغ جب نفل نماز شروع کرتا ہے تو اس کے ذمہ یہ نماز واجب ہو جاتی ہے لیکن بچہ وجوب کا محل نہیں اس لئے شروع کرنے کے باوجود بھی نفل کی تکمیل اس پر واجب نہیں ہوتی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بچے کی امامت جائز ہے کیونکہ فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کا مقتدی بن سکتا ہے۔ شافعیوں کی دلیل یہ ہے۔

روی عمرو بن سلمة قال یمر علینا الرکبان فنتعلم منهم القران فاتی الی النبی صلی الله علیه وسلم فقال لیؤمکم اکثرکم قرآنا فنظر واکنت اکثرهم قرآنا وکنت اؤمهم وانا ابن ثمان سنین. (رواہ نسائی)

عمرو بن سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس سے گھوڑ سوار گزرا کرتے تو ہم ان سے قرآن کریم سیکھتے۔ (ایک دن) نبی کریم تشریف لائے اور فرمایا: جو تم سے زیادہ قرآن جانتا ہے وہ امامت کرائے لوگوں نے دیکھا میں سب سے زیادہ قرآن کو جاننے والا تھا اور میں انہیں نماز پڑھایا کرتا تھا۔ میں (ان دنوں) آٹھ سال کا تھا۔

اسے امام بخاری نے ایک طویل واقعہ کی صورت میں نقل فرمایا ہے اس حدیث پاک میں شوافع کی کوئی دلیل موجود نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے صرف اتنا فرمایا کہ جو تم سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہے وہ امامت کرائے لیکن آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ بچہ امامت کرائے بلکہ مخاطبین جو بالغ تھے ان میں زیادہ قرآن جاننے والے کو امامت کا حکم دیا۔ وجہ یہ تھی کہ نماز کا حکم بالغوں کے لئے ہے۔ بچے مکلّف نہیں تھے ایسے لوگوں کے حکم سے بچے کا امام بننا جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ علوم شریعہ سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔

عورت کی امامت

عورتیں مردوں کی امام نہیں بن سکتیں کیونکہ یہ چیز پردے کے منافی ہے۔ عورت کا عورتوں کو باجماعت نماز پڑھانا بھی مکروہ ہے کیونکہ لامحالہ دوصورتیں سامنے آئیں گی یا تو امامت کرانے والی عورت صف کے درمیان میں کھڑی ہوگی یا الگ صف کے سامنے کھڑی ہوگی۔ الگ کھڑے ہونے میں بھی بے پردگی ہے اس لئے دونوں صورتوں میں عورتوں کا جماعت کرانا مکروہ ہے۔

اگر عورتیں جماعت کرائیں تو ضروری ہے کہ امام عورت صف کے درمیان میں کھڑی ہو کیونکہ امام محمد ایک روایت بیان کرتے ہیں۔

عن ابراهيم النخعي ان عائشة كانت تؤم النساء في شهر رمضان فتقوم وسطا.

ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ماہ رمضان میں عورتوں کو نماز پڑھایا کرتی تھیں اور درمیان میں کھڑی ہوتی تھیں۔

عن ابن عباس قال تؤم المرأة النساء وتقوم وسطهن. (رواہ عبدالرزاق)

ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت' عورتوں کو نماز پڑھایا کرتی تھی اور وہ ان کے درمیان کھڑی ہوتی تھی۔

فتح القدیر میں یہ دونوں اثر مذکور ہیں۔ اس بناء پر یہ کہنا مشکل ہے کہ عورتیں امام نہیں بن سکتیں اور ان کا ایک جگہ جمع ہونا اور ایک عورت کا امام بننا مکروہ عمل ہے اس کے لئے دلیل چاہیے۔ شیخ ابن الہمام کا میلان عدم کراہت کی طرف ہے جبکہ ہمارے علماء فرماتے ہیں عورتوں کا جماعت کرانا مکروہ تحریمی ہے۔ والله اعلم باحكامه.

عورتوں کا مسجد میں نماز باجماعت کے لئے گھروں سے نکلنا

عورتوں کا جماعت میں شریک ہونا ضروری نہیں ہے وہ گھر میں نماز پڑھیں' ان کا باہر نکلنا بہت بڑا فتنہ ہے۔ متاخرین نے اسی قول پر فتویٰ دیا ہے کیونکہ اس دور میں نیتوں میں فساد آ گیا ہے۔

ہمارے ائمہ ثلاثہ (ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور محمد رحمۃ اللہ علیہ) جوان عورتوں کو نماز میں شریک ہونے سے روکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے مغرب' عشاء اور فجر کی نمازوں میں اجازت دی ہے کہ بوڑھی عورتیں شریک جماعت ہوں کیونکہ ان اوقات میں فتنے کا اندیشہ نہیں (اندھیرے کی وجہ سے لوگ انہیں نہیں دیکھیں گے) صاحبین کے نزدیک وہ تمام نمازوں میں شریک ہوسکتی ہیں کیونکہ بوڑھی عورتیں فتنے کا محل نہیں۔ یہ تجویز ان کے دور کے مطابق ہے لیکن آج اختلاط مرد وزن کی وجہ سے یہ فتنہ عام ہے اس لئے عورتوں کا خواہ کسی عمر کی ہوں نماز میں شریک ہونا مکروہ ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ:

قد قالت عائشة في الصحيح لو ان رسول الله صلى الله عليه وسلم راى ما

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک صحیح حدیث میں فرمایا: اگر رسول اللہ ﷺ جانتے کہ عورتیں آپ ﷺ

احدثت النساء بعده لمنعهن کما منعت نساء بني اسرائيل.

کے وصال کے بعد کیا کریں گی تو آپ ضرور انہیں جماعت میں شرکت سے روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا۔

قد روی ابن عمر قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تمنعوا نساء کم مساجد وبیوتهن خیر لهن.

اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ روکو (لیکن) ان کے گھر ان کے لئے بہتر ہیں۔

روی ابن مسعود قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم صلوة المرأة في بیتها افضل من صلوتها في حجرتها. صلوتها في مخدعها افضل من صلوتها في بیتها.

(رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت کا کمرے میں نماز پڑھنا گھر میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور اندر کی چور کوٹھڑی میں نماز پڑھنا کمرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

دیکھئے حضور ﷺ کے مبارک دور میں کوئی فتنہ نہیں تھا۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان' اللہ تعالیٰ کے ولی تھے۔ اس دور ہمایوں میں کسی فتنہ کے اندیشہ سے آپ نے عورتوں کو باجماعت نماز ادا کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ وہ مبارک دور تھا لیکن دیکھیں کیسے اللہ تعالیٰ کے رسول نے ان سے نماز ساقط کر دی اور گھر میں پڑھی جانے والی نماز کو ان کے حق میں مسجد میں پڑھی جانے والی نماز سے افضل قرار دیا۔ اس پرفتن دور میں عورتوں سے جماعت کا ساقط ہونا اظہر من الشمس ہے۔ اس دور میں انہیں ضرور مسجدوں میں آنے سے روکا جائے کیونکہ نص سے ثابت ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ان پر لازم نہیں ہے اور فتنہ سے بچنا ضروری ہے کیونکہ اس بارے بہت ساری احادیث وارد ہوئی ہیں۔ نیز اس پر اجماع بھی ہے بہر حال رخصت اپنی جگہ پر ہے کیونکہ جماعت کے لئے نکلنے کی نہی وارد نہیں ہوئی ہاں فضیلت گھر میں نماز ادا کرنے کی حدیث سے ثابت ہے۔ اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ عورت کا گھر سے نماز کے لئے نکلنا بھی فتنہ کا باعث ہو تو پھر یہ رخصت بھی ساقط ہو جائے گی جیسا کہ مؤلفۃ القلوب کا حکم ساقط ہو گیا ہے۔ ام المؤمنین کا قول جو ابھی ابھی گزرا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگر اپنے دور میں عورتوں کی یہ حالت دیکھتے جو آج ہے تو انہیں مسجدوں میں آنے کی قطعاً اجازت نہ دیتے۔ اس حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر فتنہ کی وجہ سے اس دور میں رخصت پر عمل ختم ہو سکتا ہے تو موجودہ دور میں جبکہ فتنہ عروج پر ہے رخصت کیوں ساقط نہیں ہو گی؟

اس حدیث پر میں نے اس لئے قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے نص کو تعلیل کے ذریعے باطل کر دیا۔ وہ کہتے ہیں حکم دینے والا اللہ تعالیٰ ہے عورتوں کی جو حالت ہونا تھی اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف تھا' ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قول کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بات یوں نہیں جس طرح ان کا خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حاکم ہونا مسلم ہے' وہ خوب جانتا تھا کہ عورتوں کی کیا حالت ہو گی؟ اس بات سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم زبانِ رسالت سے صادر ہوا اور وہ حکم یہ ہے کہ عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو یقین تھا کہ فتنہ کا احتمال نہیں۔ جب فتنہ کا احتمال نہ پایا گیا تو نہی بھی نہ پائی گئی اس طرح اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہی عمل ہوا۔

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مقصود یہ ہے کہ اگر عورتوں کی موجودہ حالت عہد رسالت میں دیکھنے میں آتی تو رسول اللہ ﷺ گھر سے نکلنے کا حکم نہ دیتے کیونکہ وہ چیز اٹھ جاتی جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم زبان رسالت سے صادر کیا تھا اور رسول اللہ ﷺ بامر اللہ انہیں گھروں سے باہر آنے سے روک دیتے۔ حالات کے وقوع پذیر ہونے کو رسول اللہ ﷺ کی روایت سے تعبیر کیا جیسے اللہ تعالیٰ نے جہاد کے عدم وقوع پذیر ہونے کو عدم علم سے تعبیر کیا اور فرمایا: **ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم**۔ روکنے کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف اس بناء پر ہے کہ اپ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں۔ عورتوں کو اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کی زبان سے روکنے والے ہیں جیسے آپ ﷺ نے فرمایا: میں انہیں ہر وضو میں مسواک کا حکم دیتا ہوں۔ اس مقام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جن نمازوں میں قرأت بالجہر ضروری ہے

فجر کی نماز میں' مغرب' عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں' جمعہ' عیدین' رات کے نوافل اور رمضان شریف کے دوران وتروں میں قرأت بالجہر ضروری ہے اور یہ عمل حضور ﷺ کے دور سے آج تک مسلسل اپنایا جا رہا ہے۔

بلند آواز سے قرأت کرنا واجب ہے لیکن صرف امام کیلئے اکیلے آدمی پر بلند آواز سے پڑھنا واجب نہیں ہے کیونکہ امام مقتدی کو سناتا ہے مگر اکیلے آدمی کے ساتھ کوئی سننے والا نہیں ہوتا اس لئے اس کا بلند آواز سے پڑھنا ضروری نہیں ہے وہ چاہے تو بلند آواز سے پڑھے تاکہ خود اچھی طرح اپنی قرأت کو سنے کہ اس کے حواس قرأت کی طرف متوجہ رہیں' وساوس سے محفوظ رہے اور اس کی نماز جماعت کی صورت اختیار کر لے اور چاہے تو آہستہ پڑھے کہ صرف خود سنے۔

بلند آواز سے پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے سنیں اور آہستہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود سن سکے۔ یہی صحیح ہے کیونکہ حروف کی صحیح ادائیگی ہی معتبر ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان خود سن سکے۔

ظہر' عصر کے فرضوں اور دن کی نفلی نماز میں امام آہستہ قرأت کرے کیونکہ یہ چیز دور نبوت سے آج تک معمول بہ چلی آ رہی ہے۔ اکیلے نماز پڑھنے والے کو یہ اختیار نہیں کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں بلند آواز سے قرأت کرے جیسا کہ اصول الفقہ کی کتابوں سے ثابت ہے۔

امام قرأت مختصر کرے

امام کے لئے قرأت کو اتنا لمبا کرنا جائز نہیں کہ مقتدی اکتا جائیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ

علیہ وسلم قال اذا صلی احدکم فلیخفف فان فیھم الضعیف والسقیم والکبیر واذا صلی احدکم لنفسہ فلیطول ماشاء. (رواہ البخاری)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھائے تو تخفیف سے کام لے کیونکہ مقتدیوں میں کمزور، بیمار اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جب تم میں سے کوئی اکیلا نماز پڑھے تو نماز کو جس قدر چاہے طول دے۔

اس ضمن میں اور بھی بہت ساری احادیث پیش کی جا سکتی ہیں اگر کوئی شخص معنوی تواتر کا دعویٰ کرے تو بھی بے جا نہیں ہوگا۔

امام کو چاہیئے کہ جس قرأت کا تعین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خط میں کیا ہے اس سے نہ بڑھے۔ فتح القدیر میں ہے کہ عبد الرزاق حسن وغیرہ سے روایت کرتے ہیں کہ مغرب میں قصار المفصل عشاء میں وسط المفصل اور صبح میں طوال المفصل پڑھیں۔

احناف کے نزدیک فجر کا وہی حکم ہے جو ظہر کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں امام طوال مفصل پڑھے۔ فتح القدیر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ظہر میں طوال المفصل پڑھے۔ میں نے ایسی کوئی حدیث نہیں دیکھی بلکہ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مبارک دلیل ہے۔

روی عن عمر رضی اللہ عنہ انہ کتب الی ابی موسی الاشعری ان اقرء فی الظھر باوساط المفصل.

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ابو موسیٰ الاشعری کو لکھا کہ ظہر میں اوساط المفصل پڑھو۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز ظہر عصر کی نماز کی طرح ہے اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

عن جابر بن سمرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقرء فی الظھر والعصر بِالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ونحوھما من السور. (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر اور عصر کی نمازوں میں وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ اور اس قسم کی سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

راوی کا یہ کہنا اور اس طرح کی دوسری سورتیں۔ فائدہ دیتا ہے کہ آپ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی اگرچہ ظہر کی نماز میں آپ ﷺ نے کبھی سورت لقمان اور سورت ذاریات کی تلاوت بھی کی جیسے امام نسائی بیان کرتے ہیں کہ:

عن البراء کنا نصلی خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیسمع منہ الآیۃ بعد الآیات من لقمان والذاریات.

حضرت براء سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور سورت لقمان اور ذاریات کے بعد کچھ آیات سنتے تھے۔

طوال مفصل سے مراد سورت حجرات ہے اور ایک قول کے مطابق سورت محمد سے سورت بروج تک کی تمام

سورتیں ہیں' اوساط مفصل سے مراد سورت حجرات سے لے کر لم یکن الذین کفروا تک کی سورتیں ہیں۔

قصار المفصل سے مراد سورت العلق سے لے کر آخر قرآن تک کی سورتیں ہیں۔

امام فجر کی پہلی رکعت کو لمبا کرے

شیخین کے نزدیک فجر کی نماز کے علاوہ دوسری نمازوں کی پہلی رکعت اور دوسری رکعت میں ایک جیسی سورتیں پڑھنا چاہیں کیونکہ جب سورتیں ایک طرح کی ہوں گی تو ان کا ثواب بھی ایک جیسا ہوگا۔ فجر کی نماز کو اس قاعدہ سے اس لئے مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ یہ نیند اور غفلت کا وقت ہے۔ فجر کی نماز میں پہلی رکعت کو لمبا کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جماعت میں شریک ہوسکیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر نماز میں پہلی رکعت کا طویل کرنا پسندیدہ ہے۔

روی ابو قتادۃ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرء فی الظھر فی الاولیین بام الکتاب وسورتین وفی الرکعتین الاخریین بام الکتاب ویسمعنا احیانا ویطول فی قراءۃ الاولی ان یطیل فی الرکعۃ الثانیۃ وھکذا فی العصر وھکذا فی الصبح. (رواہ الشیخان)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور دو سورتیں تلاوت کرتے تھے اور دوسری دو رکعتوں میں صرف سورت فاتحہ پڑھتے تھے۔ ہم آپ ﷺ کی تلاوت کو کبھی کبھی سنتے تھے۔ آپ ﷺ پہلی رکعت میں تلاوت کو جتنا طول دیتے تھے اتنا دوسری رکعت میں طول نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح صبح اور عصر کی نماز میں کرتے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ پہلی رکعت ثناء اور تعوذ کی وجہ سے لمبی ہو جاتی ہے جیسے صاحب ہدایہ کا خیال ہے کیونکہ مذکورہ حدیث کے ظاہری الفاظ اس کی نفی کرتے ہیں۔

قرأت خلف الامام کا حکم

مقتدی قرأت نہیں کرے گا بلکہ امام کی قرأتِ ہی اس کے لئے کافی ہے۔ ہمارے علاوہ امام احمد اور امام مالک علیہا الرحمتہ کا بھی یہی خیال ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا گمان یہ ہے کہ فاتحہ شریف کا پڑھنا رکن ہے اس لئے اسے صرف امام کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان کی رائے صحیح نہیں کیونکہ جو شخص امام کے ساتھ رکوع میں آ کر ملا ہے وہ قرأت نہیں کرتا لیکن پھر بھی اس کی یہ رکعت ہو جاتی ہے اگر قرأت فاتحہ امام کے ساتھ نہ ہوتو پھر مذکورہ آدمی کی رکعت ادا نہ ہو۔

ہماری دلیل یہ حدیث ہے۔

روی جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقراءۃ الامام قراءۃ لہ.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ارشادِ رسالت ہے: جو امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہوتو امام کی قرأت اس کی قرأت ہے۔

یہ حدیث صحیح ہے اور اسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ مجھے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خبر دی اور انہوں نے اس سند کا بھی تذکرہ کیا جس کے حوالہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے۔ ابن عدی بھی اسے امام ابوحنیفہ کے حوالے سے اپنی ایک سند سے روایت کرتے ہیں۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ فتح القدیر میں اس پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے انہوں نے اس حدیث مبارک کی کئی سندیں بیان کی ہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ تک دو متصل سندوں کی صحت کو بھی بیان فرمایا ہے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی سند صحیح ترین ہے۔ اکابر صحابہ سے بھی ہمارے مذہب کے مطابق عمل مروی ہے۔

عن عبد الله بن مقيم انه سال عبد الله بن عمر وزيد بن ثابت وجابرا فقالوا لايقرء خلف الامام في شئي من الصلوة. (رواہ طحاوی)

عبداللہ بن مقیم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عبد اللہ بن عمر' زید بن ثابت اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: نماز میں امام کے پیچھے کچھ نہیں پڑھا جاتا۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں۔

عن منصور بن ابی وائل قال سئل عبد الله بن مسعود عن القراء ة خلف الامام قال انصت فان في الصلوة شغلا ويكفيك الامام.

منصور بن ابی وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود سے انہوں نے قرأت خلف الامام کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: خاموش رہا کرو۔ بیشک نماز میں خلل پیدا ہوتا ہے تیرے لئے امام کافی ہے۔

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ:

ان سعد بن ابی وقاص قال وددت الذی يقرء خلف الامام فی فيه جمرة.

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک اور روایت جسے جناب عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل فرمایا ہے کہ:

ان امير المؤمنين عمر قال ليت فی فم الذی يقرء خلف الامام حجرا.

امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کاش جو قرأت خلف الامام کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر پڑتے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ:

عن ابی حمزة قال قلت لابن عباس اقرء والامام بين يدی قال لا.

ابی حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے پوچھا کہ میں امام کے پیچھے قرأت کیا کروں آپ نے فرمایا نہیں۔

ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ:

عن جابر قال لایقرء خلف الامام ان جھر ولا ان خافت.

حضرت سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ امام کے پیچھے قرأت مت کر امام بلند آواز سے پڑھے یا آہستہ پڑھے۔

ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ:

من قول امیر المؤمنین علی قال من قرء خلف الامام فقدا خطأ الفطرۃ.

امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاداتِ گرامی میں سے ہے کہ آپ نے فرمایا: جس نے امام کے پیچھے قرأت کی اس نے فطرت کو چھوڑا۔

یہ تمام آثار فتح القدیر میں مذکور ہیں۔

کیا استحباباً قرأت خلف الامام جائز ہے؟

اب رہا یہ مسئلہ کہ کیا مقتدی استحباباً قرأت کرسکتا ہے یا نہیں تو اس بارے علماء کا اختلاف ہے۔

ہمارے تینوں امام (ابوحنیفہ، امام محمد، امام یوسف علیہم الرحمتہ) کا مذہب یہ ہے کہ مقتدی کا قرأت کرنا حرام ہے۔ اگر امام کے پیچھے کوئی شخص قرأت کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔

ہدایہ میں ہے کہ احتیاطاً قرأت کی جائے۔ فتح القدیر میں ہے کہ ہدایہ کی عبارت کا مقتضاء یہ ہے کہ وہ ظاہر الروایہ نہیں ہے۔ حقیقت میں امام محمد کے قول اور شیخین کے قول میں کوئی فرق نہیں۔ کتاب الآثار میں علقمہ بن قیس کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے جہری اور سری کسی نماز میں کبھی قرأت نہیں کی۔ اسی بناء پر ہم جہری اور سری کسی نماز میں قرأت کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے کئی آثار نقل فرمائے اور پھر فرمایا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ امام کے پیچھے بالکل ہی قرأت نہ کی جائے۔ امام محمد رحمۃ اللہ کی کتاب مؤطا میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں جہری اور سری نمازوں میں امام کے پیچھے کچھ نہیں پڑھا جاتا۔ اس کے متعلق کئی احادیث روایت کی گئی ہیں اور یہی قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سری نمازوں میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مستحب ہے۔ جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ اس وقت پڑھے جب امام فاتحہ اور سورت کے درمیان تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتا ہے لیکن جب امام بلند آواز سے قرأت کررہا ہو تو کچھ نہ پڑھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سری نمازوں میں مقتدی قرأت کرے۔ ہمارے بعض حنفی مشائخ کی بھی یہی رائے ہے۔

قد روی عن عبادۃ بن الصامت قال کنا خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صلوۃ الفجر فقرء فثقلت علیہ القراءۃ فلما فرغ قال لعلکم تقرؤون خلف امامکم قالوا نعم یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال

حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم فجر کی نماز میں نبی کریم ﷺ کے پیچھے تھے، آپ ﷺ نے قرأت کی۔ قرأت آپ کے لئے مشکل ہوگئی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا۔ ہاں یا

لاتفعلوا الا بفاتحة الكتاب فانه لا صلوة لمن لم يقرء بها. (رواہ ابوداؤد والترمذی)

رسول اللہ ﷺ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: سوائے سورت فاتحہ کے کچھ نہ پڑھا کرو کیونکہ اس کی کوئی نماز نہیں جس نے اس سورت کی تلاوت نہیں کی۔

مالکی علماء نے اسے سری نمازوں پر محمول کیا ہے کہ سری نماز میں قرأت کرنا ضروری ہے لیکن امام احمد علیہ الرحمہ نے اسے کسی نماز کے ساتھ خاص نہیں فرمایا لیکن ان کے نزدیک بھی سورت فاتحہ سکتہ کے وقت پڑھی جائے گی۔ ان کے نزدیک حضور ﷺ کی حدیث کہ ''سورت فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی'' کا مطلب یہ ہے کہ کامل نہیں ہوتی۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے۔ جب مقتدی بھی قرأت کرے گا تو دو قرأتیں لازم آئیں گی جن کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔ اگر سورت فاتحہ کو ثناء کی نیت سے پڑھا تو پھر دو قرأتیں لازم نہیں آئیں گی کیونکہ نیت کے تبدیل ہونے سے سورت فاتحہ قرآ نیت سے نکل جائے گی جیسا کہ ہم کہتے ہیں اگر کسی نے نماز جنازہ میں سورت فاتحہ دعا کی نیت سے پڑھی تو کوئی حرج نہیں ہو گا۔

فتح القدیر میں ہے کہ حدیث ''جس کا امام ہو......الخ'' کی سند عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ تعارض کے وقت حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث قابل عمل نہیں رہے گی۔

ہماری دوسری دلیل رب قدوس کا یہ ارشاد گرامی ہے:

اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ (الاعراف:۲۰۴)

جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنا کرو اور چپ رہا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

روى ابن مردويه فى تفسيره عن معاوية بن قرة قال سمعت بعض اشيا خنامن اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم احسبه قال عبد الله بن مغفل كل من سمع القران وجب عليه الانصات والا ستماع قال انما نزلت هذه الاية وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا فى القراءة خلف الامام

ابن مردویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ معاویہ بن قرہ سے اس کی یہ تفسیر روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ کرام سے سنا ہے میرا خیال ہے کہ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ جو قرآن سنے اس پر خاموش رہنا اور قرآن کریم کا سننا فرض ہے۔ یہ آیت کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا قرأت خلف الامام کے بارے نازل ہوئی۔

مذکورہ آثار فتح القدیر میں مذکور ہیں۔ ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ نص سے دو چیزیں ثابت ہیں۔ ایک سننے کی فرضیت اور دوسری خاموشی۔ جہری نمازوں میں تو دونوں چیزیں فرض ہوں گی جبکہ سری نمازوں میں ایک چیز (سننا) فوت ہو جائے گی لیکن دوسری پر عمل ضروری ہو گا (یعنی خاموشی) کیونکہ قرأت خلف الامام کو ترک کرنے سے آیت پر عمل بالکل ہی ترک ہو جائے گا۔ ظاہر ہے آیت میں قرأت بالجہر کا تذکرہ ہے جس پر دونوں چیزیں

(خاموشی اور سننا) مرتب ہوں گی۔

ہماری تیسری دلیل یہ ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما جعل الامام ليوتم به فاذ اكبر فكبروا واذا قرء فانصتوا. (رواہ ابوداؤد ونسائی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا: کسی کو امام اس لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

جہری نمازوں کے ساتھ تخصیص یا فاتحہ کے علاوہ قرأت کی تخصیص بغیر کسی مخصص کے ہے۔ جس چیز کو ایک روایت میں حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مخصص گمان کیا ہے وہ مخصص نہیں بن سکتی۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى صلوة لم يقرء فيها بام القرآن فهي خداج ثلثا غير تمام فقيل لابی هريرة انا نكون وراء الامام قال اقرء ها في نفسک فانی سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول قال الله تعالى قسمت الصلوة بينى وبين عبدى نصفين ولعبدى ماسأل فاذا قال العبد الحمدلله رب العالمين قال الله حمدنى عبدى واذا قال الرحمن الرحيم قال اثنى على عبدى واذا قال مالک يوم الدين قال مجدنى عبدى ولعبدى ماسأل واذا قال اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين قال هذا لعبدى ولعبدى ماسأل. (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا: جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورت فاتحہ کی قرأت نہیں کی تو وہ نماز نامکمل ہے۔ یہ لفظ حضور علیہ السلام نے تین مرتبہ فرمائے اور پھر فرمایا نا تمام ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا: کیا ہم امام کی اقتداء میں نہیں ہوتے فرمایا دل میں پڑھ لیا کرو کیونکہ میں نے نبی کریم علیہ السلام کو فرماتے سنا کہ ارشادِ ربانی ہے۔ (حدیث قدسی) میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ میرا بندہ مجھ سے جو مانگتا ہے اسے مل جاتا ہے۔ جب وہ پڑھتا ہے الحمد الله رب العالمين تو رب قدوس فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد وثناء کی۔ جب بندہ الرحمن الرحیم کہتا ہے تو رب قدوس فرماتا ہے۔ میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب بندہ مالک یوم الدین کہتا ہے تو رب قدوس فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ میرے بندے نے جو سوال کیا اسے دے دیا گیا۔ جب بندہ اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين کہتا ہے تو رب قدوس فرماتا ہے میرے بندے نے یہ کہا۔ میرے بندے کو میں نے عطا کر دیا جس کا اس نے سوال کیا۔

دیکھئے حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورت فاتحہ کی تقسیم سے استدلال کیا ہے کہ سورت فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے لیکن یہ حدیث امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنے کی دلیل نہیں کیونکہ امام کی فاتحہ مقتدی کی فاتحہ ہے۔ (مقتدی سورت فاتحہ چھوڑ دے تو بھی امام کی قرأت کی وجہ سے اس کی قرأت ہو جاتی ہے) لہٰذا امام اور مقتدی دونوں کے حق میں یہ تقسیم صحیح ہے اور اس حدیث کی تخصیص کا موجب نہیں جس میں خاموشی کا حکم دیا گیا ہے۔

معذور کی امامت

دھونے والا مسح کرنے والی کی اقتداء کر سکتا ہے کیونکہ دھونا اور مسح کرنا دونوں سے کامل طہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسح دھونے کا بدل نہیں بلکہ بذاتِ خود طہارت کا ایک سبب ہے۔

وضو کرنے والا تیمم کرنے والے کی اقتداء کر سکتا ہے کیونکہ پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم سے حدث زائل ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلے بات ہو چکی ہے۔ امام شافعی کا گمان یہ ہے کہ تیمم سے حدث زائل نہیں ہوتا جیسے استحاضہ والی عورت وضو کرتی ہے لیکن وضو سے اس کا حدث زائل نہیں ہوتا۔ اس کا اعتبار صرف نماز کو ادا کرنے کی غرض سے ہے اس لئے جس کو ضرورت نہیں اس کے حق میں اس کا حکم ظاہر نہیں ہوتا اسی لئے مستحاضہ کی طرح ایک تیمم سے صرف ایک ہی نماز ادا ہو سکتی ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وضو کرنے والا تیمم کرنے والے کی اقتداء نہیں کر سکتا کیونکہ ان کے نزدیک بھی تیمم ضرورت کی وجہ سے ہے اس لئے وضو کرنے والے کے نزدیک تیمم کرنے والا محدث ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ تیمم کی مشروعیت ضرورت کے تحت ہے لیکن پھر بھی اس سے حدث زائل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب حدث زائل ہو گیا تو وضو اور تیمم میں کوئی فرق نہ رہا۔

کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والا بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی اقتداء کر سکتا ہے۔ یہ رائے امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف علیہما الرحمہ کی ہے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ اقتداء صحیح نہیں کیونکہ بیٹھنے والا ایک رکن کا تارک ہے لہٰذا کھڑے ہونے والے کے نزدیک اس کی نماز صحیح نہیں۔ جس طرح سلسل بول والے کے پیچھے صحیح نہیں کیونکہ بیماری کی وجہ سے وضو کی شرط مفقود ہے۔ لہٰذا وضو والا ایسے معذور کی اقتداء نہیں کر سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ بیٹھنے والا واقعی ایک رکن (قیام) کا تارک ہے لیکن عذر کی وجہ سے اس کا بیٹھنا اب اس کے قیام کی جگہ ہے اس لئے عذر کی وجہ سے بیٹھنے والا کسی رکن کا تارک شمار نہیں ہوگا اور کھڑا ہونے والا اس کی اقتداء کر سکتا ہے لیکن سلسل بول کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کی جگہ کسی اور چیز نے نہیں لی۔ لہٰذا یہ عذر صرف معذور شخص کے حق میں معتبر ہوگا دوسرے کے حق میں نہیں بلکہ دوسرے کے حق میں وضو کی شرط مفقود شمار ہوگی۔

قد روی انس قال سقط النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن فرس فجحش شقہ الایمن

حضرت سیدنا انس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ گھوڑے سے گر گئے اور دائیں کندھے پر

فدخلنا علیه نعوده فحضرت الصلوة فصلی بنا قاعدا فصلینا وراء قعودا فلما قضی الصلوة قال جعل الامام لیوتم به فاذا رکع فارکعوا واذا سجد فاسجدوا واذا رفع فارفعوا واذا قال سمع الله لمن حمده فقولو اربنا ولک الحمد واذا صلی قاعدا فصلوا قعود اجعمین. (رواہ البخاری ومسلم)

خراش آ گئی۔ ہم عیادت کرنے حاضر ہوئے۔ نماز کا وقت ہوا تو آپ ﷺ نے ہمیں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور ہم نے آپ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو فرمایا: امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو۔ جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ جب وہ اٹھے تو تم بھی (سجدہ یا رکوع سے) اٹھو۔ جب وہ سمع الله لمن حمده کہے تو تم ربنا ولک الحمد کہو۔ جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بیٹھ کر نماز پڑھو۔

اس حدیث کو متعدد طرق سے روایت کیا گیا ہے۔ صحیحین (بخاری اور مسلم) اور دوسری کتب سنن کے الفاظ میں اختلاف ہے۔

اس حدیث سے امام محمد علیہ الرحمہ کے نظریہ کو تقویت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہے تو مقتدی کا کھڑے ہو کر اس کی اقتداء کرنا جائز نہیں؟

نیز اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر امام بیماری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہے تو مقتدی بھی بیٹھ کر نماز ادا کریں حالانکہ امام محمد علیہ الرحمہ کا نظریہ یہ نہیں۔ جب اس حدیث سے خود ان کے مذہب کا بطلان واضح ہو رہا ہے تو وہی حدیث ان کے لئے مفید کیسے ہو سکتی ہے۔

ہمارے مذہب کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض موت میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور آپ کے پیچھے لوگوں نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ یہ حدیث پہلی حدیث کے بعد کی ہے اس لئے پہلی کی ناسخ ہے۔

یاد رہے کہ حضور ﷺ جب زیادہ بیمار ہوئے تو آپ نے افضل الصدیقین ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ آپ ﷺ کی وفات تک کل سولہ یا سترہ نمازیں پڑھی گئیں۔ بعض میں آپ ﷺ نے امامت کی اور بعض میں آپ کا شانۂ اقدس سے باہر تشریف لائے لیکن افضل الصدیقین حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء فرمائی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی آخری نماز تھی جس میں آپ ﷺ باہر تشریف لائے اور لوگوں کی امامت کرائی۔

روت ام المؤمنین عائشة الصدیقه لما ثقل رسول الله صلی الله علیه وسلم جاء بلال یوذنه بالصلوة فقال مروا ابابکر فلیصل بالناس فصلی ابوبکر ثم ان

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی بیماری نے شدت اختیار کی تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز کے لئے آپ ﷺ کو بلانے آئے آپ ﷺ نے فرمایا: ابو بکر کو حکم دو کہ وہ

النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجد فی نفسہ خفۃ فقام یھادی بین رجلین ورجلاہ تخطان فی الارض حتی دخل المسجد فسمع حسہ وذھب یتاخر فاومی الیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لاتتاخر فجاء حتی جلس عن یسار ابی بکر وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی قاعدا یقتدی ابوبکر بصلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والناس یقتدون ابی بکر یسمع ابوبکر الناس.

لوگوں کو نماز پڑھائیں سو حضرت ابوبکر نے لوگوں کو نماز پڑھائی پھر نبی کریم ﷺ نے کچھ افاقہ محسوس کیا تو دو آدمیوں کا سہارہ لے کر تشریف لے گئے۔ (کمزوری کی وجہ سے) حالت یہ تھی کہ پاؤں زمین پر صحیح طریقہ سے نہیں پڑ رہے تھے حتی کہ آپ مسجد میں داخل ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے چلنے کی آواز کو سنا تو پیچھے ہٹنا شروع ہوئے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کو اشارہ سے حکم دیا کہ پیچھے نہ آؤ۔ حضور ﷺ آ کر حضرت ابوبکر صدیق کے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ حضور نبی کریم ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کر رہے تھے جبکہ دوسرے لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء کر رہے تھے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں سنا رہے تھے۔ (یعنی مکبّر تھے)

اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔

وہ نماز جو رسول اللہ ﷺ نے افضل الصدیقین کے پیچھے پڑھی۔

روی ام المؤمنین عائشۃ الصدیقۃ رضی اللہ عنہ قالت صلی ھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکر قاعدا.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ہی روایت کیا ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نماز مرض وفات میں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے پڑھی۔

اسے حضرت امام ترمذی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن[1] صحیح ہے۔

روی انس اخر صلوۃ صلاھا مع القوم فی ثوب واحد متوشحا خلف ابی بکر. (رواہ ابن حبان)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کی (آخری نماز کے) متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ آخری نماز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے ادا فرمائی۔ (آپ نے) ایک چادر پہنی ہوئی تھی (اور سینے پر اس کی) گرہ باندھی ہوئی تھی۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جس نماز میں آپ ﷺ نے امامت کرائی وہ ہفتہ یا اتوار کی نماز ظہر تھی اور

[1] امام ترمذی اپنی سنن میں حدیث کی حیثیت کا تعین بھی فرماتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ آپ ان کی سنن میں اکثر دیکھیں گے۔ بعض اوقات مذکورہ صورت میں حرف عطف واؤ محذوف ہوتا ہے اور بعض اوقات او جب سندیں دو ہوں تو واؤ یعنی ایک سند کے اعتبار سے حسن ہے اور ایک سند کے اعتبار سے صحیح۔ اَو کا مطلب یہ ہے کہ سند ایک ہے۔

جس میں آپ ﷺ مقتدی تھے وہ پیر وار کی نماز تھی اور یہ حضور ﷺ کی آخری نماز تھی۔ اس کے بعد آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

یہ ساری تفصیلات حضرت امام زہری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ:

عن انس فی صلوتھم یوم الاثنین وکشف الستر ثم ارخائه فکان ابوبکر فی الرکعة الاولی ثم انه علیه السلام وجد فی نفسه خفة فخرج فادرک منه الثانیة.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سوموار کا دن تھا۔ حضور ﷺ نے پردہ ہٹایا پھر اس کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق پہلی رکعت میں تھے۔ حضور ﷺ نے بیماری میں قدرے کمی محسوس کی تو آپ تشریف لائے حضرت ابوبکر صدیق دوسری رکعت میں تھے۔

اس حدیث کی نسبت موسیٰ بن عقبہ کی طرف ہے۔ یہ حدیث اور پردہ ہٹانے والی حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں تفصیل سے نقل کی گئی ہے۔

امام اور مقتدی کی نیت ایک ہو

امام اور مقتدی کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی فرض نماز پڑھ رہے ہوں۔ اگر امام کسی اور وقت کے فرض پڑھ رہا ہے اور مقتدی کسی اور وقت کے فرض پڑھ رہا ہے تو یہ اقتداء صحیح نہیں ہے کیونکہ امام ضامن ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ دونوں کی تکبیر تحریمہ ایک ہی نماز کے لئے ہو۔

فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کا مقتدی نہیں بن سکتا کیونکہ نفلوں کی تکبیر تحریمہ درجہ میں فرضوں کی تکبیر سے کم ہے اس لئے نفل فرض کے ضامن نہیں ہو سکتے لیکن اس کے برعکس اقتداء صحیح ہے کیونکہ قوی ضعیف کا ضامن ہو سکتا ہے۔

امام شافعی کے نزدیک فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کا مقتدی بن سکتا ہے۔ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

عن جابر قال کان معاذ بن جبل یصلی مع النبی صلی اللہ علیه وسلم ثم یاتی فیؤم قومه نصلی لیلة مع النبی صلی اللہ علیه وسلم العشاء ثم اتی قومه فامھم فافتتح بسورة البقرة فانحرف رجل فسلم ثم صلی وحده وانصرف قالوا له انا فقت یا فلان قال لا واللہ لاتین رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فلا خبرنه فاتی رسول اللہ صلی اللہ

حضرت جابر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ معاذ بن جبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے اور پھر آ کر لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی پھر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان کی امامت کی۔ آپ نے سورت بقرہ شروع کر دی (مقتدیوں میں سے) ایک آدمی مڑا اور اس نے سلا پھیر کرا کیلے نماز شروع کر دی۔ لوگوں نے کہا اے فلاں! کیا تو منافق ہے؟ اس نے کہا

علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انا اصحاب نواضح نعمل النھار وان معاذ اصلی معک العشاء ثم اتی فافتتح بسورۃ البقرۃ فاقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی معاذ فقال یا معاذ افتان انت اقرء بکذا اقرء بکذا قال سفیان فقلت لعمروان ابا الزبیر حدثنا عن جابر قال اقرء والشمس وضحھا والضحی واللیل اذا یغشی وسبح اسم ربک الاعلی. (رواہ البخاری ومسلم)

نہیں۔ بخدا! میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور انہیں بتاؤں گا۔ وہ شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم لوگ آب کشی کا پیشہ کرتے ہیں۔ ہمیں پورا دن کام کرنا پڑتا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی پھر ہمارے پاس آئے اور انہوں نے سورت بقرہ شروع کر دی۔ حضور ﷺ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر غصے ہوئے اور فرمایا: اے معاذ! کیا تو لوگوں کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے فلاں فلاں سورت پڑھا کرو۔ سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ ابوالزبیر نے ہم سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کہ سورت شمس، سورت ضحیٰ اور سورت اعلیٰ پڑھا کرو۔

فرض نماز دوبارہ پڑھنا

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنی قوم کے پاس آتے اور انہیں نماز پڑھاتے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ نماز نفل ہوتی اور مقتدیوں کی نماز فرض ہوتی۔

شیخ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ جواب دیتے ہیں کہ ایسی حدیث سے استدلال جائز نہیں جس سے رسول اللہ ﷺ نے انکار فرمایا ہے۔ ہوسکتا ہے حضور ﷺ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس طرح جماعت کرانے سے ناواقف ہوں اور جب آپ کو علم ہوا ہو تو آپ نے انہیں منع فرما دیا ہو جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے ثابت ہے۔

عن سلیم رجل من سلیمۃ انہ اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ان معاذ بن جبل یاتینا بعد ماننام ونکون فی اعمالنا بالنھار فیناوی بالصلوۃ فنخرج الیہ فیطول علینا فقال صلی اللہ علیہ وسلم لہ یا معاذ لاتکن فتانا اما ان تصلی معی واما ان تخفف علی قومک.

سلیم قبیلہ کے ایک آدمی سلیم سے روایت کرتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! جب ہم سو جاتے ہیں تو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لاتے ہیں اور ہمیں نماز کے لئے بلا لیتے ہیں۔ ہم سارا دن کام کرتے ہیں، ہم نماز کے لئے جاتے ہیں تو وہ نماز کو بہت طول دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اے معاذ! لوگوں کو آزمائش میں نہ ڈالیے۔ یا تو آپ میرے ساتھ نماز پڑھا کریں یا پھر اپنی

قوم پر تخفیف کیا کریں۔

آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دو میں سے ایک چیز کی اجازت دی۔ یا رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معیت میں نماز پڑھیں یا اپنی قوم کو مختصر سی نماز پڑھایا کریں اور ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز نہ پڑھا کریں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منع فرمادیا کہ جب تم میرے ساتھ نماز پڑھ چکو تو پھر لوگوں کو نماز نہ پڑھایا کرو۔ حالانکہ ان کی امامت بالاتفاق ممنوع شمار نہیں ہوتی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے صرف فرضوں کی امامت سے منع فرمایا۔

شیخ ابن ھمام رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں کچھ چیزیں قابل وضاحت ہیں یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ کو علم نہیں تھا، صحیح نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گزارش احوال کر دی تھی۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ رسول اللہ ﷺ جانتے تھے اور جاننے کے بعد آپ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ یا تو میرے ساتھ فرض پڑھا کرو یا پھر اپنے قبیلہ کے لوگوں کو نماز پڑھایا کرو۔ (ان دونوں میں سے صرف ایک کام کیا کرو) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جواب دیتے ہیں کہ یہ لفظ کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نفل پڑھتے تھے۔ امام شافعی کی روایت میں ہیں اور ان کے علاوہ کسی اور کی روایت میں نہیں اس لئے یہ امام شافعی کا اجتہاد ہے حدیث کے الفاظ نہیں۔ صحاح کی روایات امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے منافی ہیں۔

صلی معاذ ابن جبل باصحابه العشاء فطول علیهم فانصرف رجل فصلی فاخبر معاذ فقال منافق فلما بلغ ذلک الرجل دخل علی رسول الله صلی الله علیه وسلم فاخبره ماقال معاذ فقال له النبی صلی الله علیه وسلم اتریدان تکون فتانا یا معاذ اذا اممت الناس فاقرء بالشمس وضحها وسبح اسم ربک الاعلی واقرء باسم ربک واللیل اذا یغشی. (رواہ مسلم)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھائی اور نماز ان پر لمبی ہوگئی۔ ایک نے الگ ہو کر اپنی نماز پڑھ لی حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا گیا۔ انہوں نے فرمایا وہ شخص منافق ہے۔ جب یہ بات اس آدمی تک پہنچی تو وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ معاذ نے یہ کچھ کہا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اے معاذ کیا تو لوگوں کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے۔ جب لوگوں کو نماز پڑھاؤ تو سورت شمس، سورت اعلیٰ، سورت ضحیٰ اور سورت علق تلاوت کیا کرو۔

مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ حضرت سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے پھر اپنی قوم میں واپس آتے اور انہیں یہی نماز پڑھاتے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقتدی اگر فرض نماز پڑھتے تو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نفل پڑھتے یا اس دور میں فرض کا تکرار جائز تھا۔ یہ جواب زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس سے تمام احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے اور کسی قسم کا تعارض باقی نہیں رہتا۔

دونوں صورتوں میں ان کی حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے نماز پڑھنا فرض والوں کی نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے اقتداء شمار نہیں ہوتی۔

اور تکرار کے بارے بعد میں نہی وارد ہوگئی جس کی وجہ سے اب تکرار کا جواز بھی نہیں رہا جیسا کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔لہٰذا اس مسئلہ میں غور وخوض کی ضرورت ہے۔جس حدیث میں فرضوں کو دوبارہ پڑھنے سے منع کیا گیا ہے اسے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

عن ابن عمر قال انی سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم لاتصلوا في يوم مرتين.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ ایک دن میں ایک نماز کو دو بار نہ پڑھو۔

نماز میں صفوں کو برابر رکھنا سنت ہے

آپ ﷺ نے صفوں کے برابر کرنے کو سنت فرمایا کہ صف میں کوئی جگہ خالی نہ رہے۔اگر ایک سے زائد صفیں ہوں تو تمام صفیں متوازی ہونی چاہئیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صفوں کو درست کرنا فرض ہے۔

عن انس قال اقيمت لصلوة فاقبل علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اقيموا صفوفكم فانى اراكم من وراء ظهرى وكان احدنا يلزق منكبه بمنكبه وقدمه بقدمه. (رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اقامت ہوئی تو رسول اللہ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اپنی صفوں کو سیدھا رکھو میں تمہیں اپنی پیٹھ پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔ہم میں سے ہر شخص دوسرے کے کندھے سے اپنا کندھا ملا کر رکھتا اور قدم سے قدم ملا کر کھڑا ہوتا۔

عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اقيموا الصف فان اقامة الصف من حسن الصلوة.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: صف سیدھی رکھو صف کا سیدھا ہونا نماز کا حسن ہے۔

اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت فرمایا ہے: آخری حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ صفوں کو برابر رکھنا فرض نہیں۔

اکیلے کھڑا ہونا مکروہ ہے

ایک آدمی کا اکیلے پیچھے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔اگر صف میں جگہ نہ ہو تو اگلی صف میں سے کسی آدمی کو پیچھے کھینچ لے اور اس کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھے۔

روى زياد ابن ابى الجعد قال حدثنى هذا الشيخ وهو يسمع ان رسول الله صلى

زیاد بن ابی جعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ مجھ سے اس بزرگ نے روایت کیا اور میں

اللہ علیہ وسلم رأی رجلا صلی خلف الصف وحدہ مامرہ ان یعید الصلوۃ. (رواہ جامع الترمذی)

اسے سن رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو صف کے پیچھے اکیلے کھڑا ہو کر نماز پڑھتے دیکھا تو اسے حکم دیا کہ وہ نماز دوبارہ پڑھے۔

بزرگ شخصیت سے ان کی مراد وابصہ بن معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کا تعلق بنی اسد سے ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اکیلے کھڑا ہونا مکروہ تحریمی ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اسے اعادہ کا حکم دیا۔

صفوں کی ترتیب

مردوں کی صف پہلے ہوگی پھر بچوں کی صف ہوگی اور ان کے پیچھے اگر عورتیں ہوں تو وہ صف بنائیں گی کیونکہ حدیث مبارک ہے:

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلین منکم اولوا الاحلام والنھی ثم الذین یلونھم ثلثا. (رواہ مسلم)

عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام کے قریب تم میں سے وہ لوگ کھڑے ہوں جو عقل مند اور سمجھدار ہوں پھر وہ جو ان سے مرتبہ میں قریب ہیں۔ حضور ﷺ نے (آخری جملہ) تین بار فرمایا۔

اس ضمن میں ایک اور حدیث بھی پیش کی جاتی ہے۔

عن ابی مالک الاشعری قال الااحدثکم صلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اقام الصف فصف الرجال وصف خلفھم الغلمان ثم صلی بھم فذکر صلوتہ وقال ھکذا صلوۃ امتی. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کیا میں تم سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے بات نہ کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: صفیں درست کرو تو مردوں نے صف بنائی اور ان کے پیچھے بچوں نے صف بنائی پھر آپ ﷺ نے انہیں نماز پڑھائی اور فرمایا: میری امت کی نماز اس طرح ہے۔

عورتوں کی صف سب سے آخر میں ہونی چاہئے اس کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد ہے۔ انہیں اس طرح پیچھے رکھو جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں پیچھے رکھا ہے۔ اسے عبد الرزاق علیہ الرحمہ نے روایت فرمایا ہے۔ فتح القدیر میں صفوں کی یہی ترتیب بیان کی گئی ہے۔

اگر ایک ہی مقتدی ہو تو؟

اگر مقتدی ایک آدمی ہو تو وہ امام کے دائیں طرف کھڑا ہو۔

عن ابن عباس قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلۃ فقمت عن یسارہ فاخذبر دائی فجعلنی عن یمینہ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں آپ ﷺ کے بائیں جا کھڑا ہوا۔ آپ ﷺ نے میری

چادر پکڑ کر مجھے اپنے دائیں طرف کھڑا کر دیا۔

اسے بہت سے راویوں نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث کافی طویل ہے اس میں رات کی نماز کا تذکرہ ہے۔

دو یا اس سے زیادہ ہوں تو امام کے پیچھے کھڑے ہوں گے

اگر مقتدی ایک سے زائد ہوں تو مقتدی پیچھے کھڑے ہوں اور امام ان کے آگے کھڑا ہو۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقتدی دو ہوں تو امام ان کے درمیان میں کھڑا ہو اور دونوں مقتدی اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوں۔ دو سے زائد مقتدیوں کے پیچھے کھڑے ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

عن علقمة والاسود استاذنا علی ابن مسعود قال الاسود قد کنا اطلقنا القعود علی بابه فخرجت الجارية فاستاذنت لهما ثم قام فصلی بینی وبینه ثم قال هکذا رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فعل۔

(رواہ ابوداؤد)

علقمہ اور الاسود سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے اجازت طلب کی۔ اسود (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرماتے ہیں ہم دروازے پر بیٹھے رہے کہ اتنے میں ایک لونڈی باہر آئی اور اس نے ہم دونوں کیلئے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اجازت طلب کی پھر (حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اُٹھے اور میرے اور اس کے (علقمہ) کے درمیان کھڑے ہو کر نماز ادا فرمائی پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔

ہماری دلیل یہ حدیث مبارک ہے۔

ما روی سمرة بن جندب قال امرنا رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا کنا ثلثة ان یتقدمنا احدنا۔ (رواہ الترمذی)

سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب ہم تین ہوں تو ہم سے ایک آگے کھڑا ہو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ظاہری الفاظ تطبیق کا اشارہ دیتے ہیں کیونکہ مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں اور علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے بعد اسود رضی اللہ عنہ کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے نماز پڑھی۔ یہ نہیں کہ حضرت ابن مسعود نے یہ کہا کہ اٹھو اور نماز پڑھو۔ ہم گئے تاکہ آپ کے پیچھے کھڑے ہو جائیں تو رسول اللہ ﷺ نے ہم میں سے ایک کو اپنے دائیں کھڑا کر دیا اور دوسرے کو بائیں اور بغیر اذان اور اقامت کے نماز پڑھی۔ جب رکوع کیا تو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر ڈالا اور دونوں کو اپنے گھٹنوں کے درمیان رکھ لیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ یوں کیا کرتے تھے۔ ''یوں کیا کرتے تھے'' کا اشارہ پوری نماز کی طرف

نہیں بلکہ رکوع میں دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈال کر گھٹنوں میں رکھنے کی طرف اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ یہ طریقہ منسوخ ہے۔

پھر ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دو مقتدیوں کے درمیان کھڑا ہونا یہ صرف انہیں کا فعل ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت سے متعارض نہیں ہوسکتا۔ اگر بالفرض اسے تسلیم کر لیا جائے کہ مذکورہ روایت میں اشارہ حالت رکوع کی طرف نہیں تھا بلکہ امام کے درمیان میں کھڑے ہونے یا قیام اور رکوع دونوں کی طرف تھا تو قول وفعل میں جب تعارض آ جائے تو قول کو مقدم رکھا جاتا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا عمل آپ ﷺ کے ارشاد کے موافق پایا جاتا ہے جیسا کہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت بیان کی ہے۔

عن مسعود قال مربی رسول الله صلى الله عليه وسلم وابوبكر فقال ابوبكر ائت ابا تمام يعني مولاه فقل يحملنا على بعير وبعث الينا بزادو دليل فجئت الى مولاه فاخبرته فبعث معى ببعيرو وطب من لبن فجعلت احدثهم فى اخفاء الطريق وحضرت الصلوة فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم وقام معه ابوبكر عن يمينه وقد عرفت الاسلام فجئت وقمت خلفهما فدفع رسول الله صلى الله عليه وسلم فى صدر ابى بكر فقمنا خلفه.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا میرے پاس سے گزر ہوا تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ابو تمام یعنی ان کے غلام کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ وہ سواری کے لئے ایک اونٹ زادِ راہ اور ایک راستہ دکھانے والا لے آئے۔ میں ان کے غلام کے پاس گیا اور میں نے انہیں اطلاع دی۔ غلام نے میرے ہاتھ ایک اونٹ اور دودھ کی ایک مشک روانہ کی۔ میں ان سے اس راستے کے بارے باتیں کرنے لگا جو بالکل مخفی تھا۔ نماز کا وقت آ گیا' رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے۔ آپ کی دائیں طرف ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے۔ میں اسلام سے واقفیت رکھتا تھا۔ میں آ کر ان دونوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں پیچھے کر دیا اور ہم نے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔

مرد امام کے پیچھے عورت کہاں کھڑی ہو؟

اگر مقتدی ایک مرد اور ایک عورت ہوں تو مرد امام کے دائیں طرف کھڑا ہو اور عورت ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو۔ ایک عورت اور کئی مرد ہوں تو عورت اکیلی مردوں کے پیچھے کھڑی ہو گی اور اس کے اکیلے کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

عن ابن عباس قال صليت الى جنب رسول الله صلى الله عليه وسلم وعائشة خلفنا تصلى معنا وانا الى جنب النبى صلى

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں نماز پڑھی جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہمارے پیچھے

اللہ علیہ وسلم اصلی معہ. (رواہ النسائی) ہمارے ساتھ نماز پڑھ رہی تھیں اور میں حضورﷺ کے پہلو میں ان کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔

عورت مردوں کے برابر کھڑی ہوتو مردوں کی نماز فاسد ہوگی

اگر کوئی شخص مشتہاہ[1] عورت کے برابر کھڑا ہوکر نماز پڑھے گا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی بشرطیکہ امام نے اس عورت کی شمولیت کی نیت کی ہو۔ دونوں کی نماز ایک ہی ہو' دونوں کی جگہ ایک ہی ہو' درمیان میں کوئی پردہ حائل نہ ہو اور دونوں کے درمیان جگہ خالی بھی نہ ہو کیونکہ عورت کے ساتھ کھڑے ہوکر اس نے اپنی جگہ ترک کر دی کیونکہ عورت کے لئے فرض ہے کہ وہ آخر میں کھڑی ہو جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر سے ثابت ہے اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اثر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ ایسے مسائل میں رائے اور اجتہاد کو کوئی دخل نہیں ہوتا اسی لئے فقہاء نے اسے مرفوع گردانا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

بعض لوگ کہتے ہیں ایک عورت کی نماز تین آدمیوں کی نماز کو توڑ دیتی ہے۔ ایک جو عورت کے دائیں ہے۔ ایک جو بائیں اور تیسرا وہ جو پیچھے کھڑا ہے' ان تینوں کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ عورتوں کی صف کے پیچھے مردوں کی جتنی بھی صفیں ہوں گی ان کی نماز نہیں ہوگی۔ فتح القدیر میں ہے کہ قیاس یہ کہتا ہے کہ صرف ایک صف کی نماز ٹوٹنی چاہئے جو عورت کی صف کے پیچھے ہے۔ تمام صفوں کی نماز فاسد نہیں ہونی چاہئے کیونکہ بقیہ صفوں اور عورت کی صف کے درمیان والی صف سترہ اور پردہ ہے مگر قیاس اس ضمن میں صحیح نہیں کیونکہ امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کی صورت میں مقیس پہلے ہی محکوم بہ ہے۔

امام اور مقتدی میں فاصلہ

مقتدی اور امام کے درمیان اگر راستہ یا نہر ہو یا امام مرد اور مقتدی کے درمیان عورتوں کی صفیں ہوں تو وہ امام کے ساتھ نہیں۔

دو عورتیں ایک ہی عورت کے حکم میں ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو کا حکم تین عورتوں جیسا ہے۔ قیاساً عورت کے برابر کھڑا ہونے والے کی نماز نہیں ٹوٹنی چاہئے اس لئے اس کا حکم منصوص سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ (یعنی اس کو مقیس علیہ نہیں بنایا جا سکتا) اسی لئے اس میں قیود کا اعتبار رکھا گیا ہے۔ ان میں سے اگر ایک قید بھی مفقود ہوگی تو نمازی کی نماز فاسد نہیں ہوگی مثلاً مرد کے برابر ایک بچی کھڑی ہو جاتی ہے جو اتنی چھوٹی ہے کہ اس کے ساتھ مباشرت نہیں کی جا سکتی تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔ اگر عورت مشتہاہ ہے لیکن امام نے اس کی امامت کی نیت نہیں کی تو مرد کی نماز نہیں ٹوٹے گی بلکہ عورت کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ برابر کھڑا ہوکر پڑھنے میں عورت کے لئے امام کی نیت شرط ہے اس لئے اس کا التزام ضروری ہے۔ برابر کھڑا نہ ہونے کی صورت میں امام کی نیت کے شرط ہونے کے بارے دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اگر عورت ایک رکن تک برابر کھڑی نہیں ہوتی تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔

[1] جو شہوت کا محل ہو۔ اس حکم سے چھوٹی بچیاں مستثنیٰ ہیں۔

اگر عورت آخری صف میں کھڑی ہوئی پھر اس سے اگلی صف میں آ کر رکوع کیا اور اس سے بھی اگلی صف میں جا کر سجدہ کیا ہر صف میں جو جو آدمی اس کے برابر کھڑا ہوا اس کی نماز فاسد ہو گئی۔

نماز جنازہ میں برابر آ کر عورت کھڑی ہوئی تو مرد کی نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ یہ صلوٰۃ مطلقہ نہیں ہے یعنی ایسی نماز جس میں رکوع اور سجدہ ہو۔

اگر عورت اور مرد کی جہت قبلہ ایک نہیں تو بھی مرد کی نماز فاسد نہ ہو گی مثلاً کعبہ شریف میں مرد دائیں طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہے اور عورت اس کے پہلو میں کھڑی اس سے قدرے مختلف سمت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہی ہے تو مرد کی نماز فاسد نہیں ہو گی۔

اگر مرد اور عورت کے درمیان کوئی چیز حائل ہے مثلاً سترہ یا ستون تو نماز نہیں ٹوٹے گی اسی طرح اگر دونوں کے درمیان جگہ خالی ہو تو بھی نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ خالی جگہ سترہ کے قائم مقام ہے۔

اگر مرد اور عورت کی نماز ایک نہ ہو' ایک دوسرے کے امام نہ ہوں تو برابری سے نماز نہیں ٹوٹے گی۔ دونوں کی نماز ادائیگی میں مشترک نہ ہو مثلاً جب دونوں مسبوق ہیں اور بقیہ رکعتیں پڑھ رہے ہیں تو نماز نہیں ٹوٹے گی اور اگر دونوں کسی نماز کی قضا کر رہے ہیں تو بھی نماز نہیں ٹوٹے گی۔

ادائیگی میں اشتراک کا معنی یہ ہے کہ امام کے پیچھے حقیقۃً ادا کر رہے ہوں یا حکماً ادا کر رہے ہوں مثلاً لاحق جو ظاہراً الگ ہوتا ہے لیکن حکماً امام کی اقتداء میں ہوتا ہے۔ اگر ایسی صورت میں لاحق مرد اور لاحق عورت برابر ہو گئے تو مرد کی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ امام مرد اور عورت دونوں کا امام ہے۔

قاری کی موجودگی میں اَن پڑھ کا نماز کروانا درست نہیں

اگر ایک اُمی (اَن پڑھ) آدمی جماعت کراتا ہے اور مقتدیوں میں کچھ لوگ قرآن پڑھنا جانتے ہیں تو امیوں کی نماز ہو جائے گی لیکن جو لوگ قرآن پڑھنا جانتے ہیں ان کی نماز باطل ہو گی کیونکہ ان پڑھ معذور ہیں لیکن یہ لوگ قرأت کر سکتے ہیں۔ اب معذوروں کی نماز معذور کے پیچھے ہو جائے گی لیکن دوسروں کی نہیں۔ یہ رائے صاحبین[1] کی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کسی کی بھی نماز نہیں ہو گی کیونکہ امام نے قدرت کے باوجود قرأت نہیں کی۔ یعنی اگر وہ چاہتا تو کسی قاری کو مصلیٰ امامت پر کھڑا کر دیتا اور اس طرح ایک فرض ترک نہ ہوتا اور ایک قاری کی قرأت سے تمام لوگوں کی قرأت ہو جاتی لیکن اگر کوئی ان پڑھ اکیلے نماز پڑھے گا تو اس کی نماز ہو جائے گی کیونکہ وہ قرأت پر قادر نہیں اور جماعت میں رغبت نہیں رکھتا۔ علماء نے ایسا ہی کہا ہے۔

لیکن نماز باجماعت کو ان پڑھ کے لئے شرط قرار دینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس طرح وہ ایک اہم رکن کو پا لے گا اور اس کے برعکس وہ ایک ایسی چیز کا تارک ہو گا جو نماز میں حرج عظیم کا سبب بنے گی جس کو شرعاً دور کیا جا سکتا ہے۔ سو ان پڑھ کی اکیلے نماز ہو جائے گی لیکن قاری کی صورت میں نماز نہیں ہو گی جس کی اقتداء میں وہ ایک رکن کو پا سکتا ہے۔

---

[1] فقہ میں صاحبین سے مراد امام ابویوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما ہوتے ہیں۔

اگر امام کی نماز فاسد ہو تو تمام کی نماز فاسد متصور ہو گی

اگر لوگوں نے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ امام کا وضو نہیں تھا یا وہ جنبی تھا تو مقتدیوں کی نماز بھی نہیں ہو گی اور ہمارے نزدیک نماز کا اعادہ ضروری ہو گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعادہ ضروری نہیں اور نہ ہی اس طرح نماز ٹوٹے گی۔ ان کا گمان یہ ہے کہ جماعت اس چیز کا نام ہے کہ ارکان کو امام کے ساتھ ادا کیا جائے۔ امام کی نماز ٹوٹنے سے مقتدیوں کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔ ہماری دلیل یہ حدیث ہے۔

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه ووجوه اله الکرام انه قال فی الرجل الذی یصلی القوم جنبا قال یعید ویعیدون.

امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ امام اور مقتدی دونوں نماز کا اعادہ کریں جبکہ ایک آدمی نے لوگوں کو حالتِ جنابت میں نماز پڑھا دی تھی۔

اسے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

عن جعفر ان علیا صلی بالناس وهو جنب او علی غیر وضوء فاعاد وامرهم ان یعیدوا.

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ (جناب) علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنابت یا حدث کی حالت میں نماز پڑھا دی۔ آپ نے خود بھی نماز کا اعادہ کیا اور مقتدیوں کو بھی اعادے کا حکم دیا۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہو۔ فتح القدیر میں سند صحیح کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ:

قال الامام ضامن.

فرمایا امام ضامن ہے۔

یعنی امام فسادِ نماز اور صحت نماز کا ضامن ہے۔ جب امام کی نماز فاسد ہو گئی تو مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہو گئی کیونکہ امام کی قرأت مقتدیوں کی قرأت ہے امام کی قرأت کے فاسد ہونے سے مقتدیوں کی نماز بغیر قرأت کے ہوئی اور بغیر رکن کے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

ایک شخص مدت تک لوگوں کو نماز پڑھاتا رہا پھر خود وہ امام لوگوں سے کہنے لگا کہ میں مسلمان ہی نہیں تھا یا میں نے تمام نمازیں جان بوجھ کر بے وضو اور بے طہارت پڑھائی ہیں تو مقتدی اعادہ نہیں کریں گے کیونکہ فاسق کی خبر قابل قبول نہیں اور اعتراف کی وجہ سے امام فاسق ٹھہرا اور نماز صحیح ہوئی۔ فتح القدیر میں یہی مذکور ہے۔

دوسری فقہ کی تقلید کرنے والے کے پیچھے نماز

دوسری فقہ کی تقلید کرنے والے کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے مثلاً حنفی کی شافعی امام کے پیچھے اور شافعی کی حنفی کے پیچھے۔ یہ چیز اجماع سے ثابت ہے اور اجماع بھی وہ جسے شرعاً اجماع کہتے ہیں کیونکہ تمام فقہاء حق پر ہیں ان میں سے کسی ایک کی تقلید جائز ہے اور آخرت میں نجات کا ذریعہ ہے۔

فقیہ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد کہ رفع یدین عمل کثیر ہے اور عمل کثیر سے نماز ٹوٹ جاتی ہے لہٰذا حنفی کی نماز شافعی امام کے پیچھے نہیں ہوتی تو یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ عمل کثیر اس وقت مفسد صلوٰۃ (نماز توڑنے والا) ہے جب عامل کے اعتقاد میں رکن یا مستحب نہ ہو ورنہ عیدین میں بھی رفع یدین عمل کثیر ہے لیکن چونکہ یہ اعتقاد میں شامل ہے کہ نماز کا حصہ ہے اس لئے اس سے نماز نہیں ٹوٹی۔ شافعی امام کے پیچھے حنفی نماز پڑھ سکتا ہے کیونکہ رفع یدین شافعیوں کے نزدیک سنت ہے اور عبادت کا حصہ ہے۔

پھر وہ عمل کثیر نماز کو توڑنے کا سبب بنتا ہے جو نماز میں مشروع نہ ہو کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جس نے سبحان اللہ کہا یا ایک زائد رکوع کر دیا یا زائد قعدہ بیٹھا تو اس کی نماز نہیں ٹوٹی۔ رفع یدین بھی مشروع عمل ہے جیسے عید کی تکبیرات اور قنوت کی تکبیر کے وقت رفع یدین کیا جاتا ہے تو جب رفع یدین اپنی جگہ سے ہٹ کر ہوگا تو قعدہ اور رکوع کی طرح یہ مفسد نماز نہیں ہوگا یہ قول فتح القدیر میں وارد ہوا ہے' عمل کثیر وہ ہے کہ اگر کوئی دیکھے تو خیال کرے کہ یہ شخص نماز میں نہیں جبکہ رفع یدین کرنے والا ایسا عمل نہیں کر رہا ہوتا کہ دیکھنے والا یہ گمان کرے کہ وہ نماز نہیں پڑھ رہا پھر رفع یدین شافعیوں کے نزدیک کوئی حتمی عمل بھی نہیں۔ اگر کوئی شافعی رفع یدین کئے بغیر بھی نماز پڑھے گا تو شافعی کے نزدیک اس کی نماز ہو جائے گی۔ اگر رفع یدین کئے بغیر کوئی شافعی حنفی کو نماز پڑھاتا ہے تو مذکورہ وجہ سے اقتداء صحیح ہوگی اور مطلقاً اقتداء کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

دوسرے مذہب والے امام کی اقتداء کے لئے ہم یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ حنفی مقتدی کے نزدیک امام باوضو ہو اور مقتدی کے علم میں کوئی ایسا عارضہ لاحق نہ ہو جس سے امام کا وضو حنفی کے نظریے کے مطابق ٹوٹ گیا ہو مثلاً شافعی امام کے نزدیک خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو حنفی کو یہ علم نہیں ہونا چاہئے کہ امام کا خون نکلا اور اپنے اعتقاد کے مطابق اس نے وضو نہیں کیا کیونکہ عدم علم عدم وقوع کے قائم مقام ہے اس لئے حنفی کی شافعی امام کے پیچھے نماز ہو جائے گی۔

اگر شافعی امام نے کسی عورت کو ہاتھ لگایا یا اپنے ذکر کو چھوا اور وضو نہیں کیا اس نے اسی صورت میں نماز پڑھی اور حنفی نے اس کی اقتداء کی تو میرے نزدیک زیادہ مناسب یہ ہے کہ حنفی نماز کا اعادہ کرے اگرچہ علماء صحت نماز کا فتویٰ دیتے ہیں کیونکہ امام کے اعتقاد کے مطابق نماز کا شروع کرنا ہی صحیح نہیں سو امام کی نیت میں خلل واقع ہوا بلکہ بلا طہارت نماز پڑھنے کی وجہ سے اس پر کفر کا خوف ہے۔ ہاں اگر اس نے بطور تبرک امام ابوحنیفہ کی اقتداء کی نیت سے نماز پڑھائی یا اپنے کسی مجتہد عالم کے قول سے تبرک کی نیت سے نماز پڑھائی تو نماز ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں حنفی کی نماز صحیح ہو جائے گی اور اس کی نیت میں کسی قسم کا فطور کا اندیشہ نہیں رہے گا۔

اب رہی یہ بات کہ اپنے امام کی تقلید چھوڑنا جائز ہے یا نہیں تو یہ ایک الگ بحث ہے۔

مقتدی کسی بھی رکن میں امام سے پہل نہ کرے

مقتدی کے لئے ضروری ہے کہ کسی رکن میں امام سے پہل نہ کرے اگر کسی رکن میں امام سے پہل کی تو اس کا

وہ رکن شمار نہیں ہوگا اب اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رکن امام کے ساتھ بھی ادا کرے۔[1]

اگر اس نے کسی رکن کی ادائیگی میں پہل کی اور پھر امام کے ساتھ اس کا اعادہ نہ کیا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

عن ابی موسی الاشعری ان رسول الله صلی الله علیه وسلم فطبنا فبین لنا سننا وعلمنا صلوتنا وقال اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قرء فانصتوا واذا قال غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ. فقولوا آمین یجیبکم الله فاذا کبر ورکع فکبروا وارکعوا فان الامام یرکع قبلکم ویرفع قبلکم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم تلک بتلک واذا قال سمع الله لمن حمده فقولوا اللهم ربنا ولک الحمد یسمع الله لکم قال الله تعالی علی لسان نبیه صلی الله علیه وسلم سمع الله لمن حمده واذ اکبر وسجد فکبروا واسجدوا فان الامام یسجد قبلکم ویرفع قبلکم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم فتلک بتلک و اذا کان عند القعدة فلیکن من اوّل قولکم التحیات لله الی آخر التشهد (رواہ مسلم)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے خطاب فرمایا سنتوں کو بیان کیا اور ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا اور فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو صفیں درست کرو پھر تم میں سے ایک آدمی امامت کرائے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو۔ جب وہ قرأت کرے تو خاموش رہو۔ جب وہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کہے تو آمین کہو۔ اللہ تعالیٰ تم کو جواب دے گا۔ جب امام تکبیر کہے اور رکوع کرے تو تم بھی تکبیر کہو اور رکوع کرو کیونکہ امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے رکوع سے اٹھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو دونوں کے افعال برابر ہو جائیں گے اور جب امام سمع الله لمن حمده کہے تو تم اللهم ربنا ولک الحمد کہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری (التجا) سنے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی زبان سے فرمایا ہے۔ سمع الله لمن حمده۔ جب امام تکبیر کہے اور سجدہ کرے تو تم بھی تکبیر کرو اور سجدہ کرو۔ کیونکہ امام تم سے پہلے سجدہ کرتا ہے اور تم میں سے پہلے سر اٹھاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دونوں کے افعال برابر ہو جائیں گے جب امام قعدہ میں بیٹھے تو تم سب سے پہلے التحیات لله...... الخ پڑھو۔

امام مسلم کی ہی ایک روایت ہے۔

عن ابی هریرة لاتبادر والامام اذا کبر فکبروا.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ جلدی نہ کرو امام جب تکبیر کہے تو تکبیر کہو...... الخ۔

[1] مثلاً امام سے پہلے دوسرا سجدہ کر دیا اور ابھی تک امام پہلے سجدہ کے بعد والے قعدہ میں تھا کہ مقتدی نے سجدہ سے سر اٹھالیا۔ امام نے اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کیا۔ مقتدی اگرچہ دوسرا سجدہ امام سے پہلے کر چکا ہے لیکن اسے امام کے ساتھ سجدہ کرنا پڑے گا اور اس کا اکیلا سجدہ شمار نہیں ہوگا۔

عـنـه روی الشیـخـان انـما جعل الامام لیـوتم به فلا تختلفوا عنه فاذا رکع فارکعوا واذا قـال سـمـع الـله لمن حمده فقولوا ربنا لک الـحـمـد واذا سـجـد فـاسجدوا واذا صـلـى جـالسـا فـصـلـوا جلوسا اجمعون واقيـمـوا الـصـفوف فی الـصلوة فـان اقامة الصفوف من حسن الصلوة.

شیخین حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ اس کی اقتداء سے ہٹ کر کوئی عمل نہ کرو۔ جب وہ رکوع کرے تو رکوع کرو۔ جب وہ سمع الله لمن حمده کہے تو ربـنـا لک الـحـمـد کہو۔ جب وہ سجدہ کرے تو سجدہ کرو۔ جب بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو اور نماز میں صفوں کو درست رکھو کیونکہ صفوں کا درست کرنا نماز کا حسن ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الـلـه عليه وسلم انا نخشى الذی یرفع رأسه قبل الامـام ان یـحـول الـلـه رأسـه حـمـارا.
(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں اس شخص کے سر کو اللہ تعالیٰ گدھے کا سر نہ بنا دے جو امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے۔

یہ احادیث مبارکہ اقتداء کے اجمال کا بیان ہیں جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ امام سے پہلے کئے جانے والا رکوع و سجود معتبر نہیں ہوگا اور مقتدی کو اس رکن کا امام کے ساتھ اعادہ کرنا پڑے گا۔

اگر مقتدی امام سے پہلے رکوع کرے گا تو گناہ گار ہوگا جیسا کہ نص سے ثابت ہے۔ اگر امام نے رکوع میں مقتدی کو پالیا تو مقتدی کا رکوع شمار ہوگا کیونکہ اس میں امام اور مقتدی دونوں شریک ہو گئے اگر مقتدی نے پہلے سر اٹھالیا اور امام اسے رکوع میں نہ مل سکا تو عدم مشارکت کی وجہ سے مقتدی کا رکوع نہیں ہوا۔ اگر اس نے دوبارہ امام کے ساتھ رکوع کرلیا یا امام کے رکوع کے بعد اسے ادا کرلیا تو نماز صحیح ہو جائے گی ورنہ فاسد ٹھہرے گی۔

امام زفر فرماتے ہیں اگر امام سے پہلے مقتدی نے سجدہ کر دیا اور امام اس کے ساتھ سجدہ میں مل گیا تو بھی مقتدی کا یہ سجدہ نہیں ہوگا۔ اگر امام کے ساتھ دوبارہ سجدہ کیا تو چونکہ دوسرے سجدے کی بنیاد فاسد سجدہ پر ہے اس لئے دوسرا سجدہ بھی صحیح نہیں ہوگا ہم کہتے ہیں کہ مقتدی نے جو سجدہ امام سے پہلے کیا وہ شمار نہیں ہوگا اور وہ رکوع جس میں امام نے اسے پالیا وہ معتبر ہوگا۔

اگر کسی حنفی نے شافعی کی اقتداء کی' صبح کی نماز تھی۔ امام نے نماز میں دعائے قنوت پڑھی (شوافع کے نزدیک فرض ہے) تو مقتدی دعائے قنوت نہیں پڑھے گا بلکہ خاموشی سے کھڑا رہے گا اور جب امام سجدہ کرے گا تو مقتدی امام کے ساتھ سجدہ کرے گا کیونکہ نماز کے ارکان' سنن اور دوسرے مشروعات میں امام کی اقتداء ضروری ہے لیکن بدعت میں نہیں اور صبح کی نماز میں مقتدی کے نزدیک دعائے قنوت بدعت ہے اس لئے وہ دعائے قنوت میں اتباع نہیں کرے گا اور خاموش کھڑا ہونے کی وجہ قیام میں اتباع ہے جو نماز کا مقتدی کے نزدیک بھی رکن ہے اور رکوع اور

سجود کے درمیان کھڑا ہونا بھی مشروع ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قیام لمبا ہو گیا ہے اور ابھی تک نماز کے دوسرے ارکان کی ادائیگی باقی ہے اس لئے اتباع ضروری ہے۔

جب وتروں کی نماز میں حنفی، شافعی کی اقتداء کرے

اگر وتروں کی نماز میں حنفی نے شافعی کی اقتداء کی تو دعائے قنوت میں امام کی اقتداء کرے اور رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھے کیونکہ دعائے قنوت کا رکوع کے بعد پڑھنا اجتہادی امر ہے اور اس کا استنباط شرعی طریقہ پر ہے اور امام کی اتباع حتمی امر ہے اس لئے یہاں امام کی اتباع ضروری ہے۔

اگر شافعی وتر کی دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دے تو کیا حنفی کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ تو اس بارے شیخ ابو بکر رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقتدی کی نماز ہو جائے گی اور یہی مختار مذہب ہے کیونکہ امام کا سلام مقتدی کی نماز کو ختم کرنے والا نہیں کیونکہ اس کا سلام اگرچہ نماز کو ختم کرنے کے لئے ہے لیکن مقتدی کے نزدیک دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرنا سلام کا محل نہیں۔ امام اپنے نظریے کے مطابق عمل مشروع کو سرانجام دے رہا ہے تو یہ سلام مقتدی کے حق میں دو رکعتوں کے بعد سلام کی طرح ہو گا جس میں نمازی تیسری رکعت کو بھول جاتا ہے لیکن یاد آنے پر کھڑا ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا سلام نماز کو ختم کرنے کی نیت سے ہوتا ہے اس لئے یہاں بھی یہ شرط ضروری ہے کہ امام کے سلام کے بعد مقتدی نے کوئی ایسا عمل نہ کیا ہو جو نماز کے منافی ہو۔

مسبوق اور لاحق کا بیان

مسبوق کی تعریف اور اس کا جماعت میں شامل ہونے کا طریقہ

مسبوق وہ ہے جس کی پہلی ایک رکعت یا اس سے زائد رکعتیں رہتی ہوں اور وہ امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہو۔

نمازی آیا اور اس نے دیکھا کہ جماعت ہو رہی ہے اور امام نماز کا کچھ حصہ پڑھ چکا ہے تو اس کے لئے جماعت میں شریک ہونا جائز ہے۔ اب وہ امام کے ساتھ جتنی نماز پائے گا پڑھے گا اور جو رہ جائے گی اسے امام کے سلام پھیرنے کے بعد اٹھ کر پوری کرے گا۔ یہی سنت طریقہ ہے۔

عن المغيرة انه تخلف رسول الله صلى الله عليه وسلم وتخلفت فذكر طهارته ووضوءه ثم ركب وركبت فانتهينا الى القوم وقدقاموا الى الصلوة يصلى بهم عبد الرحمن بن عوف وقد ركع بهم ركعة فلما احس النبى صلى الله عليه وسلم ذهب يتاخر فاومى اليه فصلى بهم فلما سلم قام

حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (لشکر سے) پیچھے رہ گئے اور میں بھی (لشکر سے) پیچھے رہ گیا۔ آپ ﷺ نے اپنی طہارت اور وضو کا ذکر فرمایا: پھر آپ ﷺ سوار ہو گئے۔ میں بھی سوار ہو گیا اور ہم لوگوں کو جا ملے۔ لوگ نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں نماز پڑھا رہے تھے، حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رکعت پڑھا چکے

النبی صلی الله علیه وسلم وقمت فرکعنا الرکعة التی سبقتنا. (رواہ الشیخان)

تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی آمد محسوس کر کے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ حضور ﷺ نے اشارہ فرمایا (کہ پیچھے نہ ہٹو اور امامت کراؤ) حضرت عبد الرحمٰن نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب سلام پھیرا تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو گئے اور میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جو رکعت انہوں نے ہم سے پہلے پڑھ لی تھی وہ رکعت پڑھی۔

شیخین علیہما الرحمہ روایت کرتے ہیں کہ:

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اذا ادرکتم فصلوا وما فاتکم فاتموا.

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم جو پاؤ اسے پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے مکمل کرلو۔

رکوع کو پانے والا رکعت کو پانے والا ہے

اگر مقتدی امام کو رکوع میں پالے تو اس کی وہ رکعت مکمل سمجھی جائے گی اور وہ شخص مسبوق نہیں ہوگا۔ اگر سجدہ میں جا کر ملا تو یہ رکعت رہ گئی وہ جماعت میں شامل ہو جائے اور یہ رکعت امام کے سلام کے بعد مکمل کرے اسی طرح اگر قعدہ میں ملا تو وہ بہر تقدیر نماز کی فضیلت کو پالینے والا شمار ہوگا۔

عنه من ادرک الرکوع فقد ادرک الصلوة کلها. (رواہ البخاری و مسلم)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہی سے روایت کرتے ہیں۔ جس نے رکوع کو پالیا اس نے پوری نماز کو پالیا۔

مسبوق جو نماز امام کے ساتھ پڑھ رہا ہے اس میں یہ مقتدی ہے اور جو رہ گئی ہے اس میں منفرد ہے یہ قاعدہ کلیہ[1] ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن امیر المؤمنین علی رضی الله عنه ومعاذ قالا قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا اتی احدکم الصلوة والامام علی حال فلیصنع کما صنع الامام. (رواہ الترمذی)

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھنے آئے اور امام نماز پڑھا رہا ہو تو جس طرح امام کر رہا ہے وہ بھی اسی طرح کرے۔

یہ حدیث اس حکم کے بارے نص ہے کہ مسبوق پر امام کی اتباع فرض ہے اور مذکورہ حدیث (اما ادرکم) جو تم پالو سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ جو نماز اس نے پالی ہے اس میں امام کی متابعت لازم ہے اور جو رہ گئی ہے اس پر اس کا پورا کرنا فرض ہے۔ بقیہ نماز میں وہ امام کی اقتداء میں نہیں جیسا کہ حدیث پاک سے ثابت ہے۔ مسبوق کی نماز مجمل ہے اور یہ تمام روایات اس اجمال کا بیان ہیں اس لئے مسبوق کی نماز کی ادائیگی کے لئے اقتداء شرط ہے اور جو رہ گئی ہے اس میں وہ منفرد ہے اور اس میں اقتداء جائز نہیں اگر مسبوق اپنے امام کی اقتداء نہیں کرے گا یا منفرد

---

[1] یعنی جب وہ امام کے ساتھ ہے تو اس پر مقتدی کے تمام احکام لاگو ہوں گے مثلاً امام اس کی نماز کا ضامن ہے اسے خلیفہ بنا کر مصلیٰ امامت اس کے سپرد کر سکتا ہے اور جب وہ منفرد ہے تو اس پر تمام احکام منفرد کے لاگو ہوں گے۔

ہونے کی صورت میں اقتداء کرے گا تو نماز نہیں ہوگی۔ اس کو بنیاد بنا کر کئی مسائل کا استخراج ہوتا ہے جیسے مسبوق بقیہ نماز کو پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا اور امام کو یاد آ گیا کہ اس کے ذمہ سجدۂ تلاوت ہے۔ وہ فوراً سجدۂ تلاوت کرتا ہے تو مسبوق پر لازم ہے کہ وہ بیٹھ کر اس سجدہ میں اقتداء کرے جب تک مسبوق نے پڑھی جانے والی رکعت کا سجدہ نہیں کیا۔ مسبوق پر ایسی صورت میں امام کی اقتداء لازم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امام نے سجدۂ تلاوت کر کے آخری قعدہ باطل کر دیا اس لئے مسبوق ابھی تک امام کی اقتداء میں ہے کیونکہ امام کی نماز باقی ہے اور اگر مسبوق نے رکعت کو سجدہ سے مقید کر دیا تو پھر قعدۂ آخیرہ کو باطل کرنے کا محل گزر چکا ہے۔ لہٰذا ایک روایت کے مطابق مقتدی کی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ محل اقتداء میں اس نے امام کی اقتداء نہیں کی یہی نظریہ زیادہ صحیح ہے اگر اس نے رکعت کو مقید کر دیا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ اب وہ آخری قعدہ کو باطل نہیں کر سکتا اس لئے محل اقتداء میں وہ منفرد ہوا۔

اگر سلام پھیرنے اور مسبوق کے کھڑا ہونے کے بعد امام کو یاد آیا کہ اس نے کسی رکعت میں صرف ایک سجدہ کیا اور دوسرا سجدہ اس کے ذمے واجب الاداء ہے اور امام نے سجدہ کر دیا تو مسبوق پر لازم ہے کہ رکعت کو چھوڑ کر امام کی اقتداء کرے بشرطیکہ اس نے اس رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو کیونکہ امام نے سجدہ جو اس کے ذمہ تھا کر کے آخری قعدہ کو باطل کر دیا ہے۔ اگر مسبوق اپنی نماز پڑھتا رہا تو محل اقتداء میں انفرادیت لازم آئے گی۔ اب چونکہ وہ رکعت کو چھوڑ کر امام کی اقتداء کر سکتا ہے اس لئے امام کی اقتداء کرے۔ اگر اس نے رکعت کو سجدہ سے مقید کر دیا اور ادھر امام نے سجدہ کر دیا جو اس کے ذمہ تھا تو مسبوق کی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ محل اقتداء میں اس نے امام کی اقتداء نہیں کی اور رکعت کو سجدہ سے مقید کر کے اب وہ واپس آ کر امام کی اقتداء بھی نہیں کر سکتا اس لئے دوبارہ نماز پڑھے۔

مسبوق امام کے سلام پھیرنے سے قبل کھڑا نہ ہو

مسبوق امام کے سلام سے پہلے کھڑا نہ ہو اور اس وقت تک بیٹھا رہے جب تک سجدۂ سہو کا احتمال ہے کیونکہ ہو سکتا ہے امام سجدۂ سہو کرنا چاہتا ہو اور ایسی صورت میں مسبوق پر اقتداء ضروری ہے۔ لہٰذا جب تک سجدۂ سہو کا احتمال ہے کھڑا نہ ہو۔ شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ سلام کے بعد تھوڑی دیر کے لئے مسبوق اس امام کے پیچھے ٹھہرے گا جس کی رائے میں سجدۂ سہو سلام کے بعد ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ شرط اس جگہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جن لوگوں کے نزدیک سجدۂ سہو سلام سے پہلے ہے وہ اسے واجب نہیں سمجھتے اس لئے سجدہ کا احتمال سلام کے بعد باقی ہے۔ مسبوق کا کھڑا ہونا جائز نہیں کیونکہ سلام تک ہر جگہ امام کی اقتداء ضروری ہے۔

اگر مسبوق معذور ہو

اگر مسبوق مسح کرنے والا ہے اور اس کو اندیشہ ہے کہ اگر امام کی اقتداء میں رہا تو مسح علی الخفین کی مدت گزر جائے گی یا جمعہ، عیدین اور فجر کی نماز میں یہ خوف ہے کہ نماز کا وقت ختم ہو جائے گا یا مسبوق کو خطرہ ہے کہ وضو ٹوٹ جائے گا یا اندیشہ ہے کہ سامنے سے لوگ گزریں گے تو یہ وہ عذر ہیں جن کی وجہ سے وہ بقیہ نماز کے لئے امام کے

سلام پھیرنے سے پہلے کھڑا ہوسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اسے یہ یقین ہو کہ امام نے تشہد پڑھ لیا ہوگا۔

اگر مسبوق تشہد کی مقدار بیٹھنے کے بعد کھڑا ہو جائے اور کسی قسم کا عذر بھی نہ ہو تو اس کی نماز ہو جائے گی کیونکہ امام تمام ارکان ادا کر چکا ہے اس لئے ایسی صورت میں اس پر اقتداء فرض نہیں ہے۔ ہاں ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ امام کی اقتداء جو واجب تھی اس نے اسے ترک کر دیا۔

اگر مسبوق تشہد کی مقدار بیٹھنے سے قبل کھڑا ہو گیا

اگر مسبوق قدر تشہد سے پہلے کھڑا ہو گیا تو اس پر لوٹنا ضروری ہے۔ اگر واپس نہ آیا اور امام کے فارغ ہونے کے بعد اتنی قرأت کر لی جس سے نماز صحیح ہو جاتی ہے تو اس کی نماز ہو جائے گی ورنہ فاسد ہو جائے گی کیونکہ وہ قدر تشہد سے پہلے منفرد ہو گیا۔ سو اس کی قرأت لغو ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ منفرد قرار پائے گا۔ اگر قرأت پائی گئی تو نماز ہو گی ورنہ فاسد ہو جائے گی اور ہر حال میں متابعت کو ترک کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہوگا۔ فتح القدیر میں ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب مسبوق کی ایک یا دو رکعتیں رہتی ہوں۔ اگر تین رکعتیں باقی ہوں تو پھر جائز ہے۔

اگر چہ امام کے قدر تشہد سے فراغت کے بعد اس نے کچھ نہ پڑھا کیونکہ اصل چیز ہے اس رکعت میں قرأت کا نہ پایا جانا جو لازم ہے۔ اگر اس کے علاوہ دو اور رکعتیں ہیں تو وہ قرأت دوسری دو رکعتوں میں کر دے گا اور قرأت صرف دو رکعتوں میں فرض ہے اس لئے اس کی نماز ہو جائے گی۔

اگر مسبوق کی تین رکعتیں باقی ہوں

مسبوق نماز کی پہلی رکعتیں پڑھتا ہے جبکہ قعدہ آخری ہوتا ہے کیونکہ امام آخری رکعتیں دو یا ایک پڑھ رہا تھا اور اس کا قعدہ آخری تھا کیونکہ آخری قعدہ تمام ارکان کے بعد آتا ہے۔ اب مسبوق کھڑا ہو کر پہلی دو یا تین رکعتیں پڑھے گا۔ پہلی دو رکعتوں میں قرأت مفروضہ کرے گا کیونکہ امام کے ساتھ اس نے قرأت نافلہ پائی ہے لیکن قعدہ آخری کی اب باری ہے جبکہ وہ تمام ارکان ادا کر چکا ہے۔

اگر مسبوق کی تین رکعتیں باقی ہیں تو کھڑا ہو ایک رکعت سورت فاتحہ اور کسی اور سورت کو ساتھ ملا کر پڑھے اور بیٹھ جائے پھر تشہد کے بعد کھڑا ہو اور اس رکعت میں بھی فاتحہ اور سورت پڑھے آخری رکعت میں صرف سورت فاتحہ پڑھے اور یوں نماز مکمل کر کے سلام پھیر دے۔ اگر دو رکعتوں کے بعد بھی بیٹھ گیا تو جائز ہے کیونکہ پہلے قعدہ میں وسعت ہے لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے۔

اگر امام نے دوسری دو رکعتوں میں قرأت کی ہو اور پہلی دو رکعتوں میں قرأت چھوڑ دی ہو تو مقتدی اپنی رکعتوں میں قرأت کرے گا کیونکہ امام نے پہلی دو رکعتوں کی قرأت دوسری دو رکعتوں میں کی اور مسبوق پہلی رکعتوں میں مقتدی نہیں تھا۔

مسبوق اگر بقیہ نماز میں بھولے گا تو سجدۂ سہو کرے گا کیونکہ اب وہ منفرد ہے۔ اگر امام بھول گیا تو مسبوق پر سجدہ واجب نہیں ہوگا کیونکہ وہ مقتدی ہے۔

مسبوق کے متعلق دیگر مسائل

مسبوق بقیہ نماز میں منفرد ہے سوائے چار مسائل کے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ مسبوق کے پیچھے کوئی اور آدمی نماز نہیں پڑھ سکتا جبکہ منفرد کے پیچھے دوسرا آدمی نماز پڑھ سکتا ہے کیونکہ مسبوق کی تکبیر تحریمہ منفرد کی تکبیہ تحریمہ کے ساتھ ملی ہوئی ہے لیکن منفرد کی تکبیر تحریمہ کسی امام کے ساتھ ملی ہوئی نہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر مسبوق نئی نماز کی نیت سے اللہ اکبر کہے تو اس کی پہلی نماز ختم ہو جائے گی جبکہ منفرد کی پہلی نماز ختم نہیں ہوتی کیونکہ اس کی تکبیر کی بنیاد امام کی تکبیر پر ہے اس لئے اس کا التزام ضروری ہے جب استیناف کی نیت سے تکبیر کہے گا تو یہ التزام باطل ہو جائے گا۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مسبوق کھڑا ہوا تو امام نے سجدۂ سہو کر دیا جو اس کے ذمے لازم تھا۔ مسبوق نے جب تک سجدہ نہیں کیا امام کے ساتھ آ کر ملنا اور سجدۂ سہو کرنا ضروری ہے جبکہ منفرد ایسی کسی بات کا پابند نہیں کیونکہ ایسی صورت میں متابعت واجب ہے اور اس کا امکان بھی ہے۔ اگر مسبوق نے رکعت پڑھ کر اس کا سجدہ بھی کر دیا تو اب امام کی طرف نہ لوٹے اور نماز مکمل کر کے سجدہ کرے کیونکہ دو سجدے اس کے ذمہ واجب الاداء تھے۔ اب وہ ان سجدوں کو ممکنہ محل میں ادا کرے جبکہ منفرد کو ایسی صورت پیش نہیں آتی وہ کسی اور کی بھول کی وجہ سے سجدۂ سہو نہیں کرتا۔

چوتھی صورت مسبوق اور منفرد میں فرق کی یہ ہے کہ مسبوق پر تکبیرات تشریق بالاتفاق واجب ہیں کیونکہ وہ تکبیر تحریمہ میں امام کا مقتدی ہے سو احتیاطاً اس پر تکبیرات تشریق واجب ہیں لیکن منفرد پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیرات تشریق واجب نہیں۔

اگر مسبوق نے بھول کر امام کے ساتھ سلام پھیر دیا تو اس پر کوئی سجدہ نہیں۔ اگر امام کے بعد سلام پھیرا تو سجدۂ سہو واجب ہے۔

اگر بھول کر سلام پھیرا اور تکبیر تشریق بھی کہہ دی یا لبیک کہا تو دوسری صورت میں نماز ٹوٹ جائے گی لیکن پہلی صورت میں نماز نہیں ٹوٹے گی (اس کی وجہ ظاہر ہے)۔

لاحق کی تعریف اور اس کے احکام

لاحق وہ شخص ہے جس نے پہلی نماز امام کے ساتھ پالی ہو اور آخری نماز امام کے ساتھ نہ پڑھ سکا ہو۔ یا درمیانی نماز حدث لاحق ہونے یا کسی اور عارضہ کے لاحق ہونے سے رہ گئی ہو مثلاً دورانِ نماز کوئی سو گیا یا بھیڑ اتنی تھی کہ کچھ ارکان کو ادا ہی نہیں کر سکا اور کھڑا ہو گیا تو وہ حکماً مقتدی ہے کیونکہ اس نے پوری نماز کی ادائیگی کا التزام کیا۔ لہٰذا یہ التزام اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اس کی تکبیر تحریمہ باقی رہے گی۔ اس پر واجب ہے کہ جو پہلے نماز رہ گئی ہے اسے ادا کرے اور پھر امام کے ساتھ شریک ہو۔ اگر امام کے ساتھ شریک ہو گیا پھر بقیہ نماز پڑھی تو بھی جائز ہے لیکن گناہ گار ہو گا کیونکہ رکعتوں میں ترتیب واجب ہے' فرض نہیں۔ اس میں امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اختلاف فرماتے ہیں۔ اگر امام پر سجدۂ سہو لازم تھا تو مقتدی سجدۂ سہو کرے لیکن خود بھولے تو سجدۂ سہو نہ کرے کیونکہ

وہ مقتدی ہے۔ لاحق بقیہ نماز میں قرأت نہیں کرے گا بلکہ اتنی مقدار کھڑا رہے گا پھر رکوع کرے گا اور سجدہ کرے گا کیونکہ وہ مقتدی ہے اور اس کے لئے امام کی قرأت کافی ہے۔ اگر قرأت کی مقدار سے زائد کھڑا رہا یا کم کھڑا ہوا تو بھی جائز ہے کیونکہ بالکل برابری تو محال ہے۔ صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اگر امام نے پہلا قعدہ بھول کر ترک کر دیا تو لاحق اس قعدہ کو پورا نہ کرے کیونکہ وہ اس کے ازالہ کے لئے آخر میں سجدہ کرے گا اور سجدہ اس کمی کو پورا کرسکتا ہے۔

لاحق باقی ماندہ نماز کو گویا قضاء پڑھ رہا ہے کیونکہ اس کا اصل وقت وہ تھا جس میں امام نے نماز مکمل کی اور اس وقت سے یہ نماز مؤخر ہوگئی ہے۔ اگرچہ نفس نماز کا وقت اب بھی ہے۔

اگر مسافر ہے تو اس کے فرضوں میں تبدیلی نہیں آئے گی اگرچہ اس نے پندرہ دن ٹھرنے کی نیت کر لی ہو۔

جن باتوں میں مسبوق' لاحق سے مختلف ہے

چھ چیزوں میں مسبوق لاحق سے مختلف ہے۔

عورت کے برابر کھڑا ہونے میں' بھولنے میں' پہلے قعدہ میں جب امام اسے ترک کر دے' سلام کے وقت امام کے قہقہہ میں آخری صورت میں لاحق کی نماز فاسد نہیں ہوتی کیونکہ یہ قہقہہ نماز کے آخر میں لگایا گیا ہے جبکہ مسبوق کی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ امام نے نماز کے دوران قہقہہ لگایا ہے۔ امام کی اقامت کی نیت میں مسبوق اور لاحق مختلف ہیں جبکہ مسبوق بقیہ نماز کی رکعت کا سجدہ کر دے۔

ایسا شخص جو مسبوق بھی ہے اور لاحق بھی ہے کہ امام کے ساتھ شریک ہونے کے بعد اس کی کچھ نماز رہ گئی ہے تو پہلے وہ بقیہ نماز پڑھے جو امام کو پانے سے پہلے رہ گئی ہے اور پھر وہ نماز پڑھے جو امام کے ساتھ ملنے کے بعد کسی وجہ سے رہ گئی ہے۔ دوسری نماز میں وہ لاحق ہے اور لاحق حکماً مقتدی ہے۔ علماء کی یہی رائے ہے۔ **واللہ اعلم باحکامہ۔**

قضاء نماز کا بیان

قضاء نماز کا وقت

جب کسی شخص کی فرض نماز رہ جائے تو اس پر فرض ہے کہ اسے کسی اور وقت میں ادا کرے تا کہ وہ اس فریضہ سے سبکدوش ہو جائے۔

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا رقد احدکم عن الصلوۃ اوغفل عنہا فلیصلہا اذا ذکرھا فان اللہ عزوجل یقول اقم الصلوۃ لذکری۔

حضرت سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی سویا رہے اور اس کی نماز رہ جائے یا اس سے غافل رہے (یعنی یاد نہ آئے یا وقت کا پتہ نہ چل سکے) تو جب اسے یاد آئے تو وہ نماز پڑھ

لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ: میری یاد کی خاطر نماز قائم کرو۔

یہ ضروری نہیں کہ جس وقت یاد آئے فوراً نماز پڑھے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی ایسے وقت میں فوت شدہ نماز کو ادا کرے جو مکروہ نہ ہو کیونکہ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ قضاء واجب ہے اور اس کے وقت میں وسعت ہے۔ اصل مطلب یہ ہے کہ جو نماز رہ جائے اس کا قضاء کرنا فرض ہے اور یہ بعید از قیاس نہیں کہ حدیث میں اِذَا[1] کا کلمہ اِنْ کے معنی میں ہو اور صرف شرط کا فائدہ دے۔ یہ حدیث نماز کی قضاء کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے یا نماز کی قضاء کا وجوب اجماع سے ثابت ہے۔ بہر حال نماز کی قضاء کے فرض ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں لیکن نماز میں جان بوجھ کر تاخیر کرنا اور اصل وقت میں نہ پڑھنا گناہ ہے اور اس میں اس قضاء کے بعد بھی توبہ ضروری ہے۔

فوت شدہ نماز اور وقتی نماز میں ترتیب ضروری ہے اسی طرح فوت شدہ نمازیں اگر ایک سے زائد ہوں تو ان کے درمیان ترتیب کا لحاظ بھی ضروری ہے جیسا کہ دارقطنی اور بیہقی علیہما الرحمہ نے بیان کیا ہے۔

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من نسی صلوة فلم یذکرها الا وهو مع الامام فلیتم صلوته فاذا فرغ من صلوته فلیعد الذی صلاها مع الامام.

جناب ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو نماز پڑھنا بھول گیا اور اسے یاد نہ رہا مگر جب امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا تو اپنی نماز مکمل کرے اور جب اس سے فارغ ہو تو جو نماز امام کے ساتھ پڑھی ہے اس کا اعادہ کرے۔

اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موقوفاً بیان کیا ہے (یعنی سند حضرت ابن عمر پر ختم ہو جاتی ہے اور اس کی نسبت وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف نہیں کرتے۔) امام دارقطنی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں بلکہ ان کے نزدیک اس کو مرفوع کہنا بعض راویوں کی طرف سے غلطی ہے۔

شیخ ابن ھمام علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اسے مرفوع بیان کرنا راویوں کی طرف سے زیادتی ہے اور ثقہ راویوں کی طرف سے حدیث میں ایسی زیادتی قابل قبول ہوتی ہے جیسا کہ اصول کی کتابوں سے ظاہر ہے۔ اس مسئلہ کو فتح القدیر میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اس حدیث سے اس لئے استدلال کیا گیا ہے کہ اس میں نماز کے ٹوٹنے کی بات کی گئی ہے۔ اس پر صاحب فتح القدیر نے اعتراض کیا ہے کہ ہوسکتا ہے اعادہ کا حکم مکروہ تحریمی کی وجہ سے ہو کیونکہ ترتیب واجب ہے فرض نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ یہ خبر واحد ہے جس سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ اس حدیث سے فوت شدہ نماز کی قضاء کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن یہ شرط نہیں بن سکتی کیونکہ شرط مطلق کو مقید کر دیتی ہے نماز کا حکم مطلق ہے اور خبر واحد سے مطلق کو مقید نہیں بنایا جا سکتا اور یہ بات ہر وہ شخص جانتا ہے جو اصول فقہ کی مبادیات سے بھی واقف ہو۔ صاحب فتح القدیر کی گفتگو کا خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔

[1] لفظ اذا کا معنی جس وقت بھی ہے اور ''اگر'' ہو سکتا ہے۔ اذا جب صرف شرط کا معنی دے گا تو اس کا معنی اگر ہو گا۔

اس کے مقابلہ میں دوسرے لوگ فرماتے ہیں کہ نماز کی قضاء کی کیفیت میں اجمال ہے۔ اس میں کن شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اس اعتبار سے حدیث مجمل ہے اور اس اجمال کی تفسیر درکار ہے۔ حدیث پاک میں نماز کے اعادے کا حکم اس اجمال کی تفسیر ہے کیونکہ خبر واحد مجمل کے لئے تفسیر بن سکتی ہے۔ اسی طرح خبر واحد سے مطلق کی تقید لازم نہیں آ رہی بلکہ اجمال کی تفسیر ہو رہی ہے کیونکہ حکم مطلق نہیں ہے۔

ادائے نماز کے بارے جتنی بھی نصوص ہیں (آیات و احادیث) وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ وقت گزرنے کے بعد نماز انسان کے ذمے واجب الاداء رہتی ہے اور اس فریضہ سے سبکدوش ہونا ضروری رہتا ہے۔ اب چونکہ یہ کمی اس فوت شدہ کی مثل سے پوری ہو سکتی ہے۔ وقت گزرنے کی وجہ سے اصل کو تو لوٹایا نہیں جا سکتا لیکن اس اصل کی مثل پر عمل کر کے اس فریضہ کو ادا کیا جا سکتا ہے جیسا کہ محققین کا خیال ہے کہ قضاء اور ادا میں مثلیت پائی جاتی ہے کیونکہ دونوں میں اتحاد سببی موجود ہے لیکن مثل میں اجمال ہے اس لئے اسے بیان شارع علیہ السلام سے سمجھا جا سکتا ہے اور قضاء نماز کے بارے میں صرف ایک یہی حدیث آئی ہے کیونکہ حضور ﷺ کی چند نمازیں خندق کے دن فوت ہوئیں اور آپ ﷺ نے ان کی قضاء کی اس لئے صرف ایک فعلی حدیث بھی اس اجمال کی تفسیر ہو گی (گویا ایک حدیث اور ایک حدیث فعلی) بس معلوم ہوا کہ وہ مثل جس کے ذریعے سے انسان پہلے فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش ہو سکتا ہے وہ وقتی نماز سے پہلے قضا ہونے والی نماز ہے جس طرح ادا نماز کی صورت میں وہ وقتی نماز سے پہلے ہے۔ اسی طرح ایک سے زائد مرتبہ[1] نمازیں وقتی نماز سے پہلے پڑھی جائیں گی۔ جب مثل صرف اسی فریضہ سے سبکدوش کرنے والی ہے کسی اور سے نہیں تو وقتی نماز سے اگر فوت شدہ نماز پہلے پڑھی جائے گی تو وقتی نماز فاسد ہو جائے گی کیونکہ فوت شدہ نماز سے اس کو پہلے ادا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ فوت شدہ نمازیں بھی جو غیر مرتبہ ہیں۔ یہی علماء کی تقریر کی غرض و غایت ہے۔

ترتیب کا ساقط ہونا

ویسے تو ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے لیکن یہ ترتیب بعض وجوہات کی بناء پر ساقط ہو جاتی ہے۔ جن میں سے ایک وجہ نسیان ہے اور ظاہر ہے جب یاد ہی نہیں رہی تو ترتیب ساقط ہو جائے گی۔ حدیث مبارک میں بھی یہی ہے کہ یاد آنے پر اسے پڑھو وقت کم ہو تو بھی ترتیب ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ دلائل قطعیہ سے ثابت ہے کہ نماز کو وقت سے مؤخر کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اسی لئے یہ ممکن نہیں کہ شارع علیہ السلام نے کسی ایسی ترتیب کی مشروعیت کا حکم دیا ہو جس میں گناہ ہو پھر ظاہر الروایہ نے بھی ہر لحاظ سے وقتی نماز کے وقت کی تنگی کو معتبر ٹھہرایا ہے کہ وقت اتنا کم ہو کہ فوت شدہ نماز کو مکمل کرنے کے بعد وقتی نماز کے لئے وقت نہ رہے۔ امام حسن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں غیر مکروہ وقت کی تنگی کا اعتبار ہے۔ اگر وقت صرف اتنا ہے کہ فوت شدہ نماز کو پڑھنے کے بعد عصر کی نماز مکروہ وقت میں پڑھی جا سکتی ہے تو اس کا اعتبار ہو گا اور تنگی وقت کی وجہ سے ترتیب ساقط ہو جائے گی کیونکہ عصر کی نماز کا مکروہ وقت میں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ مفتی بہ روایت امام حسن رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

---

[1] مسلسل نمازیں جو قضا ہوئیں مثلاً ایک دن کی پوری پانچ نمازیں۔

تیسری چیز جس سے ترتیب ساقط ہو جاتی ہے وہ فوت شدہ نمازوں کی کثرت ہے کیونکہ بہت زیادہ نمازوں اور وقتی نماز کے درمیان ترتیب کو لازمی ٹھہرانا حرج کا باعث ہے ہو سکتا ہے فوت شدہ نمازیں اتنی ہوں کہ انہیں وقتی نماز سے پہلے ادا نہ کیا جا سکتا ہو اس لئے کثرت وقلت کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے' کثرت سے مراد یہ ہے کہ نمازیں چھ ہوں یا اس سے زیادہ ہوں کیونکہ کثرت تکرار سے متحقق ہوتی ہے۔

اگر کسی نے عصر کی نماز پڑھی حالانکہ اسے ظہر کی فوت شدہ نماز یاد تھی تو عصر کی نماز امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فاسد ہو گی اور یہ نماز نفل شمار بھی نہیں ہو گی کیونکہ اس کی تکبیر تحریمہ ہی صحیح نہیں فاسد ہے اور جب تکبیر تحریمہ ہی فاسد ہو تو نماز کیسے ہو گی اسی طرح فرض نماز بھی شمار نہیں ہو گی۔

شیخین کے نزدیک فرض نماز نہیں ہو گی لیکن اسے نفل نماز کا ثواب ملے گا کیونکہ تحریمہ کا فساد فرضوں کے حق میں ہے' نفلوں کے حق میں نہیں اس لئے نفل ہو جائیں گے۔ حدیث مبارک بھی شیخین کے قول کی تائید کرتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہ حکم نہیں دیا کہ نماز ٹوٹ جائے گی جو امام کے ساتھ مقتدی پڑھ چکا ہے اور اسے فوت شدہ نماز یاد آ گئی ہے بلکہ آپ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ نماز کا اعادہ کرے۔ جس سے اشارہ ملتا ہے کہ نفل ہو جائیں گے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ایک موقوف حدیث میں یہ مذکور ہے کہ جب نمازی کوئی نماز بھول جائے اور اسے اس وقت یاد آئے جب وہ امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو تو امام کے سلام کے بعد پہلے فوت شدہ نماز پڑھے اور پھر وہ نماز ادا کرے جو امام کے ساتھ پڑھ چکا ہے۔ اس حدیث میں امام کے ساتھ نماز کو مکمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد اس کے اعادے کا حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کے ساتھ جو نماز پڑھی گئی وہ نفل نماز ہے پھر یہ فساد طرفین کے نزدیک آیت سے ثابت ہے جس سے ہر وہ نماز فاسد ہو جاتی ہے جسے عصر کی فوت شدہ نماز کے یاد ہونے کے باوجود پڑھا گیا۔ تمام نمازیں فاسد ہوتی رہیں گی حتی کہ اس فوت شدہ نماز کو پڑھا نہیں جاتا۔ ایسی صورت میں یہ نماز ہو جائے گی کیونکہ ترتیب کے سقوط کا سبب کثرت ہے اور اس سبب کے بعد ترتیب ساقط ہو جاتی ہے نہ کہ اس سے پہلے اس لئے جو قلیل نمازیں اس نے پڑھیں ان کے صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک فساد موقوف ہے۔ اگر آنے والی نماز سے پہلے فوت شدہ کو قضا نہ کیا تو تمام نمازیں صحیح ہوں گی کیونکہ ترتیب کے سقوط کا سبب چھ نمازوں کا اکٹھا قضا ہونا ہے۔ ان میں سے ہر نماز کو سقوط ترتیب میں دخل ہے لہٰذا کثرت جب تک متحقق نہیں ہو جاتی فوت شدہ نماز سے پہلے پڑھی جانے والی تمام نمازیں ساقط ہوں گی۔ اس چیز کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے اگر کثرت پائی گئی تو ترتیب ساقط ہو جائے گی اور ادا شدہ نمازیں صحیح ہو جائیں گی اگر کثرت نہ پائی گئی تو ترتیب ساقط نہیں ہو گی اور تمام نمازیں (چھ سے کم) فاسد ہو جائیں گی۔

اگر مسجد میں لوگ موجود ہیں اور کسی وجہ سے نہ اذان ہوتی ہے اور نہ اقامت ہوتی ہے اور ان کی نماز بھی قضاء ہو جاتی ہے تو وہ اذان اور اقامت کہیں گے اور نماز ادا کریں گے۔ اگر نماز جہری ہے تو بآواز بلند قرأت کریں گے۔

فجر کی سنتوں کی بھی قضاء ہوگی

اگر ایک سے زائد آدمیوں کی نماز رہ گئی ہے تو بہتر ہے کہ وہ بھی باجماعت قضا کریں۔ اگر فجر کی نماز قضا ہوگئی ہے تو سنتوں کی بھی قضاء کریں۔

عن عمران بن الحصين ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان في ميسر له فنا موا عن صلوة الفجر فاستيقظوا بحر الشمس فارتفعوا قليلا حتى ماستقلت الشمس ثم امر مؤذنا فاذن فصلى ركعتين قبل الفجر ثم اقام ثم صلى الفجر. (رواہ ابوداؤد)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں تھے کہ لوگ سو گئے اور فجر کی نماز فوت ہوگئی۔ سورج کی گرمی سے جاگے پھر سورج کے بلند ہونے کا انتظار کیا حتی کہ سورج خوب چمکنے لگا تو آپ ﷺ نے مؤذن کو حکم دیا۔ اس نے اذان پڑھی آپ ﷺ نے دو سنتیں پڑھیں پھر اقامت کہی اور فجر کی نماز ادا کی۔

اسی حدیث کو شیخین نے بھی روایت کیا ہے۔ دوسری کئی کتب حدیث میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ اس کے طرق کثیر ہیں اور الفاظ مختلف ہیں جو بہت سے صحابہ کرام سے مروی ہیں یہ طویل قصہ صحیحین میں بالتفصیل مذکور ہے۔ اس سے فجر کی سنتوں کی قضاء اور اس کے علاوہ باقی نفلی نمازوں کی عدم قضاء کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ سنتوں کو صرف اس صورت میں قضا کیا جائے گا جب وہ زوال سے پہلے پڑھی جائیں لیکن اس کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں۔

قضاء نمازوں کے لئے ایک اذان ہی کافی ہوگی

اگر فوت شدہ نمازیں زیادہ ہوں تو ایک اذان کافی ہے اقامت ہر نماز کے لئے الگ ہوگی۔

عن ابن مسعود ان المشركين شغلوا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن اربع صلوات يوم الخندق حتى ذهب من الليل ماشاء الله فامر بلا لا فاذن ثم اقام فصلى الظهر ثم اقام فصلى العصر ثم اقام فصلى المغرب ثم اقام فصلى العشاء. (رواہ جامع الترمذی، سنن نسائی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ خندق کے دن مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو چار نمازوں سے مشغول رکھا (یعنی چار نمازیں قضاء ہوگئیں) حتی کہ کافی رات بیت گئی جتنی کہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھی تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا۔ انہوں نے اذان کہی پھر آپ ﷺ نے اقامت کہی، پھر ظہر کی نماز پڑھی پھر اقامت کہی اور عصر کی نماز پڑھی پھر اقامت کہی اور مغرب کی نماز پڑھی پھر اقامت کہی اور آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی۔

اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور مغرب کی سنتوں کو نہیں پڑھا کیونکہ بیان کی جگہ سکوت کسی چیز کے نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ فجر کے علاوہ باقی سنتوں کی قضاء نہیں ہوگی۔

قضاء نمازوں کی جماعت کی صورت

جماعت کی صورت میں جہری نمازوں میں قرأت بلند آواز سے ہوگی۔ اگر اکیلے پڑھی جارہی ہے تو بعض علماء کے نزدیک ضروری ہے کہ قرأت کی جائے اگر چہ نماز جہری ہی کیوں نہ ہو اور صاحب ہدایہ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ بلند آواز سے قرأت جماعت اور وقتی نماز کے ساتھ خاص ہے اور چونکہ یہ دونوں چیزیں نہیں پائی جارہیں اس لئے قرأت آہستہ ہوگی اس کا کمزور ہونا مخفی نہیں اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ اسے اختیار ہے جس طرح ادا کی صورت میں اختیار ہے کہ چاہے تو بلند آواز سے قرأت کرے اور چاہے تو آہستہ قرأت کرے کیونکہ اتحاد سبب کی وجہ سے قضا کی صورت ادا کی سی ہوگی یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور ایک حدیث پاک بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

روی ابن مسعود فی حدیث التعریس قال اقبلنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم زمن الحدیبیة فقال النبی صلی الله علیه وسلم من یکلؤنا فقال بلال انا فناموا حتی طلعت الشمس فاستیقظ النبی صلی الله علیه وسلم فقال افعلوا کما کنتم تفعلون ففعلنا قال کذلک فافعلوا لمن نام او نسی. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حدیبیہ کے دنوں کی بات ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جارہے تھے (کہ ایک جگہ پڑاؤ ہوا) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پہرہ کون دے گا؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی۔ (یا رسول اللہ ﷺ!) پہرہ میں دوں گا۔ سب سو گئے حتیٰ کہ سورج طلوع ہوگیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں بیدار کیا اور فرمایا جیسے کرتے ہو[1] ایسا کرو۔ تو ہم نے کیا (یعنی وضو کر کے نماز پڑھی) آپ ﷺ نے فرمایا جو سو جائے یا بھول جائے وہ ایسا ہی کرے۔

نماز جمعہ کا بیان

جمعۃ المبارک کے دن غسل

جمعہ کے دن غسل کرنے کے بارے اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے جس طرح غسل جنابت واجب ہے۔

عن ابی سعید ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال غسل الجمعة واجب علی کل محتلم. (رواہ البخاری)

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غسل جمعہ ہر بالغ پر واجب ہے۔

وعن ابن عمر من جاء منکم الجمعة فلیغتسل. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جو جمعہ پڑھنے آئے وہ غسل کرے۔

---

[1] یعنی جس طرح پہلے فجر کی نماز پڑھتے ہو ایسے ہی وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرو۔

عن جابر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم على كل رجل مسلم في سبعة ايام غسل يوم وهو يوم الجمعة. (رواہ مالک)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر مسلمان پر سات دنوں میں ایک دن غسل کرنا ضروری ہے اور وہ دن جمعہ مبارک کا ہے۔

ہمارے نزدیک جمعہ کے دن غسل کرنا مستحب ہے۔ اس غسل کو اچھے غسل کا نام دیا گیا ہے۔ بعض مشائخ نے اس کے لئے سنت کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

عن سمرة بن جندب ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من اغتسل يوم الجمعة فبها ونعمت ومن اغتسل فالغسل افضل. (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے جمعہ کے دن وضو کیا تو بہت اچھا' یہ عمل بہتر ہے اور جس نے غسل کیا تو غسل افضل ہے۔

جو لوگ مذکورہ احادیث سے استدلال کرتے ہوئے اسے واجب کہتے ہیں انہیں یہ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے یا یہ حکم علت کے ختم ہونے کی وجہ سے ختم ہو گیا ہے جیسے قرآن کریم کی آیت میں تالیف قلوب کو صدقہ کا استحقاق بتایا گیا ہے لیکن علت کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اب تالیف قلوب کے لئے صدقہ نہیں دیا جا سکتا۔

عن ابن عباس ان ناسا من اهل العراق جاؤا الى ابن عباس فقالوا يا ابن عباس اترى الغسل يوم الجمعة واجبا فقال لا ولكنه طهور وخير لمن اغتسل ومن لم يغتسل فليس عليه بواجب وساخبركم كيف بدء الغسل كان الناس مهودين يلبسون الصوف ويعملون على ظهورهم وكان المسجد ضيقا مقارب السقف انما هو عريش فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم في يوم حار وعرق الناس في ذلك الصوف حتى ثارت فيه رياح حتى اذى بعضهم بعضا فلما وجد عليه السلام تلك لرياح قال يا ايها الناس اذا كان هذا اليوم فاغتسلوا وليمس احدكم مايجدمثل طيبة ووهنة قال ابن عباس ثم جاء الله بالخبر

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت بھی اس رائے کی تائید کرتی ہے کہ عراق کے کچھ لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس آئے اور انہوں نے پوچھا اے ابن عباس کہ کیا آپ جمعہ کے دن غسل کو فرض سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں لیکن جمعہ کے دن غسل کرنا بڑی طہارت ہے جس نے غسل کیا اس کے لئے بہت بھلائی ہے اور جس نے غسل نہ کیا تو اس پر غسل فرض نہیں ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ غسل کی ابتاء کیسے ہوئی؟ لوگ محنت مشقت کرتے تھے' صوف کے کپڑے پہنتے تھے اور اپنی پیٹھوں پر بوجھ اٹھاتے تھے۔ مسجد (نبوی) تنگ تھی چھت بہت نچلی تھی۔ بس وہ ایک چھپر تھا۔ سخت گرمی کا دن تھا حضور ﷺ تشریف لائے تو ان صفوں میں موجود لوگ پسینہ سے شرابور تھے اور بدبو آ رہی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو ایک دوسرے سے تکلیف ہو رہی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے پسینہ کی بو محسوس کی تو فرمایا: اے لوگو! جب جمعہ کا دن ہو

ولبسوا غير الصوف وكفوا العمل ووسع مسجدهم وذهب بعض الذى كان يوذى بعضهم بعضا من العرق. (رواه ابوداؤد)

تو غسل کیا کرو اور خوشبو اور تیل کی طرح (خوشبودار) کوئی چیز موجود ہو تو استعمال کر لیا کرو پھر اللہ تعالیٰ نے بھلائی عطا فرمائی اور لوگوں نے صوف کے علاوہ دوسرے کپڑے پہنے محنت و مشقت بھی نہ رہی، مسجد وسیع ہوگئی اور اب کسی کو کسی کے پسینے کی وجہ سے تکلیف نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مطلب یا تو یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہوگیا ہے کہ غسل کا حکم خاص حالات میں تھا اب وہ حالات نہیں رہے تو علت کے اٹھ جانے سے حکم اٹھ گیا اور یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ یا مقصود یہ ہے کہ غسل کرنا فرض نہیں بلکہ مستحب ہے تاکہ پسینے سے تکلیف نہ ہو بہر تقدیر غسل واجب نہیں رہا بلکہ مستحب ہے۔ سنت مؤکدہ بھی نہیں ہے کیونکہ شیخ ابن الہمام کے بقول حضور ﷺ نے اس پر مواظبت اختیار نہیں فرمائی۔ غسل نماز کے لئے ہے یا اس کے احترام میں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غسل نماز کے لئے مستحب ہے، جمعہ کے روز کے لئے نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو علماء نے اختیار فرمایا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ امام حسن کی روایت کے مطابق غسل جمعہ کے دن کے لئے ہے۔ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا پھر وہ بے وضو ہوگیا اور وضو کر کے اس نے نماز پڑھی پہلی رائے کے مطابق اس کا غسل جمعہ معتبر نہیں اور دوسری رائے کے مطابق اس کا غسل معتبر ہے اور جس شخص پر نماز جمعہ واجب نہیں اس کے لئے پہلی رائے کے مطابق غسل مستحب نہیں اور دوسری رائے کے مطابق غسل مستحب ہے۔

جمعہ کے دن خوشبو لگانا اور نئے کپڑے پہننا مستحب ہے

جس طرح جمعہ کے دن غسل مستحب ہے اسی طرح خوشبو لگانا اور نئے کپڑے (دھلے ہوئے) پہننا بھی مستحب ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ما على احدكم لو اتخذ ثوبين لجمعة سوى مهنة.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا ہی اچھا ہو کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے لئے دو جوڑے کپڑوں کے بنا لے ایک جمعہ کے لئے اور ایک محنت مزدوری کے لئے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک روایت پیش کرتے ہیں۔

عن ابن السباق قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يا معشر المسلمين ان هذا يوم جعله الله عيدا فاغتسلوا ومن كان عنده طيب فلا يضره ان يمس منه وعليكم بالسواك.

حضرت ابن السباق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے گروہ مسلمین! یہ وہ دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عید (خوشی کا دن) بنایا ہے۔ اس دن غسل کرو، جس کے پاس خوشبو ہو تو خوشبو لگانا اسے نقصان نہیں دے گا (یعنی خوشبو لگاؤ) اور مسواک کرو۔

فرضیتِ جمعہ کی شرائط

نماز جمعہ ہر آزاد بالغ مرد پر فرض ہے بشرطیکہ تندرست ہو اور مقیم ہو (مسافر نہ ہو)۔ جمعہ کی فرضیت کتاب' سنت متواترہ اور اجماع سے ثابت ہے۔ وجوب ہونے کے بعد جمعہ مبارکہ کی نماز کا ترک قساوتِ قلبی کا سبب بنتا ہے۔

ان عبد اللہ بن عمر و ابا هريرة حدثا انهما سمعا رسول الله صلى الله عليه وسلم لينتهين اقوام عن ودعهم الجمعات او ليختمن الله على قلوبهم ثم ليكونن من الغافلين. (رواہ مسلم)

عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا لوگ جمعوں (جمعہ کی نمازوں کو) ترک کرنے سے باز آ جائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے۔

عن ابی جعدة الضمری ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من ترک ثلث جمع تهاونا بها طبع الله على قلبه.

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

حضرت ابو جعدہ ضمری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے تین جمعے چھوڑے انہیں معمولی خیال کرتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر مہر لگا دی۔

سنن میں ایسی کئی احادیث مذکور ہیں۔

غلام' بچے' مریض اور عورت پر جمعہ فرض نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے۔

روى طارق بن شهاب ان رسول الله ﷺ قال الجمعة حق واجب على كل مسلم فى جماعة الا على اربعة عبد مملوک او امرأة او صبى او مريض. (رواہ ابوداؤد)

حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ حق ہے یہ ہر مسلم پر باجماعت فرض ہے سوائے چار آدمیوں کے غلام' عورت' بچہ اور مریض۔

حضرت طارق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق علماء فرماتے ہیں کہ انہیں صحابی ہونے کا شرف حاصل ہے حالانکہ انہوں نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنی۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس وجہ سے حدیث مطعون نہیں کیونکہ صحابی کی مرسل بالاتفاق مقبول ہے۔ حضرت طارق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے یہ گفتگو صرف اس لئے کی گئی ہے کہ ان کے حالات سے آگاہی ہو۔ انہیں سے ایک دوسری روایت یوں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ جمعہ سوائے بچے' غلام یا مسافر کے ہر مسلمان پر فرض ہے۔

شیخ فانی بھی بیمار کے حکم میں ہے اسی طرح جس کے ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوئے ہوں یا وہ اندھا ہو۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ اندھا اگر کسی آدمی کی رہنمائی میں آ سکتا ہو تو اس پر جمعہ فرض ہے کیونکہ وہ جمعہ میں شرکت پر قادر ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس طرح نابینا آنے پر قادر تو ہے لیکن اس کی قدرت اپنی نہیں غیر کی ہے اور کسی دوسرے کی

قدرت کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں لہٰذا ایسے شخص پر جمعہ فرض ہی نہیں جس پر جمعہ کا واجب ہونا اس کی قدرت کے پائے جانے پر موقوف ہو۔

صحتِ جمعہ کی شرائط

ادائے جمعہ کی کئی شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ مصر (شہر) ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے دور اقدس سے جمعہ شہروں میں پڑھا جاتا رہا ہے اور دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں جمعہ نہیں پڑھا گیا۔ مصر کی تعریف میں اختلاف ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی جگہ جہاں عمارتیں ہو جنہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کیا جا سکتا ہو ان میں کم از کم چالیس مرد ایسے ہو جو مکلف اور تندرست ہوں۔ ایسے شہر میں جمعہ فرض ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خیال ہے کہ جمعہ مبارکہ کی جماعت کے لئے چالیس مرد شرط ہیں۔

ہماری (احناف) روایات اس بارے مختلف ہیں۔ ظاہر الروایہ میں ہے کہ ایسی بستی جس میں امام یا قاضی ہو جو حدود قائم کر سکتا ہو۔ فتح القدیر میں ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ مصر سے مراد ایسا شہر ہے جس میں گلیاں اور بازار ہوں اور والی ہو جو مظلوم کی دادرسی کر سکے اور ایسا عالم ہو جس کی طرف حوادث میں لوگ رجوع کر سکیں۔ یہ تعریف نسبتاً خاص ہے۔ امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے جسے عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے تشریق اور جمعہ صرف بڑے شہر میں ہو سکتے ہیں۔ علماء نے اسے ان دونوں میں سے کسی ایک پر محمول کیا ہے۔ مصر جامع صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں مذکورہ تمام شرائط موجود ہوں اسی لئے جس شہر کا والی کافر ہو اس میں جمعہ فرض نہیں۔ دوسری تفسیر کے مطابق ایسے شہر کے باسیوں پر جمعہ فرض نہیں جس کا والی ظالم ہو اور جو مظلوم کی دادرسی نہ کرتا ہو۔ ان دونوں روایتوں کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ یزید بدبخت کے دور میں صحابہ کرام علیہم الرضوان اور تابعین علیہم الرحمہ نے نماز جمعہ کو ترک نہ کیا حالانکہ اس کے ظالم ہونے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں کیونکہ اس بدبخت شخص نے اہل بیت اطہار علیہم الرضوان کی عزت و توقیر کو مٹانے کا ارادہ کیا بلکہ وہ ان نفوس قدسیہ کی شان میں گستاخی پر مصر رہا اور برابر ظلم کرتا رہا حتی کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے خون سے ہولی کھیلی[1] اور یزید سے یہ تو بہر حال بعید ہے کہ وہ کسی کی دادرسی کرتا۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ سے روایت کے مطابق مصر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں کے رہنے والے اس شہر کی کسی ایک مسجد میں نہ سما سکیں۔ ہدایہ میں ہے یہ رائے امام بلخی کی اختیار کردہ ہے اور اسی پر اکثر مشائخ کا فتویٰ ہے کیونکہ اب سیاسی صورت حال وہ نہیں رہی کہ والی یا انصاف ملنے کی شرائط عائد کی جائیں۔ اب نہ کہیں حدود قائم ہوتی ہیں

---

[1] یزید بن معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ظالم اور فتنہ باز ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ خانوادۂ رسول کا قتل اور پاک طینت گھر کی بہو بیٹیوں کو اسیر بنا کر دمشق لے جانا یزید کے حکم کے بغیر نہیں ہوا۔ اس کی طرف سے صفائی اور لاعلمی بدبختی کی علامت ہے۔ جس شخص نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اہل اسلام کے خون سے ہاتھ رنگے اور ان کی عزتوں کو تین دن تک پامال کیا وہ کسی اور قوم کا امیر تو ہو سکتا ہے امیر المؤمنین نہیں ہو سکتا۔ آپ کی تحقیق جو کہے ہمارے نزدیک واقعہ کربلا یزید کے اصل کردار کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔

اور نہ ہی کہیں مظلوم کی دادرسی ہوتی ہے۔ دینی امور میں لاپرواہی عام ہے یہ صورت حال آج سے نہیں بنوامیہ کے دور سے آ رہی ہے۔ حضرت امیر معاویہ کے بعد کے ادوار میں ملتِ اسلامیہ بادشاہت کے شکنجے میں جکڑی رہی۔ سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز اور چند عباسی خلفاء کے دور کے مجموعی طور پر آمریت ہی رہی اور عوام پر برابر ظلم وستم ہوتا رہا لیکن اس ادوار میں کہیں بھی جمعہ مبارک کو ترک نہیں کیا گیا اسی لئے سیاسی حالات کو شرائط میں شامل کرنا صحیح نہیں ہے اور فتوئی حضرت امام بلخی کی اختیار کردہ رائے پر ہونا چاہئے۔

میرے والد گرامی قدس سرہ فتوئی دیا کرتے تھے کہ مصروہ جگہ ہے جہاں انسانی ضرورت کی تمام چیزیں میسر ہوں۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والا ہو۔ ضروری لباس کی دکانیں ہوں۔ وہاں ایسے پیشہ وار لوگ ہوں جن کی لوگوں کو اکثر ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ والد گرامی یہ فتوئی اپنے اجتہاد پر دیا کرتے تھے یا ان کے پاس کسی قسم کی کوئی روایت بھی تھی۔ واللہ اعلم۔

منیٰ میں مکانات بھی ہیں۔ حج کے دنوں میں وہ شہر کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اسی لئے سلطان اور امیر حجاز کے لئے وہاں جمعہ پڑھنا جائز ہے لیکن امیر حج جمعہ نہیں پڑھا سکتا۔ منیٰ میں کوئی شخص جمعہ کا اعادہ نہیں کرے گا تاکہ مناسک حج میں خلل واقع نہ ہو۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اس بارے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک منیٰ میں جمعہ سرے سے ہوتا ہی نہیں۔

جمعہ کی شرائط میں سے ایک شرط سلطان یا اس کے جمعہ کے لئے مقرر کردہ شخص کا ہونا ہے یہ شرط صرف حنفیوں کے نزدیک ہے' شافعیوں کے نزدیک نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ایک شہر کے مسلمان اکٹھے ہو جائیں اور ایک آدمی کو آگے کر دیں اور وہ جمعہ پڑھا دے تو جمعہ ہو جائے گا لیکن سلطان کی طرف سے مقررہ کردہ آدمی کا جمعہ کی نماز پڑھانا افضل ہے۔

نمازِ جمعہ کے لئے بادشاہ کی اجازت کب ساقط ہوتی ہے؟

میں کسی ایسی دلیل سے واقف نہیں جو امر سلطان کو شرط قرار دے۔ ہدایہ میں یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ جب بہت سے لوگ اکٹھے ہوں گے اور ان میں سے ایک آدمی کو امام مقرر کیا جائے گا تو ہو سکتا ہے ان میں اختلاف ہو جائے کیونکہ ہر شخص اس عظیم منصب کو حاصل کرنا چاہتا ہے نزاع کی صورت میں سلطان یا اس کے نائب کا ہونا ضروری ہے تاکہ کسی قسم کا تنازع نہ ہو لیکن یہ رائے کچھ وزن نہیں رکھتی کیونکہ نصوص میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام نزاع کا تصفیہ کر سکتے ہیں کیونکہ سلطان کا تقرر بھی تو انہی کی رائے سے ہوتا ہے اور اس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے تو کیا کہا جائے کہ سلطان کا تقرر ہی نہ کیا جائے۔ اگر سلطان کے تقرر پر نزاع اجماع مسلمین سے ختم ہو سکتا ہے تو امام کے تقرر میں نزاع نمازیوں کے اجماع سے ختم ہو سکتا ہے۔

پھر صحابہ کرام علیہم الرضوان نے ان دنوں بھی جمعہ کی نماز ترک نہیں کی جب امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا محاصرہ ہوا اور آپ کے قاتلین نے آپ کو کہیں آنے جانے سے روک دیا۔ آپ امام حق تھے یہ بات بھی معلوم نہیں کہ لوگوں نے اقامت جمعہ کے لئے آپ سے اجازت لی ہو بلکہ حالات یہی بتاتے ہیں کہ آپ سے

اجازت نہیں لی گئی کیونکہ ان بدبختوں اور شریروں نے لوگوں کو اجازت طلب کرنے کی اجازت کب دی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے نزدیک بھی جمعہ کے لئے امیر کی اجازت شرط نہیں تھی۔ شاید اسی واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے کئی علماء فقہ نے اس شرط سے رجوع کیا ہے اور کہا ہے کہ جب اجازت طلب کرنا متعذر ہو تو جسے مسلمان اپنا امام منتخب کریں اس کے پیچھے جمعہ کی نماز ہو جائے گی اور اذن سلطان ضروری نہیں ہوگا۔ عالمگیری میں ایسا ہی ہے اور انہوں نے تہذیب کے حوالے سے اس رائے کو نقل کیا ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے ہاں جب اذن طلب کرنا ممکن ہو تو پھر اذن طلب کرنا بعض لوگوں کے لئے جمعہ کی شرائط میں سے ہے۔

احناف کے نزدیک جس حکمران کے اذن کو جمعہ کی شرط قرار دیا گیا ہے اس امام کے لئے کوئی خاص شرط نہیں۔ حکمران عادل ہو یا ظالم جابر و باغی ہو یا امام حق اگر اس کی طرف سے کوئی شخص جمعہ کی نماز کے لئے متعین ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے جمعہ پڑھا جائے گا کیونکہ وہ صحابہ کرام علیہم الرضوان جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سیاسی طور پر ہم خیال نہیں تھے وہ بھی اسی امام کے پیچھے نماز جمعہ پڑھتے حالانکہ امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلاشبہ حق پر تھے۔ حقیقت میں بھی اور ان صحابہ کرام کے اعتقاد میں بھی حقیقی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اختلاف کے باوجود صحابہ کرام ان کے متعین کردہ امام کے پیچھے نماز جمعہ پڑھ لیتے تھے۔

علماء فقہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی ملک کا حکمران کافر ہو تو اس ملک کے باسی حکمران کی اجازت کے بغیر نماز جمعہ ادا کریں گے اور ان سے امام کے اذن کی شرط ساقط ہو جائے گی لیکن ان پر یہ فرض عائد رہے گا کہ وہ کسی مسلمان حکمران کے لئے تگ و دو کرتے رہیں۔

جمعہ کی ایک شرط اذن عام ہے۔ اگر کسی حکمران یا امیر شہر نے اپنے قلعہ میں اپنے ساتھیوں کو نماز جمعہ پڑھائی اور قلعہ کا دروازہ نہ کھولا گیا تو جمعہ نہیں ہوگا۔ فتح القدیر میں ہے کہ اگر شہر کے دروازے بند رہے تو بھی جمعہ نہیں ہوگا لیکن آخری رائے میں تامل ہے کیونکہ شہر کے دروازوں کا بند رہنا اذن عام کے منافی نہیں ہے کیونکہ تمام شہری جمعہ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ رہے شہر سے باہر بسنے والے لوگ تو ضروری نہیں کہ وہ نماز جمعہ ادا کرنے آئیں وہ شر و فساد کی نیت سے بھی آ سکتے ہیں۔ اذن عام کی شرط کتب شافعیہ میں موجود نہیں۔ ہم لوگ اذن عام کو اس لئے شرط ٹھہراتے ہیں کہ اس طرح جمعہ کی نماز کے لئے مشہوری مقصود ہوتی ہے اور جب تک اذن عام نہ ہو مشہوری نہیں ہو سکتی۔

اس پر تمام مسلمان متفق ہیں اور کسی کو اس سے اختلاف نہیں کیونکہ حدیث مبارک ہے کہ:

روی سلمة بن الاكوع كنا نجمع مع رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا زالت الشمس ثم نتبع الفيء. (رواہ البخاری)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جب سورج ڈھلتا تو جمع ہوتے پھر سائے کو تلاش کرتے۔

پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کا یہی معمول رہا۔ یہ حدیث مبارک اس اجمال کا بیان ہے جو نماز جمعہ کے وقت میں ہے۔ دوسرا اس حدیث پاک سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز میں جلدی کرنا مسنون ہے ابرد (ٹھنڈا

کرنا اور دیر سے پڑھنا) مسنون نہیں ہے۔ یہی علماء کی اختیار کردہ رائے ہے۔ ظہر کا وقت جمعہ کے لئے شرط ہے حتی کہ جمعہ کے وقت کے بعد نہیں ہوتا اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ جمعہ کی نماز کی قضاء نہیں اگر نماز جمعہ ظہر کے وقت میں نہ پڑھی گئی تو بعد میں کسی صورت نہیں پڑھی جا سکتی ہاں اگر تشہد کے بعد ظہر کا وقت ختم ہوا تو نماز جمعہ ہو گئی کیونکہ تمام ارکان مکمل ہو چکے ہیں۔ صاحبین کی یہی رائے ہے۔

نمازِ جمعہ کی جماعت کے لئے کتنے افراد کا ہونا ضروری ہے؟

جمعہ کی ایک شرط جماعت ہے لفظ جمعہ اسی کو ظاہر کرتا ہے اس شرط پر بھی پورے عالم اسلام کا اتفاق ہے اور کوئی اس شرط سے اختلاف نہیں رکھتا۔ ہاں اس میں بہر حال اختلاف ہے کہ نمازیوں کی کم از کم تعداد کتنی ہونی ضروری ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک چالیس آدمی جیسا کہ وہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ حدیث کے الفاظ شرط کا موجب نہیں۔

عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یخطب قائما فجاء ت غیر من الشام فالتفتوا الیھا حتی مابقی الا اثناء عشر رجلا فیھم ابوبکر وعمر. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ شام سے ایک قافلہ آیا بارہ آدمیوں کے علاوہ جن میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے تمام لوگ قافلہ کی طرف چلے گئے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ خطبہ کے وقت لوگ چلے گئے اور حضور ﷺ نے صرف بارہ آدمیوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا فرمائی۔ اس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول باطل ہو گیا کہ جمعہ کے لئے چالیس آدمی شرط ہیں اگر وہ لوگ تکبیر تحریمہ کے بعد بھاگ گئے جیسا کہ شیخین کی ایک اور روایت سے ثابت ہے تو یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے الزام ہوگا کیونکہ وہ گمان کرتے ہیں کہ چالیس آدمیوں کا آخر تک رہنا ضروری ہے حالانکہ مذکورہ واقعہ میں لوگ چلے گئے اور یہ تھی بھی جمعہ کی نماز۔ یہ روایت اور اس کے علاوہ کئی دوسری روایات بتاتی ہیں کہ جمعہ کے لئے چالیس آدمی شرط نہیں ہیں۔

ہمارے امام کے نزدیک امام کے علاوہ تین آدمیوں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ تین پر جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور انہیں شرعاً اور عرفاً جماعت کہا جا سکتا ہے۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام کے علاوہ دو آدمی بھی ہوں تو جمعہ ہو جائے گا کیونکہ امام کو ملا کر ان کی تعداد تین ہو جاتی ہے لہٰذا یہ بھی جماعت ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ امامت شرط ہے اور جماعت بھی شرط۔ تو یہ دونوں جب الگ الگ ہیں تو انہیں ایک دوسرے میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

پھر ہمارے نزدیک جماعت انعقاد جمعہ کے لئے شرط ہے بقاء کے لئے شرط نہیں لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بقاء کے لئے بھی جماعت شرط ہے حتی کہ ہمارے نزدیک اگر تین آدمیوں نے امام کی اقتداء کی اور پھر دوران نماز بھاگ گئے تو جمعہ ہو جائے گا۔ ہماری دلیل مسبوق سے متعلقہ دلالت النص ہے کیونکہ بقیہ نماز میں مسبوق منفرد ہوتا ہے حالانکہ اس کی نماز جمعہ ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے لئے جماعت ابتداً شرط ہے

بقاء نہیں۔ مسبوق کے جمعہ کی صحت کی دلیل ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کردہ حدیث ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ارشادِ نبوی ہے: جس نے جمعہ کی ایک رکعت پالی یا کسی اور نماز کی تو اس کی نماز ہوگئی۔ اسے امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ایک ایسی ہی حدیث روایت ہے جس میں ہے کہ جس نے جمعہ کی ایک رکعت پالی اس نے جمعہ کی پوری نماز پالی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رکوع اور سجدہ کے بعد مقتدیوں کا نماز چھوڑ کر چلا جانا نماز جمعہ کیلئے مضر نہیں کیونکہ رکوع سے پہلے شروع مستحکم نہیں ہوتا۔ صاحبین علیہما الرحمہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے بعد سجدہ سے پہلے اور سجدہ کے بعد بھاگ جانا برابر ہے اس سے نماز جمعہ کا کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ صاحبین کے قول کی تردید گزشتہ حدیث سے ہوتی ہے۔

مسبوق جب قعدہ میں شامل ہو تو شیخین کے نزدیک اس کی نماز جمعہ ہوگی۔ امام محمد علیہ الرحمہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو نماز ظہر مکمل کرنا ہوگی لیکن دو رکعتوں کے بعد قعدہ کرنا اس کے لئے فرض ہوگا کیونکہ اس نے جمعہ نہیں پایا اور اس پر ظہر کی نماز پڑھنا فرض ہے مگر جمعہ کا شبہ موجود ہے اس لئے دو رکعتوں کے بعد بیٹھنا ضروری ہے۔ صحیح رائے شیخین کی ہے کیونکہ اس نے نماز کی ابتداء جمعہ کی نیت سے کی ہے اب ظہر پڑھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ قعدہ میں ملنا اور دوسری رکعت میں شامل ہونا جمعہ کی فضیلت میں برابر ہیں اس لئے جمعہ کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

جمعہ کی ایک شرط خطبہ ہے۔ یہ بالاتفاق جمعہ کی نماز کے لئے شرط ہے اسی پر اجماع ہے۔ اگر خطبہ کی نیت سے تحمید اور تسبیح بھی کہہ دی تو شرط پوری ہو جائے گی۔ اگر نیت نہ کی گئی تو امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک خطبہ صحیح نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں علماء نے امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک اثر نقل فرمایا کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ الحمد للہ کہتے اور پھر منبر سے اتر آتے۔ فتح القدیر میں ہے کہ علماء حدیث کے نزدیک یہ اثر ثابت نہیں ہاں لوگوں میں یہ بات ضرور مشہور ہے۔ بعض اہل تصوف کا بھی اس پر اعتماد ہے۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ خطبہ کے لئے طویل ذکر ضروری ہے جسے خطبہ کہا جا سکے۔ فرماتے ہیں کہ کم از کم خطبہ تشہد کی مقدار ہونا چاہئے کیونکہ خطبہ فرض ہے اور چند الفاظ سے فرض ادا نہیں ہو سکتا۔ ابن ہمام علیہ الرحمہ امام ابوحنیفہ کے مذہب کے صحیح ہونے کی دلیل دیتے ہیں کہ آیت[1] میں اللہ تعالیٰ کا ذکر عام ہے جو تحمید کو بھی شامل ہے۔ ذکر بھی فرض ہے خواہ اسے خطبہ کہا جائے یا خطبہ کا نام نہ دیا جائے۔ پس جس پر ذکر کا اطلاق ہوتا ہے وہ خطبہ بن سکتا ہے۔ صحیح رائے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ آیت میں ذکر کی اضافت[2] عہدی ہے کیونکہ محض ذکر کی طرف سعی کرنے کا حکم نہیں بلکہ خاص ذکر کی طرف سعی کرنے کا حکم ہے جو لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کے دور اقدس میں خطبہ اور نماز کے نام سے متعارف تھا۔

سبحان اللہ کہنے والے کو عرف عام میں خطیب کوئی نہیں کہتا۔ ہاں اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ثابت ہو جائے تو پھر چونکہ صحابہ کرام علیہم الرضوان اور تابعین علیہم الرحمہ نے اس کو کافی سمجھا تو اس پر اجماع ہوگا اور

---

۱ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ کی طرف اشارہ ہے۔

۲ ذکر اللہ کی اضافت عہدی ہے یعنی یہاں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مراد عام ذکر نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا ذکر ہے جسے لوگ خطبہ اور نماز جمعہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اس لئے ذکر اللہ کا اطلاق صرف چند لفظوں پر صحیح نہیں۔

اس پر کفایت کرنا یقینی ہوگا۔

نمازِ جمعہ کا خطبہ سننا واجب ہے

خطبہ جمعہ کا سننا واجب ہے۔ خواہ سننے والا ایک ہو یا زیادہ اور یہ بھی ضروری ہے کہ سننے والے وہ ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ اگر صرف ایک آدمی خطبہ سنتا ہے اور جماعت کے وقت دو آدمی اور بھی شامل ہو جاتے ہیں تو جمعہ ہو جائے گا۔ اگر کسی نے خطبہ نہیں سنایا ان لوگوں نے سنا جن پر جمعہ کی نماز فرض نہیں تو خطبہ معتبر نہیں ہوگا۔

امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک چالیس آدمیوں کا خطبہ سننا شرط ہے کیونکہ انہیں کی وساطت سے جمعہ کی نماز قائم ہوگی۔

ہم کہتے ہیں کہ جمعہ کی نماز میں شریک ہونے والے تمام لوگوں کے لئے خطبہ سننا ضروری نہیں کیونکہ اس کے ضروری ہونے پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔

بیٹھ کر خطبہ پڑھنا مکروہ ہے

جنابت اور حدث کی حالت میں اور بیٹھ کر خطبہ پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ تواتر سے ثابت ہے کہ خطبہ جمعہ ہمیشہ طہارت سے کھڑے ہو کر دیا گیا۔

عن کعب بن عجرة انه دخل المسجد وعبد الرحمن بن ام الحکم یخطب قاعدا فقال انظروا الی ھذا الخبیث یخطب قاعدا وقال اللہ تعالی واذا رؤا تجارة اولھوا ن انفضوا الیھا وترکوک قائما.

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ (کعب) مسجد میں گئے تو عبد الرحمٰن بن حکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس خبیث کو دیکھو بیٹھ کر خطبہ دے رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ واذا رأوا تجارة او لھوا ن انفضوا الیھا و ترکوک قائماً.

اسے امام مسلم اور امام نسائی علیہما الرحمہ نے روایت کیا ہے۔ یہ اثر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بیٹھ کر خطبہ جمعہ دینا مکروہِ تحریمی ہے۔ بیٹھنے سے بہرحال نماز جمعہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا اور نہ نماز کے باطل ہونے سے خطبہ جمعہ پر کچھ فرق پڑتا ہے۔

خطبہ دیتے ہوئے خطیب لوگوں کی طرف منہ کرے

لوگوں کو چاہئے کہ وہ قبلہ رو ہو کر بیٹھیں اور امام ان کی طرف منہ کر کے خطبہ دے۔

عن ابن مسعود قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا استوی علی المنبر استقبلنا بوجوھھم. (رواہ الترمذی)

جناب ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ منبر پر خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تو ہم آپ ﷺ کی طرف منہ کر لیتے۔

اگر امام نے مقتدیوں کی مخالف سمت رخ کر لیا تو سنت متواترہ کی مخالفت کی وجہ سے مکروہ تحریمی کا ارتکاب

کرے گا۔

خطبہ مختصر پڑھنا چاہیے

خطبہ مختصر ہونا چاہیے اور نماز لمبی کیونکہ حدیث مبارک ہے۔

عن عمار قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان طول صلوة الرجل وقصر خطبة مئنة فقهه فاقصروا الخطبة واطیلوا الصلوة وان من البیان لسحرا. (رواہ مسلم)

حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ نماز کو لمبا کرنا اور خطبے کو مختصر کرنا امام کی فقاہت کی علامت ہے۔ خطبہ مختصر کیا کرو اور نماز لمبی۔ بلاشبہ بیان جادو ہے (جس سے امام اور مقتدی دونوں مسحور ہو جاتے ہیں)۔

وعنه قال امرنا رسول الله ﷺ باقصار الخطب.

انہیں سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ کو مختصر کرنے کا حکم دیا۔

اسے امام ابوداؤد علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

خطبہ میں تحمید (الحمد للہ) درود پاک اور قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ تحمید کی دلیل یہ ہے۔

عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال کل خطبة لیس فیها تشهد فهی کالید الجزماء. (رواہ ابوداؤد ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ خطبہ جس میں تشہد (اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده و رسوله) نہ ہو وہ ایسے ہاتھ کی مانند ہے جو جزام کی بیماری میں مبتلا ہو۔

عن ابی هریرة کل کلام لایبدء فیه بالحمد لله فهو اجزم. (رواہ ابوداؤد)

حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جس گفتگو کو الحمد للہ کے ساتھ شروع نہ کیا جائے وہ اجزام ہے۔

نبی کریم ﷺ پر درود پاک بھی خطبہ میں شامل ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ درود پاک سرچشمہ خیرات و برکات ہے۔ درود پاک کے بغیر کوئی ذکر قبول نہیں ہوتا۔ رہی قرآن کریم کی تلاوت تو رسول اللہ ﷺ خطبہ میں سورۂ ق کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

روت ام هشـــام اخــذت ق والقــرآن المـجیـد من فی رسول الله صلی الله علیه وسلم یقرء بها کل جمعة. (رواہ مسلم)

ام ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ میں نے سورت ق والقرآن المجید کو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یاد کیا آپ ﷺ ہر خطبۂ جمعہ میں سورت ق کی تلاوت کرتے تھے۔

اس حدیث کی شرح کرنے والے کہتے ہیں کہ حضرت ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ ماجدہ کی زندگی میں تو حضور ﷺ کا یہ معمول تھا لیکن بعد میں ہمیشہ یہ معمول نہیں رہا۔ حدیث مبارک سے مقصود یہ ہے کہ سورت ق کی

ابتدائی آیات مبارکہ آپ جمعہ کے خطبہ میں تلاوت فرماتے تھے۔ شارحین نے یہی تصریح کی ہے۔ اس سورت کے علاوہ بھی رسول اللہ ﷺ تلاوت فرماتے تھے۔

روی یعلی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر ونادوا یا مالک. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت یعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر یوں خطبہ پڑھتے سنا۔ ونادوا یا مالک۔

خطیب دو خطبے دے

عہد نبوی سے آج تک برابر دو خطبے ہوتے آئے ہیں۔ خطبہ میں امام کو چاہئے کہ مسلمانوں کے لئے دعا کرے۔ دعا کی ابتداء خلفاء راشدین کے ذکر اور دعا سے ہونی چاہئے کیونکہ ان کا ذکر اور ان کی مدح وستائش رحمت خداوندی کے نزول اور قبولیت دعا کا ذریعہ ہے۔ تابعین علیہم الرحمہ کے دور سے آج تک برابر ان صالحین کا ذکر ہوتا آ رہا ہے اور کوئی بھی اس کا انکار نہیں کرتا۔ خلفاء راشدین کا ذکر مستحب بلکہ سنت کے قریب ہے اس کے علاوہ یہ شعار دین بھی ہے جس طرح کہ اذان شعار دین ہے اس لئے خطبہ میں خلفاء راشدین کا ذکر خیر ضرور ہونا چاہئے۔

جمعہ کی نماز کا طریقہ یہ ہے کہ امام منبر پر بیٹھے اور اس کے سامنے مؤذن اذان کہے۔ اذان کے بعد ایک خطبہ دے جس طرح ہم نے اس کے بارے بیان کیا ہے اور پہلے خطبے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائے۔ علماء فقہ فرماتے ہیں کہ چھوٹی تین آیات کی تلاوت کے برابر بیٹھے پھر کھڑا ہو کر دوسرا خطبہ دے جسے ہم نے ذکر کیا۔

روی ابن عمر قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخطب خطبتین وکان یجلس اذا صعد المنبر حتی یفرغ المؤذن ثم یقوم فیخطب ثم یجلس فلا یتکلم ثم یقوم فیخطب. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو خطبے دیا کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ منبر پر چڑھتے تو بیٹھ جاتے حتی کہ مؤذن اذان سے فارغ ہو جاتا پھر آپ ﷺ کھڑے ہوتے اور خطبہ دیتے پھر تشریف فرما ہوتے اور گفتگو نہ فرماتے پھر کھڑے ہو جاتے اور خطبہ ارشاد فرماتے۔

خطبہ سے فارغ ہو کر دو رکعت نماز پڑھے اور دونوں میں بلند آواز سے قرأت کرے جیسا کہ عہد نبوی ﷺ سے ہوتا آ رہا ہے۔ خطبہ اور نماز میں گفتگو جائز نہیں۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ انصت والامام یخطب فقد لغوت. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم اپنے ساتھی سے جمعہ کے دن خاموش رہنے کو کہتے ہو اور امام خطبہ دے رہے ہوتے ہیں تو تم بے ہودہ بات کرتے ہو۔

عن امیر المؤمنین عثمان کان یقول فی خطبۃ فلما یدع ذلک اذا خطب اذا قام الامام یخطب یوم الجمعۃ فاستمعوا فان لانصیب للذی لایسمع من الخطبۃ مثل ماللمنصت السامع. (رواہ مالک)

امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے خطبہ میں یہ الفاظ کہتے اور ایسا بہت ہی کم ہوا ہے کہ آپ نے خطبہ دیا ہو اور یہ الفاظ نہ کہے ہوں (وہ الفاظ یہ ہیں) جمعہ کے دن جب امام خطبہ دینے کیلئے کھڑا ہو تو اس کی باتیں سنا کرو کیونکہ جو خطبہ نہیں سنتا' اس کو خاموش رہنے اور خطبہ سننے والے کی طرح اجر و ثواب نہیں مل سکتا۔

یہ باتیں حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کی موجودگی میں ہوئیں اور ان میں سے کسی صحابی نے ان باتوں کا انکار نہ کیا۔ گویا اس پر اجماع ہے اس اثر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ دوران خطبہ نماز پڑھنا حرام ہے۔ اسی طرح خطبہ کے دوران ذکر و اذکار بھی حرام ہیں اور دور و نزدیک ہر شخص کے لئے خطبہ کا سننا واجب ہے۔ یہی ہمارا مذہب ہے۔

خطبہ کے دوران حضور کے اسم گرامی پر دل میں درود پاک پڑھنا چاہیے

درود پاک کے بارے اختلاف ہے صحیح رائے یہ ہے کہ جب امام خطبہ کے دوران یہ آیت تلاوت کر رہا ہو یایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیماً تو سننے والے دل میں درود پاک پڑھیں۔ اسی طرح جب امام رسول اللہ ﷺ کا اسم گرامی لے یا ایسا لفظ استعمال کرے جس سے مقصود آپ ﷺ کی طرف اشارہ ہو تو سننے والے دل میں درود پاک پڑھیں کیونکہ ایسے میں درود پاک کا پڑھنا واجب ہوتا ہے اور واجب بالکل ترک نہیں ہوتا اور خصوصاً جب واجب منبع خیرات و برکات ہو تو پھر کسی صورت اس کا ترک کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ درود پاک کو باآواز نہیں پڑھنا چاہئے کیونکہ اس طرح خطبہ سننے میں خلل آئے گا۔ یہ ہماری رائے ہے اور اسی پر علماء فتویٰ دیتے ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحیۃ المسجد کے علاوہ دوران خطبہ ہر قسم کی نماز حرام ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔

شوافع اور حنابلہ حضرت سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

روی جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جاء احدکم الجمعۃ وھو یخطب فلیرکع رکعتین ولیتجوز فیھما. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کی نماز پڑھنے آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعتیں پڑھ لے اور انہیں مختصر کرے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ عمل اجماع کے مخالف ہے اس لئے اس کی تاویل ضروری ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب امام خطبہ کا قصد کرے (یعنی ابھی خطبہ شروع نہ کیا ہو) تو خطبہ شروع ہونے سے پہلے دو نفل پڑھ لے رہی یہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دینے کی حالت میں ایک آدمی کو حکم دیا کہ دو نفل پڑھ لو تو اس کا جواب یہ ہے کہ

آپ ﷺ نے خطبہ منقطع کر دیا اور فرمایا کہ دو نفل پڑھ لو جیسا کہ فتح القدیر میں براویتہ دارقطنی مذکور ہے۔

امام کے کھڑا ہونے کے بعد اور خطبہ شروع کرنے سے پہلے کیا گفتگو جائز ہے یا حرام تو اس بارے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ گفتگو حرام ہے کیونکہ ہوسکتا ہے گفتگو طویل ہو جائے اور خطبہ کے دوران بھی گفتگو جاری ہے اور انسان حرام کا مرتکب ہو اور وہ کام جو حرمت کا سبب بن سکتا ہو اس کا کرنا بھی حرام ہے۔

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه وابن عباس وابن عمر انهم کانوا یکرهون الصلوة والکلام بعد خروج الامام.

امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ امام جب خطبہ دینے کے لئے نکلتا تو اس کے بعد وہ نماز اور گفتگو کو حرام سمجھتے تھے۔

(رواہ ابن ابی شیبہ)

صحابی کا قول حجت ہوتا ہے خصوصاً اس وقت جب وہ اس کا مفہوم بھی بیان کر رہا ہو جیسے اس قول میں وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ گفتگو لمبی ہوسکتی ہے اور اسے جاری رکھنے میں حرام کے ارتکاب کا اندیشہ ہے۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ خطبہ شروع ہونے سے پہلے گفتگو حرام ہے۔ یہی رائے امام شافعی علیہ الرحمہ کی ہے۔

عن ابن شهاب قال قال ثعلبة بن ابی مالک القرظی انهم کانوا فی زمن عمر بن الخطاب یصلون یوم الجمعة حتی یخرج عمر فاذا خرج عمرو جلس علی المنبر واذان المؤذن قال ثعلبة وجلسنا نتحدث فاذا سکت المؤذن وقام عمر یخطب انصتنا ولم یتکلم منا احد. (رواہ الامام مالک)

حضرت ابن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ثعلبہ بن ابی مالک قرظی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ لوگ عہد فاروقی میں جمعہ کے دن نماز پڑھتے حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لاتے۔ جب آپ تشریف لاتے اور منبر پر بیٹھ جاتے تو مؤذن اذان کہتا۔ حضرت ثعلبہ فرماتے ہیں کہ ہم بیٹھ کر گفتگو کرنے لگتے اور جب مؤذن خاموش ہوتا اور حضرت عمر خطبہ دینے کھڑا ہوتے تو ہم خاموش ہو جاتے اور ہم میں سے کوئی بھی گفتگو نہ کرتا۔

اب شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ امام کا نکلنا نماز (کے سلسلہ) کو کاٹ دیتا ہے اور اس کی گفتگو (سلسلہ گفتگو) کو کاٹ دیتی ہے۔ یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ اگر یہ ان کی عادت تھی (گفتگو کرنا) اور وہاں پر موجود لوگوں میں سے کسی نے اعتراض نہ کیا حالانکہ ان میں حضرات علیؓ ابن عمرؓ ابن عباس علیہم الرضوان جیسے لوگ موجود تھے تو یہ اثر ابن ابی شیبہ کی روایت سے زیادہ قوی ہے۔ البتہ امام کے آ جانے کے بعد نماز ممنوع ہے۔ رہا خطبہ سے فارغ ہونے اور نماز کے درمیان کا واقعہ تو اس بارے مشہور یہ ہے کہ امام گفتگو نہ کرے اور نہ ہی اس کے ساتھ والا کوئی اور آدمی تا کہ نماز اور خطبہ کے درمیان وقفہ نہ آ جائے۔

عن انس رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم ینزل عن المنبر یتعرض له الرجل فی الحاجة فیقوم معه حتی یقضی

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ منبر سے نیچے تشریف لاتے تو کوئی آدمی آپ کی خدمت میں اپنی کسی ضرورت کے لئے پیش

حاجة ثم یقول فیصلی. (رواہ ابوداؤد)

ہوتا۔ آپ اس کے ساتھ کھڑے رہتے حتیٰ کہ اس کی ضرورت پوری فرما دیتے پھر آپ ﷺ کھڑے ہو کر نماز ادا فرماتے۔

امام ترمذی علیہ الرحمہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ منبر سے اتر کر ضرورت کے تحت گفتگو فرما لیتے تھے حالانکہ آپ ﷺ میں ضعف تھا۔ (آخری عمر مبارک میں آپ ﷺ کمزور ہو گئے تھے) جیسا کہ امام ابوداؤد علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ مبلغ اور مرجع خلائق تھے مگر ان مصروفیات کے باوجود آپ ﷺ پل جھپکنے کی دیر کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہوتے۔ آپ ﷺ کا ہر قول و فعل کسی واجب کی ادائیگی ہوتا۔ کسی اور شخص کو آپ ﷺ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ آپ ﷺ نے خطبہ کو منقطع کر دیا اور حضرت ابورفاعہ عدوی کو دین حنیف کے مسائل سکھائے۔

ابـی رفـاعة العدوی قـال انتهیت الی رسول اللـه صـلی الله علیه وسلم وهو یـخـطـب قـال فقلت یا رسول الله عزوجل غریب جـاء کـ یسأل عـن دینه لایدری مادینه قال فاقبل علی رسول الله صلی الله علیـه وسـلـم وترک خطبة حتی انتهی الی فاتی بـکـرسی حسبت قوائمه حدیداً فقعد علیـه وجـعـل یعلمنی مما علمه الله ثم اتی خطبة خاتم آخرها. (رواہ مسلم)

ابورفاعہ عدوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بارگاہِ رسالت میں جا پہنچا۔ آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ایک مسافر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہے تاکہ آپ کے لائے ہوئے دین کے بارے آپ سے کچھ دریافت کرے۔ یہ نہیں جانتا کہ آپ کے دین کی تعلیمات کیا ہیں؟ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور خطبہ ترک کر دیا حتیٰ کہ آپ ﷺ مجھ تک تشریف لائے۔ کرسی لائی گئی میرے خیال میں اس کی ٹانگیں لوہے کی تھیں۔ آپ ﷺ اس پر بیٹھ گئے اور مجھے اللہ تعالیٰ کی تعلیم کردہ باتوں سے بہرہ ور کرنے لگے پھر آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور اُسے آخر تک مکمل کیا۔

حضور ﷺ پر تعلیم دین کو مؤخر کرنا حرام تھا اس لئے آپ ﷺ نے خطبہ چھوڑ دیا اور دورانِ خطبہ حضرت ابورفاعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے باتیں کیں لیکن کسی اور امام کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں۔

جس طرح خطبہ اور نماز جمعہ کے درمیان گفتگو حرام ہے اسی طرح نماز بھی حرام ہے لیکن صاحب ترتیب قضاء نماز پڑھ سکتا ہے لیکن اس میں وہ قرأت بلند آواز سے نہیں کرے گا کیونکہ اگر وہ نماز ادا کئے بغیر جمعہ پڑھے گا تو اس کی جمعہ کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ ترتیب کی رعایت ضروری ہے۔

اذان کے بعد تمام کام چھوڑ کر مسجد میں جانا واجب ہے

اذان کے بعد واجب ہے کہ سب کام چھوڑ کر انسان سیدھا مسجد کو جائے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے بلایا جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑے چلے آؤ اور لین

الْبَیْعَ. دین ترک کردو۔

یہ صرف جمعہ کی نماز کی ساتھ خاص ہے کیونکہ جمعہ کے علاوہ دوسری نمازوں کے لئے سعی (دوڑنا) مکروہ ہے وجوب سعی اور حرمت بیع میں دوسری اذان معتبر ہے کیونکہ پہلی اذان رسول اللہ ﷺ کے دور اقدس میں نہیں دی جاتی تھی جیسا کہ سائب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا ہے۔

عن یزید قال کان النداء یوم الجمعة اوله اذا جلس الامام علی المنبر علی عهد النبی صلی الله علیه وسلم و ابی بکر و عمر فلما کان عثمان و کثر الناس زاد الثالث علی الزوراء. (رواہ البخاری)

حضرت یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور اقدس اور حضرت ابوبکر' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور ہمایوں میں جب امام منبر پر بیٹھتا تو جمعہ کی اذان کہی جاتی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور خلافت آیا اور لوگ بہت زیادہ ہو گئے تو زوراء کے مقام پر تیسری اذان کا اضافہ کیا گیا۔

اس اذان کو تیسری اذان کہا گیا ہے گویا اقامت بھی ایک اذان ہے۔ بعض مشائخ کے نزدیک اس سے مراد پہلی اذان ہے اور بعض کے نزدیک دوسری۔ ہدایہ میں ہے کہ دوسری اذان مراد لینا صحیح ہے کیونکہ آیت کا نزول اگر چہ خاص سبب کے تحت ہوا لیکن یہ حکم اس سبب کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ حکم عام ہے۔ جب اذان خطبہ سے پہلے والی مراد تھی تو حکم اس کے بارے تھا کیونکہ نداء ایک ہی تھی پھر جب اس سے بھی پہلے ایک نداء پائی گئی تو پہلی اذان کے ساتھ سعی ضروری ہو جائے گی کیونکہ خلفاء راشدین کے عمل سے بھی شریعت کا ثبوت عمل میں آتا ہے اور اس پر حکم مرتب ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی نداء کا فرد ہے اور حکم کسی نداء کے ساتھ خاص نہیں۔

پھر خرید وفروخت میں گفتگو لمبی ہو سکتی ہے اور اس طرح خطبہ یا جمعہ کی نماز رہ بھی سکتی ہے کیونکہ موجودہ دور میں دکاندار گاہکوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اسی لئے پہلی اذان کے ساتھ ہی سب کام چھوڑ کر جمعہ کی نماز کو آنا واجب ہے۔

ترکِ جمعہ پہ وعید

اگر کسی شخص نے بغیر کسی شرعی مجبوری کے نماز جمعہ ترک کی اور ظہر کی نماز پڑھ لی تو وہ گناہ گار ہوگا کیونکہ اس نے فرض کو عمداً ترک کیا ہے لیکن اس کی نماز ظہر ہو جائے گی۔

امام زفر اور امام شافعی علیہما الرحمہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ شخص کی نماز ظہر صحیح نہیں کیونکہ اس پر جمعہ کی نماز فرض تھی اس نے اسے ترک کیا تو کوئی دوسری نماز اس فریضہ کا بدل نہیں بن سکتی۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ وقت کا فرض ظہر کی نماز ہے لیکن جمعہ کے دن ظہر کی نماز کو جمعہ کی نماز کے ساتھ ساقط کیا گیا ہے۔ جب کسی شخص نے جمعہ کی نماز ترک کر کے ظہر کی نماز پڑھی تو اس نے وقت کے اصل فرض کو ادا کیا۔ اس لئے اس کی نماز ظہر صحیح ہے لیکن اس فریضہ کو نماز جمعہ کے ذریعے ساقط نہ کرے اس نے حکم خداوندی سے روگردانی کی ہے اور گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ اصل فرض ظہر کی نماز ہے کیونکہ اس بات پر تو اجماع ہے کہ جس کی نماز جمعہ فوت ہوگئی

اس پر ظہر کی نماز قضاء کرنا فرض ہے۔ قضاء اس وقت لازم ہوتی ہے جب ادا کسی کے ذمہ فرض ہو۔

اگر کسی شخص نے نماز جمعہ سے پہلے ظہر کی نماز پڑھ لی پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنے گناہ پر شرمندہ ہوا اور جمعہ کی ادائیگی کے لئے مسجد کی طرف چل پڑا تو امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک صرف سعی کے ساتھ ہی اس کی نماز ظہر باطل ہو جائے گی کیونکہ **سعی الی الجمعۃ** جمعہ کے خصائص میں سے ہے۔ جبکہ صاحبین کے نزدیک جب جمعہ کی نماز شروع کرے گا تو ظہر کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ ظہر کی نماز کے بغیر جمعہ کو آنا بہتر ہے بنسبت ظہر کی نماز پڑھ کر آنے سے' لہٰذا سعی سے ظہر کی نماز باطل نہیں ہو گی۔

ہم کہتے ہیں جمعہ کے دن ظہر کی نماز پڑھنا بغیر عذر کے حرام ہے اور سعی مستحسن امر ہے اس لئے سعی اس پر فوقیت رکھتی ہے۔ سو سعی نماز ظہر کو باطل کر دے گی۔

مریض اور دوسرے معذوروں کے لئے جمعہ کے دن ظہر کی نماز با جماعت پڑھنا مکروہ ہے۔ دیہات میں رہنے والوں کے لئے مکروہ نہیں کیونکہ جمعہ کی نماز شہروں میں ہوتی ہے۔ شہر میں نماز ظہر کی جماعت اس لئے مکروہ ہے کہ کہیں لوگ اسے جمعہ کی نماز نہ سمجھ لیں اور اس طرح جمعہ کی نماز سے رہ جائیں لیکن دیہاتوں میں ایسی کوئی بات نہیں۔

شہر میں ایک سے زائد مقامات پر جمعہ

چونکہ جمعہ سے مقصود مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے اس لئے ایک شہر میں امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک کئی مقامات پر جمعہ جائز نہیں امام ابوحنیفہ سے ایک روایت ایسی ہی ہے۔ امام شافعی کی رائے بھی یہی ہے۔

امام محمد علیہ الرحمہ' حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک شہر میں ایک سے زائد مقامات پر جمعہ کی نماز جائز ہے۔ یہی روایت علماء کی اختیار کردہ ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اور بعض فقہاء کا یہ کہنا کہ جمعہ جماعتوں کو اکٹھا کرنے والا ہے تو اگر ان کی مراد جمعہ کے علاوہ دوسری جماعتیں ہیں تو اس بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں ورنہ تعدد کی نفی لازم آئے گی۔ اگر ان کی مراد تمام جماعتوں سے ہے اور جمعہ بھی اس میں شامل ہے تو پھر ایک شہر میں صرف ایک ہی جماعت ہونی چاہئے مگر یہ ممنوع ہے اور اس کے لئے کوئی دلیل چاہئے۔

ہماری دلیل یہ ہے۔

عن امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ انہ امر بتعدد الجمعۃ. امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شہر میں کئی جمعے پڑھنے کا حکم دیا۔

یہ اثر صحیح ہے جسے ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں صحیح قرار دیا ہے پھر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر عمل حرج کا سبب ہے کیونکہ بعض اوقات شہر بہت بڑے ہوتے ہیں اور ان کا طول وعرض کئی فرلانگوں پر محیط ہوتا ہے اور دور دراز سے لوگ ایک ہی مسجد میں آ کر جمعہ کی نماز نہیں پڑھ سکتے کیونکہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ شام کو گھر واپس نہ جا سکیں اور اس سے بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور شریعت کسی ایسی چیز کو لازم نہیں ٹھہراتی جس سے

حرج عظیم ہو۔[1]

شاید یہی وجہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جب ایک شہر میں بڑی نہر ہوتو ایک سے زائد جگہوں پر نماز جمعہ پڑھی جا سکتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب شہر بڑا ہوتو بھی ایک جگہ جمع نہ ہو سکنے کی وجہ سے ایک سے زائد جگہوں پر نماز جمعہ پڑھنا جائز ہے۔ اگر شہر نہ بھی ہو کیونکہ جس علت کی بناء پر حضرت ابو یوسف علیہ الرحمہ یہ حکم دے رہے ہیں وہ شہر کے بغیر بھی بڑے شہر میں موجود ہے تو تعدد جمعہ بھی جائز ہوگا پھر نماز جمعہ دوسری جماعتوں کی طرح فرض ہے اسے ایک جماعت کے ساتھ مقید نہیں کرنا چاہئے اور پھر اس پر کسی قسم کی عقلی دلیل نہیں دینی چاہئے۔ واللہ اعلم باحکامہ۔

نمازعیدین کا بیان

عید کے دن غسل کرنا سنت ہے

عیدین (عیدالفطر' عیدالاضحیٰ) کے روز مستحب ہے کہ انسان مسواک کرے اور غسل کرے کیونکہ حدیث میں آیا ہے۔

ان عبد اللہ ابن عمر کان یغتسل یوم الفطر قبل ان یلوح الی المصلی ویلبس مایجد من احسن الثیاب لما کان یلبس رسول اللہ ﷺ یوم العید حلۃ حمراء.

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما عیدالفطر کے دن عید گاہ جانے سے پہلے غسل فرمایا کرتے تھے اور عید کے دن انسان اچھے کپڑے پہنے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرخ حلہ پہنا کرتے تھے۔

فتح القدیر میں ہے کہ طبرانی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سرخ حلے سے مراد دو یمنی کپڑے ہیں جن میں سرخ اور سبز خطوط تھے۔ یہ حلہ مبارک بالکل سرخ نہیں تھا۔

عید کے روز اگر ہو سکے تو خوشبو استعمال کرے کیونکہ عید کے دن مسلمانوں کا ایک جم غفیر ہوتا ہے اس لئے اس دن صفائی کا خاص خیال رکھے اور حسب استطاعت اچھے لباس کا اہتمام کرے۔

عیدالفطر سے قبل میٹھی چیز کھانا سنت ہے

عید گاہ کو جانے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ کوئی میٹھی چیز کھائے اگر عیدالاضحیٰ ہوتو کچھ نہ کھائے۔

عن بریدۃ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایخرج یوم الفطر حتی یطعم ولا یطعم یوم الاضحی حتی یصلی. (رواہ الترمذی)

حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدالفطر کے دن گھر سے باہر نہ نکلتے حتی کہ کچھ کھا لیتے اور عیدالاضحیٰ کے دن کچھ تناول نہ فرماتے حتی کہ نماز پڑھ لیتے۔

---

[1] اب تو شہر کئی میلوں پر محیط ہیں اور واقع ایک جگہ پورے شہر کا نماز جمعہ ادا کرنا تقریباً ناممکن ہے لیکن اس گفتگو سے یہ اندازہ بہرحال ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اجتماعات کا اہتمام کیا جائے اور ایک محلّہ میں تین تین اور چار چار جگہوں پر نماز جمعہ نہیں ہونی چاہئے تاکہ عوام اور علماء ایک دوسرے کے نزدیک آ سکیں اور اجتماعیت کا رنگ پیدا ہو۔

اس اہتمام کے بعد اگر معذور نہ ہو تو پیدل چل کر عید گاہ کو جائے۔

عن امیر المؤمنین علی قال من السنة ان یخرج الی العید ماشیا وان یأکل قبل ان یخرج.

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ عید پڑھنے کے لئے چل کر جانا اور گھر سے نکلنے سے قبل کچھ کھانا سنت ہے۔

اسے امام ترمذی علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

عید گاہ جاتے ہوئے راستے میں تکبیرات کہنا

اس بات پر ہمارے علماء کا اتفاق ہے کہ بقرہ عید پڑھنے جائے تو بلند آواز سے تکبیر کہتا جائے کیونکہ یہ تکبیر کا دن ہے۔ عید الفطر کے دن تکبیر کہنے کے بارے اختلاف ہے۔ صاحبین علیہما الرحمہ کی رائے یہ ہے کہ راستے میں بآواز بلند تکبیر کہے کیونکہ دار قطنی علیہ الرحمہ سے ایسے ہی روایت ہے۔ فتح القدیر میں ہے۔

عن ابن عمر موقوفا انه كان اذا غدا يوم الفطر ويوم الاضحی یجهربا لتكبير حتی یاتی المصلی ثم یکبر حتی یاتی الامام.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر موقوف ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن بلند آواز سے تکبیر کہتے جاتے حتیٰ کہ آپ عید گاہ پہنچ جاتے پھر عید گاہ میں تکبیر کہتے رہتے حتیٰ کہ امام تشریف لاتے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی رائے یہ ہے کہ عید الفطر کے دن تکبیر نہیں کہنا چاہیے۔

عن ابن عباس رضی الله عنهما انه سمع الناس یکبرون فقال لقائده اکبر الامام قیل لا قال افجر الناس ادرکنا مثل هذا الیوم مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فما کان احدیکبر قبل الامام.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے لوگوں کو تکبیریں کہتے سنا تو ان کے قائد سے فرمایا: کیا امام نے تکبیر کہی؟ انہوں نے عرض کیا نہیں (امام نے تو تکبیر نہیں کہی) آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا (تو پھر) لوگوں نے گناہ کیا ہم اس طرح کا دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پاتے تو امام سے پہلے کوئی تکبیر نہ کہتا۔

یہ اثر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے اس لئے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی موقوف روایت پر مقدم رکھا جائے گا۔

لیکن حضرت ابن عباس کی حدیث سے یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا کہ عید گاہ میں بھی تکبیر نہیں کہنی چاہیے۔ اس سے تو صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ راستے میں تکبیر نہیں پڑھنی چاہیے پھر واذکر ربک فی نفسک تضرعاً و خیفة و دون الجهر من القول (الاعراف:۲۰۵) سے استدلال کرنا کہ بلند آواز سے ذکر کرنا ممنوع ہے تو صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل اس کے معارض نہیں کیونکہ آیت کریمہ کا وہ معنیٰ نہیں جو یہ لوگ لیتے ہیں۔ اس میں تو کسی کو شک نہیں کہ ذکر بالجہر مستحب ہے جس پر یہ حدیث دلیل ہے کہ جس نے مجھے اپنے دل میں یاد کیا میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے لوگوں میں یاد کرتا ہے تو میں ان سے بہتر لوگوں میں اسے یاد کرتا ہوں۔ اس مفہوم کی اور

بھی بہت ساری احادیث ہیں جنہیں اگر معنوی اعتبار سے متواتر کہا جائے تو کچھ بعید نہیں جن سے ذکر بالجہر کا استحباب لازم آتا ہے اس لئے علماء فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت کریمہ میں دُوْنَ ' عِـنـدَ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جب تو بلند آواز سے ذکر کر رہا ہو تو تیرے دل میں خوف اور خشیت ہونی چاہئے مطلب یہ ہے کہ دل غافل نہ ہو بلکہ زبان اگر ذکر میں مشغول ہے اور اس سے آواز پیدا ہو رہی ہے تو دل بھی غافل نہ ہو بلکہ اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا خوف اور جلال چھایا ہو۔ اس کے علاوہ آیت کریمہ کے اور بھی مفاہیم بیان کئے گئے ہیں۔

فتح القدیر میں ہے کہ اختلاف تکبیر بالجہر کے بارے میں ہے۔ رہا قلبی ذکر تو وہ تو قطعی طور پر مستحب ہے۔ خواہ عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ ہو۔ عیدین کے دن تکبیرات کے علاوہ دوسرے اذکار بھی قطعی مستحب ہیں مگر اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ عید الفطر کے دن خصوصیت سے تکبیر مشروع ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک صحیح رائے وہ ہے جسے البحر الرائق کے مصنف نے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عیدگاہ کو جاتے ہوئے کوئی مخصوص تکبیر مشروع نہیں جبکہ صاحبین کے نزدیک مخصوص ذکر مشروع ہے ورنہ نفس تکبیر تو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے ہر وقت جہراً و اخفاءً مندوب اور مستحب عمل ہے۔ فقیہ ابوجعفر فرماتے ہیں کہ لوگوں کو تکبیر کہنے سے نہیں روکنا چاہئے کیونکہ عید کے دن اگر آپ لوگوں کو ذکر سے روکیں گے تو ان میں سستی آئے گی' اگر وہ چاہیں تو ذکر کریں۔ فقیہ ابوجعفر علیہ الرحمہ کی یہ رائے بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ ذکر بالجہر مکروہ نہیں ہے ورنہ وہ منع نہ کرنے کا حکم نہ دیتے کیونکہ مکروہ چیز سے رکنا تو ضروری ہے۔

نمازعید کا وقت اور دیگر مسائل

سورج جب ایک نیزہ یا دو نیزہ کے برابر بلند ہو جائے تو امام لوگوں کو باجماعت دو رکعتیں نماز عید پڑھائے۔ زوال سے پہلے مکروہ وقت کو چھوڑ کر ان نمازوں کو جب چاہے پڑھا جا سکتا ہے۔ نہ اس نماز کے لئے اذان ہوگی اور نہ ہی اقامت ہوگی۔ نماز عیدین سے پہلے گھر اور عیدگاہ میں کسی قسم کی نہیں پڑھی جا سکتی اور نہ ہی عیدین کی نماز سے فارغ ہو کر عیدگاہ میں کوئی نماز پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے بارے شیخین کی روایت ہے کہ:

ان رسول اللہ ﷺ خرج یوم عید فصلی رکعتین ولم یصل قبلها ولا بعدها.

آپ ﷺ عید پڑھنے گئے اور صرف دو رکعتیں نماز عید ادا فرمائی اور نہ اس سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ ہی بعد میں۔

وعن ابن عمر خرج یوم عید ولم یصل قبلها ولا بعدها وذکر ان النبی صلی اللہ علیه وسلم فعله. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق روایت ہے کہ آپ عید کے دن باہر تشریف لائے اور آپ نے عید سے پہلے اور عید کے بعد کسی قسم کی کوئی نماز نہ پڑھی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

عن جابر بن سمرة قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم العیدین غیر مرة

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک یا دو بار

ولا مرتین بغیر اذان ولا اقامة. (رواہ مسلم)

نہیں (کئی بار) عیدین کی نماز بغیر اذان اور اقامت کے ادا کی۔

اس موضوع پر بہت ساری احادیث مبارکہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ نماز عید کے بعد عید گاہ میں نماز پڑھنا تو صحیح نہیں لیکن گھر واپس آ کر کوئی پڑھنا چاہے تو ممانعت نہیں جائز ہے کیونکہ امام ابن ماجہ علیہ الرحمہ حدیث مبارک بیان فرماتے ہیں۔

عن ابی سعید الخدری قال کان رسول الله ﷺ لا یصلی قبل العید شیئا فاذا رجع الی منزله صلی رکعتین.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے۔ جب آپ ﷺ گھر تشریف لاتے تو دو رکعت نفل ادا فرماتے۔

عیدین کی تکبیرات کے متعلق وضاحت

پھر نماز عید بھی دوسری نمازوں کی طرح ہے بس اس میں زائد تکبیرات ہیں۔ ہمارے نزدیک کل چھ تکبیریں ہیں۔ تین پہلی رکعت میں ثناء کے بعد اور تعوذ اور قرأت سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں قرأت کے بعد اور رکوع کی تکبیر سے پہلے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عیدین میں کل تکبیریں بارہ ہیں۔ سات پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے اور پانچ دوسری رکعت میں قرأت سے پہلے۔ یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور صحابہ کرام میں بھی مختلف رہا ہے کیونکہ اس بارے رسول اللہ ﷺ کے عمل کی مختلف صورتیں تھیں۔

فعن ام المؤمنین عائشة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یکبر فی الفطر والاضحی فی الاولی سبع تکبیرات وفی الثانیة خمس سوی تکبیرة الرکوع. (رواہ ابوداؤد)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں رکوع کی تکبیر کو چھوڑ کر پانچ تکبیریں کہتے تھے۔

عن ابن عمرو بن العاص قال قال النبی صلی الله علیه وسلم التکبیر فی الفطر سبع فی الاولی وخمس فی الاخیرة القراءة بعدهما کلیهما.

حضرت ابن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عید الفطر کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دوسری میں پانچ اور قرأت ان دونوں کے بعد ہے۔

یہ دونوں حدیثیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کی تائید کرتی ہیں۔

عن سعید بن العاص قال سئلت ابا موسی وحذیفة کیف کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یکبر فی الاضحی والفطر فقال ابوموسی کان یکبر اربعا کتکبیره علی الجنازة فقال حذیفة صدق قال

سعید بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوموسیٰ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں کیسے تکبیریں کہتے تھے؟ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز جنازہ کی طرح چار تکبیریں کہتے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ

ابوموسی و کذلک اکبر فی البصرة حیث کنت علیھم. (رواہ ابوداؤد)

تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ انہوں نے سچ فرمایا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جب میں بصرہ میں لوگوں پر امیر تھا تو اسی طرح تکبیریں کہا کرتا تھا۔

یہ حدیث احناف کی رائے کی تائید کرتی ہے کیونکہ چار تکبیروں میں سے تین تکبیریں[1] زائد ہوتی تھیں اور دو تکبیریں دونوں رکعتوں میں رکوع میں جانے کے لئے کہی جاتیں۔

دونوں فریقین کی احادیث میں علماء نے کلام فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل فتح القدیر میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ عیدین کی تکبیرات کے بارے کوئی صحیح مرفوع حدیث نہیں ہے رہا صحابہ کے آثار تو اس میں موجود ہے کہ:

فعن ابن مسعود انہ کان یکبر فی العیدین تسعا اربعا قبل القراءة ثم یکبر فیرکع وفی الثانیة یقرء فاذا فرغ کبر اربعا ثم رکع. (رواہ مصنف عبدالرزاق)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عیدین میں نو تکبیریں کہتے تھے چار قرأت سے پہلے کہتے پھر تکبیر کہتے اور پھر رکوع کرتے اور دوسری رکعت میں قرأت کرتے اور قرأت سے فارغ ہوکر چار تکبیریں کہتے پھر رکوع کرتے۔

تکبیر افتتاح (تکبیر تحریمہ) کو شامل کیا گیا ہے کیونکہ وہ بھی قیام کی حالت میں کہی جاتی ہے۔ دوسری رکعت کی تکبیر (پہلی رکعت کے سجدہ سے اٹھنے کے وقت جو تکبیر کہی جاتی ہے) کو شامل نہیں کیا کیونکہ وہ دوسری رکعت کی طرف منتقل ہوتے ہوئے کہی جاتی ہے۔

امام محمد علیہ الرحمہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ

عن حماد عن ابراھیم عن عبد اللہ بن مسعود وکان قاعدا فی مسجد الکوفة ومعہ حذیفة بن الیمان وابو موسی الاشعری فخرج علیھم الولید بن عقبة وھو امیر الکوفة یومئذٍ فقال ان عیدا علیکم فکیف اصنع فقالا اخبرہ یا عبد الرحمن فامرہ عبد اللہ بن مسعود ان یصلی بغیر اذان ولا اقامة وان یکبر فی الاولی خمسا وفی الثانیة اربعا وان توالی بین القراء تین

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ کوفہ کی مسجد میں تشریف فرما تھے اور ان کے ساتھ حضرت حذیفہ بن الیمان اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ ان کے پاس ولید بن عقبہ آئے ان دنوں وہ کوفہ کے امیر تھے فرمایا: عید قریب ہے۔ میں نماز عید کیسے پڑھاؤں؟ حذیفہ بن الیمان اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے عرض کیا۔ اے عبدالرحمٰن (حضرت ابن مسعود کا اسم گرامی عبدالرحمٰن ہے) آپ انہیں بتائیں کہ نماز عید کیسے پڑھی جاتی ہے؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ولید کو

[1] تکبیر تحریمہ اور تین زائد تکبیروں کو ملا کر پہلی رکعت میں کل چار تکبیریں ہوئی اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد تین زائد اور ایک رکوع میں جانے کے لئے کل چار تکبیریں ہوئی۔ یہ تقسیم زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔

وان یخطب بعد الصلوة علی راحلته.

حکم دیا کہ وہ اذان اور اقامت کے بغیر (دو رکعتیں) اس طرح پڑھائے کہ پہلی رکعت میں پانچ تکبیریں اور دوسری میں چار تکبیریں کہے دونوں قراتوں میں کوئی وقفہ نہ کرے اور نماز کے بعد اپنی سواری پر خطبہ کہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ یہ اثر (حدیث) صحیح ہے۔ آپ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی موجودگی میں نماز عید کی یہ تفصیل بتائی۔ ایسے اثر کو مرفوع حدیث پر محمول کرنا چاہئے۔ ہم حنفی لوگ اسی اثر پر عمل کرتے ہیں۔

عن ابن عباس کبر سبعا فی الاولی وستا فی الآخر. (رواہ ابن ابی شیبہ)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ وہ پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں چھ تکبیریں کہا کرتے تھے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ نے سات سے مراد سات زائدہ تکبیریں مراد لی ہیں اور چھ تکبیروں کو بھی پانچ زائدہ اور ایک رکوع کی تکبیر پر محمول کیا ہے۔ اس کی دلیل ان سے متعلق روایت کردہ ایک اور حدیث ہے کہ انہوں نے بارہ تکبیریں کہیں۔ سات پہلی رکعت میں اور پانچ دوسری رکعت میں۔ اسی پر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ثابت ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اضطراب نہیں اور اس کی روایت بھی صحیح سند کے ساتھ کی گئی ہے۔ جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اثر میں اضطراب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہمارے طریقہ کی تائید ہوتی ہے۔

فعن عبد اللہ بن الحارث قال صلی ابن عباس فی یوم عید فکبر تسع تکبیرات خمس فی الاولی واربع فی الاخیرۃ دوالی بین القراء تین. (رواہ ابن ابی شیبہ)

عبد اللہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے عید کی نماز ادا فرمائی تو آپ نے نو تکبیریں کہیں۔ پانچ پہلی رکعت میں اور چار آخری (دوسری) رکعت میں اور دونوں قراتوں کو ملایا۔

حضرت امام عبد الرزاق علیہ الرحمہ نے بھی ایسے ہی روایت کیا ہے۔

شیخ ابن الہمام علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ عمل کرنے میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اثر پر مقدم ہے۔ شیخ ابن الہمام جب حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اثر کو اضطراب سے محفوظ تسلیم کر رہے ہیں تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عمل میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر مقدم اور قابل عمل ہو۔

امام کو رکوع میں پانے والا تکبیریں کیسے کہے گا؟

اگر کسی نے نماز عیدین میں امام کو رکوع میں پایا تو اس پر لازم ہے کہ کھڑے ہو کر تکبیریں کہے اور پھر رکوع میں مل جائے۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ تکبیروں میں لگ گیا تو امام سے رکوع میں نہیں مل سکوں گا تو فوراً رکوع کرے اور

رکوع کی حالت میں تکبیریں کہہ لے مگر امام ابو یوسف علیہ الرحمہ اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ رکوع قیام کی طرح ہے اسی لئے جو رکوع میں ملتا ہے وہ اس رکعت میں شامل سمجھا جاتا ہے اگر رکوع میں وقت کم ملا اور کچھ تکبیریں نہ کہہ سکا کہ امام نے سر اٹھالیا تو تکبیریں ترک کر دے کیونکہ امام کی اتباع واجب ہے۔ اگر پوری رکعت ہی چلی گئی تو اب وہ نمازی مسبوق ہے سلام کے بعد کھڑا ہو کر اپنی ایک رکعت پوری کرے گا اور اس میں تکبیریں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے کہے گا تاکہ تکبیرات پے در پے نہ ہو جائیں اور علی المرتضٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کے مطابق اس کی تکبیریں اس صورت میں بھی صحیح ہیں اور اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن اس سے اجماع کا خلاف لازم آئے گا اور وہ ہے پے در پے تکبیریں کہنا۔

اگر کسی نے دوسرے مذہب والے امام کی اقتداء میں نماز عید پڑھی تو اپنی رائے پر عمل ترک کرے اور امام کی اقتداء کرے کیونکہ اجتہادی مسائل میں امام کی اقتداء واجب ہے۔

ہمارے ائمہ کے نزدیک زائد تکبیریں واجب ہیں حتی کہ ان کے چھوٹ جانے پر سجدۂ سہو لازم آتا ہے اسی طرح رکوع کے لئے جو تکبیر کہی جاتی ہے وہ بھی واجب ہے کیونکہ یہ زائد تکبیروں کے فوراً بعد کہی جاتی ہیں۔

تکبیریں بھولنے کی صورت میں

اگر پہلی رکعت کی تمام زائد تکبیریں بھول گئیں یا بعض بھول گئیں اور سورت فاتحہ پڑھنے کے بعد یاد آیا کہ تکبیریں چھوٹ گئی ہیں تو فوراً تکبیریں کہے اور سورت فاتحہ کو دوبارہ پڑھے تاکہ ترتیب فوت نہ ہو جائے۔ اگر سورت پڑھنے کے بعد (یعنی رکوع سے پہلے) یاد آیا کہ تکبیریں نہیں پڑھیں تو تکبیریں کہے اور اس کے بعد رکوع کرے۔ اس صورت میں سورت فاتحہ اور ساتھ ملائی جانے والی سورت کا اعادہ نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ قرأت مکمل ہو گئی ہے اب اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

اگر کوئی شخص دوسری رکعت کی تمام تکبیریں بھول گیا یا بعض تکبیریں چھوٹ گئیں اور رکوع میں یاد آیا تو فوراً کھڑا ہو کر تکبیریں کہے کیونکہ رکوع ہوا ہے لیکن مستحکم[1] نہیں ہوا۔ سو رجوع واجب ہے تکبیریں کہہ کر دوبارہ رکوع کرے تاکہ ترتیب صحیح رہے اور اگر رکوع مکمل ہونے کے بعد یاد آیا کہ تکبیریں رہ گئی ہیں تو اب واپس نہ جائے کیونکہ رکوع مکمل ہو گیا ہے اور رکوع کے بعد تکبیریں کہنا مشروع نہیں ہے۔ اس لئے ان تمام صورتوں میں سجدۂ سہو کرے۔

وتر میں اگر دعائے قنوت رہ جائے تو اس صورت میں رکوع سے رجوع کرنا صحیح نہیں صرف آخر میں سجدہ کیا جائے گا۔ اس فرق کو ضرور ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ دعائے قنوت کا وجوب بہت کمزور دلائل سے ثابت ہے اس لئے تکبیروں کو دعائے قنوت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ میرے نزدیک زیادہ مناسب یہ ہے کہ رکوع کے بعد قومہ میں دعائے قنوت پڑھ لی جائے کیونکہ اکثر کے نزدیک قومہ ہی دعائے قنوت کا محل ہے۔

---

[1] استحکام سے مراد کسی رکن کا مکمل ہو جانا ہے جب کوئی رکن مکمل ہو جائے تو اس کا نقص یعنی اس کو ختم کر کے کسی پہلے رکن کی طرف لوٹنا صحیح نہیں۔

نمازِ عید کے بعد خطبہ پڑھنا سنت ہے

عید کی نماز سے فارغ ہو کر امام خطبہ دے۔ جمعہ کی طرح عیدین کے بھی دو خطبے ہوں گے اور دونوں خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لئے بیٹھے۔

روی نافع ان ابن عمر قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر وعمر یصلون العیدین قبل الخطبۃ. (رواہ البخاری ومسلم)

نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما عیدین کی نماز خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے۔

ان کے علاوہ یہ حدیث ترمذی اور نسائی میں بھی ہے۔ خطبہ کا عیدین کی نماز کے بعد پڑھا جانا تواتر سے ثابت ہے اور عہد نبوی سے آج تک یہ عمل برابر چلا آ رہا ہے جو شخص اس مسئلہ میں اختلاف رکھتا ہے وہ غلط فہمی کا شکار ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے دن اپنے آخری حج کے موقعہ پر بھی ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ وہ خطبہ نماز عید کے لئے نہیں تھا۔ شاید اسے اسی خطبہ سے غلط فہمی ہو گئی ہے۔ وہ خطبہ مناسک حج کا حصہ تھا جیسے شوافع کہتے ہیں لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ وہ عید کا خطبہ نہیں تھا۔ بنوامیہ نے عیدین سے پہلے خطبہ کو رواج دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے کیونکہ یہ بدعت تھی۔

فقد روی ابوسعید کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج یوم الفطر والاضحی الی المصلی واول مایبدء بہ الصلوۃ ثم ینصرف فیقوم مقابل الناس والناس جلوس علی صفوفھم فیعظھم ویوصیھم ویامرھم وان کان یرید ان یقطع بعثا او یامر بشئی امربہ ثم ینصرف.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید فطر اور عید قربان کے دن عیدگاہ کو تشریف لے جاتے تو سب سے پہلے آپ ﷺ نماز عید ادا فرماتے پھر لوگوں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے اور لوگ اسی طرح صفوں میں بیٹھے رہتے۔ آپ ﷺ (اپنے خطبہ میں) انہیں وعظ و نصیحت فرماتے اور انہیں حکم دیتے۔ اگر لشکر کو روانہ کرنا چاہتے یا کسی چیز کا حکم دینا چاہتے تو حکم دیتے پھر واپس لوٹتے۔

ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں لوگوں کا یہی معمول رہا حتی کہ (دور بنوامیہ میں) میں مروان کے ساتھ عید الاضحیٰ یا عید الفطر پڑھنے کے لئے گیا ان دنوں وہ امیر شہر تھا۔ جب ہم عیدگاہ آئے تو میں کیا دیکھتا ہوں ایک منبر (رکھا) ہے جسے کثیر بن الصلت نے بنایا تھا۔ مروان نے نماز سے پہلے منبر پر چڑھنے کا ارادہ کیا تو میں نے اسے کپڑے سے پکڑ کر کھینچا اور اس نے مجھے کھینچا۔ مروان منبر پر چڑھ گیا اور نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ میں نے اس سے کہا۔ بخدا تم (بنوامیہ) نے دین کو بدل ڈالا کہنے لگا اے ابوسعید! جو تو جانتا ہے وہ حالات نہیں رہے۔ میں نے کہا جو میں جانتا ہوں بخدا وہ اس سے بہتر ہے جو میں نہیں جانتا۔ مروان بولا لوگ نماز کے بعد خطبہ سننے کے لئے نہیں بیٹھتے اس لئے میں نے نماز سے پہلے خطبہ دے دیا ہے۔ اسے حضرت امام بخاری علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

مسلم نے بھی اس واقعہ کو اسی طرح نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح بیان ہے کہ مروان مجھ سے ہاتھ اس طرح چھڑانے لگا گویا وہ مجھے منبر کی طرف کھینچ رہا ہے اور میں اسے نماز کی طرف کھینچ رہا ہوں۔ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی تو میں نے کہا۔ کہاں جاتے ہو۔ پہلے تو نماز پڑھی جاتی ہے کہنے لگا اے ابوسعید! جو تو جانتا ہے اس کو چھوڑ دیا گیا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم اس سے بہتر کام نہیں کر سکتے جو میں جانتا ہوں انہوں نے یہ الفاظ تین بار کہے۔

ہمارے نزدیک عیدین کے بعد خطبہ دینا سنت ہے نماز کی شرائط میں سے نہیں۔

عن عبد الله بن السائب قال شهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوة العيد يوم الفطر فكبر تكبير العيد فلما قضى الصلوة قال انا نخطب فمن احب ان يجلس للخطبة فليجلس ومن احب ان يذهب فليذهب.

عبداللہ بن سائب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عید الفطر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھی تو آپ نے عید کی (زائد) تکبیریں کہیں اور جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو فرمایا: ہم خطبہ دیں گے جو خطبہ کے لئے بیٹھنا پسند کرے وہ بیٹھ جائے اور جو جانا چاہتا ہے چلا جائے۔

اسے ابوداؤد علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس روایت میں زائد الفاظ مروی ہیں اور ثقہ کی طرف سے زیادتی مقبول ہوتی ہے اور پھر ہمارے نزدیک تو مرسل ہے ہی مقبول جیسا کہ علم اصول الفقہ میں ہمارے مشائخ نے اس کی تصریح کی ہے۔

مناسب یہ ہے کہ عید کی نماز سے پہلے نماز عید کے پڑھنے کا طریقہ بیان کیا جائے اور پھر نماز پڑھ کر اگر عید الفطر ہے تو خطبہ میں اس سے متعلقہ مسائل کو ذکر کیا جائے اور اگر عید الاضحیٰ ہے تو قربانی کے مسائل سکھائے جائیں کیونکہ وقت کی مناسبت سے ان مسائل کے بارے گفتگو کرنا ضروری ہے اور بہتر یہ ہے کہ فضائل کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بتائے جائیں۔

نمازِ عید کے بعد راستہ بدل کر گھر آنا افضل ہے

نماز عید پڑھ کر گھر آنا چاہئے اور راستہ بدل کر واپس لوٹنا زیادہ بہتر ہے۔

روى جابر كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كان يوم عيد خالف الطريق.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے روز راستہ بدل لیتے تھے۔

اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

شہر سے باہر عید گاہ میں نماز پڑھنے میں زیادہ فضیلت ہے کیونکہ شروع سے آج تک اہل اسلام کا یہی معمول چلا آ رہا ہے لیکن جہاں تک جواز کا تعلق ہے تو عیدین کی نماز مسجد میں بھی پڑھی جا سکتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بارش کی وجہ سے نماز عید مسجد میں ادا فرمائی جیسا کہ حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ کی روایت سے واضح ہے۔

عید کی نماز کا حکم

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک عید کی نماز واجب ہے اور صاحبین کے نزدیک تمام سنتوں سے زیادہ اہم سنت ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت سنت کی بھی ہے۔ یہی رائے تینوں اماموں شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام مالک علیہم الرحمہ کی بھی ہے۔ مشائخ نے عیدین کے وجوب پر سوائے مواظبت کے اور کوئی دلیل نقل نہیں فرمائی ہے لیکن کسی عمل پر مواظبت اس کے واجب ہونے کی دلیل نہیں جیسے اذان پر مواظبت ہے زندگی میں اسے کبھی بھی ترک نہیں فرمایا آج تک یہ عمل مسلسل ہر روز سرانجام دیا جارہا ہے لیکن یہ واجب نہیں، سنت ہے اس کے علاوہ اقامت وغیرہ کئی دوسرے امور سنت ہیں حالانکہ ان پر مواظبت پائی گئی ہے۔

نماز عید کے سنت ہونے کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی ہے: کہ جب ایک دیہاتی نے سوال کیا کہ کیا اس کے علاوہ بھی میرے ذمہ کچھ ہے تو آپ نے فرمایا تھا نہیں ہاں اگر تو نفلی طور پر کچھ کرنا چاہے تو۔ اس کا جواب علماء یہ دیتے ہیں کہ دیہاتی تو شہر سے باہر دیہات میں سکونت پذیر تھا اور اس وجہ سے اس پر نماز عیدین فرض نہیں تھی اس لئے اس سے اس کی سنت کیسے ثابت ہوتی ہے؟

عیدین کی نماز کے وجوب اور ادائیگی کے لئے بالکل وہی شرائط ضروری ہیں جو جمعہ کی نماز کے لئے ضروری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عیدین میں خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے اور جمعہ میں پہلے وقت بھی عیدین کی نماز کے لئے شرط ہے کیونکہ اس بات پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ نماز عید کی قضاء نہیں۔

عیدالاضحیٰ کی نماز کا وقت

عیدالاضحیٰ کی نماز کا وقت سورج کے بلند ہونے سے زوال تک اور یہ عید قربانی کے تین دن تک (یعنی دسویں، گیارویں اور بارہویں ذی الحجہ) پڑھی جاسکتی ہے۔ تینوں دنوں میں وقت وہی ہوگا لیکن پہلے روز پڑھنا سنت ہے اور دوسرے یا تیسرے دن تک دیر کرنا بہت بری بات ہے کیونکہ اس سے ایسی سنت کی مخالفت لازم آتی ہے جو صدیوں سے برابر جاری ہے۔ ہاں اگر چاند کے نظر آنے کی شہادت اس وقت پہنچی جب وقت گزر چکا تھا تو پھر دوسرے یا تیسرے دن تک دیر کی جاسکتی ہے اسی طرح سخت بارش یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے بھی اس میں تاخیر ہوسکتی ہے لیکن بلاوجہ تاخیر سنت کی مخالفت ہے اور سنت مبارکہ کی مخالفت بری بات ہے ان تین دنوں کے بعد نماز عیدالاضحیٰ نہیں پڑھی جاسکتی خواہ یہ تاخیر عمداً کی گئی ہو یا بامہ مجبوری ہوگئی ہو کیونکہ نماز عیدین کی قضاء نہیں۔

قربانی کے تین ایام ہیں

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ایام تشریق تمام کے تمام نماز عید کے دن ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک چوتھے دن تک نماز اضحیٰ ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ان کے نزدیک قربانی بھی چوتھے دن کی جاسکتی ہے لیکن خلاف سنت ہونے کی وجہ سے اس میں برائی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چوتھے دن تک نماز اور قربانی

اس لئے جائز ہے کہ یہ ایام ایام منیٰ شمار ہوتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ ایام منی وہ ہیں جن میں منیٰ سے واپسی نہیں ہو سکتی۔ چوتھے دن منیٰ سے واپس آیا جا سکتا ہے اور ایام منیٰ عید کے دن ہیں کیونکہ:

عن عائشة ام المؤمنين قالت ان ابابكر دخل عليها وعندها جاريتان في ايام منى قدفان وتضربان والنبي صلى الله عليه وسلم متغش ثوبه فانتهر هما ابوبكر فكشف النبي صلى الله عليه وسلم عن وجهه وقال دعهما يا ابابكر فانها ايام عيد. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق میرے گھر میں تشریف لائے ان کے پاس دو بچیاں تھیں جو ایام منیٰ کے موقعہ پر دف بجا کر گانا گا رہی تھیں اور نبی کریم ﷺ چادر تان کر آرام فرما رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان بچیوں کو جھڑکا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے چہرۂ اقدس سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا اے ابوبکر! انہیں چھوڑ دو یہ عید کے دن ہیں۔

ان ابن عمر قال الاضحى يومان بعد يوم الاضحى. (رواہ الامام مالک)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: عید الاضحیٰ کے بعد قربانی کے دو دن ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کی ایک حدیث امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی روایت فرمائی ہے اور وقت کا تعین ایسا معاملہ ہے جس میں رائے کو دخل نہیں اس لئے حضرت ابن عمر کا یہ اثر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ سو ثابت ہوا کہ قربانی تین دن تک ہو سکتی ہے اسی طرح عید الاضحیٰ کی نماز بھی تین دن (دسویں، گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ) تک پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ نماز قربانی کے دنوں میں ہی پڑھی جا سکتی ہے۔

عیدالفطر کی نماز کا وقت

عیدالفطر کی نماز کا وقت بھی آفتاب کے بلند ہونے سے زوال تک ہے لیکن یہ نماز شوال کی صرف پہلی تاریخ کو پڑھی جا سکتی ہے۔ ہاں اگر کسی عذر کی وجہ سے تاخیر ہو جائے اور پہلے دن نہ پڑھی جا سکے تو پھر دوسرے دن، اس سے مؤخر نہیں ہو سکتی ہے جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے۔

عن عمير بن انس عن عمومة له من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ان ركبا جاؤا الى النبي صلى الله عليه وسلم يشهدون انهم رؤا الهلال بالامس فامرهم ان يفطروا واذا اصبحوا ان يغدوا الى مصلاهم. (رواہ ابوداؤد والترمذی)

حضرت عمیر بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے چچاؤں سے سنا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے کہ سواروں کا ایک گروہ یہ گواہی دینے کے لئے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا کہ انہوں نے کل چاند دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان کو حکم دیا کہ روزہ افطار کر دو اور صبح کو عیدگاہ آ جاؤ۔

دوسرے دن سے مؤخر کرنا جائز نہیں اگر عذر ہو تب بھی تیسرے دن عید الفطر نہیں پڑھی جا سکتی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

ایامِ تشریق کون سے ہیں؟

تکبیریں کہنا سنت ہے تکبیر یوں کہنی چاہئے۔ الله اکبر' الله اکبر لا اله الا الله والله اکبر' الله اکبر ولله الحمد۔ یہ تکبیرات نویں ذی الحجہ کی فجر سے لے کر ایام تشریق کے آخری دن کی عصر کی نماز تک کہی جائیں۔ یہ صاحبین کے نزدیک ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عید کے دن کی نماز عصر تک تکبیرات کہی جائیں گی۔ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

یہ مسئلہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے درمیان بھی مختلف فیہ رہا ہے۔

فعن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه انه کان یکبر بعد الفجر من یوم عرفة الی صلوة العصر من آخر ایام التشریق.

حضرت امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نویں ذی الحجہ کی نماز فجر سے ایام تشریق کے آخری دن کی نماز عصر تک تکبیریں کہتے تھے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن ابی شیبہ علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے امام محمد علیہ الرحمہ اپنی مؤطا میں بیان کرتے ہیں۔

عن ابراهیم النخعی عن امیر المؤمنین علی وعن ابن مسعود انه کان یکبر من صلوة الفجر یوم عرفة الی صلوة العصر من یوم النحر یقول الله اکبر الله اکبر الی الآخر.

ابراہیم نخعی سے اور وہ امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ نویں ذی الحجہ کی نماز فجر سے قربانی کے دن کی نماز عصر تک تکبیریں کہتے تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تکبیر اس طرح کہتے۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر......الخ

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کا عمل حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے پر ہے جبکہ صاحبین حضرت امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ چونکہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے زیادہ محتاط ہے اس لئے اس پر عمل ہے اور علماء اس پر فتویٰ دیتے ہیں پھر صاحبین کی رائے میں تکبیرات تشریق سنت ہیں۔ جبکہ امام ابوحنیفہ اور دوسرے کئی مشائخ علیہم الرحمہ کے نزدیک یہ تکبیرات واجب ہیں لیکن واجب کی اس کے سوا اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اس کے لئے واذکروا الله فی ایام معدودات کی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ ایام معدودات سے مراد ایام تشریق ہیں اور اس آیت سے وجوب صرف اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے جب یہ حکم ہر مکلف مسلمان کے لئے ہو اور ذکر سے مراد نمازوں کے بعد تسبیح ہو مگر جب یہ خطاب حاجیوں کو ہو جیسا کہ سیاق کلام سے ظاہر ہے تو ذکر سے مراد منیٰ میں نمازیں ہوں گی اور معنی یہ ہوگا کہ منیٰ میں چند دن تک نمازیں پڑھو یا اس سے مطلق ذکر مراد لیا جائے اور امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ استحباب کے لئے ہو چونکہ یہ تمام احتمالات پائے جا سکتے ہیں اس لئے اس آیت سے تکبیرات کا وجوب ثابت نہیں ہو سکتا۔

کیا تکبیرات کہنے کے لئے کوئی شرط ہے؟

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک تکبیرات کہنے کے لئے یہ شرط ہے کہ تکبیریں کہنے والا مقیم ہو۔ شہر ہو اور مسنون طریقہ سے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے۔ مسنون جماعت سے مراد ایسی جماعت ہے جو عورتوں پر مشتمل نہ ہو بلکہ مردوں کی ہو۔ صاحبین کے نزدیک ان تکبیروں کے لئے کسی قسم کی کوئی شرط نہیں۔ صاحبین علیہما الرحمہ کا قول ہی زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان شرائط پر کوئی شافی دلیل نہیں ہے۔ واللہ اعلم باحکامہ۔

نماز وتر کا بیان

نماز وتر کا حکم

نماز وتر کے بارے ائمہ میں اختلاف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک وتر کی نماز واجب ہے۔ یہ ان کی ظاہر الروایۃ ہے۔ جبکہ صاحبین کے نزدیک یہ سنت ہے جس کے بارے نسبتاً زیادہ تاکید پائی جاتی ہے حتیٰ کہ اگر وتر کی نماز رہ جائے تو اسے قضاء کرنا پڑتا ہے اور اس کی قضاء کے لئے عشاء کی نماز کی قضاء ضروری نہیں۔

وجوب کی دلیل یہ ہے۔

عن بریدۃ الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا. (رواہ ابوداؤد)

حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وتر کی نماز حق ہے۔ جس نے نماز وتر ادا نہ کی وہ ہم میں سے نہیں۔

اسی طرح ایک اور ارشادِ نبوی سے اس کے وجوب کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ زادکم صلوۃ ھی خیر لکم من حمر النعم الوتر وھی لکم فیما بین العشاء والصبح.

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز کا اضافہ فرمادیا ہے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر ہے اور وہ نماز وتر کی ہے یہ نماز تم عشاء اور صبح کے درمیان پڑھ سکتے ہو۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس کو راہویہ نے ایک ایسی سند کے تحت روایت کیا ہے جس میں قرہ کا نام آتا ہے۔ قرہ نے اس حدیث کو حضرت عمرو بن العاص اور عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے اور قرہ کو ابن معین وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی حدیث کو طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ اس روایت میں ابوعمر النضر کا نام ہے جسے دارقطنی نے ضعیف گردانا ہے۔ اس حدیث کو دارقطنی بھی روایت کرتے ہیں۔ ان کی سند میں حمید بن جون کا نام ہے۔ اس سند کے تحت روایت کردہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز کا اضافہ فرمادیا ہے اور وہ نماز وتر ہے۔ طبرانی نے اسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے بھی روایت کیا ہے جس کی سند میں مذکورہ نضر شخص ہے۔ حاکم کی بیان کردہ حدیث میں ابن لہیہ' ابی نضرہ سے راوی ہیں اور اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔ اسے عشاء اور صبح کے درمیان پڑھو۔ اسی حدیث کو ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ اور حاکم علیہم

الرحمہ نے روایت کیا ہے اور اس سند کے الفاظ یہ ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک نماز کا حکم دیا ہے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور اس کا وقت عشاء اور فجر کے درمیان مقرر فرمایا ہے۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔ یہ فتح القدیر کی گفتگو کا خلاصہ تھا۔

ان اسانید کو ذکر کرنے کے بعد انہوں نے ابوداؤد علیہ الرحمہ کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اگرچہ انہوں نے اسے خارجہ سے روایت کیا ہے اور خارجہ میں کلام ہے۔ امام ابن الہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو دو وجوہات کی بناء پر وجوب کی دلیل بنایا گیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وتروں کو الزیادۃ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور زیادہ کیلئے مزید علیہ (جس سے زیادہ ہے) کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں نفل سے زیادہ مراد نہیں کیونکہ نفلوں کی تو کوئی حد نہیں وہ غیر محصور ہیں بلکہ یہاں فرائض سے زیادہ مراد ہے لہٰذا فرائض سے زیادہ کے الفاظ سے وجوب لازم آتا ہے۔ سنن سے زیادہ مراد لینا بھی مناسب نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ امر کا صیغہ وجوب کے علاوہ استحباب وغیرہ کے لئے بھی آتا ہے مگر اس کے لئے قرینہ چاہئے اور ابن لہیعہ کی روایت کے علاوہ کسی اور روایت میں امر کا صیغہ نہیں اور پہلے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ ابن لہیعہ ضعیف ہیں۔ ابی نضرہ کی روایت میں بھی امر کا صیغہ ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس سے استدلال کیا جائے کیونکہ اس کی سند ایسی ہے کہ اس سے استدلال ہو سکتا اور امر مطلق حقیقت میں وجوب کے لئے ہے جیسا کہ علم اصول الفقہ سے ظاہر ہے۔

جو علماء وتر کو واجب نہیں سمجھتے وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ واجب کوئی معمولی نوعیت کا مسئلہ نہیں وہ ایک عظیم معاملہ ہے اس کے تارک کو سزا دی جائے گی اور اس بارے روز قیامت اس سے سختی کی جائے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ واجب اتنا واضح ہو جس کی ہر مکلف معرفت رکھتا ہو کیونکہ ہر مکلف کو اس کی معرفت کی ضرورت ہے۔ خصوصاً جب وہ کسی شرط سے مشروط نہ ہو تو یہ تمام مکلفین کو عام ہوتا ہے اور معرفت کی وجہ سے ہر ایک شخص پر اس کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ وہ ایسی ضروری چیزوں کو وضاحت سے بیان فرما دیتے تھے اور ان کی شہرت کا اہتمام فرماتے تھے۔ اس لحاظ سے اگر وتر واجب ہیں تو ان کو مشہور ہونا چاہئے تھا اس لئے اس ضمن میں کسی ایک شخص کی روایت قابل قبول نہیں پھر تابعین علیہم الرحمہ کا بھی یہ طریقہ تھا اسی طرح ان کے بعد والے اہل علم کی بھی یہ عادت تھی کہ وہ احادیث کے بارے مکمل چھان بین کرتے خصوصاً جب معاملہ واجبات کا ہوتا تو خوب تحقیق کی جاتی تھی۔ اس لئے ناممکن ہے کہ ایسے اہم امر سے صرف چند آدمی مطلع ہوئے اور باقی سب بے بہرہ رہے اور ان کی حالت بھی یہ ہے کہ وہ اہل علم کے نزدیک ضعیف ہیں ان کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور وہ مصروف لوگوں میں شمار نہیں ہوتے۔ اس لئے اہل خرد کے نزدیک انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وتر نماز کو واجب خیال نہ کیا جائے اور وتر کے وجوب کے بارے جو احادیث روایت کی گئی ہیں ان سے اعراض کیا جائے اور ان سے واجب کا ثبوت نہ کیا جائے۔ مذکورہ حدیث کو اگر صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس کی تاویل ضروری ہے۔ یہاں امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ استحباب کیلئے ہوگا اور لفظ وجوب (حدیث میں جس کا ذکر ہے) کا معنی ہوگا ثبوت۔

مطلب یہ بنے گا کہ وتر کی نماز ایک ثابت شدہ حق ہے اور اس لفظ کا استعمال محض تاکید کے لئے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد جس نے وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔ اسی طرح ہے جس طرح حضور ﷺ نے فرمایا: کہ نکاح میرا طریقہ ہے اور جس نے میرے طریقہ کو چھوڑا وہ ہم میں سے نہیں حالانکہ ہم اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ نکاح سنت ہے۔

اسی حدیث کے علاوہ قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کو بھی بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کہتے ہیں کہ نمازوں کی تعداد جفت نہیں طاق ہے۔ (اگر وتر کو واجب شمار کریں تو پانچ کی بجائے چھ نمازیں بن جاتی ہیں) اور اس طرح درمیانی نماز کا اطلاق کسی نماز پر نہیں ہوسکتا۔ اگر وتر واجب ہوں تو یہ تعداد جفت ہوگی اس لئے وتر نماز کو واجب یا فرض نہیں کہا جاسکتا۔

وتروں کا واجب ہونا فرض نمازوں کے طاق ہونے کے منافی نہیں کیونکہ ہم کہتے ہیں واجب اور فرض کے درمیان فرق شارع علیہ السلام کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ فرق تو صرف ہمارے نزدیک معتبر ہے۔ ہم قطعیت اور ظنیت کے اعتبار سے فیصلہ کرتے ہیں کہ کون سا فعل فرض ہے اور کون سا واجب؟ رہا شارع علیہ السلام کے نزدیک ان کا حکم تو ان کے نزدیک دونوں مطلوب ہیں۔ تو اس کا جواب صرف یہی ہے کہ وتریت اور وسطیت وقت کے اعتبار سے ہے۔ نماز وسطیٰ سے مراد وہ نماز ہے جس کا وقت درمیان میں ہے۔ اگر عشاء اور وتر کا وقت ایک ہے تو عصر کا وقت درمیانی وقت ہے اور اس طرح عصر کی نماز درمیانی نماز ہے۔

اب رہی حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کے سوال میں اسلام کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ رات اور دن میں پانچ نمازیں پڑھی جائیں تو اس شخص نے پوچھا تھا کہ کیا اس کے علاوہ کچھ اور بھی فرائض ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا نہیں ہاں اگر تو نفلی عبادت کرنا چاہئے تو وہ الگ بات ہے جیسا کہ اس حدیث کو بالتفصیل بخاری اور مسلم میں روایت کیا گیا ہے۔

علماء اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب وتر کی نماز واجب نہیں ہوئی تھی۔ یہ محض دعویٰ ہے اور یہ حدیث اس وقت تک قابل عمل رہے گی جب تک کسی اور حدیث کے ساتھ اس کا معارضہ نہ ہو یا کسی دوسری حدیث سے اس کا نسخ نہ ہو جس حدیث کو انہوں نے وجوب کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے وہ دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ اس کی سند کمزور ہے جب کوئی دوسری حدیث اس کے مقابلے میں آئے گی تو اس سے استدلال صحیح نہیں ہو سکے گا۔

وقد روى ابوداؤد قال عبد الله الصنابحي قلت لابن الصامت زعم ابومحمد ان الوتر واجب قال ابن الصامت كذب ابومحمد انى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول خمس صلوت	حضرت امام ابوداؤد علیہ الرحمہ روایت کرتے ہیں کہ عبد اللہ الصنابحی نے فرمایا کہ میں نے ابن صامت سے پوچھا کہ ابومحمد کا خیال ہے کہ وتر کی نماز واجب ہے۔ ابن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ابومحمد جھوٹا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض

افتـرضهـن الـلـه مـن احسـن وضـوءهـن وصـلاهـن لـوقتهـن واتـم ركـوعهـن وسـجـودهـن وخشوعهن كان له على الله عهـد ان يـغفرله ومن لم يفعل فليس له على الله عهد انشاء الله غفرله وانشاء عذبه.

فرمائی ہیں۔ جس نے اچھی طرح وضو کیا۔ ان نمازوں کو ان کے وقت پر ادا کیا۔ پوری طرح رکوع و سجود بجالایا اور پورے خشوع وخضوع کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ کا اس کے ساتھ وعدہ ہے کہ وہ اس کی لغزشوں کو معاف فرمادے گا اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ نہیں چاہے تو اسے بخش دے اور چاہے تو اسے عذاب دے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک پانچ سے زیادہ نمازیں فرض نہیں تھیں اور ہر رات کو اس قسم کی نماز کا واجب ہونا عقل سے بعید ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن بھیجا اور آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: یمن کے لوگوں کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات میں پانچ نمازیں ان پر فرض کی ہیں جیسا کہ بخاری اور مسلم میں یہ حدیث موجود ہے اور اس کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کے وصال سے کچھ عرصہ پہلے یمن تشریف لے گئے اور وتر کی نماز یقیناً ان کے یمن جانے سے پہلے مشروع تھی اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وتر مشروع تو ان کے جانے سے پہلے ہوئے ہوں اور ان کے وجوب کا حکم ان کے یمن جانے کے بعد ہوا ہو لہٰذا وتر کی نماز اس حدیث کی رو سے واجب نہیں ہے۔

وتر ایک نفلی نماز ہے۔ اس کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ رمضان میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ساتھ رات کو قیام فرمایا اور ان کو آٹھ رکعتیں پڑھائیں اور وتر بھی پڑھائے پھر دوسری رات آپ تشریف نہ لائے تو صحابہ کرام علیہم الرضوان نے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں وتر نماز تم پر فرض نہ ہو جائے۔ فتح القدیر میں ہے کہ اس حدیث کے راوی ابن حبان ہیں۔ امام ابن ہمام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حضور ﷺ کی وتر سے مراد پوری آٹھ رکعتیں اور وتر کی تین یعنی کل گیارہ رکعتیں مراد ہیں۔ ان کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ نماز (تہجد) تم پر فرض نہ ہو جائے۔ اس سے معلوم صرف اتنا ہوتا ہے کہ گیارہ رکعتیں ساری کی ساری واجب نہیں ہیں یہ فتح القدیر میں جو گفتگو کی گئی ہے اس کا خلاصہ تھا۔ یہ اطلاق اگرچہ فی نفسہ بعید نہیں لیکن حدیث کے الفاظ اس کو قبول نہیں کرتے کیونکہ حدیث میں آٹھ رکعتوں کے علاوہ جو نماز پڑھی گئی اس کو وتر کا نام دیا گیا ہے۔ اگر امام ابن ہمام کی بات کو قبول کیا جائے تو گویا ان کے نزدیک وتر نماز کی گیارہ رکعتیں ہیں۔

وتر نماز کے سنت ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ وتر کی نماز میں وجوب کی علامات اذان اور اقامت نہیں پائی جاتیں اور بقول صاحب ہدایہ کے ''عشاء کی نماز کے لئے دی جانے والی اذان ہی وتر نماز کے لئے کافی ہے'' کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ عشاء کی اذان تو عشاء کے وقت کے شروع ہوتے ہی ہو جاتی ہے اور وتر کو آخری رات میں پڑھنا واجب ہے تو پھر عشاء کی اذان وتر نماز کے لئے کیسے کافی ہو سکتی ہے؟ پھر وتروں کی جماعت بھی نہیں

ہوتی۔ رمضان شریف میں بالتبع ان کی جماعت ہوتی ہے کیونکہ اس سے پہلے نماز تراویح باجماعت ادا کی جاتی ہے جونفل نماز ہے۔ وتر کی جماعت کونفل نماز کی جماعت کے تابع بنانا اورنفل نماز (تہجد) کے ساتھ اس کوادا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نماز واجب نہیں بلکہ نفل (سنت) ہے۔

نمازِ وتر کا وقت

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وتر اور نماز عشاء کا وقت ایک ہی ہے اور عشاء کی نماز کے بعد نماز وتر ادا ہوگی کیونکہ ترتیب شرط ہے اگر کسی نے بھول کر وتر کی نماز عشاء کی نماز سے پہلے پڑھ دی اور پھر اسے یاد آیا کہ میں نے تو عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی اور محض گمان کی بناء پر وتر کی نماز پڑھ دی تو اعادہ ضروری نہیں کیونکہ نسیان کی وجہ سے یہ شرط ساقط ہو جائے گی۔

امام صاحب کے نزدیک ترتیب شرط ہے تو اس کے لئے دلیل چاہیے سوسوائے مواظبت کے ان کے پاس اس کی کوئی اور دلیل نہیں۔

صاحبین کے نزدیک وتر نماز کا وقت عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہی رائے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اگر کسی نے عشاء سے پہلے نماز وتر پڑھ دی اگر چہ بھول کر پڑھ دی ہو تو نماز نہیں ہوگی اور اعادہ کرنا پڑے گا کیونکہ نماز وقت سے پہلے نہیں پڑھی جاسکتی۔ صاحبین دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

عن خارجة بن حذافة قال خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال قد امدكم الله بصلوة هي خير لكم من حمر النعم وهي الوتر فجعلهما لكم ما بين العشاء الاخيرة الى الصبح. (رواہ الترمذی وابوداؤد)

حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نماز کے ذریعے تمہاری مدد فرمائی ہے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور وہ نماز وتر ہے اور اس کے لئے جو وقت مقرر فرمایا ہے وہ عشاء کے آخری وقت اور صبح کے درمیان کا وقت ہے۔

اگر نماز وتر رہ جائے اور صبح طلوع ہو جائے تو اس کی قضاء ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو اس لئے ضروری ہے کہ یہ نماز واجب ہے اور صاحبین کے نزدیک اس کی قضاء اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بارے تمام سنتوں سے زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ قریب الی الواجب ہے پھر وتروں کی قضاء بالتبع نہیں (یعنی عشاء کی نماز رہ جائے تو تب) بلکہ اگر صرف وتر رہ جائیں تو انہیں اکیلا بھی قضاء کی صورت میں پڑھا جائے گا کیونکہ یہ نماز عشاء کی نماز کے تابع نہیں ہے جبکہ فجر کی سنتیں فجر کی نماز کے تابع ہیں (اس لئے فجر کے فرضوں کے ساتھ ان کو قضاء پڑھا جاتا ہے الگ نہیں)۔

رواه ابوسعيد قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من نام عن وتره فليصل اذا اصبح. (رواہ الترمذی)

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو سو جائے اور وتر نماز نہ پڑھ سکے تو وہ صبح کے وقت انہیں پڑھ لے (یعنی قضاء کر لے)۔

وتر کی تین رکعتیں اور دعائے قنوت کے متعلق ائمہ کے دلائل

وتر کی تین رکعتیں ہیں اور ہمارے ائمہ کے نزدیک یہ تینوں رکعتیں اکٹھی پڑھی جائیں گی اور ان کے آخر میں ایک ہی سلام ہوگا کیونکہ ابن ابی شیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں۔

عن الحسن اجمع المسلمون علی ان الوتر ثلث لایسلم الا فی اخرھن.

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راویت ہے کہ اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں، سلام نہیں پھیرا جائے گا مگر ان کے آخر میں۔

امام طحاوی، ابن ابی زیاد سے اور وہ ساتوں فقہاء سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابی بکر بن عبد الرحمٰن، خارجہ بن زید، عبید اللہ بن عبد اللہ اور سلیمان بن یسار علیہم الرحمہ سے روایت کرتے ہیں کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے آخر میں (ایک ہی بار) سلام پھیرا جاتا ہے۔ یہ دونوں روایتیں فتح القدیر میں ہیں۔

(وتر عام نماز کی طرح پڑھے جاتے ہیں بس فرق اتنا ہے کہ) تیسری رکعت کی قرأت کے بعد تکبیر کہہ کر رفع یدین کیا جاتا ہے اور کھڑے ہو کر دعائے قنوت پڑھی جاتی ہے اور اس کے بعد رکوع کیا جاتا ہے ہمارے ائمہ احناف کے نزدیک وتر پڑھنے کا یہی طریقہ ہے جو سنت سے ثابت ہے۔

عن ابی بن کعب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یوتر بثلث یقرء فی الاولی سبح اسم ربک الا علی وفی الثانیة قل یایھا الکافرون وفی الثالثة قل ھو اللہ ویقنت قبل الرکوع. (رواہ النسائی)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت میں آپ ﷺ سورت سبح اسم ربک الا علی پڑھتے۔ دوسری رکعت میں سورت قل یایھا الکافرون اور تیسری میں سورت قل ھو اللہ احد پڑھتے اور رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھتے۔

فتح القدیر میں ایسے ہی ہے۔

عن عبد اللہ بن مسعود ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قنت فی الوتر قبل الرکوع.

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وتر کی نماز میں رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھی۔

ابن الہمام کے بقول ابن جوزی علیہ الرحمہ نے التحقیق میں اسے ذکر کیا ہے اور اس کے بارے خاموشی اختیار کی ہے۔

طبرانی ایک حدیث مبارک پیش کرتے ہیں:

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوتر بثلث رکعات ویجعل القنوت قبل الرکوع.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ تین رکعت نماز وتر پڑھتے تھے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے۔

فتح القدیر میں ہے کہ یہ روایات یا تو حسن ہیں یا صحیح ہیں (کوئی ضعیف روایت نہیں جو قابل استدلال نہ ہو)۔

امام شافعی اور کئی دوسرے علماء فقہ فرماتے ہیں کہ وتر کی نماز ایک سے لے کر نو رکعتوں تک پڑھی جاسکتی ہے۔

عن ابی ایوب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الوتر حق علی کل مسلم فمن شاء ان یوتر بسبع فلیفعل ومن احب ان یوتر بخمس فلیفعل ومن احب بثلثة فلیفعل ومن احب بواحدة فلیفعل. (رواہ النسائی وابوداؤد)

حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نماز وتر حق (خداوندی) ہے یہ ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے جو وتر کی نماز سات رکعتوں میں پڑھنا چاہے وہ سات رکعتیں پڑھ لے جو پانچ رکعتیں پڑھنا پسند کرے وہ پانچ رکعتیں پڑھ لے جو تین رکعتیں پڑھنا چاہے تین رکعتیں پڑھے اور جو ایک رکعت پڑھنے کا خواہاں ہو وہ ایک رکعت پڑھے۔

ابوداؤد علیہ الرحمہ کی روایت میں یہ الفاظ نہیں' سات رکعتیں پڑھنا چاہے تو سات پڑھ لے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ وتر کی رکعتوں کی تعداد ایک سے سات تک ہے۔ رہا نو کا جواز تو وہ مسلم کی روایت سے ثابت ہے۔ جس میں یہ الفاظ بھی ہیں نو رکعتیں پڑھے اور سوائے دوسری کے کسی رکعت کے بعد قعدہ نہ کرے۔

جب کوئی شخص وتروں کی ایک رکعت پڑھنا چاہتا ہو تو اس کے لئے لازمی ہے کہ اسے جفت رکعتوں والی نفلی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھے۔ اگر بہت سی جفت رکعتیں ملائیں تو بھی جائز ہے اور کم از کم دو رکعتیں ضروری ہیں تا کہ اس سے پہلے پڑھی جانے والی نماز نفل شمار ہو سکے۔

روی ابن عمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یسلم فی الرکعتین فی الوتر حتی یامر ببعض حاجة. (رواہ البخاری ومالک)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیتے حتی کہ آپ کسی کام کا حکم ارشاد فرما دیتے۔

کیا وتروں کے علاوہ کسی اور نفل نماز کی صرف ایک رکعت پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ جائز ہے جبکہ امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کی ایک روایت عدم جواز کی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ طلق بن علی فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ ایک رات میں دو وتر نہیں پڑھے جا سکتے۔ اسے امام ترمذی نے بیان کیا ہے۔

اگر کوئی شخص وتر کی تین رکعتیں پڑھے (یعنی ایک رکعت نفل کی اور دوسری وتر کی) اور صرف ایک بار آخر میں سلام پھیرے تو یہ جائز ہے۔

روی ام المؤمنین عائشة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لایسلم فی رکعتی الوتر. (رواہ النسائی)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوة اللیل مثنی مثنی فاذا

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رات کی نماز دو دو رکعتیں پڑھی جاتی

اردت ان تنصرف فارکع رکعة توتر لک ماصلیت قال القاسم وقدرأینا اناسامنذادرکنا یوترون بثلث وان کلا لواسع. (رواہ مسلم)

ہیں۔ جب تو لوٹنے کا ارادہ کرے تو ایک رکعت پڑھ لے تا کہ تو نے جو نماز پڑھی ہے وہ وتر ہو جائے۔ قاسم فرماتے ہیں کہ ہم نے کئی لوگوں کو دیکھا کہ وہ وتر کی تین رکعتیں پڑھتے ہیں تو ان تمام کی گنجائش ہے۔

پھر شوافع کے ہاں یہ مشہور ہے کہ جب وتروں کی تین رکعتیں پڑھی جائیں اور ایک سلام سے پڑھی جائیں تو دو رکعتوں کے بعد قعدہ کرنا اور تشہد تک پڑھنا ضروری ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن العربی قدس سرہ کی رائے یہ ہے کہ دوسری رکعت کے بعد نہ بیٹھے کیونکہ اس سے مغرب کی نماز کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے اور مغرب کی نماز کے ساتھ مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔ مجھے کوئی حدیث ایسی نہیں ملی جو نماز وتر میں صراحۃً دو رکعتوں کے بعد بیٹھنے پر دلالت کرتی ہو جبکہ وتر کی تین رکعتوں کو ایک سلام کے ساتھ پڑھا جا رہا ہو۔ اگر کوئی شخص وتر کی نو رکعتیں پڑھتا ہے تو صرف دوسری رکعت کو مکمل کرنے کے بعد بیٹھے اور تشہد تک التحیات پڑھے پھر نو رکعتیں مکمل کرنے کے بعد قعدہ کرے اور اس میں کم از کم تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے جیسا مسلم کی روایت کردہ گذشتہ حدیث سے واضح ہے۔ سات رکعتوں کے پڑھنے کا طریقہ بھی ان کے نزدیک یہی ہے کہ سات رکعتوں کو مکمل کرنے کے بعد یہ بیٹھے اور آخر میں سلام پھیر دے۔ اگر پانچ رکعتیں نماز وتر پڑھنا چاہتا ہے تو چوتھی اور پانچویں رکعت کو مکمل کرنے کے بعد بیٹھے اور اس کے بعد سلام پھیرے مگر نسائی کی ایک روایت اس کے خلاف ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یوتر بخمس لایجلس الا فی اخرھن.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کی پانچ رکعتیں پڑھتے تھے اور صرف ان کے آخر میں بیٹھتے تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ وتر کے پہلے قعدہ کو ترک کرنا جائز ہے جسے چوتھی رکعت کے بعد ہونا تھا۔ شاید دوسرے علماء بھی اسے جائز خیال کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

تاج العارفین جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے جو یہ منقول ہے کہ وتروں کی تین رکعتوں پر مسلمانوں کا اجماع ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی سلام کے ساتھ وتر کی تین رکعتیں پڑھنا مسلمانوں کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے کیونکہ وتر تین رکعتوں میں منحصر ہیں تو تین رکعتوں میں وتر کے منحصر ہونے پر مسلمانوں کے اجماع کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے حالانکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان یہ ہے کہ:

عن ابن عباس قیل له هل لک فی امیر المؤمنین معاویة ماأوتر الا بواحدة قال اصاب انه فقیه.

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا آپ کو (امیر المؤمنین) حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے معلوم ہے کہ وتروں کی ایک ہی رکعت پڑھتے تھے تو (عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے فرمایا: انہوں نے ٹھیک کیا بلاشبہ وہ فقیہ ہیں۔

امام بخاری علیہ الرحمہ بیان کرتے ہیں:

عن الزهری اخبرنی عبد الله ابن ثعلبة وکان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد صح عنه انه رأی سعد بن وقاص یوتر بواحدة. (رواہ النسائی)

امام زہری علیہ الرحمہ سے روایت ہے کہ مجھے عبداللہ بن ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ انہوں نے سعد بن ابی وقاص کو دیکھا کہ وتر کی ایک رکعت پڑھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت صحیح ہے۔

عن ابی موسی کان بین مکة والمدینة فصلی العشاء رکعتین ثم قام فصلی رکعة اوتر فقرء فیها بمائة ایة من النساء ثم قال ما اردت ان اضع قدمی الاحیث وضع رسول الله صلی الله علیه وسلم وانما قرء بما قرء رسول الله صلی الله علیه وسلم.

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ مکہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان تھے تو انہوں نے عشاء کی دو رکعتیں (قصر نماز) پڑھیں پھر اٹھے اور وتروں کی ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورت نساء کی سو آیات پڑھیں پھر فرمایا: میں ارادہ رکھتا ہوں کہ وہیں قدم رکھوں جہاں رسول اللہ ﷺ نے قدم رکھا ہے انہوں نے وہی پڑھا جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھا تھا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک صحیح حدیث مروی ہے جس میں وتروں کی ایک رکعت کا ذکر ہے۔ صحاح کی بہت ساری آیات ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں اور ظاہر کرتی ہیں کہ وتروں کی ایک رکعت مرفوع اور موقوف احادیث سے ثابت ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ وتروں کے تین ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے بلکہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے جو نقل کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ تین رکعتیں پڑھنا بھی صحیح ہے اور محض جواز سے امام شافعی علیہ الرحمہ کی روایت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ قاسم کا قول بالکل واضح ہے کہ وتر کی نماز میں بڑی گنجائش ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے سات فقہاء سے جو روایت نقل کی ہے اس کو بھی اسی معنی پر محمول کریں گے جس کو ہم نے بیان کیا ہے کہ وتروں میں بڑی گنجائش ہے ایک سے لے کر تین تک کسی بھی طاق تعداد میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ حضرت قاسم بھی ان سات فقہاء میں سے ایک ہیں اور انہی کا یہ صریح قول ہے کہ وتروں میں گنجائش ہے اس لئے یہی مفہوم زیادہ مناسب ہوگا اگر بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ نماز وتر تین رکعتوں میں منحصر ہے تو پھر بھی یہ حجت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان فقہاء کے اقوال کے ہوتے ہوئے اسے اجماع پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور ان کا قول سنت کے خلاف ہے اس لئے اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وتروں میں دعائے قنوت رمضان کے آخری نصف میں پڑھی جائے گی۔

روی امام العارفین الحسن قدس سره ان عمر بن الخطاب جمع الناس علی ابی بن کعب فکان یصلی لهم عشرین لیلة ولا یقنت لهم الا فی النصف الباقی فاذا

امام العارفین جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کو حکم دیا کہ تمام لوگ ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء میں تراویح کی نماز پڑھیں۔ آپ انہیں بیس رکعتیں نماز پڑھاتے

كانت العشر الاواخر تخلف فصلي في بيته و كانوا يقولون ابق ابي.

اور دعائے قنوت صرف باقی (پانچ) دنوں میں پڑھتے اور جب آخری دس دن شروع ہوتے تو آپ گھر میں نماز تراویح پڑھتے اور (صحابہ کرام) کہا کرتے تھے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھاگ گئے۔

اس سلسلہ میں بہت ساری ضعیف احادیث بیان کی گئی ہیں جیسا کہ فتح القدیر میں مذکور ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ نے مشکوٰۃ کی شرح میں ان احادیث کو بیان کرنے کے بعد انہیں ضعیف قرار دیا ہے اور فرمایا کہ امام احمد بن حنبل تمام سنتوں[1] میں ہمیشہ دعائے قنوت پڑھتے تھے اور ہم حنفیوں کا یہی مذہب ہے اور اس پر دلیل امام حسن سید شباب اہل الجنۃ کا قول ہے۔ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے مجھے کچھ کلمات سکھائے جنہیں میں وتروں کی نماز میں پڑھتا ہوں۔ (وہ الفاظ یہ ہیں) اللهم اهدني فيمن هديت و عافني فيمن عافيت و تولني فيمن توليت و بارك لي فيما اعطيت وقني شر ما قضيت فانك تقضي و لا يقضى عليك فانه لا يزل من واليت تباركت ربنا و تعاليت۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن حبان اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور ان کی روایت میں والیت کے بعد ولا يعز من عاديت کے الفاظ زیادہ ہیں۔ نسائی نے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ وصلى الله على النبى. امام نووی علیہ الرحمہ کے بقول اس حدیث کی سند صحیح یا حسن ہے۔ سو اس حدیث کی رو سے دعائے قنوت کو ایک مہینے یا ایک مہینے سے کم مدت کے ساتھ مقید نہیں کیا جا سکتا۔ رہی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث تو وہ منقطع ہے کیونکہ جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور نہیں پایا کیونکہ جب حضرت حسن بصری پیدا ہوئے تو خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں صرف دو سال باقی تھے پھر یہ حضرت ابی بن کعب کا اپنا عمل ہے۔ جبکہ یہ حدیث مرفوع ہے لہٰذا اس پر عمل کیا جائے گا۔

پھر امام احمد (کی ایک روایت کے مطابق) اور امام شافعی علیہما الرحمہ کے نزدیک رمضان کے جن دنوں میں دعائے قنوت پڑھی جاتی ہے تو وہ رکوع کے بعد قومہ میں پڑھی جاتی ہے کیونکہ جناب حاکم نے ایک حدیث روایت کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

عن الامام الحسن قال علمني رسول الله صلى الله عليه وسلم كلمات اقولهن في آخر وتري اذا رفعت راسي ولم يبق الاالسجود اللهم اهدني فيمن هديت الى الآخر.

جناب امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے کچھ کلمات سکھائے جنہیں میں اپنی نماز وتر کی آخری رکعت میں جب رکوع سے سر اٹھاتا ہوں تو پڑھتا ہوں۔ جبکہ صرف سجدہ کرنا باقی ہوتا ہے۔ (وہ کلمات یہ ہیں) اللهم اهدني فيمن هديت...... الخ۔

---

[1] شاید یہاں سنتوں سے مراد آپ کی نماز وتر ہے جو حضرت امام احمد بن حنبل کے نزدیک واجب نہیں سنت ہے کیونکہ علامہ بحر العلوم اسے احناف کا مذہب بتا رہے ہیں۔ احناف صرف وتروں کی آخری رکعت میں دعائے قنوت کے قائل ہیں۔

یہ حدیث نص مفسر ہے جو حضرت سوید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ مجمل حدیث کے لئے بیان ہے۔

روی سوید قال سمعت ابابکر وعمر وعثمان وعلیا یقولون قنت رسول الله صلی الله علیه وسلم فی آخر الوتر و کانوا یفعلون ذلک.

حضرت سوید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرات ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ فرماتے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے وتروں کی آخری رکعت میں دعائے قنوت پڑھی اور یہ آپ ﷺ کا معمول تھا۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے دارقطنی علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔ اس سے پہلے نسائی علیہ الرحمہ کی روایت گزر چکی ہے جس پر خود امام نسائی نے کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کو کئی لوگوں نے زبید یمانی سے، انہوں نے سعید بن عبدالرحمٰن ابن البزی سے، انہوں نے اپنے والد گرامی سے، انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے لیکن اس سند کے تحت روایت کردہ حدیث میں یہ لفظ نہیں کہ آپ ﷺ نے رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھی۔ فتح القدیر میں ہے کہ امام نسائی نے فرمایا ہے کہ اسے ایک سے زائد لوگوں نے روایت کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اعمش، شعبہ، عبدالمالک بن ابی سلیمان، جریر بن حازم رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے روایت کیا ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ ایک عادل راوی نے اکیلے کچھ زائد الفاظ روایت کئے ہیں اور ثقہ کی طرف سے زیادہ الفاظ قابل قبول ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ زبید نے اس حدیث کو ایک دفعہ بغیر زیادتی کے بھی روایت کیا ہے اور ایک بار انہوں نے پوری حدیث بیان کی ہے۔ پس ان سے وہ حدیث سنی جس نے سنی۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب خود وتر کی نماز ادا فرمائی تو اس میں دعائے قنوت پڑھی اور جب امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دعائے قنوت سکھائی تو اس میں رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھنے کا حکم دیا۔ لہٰذا دوسری حدیث سے دلیل اخذ کرنا زیادہ بہتر ہے اور حکم میں گنجائش ہے چاہے تو رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھے اور چاہے تو رکوع کے بعد۔ واللہ اعلم.

پھر شوافع کہتے ہیں کہ قنوت کی دعا وہی ہے جسے امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک اللھم انا نستعینک ......الخ۔ یہ قنوت نہیں۔ یہ کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ فتح القدیر میں ہے کہ حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ نے مراسیل میں ذکر کیا ہے۔

عن خالد عن عمران قال بینما رسول الله صلی الله علیه وسلم یدعو علی مضر اذجاءہ جبرئیل فاومی الیه ان اسکت فسکت فقال یا محمد ان الله لم یبعثک سبابا ولا لعانا انما بعثک رحمة لیس لک من الامر شئی ثم علمه القنوت اللھم انا نستعینک ونستغفرک ونؤمن بک

خالد سے، انہوں نے عمران سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بنو مضر کے لئے بددعا فرمائی تو جبرائیل امین حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ جبرائیل امین علیہ السلام نے گزارش کی۔ یا محمد! ﷺ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گالی دینے اور لعن طعن کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا بلکہ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ اس معاملہ

ونخضع لک ونخلع ونترک من یفجرک اللھم ایاک نعبد ولک نصلی ونسجد والیک نسعی ونحفد ونرجوا رحمتک ونخاف عذابک ان عذابک بالکفار ملحق.

میں آپ کے لئے کچھ نہیں پھر جبرائیل امین نے (باذن الٰہی) رسول اللہ ﷺ کو یہ دعائے قنوت سکھائی۔ اللھم انا نستعینک و نستغفرک ونؤمن بک و نخضع لک و نخلع ونترک من یفجرک اللھم ایاک نعبد ولک نصلی و نسجد والیک نسعی و نحفد و نرجوا رحمتک ونخاف عذابک ان عذابک بالکفار ملحق.

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس دعائے قنوت کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔ ہمارے محقق علماء فقہ فرماتے ہیں کہ دعائے قنوت کے لئے کوئی خاص دعا مقرر نہیں۔ اصل اختلاف افضلیت میں ہے میرے نزدیک وہ دعائے قنوت پڑھنا زیادہ بہتر ہے جسے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے یاد کیا اور اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ دونوں دعاؤں کو ملا کر پڑھا جائے جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے۔

دعائے قنوت پڑھنے کے وقت ہاتھ اُٹھانا کیسا ہے؟

امام احمد اور امام شافعی علیہما الرحمہ کے نزدیک دعائے قنوت کے وقت ہاتھ اٹھائے کیونکہ دعا کے لئے یہ سنت طریقہ ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ سے بھی ایک روایت ہاتھ اٹھانے کی ملتی ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ دعا میں ہاتھ صرف نماز سے باہر اٹھائے جاسکتے ہیں اور اسے تشہد کے بعد دعا پر قیاس کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ تخصیص کے لئے مخصص چاہئے بغیر مخصص کے کوئی حکم خاص نہیں ہوسکتا (جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے کا حکم ہے تو پھر اسے خارج از نماز کے ساتھ خاص نہیں کیا جاسکتا)۔

فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا بدعت ہے

امام شافعی اور امام مالک علیہما الرحمہ فرماتے ہیں کہ فجر کی نماز میں بھی دعائے قنوت سنت ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک دعائے قنوت بلند آواز سے پڑھی جائے گی اور مقتدی اس کے جواب میں آمین کہے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام آہستہ دعائے قنوت پڑھے گا اور مقتدی بھی پڑھیں گے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔

عن انس مازال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقنت فی الصبح حتی فارق الدنیا. (رواہ دارقطنی)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں ہمیشہ دعائے قنوت پڑھتے رہے حتی کہ آپ ﷺ نے اس دنیا کو خیر باد فرمایا۔

عن ابی هريرة قال كان النبی ﷺ اذا رفع رأسه من الركوع من صلوة الصبح فی الركعة الثانية يرفع يديه فيدعو بهذا الدعاء اللهم اهد فی فيمن هديت الی الآخر.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز پڑھتے ہوئے دوسری رکعت کے رکوع سے جب اٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اور یہ دعا مانگتے۔ اللھم اھدنی فیمن ھدیت......الخ۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور احناف کے نزدیک فجر کی نماز میں دعائے قنوت نہیں پڑھی جائے گی۔ ہماری دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ابی مالک سعد بن طارق الاشجعی قال قلت لابی انک صليت خلف رسول الله صلی الله عليه وسلم وابی بكر وعمر وعثمان وعلی ههنا بالكوفة خمس سنين اكانوا يقنتون قال ای بنی محدث. (رواہ الترمذی والنسائی)

ابو مالک بن طارق الاشجعی سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے گزارش کی کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پیچھے یہاں کوفہ میں پانچ سال تک نماز پڑھی۔ کیا یہ لوگ دعائے قنوت پڑھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا اے بیٹے! یہ بدعت ہے۔

امام نسائی کے الفاظ یہ ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی مگر آپ نے دعائے قنوت نہیں پڑھی۔ حضرت ابوبکر صدیق کے پیچھے نماز ادا کی انہوں نے بھی دعائے قنوت نہیں پڑھی۔ میں نے حضرت عمر فاروق کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے بھی دعائے قنوت نہیں پڑھی۔ میں نے حضرت عثمان کی اقتداء کی انہوں نے دعائے قنوت نہیں پڑھی۔ میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے بھی دعائے قنوت نہیں پڑھی پھر فرمایا اے بدعت کی اولاد۔ یہ حدیث صراحۃً بیان کرتی ہے کہ صبح کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنے کی کوئی اصل نہیں بلکہ وہ بدعت ہے۔ اس لئے اگر امام فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھے تو مقتدی اقتداء نہ کرے کیونکہ یہ بدعت ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔

دراصل فجر اور دوسری فرض نمازوں میں مصیبت کے وقت دعائے قنوت کا پڑھنا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ اسے فجر کی نماز کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

روی ابن عباس قال قنت رسول الله ﷺ شهرا متتابعا فی الظهر والعصر والمغرب والعشاء والصبح دبر كل صلوة اذا قال سمع الله لمن حمده ربنا ولك الحمد من الركعة الاخيرة يدعو علی احياء من سليم علی رعل وذكوان وعصية ويؤمن

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورا ایک مہینہ مسلسل ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازوں میں سمع اللہ لمن حمدہ ربنا ولک الحمد کے بعد دعائے قنوت پڑھتے رہے۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلیم کے مختلف قبیلوں رعل، ذکوان اور عصیہ کے لئے بددعا کرتے اور مقتدی آمین کہتے تھے۔

من خلفه. (رواہ ابوداؤد)

قنوتِ نازلہ کے بارے اس قسم کی اور بھی بہت سی روایات ہیں لیکن مسلسل صرف فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا مشروع نہیں ہے۔

رہی وہ دو حدیثیں جو نقل کی گئیں ہیں، دلیل نہیں بن سکتیں اس لئے کہ ان کی سند میں ضعف ہے بلکہ ان کی سند میں ایک طرح کا انقطاع ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ان کی سندوں کے ضعف کی وجوہات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ انقطاع باطنی کی بات ہم اس لئے کرتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے مطابق اگر دعائے قنوت مشروع ہوتی اور اسے سنت کا درجہ حاصل ہوتا اور رسول اللہ ﷺ نے اسے بلند آواز سے ہمیشہ پڑھا ہوتا اور صحابہ کرام نے اس پر آمین کہا ہوتا تو یہ عمل صحابہ کرام علیہم الرضوان میں مشہور ہوتا اور ان سے یہ راستہ مخفی نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر امام مالک کے مذہب کے مطابق دعائے قنوت امام اور مقتدی آہستہ پڑھتے اور اس پر رسول اللہ ﷺ کی مواظبت ہوتی تو روزانہ کا یہ طویل سکوت بھی صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ضرور علم میں ہوتا اور اس میں پڑھی جانے والی دعا سے بھی وہ ناواقف نہ ہوتے اور بہر تقدیر یہ دعا اسی طرح مشہور ہوتی اور نقل ہوتی جس طرح قومہ میں امام بلند آواز سے سمع الله لمن حمده..... کہتا ہے اور قومہ کرتا ہے کیونکہ عادت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی چیزیں جو ایک عرصہ تک مواظبت کے ساتھ ہوتی آئی ہوں وہ مخفی نہ رہیں۔ جب دعائے قنوت فرضوں میں مشہور نہیں تو واضح ہوا کہ صبح کی نماز میں دعائے قنوت سرے سے پڑھی ہی نہیں جاتی تھی۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ جب بہت سارے لوگ کسی چیز کے جاننے کے سبب میں مشترک ہوں اور اس کی نقل پر دواعی بھی بہت سارے ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بھی اسے نقل نہ کرے بلکہ ان میں سے کسی ایک کی طرف اس کی نقل کو منسوب کر دیا جائے تو اس کے جھوٹ ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں رہ جاتا۔ چونکہ ان کے بقول رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں زندگی بھر دعائے قنوت پڑھتے رہے۔ تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نقل ہی جھوٹ پر مبنی ہے۔ اگر آپ کی اس پر مواظبت ہوتی تو اسے مشہور ہونا چاہئے تھا اور ایک نہیں ایک سے زائد لوگ اسے نقل کرتے اور اس پر مواظبت سے اب بھی عمل ہوتا۔ ہاں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صحابہ نے قنوتِ نازلہ کو دعائے قنوت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے (یعنی انہوں نے قنت کا لفظ استعمال کیا) لیکن قنوتِ نازلہ کی تصریح نہیں کی۔ بعض راویوں نے صرف لفظ کے ظاہر کو دیکھا اور اسے اسی طرح نقل کر دیا اور اس میں غور و خوض نہ کر سکے اور گمان کر بیٹھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر مواظبت کی ہے پھر یہ اسی طرح روایت اگلے لوگوں نے نقل کی اور اس طرح یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ اسی لئے صحابہ کرام میں سے جس سے دعائے قنوت پر مواظبت نقل کی گئی ہے انہیں صحابی سے سند صحیح کے ساتھ اس کی ضد بھی نقل کی گئی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے روایت کرتے ہیں کہ وہ نماز میں دعائے قنوت نہیں پڑھتے تھے۔ یعنی فرض نمازوں میں۔ رہا یہ مسئلہ کہ قنوتِ نازلہ مشروع ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ صحابہ کرام میں بھی اجتہادی نوعیت رکھتا تھا۔ امام احمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مصائب و آلام کے وقت قنوتِ نازلہ پڑھنا مشروع ہے اور سنت ہے کیونکہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے قنوت

نازلہ پڑھی اور مسیلمہ کذاب کی شیطنیت کے ظہور کے وقت افضل الصدیقین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی قنوتِ نازلہ پڑھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فجر کی نماز میں دعائے قنوت پر مواظبت اختیار نہیں فرمائی

ہمارے نزدیک فرض نمازوں میں مشروع نہیں ہے۔ یہی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ:

عن بن مسعود ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يقنت في الفجرقط الاشهرا واحد.

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز میں سوائے ایک ماہ کے کبھی بھی دعائے قنوت نہیں پڑھی۔

اس ایک ماہ سے پہلے اور اس کے بعد کبھی بھی آپ نے دعائے قنوت نہیں پڑھی۔ ایک ماہ دعائے قنوت کا پڑھنا مشرکین کے لئے بدعا کرنے کی غرض سے تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دعا تھوڑے عرصہ کے لئے پڑھی گئی اور بعد میں اسے ترک کر دیا گیا۔

عن ابن عمر انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا رفع رأسه من الركوع في الركعة الثانية من الفجر يقول اللهم العن فلانا وفلانا بعد مايقول سمع الله لمن حمده ربنا ولک الحمد فانزل الله ليس لک من الامرشئى الى قوله فانهم ظالمون٥ (رواہ البخاری والترمذی والنسائی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ جب آپ دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھاتے تو سمع الله لمن حمده ربنا ولک الحمد کے بعد مشرکین پر لعنت بھیجتے اور کہتے اے اللہ! فلاں پر لعنت بھیج اے اللہ فلاں پر لعنت بھیج...... اسی موقعہ پر ربِ قدوس نے یہ آیت کریمہ نازل کی۔ ليس لک من الامر شيئى ...... فانهم ظالمون۔

عن ابى هريرة يقول كان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين يفرغ من صلوة الفجر من القرأة ويكبر ويرفع رأسه سمع الله لمن حمده ربنا ولک الحمد ثم يقول وهو قائم اللهم انج الوليد بن الوليد وسلمة بن هشام وعياش بن ابى ربيعة والمستضعفين من المؤمنين اللهم اشدد وطأتک على مضر واجعلها عليهم سنين

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں جب قرأت سے فارغ ہوتے۔ تکبیر کہتے (رکوع کرتے) اور جب رکوع سے سر اٹھاتے اور سمع الله لمن حمده ربنا ولک الحمد کہتے اور اس کے بعد کھڑے ہو کر یہ دعا پڑھتے۔ اللهم انج الوليد بن الوليد و سلمة بن هشام و عياش بن ابى ربيعة والمستضعفين من المؤمنين اللهم اشدد و طأتک على مضر واجعلها عليهم

اکسنی یوسف اللھم العن لحیان ورعلا وذکوان وعصیۃ عصت اللہ ورسولہ ثم بلغنا انہ ترک ذلک لما انزل لیس لک من الامر شئی اویتوب علیھم اویعذبھم فانھم ظالمونo(رواہ مسلم)

سنین اکسنی یوسف. اللھم العن لحیان و رعلا وذکوان و عصیۃ عصت اللہ ورسولہ پڑھیں یہ بات پہنچی ہے کہ جب آیت لیس لک من الامر شیئی اویتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون نازل ہوئی توآپ نے اسے ترک کر دیا۔

یہ دونوں حدیثیں بتاتی ہیں کہ قنوتِ نازلہ کا ذکر صحیحین میں بھی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ تصریح بھی ہے کہ آیت کے نزول کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا کیونکہ آیت کریمہ نے اس کو منسوخ کر دیا۔ بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت کریمہ غزوۂ احد کے دن نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور آپ ﷺ نے کفار کے لئے بددعا کرنے کا ارادہ فرمایا: بات یوں نہیں جیسے امام ترمذی نے تصریح فرمائی اور نہ ہی اس طرح جس طرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا۔ ہوسکتا ہے وتروں میں دعائے قنوت غزوۂ اُحد سے پہلے مشروع ہو کیونکہ بئر معونہ کا واقعہ اُحد کے بعد وقوع پذیر ہوا اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں بصراحت آ چکا ہے کہ دعائے قنوت بئر معونہ کے موقعہ پر پڑھی گئی لیکن اس سے ہمارے مقصود پر کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ماہ بعد دعائے قنوت پڑھنا چھوڑ دیا۔ اب یہ ترک کرنا اسی آیت کے نزول کے سبب ہو یا کسی اور وحی متلو یا غیر متلو کے سبب۔

نفل نماز کا بیان

نفلی نماز شروع کرنے سے اس کی قضاء واجب ہو جاتی ہے

نفل نماز شروع کرنے سے واجب ہو جاتی ہے۔ اگر اسے توڑ دیا جائے یا خود ٹوٹ جائے تو اس کی قضاء واجب ہوتی ہے کیونکہ ربِ قدوس کا ارشاد ہے **ولا تبطلوا اعمالکم** لہٰذا یہ نہی تقاضا کرتی ہے کہ جو نماز جس قدر ادا ہو چکی ہے اسے باطل نہ کیا جائے اور اس کو باطل ہونے سے بچانے کی واحد صورت یہ ہے کہ اسے مکمل کیا جائے اس لئے جب کوئی شخص نفلی نماز شروع کر دے تو اس کو مکمل کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر نمازی اسے توڑ دے یا کسی وجہ سے وہ ٹوٹ جائے تو اس کی قضاء واجب ہوتی ہے۔

اگر تو کہے کہ جو نفلی نماز ادا کی جا چکی ہے وہ عمل نہیں بلکہ بعض عمل ہے لہٰذا اس کو باطل کرنا منہی عنہ بن سکتا تو میں کہوں گا کہ ایک مکلف رضائے خداوندی کی غرض سے جب مذکورہ طریقے کے مطابق عمل کرتا ہے تو وہ ہرگز اس عمل کو صفت مذکورہ پر ادا نہیں کرتا۔ بہرکیف مقصود یہ ہے کہ جو نماز پڑھی ہے وہ باقی نماز کے پائے جانے پر موقوف ہے (باقی نماز ہوگی تو یہ بھی ہوگی ورنہ نہیں) اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اس کی حفاظت کے لئے باقی واجب ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نفل شروع کرنے سے واجب نہیں ہوتے کیونکہ شارع علیہ السلام نے ان کو پڑھنے اور نہ پڑھنے کا اختیار دیا ہے لہٰذا شارع علیہ السلام کا اختیار دینا باطل نہیں ہوگا۔ علماء شوافع ہمارے

استدلال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ عمل کو باطل نہ کرو کا مطلب یہ ہے کہ ریاء کاری اور دکھاوے کے ذریعے اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ اختیار صرف ابتداء میں تھا لیکن آخر تک یہ اختیار رہنا ضروری نہیں۔ آیت کریمہ کو ریاء اور دکھاوے پر محمول کرنا تخصیص بغیر مخصص ہے اس لئے اس سے صرف یہ مطلب لینا صحیح نہیں بلکہ لا تبطلوا میں نہی عام ہے کسی بھی طریقہ سے عمل باطل کرنے سے روکا گیا ہے خواہ وہ فساد و نقض کی صورت میں ہو یا ریاء اور دکھاوے کی صورت میں آپ دلالۃ النص سے حج اور عمرہ کو مکمل کرنے کے وجوب کو بھی اس کے لئے دلیل بنا سکتے ہیں کیونکہ حج اور عمرہ میں بھی مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض ارکان کو باطل ہونے سے بچایا جائے اور احرام باندھنے کے بعد اس کو مکمل کرنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد ٹوٹنے نہ پائے اور یہی معنی نماز میں بھی موجود ہے کیونکہ اس کو مکمل کرنے سے بعض ارکان محفوظ رہتے ہیں اور تکبیر تحریمہ کے ذریعے اس کو مکمل کرنے کا التزام ہوتا ہے اسی لئے اس کی تکمیل سے عہد خداوندی کی تکمیل ہوتی ہے۔

نفل اگرچہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں لیکن ان پر ثواب نفل نماز کا ملتا ہے کیونکہ اعتبار ابتداء کا ہوتا ہے۔ نفل اگر شروع کر کے توڑ دیئے جائیں یا خود ٹوٹ جائیں تو ان کی قضاء واجب ہے لیکن عصر اور صبح کی نماز کے بعد ان کی قضاء جائز نہیں۔

فرض اور نفل نماز میں فرق

نفل نماز ارکان اور سنتوں کے اعتبار سے بالکل فرض نماز کی طرح ہے۔ ہاں چند امور میں اختلاف ہے۔

فرض اور نفل میں ایک فرق یہ ہے کہ نفل بیٹھ کر پڑھے جا سکتے ہیں۔ جبکہ فرض نماز بغیر عذر کے بیٹھ کر نہیں پڑھی جا سکتی' ہاں بیٹھ کر پڑھنے سے کھڑے ہو کر پڑھنے کی نسبت سے آدھا ثواب ملتا ہے۔

عن عبد الله بن عمرو حدث ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال صلوة الرجل قاعدا نصف الصلوة قال فاتيته فوجدته يصلي جالسا فوضعت يدي قال مالك يا عبد الله بن عمرو قال حدثت يا رسول الله صلى الله عليه وسلم انك قلت صلوة الرجل قاعدا على نصف الصلوة وانت تصلي قاعدا قال اجل ولكني لست كاحدمنكم. (رواہ مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیٹھے آدمی کی نماز آدھی نماز ہے۔ فرماتے ہیں میں آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ (غالباً کندھے پر) رکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عبد اللہ بن عمر کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ میں نے گفتگو کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ نے فرمایا تھا کہ بیٹھے ہوئے آدمی کی نماز آدھی نماز ہے اور آپ بیٹھ کر نماز ادا فرما رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں لیکن میں تم میں سے کسی شخص کی طرح نہیں ہوں۔

اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھیں یا کھڑے ہو کر پڑھیں دونوں برابر ہیں اور یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت ہے۔ اگر کسی نے بیٹھ کر نماز شروع کی پھر کھڑے ہو کر پڑھنے لگا تو ہمارے ائمہ کے نزدیک صحیح ہے اور باقی تینوں ائمہ کے نزدیک بھی صحیح ہے کیونکہ یہ مفضول سے افضل کی طرف رجوع ہے۔

وقد روت ام المؤمنين عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي جالسا فقرء وهو جالس فاذا بقي من قرأته قدر ثلثين او اربعين اية قام فقرء وهو قائم ثم ركع ثم سجد وهكذا يفعل في الركعة الثانية مثل ذلك. (رواہ البخاری)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ بیٹھ کر آپ نے قرأت شروع کی اور جب قرأت میں تیس یا چالیس آیات کی مقدار (سورت) ہوگئی تو آپ کھڑے ہو گئے اور آپ نے حالت قیام میں قرأت فرمائی پھر رکوع کیا اور اس کے بعد سجدہ فرمایا اور دوسری رکعت میں بھی اسی طرح کیا۔

اگر کسی نے کھڑے ہو کر نماز نفل شروع کی پھر بیٹھ گیا اور یہی نماز پڑھتا رہا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ اس نے کھڑے ہو کر نماز نفل پڑھی ہے وہ بیٹھنے سے نہیں ٹوٹی اور جو باقی ہے (نفل ہونے کی وجہ سے) اس میں قیام ضروری نہیں ہے۔ اس لئے اسے بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔ اس مسئلے سے مدعا یہ ہے کہ نفل نماز کا کچھ حصہ حالت قیام میں ادا ہوا اور کچھ حصہ حالت قعود میں تو اس میں کسی قسم کا کوئی فساد نہیں۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ جس نماز کو کھڑے ہو کر شروع کیا اسے بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتا۔ تمام رکعتوں میں اسے قیام کرنا پڑے گا کیونکہ تکبیر تحریمہ قیام والی نماز کے لئے کہی گئی تھی اس لئے اسے بیٹھ کر نہیں پڑھا جا سکتا جیسے نذر کا مسئلہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ قیام کو لازم نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے بیٹھ کر نماز پڑھنا لازم آتا ہے بلکہ تکبیر تحریمہ سے صرف اس نماز کو مکمل کرنا لازم آتا ہے تاکہ جو تکبیر تحریمہ کے بعد ادا ہوئی ہے اسے باطل ہونے سے بچایا جا سکے۔ جو نفل نماز کھڑے ہو کر پڑھی وہ بیٹھنے سے باطل نہیں ہوتی لیکن نذر باطل ہو جاتی ہے کیونکہ نذر سے ماننے سے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا لازم آتا ہے۔ اس لئے بیٹھ کر نماز پڑھنے سے نذر پوری نہیں ہوتی۔

فرض اور نفل نماز میں دوسرا فرق یہ ہے کہ نفل نماز سواری پر اشارہ سے بھی ہو سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آدمی شہر سے باہر ہو۔

روى ابن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان سبح على ظهر راحلته حيث كان وجهه ويومي برأسه وكان ابن عمر يفعل. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری کی پیٹھ پر سر کے اشارہ سے نفل نماز پڑھ لیتے تھے چاہے آپ کا رخ جس طرف ہوتا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

ہمارے نزدیک سفر شرط نہیں صرف شہر سے باہر ہونا شرط ہے کیونکہ حدیث میں موجود ہے۔

عن انس رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو متوجه الى خيبر على حمار يصلي ايماء.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو گدھے پر سوار خیبر کی طرف جاتے دیکھا۔ آپ ﷺ اشارے سے نماز ادا فرما رہے تھے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے دارقطنی نے غرائب مالک میں روایت کیا ہے اور اس پر سکوت اختیار فرمایا ہے۔ یہ

خلاف قیاس ہے کیونکہ شرط اور رکن کا نہ پایا جانا قیاس کے لئے ناکافی ہے۔ وہ مقیس علیہ نہیں بن سکتا اس لئے نص کے مورد یعنی نفل پر اقتصار کیا جائے گا۔ (یعنی سواری پر صرف نفل نماز ہی پڑھی جاسکتی ہے' فرض نہیں)۔

فرض نماز سواری پر پڑھنا ناجائز ہے ہاں دشمن یا درندے کا خوف ہو یا قافلہ سے بچھڑ جانے کا خوف ہو تو پھر سواری پر نماز جائز ہے کیونکہ ربِ قدوس کا ارشاد ہے **فان خفتم فرجالا او رکباناً** اسی طرح بارش ہو رہی ہو اور اس قدر کیچڑ ہو کہ اتر کر نماز پڑھنا مشکل ہو تو ایسی صورت میں سواری پر فرض نماز بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ ایسے ہی ایک شخص بوڑھا (یا کمزور) ہے جو کسی کی مدد کے بغیر سواری پر سوار نہیں ہوسکتا اور وہاں کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں تو ضرورۃً وہ بھی سواری پر فرض نماز پڑھ سکتا ہے۔

فرض نماز کی طرح وتر اور نذر کی نماز سواری پر نہیں پڑھی جاسکتی (کیونکہ وتر اور نذر کی نماز واجب ہے) رہی سنت نماز تو وہ فجر کی سنتوں کے علاوہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ فجر کی سنتوں کی بہت تاکید آئی ہے۔

اگر سواری سے اتر کر نفل نماز شروع کی تو اسے سوار ہو کر مکمل نہیں کرسکتا کیونکہ تکبیر تحریمہ اس طرح کہی گئی کہ اس سے رکوع اور سجود واجب ہو گئے لیکن اس کے برعکس (کہ سواری پر شروع اور اتر کر مکمل کی) جائز ہے کیونکہ اس صورت میں اصل کی طرف لوٹ آیا ہے اور یہ نماز کی اعلیٰ صورت ہے (اعلیٰ صورت کی طرف لوٹنا بہتر ہے۔ اسی لئے یہ نماز باقی ہے)۔

نفل کی تمام رکعتوں میں قرأت کرنا لازم ہے

فرض اور نفل نماز میں تیسرا فرق قرأت کا ہے۔ نفل کی تمام رکعتوں میں قرأت فرض ہے کیونکہ نفل کی ہر دو رکعتیں علیحدہ نماز کی حیثیت رکھتی ہیں اور حدیث میں بھی ہے کہ دن اور رات کی نماز دو دو رکعتیں ہیں اور یہ حصر (کہ دن رات کی نماز دو دو رکعت پر مشتمل ہے) اس بات کی دلیل نہیں کہ دو سے زائد رکعتوں کو اکٹھا نہیں پڑھا جاسکتا۔

بس آپ چاہے ایک تکبیر تحریمہ سے جتنے نفل پڑھیں ہر دو نفل ایک مستقل نماز ہوگی اور جب ہر دو رکعتیں مستقل نماز ہوگی تو اس کی ہر رکعت میں قرأت فرض ہوگی اور قرأت کو ترک کرنے سے نماز ٹوٹ جائے گی بلکہ تکبیر تحریمہ باقی رہے گی لیکن اس کی ادائیگی فاسد ہو جائے گی۔ مشائخ کی تخریج کی بناء پر امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ باطل نہیں ہوگی کیونکہ تکبیر تحریمہ الگ چیز ہے اور اداء الگ چیز ہے اس لئے اداء کے فساد سے تحریمہ کا فساد لازم نہیں آتا کیونکہ اداتکبیر تحریمہ کی شرائط میں سے نہیں لیکن تکبیر تحریمہ اداء کے لئے شرط ہے۔

امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک اداء کے فساد سے تکبیر تحریمہ فاسد ہو جاتی ہے کیونکہ تکبیر تحریمہ ادائیگی کے لئے مشروع کی گئی ہے۔ جب ادائیگی نہیں پائی جائے گی تو تحریمہ کا مقصد فوت ہو جائے گا اس لئے وہ بھی فاسد ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر دونوں رکعتوں میں قرأت نہیں ہوگی تو تکبیر تحریمہ باطل ہو جائے گی اگر ایک میں قرأت کی گئی اور دوسری میں ترک ہو گئی تو تکبیر تحریمہ باطل نہیں ہوگی کیونکہ تحریمہ میں فساد پوری دو رکعتوں میں قرأت کے فقدان سے آتا ہے اور یہ فقدان قوی ہے جس کی وجہ سے تحریمہ فاسد ہو جاتی ہے۔ ایک رکعت میں

قرأت کا ترک ہونا ضعیف فساد شمار ہوتا ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کا امکان ہے۔
امام العارفین' تاج المحدثین شیخ حسن بصری قدس سرہ سے روایت ہے کہ نفل کی رکعت میں قرأت فرض ہے (اور اس کا ترک ضعیف فساد ہے) اور فساد جب ضعیف ہو تو وہ تحریمہ کے فساد کا باعث نہیں بنتا۔

چار نفل اکٹھے پڑھنے کی صورتیں

اسی اختلاف کی بنیاد پر بہت سارے مسائل سامنے آتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے چار نفلوں کی نیت کی اور کسی ایک جوڑے کی ایک رکعت میں یا دو رکعتوں میں قرأت ترک کر دی تو اس کی آٹھ صورتیں بنتی ہیں۔ اگر پہلے جوڑے کی دونوں رکعتوں میں قرأت کی اور آخری جوڑے کی ایک رکعت یا دونوں رکعتوں میں قرأت ترک کر دی تو اس پر صرف دوسرے جوڑے کی قضاء لازم ہے اور اس پر ہمارے ائمہ کا اتفاق ہے کیونکہ پہلا جوڑا تو ادا ہو گیا اگر پہلے جوڑے کی دونوں رکعتوں میں قرأت نہ کی اور دوسرے جوڑے کی دونوں رکعت میں قرأت کی تو بالاتفاق پہلے جوڑے کی قضاء واجب ہو گی کیونکہ صاحبین کے نزدیک تکبیر تحریمہ باطل ہو گئی ہے اس لئے دوسرے جوڑے میں نمازی شروع ہی نہیں ہوا۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک اگرچہ تکبیر تحریمہ تو باطل نہیں ہوئی اور دوسرے جوڑے کو شروع کرنا صحیح ہے لیکن صرف ایک جوڑے کی قضاء اس لئے لازم ہے کہ دوسرا جوڑا تو ادا ہو چکا ہے (پہلا ادا نہیں ہوا لہٰذا اسی کی قضاء لازمی ہے)۔ اگر پہلے جوڑے کی دونوں رکعتوں میں قرأت ترک کر دی اور دوسرے جوڑے کی دونوں رکعتوں میں بھی قرأت نہ کی یا دونوں میں سے ایک میں قرأت نہ کی تو اس پر صرف پہلے جوڑے کی قضا لازم ہو گی کیونکہ صاحبین کے نزدیک قرأت ترک کرنے کی وجہ سے تحریمہ باطل ہے اور دوسرے جوڑے میں شروع ہونا صحیح نہیں ہے اس لئے اس کی قضاء لازم نہیں ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک دونوں جوڑوں کی قضاء واجب ہے کیونکہ تحریمہ باطل نہیں ہوئی بلکہ باقی ہے اور دوسرے جوڑے میں شروع ہونا صحیح ہے۔
امام صاحب کے نزدیک اگر پہلے جوڑے کی ایک رکعت میں قرأت ترک کر دی اور دوسرے جوڑے کی ایک یا دونوں رکعتوں میں قرأت ترک کر دی تو امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک صرف دو رکعتوں کی قضاء لازم ہو گی کیونکہ تکبیر تحریمہ باطل ہو گئی ہے اور دوسرے جوڑے کو شروع نہیں کیا۔ شیخین کے نزدیک چار رکعتوں کو قضاء کرے گا کیونکہ تحریمہ باقی ہے اور دونوں جوڑوں کو شروع کرنا صحیح ہے۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے بقول جب پہلے جوڑے اور دوسرے جوڑے کی ایک ایک رکعت میں قرأت رہ جائے تو چار رکعتوں کی قضاء نہیں ہو گی۔ انہوں نے اس سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے تیرے لئے امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ سے دو رکعتوں کی قضاء روایت کی ہے۔ امام محمد علیہ الرحمہ نے اپنی اس روایت سے رجوع نہیں کیا۔ ہدایہ میں یہی مذکور ہے فرماتے ہیں کہ اصل کو فرع کے لئے جھوٹا قرار دینا روایت کے بطلان کا موجب ہوتا ہے جیسا کہ علم الاصول میں بیان کیا گیا ہے۔ امام محمد علیہ الرحمہ جیسے شخص کا رجوع نہ کرنا تعجب خیز ہے۔
پھر علماء کا اس روایت کو قبول کرنا اور اس کے مطابق فتویٰ دینا اس سے بھی تعجب خیز ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ کہا جائے امام محمد علیہ الرحمہ نے امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کی روایت پر اعتماد نہیں کیا۔ امام محمد مصر ہیں کہ امام

ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی یہی روایت ہے کیونکہ انہوں نے امام کی زبانی خود یہی بات سنی یا انہوں نے ان کے تمام قواعد سے اس کا استخراج کیا کیونکہ یہ ایسی نص ہے جس سے اس کی جزئیات اور متفرعات کے حکم پر بھی روشنی پڑتی ہے اسی لئے علماء نے اسے قبول کیا ہے اور اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

اگر پہلے جوڑے کی صرف ایک رکعت میں قرأت ترک ہو جائے اور دوسرے جوڑے کی دونوں رکعتوں میں قرأت کی جائے تو بالاتفاق اس شخص پر دو رکعتوں کی قضاء لازم ہے کیونکہ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک اس کی تکبیر تحریمہ باطل ہو گئی ہے اور اس کا دوسری دو رکعتوں کو شروع کرنا صحیح نہیں۔ اس لئے دوسری دو رکعتوں کی قضاء ضروری نہیں۔ شیخین کے نزدیک تکبیر تحریمہ باطل نہیں ہوتی اس لئے دوسری دو رکعتوں میں شروع ہونا جائز ہوا۔ اس کی دوسری دو رکعتیں ادا ہو گئیں پہلی دو رکعتوں کو قضاء کرے گا۔

نفلی نماز میں تلاوتِ قرآن زیادہ کرنی چاہیے

نوافل میں زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کی جائے یہ زیادہ نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

روی جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الصلوۃ طول القنوت. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بہترین نماز وہ ہے جس میں قیام زیادہ ہو۔

کیونکہ لمبا قیام مشکل ہے اور بہترین عبادت وہ ہے جو محنت طلب ہو۔

دن اور رات کے نوافل پڑھنے کا طریقہ

دن کے وقت ایک ہی تکبیر تحریمہ کے ساتھ نوافل کی چار چار رکعتیں پڑھی جا سکتی ہیں اور رات کے نوافل اکٹھے آٹھ رکعتوں تک ہو سکتے ہیں لیکن زیادہ رکعتیں ایک تکبیر تحریمہ کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے۔ صاحب ہدایہ نے یہی رائے اختیار کی ہے کیونکہ حضور ﷺ سے مذکورہ تعداد سے زیادہ منقول نہیں ہے۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رات کو اکٹھے آٹھ سے زائد نوافل پڑھنا مکروہ نہیں ہے اگرچہ خلافِ اولیٰ ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دن ہو یا رات دو دو نفل پڑھنا افضل ہے کیونکہ حدیث مبارک ہے دن اور رات کی (نفل) نماز دو دو رکعتیں ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذی روایت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر سے بعض لوگوں نے اسے مرفوع روایت کیا ہے اور بعض نے اسے موقوف روایت کیا ہے۔ ایک صحیح روایت میں ہے۔

روی عنہ انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃ اللیل مثنی مثنی.

حضرت (ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے ہی روایت کی گئی ہے کہ رات کی نماز دو دو رکعتیں ہے۔

اس روایت میں رات کا تذکرہ نہیں۔ امام نسائی علیہ الرحمہ کے بقول اس حدیث میں دن کا تذکرہ راویوں کی غلطی ہے۔ مذکورہ حدیث حجت نہیں بن سکتی۔ اگر اسے مان بھی لیا جائے تو اس کی تاویل ہوگی جیسا کہ ہم پہلے بیان

کر چکے ہیں۔ ہمارے امام حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ دن ہو یا رات چار چار نفل پڑھنا بہتر ہے کیونکہ دیر تک نماز میں رہنا مشکل ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چاشت کی نماز چار رکعتوں میں پڑھی جیسا عنقریب آپ جان لیں گے۔ اسی طرح رات کے وقت بھی آپ ﷺ نے چار چار نفل پڑھے اور اس کے تین رکعت وتر کی پڑھیں جیسا کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ پوری تفصیل امام بخاری علیہ الرحمہ نے نقل فرمائی ہے۔ یہ حدیث بھی انشاء اللہ عنقریب آ رہی ہے۔

امام محمد اور امام ابو یوسف علیہما الرحمہ کے نزدیک رات کو دو دو نفل پڑھنا افضل ہے لیکن ایک ہی سلام کے ساتھ چار نفل پڑھنا بھی جائز ہے۔

لـقوله صلى الله عليه وسلم صلوة الليل مثنى مثنى.

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: رات کی نماز دو دو رکعتیں ہے۔

اس سے یہ مفہوم نہیں لیا جا سکتا کہ ہر دو رکعتیں الگ ایک نماز ہے کیونکہ اس طرح رات کی قید بے معنی ہو جاتی ہے اور رات کی نماز کو دو رکعتوں میں منحصر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ چار رکعتوں کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔ اصل مقصود افضلیت کو بیان کرنا ہے۔ رہی رسول اللہ ﷺ کی رات کی نماز تو اکثر آپ ﷺ دو دو رکعتیں پڑھتے تھے اور ایک رکعت وتر کی پڑھتے تھے۔ بعض اوقات چار نفل ادا فرماتے اور وتر کی تین رکعتیں پڑھتے۔ پس اس میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ قولی حدیث مقدم ہوتی ہے۔ اسے سمجھئے۔ واللہ اعلم باحکامه.

سنن مؤکدہ کا بیان

نماز میں سنت مؤکدہ کی تعداد

قد روی ام المؤمنين ام حبيبة قالت قال رسول الله ﷺ من ركع اثنى عشر ركعة فى يوم وليلة سوى المكتوبة بنى الله له بيتا فى الجنة. (رواہ مسلم والنسائی)

اُم المؤمنین اُم حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے فرائض کے علاوہ دن اور رات میں بارہ رکعتیں پڑھیں، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ضرور جنت میں گھر بنائے گا۔

اسے امام ترمذی علیہ الرحمہ نے بھی نقل فرمایا ہے اور ان الفاظ کو زائد بیان کیا ہے۔ چار رکعتیں ظہر سے پہلے۔ دو رکعتیں ظہر کے بعد۔ دو مغرب کے بعد۔ دو عشاء کے بعد اور دو فجر سے پہلے۔

اسی طرح امام ترمذی علیہ الرحمہ نے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بعینہٖ یہی الفاظ بیان کئے ہیں صرف لفظ غداۃ کی جگہ لفظ فجر آیا ہے۔

یہ بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ ان بارہ رکعتوں کو حضور ﷺ ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ ظہر سے پہلے چار اور ظہر کے بعد دو سنتوں کا تذکرہ حدیث میں یوں کیا گیا ہے۔

فلما روی امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه ووجوه اله الکرام قال کان رسول الله ﷺ یصلی قبل الظهر اربعا ویصلی بعدها رکعتین. (رواہ الترمذی)

امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ و وجوہ آلہ الکرام روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ظہر سے پہلے چار اور ظہر کے بعد دو رکعتیں ادا فرماتے تھے۔

عن ام المؤمنین عائشة قالت کان النبی صلی الله علیه وسلم یصلی اربعا قبل الظهر ورکعتین قبل الغداة. (رواہ مسلم وابوداؤد والنسائی)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چار رکعتیں ظہر سے پہلے اور دو رکعتیں فجر سے پہلے ادا فرماتے تھے۔

عن ابن عمر قال صلیت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم رکعتین قبل الظهر ورکعتین بعدها.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دو رکعتیں ظہر سے پہلے اور دو رکعتیں ظہر کے بعد پڑھیں۔

اسے شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یہ آخری حدیث اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ ظہر سے پہلے دو رکعتیں مشروع ہیں کیونکہ حضور ﷺ فرائض کے علاوہ سنتیں اور نفل گھر میں ادا کرتے تھے۔

عن عبد الله بن شقیق قال قالت عائشة عن صلوة رسول الله صلی الله علیه وسلم عن تطوعه فقالت کان النبی صلی الله علیه وسلم یصلی فی بیته قبل الظهر اربعا ثم یخرج یصلی بالناس. (رواہ مسلم)

حضرت عبداللہ بن شقیق علیہ الرحمہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی نفلی نماز کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ اپنے کاشانۂ اقدس میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے پھر آپ ﷺ باہر تشریف لے جاتے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر نے رسول اللہ ﷺ کو مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا۔ یہ دو رکعتیں تحیۃ المسجد کی نماز تھی' ظہر کی سنتیں نہیں تھیں۔ اسی لئے انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ پڑھا کرتے تھے بلکہ فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ آپ نے دو رکعتیں پڑھیں۔ تو انہوں نے جو دیکھا' روایت فرما دیا۔ ہوسکتا ہے ظہر کی چار سنتیں آپ ﷺ نے حسب معمول گھر میں ادا فرمائی ہوں۔

ظہر کی چار سنتیں ایک ہی سلام کے ساتھ ہیں

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ظہر کی چار سنتیں دو دو کر کے پڑھی جائیں جیسا کہ گزر چکا ہے کہ ان کے نزدیک نفل نماز دو دو رکعتیں پڑھنا صحیح ہے۔ احناف کے نزدیک ظہر کی چار سنتیں ایک سلام کے ساتھ پڑھی جائیں جیسا کہ دن کے نفلوں کے لئے ہماری رائے چار چار پڑھنے کی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث پاک میں مطلقاً چار سنتوں کا ذکر ہے جسے پڑھ کر فوراً یہ خیال آتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ چار سنتیں ایک ہی سلام کے ساتھ ادا فرمائیں۔ وہ دلیل جس سے یہ سارا اختلاف ختم ہو جاتا ہے یہ حدیث ہے۔

عن ابی ایوب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اربع قبل الظہر لیس فیھن تسلیم یفتح لھن ابواب السماء. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ظہر سے پہلے چار (سنتیں) جن میں کوئی سلام نہیں ان کے لئے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں (یعنی فوراً قبول ہو جاتی ہیں)۔

ظہر کے بعد دو سنتیں بھی حدیث سے ثابت ہیں جیسا کہ آپ پڑھ آئے ہیں۔ اگر کوئی چاہے تو چار نفل بھی پڑھ سکتا ہے بلکہ چار رکعتیں پڑھنا افضل ہے۔

لما روی ام المؤمنین ام حبیبۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی قبل الظھر اربعا وبعدھا اربعا حرمہ اللہ علی النار. (رواہ الترمذی)

ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ظہر سے پہلے چار اور ظہر کے بعد چار رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ نے اس پر آگ حرام کر دی۔

نمازی چاہے تو ظہر کے بعد والی چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھ لے چاہے تو دو سلاموں سے پڑھ لے۔ اگر ایک سلام سے چار رکعتیں پڑھ لیں تو دو سنتیں بھی ادا ہو گئیں اور دو نفل بھی اور نیت کرتے وقت سنت اور نفل کا نام نہ لے' صرف نماز کا نام لے۔ (میں نماز کی نیت کرتا ہوں) تاکہ یہ نماز سنت اور نفل دونوں کو شامل ہو جائے۔ اگر سنت کی نیت کر لی گئی تو بھی جائز ہے۔ دوسری دو رکعتوں میں سنیت کا لفظ لغو ہو جائے گا اور دو نفل مطلق نیت سے ادا ہو جائیں گے جیسے فرض کی نیت سے نفل ادا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی کہنا بے جا نہیں کہ سنت دو اور چار میں قدر مشترک ہے۔ دونوں میں سے جو پڑھے گا ادا ہو جائے گا۔

مغرب اور عشاء کے بعد دو دو سنتیں ہیں

مغرب کے بعد کی دو سنتیں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کردہ حدیث مبارک سے ثابت ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے گھر میں مغرب کے بعد دو رکعتیں پڑھیں۔ اسے امام ترمذی نے روایت فرمایا ہے۔

عشاء کے بعد دو سنتیں حدیث سے ثابت ہیں اور دو کی جگہ چار سنتیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چار رکعتیں بھی پڑھی ہیں۔

عن ابن شریح قال سألت عائشۃ عن صلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت ما صلی العشاء قط فدخل بیتی الا صلی اربع رکعات اوست رکعات ولقد مطرنا مرۃ من اللیل فطرحنا لہ نطعا فکانی انظر الی نقب ینبع منہ الماء ومارأیتہ منقبا

حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے پوچھا تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ حضور ﷺ نے جب عشاء کی نماز پڑھی اور میرے گھر تشریف لائے تو ایسا کبھی نہ ہوا کہ آپ نے چار یا چھ رکعتیں نہ پڑھی ہوں۔ ایک دفعہ رات کو بارش برسنے لگی تو ہم نے آپ ﷺ

الارض بشئی من ثیابه قط. (رواہ البخاری)

کیلئے چمڑے کا مصلّٰی بچھا دیا۔ گویا میں اب بھی وہ منظر دیکھ رہی ہوں کہ ایک سوراخ سے پانی ٹپک رہا ہے اور میں نے کبھی بھی آپ کے کپڑوں پر مٹی کے نشانات نہیں دیکھے۔

یہاں چار رکعتوں سے مراد عشاء کے بعد والی دو سنتیں ہیں جس پر رسول اللہ ﷺ نے دو نفلوں کا اضافہ فرمایا اور سنتوں اور نفلوں کو ایک ہی سلام کے ساتھ ادا فرمایا اور ان کے لئے ایک ہی تکبیر تحریمہ کہی جیسا کہ ہم نے ظہر کی دو سنتوں کے بارے بیان کیا ہے۔

بعض فتاوٰوں میں مذکور ہے کہ دو سنتوں کے بعد چار رکعتیں ایک سلام کے ساتھ پڑھنا مستحب ہے کیونکہ حدیث پاک میں چھ رکعتوں کا بھی تذکرہ ہے۔

فجر کی دو سنتیں ہیں

فجر کی دو سنتوں کے بارے حدیث مبارک ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة ان النبی صلی الله عليه وسلم كان يصلی ركعتين خفيفتين بين النداء والاقامة من صلوة الصبح. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اذان صبح اور نماز صبح کے درمیان ہلکی سی دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

اس سلسلہ کی بہت ساری احادیث کتب میں مذکور ہیں۔

صبح کی دو سنتوں کو پڑھنے کے بعد دائیں کروٹ پر تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جانا بھی سنت ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم اذا صلی احدكم الركعتين قبل الصبح فليضطجع عن يمينه. (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص صبح کی نماز سے پہلے دو سنتیں پڑھے تو دائیں کروٹ پر لیٹ جائے۔

اب ایسی حدیث بیان کی جاتی ہے۔ جس میں تمام سنتوں کا تذکرہ ہے۔

عن عبد الله بن شقيق قال سألت عائشة عن صلوة رسول الله صلی الله عليه وسلم عن تطوعه فقالت كان النبی صلی الله عليه وسلم فی بيته قبل الظهر اربعا ثم يخرج فيصلی بالناس ثم يدخل فيصلی ركعتين وكان يصلی بالناس المغرب ثم يدخل

حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسولِ خدا ﷺ کی نفلی نماز کے بارے پوچھا تو فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں ظہر سے پہلے چار سنتیں پڑھتے پھر باہر تشریف لے جاتے، لوگوں کو نماز (فرض) پڑھاتے واپس تشریف لاتے اور دو رکعتیں پڑھتے۔ آپ ﷺ لوگوں کو

فیصلی رکعتین ویصلی بالناس العشاء ویدخل بیتی فیصلی رکعتین وکان یصلی من اللیل تسع رکعات فیھن الوتر وکان یصلی لیلا طویلا قائما ولیلا طویلا قاعدا وکان اذاقرء وھو قائم رکع وسجد وھو قائم واذا قرء قاعدا رکع وسجد وھو قاعد وکان اذا طلع الفجر صلی رکعتین۔

(رواہ مسلم)

مغرب کی نماز پڑھاتے تو گھر تشریف لاتے اور دو سنتیں ادا فرماتے پھر لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھاتے' میرے حجرہ میں داخل ہوتے اور دو سنتیں پڑھتے' رات کو آپ ﷺ نو رکعتیں پڑھتے اور ان نو رکعتوں میں وتر کی نماز بھی شامل ہوتی۔ آپ ﷺ رات گئے تک کھڑے ہو کر نماز پڑھتے اور بڑی دیر تک بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے۔ آپ جب حالتِ قیام میں قرآن کریم کی قرأت کرتے تو کھڑے ہو کر رکوع و سجود کرتے اور جب بیٹھ کر قرأت کرتے تو بیٹھ کر رکوع و سجود کرتے۔ جب پو پھٹتی تو دو سنتیں ادا فرماتے۔

فرضوں اور سنتوں کے درمیان گفتگو نہ کرنا افضل ہے

یہاں دو مسئلے پیش نظر رہیں کہ فرض اور سنت کے درمیان گفتگو کرنا مکروہ ہے کیونکہ سنت سے فرضوں کی تکمیل ہوتی ہے کیونکہ سنتیں فرض نماز کا تتمہ ہیں اس لئے ضروری ہے کہ فرض اور سنت کے درمیان گفتگو نہ کی جائے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ گفتگو کے بعد نماز یقینی طور پر ادا ہو جاتی ہے۔ حضرت مکحول رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مغرب کی نماز کے بعد گفتگو کرنے سے پہلے دو سنتیں پڑھیں تو اس کی نماز علیین میں بلند ہو گئی۔ اسے زرین علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گفتگو نہ کرنا افضل ہے لیکن گفتگو کے باوجود نماز ادا ہو جاتی ہے لیکن اعلیٰ علیین تک نماز کا بلند ہونا یہ وعدہ صرف گفتگو نہ کرنے والے کے لئے خاص ہے۔

فجر کی دو سنتیں ہوں یا ظہر کی چار سنتیں بلکہ فرض نماز سے پہلے پڑھی جانے والی تمام سنتیں پڑھنے کے بعد اگر کسی نے گفتگو کی اور اب وہ چاہتا ہے کہ حدیث میں جو وعدہ کیا گیا ہے کہ جس نے گفتگو نہ کی اس کی نماز اعلیٰ علیین تک بلند ہو گی تو وہ سنتیں دوبارہ پڑھ لے۔ اس طرح اسے یہ فضیلت نصیب ہو جائے گی اسی لئے علماء فقہ نے فرضوں کی پہلی سنتوں کے اعادہ کو بہتر قرار دیا ہے تاکہ وہ فضیلت ضائع نہ ہو اور اسے ثواب پوری طرح مل جائے۔

یہ اعادہ اس لئے نہیں کہ گفتگو سے سنتوں کی نماز فاسد ہو گئی بلکہ اعادہ کی وجہ زیادہ ثواب حاصل کرنا ہے۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے علماء فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے اس طرح نماز فرض ادا کی کہ کوئی امر مکروہ بھی پایا جا رہا تھا تو فرض نماز کا اعادہ ضروری ہے تاکہ یہ فرض نماز اکمل صورت میں ادا ہو جائے اور مکروہ نہ رہے اور مکروہ سے نماز باطل ہرگز نہیں ہوتی بلکہ تمام امکان ادا ہو جانے کی وجہ سے نماز کی ادائیگی صحیح ہو جاتی ہے لیکن امر مکروہ کی وجہ سے اس کو دوبارہ ادا کیا جاتا ہے تاکہ کوئی نقص باقی نہ رہے۔ فرض نماز کی صورت میں اعادہ واجب ہے کیونکہ وہ فرض نماز ہے جبکہ سنت کی صورت میں اعادہ سنت ہو گا کیونکہ یہ نماز سنت ہے۔ اب جو سنتیں دوبارہ پڑھی ہیں وہ سنت نماز شمار ہو گی اور اس سے پہلے والی سنتیں نفل نماز بن جائے گی۔

اگر کسی نے فرض نماز کے بعد سنتوں سے پہلے گفتگو کی تو اب اس نقصان کو پورا کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ فرض نماز کا اعادہ کیا جائے لیکن فرض نماز کا اعادہ سنت میں کمی کی وجہ سے نہیں ہوسکتا۔

امام شافعی علیہ الرحمہ اور اہل حدیث علماء کے نزدیک فرض اور سنت نماز کے درمیان گفتگو سے سنتوں پر کچھ فرق نہیں پڑتا چہ جائے کہ اس کے اعادہ کی بات کی جائے۔

روت ام المؤمنین عائشة الصدیقة کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی رکعتی الفجر فان کنت مستیقظة حدثنی والا اضطجع حتی نودی بالصلوة۔ (رواہ البخاری)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب فجر کی دو رکعتیں پڑھتے اگر میں جاگ رہی ہوتی تو آپ ﷺ مجھ سے گفتگو فرماتے ورنہ کروٹ کے بل لیٹ جاتے حتیٰ کہ نماز صبح کی اذان ہوتی۔

یہ حدیث شوافع اور اہل حدیث کے لئے دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ ہم مطلق گفتگو سے منع نہیں کرتے۔ قرآن کریم کی تلاوت' حدیث پاک کو بیان کرنا' درود پاک اور اللہ تعالیٰ کا ذکر تو جائز ہے ممانعت ایسی گفتگو کی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذکر سے خالی ہو۔ رسول اللہ ﷺ تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے رطب اللسان رہتے تھے۔ آپ ﷺ مبلغ تھے۔ آپ کی زبان اقدس سے جو لفظ نکلتا آپ جو عمل کرتے وہ فرض کی ادائیگی ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ذکر پر مبنی ہوتا۔ ایسا کلام تو سنت کی تکمیل کا باعث بنتا ہے نہ کہ سنت میں نقص کا باعث بنتا ہے۔ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ پر قیاس نہ کیجئے۔ کہاں حضور ﷺ کی ذات اقدس اور کہاں ہم بندگان اغراضِ دنیا۔ حضور ﷺ فجر کی سنتوں کے بعد جو گفتگو فرماتے اگر آج ہم اسے پڑھیں تو وہ سنتوں کی تکمیل کا باعث ہوگی اور اس پر ہمیں اجر و ثواب ملے گا۔

فرضوں اور سنتوں کے درمیان وقفہ ضروری ہے

دوسرا اہم مسئلہ نفلوں کے ضمن میں یہ یاد رہے کہ فرض اور سنت کو ملانا مکروہ ہے۔ چاہئے یہ کہ نمازی فرض پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائے اور پھر اٹھ کر سنتیں ادا کرے۔ اگر مقتدی ہے تو جہاں فرض پڑھے ہیں اس جگہ سے ہٹ کر کسی دوسری جگہ سنتیں پڑھے اگر امام ہے تو خلاصہ میں یہ مذکور ہے کہ اسی جگہ سنتیں پڑھے یا گھر چلا جائے اور گھر سنن اور نوافل ادا کرے۔

فرض نماز کو بعد والی سنتوں سے ملا کر پڑھنے کی کراہت اس حدیث سے ثابت ہے۔

عن ابی رمثة قال صلیت هذه الصلوة فصلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان ابوبکر وعمر یقومان فی الصف المقدم عن یمینه وکان رجل قد شهد التکبیرة الاولی من الصلوة فصلی رسول

حضرت ابورمثہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ادا کی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما پہلی صف میں آپ کی دائیں سمت (پیچھے) کھڑے تھے۔ ایک آدمی تھا جو تکبیر تحریمہ میں شریک ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی پھر آپ نے دائیں

الله صلى الله عليه وسلم ثم سلم عن يمينه وعن يساره حتى رأينا بياض خديه ثم انتقل كانتقال ابى رمثة يعنى نفسه فقام الرجل الذى ادرك معه التكبيرة الاولى يشفع فوثب عمر فاخذبمنكبه فهزه ثم قال اجلس فانه لم يهلك اهل الكتاب الا انه لم يكن بين صلوتهم فصل فرفع النبى صلى الله عليه وسلم بصره فقال اصاب الله بك يا ابن الخطاب. (رواہ ابوداؤد)

اور بائیں سلام پھیرا حتیٰ کہ ہم نے آپ ﷺ کے رخساروں کی سفیدی کو دیکھا پھر آپ ﷺ ابو رمثہ یعنی خود راوی کی طرح جگہ سے ہٹے تو وہ آدمی جس نے آپ ﷺ کو تکبیر تحریمہ میں پایا تھا دو سنتیں پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جھپٹے اور اس کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور فرمایا بیٹھ جا۔ اہل کتاب صرف اس لئے ہلاک ہوئے ہیں کہ وہ اپنی نمازوں میں وقفہ نہیں رکھتے تھے۔ حضور ﷺ نے نظر اٹھائی اور فرمایا: اے خطاب کے بیٹے! اللہ تعالیٰ نے تجھے ٹھیک بات کہنے کی توفیق دی۔

فرض اور سنت نماز میں اتنا وقفہ کرے کہ جس میں یہ دعا پڑھ سکے اللھم انت السلام ......الخ کیونکہ حدیث میں موجود ہے کہ:

عن ام المؤمنين عائشة الصديقة قالت كان رسول الله ﷺ اذا اسلم لم يقعد الامقدار ما يقول اللهم انت السلام ومنك السلام تباركت يا ذاالجلال والاكرام.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرنے کے بعد صرف اتنا بیٹھتے کہ جس میں یہ دعا پڑھ لیتے۔ اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذاالجلال والاکرام.

اتنی دیر بیٹھنا سنت ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ دعا پڑھے۔ درود پاک یا کوئی اور دعا بھی پڑھ سکتا ہے بلکہ خاموش بیٹھا رہے تو بھی جائز ہے۔ رہا فرضوں کے بعد لمبی لمبی دعا مانگنا تو بہتر یہ ہے کہ سنتیں پڑھ کر جی بھر کر دعا مانگے۔ فتح القدیر میں اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

عصر کی غیر مؤکدہ سنتیں

عصر کے وقت کوئی سنت مؤکدہ نہیں۔ ہاں عصر کی نماز سے پہلے چار سنتیں پڑھی جاتی ہیں جو غیر مؤکدہ ہیں۔ اگر کوئی دو پڑھ لے تو بھی جائز ہے۔

روى ابن عمر قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال رحم الله امرء صلى قبل العصر اربعا.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم کرے جس نے عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھیں۔

وعن امير المؤمنين على كرم الله وجهه قال كان يصلى رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل العصر ركعتين. (رواہما ابوداؤد)

حضرت امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عصر سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے۔

عصر کی چار سنتوں کو دو سلاموں کے ساتھ پڑھنا بھی حدیث سے ثابت ہے۔

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه قال کان النبی ﷺ یصلی قبل العصر اربع رکعات یفصل بینهن بالتسلیم علی الملائکة المقربین ومن تابعهم من المسلمین والمؤمنین. (رواہ الترمذی)

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے اور دونوں میں مقرب فرشتوں اور ان کی اتباع کرنے والے مسلمین اور مؤمنین پر سلام کے ساتھ وقفہ پیدا کرتے تھے۔

فقہاء اسلام فرماتے ہیں کہ عشاء سے پہلے چار سنتیں پڑھنا بھی مستحب ہے۔ واقف اسرار الٰہی اور مجمع علوم عقلیہ اور نقلیہ میرے والد گرامی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ عشاء کی چار سنتوں کا تذکرہ کسی حدیث میں نہیں لیکن انہوں نے اپنی وفات تک بھی ان چار سنتوں کو ترک نہیں فرمایا۔

جمعہ شریف کی سنتیں

جمعۃ المبارک سے پہلے چار اور اس کے بعد بھی چار رکعتیں سنت ہیں۔ یہ رائے ہمارے ائمہ ثلاثہ کی ہے۔
امام ابو یوسف علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے بعد دو سنتیں بھی حدیث سے ثابت ہیں۔
جمعہ سے پہلے والی سنتوں کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی سنتوں پر مواظبت فرماتے تھے کیونکہ حدیث مبارک کی رو سے زوال کے بعد آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ظاہر ہے جمعہ کے دن بھی زوال کے بعد رحمت کے دروازے بند نہیں ہوتے ہوں گے بلکہ اس کے فضل و رحمت کی بارشوں میں اضافہ ہوتا ہوگا تو اس لئے جمعہ سے پہلے چار سنتیں پڑھنا ضروری ہے کیونکہ ان چار سنتوں کو نہ تو کوئی دوسری چیز زائل کرنے والی ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کے قائم مقام ہے جیسے خطبہ اور دو فرض چار فرضوں کے قائم مقام ہیں۔ رہا اس کا ثبوت کہ زوال کے بعد آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اس لئے حضور ﷺ نے ظہر کی چار سنتوں پر مواظبت اختیار فرمائی۔

روی عبد الله بن السائب ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یصلی اربعا بعدالزوال قبل الظهر قال انها ساعة یفتح فیها ابواب السماء واحب ان یصعد لی فیها عمل صالح. (رواہ الترمذی)

عبداللہ بن سائب روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ زوال کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے سے پہلے چار سنتیں پڑھتے تھے۔ آپ نے (ایک مرتبہ) فرمایا کہ یہ وہ گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور میں پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل صالح آسمان کی طرف بلند ہو۔

نماز جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنا سنت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کی نماز پڑھے تو وہ اس کے بعد چار رکعتیں (سنت) ادا کرے۔
اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

عن عطاء قال رأیت ابن عمر صلی بعد الجمعة رکعتین ثم صلی اربعا. (رواہ الترمذی)

عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھا کہ آپ نے جمعہ

کے بعد دو سنتیں اور پھر چار سنتیں ادا فرمائیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کو قبول کیا ہے لیکن ان کے نزدیک چار سنتیں پہلے اور دو سنتیں بعد میں پڑھنا مناسب ہے کیونکہ حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ کی ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے چار سنتیں دو سنتوں سے پہلے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔

فی روایة ابی داؤد رأیت ابن عمر یصلی بعد الجمعة فیجتاز من مصلاہ الذی صلی الجمعة فیه قلیلا غیر کثیر فیرکع رکعتین ثم یمشی النفس من ذلک ای ابعد فیرکع اربع رکعات.

حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ سے روایت ہے کہ (راوی فرماتے ہیں) میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھا کہ آپ جمعہ کے بعد نماز پڑھتے تھے۔ جہاں آپ نے جمعہ کے فرض پڑھے ہوتے وہاں تھوڑی نہ کہ زیادہ دیر تک ٹھہرتے۔ دو رکعتیں پڑھتے پھر یہاں سے تھوڑے ہٹ جاتے اور چار رکعتیں نماز (سنت) پڑھتے۔

له کان اذا صلی الجمعة بمکة تقدم فصلی رکعتین ثم یتقدم فیصلی اربعا واذا کان بالمدینة صلی الجمعة ثم رجع الی بیته فصلی رکعتین ولم یصل فی المسجد فقیل له قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یفعله.

انہیں سے ایک روایت ہے کہ جب مکہ میں نماز جمعہ پڑھ چکتے تو آگے بڑھ کر دو سنتیں پڑھتے پھر تھوڑا اور آگے بڑھتے اور چار سنتیں ادا فرماتے اور جب آپ مدینہ طیبہ میں ہوتے تو جمعہ (کے فرض پڑھنے) کے بعد گھر تشریف لاتے اور دو سنتیں پڑھتے اور مسجد میں (جمعہ کے بعد) نماز نہیں پڑھتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہی معمول تھا۔

اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ ﷺ فرضوں کے بعد دو سنتیں پڑھتے تھے۔ واللہ اعلم۔

نمازِ تہجد کا بیان

کیا نمازِ تہجد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر فرض تھی؟

تہجد کی نماز رات کے آخری حصہ میں پڑھی جاتی ہے۔ حضور ﷺ پر نماز تہجد فرض تھی یا نفل اس بارے اختلاف ہے۔ کئی علماء کی رائے یہ ہے کہ حضور ﷺ پر یہ نماز فرض تھی۔ ان علماء میں ہمارے مذہب کے اصحاب اصول بھی شامل ہیں۔ امام قسطلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اکثر شافعی علماء کا بھی یہی مذہب ہے۔ کئی علماء کا موقف یہ ہے کہ نماز تہجد حضور ﷺ پر بھی فرض نہیں تھی۔

اس اختلاف کی بنیاد پر بقول شیخ ابن ہمام کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں۔ مثلاً رات کی نماز مستحب ہے یا سنت؟

جن کے نزدیک یہ نماز حضور ﷺ پر فرض تھی۔ ان کے نزدیک امت کے لئے نماز تہجد سنت نہیں ہے کیونکہ

سنت وہ نفل نماز ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے مواظبت اختیار فرمائی ہو اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ نماز تہجد کو حضور ﷺ نفل کی حیثیت سے پڑھتے تھے تو ان کے نزدیک امت کے لئے تہجد سنت ہے کیونکہ اس پر سنت کی تعریف صادق آتی ہے۔ جو لوگ نفل نماز کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے۔ **فتھجد به نافلة لک**. فرماتے ہیں کہ نماز تہجد کے نفل ہونے کے بارے یہ آیت نص ہے اور جو لوگ فرضیت کے قائل ہیں وہ اس آیت کو دلیل بناتے ہیں **یایها المزمل قم اللیل** کیونکہ یہ امر ہے اور امر وجوب کے لئے آتا ہے۔ دوسرا **فتهجد** بھی امر کا صیغہ ہے اس سے بھی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا لفظ کو حقیقی معنی سے پھیرنا جائز نہیں ہے۔ آیت میں **نافلة** کا مطلب ہے **زائدة**۔ نفلوں کو نفل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرض نماز سے زائد ہوتے ہیں۔ بہر حال نفل کا لغوی معنی ہے زائد۔ لہٰذا آیت میں **نافلة** اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوگا اور جب تک کوئی مانع نہیں ہوگا اس کو مجاز کی طرف نہیں پھیرا جائے گا جیسا کہ اصول امام فخر الاسلام میں مذکور ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تہجد کی نماز پڑھا کیجئے۔ آپ کے خلوص کے پیش نظر یہ نماز فرض نمازوں کے علاوہ آپ کے ذمہ لگائی گئی ہے اور امت میں کسی پر یہ نماز فرض نہیں کیونکہ ذوق عبادت میں آپ کا کوئی ہم پلہ نہیں ہوسکتا۔ **واللہ اعلم**.

امام ابن ہمام کے نزدیک تہجد حضور ﷺ کے لئے نفل تھے اور انہوں نے اس کی تائید میں مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حدیث پیش کی ہے۔

عن سعد ابن هشام قال فقلت یا ام المؤمنین انبئنی عن خلق رسول الله صلی الله علیه وسلم قال الست تقرء القرآن قلت بلی قالت فان خلقه القرآن.

سعد ابن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا۔ مجھ سے رسول اللہ ﷺ کے خلق کے بارے کچھ فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا خلق قرآن ہے۔

حضرت سعد بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے ارادہ کیا کہ (راتوں کو) قیام کروں گا اور آخری دم تک کسی سے کچھ نہیں پوچھوں گا پھر میرے دل میں خیال پیدا ہوا (کہ دین سیکھنا چاہئے) تو میں نے عرض کیا (اے ام المؤمنین!) مجھ سے رسول اللہ ﷺ کے قیام (رات کی نماز) کے بارے کچھ فرمائیے۔ تو آپ نے فرمایا: کیا تم **یایها المزمل** نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا کیوں نہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی ابتداء میں رات کا قیام فرض فرمایا۔ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ علیہم الرضوان نے ایک سال تک قیام فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی آخری بارہ آیات کو ایک ماہ تک آسمان میں روکے رکھا حتیٰ کہ جب اس سورت کی آخری آیات میں تخفیف کو نازل فرمایا تو رات کی نماز (تہجد) فرض کے بعد نفل بن گئی پھر حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نماز تہجد کی کیفیت کو بیان فرمایا۔

جس کا تذکرہ انشاء اللہ عنقریب آئے گا لیکن یہ حدیث دلیل نہیں بن سکتی کہ حضور ﷺ پر نماز تہجد فرض نہیں کیونکہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امت پر نماز تہجد فرض تھی جو بعد میں نفل بن گئی لیکن کیا حضور ﷺ کے لئے بھی یہ

نفل رہی یا فرض تو اس بارے حدیث میں کوئی اشارہ نہیں۔

امام قسطلانی نے نفل کے قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ ایک روایت ہے۔

روت ام المؤمنين عائشة الصديقة وقالت قام رسول الله صلى الله عليه وسلم الى ان تورمت قد ماه وفي رواية تفطرت قد ماه فقلت له لم تصنع هذا يا رسول الله وقد غفر الله لك ماتقدم من ذنبك وما تاخر قال افلا اكون عبدا شكورا فلما بدن وكثر لحمه صلى جالسا فاذا اراد ان يركع قام فقرء ثم ركع. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس قدر قیام فرماتے کہ پاؤں سوج جاتے اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کے پاؤں پھٹ جاتے۔ میں عرض کرتی کہ یا رسول اللہ! اتنا لمبا قیام نہ فرمایا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ ﷺ کے پہلے اور پچھلے سب الزامات دھوڑالے ہیں تو فرماتے کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں پھر جب آپ ﷺ موٹے ہو گئے اور آپ کا گوشت[1] زیادہ ہو گیا تو آپ بیٹھ کر نماز تہجد پڑھتے تھے اور جب رکوع کرنا چاہتے تو اٹھ جاتے۔ قرأت کرتے اور اس کے بعد رکوع فرماتے۔

لیکن اس حدیث مبارک سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ تہجد کی نماز آپ پر فرض نہیں تھی۔ حدیث سے تو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ ام المؤمنین نے عرض کیا کہ جب آپ ہر الزام سے پاک اور ہر خطا سے معصوم ہیں تو پھر اس حد تک مشقت نہ اٹھایئے' نماز تہجد میں قرأت کم کیجئے تا کہ قدم مبارک متورم نہ ہوں اور آپ ﷺ نے جواباً فرمایا کہ کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں کہ اس کی مجھ پر بے شمار نعمتیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یا رسول اللہ! آپ نماز تہجد نہ پڑھیں کیونکہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دوسرے صحابہ کرام کی روایات میں نماز تہجد کے لئے لفظ تطوع (زائد) بھی آیا ہے۔ اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے نزدیک حضور ﷺ کے لئے نماز تہجد نفل تھی یا پھر امت کے لئے نفل تھی۔ واللہ اعلم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ شب

رات کے وقت حضور ﷺ جو نفل نماز پڑھتے وہ زیادہ سے زیادہ گیارہ رکعتیں ہوتیں اور اس میں وتر نماز بھی شامل ہوتی۔ کبھی کبھی آپ اس سے کم نفل بھی پڑھتے لیکن گیارہ رکعتوں سے زیادہ نماز تہجد آپ ﷺ نے کبھی نہیں پڑھی۔ شیخ اکبر قدس سرہ نے فتوحات میں تصریح کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گیارہ سے زیادہ وتر نہیں پڑھے اور آپ علیہ الرحمہ کا جیسے طریقہ مبارک ہے اس میں جو راز پنہاں ہے اس کو بھی بیان فرمایا۔

[1] حضور ﷺ حسن وخوبی کا مجسمہ تھے۔ ان الفاظ سے اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کے حسن ظاہری میں کچھ فرق آ گیا تھا جیسے آج کل لوگ بے حد موٹاپے کا شکار ہو کر بدصورت دکھائی دینے لگتے۔ حاشا وکلا حضور ﷺ کے بارے ہم ایسا گمان بھی نہیں کر سکتے۔ الفقر فخری فرمانے والی مقدس شخصیت کو دنیاداروں پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔

وقد قالت ام المؤمنين عائشة الصديقة كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي من الليل ثلث عشر ركعة منها الوتر وركعتا الفجر. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ رات کو تیرہ رکعتیں ادا فرماتے تھے جن میں وتر کی نماز اور فجر کی دو سنتیں بھی ہوتیں۔

حضور ﷺ کی گیارہ رکعت نماز نفل کئی طریقوں سے منقول ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ ﷺ پانچ سلاموں سے دس رکعتیں ادا فرماتے اور پھر ایک رکعت وتر پڑھتے۔ امام احمدؒ امام شافعی کے اکثر پیرووں اور اہل حدیث علماء نے اسی کو اختیار کیا ہے اور نماز تہجد کا یہ طریقہ حدیث میں موجود ہے۔

روت ام المؤمنين عائشة الصديقة قالت كانت صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم عشر ركعات ويوتر بسجدة ويركع ركعتي الفجر فتلك ثلث عشر.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز تہجد دس رکعتوں پر مشتمل تھی۔ آپ ﷺ ایک سجدہ (یعنی ایک رکعت) سے وتر پڑھتے اور فجر کی دو رکعتیں ادا فرماتے۔ پس (یوں) یہ تیرہ رکعتیں بن جاتیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي ما بين ان يفرغ من صلوة العشاء وهي التي يدعوا الناس العتمة الى الفجر احدى عشرة ركعة يسلم بين ركعتين ويوتر بواحدة فاذا سكت المؤذن من صلوة الفجر وتبين له الفجر وجاء المؤذن قام فركع ركعتين خفيفتين ثم اضطجع على شقه الايمن حتى ياتيه المؤذن للاقامة. (رواہ البخاری ومسلم)

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے جسے لوگ عتمہ کہتے تھے فارغ ہو کر فجر تک گیارہ رکعتیں (نماز تہجد) پڑھتے۔ دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرتے اور ایک وتر کی رکعت ہوتی۔ جب مؤذن فجر کی اذان پڑھ کر خاموش ہوتا اجالا پھیل جاتا اور مؤذن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اٹھتے اور مختصر سی دو رکعتیں پڑھتے۔ اس کے بعد دائیں پہلو کے بل لیٹ جاتے حتیٰ کہ مؤذن اقامتِ نماز کے لئے عرض کرنے آتے۔

حضرت امام بخاری اور حضرت امام مسلم علیہما الرحمہ سے روایت ہے کہ:

عن ابن عباس انه بات عند ميمونة ام المؤمنين وهي خالته فقال فقلت لانظرن الى صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم فطرحت لرسول الله صلى الله عليه وسلم وسادة قال فاضطجعت في عرض الوسادة

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں جو ان کی خالہ تھیں رات گزاری۔ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ کی (نماز تہجد) کو دیکھوں گا۔ حضور ﷺ کے لئے بستر بچھایا گیا۔ فرماتے ہیں کہ میں بستر پر

واضطجع رسول الله صلى الله عليه وسلم واهله في طهولها فنام رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى انتصف الليل اوقبله بقليل اوبعده بقليل ثم استيقظ رسول الله صلى الله عليه وسلم فجلس يمسح النوم عن وجهه بيديه ثم قرء العشر الايات الخواتم من سورة آلِ عمران ثم قام الى شن معلقة فتوضأ منها واحسن وضوءه ثم قام فصلى قال عبد الله بن عباس فقمت فصنعت مثل ما صنع ثم ذهبت فقمت الى جنبه فوضع رسول الله صلى الله عليه وسلم على رأسي واخذباذني اليمنى يفتلها فصلى ركعتين ثم ركعتين ثم ركعتين ثم ركعتين ثم ركعتين ثم ركعتين لم اوترثم اضطجع حتى جاء المؤذن فصلى ركعتين ثم خرج فصلى الصبح.

عرضاً لیٹ گیا اور رسول اللہ ﷺ اور ان کی اہلیہ محترمہ طولاً لیٹ گئے۔ رسول اللہ ﷺ سو گئے۔ حتیٰ کہ آدھی رات یا اس سے کچھ پہلے یا اس کے تھوڑا بعد کا وقت تھا کہ آپ ﷺ بیدار ہوئے۔ بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کو ملا تا کہ نیند جاتی رہے پھر آپ ﷺ نے سورت آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں۔ اس کے بعد لٹکی ہوئی ایک پرانی مشک کی طرف اٹھ کر تشریف لے گئے اس سے وضو فرمایا اور خوب اچھی طرح وضو کیا پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی طرح (آیات پڑھیں اور وضو) کیا اور آپ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ آپ ﷺ نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اور دائیں کان کو (پیار سے) مروڑنا شروع کیا اور دو دو کر کے آپ نے بارہ رکعتیں ادا فرمائیں اور اس کے بعد وتر پڑھے اور کروٹ کے بل لیٹ گئے حتیٰ کہ مؤذن آیا۔ آپ ﷺ نے دو سنتیں پڑھیں پھر باہر تشریف لے گئے اور صبح کی نماز پڑھی۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ نماز کسی الگ نوعیت کی تھی کہ اس میں آپ نے بارہ رکعتیں نفل اور وتر ادا فرمائے حالانکہ بات یوں نہیں۔ دو رکعتیں تحیۃ الوضوء کی تھیں۔ یہ نماز حضور ﷺ کبھی کبھار پڑھتے تھے اور کبھی اس کو ترک بھی فرما دیتے تھے تو اس طرح کل رکعتیں نماز وتر کے علاوہ بارہ بن جاتی ہیں۔

دوسری صورت یہ تھی کہ حضور ﷺ دو سلاموں کے ساتھ آٹھ آٹھ رکعتیں پڑھتے اور ایک سلام کے ساتھ تین وتر پڑھتے۔ حنفیہ کے نزدیک یہی نماز تہجد کا طریقہ ہے اور یہ طریقہ حدیث سے ثابت ہے۔

عن ابي سلمة انه سأل عائشة كيف كان صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم في رمضان قالت ما كان يزيد في رمضان ولا غيره على احدى عشر ركعة يصلي اربعا فلاتسال عن حسنهن وطولهن ثم يصلي اربعالاتسال عن حسنهن وطولهن ثم يصلي ثلثا قالت عائشة فقلت يا رسول

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا گیا ہے۔ انہوں نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں نماز کیسے پڑھتے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ حضور ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ چار رکعتیں پڑھتے۔ ان کے حسن اور طوالت کے بارے کچھ نہ پوچھیے پھر آپ ﷺ چار رکعتیں پڑھتے ان کے حسن اور

الـلـه اتنام قبل ان توتر فقال عائشه ان عيني تناماں ولاينام قلبي. (رواہ البخاری ومسلم)

طوالت کے بارے کچھ نہ پوچھئے پھر آپ تین رکعت (وتر) پڑھتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ وتروں سے پہلے سو جاتے ہیں۔ فرمایا اے عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا۔

حنفیوں نے اس حدیث سے یہ مفہوم لیا ہے کہ حضور ﷺ چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھتے اور وتر کی تین رکعتیں بھی ایک سلام سے۔ اہل حدیث یہ مفہوم لیتے ہیں کہ آپ ﷺ چار رکعتیں دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے۔ اس کے بعد پھر دو سلاموں سے چار رکعتیں پڑھتے اور آخر میں تین وتر بھی دو سلاموں سے ادا فرماتے اور ان دونوں نے بھی اہل حدیث کے ساتھ موافقت کی ہے۔ ان کے نزدیک بھی حدیث پاک کا وہی مفہوم ہے جو اہل حدیث نے لیا ہے۔ ان کی رائے اور اہل حدیث کی رائے میں صرف یہ فرق ہے کہ ان کے نزدیک وتر کی تینوں رکعتیں ایک سلام کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں۔ کسی منصف پر یہ حقیقت مخفی نہیں کہ حنفیہ کی رائے زیادہ صحیح اور واضح ہے۔ چار، پھر چار اور پھر تین کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ گیارہ رکعتیں تین سلاموں کے ساتھ پڑھی گئیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ چھ رکعتیں تین سلاموں کے ساتھ ادا فرماتے اور اس کے بعد ایک سلام کے ساتھ وتر کی پانچ رکعتیں ادا کرتے

روت ام المؤمنين عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي من الليل ثلثة عشر ركعة يوتر من ذلك بخمس لايجلس في شئي الا في اخرها. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کو تیرہ رکعتیں پڑھتے۔ ان میں پانچ رکعتیں نماز وتر کی نیت سے پڑھتے اور ان میں آپ بالکل نہیں بیٹھتے تھے۔ سوائے آخری قعدہ کے۔

رات کی یہ نماز چھ رکعت نماز تہجد اور پانچ رکعت نماز وتر پر مشتمل ہوتی۔ اس طرح تہجد اور وتر کی کل رکعتیں گیارہ بن جاتیں اور فجر کی دو سنتوں کو ملانے سے اس کی تعداد تیرہ ہو جاتی۔ مسلم شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے جو روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز تہجد کی آٹھ رکعتیں دو دو کر کے ادا فرمائیں پھر پانچ رکعت نماز وتر پڑھی اور ان پانچ رکعتوں میں صرف آخری قعدہ کیا تو درحقیقت دو رکعتیں تحیۃ الوضو کی تھیں وہ تہجد کی نماز میں داخل نہیں تھیں۔

رہی گیارہ رکعتوں سے کم رات کی نماز تو حضور ﷺ نے اسے مختلف طریقوں سے ادا فرمایا ہے۔

اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ آپ حضور ﷺ نے چھ رکعتیں تین سلاموں کے ساتھ ادا کیں اور اس کے بعد تین وتر ادا فرمائے۔ یہ طریقہ بھی حنفیوں کا اختیار کردہ ہے۔

روى ابن عباس انه رقد رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فاستيقظ

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے روایت کیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سوئے (ان کی خالہ

وتسوک وتوضأ وهو يقول ان في خلق السموات والارض واختلاف الليل والنهار لايات لاولي الالباب فقرء هؤلاء الايات حتى ختم السورة ثم قام فصلى ركعتين اطال فيهما القيام والركوع والسجود ثم انصرف فنام حتى نفخ ثم فعل ذلك ثلث مرات ست ركعات كل ذلك يستاك ويتوضأ ويقرء هو لاء الايات ثم اوتر بثلث فاذن المؤذن فخرج الى الصلوة وهو يقول اللهم اجعل في قلبي نورا وفي لساني نورا واجعل في سمعي نورا واجعل في بصري نورا واجعل من خلفي نورا ومن امامي نورا واجعل من فوقي نورا ومن تحتي نورا اللهم اعطني نورا. (رواہ مسلم)

حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں تھیں۔ حضرت ابن عباس ان کے گھر میں سوئے) تو آپ بیدار ہوئے' مسواک کیا' وضو فرمایا اور یہ آیات پڑھنے لگے۔ ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار لایات لاولی الالباب. آپ ﷺ نے ان آیات کریمہ کی تلاوت فرمائی حتیٰ کہ سورت ختم ہوگئی پھر آپ کھڑے ہوگئے اور دو نفل پڑھے جن میں قیام اور رکوع و سجود کو طویل کیا پھر ہٹ کر سو گئے حتیٰ کہ آپ کے سانس کی آواز آنے لگی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے تین مرتبہ ایسا ہی کیا۔ آپ نے چھ رکعتیں ادا فرمائیں۔ ہر بار مسواک کر کے وضو کرتے اور یہی آیات تلاوت کرتے۔ آخر میں آپ نے وتر کی تین رکعتیں پڑھیں۔ مؤذن نے اذان دی۔ آپ باہر تشریف لے گئے۔ آپ کی زبان مبارک پر یہ دعائیہ کلمات تھے۔ اے اللہ! میرے دل میں نور پیدا فرما۔ میری زبان میں نور پیدا فرما۔ میری سماعت میں نور پیدا فرما۔ میری بصارت میں نور پیدا فرما۔ میرے آگے پیچھے' اوپر نیچے نور پیدا فرما۔ اے اللہ! مجھے نور عطا کر۔

دوسری صورت یہ ہے کہ نو رکعتیں ایک ہی ساتھ پڑھ دی جائیں اور صرف آٹھویں رکعت پڑھ کر قعدہ کیا جائے اور اس قعدہ کے بعد ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ سات رکعتیں ایک ہی سلام کے ساتھ پڑھی جائیں۔ چھ رکعتوں کو پڑھ کر قعدہ کیا جائے' اس کے بعد ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے کیونکہ سعد بن ہشام نے ایک حدیث روایت کی ہے جس میں رات کی نماز کے منسوخ ہونے کا بیان ہے۔ انہوں نے یہ حدیث ایک لونڈی سے روایت کی ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة قال قلت يا ام المؤمنين انبئني عن وتر رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت كان نعدله سواک وطهوره فيبعثه الله متى شاء ان يبعثه من الليل فيتسوک ويتوضا و يصلي تسع ركعات لايجلس فيها الا في الثامنة فيذكر

حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں۔ کہ میں نے ام المؤمنین سے گزارش کی۔ اے مسلمانوں کی ماں! رسول اللہ ﷺ کے وتروں کے بارے ارشاد فرمایئے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: ہم آپ ﷺ کے لئے مسواک اور وضو کا پانی تیار کر رکھتے۔ رات کو اللہ تعالیٰ جب چاہتا آپ ﷺ کو بیدار فرماتا۔ آپ

الله وبحمده ويدعوه و ينهض ولا يسلم ثم يقوم فيصلى التاسعة ثم يقعد فيذكر الله وبحمده ويدعوه ثم يسلم تسليما يسمعنا ثم يصلى ركعتين بعد مايسلم و هو قاعد فتلك احدى عشر ركعة يا بنى فلما اسن واخذ اللحم اوتر بسبع وصنع فى الركعتين مثل الاول فتلك تسع يا بنى وكان نبى الله صلى الله عليه وسلم اذا صلى صلوة احب ان يداوم عليها وكان اذا غلبه نوم او وجع عن قيام الليل صلى فى النهار اثنى عشر ركعة ولا اعلم نبى الله قرء القرآن كله فى ليلة ولا صلى ليلة الى الصبح ولا صام شهرا كاملا غير رمضان. (رواہ مسلم)

مسواک کرتے۔ وضو فرماتے اور نو رکعتیں نماز ادا فرماتے۔ آپ ان نو رکعتوں میں سوائے آٹھویں رکعت کے بالکل نہیں بیٹھتے تھے۔ آپ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔ اس کی حمد وثناء کرتے۔ دعا کرتے اور اٹھ جاتے اور سلام نہیں پھیرتے تھے پھر قیام فرماتے اور نویں رکعت پڑھتے پھر قعدہ کرتے۔ ذکر خداوندی کرتے' حمد وثناء بیان کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے اور پھر آپ ہمیں سنا کر سلام پھیرتے۔ سلام کے بعد آپ بیٹھ کر دو نفل پڑھتے۔ اے میرے بیٹے! یہ گیارہ رکعتیں بنتی ہیں۔ جب آپ ﷺ کی عمر مبارک زیادہ ہوگئی اور (قدرے) موٹے ہو گئے تو آپ سات رکعتیں پڑھنے لگے۔ دوسری دو رکعتوں میں بھی آپ ﷺ وہی کرتے جو پہلی رکعت میں کرتے۔ تو یہ نو رکعتیں بنتی ہیں اے میرے بیٹے! حضور ﷺ جب نفل نماز پڑھتے تو چاہتے کہ اس پر مداومت اختیار فرمائیں۔ جب آپ پر نیند کا غلبہ ہو جاتا یا رات کو کھڑے ہونے سے تکلیف محسوس کرتے تو دن کے وقت بارہ رکعتیں پڑھ لیتے۔ میں نہیں جانتی کہ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے ایک رات میں سارا قرآن پڑھا ہو۔ نہ آپ نے صبح تک کبھی نماز پڑھی اور نہ ہی رمضان شریف کے علاوہ پورا ماہ روزے رکھے۔

اس حدیث مبارک میں سات اور نو رکعتوں کے بعد دو رکعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دو رکعتیں رات کی نماز کی نہیں۔ یہ آپ وتر نماز کے بعد ادا فرماتے۔ اس لئے یہ حدیث اجعلوا آخر صلوتكم وترا کے معارض نہیں کیونکہ صلوتکم میں اضافت عہدی ہے اور معہود صلوٰة الليل مثنٰى مثنٰى ہے جسے امام مسلم اور دوسرے لوگوں نے روایت کیا ہے۔

عن عبد الله بن عمر ان رجلا سأل النبی ﷺ فقال یا رسول الله صلى الله عليه وسلم كيف صلوة الليل قال مثنى مثنى فاذا خشيت الصبح فصل ركعة واجعل اخر صلوتک وترا.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا۔ یا رسول اللہ! رات کی نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا: دو دو رکعتیں اور جب طلوع صبح کا اندیشہ ہو تو ایک پڑھ لو اور اپنی آخری نماز وتر بنا لو۔

لہٰذا جو شخص وتر کی نماز پڑھتا ہے اور اس سے پہلے دو دو رکعتیں (نماز تہجد) نہیں پڑھتا تو اس کے بارے حدیث خاموش ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دو رکعتوں کے بعد وتر کی سات یا نو رکعتیں پڑھی ہوں۔ حضور ﷺ کے عمل سے معلوم ہوا کہ وتروں کے بعد دو رکعتیں جبکہ وتر کی سات یا نو رکعتیں پڑھی ہوں زیادہ مؤکدہ ہیں اور ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ارشاد جب آپ پر نیند کا غلبہ ہو جاتا یا کسی قسم کی تکلیف ہو جاتی یعنی رات کی نماز لمبی ہوتی جب کسی وجہ سے وہ رہ جاتی تو آپ دن کے وقت اسے ادا کرتے لیکن یہ ثابت نہیں کہ حضور ﷺ کی وتر نماز کبھی رہ گئی ہو اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وتر کی نماز کبھی ترک نہیں فرمائی۔ اب بارہ رکعتیں جن کو حضور ﷺ دن کے وقت ادا کرتے تھے یا تو فوت شدہ نماز کی قضا ہوتی اور اس میں وتر شامل نہیں ہوتے تھے اور آپ گیارہ رکعتوں کو جفت بنا دیتے تھے تاکہ دو نماز وتر لازم نہ آئیں۔ یا پھر یہ بارہ رکعتیں چاشت کی نماز ہوتی تاکہ یہ نیکی اس نیکی کا بدلہ ہو جائے۔ جو رات کو کسی وجہ سے رہ گئی ہے۔ نماز تہجد کی چوتھی صورت یہ تھی کہ حضور ﷺ چار رکعتیں دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے تھے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

روی حذیفة قال رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی من اللیل فاستفتح یقول الله اکبر ثلثا ذو الملکوت والجبروت والکبریاء والعظمة ثم افتتح فقرء البقرة ثم رکع وکان رکوعه نحوا من قیامه وکان یقول فی رکوعه سبحان ربی العظیم ثم رفع رأسه من الرکوع فکان قیامه نحوا من قیامه یقول لربی الحمد ثم یسجد فکان سجوده نحوا من رکوعه وکان یقول فی سجوده سبحان ربی الاعلی ثم یرفع رأسه من السجود فکان یقعد فیما بین السجدتین نحوا من سجوده وکان یقول رب اغفرلی فیصلی اربع رکعات فقرء فیهن البقرة وال عمران والنساء والمائدة او الانعام شک شعبة. (رواہ ابوداؤد)

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو رات کے وقت نماز پڑھتے دیکھا۔ آپ ﷺ نے نماز شروع کرتے وقت تین بار اللہ اکبر ذو الملکوت والجبروت والکبریاء والعظمة کہا پھر نماز شروع کی اور سورت بقرہ کی تلاوت فرمائی پھر رکوع کیا اور رکوع تقریباً اتنا ہی تھا جتنا قیام لمبا تھا۔ آپ ﷺ نے رکوع میں سبحان ربی العظیم کہا پھر آپ نے رکوع سے سر اٹھایا اور قومہ میں قیام کے برابر کھڑے رہے اور لربی الحمد کہتے رہے پھر آپ نے سجدہ کیا اور سجدہ رکوع کے برابر تھا اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلی پڑھتے رہے پھر سجدہ سے سر اٹھایا اور دونوں سجدوں کے درمیان اتنی دیر بیٹھے جتنی دیر سجدہ کیا تھا اور یہ دعا پڑھتے رہے رب اغفرلی۔ اس طرح آپ نے چار رکعتیں پڑھیں اور ان میں سورت بقرہ، سورت آل عمران، سورت نساء، سورت مائدہ یا سورت انعام کی تلاوت کی۔ حضرت شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس میں شک ہے۔

شاید حضور ﷺ نے سونے سے پہلے عشاء کی نماز کے ساتھ ہی وتر کی نماز پڑھ لی تھی جیسا کہ روایت سے ثابت ہے۔

روت ام المؤمنين عائشة الصديقة قالت من كل الليل اوتر رسول الله صلى الله عليه وسلم من اول الليل واوسطه و آخره وانتهى وتره الى السحر. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ رات کو ہمیشہ نماز وتر ادا کرتے۔ کبھی رات کے پہلے پہر۔ کبھی درمیانی حصہ میں اور کبھی آخر میں اور زیادہ سے زیادہ آپ وتر کی نماز کو سحر تک مؤخر کرتے تھے۔

حضور ﷺ رات کے وقت جو نماز پڑھتے اس کی تمام صورتیں یہاں بیان کر دی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی بھی طریقہ کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ غافلین کے زمرے سے نکلنے کے لئے کم سے کم نماز تہجد کا ذکر اس حدیث میں موجود ہے۔

فعن ابى هريرة و ابى سعيد قالا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا ايقظ الرجل اهله من الليل فصليا اوصلى ركعتين جميعا كتبا فى الذاكرين والذاكرات.

(رواہ ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنے اہل خانہ کو رات کے وقت بیدار کرتا ہے اور وہ دونوں میاں بیوی نماز پڑھتے ہیں یا وہ مرد پوری دو رکعتیں پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں (میاں بیوی کو) ذکر کرنے والوں میں لکھ دیتا ہے۔

نماز تراویح کا بیان

نمازِ تراویح اور نمازِ تہجد میں فرق

نماز تراویح رمضان المبارک میں رات کے وقت ادا کی جاتی ہے اور یہ رمضان شریف کے ساتھ خاص ہے۔ یہ نماز تہجد سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ تراویح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور نماز تہجد کے برعکس رات کے پہلے دوسرے اور آخری پہر میں کسی وقت بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ ایک اور لحاظ سے بھی یہ نماز تہجد سے مختلف ہے کہ نماز تراویح کے لئے زیادہ تاکید آئی ہے اور پورے مہینے میں نماز تراویح کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس میں قرآن کریم کا ختم ہوتا ہے۔ بہت ساری صحیح احادیث اس نماز کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ یوں کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ انہیں تواتر معنوی حاصل ہے۔ مثلاً ایک حدیث مبارک ہے:

من صام نهار رمضان وقام لياليه غفرله ماتقدم من ذنبه. (رواہ البخاری ومسلم)

جس نے رمضان کے دنوں میں روزے رکھے اور راتوں کو قیام کیا تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف ہو گئے۔

ان دو حضرات کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی انہیں روایت کیا ہے۔ عہد نبوی میں صحابہ کرام نماز تراویح کو گھروں میں اکیلے مواظبت کے ساتھ پڑھتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں پھر حضور ﷺ نے دو یا تین راتیں نماز تراویح باجماعت ادا فرمائی۔ اس کے بعد اس عذر کی وجہ سے جماعت ترک فرما دی کہ کہیں یہ نماز فرض نہ ہو جائے۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں یہ امت پر گراں نہ گزرے آپ نے حکم دیا کہ اسے اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو۔

حضور علیہ السلام بے حد شفیق تھے۔ اپنی امت کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

عن ام المؤمنین عائشة قالت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم خرج من جوف اللیل فصلی فی المسجد فصلی رجال بصلوته فاصبح الناس یتحدثون بذلک فاجتمع اکثر منهم فخرج رسول الله صلی الله علیه وسلم فی اللیلة الثانیة فصلوا بصلوته فاصبح الناس یذکرون ذلک فکثر اهل المسجد من اللیلة الثالثة فخرج فصلوا بصلوته فلما کان اللیلة الرابعة عجز المسجد عن اهله فلم یخرج الیهم رسول الله صلی الله علیه وسلم فطفق رجال یقولون الصلوة فلم یخرج الیهم رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی خرج لصلوة الفجر فلما قضی الفجر اقبل الناس ثم تشهد فقال اما بعد فانه لم یخف علی شانکم اللیلة ولکن خشیت ان یفرض علیکم صلوة اللیل. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام رات کے وقت گھر سے باہر تشریف لے گئے اور مسجد میں نماز (تراویح) ادا فرمائی۔ لوگوں نے بھی آپ کی معیت میں یہ نماز پڑھی۔ صبح ہوئی تو لوگ باہم اس نماز کے بارے گفتگو کرنے لگے۔ (دوسرے دن) اس سے بھی زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ دوسری رات بھی حضور علیہ السلام کاشانۂ اقدس سے باہر تشریف لے گئے اور لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز (تراویح) پڑھی۔ صبح کے وقت پھر لوگوں نے اس نماز کے بارے گفتگو کی تو تیسری رات لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا۔ آپ علیہ السلام باہر تشریف لے گئے اور لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب چوتھی رات مسجد لوگوں سے بھر گئی اور تنگ ہو گئی تو حضور علیہ السلام تشریف نہ لائے۔ لوگ ادھر ادھر پھرتے اور الصلوٰۃ الصلوٰۃ کی صدا لگاتے رہے لیکن حضور علیہ السلام گھر سے باہر لوگوں کے پاس تشریف نہ لائے حتیٰ کہ صبح کی نماز کے لئے باہر نکلے۔ جب نماز پڑھ چکے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا عبده ورسوله پڑھا اور فرمایا: اما بعد! رات کے وقت تمہارا جمع ہونا مجھ سے چھپا نہیں رہا لیکن میں ڈر گیا کہ کہیں تم پر رات کی نماز (تراویح) فرض نہ ہو جائے۔

نمازِ تراویح مسجد میں با جماعت ادا کرنا

شیخین کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ رمضان شریف کا ہے۔ شیخین ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا: اپنے گھروں میں نماز پڑھو! بہترین نماز وہ ہے جو انسان گھر میں ادا کرے سوائے فرض نماز کے۔ صحابہ کرام تراویح کی نماز گھروں میں ادا کرتے تھے اور انہوں نے اس پر مواظبت اختیار فرمائی کیونکہ رسول اللہ علیہ السلام نے اس کو ترک کرنے کا حکم نہیں دیا۔ وہ کبھی نماز تراویح مسجد میں اکیلے ادا کر لیتے اور کبھی جماعت کے ساتھ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

عن ابی هریرة قال خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم علی الناس فی رمضان وهم یصلون فی ناحیة المسجد فقال ماهؤ لاء قیل له هو لاء اناس لیس معهم قرآن و ابی بن کعب یصلی بهم وهم یصلون بصلوته فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اصابوا و نعم اصنعوا.

حضرتؑ ابوہریرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ گھر سے نکل کر لوگوں کے پاس آئے۔ رمضان کا مہینہ تھا اور وہ مسجد کے ایک کونہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ عرض کیا گیا یہ لوگ قرآن پڑھنا نہیں جانتے اس لئے ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں نماز (تراویح) پڑھا رہے ہیں اور وہ ان کی اقتداء کر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان لوگوں نے ٹھیک کیا اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ بہت اچھا ہے۔

اسے ابوداؤد علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے۔ اس کی سند میں مسلم بن خالد ضعیف راوی ہے۔

نمازِ تراویح کی بیس رکعتیں ہیں

حضور ﷺ نے ان تین راتوں میں جو نماز پڑھی وہ ایسی نماز تھی جس پر آپ کی مواظبت تھی اور اس کی رکعتیں گیارہ تھیں اور آپ کے حکم سے صحابہ کرام جو نماز ادا کرتے تھے اس نماز کی رکعتیں گیارہ سے زائد تھیں اور جو نماز حضور ﷺ اپنے گھر میں ماہ رمضان میں ادا فرماتے تھے ظاہر ہے وہ بھی گیارہ رکعتیں تھیں جیسا کہ شیخین نے ام المؤمنین سے روایت کیا ہے کہ رمضان اور رمضان کے علاوہ دوسرے کسی مہینے میں رسول اللہ ﷺ کی نماز گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن ابن ابی شیبہ کی روایت ہے:

عن ابن عباس کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی فی رمضان عشرین رکعة الوتر.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں وتر کی بیس رکعتیں پڑھتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے اور یہ ام المؤمنین کی حدیث کے معارض بھی ہے اور ظاہر ہے یہ حدیث ام المؤمنین کی حدیث کے معارض نہیں ہوسکتی کیونکہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جو دیکھا وہی بتایا۔ ہوسکتا ہے بیس رکعتیں آپ ﷺ نے ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر ادا فرمائی ہوں۔ اس کی تائید ابن عباس کی حدیث سے ہوتی ہے۔ نیز صحابہ کرام کی بیس رکعتوں پر مواظبت یہ قرینہ ہے کہ یہ روایت صحیح ہے پھر رسول اللہ ﷺ کے دور ہمایوں' افضل الصدیقین کے پورے دور اور خلافت فاروقی کے ابتدائی دور میں یہی طریقہ چلتا رہا حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک قاری کے پیچھے نماز تراویح پڑھنے کا حکم دیا۔ پہلے تو لوگ امام کے پیچھے گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے پھر بیس رکعت تراویح اور وتر جماعت کے ساتھ پڑھنا مقرر ہوا اور یہی طریقہ رائج ہوگیا۔

فعن عبد الرحمن ابن القاری قال خرجت مع عمر بن الخطاب لیلة الی المسجد والناس اوزاع متفرقون یصلی الرجل لنفسه ویصلی الرجل فیصلی بصلوته الرهط فقال عمرانی لو جمعت هؤلاء علی قار واحد لکان امثل ثم عزم فجمعهم علی ابی بن کعب قال ثم خرجت معه لیلة اخری والناس یصلون بصلوة قاریهم قال عمر نعمت البدعة هذه والتی تنامون عنها افضل من التی یقومون یرید اخر اللیل وکان الناس یقومون اوله. (رواہ البخاری)

عبدالرحمٰن ابن القاری سے راویت ہے کہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ایک رات مسجد میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ لوگ الگ الگ کھڑے ہیں اور اپنی اپنی نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ بہت سارے لوگوں نے نماز پڑھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر میں انہیں ایک قاری پر جمع کردوں تو بہت اچھی بات ہوگی پھر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پختہ ارادہ فرمالیا اور لوگوں کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء پر جمع کردیا۔ راوی فرماتے ہیں کہ دوسری رات میں آپ کے ساتھ گیا تو لوگ اپنے قاری (ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر نے فرمایا یہ ایک اچھا کام ہے۔ جو نماز تم پڑھ لیتے ہو وہ اس نماز سے بہتر ہے جسے چھوڑ کر تم سو جاتے ہو۔

آپ کا مطلب یہ تھا کہ آخری رات میں جسے تم چھوڑ دیتے ہو اسے پہلی رات میں پڑھنا بہتر ہے۔ لوگ اسے رات کے پہلے پہر میں پڑھ لیتے تھے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ بدعت اس بدعت سے بہتر ہے جس کو تم نے رات کے پہلے پہر ایجاد کیا ہے کہ تم سب قرآن پڑھتے ہو اور یوں ایک جھگڑا کی کیفیت بن جاتی ہے۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آتا۔ آپ نے اسے بدعت اس لئے کہا کہ اس چیز کو رسول اللہ ﷺ کے بعد ایجاد کیا گیا۔ یہ لوگ پوری رات نماز پڑھتے جبکہ رسول اللہ ﷺ صرف رات کے آخری حصے میں نماز پڑھتے تھے۔ یہ بدعت تو ہے لیکن بدعت حسنہ ہے جس کو امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شروع فرمایا ہے اور اس کام کو رواج دینے سے ان کا مقصود رضائے خداوندی تھا۔ لہٰذا یہ ہمارے لئے سنت کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ خلفاء راشدین کی سنت نبی کریم ﷺ کی سنت کی طرح واجب اتباع ہے اور اس کو ترک کرنا موجب گناہ ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ فی موعظته فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوابها و عضوا علیها بالنواجذ ایاکم و محدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة. (رواہ ابوداؤد و احمد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ نصیحت کی ہے کہ تم پر میری اور میرے خلفائے راشدین محدثین کی سنت کی پیروی ضروری ہے اسے اختیار کرو اور اسے اپنے دانتوں کے ذریعے مضبوطی سے پکڑو۔ نئی نئی چیزوں سے بچو۔ بیشک ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

وہ چیزیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک اور خلفائے راشدین کے زمانہ کے بعد رواج پذیر ہوئیں وہ بدعت ہیں جیسے مروان نے عیدین سے پہلے خطبہ کو رواج دینے کی کوشش کی اس کے علاوہ چند چیزیں اور بھی ہیں

جنہیں بنوامیہ نے رواج دیا۔

خلفاء راشدین کا عمل یا ان کے دور میں مروج ہونے والا کوئی کام سنت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا قابل اتباع ہونا نص سے ثابت ہے۔ نماز تراویح جماعت کے ساتھ پڑھنا بھی انہیں امور میں سے ایک ہے جس پر خلفاء راشدین کے دور میں عمل ہوا۔ اب قیامت تک اس کام کو رواج دینے کی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی ثواب ملتا رہے گا۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده. (رواہ مسلم)

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: جس نے اسلام میں کسی اچھے کام کی بنیاد ڈالی تو اسے اس کا اجر ملے گا اور اس کے بعد جو اس کام کو کرے گا اس کا اجر بھی اسے ملے گا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ تراویح کی بیس رکعتیں پڑھی جاتی ہیں اور ان کے بعد وتر بھی پڑھے جاتے ہیں تو اس کے ثبوت کے لئے بہت سارے آثار ہیں۔

قال یزید بن رومان کان الناس یقومون فی زمن عمر بثلث وعشرین رکعة. (رواہ مالک)

(تین رکعت وتر بھی اس میں شامل ہیں)

یزید بن رومان کہتے ہیں کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں تیئس رکعتیں پڑھتے تھے۔

نماز تراویح کی بیس رکعتیں ہیں جو عشاء کی نماز کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔ ان کو پڑھنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ دو دو کر کے دس سلاموں کے ساتھ پڑھی جائیں اور ہر چار رکعتوں کے بعد اتنی دیر بیٹھا جائے جتنی دیر میں چار رکعتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس وقفے کے دوران نمازی کچھ ذکر کرے۔ وہ خاموش بھی بیٹھ سکتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ تسبیح وتہلیل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی کبریائی بیان کرے (تسبیح تراویح کا پڑھنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں بہت اچھے طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی مسبوحیت کو بیان کیا گیا ہے) اس طرح بیس رکعتیں پڑھنے کے بعد بھی چار رکعتوں کی مقدار بیٹھے اور پھر وتر ادا کرے۔

اگر کوئی شخص نماز وتر تراویح سے پہلے ادا کر لے تو بھی حرج نہیں۔ تمام رکعتوں میں بلند آواز سے قرأت کی جائے اور قرآن کریم کا ایک بار ختم ہو کیونکہ یہ سنت ہے اگر ایک ختم سے زیادہ ہو سکے تو بہت بہتر ہے۔ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت سے آج تک مسلسل اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ ایسے احکام ہیں کہ ہمارے چاروں امام ابوحنیفہ، مالک، احمد بن حنبل اور شافعی علیہم الرحمہ ان پر مکمل اتفاق رکھتے ہیں۔

اگر تمام لوگ ہی نماز تراویح چھوڑ دیں

اگر کسی مسجد سے منسلک تمام لوگ نماز تراویح چھوڑ دیں تو تمام لوگ گناہ گار ہوں گے۔ اگر کچھ لوگ جماعت سے تراویح پڑھیں تو انہیں ثواب ملے گا اور گھر میں پڑھنے والے گناہ گار نہیں ہوں گے کیونکہ عہد فاروقی میں تمام صحابہ کرام نماز تراویح مسجد میں آ کر نہیں پڑھتے تھے بلکہ کئی گھر میں بھی پڑھ لیتے اور باجماعت نماز تراویح کو معیوب نہیں گردانتے تھے اور جو نہیں آتے تھے انہیں بھی کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔

اگر لوگ تراویح میں قدرت کے باوجود سستی کریں تو وہ گناہ گار ہوں گے اور ان کی سستی کی وجہ سے ختم قرآن کو ترک نہیں کیا جا سکا۔ اگر قرآن کریم کا ختم چند دنوں میں ہو جائے تو بقیہ دنوں میں تراویح کی نماز پڑھی جائے گی کیونکہ نماز تراویح رمضان شریف کے مہینے کے حق کو ادا کرنے کے لئے شروع کی گئی ہے جبکہ قرآن کریم کا ختم ایک الگ سنت ہے۔ ایک سنت کو ادا کرنے سے دوسری سنت ادا نہیں ہو جاتی بلکہ دونوں کو الگ الگ ادا کرنا ضروری ہے۔

نمازِ چاشت کا بیان

نمازِ چاشت کی رکعتیں

چاشت کی کم سے کم دو رکعتیں ہیں جیسا کہ حدیث مبارک سے ثابت ہے۔

عن معاذ بن انس الجهني قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من قعد في مصلاه حين ينصرف من صلوة الصبح حتى يسبح ركعتي الضحى لايقول الاخيرا غفر خطاياه وان كانت مثل زبد البحر. (رواہ ابوداؤد)

معاذ بن انس الجہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص صبح کی نماز سے واپس آنے کے بعد نماز کی جگہ بیٹھا رہا حتیٰ کہ اس نے چاشت کی دو رکعتیں پڑھیں اور وہ اچھی بات ہی کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے گناہ معاف فرما دے گا چاہے وہ سمندر کی جھاگ کی مانند ہوں۔

چاشت کی نماز زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں پڑھی جاتی ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے:

عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى الضحى اثنتى عشر ركعة بنى الله له قصرا من ذهب في الجنة. (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ارشادِ نبوی ہے جس نے چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں سونے کا محل تعمیر فرمائے گا۔

چاشت کی نماز نفلی عبادت ہے، سنت مؤکدہ نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر مواظبت اختیار نہیں فرمائی۔

قال ابن عمر حين سئل ان النبي صلى الله عليه وسلم يصليها لا اخاله. (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ چاشت کی نماز نہیں پڑھتے تھے۔

لیکن ایک بار حضور ﷺ نے چاشت کی چار رکعتیں پڑھیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

عن معاذة قالت سالت عائشة كم كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي الضحى قالت اربع ركعات و يزيد ماشاء. (رواہ مسلم)

حضرت معاذہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ چاشت کے وقت کتنی نماز پڑھتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ چار رکعتیں اور چاہتے تو اس سے زیادہ

پڑھ لیتے۔

ایک بار آپ ﷺ نے آٹھ رکعتیں پڑھیں۔

عن ام ھانئ قالت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل بیتھا فاغتسل وصلی ثمانی رکعات فلم ار صلوۃ قط اخف منھا غیر انہ تیم الرکوع والسجود قالت وذلک صلوۃ الضحی. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے گھر تشریف لائے غسل فرمایا اور آٹھ رکعتیں نماز (چاشت) ادا فرمائی۔ میں نے ایسی ہلکی نماز کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سوا اس کے آپ ﷺ رکوع اور سجود مکمل کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: وہ چاشت کی نماز تھی۔

نمازِ چاشت کا وقت

نماز چاشت کا وقت سورج کے ایک یا دو نیزے کی قدر بلند ہونے سے نصف النہار تک ہے۔ حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ یہ نفل دن کی دوسری چوتھائی میں ادا کئے جائیں اور پڑھنے والے کو اختیار ہے کہ چاہے تو دو دو رکعتیں پڑھ لے اور جب چاہے تو چار چار رکعتیں پڑھے۔

بعض اربابِ سلوک دو نمازیں (یعنی سورج طلوع ہونے اور زوال سے پہلے) پڑھتے ہیں۔ ایک کو نماز اشراق کہتے ہیں۔ یہ نماز سورج کے اچھی طرح طلوع ہونے کے بعد تقریباً ایک یا دو نیزے برابر سورج کے بلند ہونے تک پڑھی جاتی ہے۔ اس کی دو یا چار رکعتیں ہوتی ہیں اور دوسری نماز چاشت کی ہے جس کی چار سے بارہ رکعتیں ہیں اور یہ دو ساعتوں کے بعد نصف النہار تک پڑھی جاتی ہے لیکن یہ حد بندی حدیث سے ثابت نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال.

نمازِ کسوف کا بیان

نمازِ کسوف سنت ہے

نمازِ کسوف جمہور کے نزدیک سنت ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نماز کسوف سنت نہیں بلکہ واجب ہے۔ اس قول کو فتح القدیر میں نقل کیا گیا ہے اور ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ نماز کسوف کے لئے امر کا صیغہ آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جب تم اس طرح دیکھو تو نماز کی طرف لپکو۔ جمہور فرماتے ہیں کہ یہ امر استحباب کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نماز کسوف میں اذان اور اقامت نہیں

نماز کسوف میں اذان اور اقامت نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کو جمع کرنے کے لئے الصلوٰۃ جامع (نماز ہونے والی ہے) کہا جائے گا جیسا کہ حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ روایت کرتے ہیں۔

عن ام المؤمنین عائشة قالت خسفت الشمس علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فبعث منا دیا الصلوة جامعة.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ کے دور میں سورج گرہن لگ گیا تو آپ نے ایک شخص کو یہ اعلان کرنے کے لئے بھیجا کہ نماز ہونے والی ہے۔

نمازِ کسوف پڑھنے کا طریقہ

نمازِ کسوف کو پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ امام جو جمعہ کی نماز پڑھاتا ہے لوگوں کو جماعت کے ساتھ دو رکعتیں پڑھائے جس طرح نفلی نماز پڑھی جاتی ہے اور قرأت کو اس قدر طول دے کہ سورج گرہن ختم ہو جائے۔

لما روی قبیصة قال کسفت الشمس علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فخرج فزعا یجر ثوبه وانا معه یومئذ بالمدینة فصلی رکعتین فاطال فیها القیام ثم انصرف فانجلت ثم قال انما هذه الایات یخوف الله بها عباده فاذا رأیتموه صلوا کاحدث صلوة صلیتموها من المکتوبة. (رواہ ابوداؤد)

حضرت قبیصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ عہد نبوی میں سورج گرہن ہوا۔ آپ ﷺ خوف سے دامن گھسیٹتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ میں اس روز مدینہ طیبہ میں آپ ﷺ کے ساتھ تھا۔ آپ نے دو رکعتیں پڑھیں اور ان میں طویل قیام فرمایا پھر آپ تشریف لے گئے تو سورج صاف ہو گیا پھر آپ نے فرمایا: یہ وہ نشانیاں ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ جب تم سورج گرہن دیکھو تو نماز پڑھو جیسے تم نے فرض کی سب سے نئی نماز پڑھی۔

نمازِ کسوف میں قرأت کے متعلق ائمہ کے دلائل

امام ابوحنیفہ کے نزدیک نمازِ کسوف میں قرأت بالجہر نہیں ہوتی اور نہ ہی خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ صاحبین کے بقول قرأت بھی بلند آواز سے کی جاتی ہے اور اس کے بعد خطبہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک دو خطبے جس طرح عیدین میں پڑھے جاتے ہیں اور امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک صرف ایک خطبہ پڑھا جاتا ہے۔

امام اعظم قرأت بالاخفاء کی یہ دلیل دیتے ہیں۔

عن سمرة بن جندب قال بینما انا وغلام من الانصار یرمی غرضین لنا حتی اذا کانت الشمس قد رمحین اوثلثة فی عین الناظر من الافق اسودت حتی آضت کانها تنومة فقال احدنا لصاحبه انطلق بنا الی المسجد فوالله لیحدثن شان هذه الشمس لرسول الله صلی الله علیه وسلم

سمرہ بن جندب نے فرمایا کہ میں اور انصار کا ایک غلام ایک ہدف پر تیراندازی کر رہے تھے کہ سورج دیکھنے والے کی نظر میں افق پر دو یا تین نیزوں کے برابر بلند ہوا ہو گا کہ سیاہ پڑ گیا اور تنومہ (ایک جنگلی بوٹی) کی مانند ہو گیا۔ ہم نے ایک دوسرے سے کہا۔ آؤ مسجد نبوی کو چلیں۔ بخدا امت کو ضرور کوئی واقعہ پیش آئے گا اسی لئے سورج کی یہ حالت ہے۔ ہم وہاں سے چل پڑے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ سامنے

فی امته حدثنا فدفعنا فاذا هو بارز فاستقدم وصلی فقام بنا کاطول ماقام بنا فی صلوة قط لانسمع له صوتاثم سجدبنا کاطول ماسجدبنا فی صلوة قط لانسمع له صوتاثم فعل فی الرکعة الاخری مثل ذلک فوافق تجلی الشمس جلوسه فی الرکعة الثانية ثم سلم فحمدالله واثنی علیه وشهد ان لا اله الا انت وشهد انه عبد الله ورسوله. (رواہ ابوداؤد)

کھڑے ہیں۔ آپ نے لوگوں کو آگے بلایا اور نماز پڑھائی اور ہمیں اتنی دیر قیام کی حالت میں رکھا کہ اتنی دیر کبھی بھی آپ نے قیام نہیں فرمایا۔ ہم آپ کی آواز نہیں سن رہے تھے پھر آپ ﷺ نے ہمیں سجدہ کرایا کہ اس سے طویل سجدہ ہم کو کسی نماز میں نہیں کرایا تھا۔ ہم آپ کی آواز نہیں سن رہے تھے پھر دوسری رکعت میں بھی ایسے ہی کیا۔ جب آپ دوسری رکعت پڑھ کر بیٹھے تو سورج روشن ہو گیا پھر آپ نے سلام پھیرا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور گواہی دی کہ اے اللہ! تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ بھی گواہی دی کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اور ایسا ہی ایک واقعہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالے سے صحیحین میں بھی روایت ہوا ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے سورت بقرہ کی تلاوت کے برابر طویل قیام فرمایا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ قرأت بالجہر نہیں کرتے تھے۔ صاحبین دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

روت ام المؤمنین انه علیه السلام جهر فی صلوة الخسوف بقرأته. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز خسوف (چاند گرہن) میں بلند آواز سے قرأت کی۔

اور ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اسے نقل کیا ہے یہ الفاظ ایک طویل حدیث سے لئے گئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ چاند گرہن میں ایسا بہت کم واقع ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور یہ بات بھی سامنے رکھی جانی چاہئے کہ اگر اس نماز میں رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے قرأت کرتے تو سمرہ بن جندب ضرور سنتے کیونکہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو بہت دور کھڑی تھیں۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صرف چند الفاظ سنے اور انہوں نے گمان کیا کہ حضور ﷺ بلند آواز سے قرأت کر رہے ہیں اور وہ ازدھام اور دور ہونے کی وجہ سے نہیں سن رہیں۔ واللہ اعلم۔

تیسری بات یہ ہے کہ سورج گرہن دن کے وقت ہوتا ہے اور اس کے لئے جو نماز پڑھی جاتی ہے وہ دن کی نماز ہے اور ظاہر ہے دن کی نماز میں قرأت بلند آواز سے نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ تعارض کی وجہ سے دونوں حدیثیں ساقط ہوئیں اور اصل حکم یعنی دن کے وقت آہستہ قرأت کرنا باقی رہا۔

رہا خطبہ تو ہر آدمی جس نے نماز کسوف کا تذکرہ کیا ہے اس نے اس کے بعد خطبے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ لہٰذا صاحبین کے نزدیک یہ مکمل دلیل ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ خطبہ کسوف کی نماز کے لئے نہیں تھا بلکہ اس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ سورج گرہن کی وجہ سے حضرت ابراہیم کی وفات

الشمس والقمر لا تنكسفان لموت احد ولا لحيوته ولكنهما ايتان من ايات الله يريهما عباده فاذا رايتم ذلك فافزعوا الى الصلوة. (رواہ البخاری ومسلم)

وہی کچھ کیا جو پہلی رکعت میں کیا تھا پھر اٹھے اور فرمایا: سورج اور چاند کسی کی موت کی وجہ سے نہیں گہناتے اور نہ ہی کسی کی زندگی کی وجہ سے انہیں گہن لگتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ (کی قدرت) کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں جو وہ اپنے بندوں کو دکھاتا ہے۔ جب تم اسے (گرہن) کو دیکھو تو نماز کی طرف لپکو۔

جس حدیث میں دو رکوعوں کا تذکرہ ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ اس میں اضطراب ہے اور جس حدیث میں اضطراب ہو وہ قابل حجت نہیں ہوتی۔ ایک روایت میں ہے کہ ام المؤمنین نے یہ حدیث نہیں سنی۔

و عن ابن عباس قال ان النبی ﷺ صلی اربع ركوعات فی ركعتين واربع سجدات يعنی فی كسوف الشمس. (رواہ مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چار رکوعوں اور چار سجدوں میں دو رکعتیں ادا کیں۔ یعنی سورج گرہن کی نماز پڑھتے ہوئے۔

انہیں سے مسلم اور بخاری ایک طویل حدیث روایت کرتے ہیں جس میں طویل قرأت، دو رکوعوں (یعنی ہر رکعت میں) کا ذکر ہے اور ازیں بعد خطبہ کا بھی تذکرہ ہے۔

عنه قال صلى الله عليه وسلم حين كسفت الشمس ثمانی ركوعات فی اربع سجدات.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی سے روایت ہے کہ سورج گرہن کے وقت رسول اللہ ﷺ نے آٹھ رکوعوں کو چار سجدوں میں ادا کیا۔

امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح کی ایک حدیث مروی ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس طرح ہر رکعت میں گویا چار رکوع ہوئے۔

عن ابی بن كعب قال انكسفت الشمس على عهد رسول الله ﷺ فصلى بهم فقرء بسورة من الطوال و ركع خمس ركوعات وسجد سجدتين ثم قال الى الثانية فقرء سورة من الطوال ثم ركع خمس ركوعات وسجد سجدتين ثم جلس كما هو مستقبل القبلة يدعو حتى انجلى كسوفها. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں سورج گرہن ہو گیا تو آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور طوال مفصل سورتوں میں سے ایک سورت تلاوت کی اور پانچ رکوع اور دو سجدے کئے پھر دوسری رکعت کے لئے اٹھے۔ طوال سورتوں میں سے ایک سورت تلاوت کی پھر پانچ رکوع کئے اور دو سجدے۔ اس کے بعد قبلہ رو جیسے تھے بیٹھ گئے اور دعا کرتے رہے حتیٰ کہ گہن چھٹ گیا۔

عن جابر قال انكسفت الشمس فی عهد رسول الله ﷺ يوم مات ابراهيم بن رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال الناس

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں سورج کو گہن لگ گیا۔ اسی دن رسول اللہ ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم کی وفات ہوئی تھی۔ لوگ

انما انکسفت لموت ابراھیم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصلی بالناس ست رکعات باربع سجدات ثم بدء فکبر ثم قرء فاطال القرأة ثم رکع نحو مما قام ثم رفع رأسه من الرکوع فقرء قرأة الاولی ثم رکع نحوا مما قام ثم رفع رأسه من الرکوع فقرء قرأة دون القراء الثانیة ثم رکع نحوا مما قام ثم رفع رأسه من الرکوع ثم انحد ربالسجود فسجد سجدتین ثم قام فقرء فرکع ثلث رکعات لیس منها رکعة الاالتی قبلها اطول من التی بعدها ورکوعه نحوا من سجوده ثم تاخرو تاخرت الصفوف خلفه حتی انتهینا الی النساء ثم تقدم و تقدم الناس معه حتی قام فی مقامه فانصرف حین انصرف وقد اضئت ثم ذکر بعد ھذا خطبة. (رواہ مسلم)

کہنے لگے سورج کے گرہن کا سبب حضرت ابراہیم کی وفات ہے۔ نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ آپ نے چھ رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ ادا فرمائیں پھر آپ نے (دوسری رکعت) شروع کی تو تکبیر کہی' پھر قرأت کی اور قرأت لمبی کی پھر اتنی دیر رکوع کیا جتنی دیر قیام کیا تھا پھر رکوع سے سر اٹھایا اور پہلے کی نسبت کم قرأت کی پھر اتنی دیر رکوع کیا جتنی دیر قیام کیا تھا پھر رکوع سے سر اٹھایا اور دوسری قرأت سے کم قرأت کی پھر رکوع کیا جتنی دیر قیام کیا تھا پھر رکوع سے سر اٹھایا پھر سجدہ میں چلے گئے اور دو سجدے کئے پھر کھڑے ہوئے اور پھر قرأت کی اور تین رکعتیں ادا فرمائیں۔ ہر پہلی رکعت اپنے بعد آنے والی قرأت سے لمبی تھی اور رکوع سجدہ کے برابر تھا پھر آپ پیچھے ہٹے اور صفیں بھی پیچھے ہٹیں۔ حتیٰ کہ ہم عورتوں تک آ گئے پھر حضور ﷺ آگے بڑھے اور لوگ بھی آگے بڑھے حتیٰ کہ آپ پہلی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ غرضیکہ جس وقت آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو سورج روشن ہو گیا۔

اس اضطراب کو دیکھیں۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ ہر رکعت میں دو رکوع کئے۔ بعض میں ہے کہ چار رکوع کئے۔ بعض میں پانچ اور بعض میں تین رکوعوں کا تذکرہ بھی ہے۔ سو یہ روایات وہم سے خالی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ائمہ کرام کی قبروں کو روشن کرے جنہوں نے دقت نظر سے کام لیا اور اس حقیقت کو معلوم کیا کہ ان روایات میں اضطراب ہے اور ان میں سے کوئی بھی قابل عمل نہیں۔ انہوں نے اس روایت پر عمل کیا جو دوسری نمازوں کے مطابق تھا۔

امام قسطلانی فرماتے ہیں کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ دو سے زائد رکوع راویوں کا وہم ہے۔ مجھے امام قسطلانی کے اس قول سے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ دو رکوعوں کو وہم نہیں کہتے۔ اگر ایک رکعت میں دو رکوع وہم نہیں تو دو سے زیادہ کس دلیل سے راوی کا وہم ہو سکتے ہیں؟

جامع الاصول میں ابوسلیمان خطابی کی کتاب معالم سنن کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے روایات کا یہ اختلاف سورج گرہن کے بارے ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسے کئی بار پڑھا۔ جب مدت خسوف لمبی ہو گئی تو آپ نے نماز طویل کر دی اور جب مدت لمبی نہ ہوئی تو آپ نے بھی نماز کو طویل نہ فرمایا۔ دراصل یہ گفتگو اضطراب کو ختم کرنے کے لئے ہے اور یہ محض وہم ہے کیونکہ سیرت نگاروں نے صرف ایک کسوف کا ذکر کیا ہے اور یہ واقعہ مدینہ

منورہ کا ہے اور یہی صحیح ہے۔ خطابی کا قول تبھی صحیح ہو سکتا ہے کہ مدنی دور میں پانچ دفعہ سورج کو گرہن لگتا یا اس سے زیادہ بار سورج گرہن ہوتا لیکن دس سال کی مدت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی پھر تمام روایات میں خطبہ کے الفاظ تقریباً قریب قریب ہیں اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ہر بار ایک جیسا خطبہ دیا گیا ہو۔ سو اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ روایات میں اضطراب ہے۔ اس لئے ایسی کسی روایت پر عمل نہیں ہو گا اور سورج گرہن کی نماز بھی عام نمازوں کی طرح پڑھی جائے گی اور ہر رکعت میں صرف ایک رکوع ہو گا۔

شیخ ابن الھمام فرماتے ہیں کہ بالفرض اگر ایک سے زائد بار سورج گرہن ہوا تو بھی جو روایت خلاف عادت ہے اس پر عمل نہیں ہو گا کیونکہ کسی طرح یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کون سی روایت بعد کی ہے کیونکہ پہلی روایت سے جب دوسری روایت مختلف ہو تو دوسری پہلی کی ناسخ ہوتی ہے۔ سو اس طرح تمام روایات ساقط العمل ہوں گی اور جس طرح عام نماز پڑھی جاتی ہے یہ نماز بھی اسی طرح پڑھی جائے گی۔

امامت کا حقدار

ہمارے نزدیک سورج گرہن کی نماز وہی امام پڑھا سکتا ہے جو نماز جمعہ پڑھانے کا مجاز ہے جیسا کہ ہدایہ وغیرہ کتب حدیث سے ثابت ہے۔ اگر امامِ جمعہ نہ ہو تو تمام لوگ الگ الگ نماز کسوف پڑھیں گے۔ مجھے اس شرط کی کوئی دلیل نظر نہیں آئی اس لئے میرے نزدیک نمازیوں کا متعین کردہ امام بھی یہ نماز پڑھا سکتا ہے کیونکہ مذکورہ شرط پر کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں اور حکم شرعی دلیل شرعی پر موقوف ہوتا ہے۔ دلیل نہ پائی جا رہی ہو تو حکم بھی اٹھ جاتا ہے۔

چاند گرہن کی رکعتیں

چاند گرہن کے وقت بھی دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ امام چاہے تو اس نماز کو اس وقت تک طویل کر سکتا ہے کہ چاند گرہن ختم ہو جائے اور چاہے تو مختصر سی دو رکعتیں پڑھ کر استغفار اور ذکر خداوندی میں مشغول ہو سکتا ہے حتیٰ کہ چاند صاف دکھائی دینے لگے کیونکہ حدیث پاک میں ہے کہ جب چاند گرہن دیکھو تو نماز کی طرف لپکو۔

امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابن الحبان علیہ الرحمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے چاند گرہن کے وقت بھی نماز پڑھی۔ چاند گرہن کی نماز میں جماعت نہیں کیونکہ اس بارے کوئی روایت منقول نہیں اور نفلوں کی جماعت نہیں ہوتی لہٰذا اصل کا اعتبار کرتے ہوئے چاند گرہن کی نماز اکیلے اکیلے پڑھی جائے گی۔ اس نماز میں قرأت بآواز ہو سکتی ہے کیونکہ رات کی نماز میں قرأت بالجہر مشروع ہے۔ چاند گرہن ہو یا سورج گرہن صدقہ کر لینا بہتر ہے کیونکہ شیخین کی روایت میں صدقے کا بھی ذکر ہے۔

ام المومنین رسول اللہ ﷺ کے خطبہ کو بیان کرتے ہوئے روایت کرتی ہیں کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ کسی شخص کی موت اور زندگی سے ان کو گرہن نہیں لگتا۔ جب چاند اور سورج گرہن لگا دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔ نماز پڑھو اور صدقہ دو۔

نمازِ استسقاء کا بیان

نمازِ استسقاء کے بارے ائمہ کا مؤقف

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک استسقاء دعا ہے' استغفار اور توبہ ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز و نیاز کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا تھا:

استغفروا ربکم انہ کان غفارا ٥ یرسل السماء علیکم مدرارا ٥ (نوح:۱۰-۱۱) اپنے رب سے معافی مانگو وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے۔ تم پر شراٹے کا (موسلا دھار) مینہ بھیجے گا۔

بارش کے لئے کوئی مسنون اور مؤکدہ نماز نہیں ہے۔ اگر لوگ نماز استسقاء پڑھنا چاہیں تو اکیلے اکیلے پڑھیں۔ الگ الگ نماز پڑھنا جائز اور اچھا عمل ہے کیونکہ نماز نزول رحمت کا ذریعہ ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز استسقاء باجماعت مسنون نہیں۔ ہاں جماعت سے پڑھنا جائز ہے۔ ہدایہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جماعت جائز ہے۔ بعض کتب میں اسے صراحتاً مکروہ کہا گیا ہے۔ خطبہ' چادر کا الٹنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ طلب باراں کے لئے دو رکعتیں باجماعت ادا کی جائیں گی۔ عید کی طرح اس میں قرأت بالجہر ہوگی اور نماز کے بعد خطبہ دیا جائے گا جس میں دعا کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی اور اس وقت تک دعا کی جائے گی جب تک بارش ہو نہیں جاتی اگر طوالتِ دعا کے باوجود بارش نہیں ہوتی تو نصف رات تک دعا کی جائے اور دوسرے دن پھر نماز استسقاء پڑھی جائے اسی طرح برابر تین دن تک یہ عمل دہرایا جائے۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک طلبِ باراں کے لئے نماز پڑھ کر صرف ایک خطبہ دیا جائے جبکہ امام محمد علیہ الرحمہ دو خطبوں کے قائل ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ قبلہ رو ہو کر چادر کو الٹ دیا جائے۔ مشائخ نے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے اور اسی پر عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث سے نماز استسقاء کے کئی طریقے ثابت ہیں۔ بعض صورتوں میں نماز ہے بعض صورتوں میں دعا ہے نماز نہیں اور یہ طریقہ امام ابوحنیفہ کی رائے کو تقویت دیتا ہے کہ استسقاء میں دعا اور استغفار ہے۔

اب رہی وہ صورت جس میں نماز ہے تو اس کی بھی ایک سے زائد صورتیں ہیں۔

ایک صورت یہ ہے:

عن عبد اللہ بن زید المازنی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج بالناس یستسقی فصلی بھم رکعتین وجھر بالقراۃ فیھما وحول رداءہ ٥ فدعا واستسقی واستقبل القبلۃ. (رواہ ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن زید مازنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ساتھ لیے (شہر سے) باہر طلبِ باراں کی غرض سے تشریف لے گئے اور باجماعت دو رکعتیں پڑھیں جن میں قرأت بالجہر کی' چادر الٹی' دعا کی اور قبلہ رو ہو کر بارش کے لئے دعا فرمائی۔

اسی حدیث کو امام محمد اور امام ابو یوسف علیہما الرحمہ نے دلیل بنایا ہے اور رائے قائم کی ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، عبداللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو لیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ طلب باراں کے لئے باہر تشریف لے گئے اور خطبہ سے پہلے آپ نے نماز پڑھی۔ اس حدیث سے صاحبین کی رائے کو بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔

عن اسحق بن عبد الله بن كنانة قال ارسلني الوليد بن عقبة و هو امير المدينة الى ابن عباس يسأله عن استسقاء رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم متبذلا متواضعا متضر عاحتى اتى المصلى فرى المنبر فلم يخطب خطبتكم هذه ولكن لم يزل في الدعاء والتضرع والتكبير ثم صلى ركعتين كما يصلي في العيد. (رواہ الترمذی)

اسحاق بن عبداللہ بن کنانہ سے روایت ہے کہ مجھے ولید بن عقبہ، امیر شہر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خدمت میں بھیجا کہ ان سے نماز استسقاء کا طریقہ پوچھوں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی نماز استسقاء کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ نہایت ہی عاجزی و انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ آپ تضرع و آہ وزاری کر رہے تھے حتیٰ کہ نماز کی جگہ پہنچے۔ منبر پر چڑھے اور تمہاری طرح خطبہ نہیں دیا بلکہ دعا کرتے رہے، آہ و زاری اور تکبیر میں مشغول رہے پھر نماز عید کی طرح دو رکعت نماز (استسقاء) پڑھی۔

اس حدیث کے پہلے حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطبہ تذکیر اور وعظ پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اس میں دعاء اور استغفار تھی لیکن یہ بھی ظاہر ہوا کہ خطبہ نماز سے پہلے دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ فرمانا کہ پھر عید کی طرح دو رکعتیں پڑھیں۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خطبہ نماز کے بعد دیا جاتا ہے لیکن یہاں خطبہ کو پہلے ذکر کر دیا اور نماز کو بعد میں۔ دراصل خطبہ کا عطف نکلنے پر ہے مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مذکورہ حالت میں نکلے پھر نماز عید کی طرح دو رکعتیں نماز پڑھی اور ان کے بعد خطبہ دیا۔ خطبہ کو پہلے اس لئے ذکر کیا کہ بنو امیہ نے خطبہ کو تبدیل کر دیا تھا اور یہاں پہلے ذکر کرنے سے مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اس خطبہ کی نوعیت تمہارے خطبوں سے مختلف تھی۔

امام شافعی علیہ الرحمہ اس تشبیہ (عید کی طرح) سے یہ گمان کرتے ہیں کہ نماز استسقاء میں عید کی طرح تکبیریں بھی کہی جاتی ہیں حالانکہ تشبیہ سے مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ نماز استسقاء کی بھی دو رکعتیں ہیں جس طرح عید کی نماز کی دو رکعتیں ہوتی ہیں۔ یہ نماز با جماعت پڑھی جاتی ہے اور آخر میں خطبہ دیا جاتا ہے۔ طبرانی کی روایت ہے۔

عن ابن عباس قال لم يزد صلى الله عليه وسلم على ركعتين مثل صلوة الصبح.

حضرت ابن عباس سے (منقول ہے) کہ آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز استسقاء دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے جس طرح کی صبح کی نماز پڑھی جاتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خطبہ نماز سے پہلے پڑھا جائے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

فعن انس رسول الله صلى الله عليه وسلم استسقى فخطب قبل الصلوة واستقبل القبلة وحول رداء ه ثم نزل فصلى ركعتين لم يكبر فيهما الاتكبيرة واحدة.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز استسقاء پڑھی اور نماز سے پہلے خطبہ ارشاد فرمایا۔ قبلہ رو ہوئے۔ اپنی چادر کو الٹا کیا اور دو رکعتیں پڑھیں جن میں سے صرف ایک تکبیر کہی۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔

و عن ام المؤمنين عائشة قالت شكى الناس الى رسول الله صلى الله عليه وسلم قحوط المطر فامر منبر فوضع في المصلى و وعد الناس يوما يخرجون فيه قالت عائشة رسول الله صلى الله عليه وسلم حين بدء حاجب الشمس فقعد على المنبر فكبر و حمد الله ثم قال انكم شكوتم جدب دياركم واستيخار المطرعن ابان زمانه عنكم و قد امركم الله ان تدعوه ووعدكم ان يستجيب لكم ثم قال الحمد لله رب العالمين الرحمن الرحيم ملك يوم الدين لا اله الا الله يفعل مايريد اللهم انت الله لا اله الا انت الغني ونحن الفقراء انزل علينا الغيث واجعل ما انزلت لنا قوة و بلاغا الى حين ثم رفع يديه فلم يترك الرفع حتى بدء بياض ابطيه ثم حول الى الناس ظهره و قلب و حول رواء ه و هو رافع يديه ثم اقبل الناس فصلى ركعتين فانشا الله سبحانه فرعدت و برقت ثم امطرت باذن الله فلم يات مسجده حتى سألت السيول فلما راى سرعتهم الى الكن ضحك حتى بدت نواجذه فقال اشهد ان الله على كل شئى قدير واني عبد الله

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں قحط سالی کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ منبر لاؤ۔ منبر عیدگاہ میں رکھا گیا اور لوگوں سے فرمایا کہ تم نے فلاں دن یہاں آنا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جب سورج طلوع ہوا تو رسول اللہ ﷺ نکلے۔ منبر پر چڑھے اور تکبیر کہی' اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور اس کے بعد فرمایا: تم نے اپنے علاقوں میں قحط سالی کا شکوہ کیا ہے اور کہتے ہو کہ ایک عرصہ سے کوئی بارش نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم اس سے دعا کرو۔ اس کا تمہارے ساتھ وعدہ ہے کہ تمہاری دعا قبول فرمائے گا پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پروردگارِ عالم ہے۔ بے حد مہربان بڑا رحیم ہے۔ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ تیرے سوا کوئی خدا نہیں۔ تو بے نیاز ہے۔ ہم محتاج۔ ہم پر نازل فرما۔ اور اس بارش کو ہماری خوراک اور ایک وقت کے لئے ذریعہ حیات بنا دے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور اس وقت تک ہاتھ نیچے نہ کئے حتیٰ کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہوگئی پھر لوگوں کی طرف پیٹھ پھیری اور اپنی چادر کو الٹ پلٹ کیا۔ آپ کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور دو رکعت نماز استسقاء پڑھائی۔ اللہ نے چاہا۔ بادل گرجا' بجلی چمکی اور باذنِ خداوندی بارش برسنے لگی۔ آپ مسجد نبوی میں تشریف نہ

ورسوله. (رواہ ابوداؤد)

لائے حتیٰ کہ نالے بہنے لگے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ گھروں کی طرف بھاگ رہے ہیں تو آپ ہنسے حتیٰ کہ آپ کے دندان مبارک (نواجذ کہتے ہیں اوپر کے نوکدار دانت جو سامنے کے چار دانتوں کے دائیں بائیں ہوتے ہیں) نظر آنے لگے۔ آپ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

یہ بندہ (مصنف عبدالعلی علیہ الرحمہ) گمان کرتا ہے کہ نماز سے پہلے اور نماز کے بعد دونوں صورتوں میں خطبہ کا جواز ہے۔

چادر کا اُلٹ پلٹ کرنا کیسا ہے؟

صاحبین کے نزدیک صرف امام چادر الٹ پلٹ کرے گا مقتدی نہیں کریں گے جیسا کہ ابوداؤد علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

عن ابن عباس قال استسقى رسول الله صلى الله عليه وسلم وعليه خميصة سوداء فاراد ان ياخذ اسفلها ويجعل اعلاها فلما تقلبه قلبها على عاتقه.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز استسقاء پڑھی۔ آپ ﷺ نے سیاہ کناروں والا جبہ پہنا ہوا تھا۔ آپ نے ارادہ فرمایا کہ نچلے حصے کو پکڑ کر اوپر کر دیں۔ جب آپ نے اسے الٹا کیا تو اپنے کندھے پر الٹا کیا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ لوگوں نے بھی اپنی چادریں الٹی کر دیں۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حدیث مسلم کی شرط کے مطابق ہے جیسا کہ فتح القدیر میں امام زیلعی سے نقل کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس کا یہ جواب دیا ہے کہ مقتدیوں نے چادریں حضور ﷺ کے حکم سے الٹی نہیں کیں کہ اسے دلیل بنایا جائے اور نہ ہی اسے حدیث تقریری کہہ سکتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی تو مقتدیوں کی طرف پیٹھ تھی۔

غیر مسلم رعایا نماز استسقاء میں شریک نہ ہو کیونکہ استسقاء طلب باران کے لئے دعا اور استغفار ہے اور ذمی اپنے کفر کی وجہ سے نزول رحمت کی دعا نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی دعا رحمت کا وسیلہ بن سکتی ہے بلکہ اس کی وجہ سے تو رب قدوس فضل و کرم کی بجائے محرومی اور لعنت برسائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم باحکامہ۔

☆☆☆☆☆

مسافر کی نماز کا بیان

سفر کی شرعی حد

ہمارے نزدیک سفر کی شرعی حد تین دن ہے جب کسی کو تین دن کی مسافت درپیش ہو تو وہ شہر سے نکلتے ہی مسافر شمار ہوگا اور اس میں اعتبار درمیانی چال کا ہوگا کہ چھوٹے دنوں میں فجر سے زوال تک انسان تین دن میں جتنا فاصلہ طے کر سکتا ہے وہ ایسی مسافت ہے جو قصر کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ گفتگو ہدایہ کی ہے اور یہی صحیح ہے۔ فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں ہوگا۔

بعض علماء کے نزدیک اکیس فرسخ[1] اور بعض کے نزدیک یہ مسافت اٹھارہ فرسخ کی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پندرہ فرسخ کی مسافت سے انسان مسافر بن جاتا ہے۔ یہ تمام اندازے ہیں۔ یہ کوئی ضابطہ نہیں کہ اتنے فرسخ (یا میل یا کلومیٹر) شرعی مسافت ہے کیونکہ سفر کبھی دشوار گزار ہوتا ہے اور بہت تھوڑی مسافت طے ہوتی ہے جو ان اندازوں سے بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اس لئے فراسخ (اور کلومیٹر) کا اندازہ صحیح نہیں ہے۔ سفر اگر پہاڑی ہے تو پہاڑ کا اعتبار ہوگا۔ پانی میں سفر ہے تو پھر اسی اعتبار سے دیکھا جائے گا۔ البحر الرائق میں ہے کہ اگر سفر پانی میں ہے تو ہوا کے اعتدال کا لحاظ کرتے ہوئے مسافت کا اندازہ لگایا جائے۔ یہ گفتگو احناف کے نظریات کے مطابق تھی۔

امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک تو سفر کی حد چار برید ہے اور ایک برید چھ میلوں کا ہوتا ہے۔ امام مالک علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مکہ اور طائف' مکہ اور عسفان' مکہ اور جدہ کے درمیان جتنی مسافت ہے اتنی مسافت درپیش ہوتی تو قصر کرتے تھے۔ امام مالک علیہ الرحمہ کے بقول یہ چار برید سفر ہے حالانکہ یہ چیز واضح نہیں کیونکہ اگر ایک شخص متوسط رفتار سے چلے تو دو دن میں اگر نصف النہار تک چلے تو وہ مکہ سے طائف نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی مکہ سے جدہ پہنچ سکتا ہے۔

صاحبِ ہدایہ احناف کی رائے کے ثبوت کے لئے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسافر تین دن اور تین رات تک موزوں کا مسح کر سکتا ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ شرعی سفر تین دن اور تین رات سے کم نہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سفر کی کم سے کم حد وہی ہو جو مسح علی الخفین کی زیادہ سے زیادہ مدت ہے۔ شاید وہ اجماع سے ثابت ہے۔ اس پر فتح القدیر کے مصنف نے یہ اعتراض کیا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسافر تین دن تک موزوں پر مسح کرے۔ جبکہ تین دن پورے سفر میں گزر جائیں۔ اسے ایک ایسے حکم پر محمول کرنا صحیح نہیں جو زیادہ عام ہو کیونکہ مسافر جس کا وطن اس جگہ سے تین دن کی مسافت پر ہے جب وہ ظہر کے وقت پہنچے گا تو تین دن تک مسح کرنا ممکن نہیں رہتا اور نہ ہی وہ عصر کے وقت مسح کرے گا۔ جب حدیث کا معنی یہ ہوا تو پھر یہ حدیث مدت سفر کو بیان نہیں کرتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ تین دن اور تین رات

---

[1] فرسخ تین میلوں کا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بارہ ہزار گز جو تقریباً آٹھ کلومیٹر بنتا ہے۔ یوں گویا ۱۶۸ یا ۱۴۴ یا ۱۲۰ کلومیٹر کو شرعی سفر کہیں گے۔ بعض علماء نے ۴۸ میل اور بعض نے ۵۲ میل بھی نقل کیا ہے۔

سے پہلے تم نہ موزے اتار سکتے ہو اور نہ ہی غسل کر سکتے ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر مسافر کو یہ اجازت ہے کہ وہ تین دن تک مسح کرے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی کم سے کم مدت تین دن نہ ہو۔ اگر مدت تین دن ہو تو پھر ممکن ہے۔ مسافر مذکور کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تین دن تک مسح کرے وہ اس طرح کہ زوال سے پہلے موزے پہن لے پھر سفر کرے اب اس کے لئے جائز ہے کہ تین دن مکمل کرے۔ حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ ہر حال میں تین دن تک مسح کرے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب مسافر نے ایک دن سے کم مدت میں موزے اتار دیئے تو اس کے بعد مسح کرنا جائز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ کل تین دن تک موزوں پر مسح کرے اور یہ حکم ہر مسافر کے لئے ہے۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ سفر تین دن سے کم معتبر ہی نہیں۔

مسافر قصر کرے گا

مسافر چار کی بجائے دو فرض پڑھے گا۔ ہمارے نزدیک فجر کی نماز کی طرح مسافر پر (ظہر، عصر اور عشاء کی) دو رکعتیں ہی فرض ہیں جبکہ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک مسافر پر چار رکعتیں فرض ہیں۔ جس طرح مقیم پر چار رکعتیں فرض ہیں لیکن صرف سفر میں اسے قصر کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اگر کسی نے چار رکعتیں پڑھیں تو یہ چاروں رکعتیں فرض شمار ہوں گی کیونکہ ان کے خیال میں قصر رخصت ہے جس کے لئے عزیمت[1] کا ہونا ضروری ہے سو چار رکعتیں عزیمت ہیں۔

ہماری دلیل یہ ہے:

قول امیر المؤمنین عمر صلوة الاضحٰی رکعتان و صلوة الفطر رکعتان و صلوة المسافر رکعتان وصلوة الجمعة رکعتان تمام غیر قصر علی لسان النبی صلی الله علیه وسلم. (رواہ النسائی)

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد ہے۔ عید قربان کی دو رکعتیں ہیں۔ عید فطر کی دو رکعتیں ہیں۔ مسافر کی نماز کی دو رکعتیں ہیں اور جمعہ کی نماز کی دو رکعتیں ہیں۔ یہ پوری نماز ہے، قصر نہیں۔ یہ نبی کریم ﷺ کی زبان سے حکم جاری ہوا ہے۔

ہماری دوسری دلیل یہ ہے۔

قول ام المؤمنین عائشة فرض الله الصلوة حین فرضها رکعتین ثم اتمها فی الحضر واقرت فی السفر. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ارشادِ مبارک ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ نے نماز فرض کی تو دو رکعتیں فرض فرمائیں پھر حضر میں اس کو مکمل فرما دیا اور سفر میں اسی کو برقرار رکھا۔

رخصت کا قصر پر اطلاق مجازی ہے ورنہ رخصت کا اصل معنی کسی حکم کو ساقط کرنا ہے اور اسی اسقاط کو مجازاً

---

[1] عزیمت سے مراد اصل حکم ہے اور رخصت سے مراد خاص حالات کے تحت اصل کی جگہ دیا جانے والا دوسرا حکم ہے۔ جیسے ایمان اصل ہے اور خوف کی حالت میں کلمۂ کفر کہنا رخصت ہے۔

رخصت کہتے ہیں جیسا کہ اصول کی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

سفر کی تمام اقسام میں رخصت ہے

سفر معصیت کے لئے ہو۔ اطاعت کے لئے ہو یا مباح امور کے لئے سب سفر برابر ہیں۔ تمام صورتوں میں رخصت ہے کیونکہ نص میں عموم ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ سفر معصیت میں رخصت نہیں کیونکہ رخصت آسانی پیدا کرنے کے لئے ہے اور گناہ اس کا سبب نہیں بن سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ سفر فی نفسہٖ گناہ نہیں بلکہ سفر تو ایک معین حد تک قطع مسافت ہے اور بس قطع مسافت میں کسی قسم کی کوئی معصیت نہیں۔ معصیت تو وہ کام ہے جس کے لئے سفر کیا جا رہا ہے حتیٰ کہ اگر کسی نے اسی سفر کے دوران حج کا ارادہ کر لیا اور معصیت سے توبہ کر لی تو یہی سفر اطاعت کا سفر بن جائے گا اور قصر کا سبب صرف اور صرف سفر ہے اور وہ اس وجہ سے سبب نہیں کہ سفر کس غرض سے کیا جا رہا ہے؟ لہٰذا اگر کوئی شخص عمداً چار رکعتیں پڑھ لیتا ہے اور درمیان میں قعدہ کرتا ہے تو نماز ہو جائے گی لیکن خطا کار ہو گا کیونکہ اس نے جان بوجھ کر سلام میں تاخیر کی ہے اور فرض پر نفلوں کی بناء کی ہے۔ اگر تیسری رکعت کے لئے بھول کر کھڑا ہو گیا تو جب تک سجدہ نہیں کیا، واپس لوٹ آئے جیسے فجر کی نماز کے بارے بیان ہو چکا ہے۔

مسافر کے لئے سنتیں ادا کرنا افضل ہے

مسافر سے سنتیں ساقط ہو جاتی ہیں جیسا کہ روایت سے ثابت ہے:

عن ابن عمر قال اصحبت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم اریسبح فی السفر و قال اللہ تعالی لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (رواہ البخاری ومسلم)

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر کیا ہے اور میں نے آپ کو سفر میں (نفل) نماز پڑھتے نہیں دیکھا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

اگر کوئی شخص سنتیں پڑھ لے تو جائز بلکہ بہتر ہے۔

عن ابن عمر صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الظہر فی السفر رکعتین و بعدھا رکعتین. (رواہ الترمذی)

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں دو رکعتیں پڑھیں اور ان دو رکعتوں کے بعد دو رکعتیں (اور) پڑھیں۔

عن نافع ان عبد اللہ بن عمر کان یری ابنہ عبید اللہ یتنفل فی السفر فلاینکر علیہ. (رواہ الامام مالک)

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے بیٹے عبید اللہ کو سفر میں نفل پڑھتا دیکھتے اور منع نہیں کرتے تھے۔

چار سنتوں میں قصر کرنا بھی جائز ہے جیسے چار فرضوں میں قصر جائز ہے۔

عن البراء قال صحبت رسول الله صلى الله عليه وسلم ثماني عشر سفرا فما رأيته يترك ركعتين اذا زاغت الشمس قبل الظهر. (رواہ ابوداؤد والترمذی)

حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کے ساتھ اٹھارہ سفر کئے اور میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا کہ ظہر سے پہلے سورج کے ڈھلنے کے بعد آپ نے دو رکعتوں کو ترک کیا ہو۔

ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ مسافر کے لئے جائز ہے کہ فجر کی دو سنتوں کے علاوہ دوسری تمام سنتوں اور نفلوں کو ترک کر دے کیونکہ فجر کی سنتوں کے بارے میں بڑی تاکید آئی ہے لیکن تمام سنتیں پڑھنا افضل ہے۔

وطنِ اقامت

مسافر جب کسی شہر یا دیہات میں پہنچ کر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کر لیتا ہے تو وہ مقیم ہو جاتا ہے۔ چلتے ہوئے جو نیت کی جائے اس کا کوئی اعتبار نہیں اور داخل ہونے سے پہلے کی نیت بھی معتبر نہیں۔ فتح القدیر میں اس کی دلیل امام طحاوی کی روایت کو ٹھہرایا گیا ہے۔

عن ابن عباس و ابن عمر قالا اذا قدمت بلدة وانت مسافر و في نفسك ان تقيم خمسة عشر ليلة فاكمل الصلوة.

ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: جب تو کسی شہر میں پہنچے اور تو مسافر ہو اور یہ بات تیرے دل میں ہو کہ پندرہ راتیں ٹھہرے گا تو اس شہر میں نماز مکمل پڑھا کر۔

ان ابن عمر كان اذا اجمع على اقامة خمسة عشر اتم. (رواہ مصنف ابن ابی شیبۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب آپ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کر لیتے تو پوری نماز پڑھتے۔

عن ابن عمر قال اذا كنت مسافرا فوطنت نفسك على اقامة خمسة عشر يوما فاتمم الصلوة وانكنت لا تدرى متى تظعن فاقصر انتهى. (رواہ الامام محمد)

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: جب تو مسافر ہو اور تو اپنے آپ کو پندرہ دن کے لئے مقیم بنا لے تو نماز پوری ادا کر اور اگر معلوم نہیں کہ کب روانہ ہونا ہے تو قصر پڑھ۔

یہ تمام روایات فتح القدیر میں ہیں۔

لیکن امام نسائی کی ایک روایت میں انیس دن تک قصر ہے۔

عن ابن عباس قال من اقام تسع عشر قصر و من اقام اكثر اتم.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جو شخص انیس دن ٹھہرے تو وہ قصر کرے اور جو اس سے زیادہ دنوں کیلئے قیام کرے تو وہ پوری نماز پڑھے۔

یہ حدیث بظاہر طحاوی کی روایت کے معارض ہے عنقریب آپ کے دل میں اس تعارض کے بارے کوئی قلق و اضطراب نہیں رہے گا۔

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں اگر چار دن قیام کیا تو مقیم شمار ہوگا اور اسے پوری نماز پڑھنا پڑے گی۔ صحاح

ستہ کی ایک حدیث سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

عن انس خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم من المدينة الى مكة فصلى ركعتين ركعتين حتى رجعنا الى المدينة قيل كم اقمتم بمكة قال اقمنا بها عشرا.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ دو دو رکعتیں پڑھتے رہے حتیٰ کہ ہم مدینہ طیبہ واپس لوٹے۔ (حضرت انس سے) پوچھا گیا کہ آپ لوگ مکہ میں کتنے دن ٹھہرے تو انہوں نے فرمایا: دس دن۔

یہ حجۃ الوداع کے دور کا واقعہ ہے۔ حضور ﷺ ذی الحجہ کی چار تاریخ کو صبح مکہ میں داخل ہوئے اور آٹھویں ذی الحجہ صبح کے وقت نماز کے بعد منیٰ تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں پورے چار دن ٹھہرے اور آپ نے قصر نماز پڑھی۔ آپ کی نیت چار دن ٹھہرنے ہی کی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ ﷺ مختلف جگہوں پر ٹھہرے۔ اس میں غور کیجئے پھر رسول اللہ ﷺ مناسک حج ادا کرنے کے بعد چودھویں ذی الحجہ کو روانہ ہوئے۔ اس طرح مکہ میں قیام کی مدت کل دس دن بنتی ہے۔

جو شخص شہر میں ٹھہرے لیکن پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ کرے اور بغیر نیت کے کئی دن تک ٹھہرا رہے تو وہ مسافر ہی شمار ہوگا اور قصر نماز پڑھے گا۔ جو بالکل نیت ہی نہ کرے یا پندرہ دن سے کم کی نیت کرے یا روزانہ کوچ کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اسی طرح اسے کئی دن گزر جائیں ہر حال میں وہ مسافر شمار ہوگا اور قصر کرے گا:

عن جابر قال اقام رسول الله صلى الله عليه وسلم بتبوك عشرين يوما يقصر الصلوة. (رواہ ابوداؤد)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تبوک میں بیس دن تک ٹھہرے رہے اور قصر کرتے رہے۔

عن عمران بن الحصين قال غزوت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم و شهدت معه الفتح فاقام بمكة ثمان عشر ليلة لا يصلى الا ركعتين ويقول يا اهل البلد صلوا اربعا فانا سفر. (رواہ ابوداؤد)

عمران بن الحصین سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں غزوات میں شریک ہوا اور میں فتح مکہ کے موقع پر بھی موجود تھا۔ آپ ﷺ اٹھارہ راتیں مکہ مکرمہ میں رہے اور صرف دو رکعتیں پڑھتے رہے اور آپ فرماتے تھے۔ اے اس شہر کے رہنے والے لوگو! تم چار رکعتیں پڑھو ہم لوگ مسافر ہیں۔

عن ابن عباس قال اقام النبى صلى الله عليه وسلم تسع عشرة يقصر الصلوة فنحن اذا سافرنا فاقمنا تسع عشر قصرنا وان زدنا اتممنا. (رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ انیس دن ٹھہرے اور نماز قصر پڑھتے رہے۔ پس ہم جب سفر کرتے ہیں تو انیس دن تک قصر کرتے ہیں اگر قیام زیادہ ہو جائے تو پھر پوری نماز پڑھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس نے رسول اللہ ﷺ کے انیس دن تک ٹھہرنے سے استدلال کرتے ہوئے جو مسئلہ مستنبط کیا ہے اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ انیس دن کا یہ قیام اقامت کی نیت سے نہیں تھا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مراد اگر یہ ہے کہ آپ اقامت کی نیت سے انیس دن تک ٹھہرے تو پھر اس سے یہ مسئلہ ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو بغیر نیت کے انیس دن ٹھہرے اور اگر انیس دن کا قیام بلا نیت ہو تو پھر انیس دن سے زائد قیام کی صورت میں پوری نماز پڑھنے کی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فعل اس پر دلالت نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے یہ روایت احناف کے نزدیک معتبر نہیں ہے اور انہوں نے امام طحاوی کی روایت پر اعتماد کیا ہے۔

جب اسلامی لشکر دشمن کی سرزمین میں داخل ہو جائے اور وہاں پندرہ دن یا اس سے زیادہ عرصہ رہنے کی نیت کرلے تو یہ نیت باطل ہے کیونکہ ان کی حالت ان کی عزیمت کی تکذیب کرتی ہے کسی وقت بھی انہیں واپس آنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اگر لشکر کی تعداد زیادہ ہو وہ کیل کانٹے سے لیس ہو اور اسے دشمن کے مقابلہ میں رعب و دبدبہ حاصل ہو تو پھر بھی دشمن کی سرزمین میں ان کی نیت معتبر نہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کتنے ہی چھوٹے لشکر بڑے لشکروں پر اللہ تعالیٰ کے اذن سے غالب آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کامیابی ناممکن ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اللہ کریم کو کیا منظور ہے اسی لئے امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کا یہ قول باطل ہے کہ اگر لشکر اسلام کو شوکت حاصل ہو تو دشمن کی سرزمین میں پندرہ دن قیام کی نیت سے ان پر پوری نماز پڑھنا لازم ہو جاتا ہے۔ امام زفر علیہ الرحمہ کی رائے بھی یہی ہے اس لئے ان کی رائے بھی باطل ہے۔

خانہ بدوش لوگ جو شہروں سے دور چراگاہوں میں پھرتے رہتے ہیں اور جن کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا تو وہ جہاں جائیں گے وہی ان کا وطن ہوگا۔ وہ مسافر نہیں ہوں گے۔ فتح القدیر میں ہے کہ چرواہے قحط سالی کی وجہ سے اپنے مویشی اور سامان ضرورت لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں اور تین دن کی مسافت طے کرتے ہیں تو وہ مسافر ہیں ہاں اگر وہ کسی ایسی چراگاہ میں قیام کرتے ہیں جہاں گھاس اور پانی وافر مقدار میں ہے اور وہ وہاں تنور لگا لیتے ہیں' خیمے گاڑھ دیتے ہیں' مویشیوں کے لئے باڑے بنا دیتے ہیں اور پندرہ دن قیام کی نیت کر لیتے ہیں تو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ انہیں مقیم شمار کیا جائے۔

تابع کی نیت کا اعتبار نہیں

تابع کی نیت کا اعتبار نہیں جیسے غلام' سپاہی اور وہ شخص کہ جو کسی دوسرے شخص کے حکم کا پابند ہو کہ وہ اقامت گزیں ہو تو یہ بھی قیام کرے اور وہ سفر کرے تو یہ بھی سفر پر آمادہ ہو جائے۔ سفر اور اقامت میں متبوع کی نیت کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ اس کی حالت اس کی عزیمت کو جھٹلا رہی ہے۔

اگر مسافر' مقیم کی اقتداء کرے یا اس کے برعکس ہو

اگر مسافر مقیم کی اقتداء کرے تو پوری نماز پڑھے کیونکہ امام کی مطابعت کا اس نے التزام کر لیا ہے سو اس پر چار رکعتیں فرض ہو جائیں گی۔

عن نافع ان ابن عمر كان يصلي وراء الامام اربعا فاذا صلى لنفسه صلى ركعتين. (رواہ مالک فی المؤطا)

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما امام کے پیچھے چار رکعتیں پڑھتے تھے اور جب اکیلے نماز پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔

اگر مقیم کسی مسافر کے پیچھے نماز پڑھے تو مسافر (امام) دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دے اور مقیم (مقتدی) اپنی دو رکعتیں مکمل کر لے کیونکہ امام کی متابعت ان پر صرف دو رکعتوں میں لازم تھی۔ امام کو چاہئے کہ جب وہ سلام پھیرے تو مقتدیوں سے کہہ دے جو لوگ مقیم ہیں اپنی نماز مکمل کر لیں ہم مسافر ہیں۔ اب جو لوگ اپنی نماز مکمل کریں گے وہ قرأت نہیں کریں گے کیونکہ قرأت کا فرض ادا ہو چکا اور تحریمہ کی جہت سے وہ اب بھی مقتدی کا حکم رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے امام کے ساتھ پہلی نماز پا لی ہے۔ (ایسے شخص کو لاحق کہتے ہیں۔ لاحق کے بارے احکام گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں)

و عن امير المؤمنين عمر رضى الله عنه صلى للناس بمكة فلما انصرف قال يا اهل مكة اتموا صلوتكم فاناقوم سفر. (رواہ مالک)

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں لوگوں کو نماز پڑھائی جب آپ نے نماز مکمل کی تو فرمایا: اے مکہ والو! اپنی نماز مکمل کرلو ہم لوگ مسافر ہیں۔

مسافر اور مقیم کا فوت شدہ نمازوں کو ادا کرنے کی صورت

فوت شدہ نمازوں میں مسافر مقیم کی اقتداء نہیں کر سکتا کیونکہ وقت کے بعد فرض تبدیل نہیں ہوتے (دو کے چار نہیں بنتے) مسافر کے بعد فرض تبدیل نہیں ہوتے (دو کے چار نہیں بنتے) مسافر دوران سفر اگر فوت شدہ نمازیں پڑھنا چاہتا ہے تو چار رکعتیں پڑھے گا اور مقیم ان فوت شدہ نمازوں کو دو ہی پڑھے گا جو دورانِ سفر رہ گئی تھیں کیونکہ فرض کا ثبوت سبب سے ہے اور سبب کے گزر جانے کے بعد اس حکم میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اگر کوئی شخص ایک شہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر یا بستی میں جا بسا اور اسے مستقل ٹھکانہ بنالیا اور پھر پہلے وطن کی طرف سفر کیا تو وہ مقیم نہیں ہو گا جب تک وہاں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہیں کرتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ مکہ شریف میں قصر کرتے تھے۔

وطن اصلی اور وطن اقامت کی تعریف

وطن اصلی، وطن اصلی کے ذریعے باطل ہو جاتا ہے۔ محض سفر سے باطل نہیں ہوتا اور نہ ہی وطن اقامت سے باطل ہوتا ہے۔ جبکہ وطن اقامت سفر سے، وطن اقامت سے اور وطن اصلی سے باطل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک مدت تک کسی شہر میں اقامت گزیں رہا اور وہ مقیم بن گیا۔ جب وہ سفر کی نیت سے اس شہر کو چھوڑے گا یا کسی دوسرے شہر میں قیام پذیر ہو گا یا وطن اصلی میں داخل ہو گا پھر سفر کر کے اسی پہلے شہر میں جائے گا تو مسافر شمار ہو گا اور دو رکعتیں ہی پڑھے گا۔ وطن اصلی کے لئے نیت شرط نہیں۔ اپنے شہر میں پہنچتے ہی مقیم بن جائے گا کیونکہ صحابہ کرام جب اپنے وطن جاتے تو پوری نماز پڑھتے۔ واللہ اعلم باحکامہ۔

☆☆☆☆☆

تتمہ

سفر میں جمع بین الصلاتین

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک مسافر ظہر اور عصر کی نماز اکٹھی پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کی نماز اکٹھی پڑھنے کی بھی رخصت دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن انس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا عجل علیہ السیر یوخر الظھر الی اول وقت العصر فیجمع بینھما ویوخر المغرب حتی یجمع بنیھما وبین العشاء. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فوری طور پر کہیں جانا ہوتا تو آپ ﷺ ظہر کی نماز کو عصر کے وقت تک مؤخر کرتے اور دونوں کو ایک ساتھ پڑھ لیتے۔ (اسی طرح) مغرب کی نماز کو مؤخر کرتے حتیٰ کہ مغرب اور عشاء کو جمع کر دیتے۔

و عن معاذ بن جبل قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ تبوک اذ زاغت الشمس قبل ان یرتحل جمع بین الظھر والعصر فان رحل قبل ان یزیغ الشمس اخر الظھر حتی ینزل للعصروفی المغرب مثل ذلک ان زاغت الشمس قبل ان یرتحل جمع بین المغرب والعشاء وان ارتحل قبل ان یغیب الشمس اخر المغرب حتی ینزل للعشاء ثم یجتمع بینھما. (رواہ ابوداؤد)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک میں تھے۔ جب کوچ کرنے سے پہلے سورج ڈھل جاتا تو آپ ظہر اور عصر کی نماز اکٹھی پڑھ لیتے اور اگر سورج کے ڈھلنے سے پہلے کوچ فرماتے تو ظہر کی نماز میں دیر کرتے حتیٰ کہ عصر کی نماز کے لئے پڑاؤ کرتے مغرب کی نماز میں بھی ایسا ہی کرتے۔ اگر سورج کوچ سے پہلے غروب ہو جاتا تو مغرب اور عشاء کو اکٹھا پڑھ لیتے اور اگر غروب سے پہلے کوچ کرتے تو مغرب کی نماز کو مؤخر کرتے حتیٰ کہ عشاء کی نماز کے لئے اترتے پھر دونوں کو جمع کر لیتے۔

جمع بین الصلوٰۃ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ پہلی نماز کو وقت سے مؤخر کیا جائے اور اسے دوسری نماز کے وقت میں پڑھا جائے اور دوسری نماز کو بھی اسی وقت میں پڑھ دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دوسری نماز کو وقت سے پہلے پڑھا جائے اور یوں پہلی اور دوسری نماز کو اکٹھا کر لیا جائے۔ پہلی صورت کو جمع تاخیر اور دوسری کو جمع تقدیم کہتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دونوں صورتیں جائز ہیں کیونکہ حضرت معاذ بن جبل کی حدیث اس پر دلیل ہے۔ بعض علماء کے نزدیک جمع تقدیم جائز نہیں لیکن جمع تاخیر جائز ہے۔ یہ رائے امام احمد کی ہے۔ امام مالک کی مشہور رائے جو ان سے روایت کی گئی ہے یہ ہے کہ جمع بین الصلاتین کا جواز صرف کوچ کی صورت میں ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ نہ کوچ کی صورت میں اور نہ ہی نزول کی صورت میں نہ جمع تقدیم جائز ہے اور نہ ہی جمع تاخیر جائز ہے (یعنی دو نمازوں کو کسی صورت اکٹھا نہیں پڑھا جا سکتا)

شیخ اکبر قدس سرہ کی بھی یہی رائے ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نمازوں کے اوقات کی تعیین من جانب اللہ ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ رب قدوس کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○ (النساء:۱۰۳)

بے شک نماز مسلمانوں پر وقت باندھا ہوا فرض ہے۔

یہ آیت قطعی طور پر دلالت کرتی ہے کہ نماز کے لئے ایک وقت متعین ہے اور اس سے تقدیم یا اس سے تاخیر جائز نہیں۔ اس لئے دو نمازوں کو جمع کرنا صحیح نہیں ہے۔

امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے حکام کو خط لکھا اور یہ حکم دیا کہ ایک وقت میں دو نمازیں نہ پڑھی جائیں اور انہیں بتایا کہ دو نمازوں کو اکٹھے پڑھنا گناہ کبیرہ ہے۔ امام محمد فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ خبر ثقہ لوگوں نے دی ہے۔ جب نص قطعی سے یہ بات ثابت ہے کہ ہر نماز کے لئے ایک خاص وقت مقرر ہے تو پھر خبر واحد کے ذریعے نص قطعی کو باطل کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے یا تو ان احادیث کو رد کیا جائے گا یا ان کی تاویل کی جائے گی۔ اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ دو نمازوں کو جمع کرنے کا واقعہ غزوۂ تبوک کے سفر کے دوران پیش آیا اور ظاہر ہے اس غزوہ میں ہزاروں لوگ شامل تھے۔ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے یہ نمازیں پڑھیں اور اس واقعہ کی خبر ان ہزاروں لوگوں میں صرف ایک یا دو آدمی دے رہے ہیں۔ اتنا اہم واقعہ نہ تو لوگوں میں مشہور ہوا اور نہ ہی کسی دوسرے شخص نے اس کو روایت کیا بلکہ بعض حاضرین نے اس کا انکار کیا۔

قال ابن مسعود مارأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى صلوة صلوة لغير ميقاتها الا صلى صلوتين جمع بين المغرب والعشاء بجمع وصلى الفجر يومئذ قبل ميقاتها. (رواہ البخاری ومسلم والنسائی)

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے بے وقت کوئی نماز پڑھی ہو سوائے دو نمازوں کے۔ ایک تو آپ ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو اکٹھے پڑھا اور دوسرا اس دن فجر کو اس کے وقت سے پہلے پڑھا۔

اس حدیث میں حضرت ابن مسعود نے جمع بین الصلوٰتین کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ مغرب اور عشاء کی نماز صرف مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی گئی اور فجر کی نماز کو اس دن وقت سے پہلے پڑھ دیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ظہر اور عصر کی نماز کا تذکرہ نہیں فرمایا کیونکہ ان کا جمع کرنا مشہور تھا۔

جب صورت حال یہ ہو جیسے ہم نے بیان کیا ہے تو پھر یا خبر واحد کو رد کیا جائے گا یا اس کی تاویل کی جائے گی۔ تاویل یہ ہوگی کہ جمع سے مراد جمع صوری ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ظہر اور مغرب کی نمازوں کو ان کے آخری وقت تک مؤخر کیا جائے اور عصر اور عشاء کی نمازوں کو ان کے اول وقت میں ادا کیا جائے اس طرح دو نمازیں ایک ہی وقت میں پڑھی جائیں گی اور وقت مقررہ کی پابندی بھی رہے گی۔ یہ حقیقی طور پر دو نمازوں کو ایک

وقت میں جمع کرنا نہیں بلکہ دیکھنے میں یوں لگتا ہے کہ دو نمازوں کو اکٹھے پڑھا جا رہا ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب نماز ظہر کو عصر کے وقت تک مؤخر کر دیا جائے اور اسی طرح مغرب کی نماز کو عشاء کے وقت تک مؤخر کر دیا جائے تو پھر عصر اور عشاء کی نمازوں کو مقدم کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ بلکہ چاہئے یہ کہ دوران سفر ظہر اور مغرب کی نمازوں کو مکروہ وقت سے پہلے تک مؤخر کر دیا جائے اور یوں دو نمازوں کو صوری طور پر جمع کر لیا جائے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عصر اور مغرب کو جمع کرنا منقول نہیں کیونکہ اس طرح عصر کی نماز مکروہ وقت میں ہوگی اگر جمع سے مراد حقیقی جمع ہوتی تو عصر کو مغرب تک اور مغرب کو عشاء تک مؤخر کرنے کے درمیان کیا فرق ہوتا؟ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے۔

عن امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجھہ ووجوہ آلہ الکرام کان اذا سافر سار بعد مایغرب الشمس حتی کادان یظلم ثم ینزل فیصلی المغرب ثم یدعو لعشائہ فیتعشی ثم یصلی العشاء فیرتحل ویقول ھکذا کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصنع. (رواہ ابوداؤد)

حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب سفر پر جاتے تو مغرب کے بعد کوچ کرتے حتیٰ کہ تاریکی چھانے والی ہوتی پھر اترتے اور مغرب کی نماز ادا فرماتے پھر لوگوں کو کھانے کے لئے بلاتے اور اس کے بعد عشاء کی نماز پڑھ کر کوچ کرتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ یونہی کیا کرتے تھے۔

عن نافع وعبد اللہ ابن واقد ان موذن ابن عمر قال الصلوۃ قال سر حتی اذا کان قبل غروب الشفق نزل فصلی المغرب ثم انتظر حتی غاب الشفق فصلی العشاء ثم قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا عجل بہ امر صنع مثل الذی صنعت.

حضرت نافع اور عبداللہ ابن واقد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مؤذن نے کہا کہ حضور نماز کا وقت ہو گیا ہے تو آپ نے فرمایا: چلتے رہو حتیٰ کہ غروب شفق سے کچھ دیر پہلے سواری سے اترے اور مغرب کی نماز پڑھی پھر کچھ دیر کے لئے انتظار کیا حتیٰ کہ شفق غروب ہو گئی تو عشاء کی نماز ادا فرمائی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کسی وجہ سے جلدی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری طرح کرتے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک دن اور ایک رات میں تین دن کی مسافت طے کی۔ امام محمد علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے مغرب کی نماز کو شفق کے غروب تک مؤخر کر کے ادا فرمایا۔

امام بخاری علیہ الرحمہ ایک روایت بیان کرتے ہیں۔

عن ابن عمر قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اعجلہ السیر فی السفر یؤخر المغرب حتی یجمع بینھا وبین

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ کو کہیں جلدی جانا ہوتا تو مغرب کی نماز میں دیر کرتے حتیٰ

العشاء. کہ مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے۔

سالم فرماتے ہیں کہ عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب کہیں جلدی جانا ہوتا تو وہ بھی یونہی کیا کرتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ لیث نے یہ الفاظ زیادہ کئے ہیں کہ مجھ سے یونس نے بیان کیا انہوں نے ابن شہاب سے روایت کیا۔ سالم فرماتے ہیں کہ ابن عمر مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز اکٹھے پڑھتے تھے۔ سالم کے بقول حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے مغرب کی نماز میں دیر کی' تو میں نے آپ سے عرض کیا نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: چلتے رہو۔ میں نے پھر کہا (کہ حضور!) نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: چلتے رہو حتیٰ کہ ہم دو یا تین میل چلے ہوں گے کہ آپ سواری سے اترے اور نماز پڑھی پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ کو کہیں جانے میں جلدی ہوتی تو اسی طرح نماز پڑھتے۔ عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو دیکھا کہ جب آپ کو کہیں جلدی جانا ہوتا تو نماز مغرب کے لئے اقامت کہتے اور تین رکعتیں پڑھتے پھر سلام پھیرتے پھر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتے حتیٰ کہ عشاء کے لئے اقامت فرماتے اور دو رکعتیں پڑھتے اور سلام پھیر دیتے۔ آپ عشاء کی نماز کے بعد (کوئی نماز) نہ پڑھتے حتیٰ کہ رات کے وقت اٹھتے (اور تہجد پڑھتے)۔

لیث کی روایت میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ دیر کے لئے رکتے تھے تا کہ عشاء کا وقت شروع ہو جائے۔ وہ روایت جس میں جمع بین الصلوٰتین کا ذکر ہے اس کا مفہوم ہم بیان کر چکے ہیں۔ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی وہی چیز ثابت ہو رہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے تو سنن اور صحاح میں جو یہ کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غروب شفق کے بعد مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ اسی طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ جلدی ہوتی تو غروب شفق کے بعد آپ مغرب اور عشاء کی نماز اکٹھی پڑھ لیتے۔ یہ تمام روایات قابل عمل نہیں ہیں بلکہ ان کا مطلب اور مقصود یہ ہے کہ غروب شفق یعنی غروب شفق کے قریب مغرب کی نماز پڑھتے اور اس کے بعد کچھ دیر کے لئے توقف فرماتے' عشاء کا وقت شروع ہوتا تو فوراً عشاء کی نماز پڑھ لیتے کیونکہ واقعہ ایک ہی ہے جسے مختلف انداز میں روایت کیا گیا ہے اور ہم نے جو روایت بیان کی ہے وہ مفسر ہے تاویل کو قبول نہیں کرتی اس لئے جن روایات میں غروب شفق کا تذکرہ ہے ان کی تاویل کی جائے گی اور ان سے مراد قرب غروب شفق مراد لیا جائے گا یا اسے بعض راویوں کا گمان شمار کیا جائے گا۔ ہم نے جو بیان کیا ہے (کہ جمع سے مراد جمع صوری ہے نہ کہ جمع حقیقی) وہ شریعت مطہرہ کے ثابت شدہ امر کے مطابق ہے۔

جمع تقدیم صرف روایات شاذہ میں آیا ہے جن پر دوسری قطعی اور واضح روایات کے ہوتے ہوئے عمل نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ ابوداؤد علیہ الرحمہ کی روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو وقت سے پہلے عصر کی نماز پڑھنے پر دلالت کرتا ہو۔ اس میں بس اتنا مذکور ہے کہ کوچ سے پہلے جب سورج ڈھل جاتا تو آپ ظہر اور عصر کی نماز اکٹھی پڑھ لیتے۔ اس سے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ظہر میں دیر کی جاتی اور عصر میں جلدی اور اس طرح ظہر اور عصر کو اپنے مقررہ

وقتوں میں ظاہری طور پر جمع کر دیا جاتا۔ جمع سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ جب اترتے تو دونوں نمازوں کو پڑھ کر پھر سفر شروع کرتے۔

بارش کی وجہ سے دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنا جائز نہیں

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سخت بارش کی وجہ سے حضر میں بھی دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا جائز ہے۔ امام احمد علیہ الرحمہ مرض کی صورت میں اس کو جائز کہتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں۔

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی بالمدینة سبعا اوثمانیا الظھر والعصر والمغرب والعشاء قال ایوب لعلہ فی لیلة مطیرة قال عسی.

(رواہ البخاری وصحیح مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں سات یا آٹھ دن تک ظہر اور عصر کی اور مغرب اور عشاء کی نمازوں کو اکٹھے پڑھا۔ ایوب فرماتے ہیں شاید یہ بارش کی رات کو ہوا۔ انہوں نے فرمایا ہو سکتا ہے۔

حضرت ابن عباس کی حدیث صحاح اور مسانید میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بارش کے عذر پر محمول کیا ہے۔ امام احمد نے مرض کو عذر قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک بارش ہو بیماری ہو یا کوئی اور مجبوری ہو کسی صورت میں نماز کو اس کے اصل وقت سے پہلے یا بعد نہیں پڑھا جا سکتا' ہاں اگر دشمن کا خوف ہو' درندے کا اندیشہ ہو اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو امن تک نماز مؤخر کر دی جائے گی۔ یہ جمع بین الصلوٰتین نہیں بلکہ جب تک امن نہیں ہو گا نمازوں کو مؤخر کیا جائے گا اور امن کے وقت ان کو قضا پڑھا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث اگرچہ مختلف طرق سے روایت ہوئی ہے لیکن اضطراب سے خالی نہیں ہے۔ تمام علماء نے اس کے ظاہری الفاظ پر عمل کو ترک کیا ہے حتیٰ کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک بارش مجبوری ہے اور حضرت امام احمد علیہ الرحمہ کے نزدیک بیماری اور ان کے مقابلے میں ہم نے بیماری اور بارش کے علاوہ ایک اور تاویل کی ہے۔

بخاری و مسلم کی روایت میں یہ تاویل صراحت سے بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پوری آٹھ یا پوری سات (راوی کو شک ہے) نمازیں پڑھیں۔ حضرت عمر جو اس حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ اے ابو الشعثاء میں گمان کرتا ہوں کہ انہوں نے ظہر کی نماز دیر سے پڑھی اور عصر کی نماز پڑھنے میں جلدی کی۔ مغرب کی نماز میں دیر کی اور عشاء کی نماز کو جلد ادا کیا۔ فرمایا میں گمان کرتا ہوں۔ تو یہ تاویل کیسے صحیح نہیں ہو سکتی۔؟

وقد قال ابن عباس من جمع بین الصلوتین بغیر عذر فقداتی بابا من ابواب الکبائر. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ جس نے بغیر کسی مجبوری کے دو نمازیں ایک ساتھ پڑھیں تو اس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔

حدیث مبارک میں عذر سے مراد نسیان' نیند اور خوف ہے۔ واللہ اعلم بحقیقة الحال.

صلوٰۃِ خوف کا بیان

خوف کی اقسام

خوف کی دو قسمیں ہیں: ایک خوف وہ ہے جس کی وجہ سے نماز بالکل پڑھی ہی نہیں جا سکتی نہ تمام لوگ اور نہ ہی بعض لوگ۔ جب خوف کی یہ صورت حال ہو تو پھر اکیلے اکیلے سواریوں پر سوار جس طرف منہ ہے اسی طرف رکوع اور سجود کے لئے اشارہ کرتے ہوئے نماز پڑھ لی جائے جیسا کہ قرآن کریم میں "**فان خفتم فرجالا او رکبانا**" (اور اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل اور سوار ہو کر نماز پڑھو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خوف اس قدر زیادہ ہو کہ مل کر عام معروف طریقہ کے مطابق نماز نہ پڑھ سکتے ہوں تو پھر وہ نماز کیسے پڑھیں؟ اسے ہم عنقریب بیان کریں گے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خوف کی وجہ سے نماز کو مقررہ طریقہ سے ہٹ کر پڑھنا جائز نہیں۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔ میرے نزدیک امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کا قول زیادہ صحیح ہے۔ ایک دلیل تو یہ ہے کہ ربِ قدوس کا ارشادِ گرامی ہے۔ **فاذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوۃ فلتقم طائفۃ**......الخ

ربِ قدوس نے نماز خوف کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی کو شرط قرار دیا ہے اور اصولی طور پر جب شرط مفقود ہو تو حکم اپنی اصلی حالت پر باقی رہتا ہے جس حالت پر شریعت نے اس کے لئے حکم دیا ہوتا ہے اور نماز میں اصل حکم یہ ہے کہ عمل کثیر سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور جب تک انسان چل رہا ہے اور اس کا منہ قبلہ کی طرف نہیں ہے وہ نماز نہیں پڑھ سکتا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ نماز جب منافیات کے باوجود شروع ہوتی ہے تو کسی مجبوری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اب ضرورت نہیں رہی کیونکہ قرون اولیٰ میں تو تمام مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے پر مصر ہوتے تھے اب مسلمان دو گروہ میں تقسیم ہو کر بآسانی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک گروہ امام کے ساتھ نماز شروع کرے اور دوسرا گروہ دشمن کے سامنے رہے پھر دوسرا گروہ دشمن کے سامنے جائے اور جو لوگ دشمن کے سامنے کھڑے تھے کسی دوسرے امام کی اقتداء میں نماز ادا کریں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں یہ ضرورت تھی کہ تمام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھیں کیونکہ آپ کی اقتداء میں پڑھی جانے والی نماز قطعی اور یقینی طور پر مقبول تھی اور بے حد فوائد و سعادتوں کا ذریعہ تھی۔ اس فضل و کرامت سے ایک گروہ کی محرومی عقلاً جائز نہیں تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہلاکت سے بچنا اور جہاد کرنا بھی فرض تھا۔ سو ضرورت کے تحت نماز خوف شروع کی گئی تا کہ کوئی اس سعادت سے محروم نہ رہے لیکن آج اس کی ضرورت نہیں رہی اس لئے منافیات کے ساتھ نماز جائز نہیں (یعنی سوار ہو کر قبلہ کی طرف سے منہ پھیر کر محض

اشاروں سے نماز پڑھنا جائز نہیں)۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ اگرچہ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ نے نماز خوف کے مشروع ہونے کا انکار کیا ہے مگر نماز خوف بلا دلیل نہیں بلکہ اس کا ثبوت خدیث میں موجود ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل اس بارے موجود ہے۔ صاحب ہدایہ کی یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائص میں شمار کیا ہے۔ اس لئے اس پر اگر کوئی حجت ہو سکتی ہے تو وہ ہے اختصاص کی نفی اور وہ بھی نص قطعی ہے۔ اکثر ائمہ اب بھی اسے مشروع سمجھتے ہیں۔

نمازِ خوف پڑھنے کا طریقہ

امام ابوحنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمہ فرماتے ہیں کہ امام لوگوں کے دو گروہ بنائے۔ ایک گروہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا گروہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے پھر یہ گروہ جا کر دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے اور وہ گروہ جو سامنے تھا وہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے۔ امام کے ساتھ سلام پھیرنے کے بعد یہ گروہ دشمن کے سامنے چلا جائے اور جو گروہ ایک رکعت پڑھ کر چلا گیا تھا وہ واپس آ کر لاحق کی طرح اپنی دوسری رکعت پوری کرے اور سلام پھیر کر واپس چلا جائے اب وہ گروہ دوبارہ آئے اور مسبوق کی حیثیت سے اپنی بقیہ ایک رکعت پڑھے اور سلام پھیر دے۔ یہ صورت دو رکعتوں والی نماز کی ہے۔ اگر نماز چار رکعتوں والی ہو تو ہر گروہ دو رکعتیں پڑھ کر جائے اور اس طرح باری باری اپنی نماز مکمل کریں۔ پہلا گروہ اپنی بقیہ ایک یا دو رکعتوں میں قرأت نہیں کرے گا کیونکہ وہ لاحق ہے جبکہ دوسرا گروہ قرأت کرے گا اس لئے کہ وہ مسبوق ہے۔

اگر نماز کے دوران جنگ شروع ہو گئی تو جنگ میں حصہ لینے والے شخص کی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ عمل کثیر سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نماز خوف مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے:

عن ابن مسعود قال صلی اللہ علیہ وسلم صلوة الخوف فقاموا صفین صف خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصف مستقبلی العدو فصلی بھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجاء الاخرون وقاموا مقامھم واستقبل ھؤلاء فصلی بھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکعة ثم سلم فقام ھؤلاء فصلوا لانفسھم رکعة ثم سلموا ثم ذھبوا فقاموا مقام اولئک مستقبلی العدو ورجع اولئک الی مقامھم

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ثابت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز خوف ادا کی۔ لوگ دو صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ ایک صف رسول اللہ ﷺ کے پیچھے اور ایک صف دشمن کے سامنے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں نماز (یعنی ایک رکعت) پڑھائی۔ دوسرے آئے اور وہ ان لوگوں کی جگہ کھڑے ہو گئے اور (جن لوگوں نے حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی) وہ دشمن کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ حضور ﷺ نے انہیں ایک رکعت پڑھائی پھر سلام پھیر دیا۔ وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اکیلے ایک رکعت پڑھی اس کے بعد سلام پھیرا اور چلے گئے۔ یہ لوگ ان

صلوا لانفسھم رکعۃ ثم سلموا. (رواہ ابوداؤد) (مسلمانوں) کی جگہ جا کھڑے ہوئے جو دشمن کے سامنے تھے۔ وہ ان کی جگہ واپس آئے اور اکیلے ایک رکعت پڑھی اور سلام پھیر دیا۔

یہ حدیث اگرچہ ہم حنفیوں کے مذہب کے موافق ہے لیکن بقیہ رکعتوں کے پڑھنے میں مختلف ہے حدیث میں یہ ہے کہ پہلے دوسرے گروہ نے نماز مکمل کی اور جو گروہ پہلے آکر ایک رکعت پڑھ کر چلا گیا تھا اس نے بعد میں آکر نماز مکمل کی مگر ابوداؤد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز خوف ایسے ہی پڑھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس طائفہ کو آپ نے ایک رکعت پڑھائی تھی اور پھر سلام پھیر دیا تھا وہ دشمن کے سامنے چلا گیا اور وہ لوگ آئے اور انہوں نے اکیلے ایک رکعت ادا کی پھر پلٹے اور اپنی ایک رکعت مکمل کی۔ یہ مذہب حنفیہ کے موافق ہے اور موقوف حدیث ایسے معاملے کے بارے مرفوع حدیث کی مانند ہے کیونکہ ایسے امور میں کسی قسم کا اجتہاد نہیں ہوسکتا۔ فتح القدیر میں ہے کہ امام محمد علیہ الرحمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں جو ہمارے مذہب کی تائید کرتی ہے۔

عن ابن عمر قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃ الخوف باحدی الطائفتین رکعۃ والطائفۃ الاخری مواجھۃ للعدو ثم انصرفوا وقاموا فی مقام اصحابھم مقبلین علی العدو وجاء اولئک ثم صلی بھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم رکعۃ ثم قضی ھؤلاء رکعۃ ھؤلاء رکعۃ.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز خوف پڑھائی۔ ایک گروہ نے آپ ﷺ کے ساتھ ایک رکعت پڑھی اور دوسرا گروہ دشمن کے سامنے رہا پھر پہلا گروہ چلا گیا اور دشمن کے سامنے اپنے ساتھیوں کی جگہ جا کھڑا ہوا پھر وہ لوگ آئے اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک رکعت پڑھائی اس کے بعد دونوں گروہوں نے ایک ایک رکعت مکمل کی۔

یہ حدیث بھی مذہب حنفیہ کے موافق ہے ہاں اس میں یہ بیان نہیں ہوا کہ کس طائفہ نے پہلے بقیہ رکعت ادا کی اور یہ بات تو بہرحال یقینی ہے کہ دونوں گروہ بیک وقت بقیہ ایک ایک رکعت ادا نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں دشمن کا سامنا ہے اور اسی کے خوف ہی کی وجہ سے یہ نماز پڑھی جا رہی ہے۔ کسی بھی گروہ کے پہلے پڑھنے کا احتمال موجود ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے۔

عن سھل بن ابی خیثمۃ قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی باصحابہ الخوف فصفھم خلفہ صفین فصلی بالذین یلونہ رکعۃ ثم قام فلم یزل قائما حتی صلی الذین خلفہ رکعۃ ثم تقدموا وتاخر الذین

سھل ابن ابی خیثمہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان کو نماز خوف پڑھائی۔ انہوں نے آپ کے پیچھے دو صفیں باندھیں۔ حضور ﷺ نے اپنے ساتھ کے ان لوگوں کو ایک رکعت پڑھائی پھر آپ کھڑے ہوگئے اور اس وقت تک کھڑے رہے حتیٰ کہ

كانوا قدامهم فصلى بهم ركعة ثم قعد حتى صلى الذين تخلفوا ركعة ثم سلم.

(رواہ البخاری و مسلم)

آپ کے پیچھے والے لوگوں نے ایک رکعت پڑھ لی پھر یہ لوگ (دشمن کے) آگے چلے گئے اور جو ان کے سامنے تھے وہ پیچھے ہٹ آئے۔ آپ ﷺ نے انہیں ایک رکعت پڑھائی پھر آپ بیٹھ گئے حتیٰ کہ ان لوگوں نے اپنی ایک رکعت مکمل کی اس کے بعد آپ ﷺ نے سلام پھیر دیا۔

امام مالک اور امام شافعی علیہما الرحمہ نے اسی طریقہ کو اختیار فرمایا ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے:

عن جابر قال كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بذات الرقاع فاذا اتينا الى شجرة ظليلة تركناها للنبى صلى الله عليه وسلم فجاء رجل من المشركين وسيف رسول الله صلى الله عليه وسلم معلق بالشجرة فاخترطه فقال تخافنى قال لا قال فمن يمنعك منى قال الله فهدده اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم واقيمت الصلوة فصلى بطائفة ركعتين ثم تاخروا وصلى بالطائفة الاخرى ركعتين وكان للنبى صلى الله عليه وسلم اربع وللقوم ركعتان.

(رواہ البخاری)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم ذات الرقاع کی جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ جب ہم ایک سایہ دار درخت کے پاس آئے تو ہم نے اسے رسول اللہ ﷺ (کے آرام) کی خاطر چھوڑ دیا۔ (حضور ﷺ اس درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کہ) ایک مشرک آیا۔ حضور ﷺ کی تلوار درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس مشرک نے تلوار بے نیام کر کے آپ ﷺ پر سونت لی اور کہنے لگا کیا آپ مجھ سے ڈر رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ مشرک بولا۔ آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نے اس مشرک کی تہدید فرمائی نماز کے لئے اقامت کہی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ (پھر یہ لوگ چلے گئے) اور دوسرے (جو دشمن کے سامنے تھے) پیچھے ہٹ آئے۔ آپ ﷺ نے انہیں دو رکعتیں پڑھائیں۔ (اس طرح) نبی کریم ﷺ کی چار رکعتیں ہو گئیں اور لوگوں کی دو رکعتیں۔

اور یہ ذکر نہیں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام پھیر دیا۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى صلوة الخوف فصلت طائفة معه وطائفة وجوههم قبل العدو فصلى بهم ركعتين ثم قاموا مقام الاخرين وجاء

(امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے) کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز خوف پڑھی۔ ایک گروہ نے آپ کی معیت میں نماز پڑھی اور دوسرا گروہ دشمن کی طرف منہ کر کے کھڑا رہا۔ حضور ﷺ نے انہیں دو رکعتیں پڑھائیں پھر یہ لوگ

الاخرون فصلی بھم رکعتین ثم سلم.

دوسرے لوگوں کی طرح جا کھڑے ہوئے۔ دوسرے آئے اور حضور ﷺ نے انہیں بھی دو رکعتیں پڑھائیں اور اس کے بعد سلام پھیر دیا۔

اس حدیث پاک سے امام شافعی علیہ الرحمہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والوں کی اقتداء کر سکتا ہے۔ تعجب ہے کہ حالت سفر میں امام شافعی پوری نماز (چار رکعتوں) کی بات کر رہے ہیں۔ سفر میں دوسری دو رکعتیں کہاں سے آ گئیں پھر یہ حدیث دلیل بن بھی نہیں سکتی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو دو فرض رکعتوں کو دو بار ادا فرمایا کیونکہ اس دور تک فرضوں کا تکرار جائز تھا جیسے امام طحاوی علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے یا فرضوں کا تکرار نماز خوف میں جائز ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں دونوں گروہوں کو فرض نماز پڑھانے کا ذکر آیا ہے۔

فانه قال صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی خوف الظهر فصف بعضهم خلفه وبعضهم وراء العد وفصلی رکعتین ثم سلم فانطلق الذین صلوا فوقفوا موقف اصحابهم ثم جائما اولئک فصلوا خلفه فصلی بهم رکعتین ثم سلم فکانت لرسول الله صلی الله علیه وسلم اربعا ولا صحابه رکعتین رکعتین. (رواہ النسائی)

آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کے وقت نماز خوف پڑھی۔ بعض لوگوں نے آپ کے پیچھے صف بنا لی اور بعض دشمن کے سامنے صف آراء ہو گئے۔ حضور ﷺ نے انہیں دو رکعتیں پڑھا دیں اور سلام پھیر دیا۔ جو نماز پڑھ چکے تھے وہ چلے گئے اور اپنے ساتھیوں کی جگہ جا کھڑے ہوئے پھر دوسرے لوگ آئے اور حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے لگے۔ آپ نے انہیں بھی دو رکعتیں پڑھائیں اور پھر سلام پھیرا۔ (اس طرح) حضور ﷺ کی تو چار رکعتیں بن گئیں جبکہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے دو دو رکعتیں پڑھیں۔

حضرت امام ابوداؤد علیہ الرحمہ اس کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ حضرت حسن اسی پر فتویٰ دیتے تھے۔ یہی رائے امام نسائی کی بھی ہے۔

مغرب کی نماز بھی اس طرح پڑھی جائے گی۔ امام کی چھ رکعتیں ہو جائیں گی اور لوگوں کی تین۔ اگر شوافع اس حدیث سے استدلال کریں کہ فرض والا نفل والے کی اقتداء کر سکتا ہے تو پھر بھی وہ اس اصل سے نہیں نکلتے کہ سفر میں چار پڑھنا عزیمت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ فرض نماز کو دوبارہ پڑھا جاتا تھا لیکن فرض والے نے متنفل کی اقتداء کبھی نہیں کی۔

جب دشمن نمازیوں اور قبلہ کے درمیان ہو

چوتھی صورت یہ ہے کہ جب دشمن نمازیوں اور قبلہ کے درمیان ہو۔

عن ابی العیاش الزرقی قال کنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم بعسفان

ابوالعیاش زرقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عسفان میں تھے۔ مشرکین کی

وعلى المشركين خالد بن الوليد فصلينا بهم الظهر فقال المشركون لقد اصبنا عقله لو كنا حملنا عليهم وهم في الصلوة فنزلت اية القصر بين الظهر والعصر. فلما حضر العصر قام رسول الله صلى الله عليه وسلم مستقبل القبلة والمشركون امامه فصف خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم صف وصف بعد ذلك صف آخر فركع رسول الله صلى الله عليه وسلم وركعوا جميعا وسجد وسجد الصف الذي يليه وقام الاخرون يحرسونهم فلما صلى هولاء السجدتين وقاموا سجدالاخرون الذين كانوا خلفهم ثم تاخر الصف الذي يليه الى مقام الاخرين وتقدم الصف الاخر الى مقام الصف الاول ثم ركع رسول الله صلى الله عليه وسلم وركعوا جميعا ثم سجدوا سجد الصف الذي يليه ثم قام الاخرون يحرسونهم فلما جلس رسول الله صلى الله عليه وسلم والصف الذي يليه سجد الاخرون ثم جلسوا جميعا فسلم عليهم جميعا. (رواہ ابوداؤد)

قیادت خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ہمیں نماز ظہر پڑھائی۔ مشرکین کہنے لگے ہم سے غفلت ہوگئی کاش ہم حالت نماز میں ان پر حملہ کرتے۔ تو اس وقت ظہر اور عصر کے درمیان آیت قصر نازل ہوئی۔ جب عصر کی نماز پڑھنے کا وقت آیا تو رسول اللہ ﷺ قبلہ رو ہو کر کھڑے ہوگئے اور مشرکین آپ کے سامنے تھے ایک گروہ نے آپ کی اقتداء میں صف بنا لی اور دوسرا گروہ صف بنا کر پہلی صف کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے رکوع کیا تو تمام لوگوں نے رکوع کیا آپ نے سجدہ فرمایا تو جو صف آپ کے ساتھ ملی ہوئی تھی (یعنی پہلی صف) وہ بھی سجدہ میں چلے گئے اور دوسرے (یعنی دوسری صف) دشمنوں پر نظر رکھے کھڑے رہے۔ جب (پہلی صف والے) یہ لوگ دونوں سجدے کر چکے اور کھڑے ہوئے تو دوسروں (یعنی دوسری صف والوں) نے جو ان کے پیچھے کھڑے تھے انہوں نے سجدہ کیا پھر جو صف آپ کے ساتھ ملی ہوئی تھی (یعنی پہلی صف) وہ پیچھے چلی گئی اور دوسری صف آگے آ گئی جہاں پہلی صف والے کھڑے تھے پھر رسول اللہ ﷺ نے رکوع کیا تو تمام نے رکوع کیا پھر آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو ساتھ والی صف (یعنی پہلی صف) نے بھی سجدہ کیا اور دوسری صف والے لوگ دشمن پر نگاہ رکھے رہے جب رسول اللہ ﷺ اور پہلی صف والے بیٹھ گئے تو دوسرے لوگوں (یعنی دوسری صف) نے سجدہ کیا اور پھر تمام بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ نے تمام لوگوں کو سلام دیا (یعنی تمام کے ساتھ سلام پھیرا اور نماز ختم کی)۔

پانچویں صورت یہ ہے:

عن ثعلبة بن زهدم قال كنا مع سعيد بن العاص بطبرستان فقام فقال ايكم صلى مع رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوة

حضرت ثعلبہ بن زہدم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم سعید بن العاص کے ساتھ طبرستان میں تھے۔ آپ کھڑے ہوئے اور پوچھا تم میں سے کس نے رسول اللہ

الخوف فقال حذیفة انا فصلی بھولاء الرکعة وھؤلاء الرکعة ولم یقضوا.

علیہ السلام کے ساتھ نماز خوف پڑھی ہے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے پھر انہوں نے ان لوگوں کو ایک رکعت اور ان لوگوں کو بھی ایک رکعت پڑھائی۔ (مطلب یہ ہے کہ ہر دو گروہوں کو ایک ایک رکعت پڑھائی) اور انہوں نے نماز پوری نہ کی۔

حضرت ابوداؤد فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے یہ روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک اور رکعت پڑھی (یعنی مقتدیوں نے نماز مکمل کی)۔ امام نسائی روایت کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ نے کہا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز خوف پڑھی ہے۔ حذیفہ کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے دو صفیں بنائیں۔ ایک صف ان کے پیچھے اور ایک صف دشمن کے سامنے تھی۔ آپ نے اپنے پیچھے کھڑی صف کو ایک رکعت پڑھائی تو یہ ان لوگوں کی جگہ پر چلے گئے (جو دشمن کے سامنے کھڑے تھے) دوسرے آئے تو انہوں نے بھی ایک رکعت پڑھائی اور انہوں نے دوسری رکعت نہیں پڑھی۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز خوف ایک رکعت ہے۔ حضرت امام مسلم کی روایت ہے۔

عن ابن عباس قال فرض الله علی لسان نبیکم فی الحضر اربعا وفی السفر رکعتین وفی الخوف رکعة.

ابن عباس سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کی زبانی حضر میں چار رکعتیں سفر میں دو رکعتیں اور خوف کی حالت میں ایک رکعت فرض فرمائی ہے۔

لیکن ائمہ میں سے کوئی شخص اس پر عمل پیرا نہیں ہے اور نہ ہی ان کے مقلدین ان پر عمل کرتے ہیں۔ ''انہوں نے نہیں پڑھی''۔ کے الفاظ شاید راویوں کا گمان ہے۔

نمازِ جنازہ کا بیان

قریب الموت آدمی کا چہرہ قبلہ کی طرف کر دینا چاہیے

جب کوئی شخص قریب الموت ہو تو اس کو قبلہ رو کر دینا چاہیے اور دائیں پہلو پر لٹا کر اس کی گردن کو خم دینا چاہیے کیونکہ حضرت خباب نے مشرکین سے کہا تھا کہ مجھے قبلہ رو کر کے قتل کرنا۔ فتح القدیر میں حاکم کی روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو براء بن معرور کے بارے پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ وفات پا چکے ہیں اور انہوں نے وصیت کی ہے کہ آپ کی خدمت میں ان کی طرف سے تین چیزیں عرض کر دی جائیں۔ انہوں نے حالت نزع میں یہ وصیت کی کہ ان کا منہ قبلہ شریف کی طرف کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ فطرت کو پہنچ گیا اور میں تینوں وصیتیں اس کے بیٹوں کی طرف لوٹاتا ہوں۔

استیعاب میں ہے کہ معمر نے زہری سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے زندگی اور موت دونوں حالتوں میں قبلہ شریف کی طرف منہ کیا۔ انہوں نے پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد ان کی موت کا تذکرہ کرتے ہوئے روایت کیا کہ جب وہ قریب الموت تھے تو اپنے اہل خانہ سے

فرمایا کہ کعبہ کی طرف منہ کرلو۔

سوتے ہوئے دائیں کروٹ پر لیٹنا سنت ہے کیونکہ نیند موت کی سی عارضی کیفیت ہے اس لئے موت کے وقت بھی دائیں پہلو پر لیٹنا مسنون طریقہ ہے۔ ہدایہ میں مذکور ہے کہ پیٹھ کے بل لٹانا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس طرح روح آسانی سے نکلتی ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح روح آسانی سے قبض ہوتی ہے لیکن روح اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے تو تبھی آسانی ہوگی۔ فتح القدیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ آدمی کو چت لٹا کر اس کا منہ قبلہ شریف کی طرف کر دیا جائے اور اسے کلمۂ شہادت کی تلقین کی جائے تاکہ جب اس کی روح جسم سے جدا ہو تو اس کی زبان پر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو اور روح اس کی حلاوت کو محسوس کر رہی ہو۔

قریب الموت کو کلمے کی تلقین کرنی چاہیے

عن ابی سعید وابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لقنوا موتاكم لا اله الا الله. (رواہ مسلم)

حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے مرنے والے (دوستوں) کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو۔

ان کے علاوہ اصحاب سنن نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ موتیٰ سے مراد قریب الموت لوگ ہیں کیونکہ جو مر چکا ہے اس کو کلمہ کی تلقین بے سود ہے کیونکہ اگر وہ مسلمان مرا ہے تو وہ توحید و رسالت کی گواہی پر ثابت قدم تھا اس لئے اس کو تلقین کرنا بے سود ہے اور اگر اس کی موت حالت کفر پر ہوئی ہے تو اب موت کے بعد ایمان لانا اسے کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ یہ کہنا کہ جو آدمی مر چکا ہے اس کو تلقین کرنا بے فائدہ اس لئے ہے کہ وہ کچھ سن نہیں سکتا، باطل ہے کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ میت زندہ سے زیادہ سنتا ہے حتیٰ کہ وہ قبر پر آنے والے آدمی کے جوتوں کی آہٹ کو بخوبی سنتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ بدر میں قتل ہونے والے مشرکین کی لاشوں کو جب ایک گڑھے میں ڈالا تو ان سے باتیں کیں اور فرمایا کہ یہ سنتے تو ہیں لیکن سخت عذاب کی وجہ سے جواب نہیں دے سکتے۔

تلقین کا طریقہ یہ ہے کہ مرنے والا کلمۂ شہادت سنے اور اسے یہ نہ کہا جائے کہ تو کلمہ پڑھ کیونکہ ہوسکتا ہے اس حالت میں اس کی زبان سے انکار صادر ہو۔ بہر حال اگر اس حالت میں اللہ محفوظ رکھے کسی شخص کی زبان سے انکار صادر ہوگا تو اسے کافر نہیں کہیں گے بلکہ مسلمانوں کی طرح اس کے ساتھ سلوک کیا جائے گا اور اس کے باطن کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے گا کیونکہ موت کا وقت کڑوا ہوتا ہے۔ اس میں انسان حواس باختہ ہو جاتا ہے اور ذہن کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے کلمہ کو قصداً نہ کہا ہو۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی اسلامی کلمہ بولنا چاہتا ہو اور سبق لسانی کی وجہ سے کلمۂ کفر صادر ہوگیا ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مرنے والا ہر شخص ایمان پر ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ دوسری دنیا کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے۔

کافر جو جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا کفر قطعی ہوتا ہے اور ایک وہ جس کا کفر ظنی ہوتا ہے کیونکہ اپنی قساوت قلبی کی وجہ سے وہ دوسرے جہان کا مشاہدہ صرف موت کے بعد کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قریب الموت شخص کے پاس سورۃ یٰسین پڑھنی چاہیے

حالتِ نزع کے وقت مرنے والے کے قریب سورت یٰسین کی تلاوت کرنی چاہئے کیونکہ اس سے موت آسان ہو جاتی ہے اور ایمان پر ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔

عن معقل بن یسار قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اقرؤا السورة یسین علی موتاکم.

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے مرنے والوں پر سورت یٰسین تلاوت کرو۔

اسے امام احمد اور ابوداؤد علیہما الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

جب آدمی فوت ہو جائے تو اس کی آنکھیں بند کر دینی چاہئیں اور منہ کو ملا دینا چاہئے تاکہ وہ خوبصورت نظر آئے اور منہ دیکھنے والوں کے دل میں نفرت پیدا نہ ہو۔ فتح القدیر میں ہے کہ آنکھیں بند کرنے والا یہ دعا پڑھے۔

بسم الله وعلی ملة رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم اللهم یسر علیه امره وسهل علیه ما بعده واسعده بلقائک واجعل ما خرج الیه خیرا مما خرج منه

اللہ کے نام سے میں اس کی آنکھیں بند کر رہا ہوں اور یہ ملت رسول اللہ ﷺ پر اس دنیا سے جا رہا ہے۔ اے اللہ اس پر اس کا معاملہ آسان فرما اور اس کے لئے بعد کی زندگی کو آسان بنا دے۔ اسے اپنی ملاقات سے بہرہ مند فرما اور جس دنیا کی طرف یہ آ رہا ہے اسے اس دنیا سے بہتر بنا دے جس کو یہ چھوڑ کر جا رہا ہے۔

میت کی تجہیز و تکفین میں جلدی

میت کے غسل اور تجہیز و تکفین میں جلدی کرنی چاہئے۔

عن حسین بن وجوع ان طلحة بن البراء مرض فاتاه النبی صلی الله علیه وسلم یعوده فقال انی لا اری طلحة الا قد حدث به الموت فاذ نونی به وعجلوا فانه لاینبغی لجیفة مسلم ان یحبس بین ظهرانی اهله اللهم ابق طلحة وانت تضحک الیه وهو یضحک الیک. (رواہ ابوداؤد)

حسین بن وجوح سے روایت ہے کہ حضرت طلحہ بن البراء رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار ہوئے تو رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور فرمایا: میں طلحہ کو نہیں دیکھ رہا مگر اس کی موت واقع ہو چکی ہے۔ (یعنی طلحہ تو فوت ہو گئے ہیں) مجھے ان کے قریب کرو اور جلدی کرو (یعنی تجہیز و تکفین میں) کیونکہ کسی مسلمان کی لاش کو اس کے اہل خانہ میں دیر تک نہیں رکھنا چاہئے۔ اے اللہ طلحہ کو بقاء عطا فرما تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش ہو۔

میت کو غسل دینا فرض ہے۔ اس پر پوری امت کا اجماع ہے اور اس کے فرض ہونے میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ احادیث میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ ہاں اس بارے اختلاف ہے کہ کیا یہ غسل نجاست کی وجہ سے ہوتا ہے یا

حدث کی وجہ سے۔ بعض فقہاء کے نزدیک نجس ہونے کی وجہ سے میت کو غسل دیا جاتا ہے کیونکہ جس میت کو غسل نہیں دیا گیا اس کو اٹھانے والا اگر اسی حالت میں نماز پڑھے گا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ میت حیوان دموی ہے اور حیوان دموی مرنے سے نجس ہو جاتا ہے۔ جس طرح باقی خون والے حیوان مردار ہو کر ناپاک ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان میت اپنی عزت وکرامت کی وجہ سے غسل سے پاک ہو جاتا ہے۔ محققین کی رائے یہ ہے کہ میت کو غسل حدث کی وجہ سے دیا جاتا ہے' مسلمان مرنے کے بعد ناپاک نہیں ہو جاتا' ہاں موت کو شارع علیہ السلام نے غسل کا موجب ٹھہرایا ہے جیسے نیند وضو کا موجب ہے۔ علماء نے یہ نہیں کہا کہ جب انسان مرتا ہے تو تمام اعضاء بالکل ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور ایسی حالت میں جسم سے نجاست کا نکلنا یقینی ہے جو حدث کا سبب ہے اور اس وجہ سے غسل فرض ہو جاتا ہے حالانکہ غسل تو انبیاء علیہم السلام کو بھی فرض ہے اگر چہ یہاں نجاست کے خروج کا کوئی احتمال نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور عرض کیا آپ حالتِ حیات میں بھی پاک اور حالتِ وصال میں بھی پاک ہیں۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان میت پلید نہیں ہوتی۔

عن ام المؤمنین عائشة قالت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قبل عثمان بن مظعون وهو میت وهو یبکی حتی سال دموع النبی صلی الله علیه وسلم علی وجه عثمان. (رواہ الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون کو چوما حالانکہ وہ فوت ہو چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رو رہے تھے اور آپ کے آنسو عثمان کے چہرے پر گر رہے تھے۔

اسی طرح بخاری کی حدیث ہے:

ما روی ابوهریرة قال قال رسول الله ﷺ سبحان الله ان المؤمن لاینتجس.

حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سبحان اللہ مؤمن ناپاک نہیں ہوتا۔

یعنی موت یا جنابت سے مؤمن ناپاک نہیں ہوتا۔ جنابت یا گندگی سے ناپاکی تلوث کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ موت کی وجہ سے۔ اس سے تخصیص لازم نہیں آتی کیونکہ یہاں لفظ عام ہے۔

جو لوگ میت کے نجس ہونے کے قائل ہیں وہ انبیاء کو اس حکم سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں دوسرے لوگوں کے بارے وہ جھگڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امہات المؤمنین پر لفظ طیبات کا اطلاق فرمایا ہے۔ تو انہیں وصال کے بعد کیونکر نجس کہا جا سکتا ہے اسی طرح صحابہ کرام اور اولیاء امت علیہم الرضوان کی طرف نجاست کی نسبت کیسے کی جا سکتی ہے؟

بعض علماء کرام کا یہ کہنا کہ مؤمن حیوان دموی (خون والا) ہے تو یہ قول تمام دموی حیوانوں کے نجس ہونے سے مانع ہے۔ اس پر مؤمن کا وہ حکم نہیں جو دوسرے حیوانوں کا ہے۔ رہا مسئلہ کہ غسل سے پہلے میت کو اٹھانے والا نماز نہیں پڑھ سکتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میت کے جسم سے نکلنے والی نجاست سے آدمی آلودہ ہو جاتا ہے۔ اگر یقین ہو کہ میت صاف ستھری ہے اور اس کے جسم پر کوئی نجاست نہیں جیسے انبیاء اور اولیاء کے جسم پر کوئی نجاست نہیں ہوتی

تو میت کو اٹھانے والا نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس کی نماز صحیح ہوگی۔ اسی طرح تھوڑا پانی مسلمان کے فوت ہو جانے سے ناپاک اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم پر نجاست کے موجود ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب.**

میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے

غسل میت پر فرض نہیں۔ لوگوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو غسل دیں۔ میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے۔ ایک آدمی کے ادا کرنے سے سب اس فریضہ سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی بھی یہ فرض بجا نہیں لاتا تو تمام گناہ گار ہوں گے کیونکہ میت کا حق ہے اور یہ حق کسی ایک آدمی کے ذریعے بھی ادا ہو سکتا ہے۔

میت کو غسل دینے کے لئے نیت شرط ہے۔ اگر کوئی مسلمان ڈوب کر فوت ہوا اور اس کی لاش پانی سے نکال لی گئی تو اسے غسل دینا ہوگا کیونکہ غسل امر تعبدی ہے۔

شہید کس کو کہا جائے گا؟

شہید کو غسل نہیں دیا جائے گا اور شریعت کی رو سے شہید وہ ہے جس کو ظلماً کسی تیز دھار آلے سے قتل کیا گیا ہو اور اس کے ذمے کسی کا کچھ مال نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی بھاری چیز سے قتل ہو جو عموماً قتل کے لئے استعمال نہیں ہوتی مگر قتل ظلم پر مبنی ہو تو صاحبین کے نزدیک وہ شہید ہے مگر امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک وہ شہید نہیں کیونکہ ایسی بھاری چیز کے ساتھ قتل صاحبین کے نزدیک قصاص کا موجب ہے اور امام صاحب کے نزدیک دیت کا۔ اگر بھاری چیز ایسی ہو جس کو انسانی جسم برداشت کر سکتا ہو لیکن اس چیز کے لگنے سے آدمی مر جائے تو قتل خطا شمار ہوگا اور اس میں عمد کا شبہ ہوگا لیکن اس سے بالاتفاق قصاص واجب نہیں ہوگا۔ وہ شخص جس پر حکومت نے کسی جرم کی پاداش میں حد جاری کی اور اسے قتل کر دیا وہ شہید نہیں ہوگا لیکن اسے بالاتفاق غسل دیا جائے گا۔ اگر اہل حرب نے کسی مؤمن کو قتل کر دیا یا باغیوں نے کسی عادل شخص کو قتل کر دیا یا ڈاکٹروں نے کسی مؤمن کو شہید کر دیا تو وہ شہید ہے چاہے اسے کسی قسم کے آلہ سے قتل کیا گیا ہو کیونکہ وہ ایسے شخص کے ہاتھ سے قتل ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن ہے۔ آلہ کا بھاری یا تیز دھار ہونا اس کے جرم کی نوعیت کو کم نہیں کر سکتا۔

حالتِ جنابت میں شہادت پانے والے کو غسل دینے پر ائمہ کا مؤقف

جنبی اگر شہید ہو جائے تو اسے غسل دیا جائے گا لیکن اسے شہید کا اجر ضرور ملے گا مگر امام صاحب کے نزدیک اس کو غسل دینا فرض نہیں۔ صاحبین کے نزدیک جنبی شہید کو بھی غسل دینا فرض نہیں ہے کیونکہ غسل جنابت موت کی وجہ سے ساقط ہو گیا ہے کیونکہ موت تمام حواس کو باطل کر دیتی ہے اور انسان مکلّف نہیں رہتا۔ شہید اگر جنبی ہو تو اسے غسل دینے کی دلیل حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو حالت جنابت میں شہید ہوئے اور فرشتوں نے انہیں غسل دیا اسی لئے وہ غسیل الملائکہ کہلائے۔ فتح القدیر میں ہے کہ ابن حبان اور حاکم بیان کرتے ہیں۔

عن عبد اللہ بن الزبیر قال سمعت	حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول وقد	کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو

قتل حنظلة ان صاحبكم حنظلة يغسله الملائكة سلوا هاجبته فقالت خرج وهو جنب لما سمع الهاتف فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لذلك غسلته الملائكة.

یہ فرماتے سنا کہ حنظلہ شہید ہوئے تو انہیں ملائکہ نے غسل دیا ان کی گھر والی سے پوچھو۔ (صحابہ کرام نے جب ان کی زوجہ محترمہ سے ان کے بارے پوچھا تو) انہوں نے بتایا کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حالت جنابت میں تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے منادی نے آواز دی تو وہ اسی حالت میں تشریف لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی لئے فرشتوں نے انہیں غسل دیا۔

حضرت ابن ہمام کے نزدیک یہ حدیث مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ حاکم کی روایت میں ''ان کی اہلیہ سے پوچھو'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے اور اس کی صحت میں کوئی شک نہیں۔ اس میں راز کی بات یہ ہے کہ شہید حقیقت میں زندہ ہوتا ہے اگرچہ اس کی زندگی ہماری سمجھ سے ماوراء ہے۔ اس کو جو غسل دیا جاتا ہے وہ تطہیر حکمی کے لئے ثابت ہے مگر یہ غیر کی وساطت سے ممکن ہے۔ شہید یہ فرض خود ادا نہیں کرسکتا۔ یہ غسل درحقیقت غسل جنابت ہے میت کا غسل نہیں ہے۔ صاحبین کا یہ کہنا کہ موت سے غسل ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ انسان مکلف نہیں رہتا' صحیح نہیں ہے کیونکہ شہید تو مکلف نہیں لیکن جو لوگ ابھی اس دنیا میں ہیں (لواحقین) وہ تو مکلف ہیں اس لئے جنبی شہید کو غسل دینا واجب ہے۔

شہادت کب باطل ہوتی ہے؟

ارتثاث سے شہادت باطل ہو جاتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں انسان زندگی کے حظوظ کو حاصل کر لیتا ہے۔ ارتثاث کا مطلب یہ ہے کہ زخمی ہونے کے بعد انسان کچھ کھا پی لے یا دوائی استعمال کر لے یا اسے زندہ حالت میں میدان جنگ سے پیچھے منتقل کر دیا جائے تا کہ اس کو بچایا جا سکے یا اس قسم کے کسی اور مقصد کے تحت۔ اگر مقصد یہ ہو کہ میدان میں اس کی لاش کو گھوڑے (ٹینک وغیرہ) نہ روندتے رہیں تو اس سے شہادت پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اگر اسے کیمپ یا خیمے میں لایا گیا تو وہ مرتث ہے کیونکہ اس نے زندگی کی راحت کو حاصل کر لیا ہے اور اس سے ظلم میں تخفیف ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایک شخص زخمی ہوا اور اسی حالت میں اس پر نماز کا وقت گزر گیا اور وہ زندہ رہا تو مرتث ہے بشرطیکہ بے ہوش نہ ہو کیونکہ ایک نماز اس کے ذمہ واجب الاداء ہے۔ اسی طرح گفتگو بھی زندگی کی راحتوں سے ہے۔ کلام سے بھی انسان مرتث ہو جاتا ہے ہاں بہت تھوڑی گفتگو سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ حضرت سعد بن ربیع نے چند جملے کہے تھے حالانکہ وہ شہید قرار پائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں غسل نہیں دیا تھا۔ آپ کی شہادت غزوۂ احد میں ہوئی پورا واقعہ عیون الاثر میں مذکور ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما فعل سعد بن الربيع في الاحياء هو ام في الاموات فقال رجل من الانصا وانا انظر

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ حضرت سعد بن ربیع کا کیا ہوا؟ کیا وہ زندہ ہیں یا شہید ہو گئے؟ ایک انصاری نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا

لک یا رسول اللہ مافعل فنظر فوجدہ جریحافی القتلی وبہ رمق قال فقلت لہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم-امرنی ان انظرا فی الاحیاء انت ام فی الاموات قال انا فی الاموات فابلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عنی السلام وقل لہ ان سعد بن الربیع یقول جزاک اللہ خیرا عناخیر ماجری بہ نبیا عن امۃ وابلغ قومک عنی السلام وقل لھم ان سعد بن الربیع یقول لکم انہ لاعذرلکم عند اللہ ان یخلص الی نبیکم ومنکم عین تطرف قال ثم لم ابرح حتی مات قال فجئت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرتہ.

ہوا؟ اس صحابی نے ان کو مقتولوں میں دیکھا کہ وہ زخمی پڑے ہیں لیکن ابھی تک چند سانسیں باقی ہیں کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعد بن ربیع کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے کہ دیکھوں آپ زندہ ہیں یا شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت سعد بن ربیع بولے میں مرنے والوں میں ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کو میری طرف سے سلام عرض کرنا اور کہنا کہ سعد بن ربیع عرض کرتا تھا اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے جزاء خیر دے اس سے بہتر جزاء دے جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو اپنی امت کی طرف سے دی ہو اور اپنی قوم (امت مسلمہ) کو میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ سعد بن ربیع کہتا ہے کہ اگر تمہارے نبی تک کوئی میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آ کر آپ ﷺ کو (ساری صورت حال) بتائی۔

وہ شہید جس کو غسل نہیں دیا جائے گا

وہ شہید جس کو غسل نہیں دیا جائے گا اس کے لئے ضابطہ یہ ہے کہ عاقل ہو بالغ ہو جنابت سے پاک ہو ظلماً قتل ہوا ہو اس کے قتل کی وجہ سے کسی پر مال (دیت) واجب نہ ہوئی ہو اور نہ ہی وہ مرتث ہوا ہو (یعنی زندگی کی راحتوں سے کچھ حاصل نہ کیا ہو) صاحبین کے نزدیک جو شخص تیز دھار آلے سے قتل نہیں ہوا ہو وہ بھی شہید ہے اسے غسل نہیں دیا جائے گا اور امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک ایسا آدمی شہید نہیں اسے غسل دیا جائے گا۔ جو شخص کسی دشمن، باغی یا ڈاکو کے ہاتھوں قتل ہوا خواہ وہ کسی بھی آلہ سے قتل ہو وہ اس ضابطہ میں شامل ہے۔ اسی طرح جو میدان جنگ میں قتل ہوا اور اس کے جسم پر زخم پائے گئے۔ بیٹا جسے والد نے قتل کیا۔ غلام جو اپنے آقا کے ہاتھوں قتل ہوا اور ان کے قتل سے دیت واجب نہ ہوئی تو یہ بھی شہید شمار ہوں گے۔

میت کو غسل دینے کے لئے پانی میں بیری کے پتے ڈالنا

میت کو غسل دینے کا طریقہ یہ ہے کہ پانی میں بیری کے پتے ڈال کر گرم کیا جائے۔ اگر ایسا پانی میسر نہ ہو تو پھر صاف پانی لے کر میت کو غسل دیا جائے بیری کے پتے ڈال کر گرم کیا گیا پانی اگر میسر ہو تو اس سے غسل دینا مستحب ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

اغسلوھا بماء وسدر۔ (میتوں کو) پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دو۔

کیونکہ ایسا پانی کافی صفائی کرتا ہے۔ مستحب یہ ہے کہ پہلے میت کو وضو کرایا جائے اور اس کے بعد غسل دیا جائے' وضو اور غسل میں ابتداء دائیں طرف سے کی جائے جیسا کہ امام مسلم علیہ الرحمہ بیان کرتے ہیں۔

عن ام عطية ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حيث امرها ان تغسل ابنته ابدءن بميا منها.

حضرت اُم عطیہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے انہیں ان کی بیٹی کو غسل کرنے کا حکم دیا تو فرمایا کہ: دائیں طرف اور اعضائے وضو سے غسل کی ابتداء کرو۔

میت کے کپڑے اتارنا ضروری ہے

میت کے وہ کپڑے جن میں وہ فوت ہوا ہے' اتارنے ضروری ہیں کیونکہ ان پر ضرور نجاست لگی ہوگی۔ امام شافعی فرماتے ہیں جس قمیص میں فوت ہوا ہے اسی میں غسل دیا جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی قمیص میں غسل دیا گیا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیات اور بعد از حیات دونوں حالتوں میں پاک تھے۔

عیون الاثر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل کے بارے اختلاف ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا بخدا ہم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب کے کپڑے اپنے عام مرنے والوں کی طرح اتار دیں یا آپ کو انہیں کپڑوں میں غسل دیں۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کر دی اور گھر کے ایک کونے سے ہاتف غیبی نے آواز دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انہیں کپڑوں میں غسل دو۔ صحابہ کرام اٹھے اور انہوں نے قمیص میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دیا' قمیص کے اوپر سے ہی پانی ڈالتے جاتے اور جسم اطہر کو ملتے جاتے تھے۔ ان کے ہاتھ قمیص کے نیچے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام مسلمانوں کو غسل دیتے وقت ان کے کپڑے اتارے جائیں گے اور کپڑوں میں غسل دینا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔

غسل دینے کا سنت طریقہ

غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس تختے کو تین یا اس سے زائد مرتبہ خوشبو سے دھونی دی جائے پھر کپڑے اتار کر اور اس کی شرم گاہ کو کسی کپڑے سے ڈھانپ کر تختے پر لٹایا جائے۔ ضرورت کے تحت رانوں کا ننگا کرنا جائز ہے لیکن اس کے اوپر کا حصہ جسے عورت غلیظہ کہتے ہیں اس کا چھپانا ضروری ہے۔ اس کے بعد میت کا استنجاء کیا جائے اور بغیر کلی اور ناک میں پانی ڈالے وضو کرایا جائے کیونکہ کلی سے منہ میں پانی داخل ہوگا اور ناک میں پانی ڈالنے سے پانی اندر چلا جائے گا جو حرج اور تکلیف کا سبب بنے گا۔ علماء نے فرمایا ہے کہ ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر اس کے ساتھ دانتوں مسوڑھوں کو صاف کیا جائے پھر سر اور داڑھی کو خطمی (ایک قسم کی مٹی جس سے صابون کا کام لیا جاتا ہے) سے دھوئے (صابن' شیمپو اور اس قسم کی دوسری چیزیں بھی استعمال کی جاسکتی ہیں کیونکہ اصل مقصود صفائی ہے) پھر میت کو بائیں پہلو پر لٹایا جائے۔ اس پر پانی ڈالا جائے۔ آہستہ آہستہ بدن کو رگڑا جائے تاکہ وہ صاف ہو جائے اور پانی تخت تک پہنچ جائے اور اس پانی میں مٹی' میل یا صابون کی آمیزش نہ ہو (یعنی جسم دھل کر صاف ہو جائے اور

صاف پانی جسم سے ٹپکنے لگے) پھر میت کو دائیں کروٹ پر لٹایا جائے اور مذکورہ طریقے کے مطابق بائیں حصے کو دھویا جائے حتیٰ کہ وہ صاف ہو جائے۔ اس کے بعد غسل دینے والا اس کو سہارا دے کر بٹھائے اور نرمی سے اس کے پیٹ کو ملے۔ اگر کوئی چیز جسم سے خارج ہو تو اسے دھو ڈالے۔ جب کسی چیز کے نکلنے کا احتمال نہ ہو تو میت کو بائیں کروٹ پر لٹائے اور اس پر کافور ملا پانی ڈالے۔ کافور ملا پانی تیسری بار ڈالنا چاہیے۔ کم از کم تین بار پانی ڈالا جائے۔ اگر کوئی تین بار سے زیادہ پانی ڈالنا چاہتا ہے تو آخری بار کافور ملا پانی ڈالے لیکن جب زیادہ بار پانی ڈالنے کا ارادہ ہو تو طاق عدد کا لحاظ رکھا جائے اور طاق بار پانی ڈالنے کے بعد کافور ملا پانی ڈالا جائے۔ پہلی بار صاف پانی ڈالا جائے تا کہ جسم گیلا ہو جائے۔ دوسری بار بیری کے پتوں والا پانی ڈالا جائے تا کہ اچھی طرح صفائی ہو اور تیسری بار کافور ملا پانی ڈالا جائے۔ فتح القدیر میں ایسے ہی مذکور ہے۔

کفن میں متبرک کپڑا رکھنا سنت ہے

عن ام عطية قالت دخل علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن نغسل ابنة فقال اغسلنها ثلثا او خمسا ان رأتين ذلک بماء وسدر واجعلن في الاخر الكافور واذا فرغتن فآذنني فلما فرغنا اذناه فالقى الينا حقوه قال اشعرن اياه. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ ہم آپ ﷺ کی بیٹی کو غسل دے رہی تھیں تو رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: انہیں تین یا پانچ مرتبہ پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دینا اگر مناسب خیال کریں اور آخر میں کافور استعمال کرنا اور جب فارغ ہو جائیں تو مجھے اطلاع کر دیں۔ جب ہم فارغ ہو گئیں تو ہم نے آپ کو اطلاع دی تو آپ نے اپنا ازار ہماری طرف پھینکا اور ارشاد فرمایا: ان کو یہ کفن کے نیچے پہنا دو۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی متبرک کپڑا کفن کے اندر رکھ دیا جائے۔

غسل سے فراغت کے بعد میت کو کفن پہنایا جائے۔ مرد کا کفن تین کپڑوں لفافہ، ازار اور قمیص پر مشتمل ہوتا ہے۔ قمیص کی آستین نہیں ہوتی جس طرح کہ زندہ لوگوں کی قمیص کے لئے آستین بنائی جاتی ہیں جیسا کہ امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ:

عن ابراهيم النخعي ان النبي صلى الله عليه وسلم كفن في حلة يمانية وقميص والحلة ثوبان ازار ورداء.

ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو یمانی حلہ اور قمیص میں کفن دیا گیا۔ یمانی حلہ دو کپڑوں کے قائم مقام تھا ایک ازار اور دوسرا چادر۔

عن ام المومنين عائشة الصديقة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كفن في ثلثة اثواب سحولية من كرسف ليس فيها

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تین سوتی کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ جو سحول (یمن کا ایک دیہات) کے بنے ہوئے تھے اور ان

قميص ولا عمامة. (رواہ البخاری و مسلم) میں کوئی قمیص اور عمامہ نہیں تھا۔

اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔ شاید قمیص سے مراد یہاں وہ قمیص ہے جو زندہ لوگ پہنتے ہیں جس میں آستین اور گریبان وغیرہ ہوتے ہیں نہ کہ یہاں مطلقاً قمیص مراد ہے ورنہ تیسرا کپڑا کون سا ہوگا اور یہ حدیث ابراہیم کی مرسل حدیث کے معارض نہیں کیونکہ یہ حدیث ایسی قمیص پر محمول ہے جس میں گریبان اور آستین نہ ہو۔

سفید رنگ کا کفن افضل ہے

مستحب یہ ہے کہ کفن سفید رنگ کے سوتی کپڑے کا ہو اور خوبصورت ہو جیسا کہ وہ اپنی زندگی میں استعمال کیا کرتا تھا۔

لما روى جابر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كفن احدكم موتا كم فليحسن كفنه. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے مردوں کو کفن دے تو وہ خوبصورت کفن دے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم البسوا من ثيابكم البياض فانها من خيار ثيابكم وكفنوا فيه موتاكم ومن خيار الحاكم الاثمد فانه ينبت الشعر تيلوا البصر. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سفید کپڑے پہنو۔ یہ بہترین کپڑے ہیں اور اپنے مرنے والوں کو بھی سفید کفن پہناؤ۔ بہترین سرمہ اثمار ہے یہ بالوں کو اگاتا ہے اور نظر کو تیز کرتا ہے۔

کفن میں مہنگے اور زائد از ضرورت کپڑوں کا استعمال مکروہ ہے۔

عن امير المؤمنين على قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لاتغالوا فى الكفن فانه يسلب سلبا سريعا. (رواہ ابوداؤد)

امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مہنگے کفن نہ دیا کرو کہ وہ بہت جلد اتار لئے جاتے ہیں۔

کفن واجب میں دو کپڑے ہیں۔ دو سے کم کپڑوں میں کفن صحیح نہیں ہے۔ دو کپڑوں میں اگر کفن دیا جائے تو گناہ نہیں۔

عن عبادة بن الصامت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم خير الكفن الحلة وخير الاضحية الكبش الاقرن. (رواہ ابوداؤد)

حضرت عبادہ بن صامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ بہترین کفن حلہ اور بہترین قربانی سینگوں والا مینڈھا ہے۔

کفن کے لئے دُھلے ہوئے کپڑے استعمال کرنا

عن ام المؤمنين عائشة قالت قال ابوبكر لثوبيه الذين كان يمرض فيهما

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن دو

اغسلوهما و كفنوني فيهما فقالت عائشة الاتشتري لک جديد اقال لاالحي احوج الى الجديد من الميت. (رواہ عبدالرزاق)

کپڑوں میں بیمار پڑے تھے ان کے متعلق فرمایا کہ انہیں دھولو اور انہیں دو کپڑوں میں مجھے غسل دینا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا: کیا آپ اپنے لئے نئے کپڑے نہیں خرید لیتے؟ آپ نے فرمایا: نہیں مرنے والے کی نسبت زندہ آدمی کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دھلے ہوئے کپڑے بھی کفن کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اور نئے کپڑوں کو دھلے ہوئے کپڑوں پر کوئی فضیلت نہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ نئے اور دھلے ہوئے کپڑے برابر ہیں۔ و الله اعلم.

کفن کفایہ

اگر کفن سنت اور کفن واجب میسر نہ ہو تو پھر کفن کفایت کے طور پر ایک کپڑا ضروری ہے۔

عن ابراهيم عن عبد الرحمن بن عوف اتى بطعام و كان صائما فقال قل مصعب بن عمير وهو خير مني كفن في بردة ان غطي رأسه بدت رجلاه وان غطي رجلاه بدء رأسه وقتل حمزة وهو خير مني ثم بسط لنا من الدنيا مابسط او قال اعطينا من الدنيا ما اعطينا ولقد خشينا ان حسناتنا عجلت لنا ثم جعل يبكي حتى ترک الطعام.

(رواہ البخاری)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ ان کی خدمت میں کھانا لایا گیا۔ آپ روزہ سے تھے۔ فرمایا: حضرت مصعب بن عمیر شہید ہو گئے' وہ مجھ سے بہتر تھے' انہیں ایک ہی چادر میں کفن دیا گیا۔ اگر اس چادر سے ان کا سر ڈھانپا جاتا تو پاؤں ننگے ہو جاتے۔ حضرت حمزہ شہید ہوئے وہ بھی مجھ سے بہتر تھے۔ پھر دنیا ہمارے لئے بچھا دی گئی جس قدر بچھا دی گئی یا فرمایا: پھر دنیا سے ہمیں نوازا گیا جتنا نوازا گیا۔ ہم ڈرتے ہیں کہ ہماری نیکیاں ہمارے لئے جلدی ہو جائیں گی (یعنی نیکیوں کا صلہ ہمیں اسی دنیا میں مل جائے گا) پھر آپ رونے لگے اور کھانا چھوڑ دیا۔

مرد کو کفن پہنانے کا طریقہ

مرد کو کفن دینے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے کفن کو خوشبو سے دھونی دی جائے اور پھر اس پر مختلف قسم کی عطریات سے تیار شدہ مرکب خوشبو کا چھڑکاؤ کیا جائے اس کے بعد لفافہ بچھایا جائے پھر ازار کی چادر بچھائی جائے۔ یہ چادریں سر سے لے کر پاؤں تک لمبی ہونی چاہئیں پھر میت کو قمیص پہنائی جائے اور قمیص کندھوں سے پاؤں تک ہونی چاہئے۔ اگر ہو سکے تو ایک دفعہ پھر خوشبو کا استعمال کیا جائے اور سجدہ میں جو اعضاء زمین پر لگتے ہیں ان پر کافور لگایا جائے۔ سجدہ والے اعضاء میں پیشانی' ناک' دونوں ہاتھ' دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں خصوصاً انگلیاں شامل ہیں پھر میت کو ازار پر لٹایا جائے اور اس پر ازار کی چادر کو پہلے بائیں طرف سے اور پھر دائیں طرف سے لپیٹ دیا جائے اسی طرح لفافہ کی چادر کو بھی پہلے بائیں اور پھر دائیں طرف سے میت پر لپیٹا جائے اور کفن کو باندھ دیا جائے تاکہ

ہوا سے اڑتا نہ رہے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اگر میت محرم ہے (یعنی حالتِ احرام میں ہے) تو غسل اور کفن کے وقت اسے خوشبو نہ لگائی جائے اور نہ ہی اس کے سر کو ڈھانپا جائے کیونکہ محرم کے احکام اس پر ابھی جاری ہیں جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

عن عبد الله بن عباس قال ان رجلا کان مع النبی صلی الله علیه وسلم فوقصته ناقته وهو محرم فمات فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اغسلوه بماء وسدر وکفنوه فی ثوبیه ولا تمسوه بطیب ولا تخمروا رأسه فانه یبعث یوم القیمة ملبیا. (رواہ البخاری ومسلم)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ اس کے اونٹ نے اسے پاؤں سے لتاڑ دیا اور وہ حالت احرام میں فوت ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور انہیں دو کپڑوں میں اسے کفن دو۔ اسے خوشبو نہ لگانا اور نہ ہی اس کے سر کو ڈھانپنا کیونکہ قیامت کے دن یہ تلبیہ (لبیک اللھم لبیک) کہتے ہوئے اٹھے گا۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم خاص اس شخص کے لئے دیا تھا۔ یہ عام تشریعی حکم نہیں تھا۔

عورت کا کفنِ سنت

عورتوں کے لئے کفن سنت پانچ کپڑے ہیں۔ ایک درع (عورت کی قمیص) ازار' لفافہ' خمار اور خرقہ۔ پانچواں کپڑا عورت کے پستانوں کے اوپر باندھا جاتا ہے۔

عن لیلی بنت فائق قالت کنت فیمن غسل ام کلثوم بنت رسول الله صلی الله علیه وسلم فکان اول ما اعطانا الحقائم الدرع ثم الخمار الملحفة ثم ادرجت بعد فی الثوب الاخر. (رواہ ابوداؤد)

لیلیٰ بنت فائق رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جو عورتیں غسل دے رہی تھیں میں بھی ان میں شامل تھی۔ سب سے پہلا کپڑا جو حضور ﷺ نے ہمیں عطا کیا وہ آپ کا استعمال شدہ کپڑا تھا پھر آپ نے قمیص (جسے عربی میں درع المرأۃ کہتے ہیں) پھر خمار اور پھر بڑی چادر دی پھر اس کے بعد انہیں ایک اور کپڑے میں لپیٹا گیا۔

فتح القدیر میں بھی یہی مذکور ہے۔ ابن الھمام (مصنف فتح القدیر) نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ میت کا ازار زندہ آدمی کے ازار کی مانند ہوتا ہے۔ اس کا پاؤں تک آنا ضروری ہے لیکن حدیث پاک میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ازار کا استعمال شدہ ہونا ضروری ہے۔ ہاں اگر ازار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استعمال شدہ ہو تو بہتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی لختِ جگر کے لئے جو ازار دیا وہ اتنا بڑا تھا کہ ان کا سر اور پاؤں دونوں چھپ گئے تھے۔

اگر عورت کو صرف تین کپڑوں میں کفن دیا جائے تو بھی جائز ہے یعنی دو کپڑے اور ایک خمار جیسا کہ ہدایہ شریف میں ہے۔ فتح القدیر خلاصہ سے نقل کرتے ہیں کہ دو کپڑوں سے مراد ازار اور لفافہ ہیں اور یہ کفن کفایہ ہے۔ عورت کو اس سے کم کپڑوں میں کفن دینا مکروہ ہے۔ جس طرح مرد کو دو کپڑوں سے کم میں کفن دینا مکروہ ہے۔ ہاں مجبوری ہو تو الگ بات ہے۔

عورت کو کفن پہنانے کا طریقہ

عورت کو کفن پہنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قمیص پہنائی جائے گی اور اس پر خوشبو کی دھونی دی جائے گی پھر اس کے بالوں کو دو حصوں میں کر کے اس کے سینے پر قمیص کے اوپر رکھا جائے گا۔ علماء نے یہی طریقہ بتایا ہے۔
حضرت ام عطیہ کی حدیث میں ہے کہ ہم نے حضرت ام کلثوم کی تین مینڈھیاں بنا کر ان کے پیچھے ڈال دیں۔ (یعنی سینے پر نہ رکھا) اسے صحیحین میں روایت کیا گیا ہے پھر اس کے سجدہ کی جگہوں پر کافور لگایا جائے پھر قمیص کے اوپر خمار پہنایا جائے۔ اس کے ازار اور ازار کے بعد لفافہ لپیٹا جائے اور آخر میں کفن کے اوپر سے کپڑے (خرقہ) کے ساتھ پستانوں سے لے کر ناف تک کے حصے کو عرضاً باندھ دیا جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ خرقہ سے گھٹنوں تک کا حصہ باندھا جائے۔
کفن کا یہ طریقہ عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے ہے۔

شہید کا کفن

شہید کا کفن وہی کپڑے ہیں جن میں وہ قتل ہوا۔ اس سے یہ کپڑے نہیں اتارے جائیں گے۔ ہاں ایسی چیزیں جو کفن کی جنس سے نہیں انہیں اتارا جائے گا جیسے جسم پر سجا ہوا ہتھیار، پوستین، ٹوپی وغیرہ۔

عن ابن عباس قال امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقتلى احد ان ينزع منهم الحديد والجلود وان يدفنوا بدمائهم وثيابهم. (رواہ ابوداؤد)	حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے مقتولوں کے بارے یہ حکم صادر فرمایا کہ: ان سے لوہا (یعنی ہتھیار) اور چمڑہ اتار دو اور انہیں ان کے خون اور کپڑوں سمیت دفن کر دو۔

اگر کفن سے کچھ کپڑا کم ہو تو اس کا اضافہ کر کے کفن پورا کیا جائے۔

نمازِ جنازہ

میت کو غسل اور کفن دینے کے بعد اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے، یہ نماز فرض کفایہ ہے اور اس پر قطعی اجماع ہے۔ مقروض کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم موجود ہے کہ اپنے دوست کی نمازِ جنازہ پڑھو۔ یہ نماز درحقیقت میت کی تکریم اور اس کے حق کو پورا کرنے کی غرض سے ہے۔ جب یہ حق چند آدمیوں کی وساطت سے ادا ہو جائے گا تو سبھی لوگ اس فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

شرائطِ صحت

نمازِ جنازہ کی صحت کے لئے میت کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ خواہ اس کا اسلام بالتبع ہو مثلاً چھوٹا بچہ جو نا سمجھ ہے اگر اس کے والدین میں سے کوئی مسلمان ہے تو اس کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ دوسری شرط میت کو غسل دے کر صاف کرنا ہے۔ تیسری شرط امام اور مقتدیوں کے سامنے ہونا ہے' غائبانہ نمازِ جنازہ جائز نہیں اسی طرح جب جنازہ کسی سواری پر رکھا ہو تو بھی جائز ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت نجاشی کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی حالانکہ ان کا وصال حبشہ میں ہوا اور وہ وہیں دفن ہوئے تو اس کے بارے دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سے تمام حجابات اٹھا دیئے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجاشی کے جنازہ کو سامنے پایا اور دوسرا قول یہ ہے کہ غائبانہ نمازِ جنازہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

اگر میت غسل کے بغیر دفن ہو جائے تو اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور دو آخری شرطیں (طہارت اور امام کے سامنے ہونا) اس سے ساقط ہو جائیں گی۔

نمازِ جنازہ پڑھانے کا زیادہ حقدار

نمازِ جنازہ پڑھانے کا زیادہ حق خلیفہ کو ہے' اگر وہ حاضر ہے تو وہ پڑھائے پھر قاضی اور پھر میت کا ولی۔

امام شافعی اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں نیز امام ابوحنیفہ کی ایک روایت میں ہے کہ سب سے زیادہ حقدار میت کا ولی ہے کیونکہ نمازِ جنازہ کا حکم ولایت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے غیر ولی کے ساتھ اس کا تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا جیسے نکاح وغیرہ میں ولی کو زیادہ حق ہوتا ہے۔

اس نظریہ کو اس اثر سے تقویت ملتی ہے جو فتح القدیر میں ہے۔

روی ان الحسین بن علی قدم سعید بن العاص لمامات الحسن رضی اللہ عنہ وقال لو لا السنۃ لما قدمتک وسعید کان والیا بالمدینۃ والولی.

روایت ہے کہ جب حضرت امام حسن کا وصال ہوا تو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سعید بن العاص کے پاس تشریف لے گئے جو ان دنوں مدینہ طیبہ کے والی تھے۔ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر سنت نہ ہوتی تو میں کبھی بھی آپ کو آگے نہ کرتا۔

عصبات (باپ کی طرف سے رشتہ دار) اولیاء کی ترتیب وہی ہے جو وراثت میں ہے۔ ہاں اگر میت کے والد ر بیٹے موجود ہو تو سب سے زیادہ مستحق یہ لوگ ہیں۔ ائمہ کا اتفاق ہے کہ والد کا حق سب سے زیادہ ہے۔ ایک وایت ملتی ہے جس میں امام محمد علیہ الرحمہ کا اختلاف ذکر کیا گیا ہے۔

نمازِ جنازہ کا اعادہ

اگر کسی اجنبی نے جنازہ پڑھا دیا اور بعد میں ولی آ گیا تو وہ نمازِ جنازہ دوبارہ پڑھ سکتا ہے کیونکہ وہ امامت کا زیادہ حقدار تھا لیکن دوسرا کوئی نمازِ جنازہ کا اعادہ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ زیادہ حقدار نہیں۔ میت کا حق ادا ہو چکا ہے لہٰذا اب نمازِ جنازہ فرض نہیں نفل ہے اور نفلی نمازِ جنازہ جائز نہیں ہے۔

نمازِ جنازہ کی چار تکبیریں ہیں

نمازِ جنازہ کی چار تکبیریں ہیں اور ہر تکبیر ایک رکعت کے قائم مقام ہے۔ اگر کوئی شخص نمازِ جنازہ میں مسبوق بنتا ہے تو وہ امام کے ساتھ تکبیر کہے گا اور جو تکبیریں رہ گئی ہیں وہ بعد میں کہے گا کیونکہ مسبوق بقیہ نماز بعد میں پڑھتا ہے اسی طرح تکبیریں بھی بعد میں کہے گا۔

چار تکبیروں پر اجماع ہے اور یہ اجماع حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں منعقد ہوا۔ نیز حدیث پاک سے بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار تکبیریں کہیں اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری نمازِ جنازہ تھی۔

فقد روی الامام محمد ان الناس کانوا یصلون علی الجنازة خمسا وستا واربعا حتی قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم کبر وکذلک فی ولایة ابی بکر نِ الصدیق ثم ولی عمر بن الخطاب ففعلوا ذلک فقال لھم عمر انکم معشر اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم متی تختلفون یختلف الناس بعدکم والناس حدیث عھد بالجاھلیة فاجمعوا علی شئی یجتمع علیه من بعدکم فاجتمع رأی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ینظرو لاخر جنازة کبر علیھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی قبض فیاخذون به ویرفضون ماسواہ ووجدوا آخر جنازة کبر علیه النبی صلی اللہ علیہ وسلم اربعا۔ (رواہ احمد)

امام محمد روایت کرتے ہیں کہ لوگ نمازِ جنازہ میں چار تکبیریں کہتے تھے حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا۔ اس کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں بھی یہی طریقہ رائج رہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو بھی یہی معمول رہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے فرمایا: تم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہو جب تم اختلاف کرو گے تو تمہارے بعد لوگوں میں بھی اختلاف رہے گا۔ لوگ عہد جاہلیت کے قریب ہیں۔ کسی چیز پر اکٹھے ہو جاؤ تا کہ بعد والے لوگ اس پر جمع ہو جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام اس بات پر متفق ہو گئے کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری نمازِ جنازہ دیکھیں کہ آپ ﷺ نے اس میں کتنی تکبیریں کہیں حتیٰ کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔ تا کہ وہ اس آخری عمل کو دیکھیں اور اس کے سوا باقی سب طریقوں کو چھوڑ دیں۔ انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری نمازِ جنازہ وہ تھا جس میں آپ ﷺ نے چار تکبیریں کہیں۔

عن ابی وائل قال جمع عمر الناس فاستشار هم فی التکبیر علی الجنازة فقال بعضهم کبر النبی صلی الله علیه وسلم سبعا وقال بعضهم خمسا وقال بعضهم اربعا فجمع عمر علی اربع.

ابی وائل سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا اور نمازِ جنازہ کی تکبیروں کے بارے میں مشورہ کیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ ﷺ نے سات تکبیریں کہیں۔ بعض نے کہا کہ آپ نے پانچ کہیں۔ بعض لوگوں نے چار تکبیروں کی بات کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں چار پر جمع فرما دیا۔

اگر امام چار سے زائد تکبیریں کہنے کا قائل ہے اور ایسے امام کی کوئی ایسا آدمی اقتداء کرتا ہے جو چار تکبیروں کا قائل ہے تو مقتدی زائد تکبیروں میں امام کی اقتداء نہ کرے۔ اس کے برعکس امام زفر فرماتے ہیں کہ زائد تکبیروں میں بھی اقتداء ضروری ہے۔ زائد تکبیروں میں امام کی اقتداء اس لئے ضروری نہیں کہ یہ چیز اجماع کے خلاف ہے لیکن عیدین کی تکبیروں میں اقتداء ضروری ہے کیونکہ وہ اجتہادی مسئلہ ہے۔

نمازِ جنازہ میں قرأت نہیں کی جاتی

نمازِ جنازہ میں قرأت نہیں کی جاتی۔

عن ابی هریرة قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا الدعاء. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا۔ جب تم میت کی نمازِ جنازہ پڑھو تو اس کے لئے خلوصِ دل سے دعا کرو۔

عن نافع قال ان عبد الله بن عمر کان لایقرء فی الصلوة علی الجنازة.

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نمازِ جنازہ میں قرأت نہیں کرتے تھے۔ (رواہ مالک)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنازہ کی نماز میں سورت فاتحہ پڑھی جائے گی کیونکہ ایک حدیث میں ہے۔

عن طلحة بن عبد الله بن عوف قال صلیت خلف ابن عباس علی الجنازة فقرء بفاتحة الکتاب وقال لیعلموا انها سنة.

(رواہ البخاری)

طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھی تو آپ نے سورت فاتحہ پڑھی اور فرمایا: میں نے یہ سورت اس لئے پڑھی ہے تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔

اسے امام بخاری علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

عن ابی امامة قال السنة فی الصلوة علی الجنازة ان یقرء فی التکبیرة الاولیٰ بام القرآن مخافة ثم یکبر ثلثا والتسلیم عند

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نمازِ جنازہ کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلی رکعت میں آہستہ سورت فاتحہ پڑھی جائے پھر تین تکبیریں کہی جائیں اور آخر میں سلام

الاخیرۃ. (رواہ النسائی) پھیر دیا جائے۔

حنفی علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ فاتحہ شریف کو اس نیت سے نہیں پڑھا گیا کہ یہ فاتحۃ الکتاب ہے بلکہ اس لئے پڑھا گیا کہ یہ ثناء اور دعا ہے اور ہمارے نزدیک ثناء اور دعا کی نیت سے نمازِ جنازہ میں سورت فاتحہ پڑھنا صحیح ہے۔

نمازِ جنازہ پڑھنے کا طریقہ

نمازِ جنازہ پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورت فاتحہ بھی پڑھنا ضروری ہے۔ دوسری تکبیر کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھے گا کیونکہ درود پاک قبولیت دعا کی شرائط میں سے ہے پھر تیسری تکبیر کہے گا اور دعا کرے گا۔ چوتھی تکبیر کہہ کر دائیں اور بائیں سلام پھیر دے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف ایک سلام کافی ہے۔

نمازِ جنازہ میں کوئی خاص دعا نہیں ہے جو دعا چاہے مانگ سکتا ہے' ہاں ماثورہ دعائیں پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم اذا صلی علی الجنازة قال اللهم اغفرلحينا وميتنا وشاهدنا وغائبنا وصغيرنا وكبيرنا وذكرنا وانثانا اللهم من احييته منا فاحيه علی الاسلام ومن توفيته منا فتوفه علی الايمان. (رواہ ابوداؤد والترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نمازِ جنازہ پڑھتے تو یہ دعا کرتے: اے اللہ! ہمارے زندوں' مردوں' یہاں پر موجود' غیر موجود' چھوٹے بڑے' مردوں اور عورتوں کو بخش دے۔ اے اللہ! ہم میں سے جو جئے تو اُسے اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے جسے موت آئے تو اُسے ایمان پر موت دے۔

ابوداؤد علیہ الرحمہ کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں۔ **اللهم لا تحرمنا ولا تضلنا بعده.**

عن عوف قال صلی الله عليه وسلم علی جنازة فحفظنا من دعائه اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد ونقه من الخطايا كما ينقی الثوب الابيض من الدنس وابدله دارا خيرا من داره واهلا خيرا من اهله وزوجا خيرا من زوجه واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار قال عوف حتی تمنيت ان اكون ذلك اعطيت. (رواہ مسلم)

حضرت عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھی تو ہم نے آپ ﷺ کی اس دعا کو یاد کر لیا۔ اے اللہ! اسے بخش دے۔ اس پر رحم فرما۔ اس سے درگزر کر۔ اس کو معاف فرما۔ اسے اپنی جناب میں عزت عطا فرما۔ اس کی قبر کو کشادہ کر اور اسے پانی' برف اور اولے سے غسل دے۔ اور اسے گناہوں سے پاک کر جیسے سفید کپڑا میل کچیل سے پاک کیا جاتا ہے۔ اس کے بدلے اُسے بہتر گھر عطا کر اور ان گھر والوں کی نسبت بہتر گھر والے عطا کر۔ اور اس کی بیوی سے بہتر بیوی دے۔ اسے قبر کے عذاب سے اور جہنم کی آگ سے پناہ میں رکھ۔ حضرت عوف

فرماتے ہیں کہ میں نے تمنا کی کہ کاش یہ میت میں ہوتا۔

عن ابی سعید المقبری قال سألت ابا هريرة كيف تصلى على الجنازة فقال ابوهريرة انا لعمر الله اخبرك اتبعها من عند اهلها فاذا وضعت كبرت وحمدت الله وصليت على نبيه ثم اقول اللهم عبدك وابن عبدك وابن امتك كان يشهدان لا اله لا انت وان محمدا عبدك ورسولك وانت اعلم به اللهم ان كان محسنا فزد في احسانه وان كان مسيئا فتجاوز عن سيئاته الهم لاتحرمنا اجره ولا تفتنا بعده. (مؤطاامام مالک)

حضرت ابوسعید المقبری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ تم نمازِ جنازہ کیسے پڑھتے ہو تو انہوں نے فرمایا: اللہ تجھے زندگی دے میں گھر سے ہو آؤں پھر آپ کو بتاتا ہوں (جب آپ گھر سے ہو کر تشریف لائے تو بیان فرمایا) جب جنازہ رکھ دیا جاتا ہے تو میں تکبیر کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں۔اس کے نبی ﷺ پر درود پڑھتا ہوں اور اس کے بعد یہ دعا پڑھتا ہوں۔اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے۔ تیرے بندے کا بیٹا۔تیری خادمہ کا لختِ جگر ہے یہ گواہی دیتا رہا ہے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد تیرا بندہ اور رسول ہے تو خوب جانتا ہے۔الٰہی اگر تو اس کے ساتھ احسان کرنا چاہتا ہے تو خوب احسان فرما اگر اس کو سزا دینا چاہتا ہے تو اس کے گناہوں سے درگزر فرما۔الٰہی ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ رکھو اور اس کے بعد آزمائش میں نہ ڈال۔

عن ابی هريرة قال سمعته صلى الله عليه وسلم يقول اللهم انت ربها وانت خلقتهما وانت هديتها الى الاسلام وانت قبضت روحها وانت اعلم سرها وعلانيتها جئنا شفعاء فاغفرلها. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا کرتے سنا۔الٰہی تو اس کا رب ہے۔تو نے اسے پیدا کیا تو نے اسے اسلام کی طرف رہنمائی کی۔تو نے اس کی روح کو قبض کیا تو اس کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ہم اس کی شفاعت کرنے آئے ہیں اسے بخش دے۔

نابالغ کی نمازِ جنازہ

بچے کے لئے استغفار نہیں کیا جائے گا بلکہ یوں کہا جائے گا۔

اللهم اجعله لنا اجرا وذخرا واجعله لنا شافعا ومشفعا.

امام العارفین حضرت حسن بصری قدس سرہ بچے کی نمازِ جنازہ پڑھتے تو سورت فاتحہ پڑھتے اور یہ دعا کرتے۔

اللهم اجعله لنا سلفا وفرطا وذخرا واجرا. (رواہ البخاری)

یہ حدیث معلق ہے۔

جو بچہ مردہ پیدا ہوا ہو

ایسا بچہ جو مردہ پیدا ہو اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور جو بچہ زندہ پیدا ہوا اور اس میں زندگی کے آثار دیکھے گئے پھر وہ فوت ہو گیا تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔

قد روی جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الطفل لایصلی علیہ ولایرث ولایورث حتی یستھل. (رواہ الترمذی)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ بچہ جس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی نہ تو وہ وارث ہوگا اور نہ ہی کوئی اس کا وارث ہوگا جب تک کہ پیدائش کے وقت روتا نہیں۔

نمازِ جنازہ میں امام کہاں کھڑا ہوگا ؟

امام میت کے سینے کے سامنے کھڑا ہوگا کیونکہ دل سینے میں ہوتا ہے اور یہی نورِ ایمان کا مقام ہے۔ اس بارے احادیث میں میں نے اختلاف پایا ہے۔

فعن ابی غالب قال صلیت خلف انس علی جنازۃ فقام حیال صدرہ.

حضرت ابی غالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھی وہ میت کے سینے کے برابر کھڑے ہوئے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے امام احمد علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت اس کے منافی نہیں ہے۔

قال صلیت وراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی امرأۃ ماتت فی نفاسھا فقام علیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند وسطھا.

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں ایک عورت کی نمازِ جنازہ پڑھی جو نفاس میں فوت ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ اس کے وسط کے سامنے کھڑے ہوئے۔

کیونکہ سینہ اور وسط میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ حضرت غالب کی روایت سے یہ حدیث معارض ہے۔

عن ابی غالب قال کنت فی سکۃ المربد فسمرت جنازۃ عبد اللہ بن عمر فتبعتھا فاذا انا برجل علیہ کساء رقیق وعلی رأسہ خرقۃ نقیۃ من الشمس فقلت من ھذا الدھقان فقیل ھذا انس ابن مالک فلما وضعت الجنازۃ قام انس فصلی علیھا وانا خلفہ لایحول بینی وبینہ شئی فقام عند

حضرت ابو غالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں سکۃ المربد (جگہ کا نام) میں تھا کہ ایک جنازہ نکلا جس کے ساتھ بہت لوگ تھے۔ لوگوں نے کہا یہ عبداللہ بن عمر کا جنازہ ہے۔ یہ سن کر میں بھی پیچھے چل پڑا تو میں نے ایک شخص کو دیکھا باریک کمبل اوڑھے ہوئے ایک چھوٹی راس کے گھوڑے پر سوار اور اپنے سر پر دھوپ سے بچنے کے لئے ایک کپڑے کا ٹکڑا رکھے ہوئے ہے۔ میں نے

رأسه وكبر اربع تكبيرات لم يطل ولم يسرع ثم ذهب فقعد فقيل يا ابا حمزة المرأة الانصارية فقربوها وعليها نعش اخضر فقام عند عجز تها فصلي عليها نحو صلوته على الرجل ثم جلس فقال له العلاء بن زياد يا ابا حمزة هكذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي على الجنائز كصلوتك هذه تكبيرا اربعا ويقوم عند رأس الرجل وعجزة المرأة قال نعم.

(رواہ ابوداؤد)

پوچھا یہ زمیندار کون ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ حضرت انس بن مالک ہیں۔ جب جنازہ رکھا گیا تو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے۔ میں آپ کے پیچھے تھا۔ ان کے اور میرے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ آپ میت کے سر کے برابر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے چار تکبیریں کہیں نہ تو انہیں طول دیا اور نہ ہی بہت جلدی کی پھر جا کر بیٹھ گئے۔ آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ اے ابوحمزہ (آپ کی کنیت تھی) ایک انصاری عورت (یعنی اس کا نمازِ جنازہ پڑھا دیجئے) لوگ اس عورت کو قریب لائے۔ اس پر سبز رنگ کی چادر بچھی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی سرین کے برابر کھڑے ہوئے اور اس کی بھی اسی طرح نمازِ جنازہ پڑھی جس طرح مرد کی نمازِ جنازہ پڑھی تھی پھر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھ گئے۔ حضرت علاء بن زیاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ اے ابوحمزہ! کیا رسول اللہ ﷺ یونہی نمازِ جنازہ پڑھا کرتے تھے جس طرح آپ نے نمازِ جنازہ پڑھی ہے یعنی چار تکبیریں کہتے تھے اور مرد کے سر کے برابر اور عورت کی سرین کے برابر کھڑے ہوتے تھے۔ آپ نے فرمایا: ہاں

امام شافعی اسی حدیث کو لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امام مرد کے سر اور عورت کی سرین کے برابر کھڑا ہو۔

یہ روایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کے معارض ہے۔ علماء کے نزدیک معنی پہلی حدیث کو راجح کر دیتا ہے۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ ابوغالب کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عورت کی سرین کے برابر کیوں کھڑے ہوئے تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس لئے یہاں کھڑے ہوئے کہ عورت پر کفن کے اوپر کپڑا پڑا ہوا نہیں تھا۔ وہ اس لئے سرین کے برابر کھڑے ہوتے تھے تا کہ لوگوں سے یہ حصہ پوشیدہ رہے۔ احناف کہتے ہیں کہ ضرورتاً سرین کے برابر کھڑا ہونا ایک عذر تھا لیکن اسے دائمی سنت خیال نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سے پہلے جو احادیث گزری ہیں ان میں یہ ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے وہی قابل عمل ہوں گی۔

شہید پر نمازِ جنازہ

ہر مسلمان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی خواہ وہ شہید ہو یا نہ ہو۔ امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ شہید کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاتی کیونکہ تلوار تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔

و قد روی جابر انه صلی الله علیه وسلم لم یصل علی قتلی احد. (رواہ البخاری)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے شہداء کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔

ہماری دلیل یہ ہے۔

روی عطاء بن رباح قال صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم علی قتلی احد. (امام ابوداؤد و مرسلاً)

عطاء بن رباح سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے شہداء کی نمازِ جنازہ پڑھی۔

واقدی نے بھی اسے مغازی میں روایت کیا ہے۔ یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے معارض ہے۔ فتح القدیر میں براوۃ حکم منقول ہے۔

عن جابر قال فقد رسول الله صلی الله علیه وسلم حمزة حین قام الناس من القتال فقال رجل رأیته عند تلک الشجرة فجاء رسول الله صلی الله علیه وسلم نحوه فلما رآه ورأی مامثل به شهق وبکی فقام رجل من الانصار فرمی علیه ثوب جئی بحمزة فصلی علیه ثم بالشهدا فیوضعون الی جانب حمزة فیصلی علیهم ثم یرفعون وترک حمزة حتی صلی علی الشهداء کلهم وقال حمزة سید الشهداء عند الله یوم القیمة.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایتہے کہ جب لڑائی ختم ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ پایا۔ ایک آدمی نے کہا: میں نے انہیں اس درخت کے پاس دیکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس درخت کی طرف چل دیئے۔ جب آپ ﷺ کی نظر پڑی اور دیکھا کہ ان کا مثلہ کیا گیا ہے تو آپ ﷺ روئے۔ ایک انصاری نے اٹھ کر حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کپڑا ڈال دیا پھر حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لایا گیا اور آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور ان کے بعد باقی شہداء کو لایا گیا۔ انہیں حضرت حمزہ کے ساتھ رکھا گیا اور آپ ﷺ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی پھر ان کو اٹھا لیا گیا اور حضرت حمزہ کو وہیں چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ حضور ﷺ نے تمام شہداء کی نمازِ جنازہ پڑھی اور فرمایا: حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور شہیدوں کے سردار ہوں گے۔

حاکم کہتے ہیں کہ اس واقعہ کی سند صحیح ہے اور شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔ فتح القدیر کے مصنف کے بقول اس حدیث کے بعض راویوں میں کلام ہے لیکن پھر بھی یہ حدیث حسن کے درجہ سے نہیں گرتی۔ فتح القدیر میں امام احمد کے حوالے سے موجود ہے۔

عن ابن مسعود قال کان النساء یوم احد خلف المسلمین یجهزن علی جرحی المشرکین الی ان قال فوضع النبی صلی الله علیه وسلم حمزة وجیئ برجل من

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد میں عورتیں مسلمانوں کے پیچھے تھیں جو انہیں مشرکین کے قتل پر ابھار رہی تھیں، نبی کریم ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کو رکھا۔ ایک انصاری کی لاش

الانصار فوضع الی جنبه فصلی علیه فرفع الانصاری وترک حمزة ثم جیء باخر فوضع الی جنب حمزة فصلی علیه وترک حمزة صلی علیه یومئذٍ بسبعین صلوة.

لائی گئی اور اسے ان کے پہلو میں رکھ دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس انصاری کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ انصاری کو اٹھا لیا گیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چھوڑ دیا گیا پھر ایک اور شہید کو لایا گیا اور اسے بھی حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پہلو میں رکھا گیا۔ حضور ﷺ نے اس شہید کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ اس طرح ستر آدمیوں کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسی جگہ چھوڑ دیا گیا۔

انہوں نے اس حدیث کو بھی حسن کہا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ تلوار تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ شہید کی نمازِ جنازہ ہی نہ پڑھی جائے۔ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں لیکن ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

اگر ایک سے زائد جنازے ہوں؟

جب ایک سے زائد جنازے اکٹھے ہو جائیں تو تمام کی نمازِ جنازہ الگ الگ پڑھی جائے۔ اگر ایک بار ہی تمام کی نمازِ جنازہ پڑھ دی گئی تو جائز ہے۔ ایسی صورت میں انہیں ایک ہی لائن میں رکھا جائے گا (یعنی ایک شخص کے پاؤں کی سمت دوسرے شخص کا سر ہوگا اس طرح ایک لمبی صف بنے گی) اور امام جو ان میں سے افضل ہے اس کے سامنے کھڑا ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ لائن قبلہ کی طرف ہو (اس طرح تمام میتوں کے سر اور پاؤں برابر ہوں گے) ان کی ترتیب وہی ہوگی جو ترتیب زندگی میں نماز کے دوران ہوتی ہے۔ امام کے سامنے افضل ترین آدمی ہو اس کے بعد پھر افضل۔ اس ترتیب سے تمام آدمی ایک ہی قطار میں قبلہ رو رکھ دیئے جائیں حتیٰ کہ جو ان میں سب سے مفضول ہے وہ قبلہ کے زیادہ قریب ہو۔ نماز پڑھنے والے یوں صفیں بنائیں کہ پہلے مرد کھڑے ہوں' پھر بچے' پھر ہیجڑے اور ان کے پیچھے عورتیں اور ان عورتوں کے پیچھے قریب البلوغت بچیاں۔ فتح القدیر میں ایسے ہی مذکور ہے۔

عن نافع ان عمر صلی علی تسع جنائز جمیعا فجعل الرجال یلون الامام والنساء یلین القبلة فصفهن صفا واحدا ووضعت جنازة ام کلثوم بنت علی امرأة عمر بن الخطاب وابن یقال له زید وضعا جمیعا والامام یومئذسعید بن العاص وفی الناس ابن عباس وابوهریرة وابو سعید وابو قتادة فوضع الغلام ممایلی الامام فقال قدانکرت

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اکٹھے نو جنازے پڑھے۔ مردوں کی لاشیں امام کی طرف تھیں اور عورتوں کی لاشیں قبلہ کی طرف تھیں۔ عورتوں کی صف ایک ہی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو عمر فاروق کی بیوی تھیں ان کا جنازہ رکھا گیا اور ان کا بیٹا جن کا نام زید تھا ان تمام کو رکھا گیا۔ ان دنوں امام سعید بن العاص تھے اور لوگوں میں ابن عباس' ابو ہریرہ' ابوسعید' ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ

ذلک فنظرت الی ابن عباس وابی هریرة وابی سعید وابی قتادة فقلت ما هذا قالوا هي سنة. (رواہ النسائی)

عنہم تھے۔ غلام کو امام کی طرف رکھا گیا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اسے برا خیال کیا اور ابن عباس، ابو ہریرہ، ابو سعید اور ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیکھا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سنت ہے۔

عن عمار مولى الحارث قال شهد جنازة ام كلثوم وابنها فجعل الغلام ممايلي الامام فانكرت ذلك وفي القوم ابن عباس وابو قتادة وابو سعيد وابوهريرة فكلهم قالوا ان هذه سنة. (رواہ النسائی)

حارث کے (آزاد کردہ) غلام عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ام کلثوم (بنت علی المرتضیٰ) اور ان کے بیٹے کا جنازہ لایا گیا اور غلام کو امام کی طرف رکھا گیا۔ میں نے اسے برا خیال کیا۔ ان لوگوں میں حضرات ابن عباس، ابو قتادہ، ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی موجود تھے۔ ان تمام نے کہا کہ یہ سنت ہے۔

جامع الاصول میں ہے کہ رزین نے یہ بھی کہا ہے کہ نمازِ جنازہ میں مرد امام کی طرف ہوگا لیکن اگر ایک سے زائد لوگوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنا مقصود ہو تو مرد قبلہ کی طرف ہوگا اور اس کے بعد نماز کی ترتیب کے مطابق آخر میں عورت کو رکھا جائے گا۔ یہی احناف کا مذہب ہے۔

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا

نمازِ جنازہ مسجد میں نہیں پڑھا جائے گا کیونکہ مسجدیں فرض نمازوں کے لئے تعمیر کی گئی ہیں۔

عن ابي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى على ميت في المسجد فلا اجر له. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے نمازِ جنازہ مسجد میں ادا کی تو اس کو اس کا کچھ اجر نہیں ملے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ اس کے لئے کچھ نہیں۔ جامع الاصول میں ہے کہ ایک روایت میں فلا شيء عليه له کے الفاظ آئے ہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ یہ مشہور حدیث کے معارض نہیں ہوسکتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔

لانه لما توفي سعد بن وقاص قالت عائشة ادخلوا به المسجد فانكر ذلك عليها فقالت والله لقد صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم على ابني بيضاء في المسجد سهيل واخيه. (رواہ مسلم)

کیونکہ جب سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ نمازِ جنازہ مسجد میں لے جاؤ۔ لوگوں نے ان کی بات کو اچھا خیال نہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ بخدا میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ بیضاء کے دو بیٹوں سہیل اور اس کے بھائی کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھائی۔

ان کی بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ لوگوں نے اسے معیوب خیال کیا اور کہا کہ جنازوں کو مسجد میں داخل

نہیں کیا جاتا۔

یہ حدیث ہمارے نظریہ کو ثابت کرتی ہے' ہمارے خلاف دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہ گفتگو وہ لوگ کر رہے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی جنازہ کی نماز مسجد میں ادا نہیں ہوتی تھی۔ رہا بیضاء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بیٹوں کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی گئی تو یہ حکایت حال ہے جو دلیل نہیں بن سکتی۔ ہوسکتا ہے وہ کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں پڑھی گئی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد مسجد سے باہر پڑھنے کو معمول بنایا گیا ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث پر یہ جرح کی گئی ہے کہ اس کی سند میں صالح ہیں جو توءمہ کے غلام ہیں۔ آخری عمر میں ان کا حافظہ اچھا نہیں رہا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ صالح ثقہ ہیں۔ بقول نسائی علیہ الرحمہ کے ابن معین نے صالح کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے لیکن وہ موت سے پہلے گفتگو خلط ملط کر دیتے تھے۔ اس لئے کمزوری سے پہلے جن لوگوں نے ان سے احادیث روایت کی ہیں وہ حجت قرار پائیں گی اور تمام لوگ جانتے ہیں کہ ابن ابی ذئب نے صالح سے کمزوری سے پہلے روایت کی ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ اگر کسی کو اس کے سنت ہونے میں اختلاف ہے تو ان کا قول باطل ہے اور ان کی دلیل اس کا موجب نہیں کیونکہ خلق کثیر کا وصال ہوا لیکن کسی کی نمازِ جنازہ مسجد میں ادا نہیں کی گئی۔ اگر مسجد میں نمازِ جنازہ کی ادائیگی سنت ہوتی تو لوگ کبھی بھی اس کا انکار نہ کرتے۔ اگر اختلاف اباحت میں ہے تو ان کے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ مباح اور ہمارے نزدیک مکروہِ تحریمی ہے۔

مسجد میں نمازِ جنازہ کا مباح ہونا حق ہے کیونکہ مکروہِ تحریمی کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے کرنے پر وعید آئی ہو جبکہ حدیث پاک میں اجر کی نفی ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ مباح ہے اور ہمارے نزدیک مکروہِ تنزیہی ہے۔ سو اب کوئی اختلاف نہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں مسجد میں نمازِ جنازہ جائز ہے اور مسجد سے باہر پڑھنا افضل ہے جیسا کہ خطابی کا قول ہے کیونکہ مکروہ تحریمی ترک اولیٰ کا دوسرا نام ہے۔ اس طرح ہمارا اور ان کا قول ایک ہی ہے۔ یہ فتح القدیر کا خلاصہ ہے لیکن ان کی اس گفتگو میں قدرے خفاء موجود ہے کیونکہ حدیث جس نے مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی اس کے لئے کچھ اجر نہیں۔ کراہت تحریمی کا فائدہ دیتی ہے کیونکہ لفظ اجر نکرہ ہے جو لاتبریہ (نفی جنس) کے بعد آیا ہے اور عموم کا فائدہ دے رہا ہے تو اس سے لازم آیا کہ مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے سے کچھ اجر حاصل نہیں ہوتا تو نماز فائدہ سے خالی ہوگئی تو چاہئے کہ اسے لغو اور فاسد قرار دیا جائے۔ اس طرح اسے مکروہ تحریمی کہنا بے جا نہیں ہے مگر بہر صورت اس ساری گفتگو سے جواز کا پہلو نکلتا ہے۔

میت کی چارپائی کو اٹھانے کا طریقہ

میت کی چارپائی کو چار آدمی اٹھائیں گے۔ ہر آدمی ایک پائے کے ساتھ ہوگا۔ اٹھانے والا سب سے پہلے میت کے دائیں طرف والا اگلا پایا اٹھائے پھر پچھلا دائیں طرف والے کو کندھا دے پھر بائیں طرف والے اگلے پائے کو کندھا دے اور آخر میں بائیں طرف والے پچھلے پائے کو اٹھائے تاکہ دائیں طرف کی محافظت رہے۔

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ہم سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ہم سے منصور بن معقر نے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ چاروں پایوں کو کندھا دینا سنت ہے۔

عن ابی هریرة من حمل الجنازة بجوانبها الاربع فقدقضی الذی علیه.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے جنازہ کو چار پایوں سے اٹھایا تو اس پر جو حق تھا اس نے اسے ادا کر دیا۔ (رواہ عبدالرزاق)

عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ علیہما الرحمہ نے بیان کیا ہے۔

عن ابن مسعود من اتبع الجنازة فلیا خذبجوانب السریر الاربع.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جو جنازہ کے ساتھ جائے تو وہ چارپائی کے چاروں طرف سے پکڑے (یعنی چاروں پایوں کو کندھا دے)۔

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جنازہ کو صرف دو آدمی اٹھائیں۔ اگلا آدمی چارپائی کو گردن پر رکھے اور پچھلے اپنے سینے پر کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جنازہ کو ان کے گھر سے دو پایوں کے درمیان سے پکڑ کر اٹھایا اور گھر سے باہر لائے۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن سعد نے طبقات میں روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔ فتح القدیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ کوئی مرفوع حدیث نہیں جو امام شافعی علیہ الرحمہ کے مذہب کی موافقت کرے۔ ہاں موقوف احادیث ہیں۔

فعن ابن الحویرث لما توفی جابر فشهد ناه فلما خرج سریره من حجرته اذا حسن بن حسین بن علی بین عمودی السریر. (رواہ الطبرانی)

حضرت ابن الحویرث سے روایت ہے کہ جب حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا تو ہم نے انہیں دیکھا جب ان کی چارپائی ان کے کمرے سے باہر آئی تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت حسن بن حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم چارپائی کے دونوں پایوں کے درمیان ہیں۔

حضرت اسید بن حضیر ۲۰ھ کو فوت ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں دونوں پایوں کے درمیان سے پکڑ کر اٹھایا حتیٰ کہ انہیں جنت البقیع میں لائے اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔

عن ابی هریرة انه یحمل بین عمودی سریر سعد بن وقاص.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جنازہ کو دونوں پایوں کے درمیان اٹھایا۔

اسی قسم کے الفاظ امیر المؤمنین حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے بھی آئے ہیں۔ فتح القدیر میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ واقعات ہیں جو ضروری ہیں کہ سنت پر دلالت کریں پھر ان واقعات کو جن الفاظ سے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ چاروں پاؤں سے پکڑ کر جنازہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان سے تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اٹھانے والے لوگ چاروں پایوں کے نیچے کندھا دیئے ہوئے تھے لیکن یہ لوگ

دو آخری پایوں کے درمیان تبرک کی خاطر تھے۔

میت کی چارپائی رکھنے سے پہلے بیٹھنا مکروہ ہے

جب لوگ جنازہ لے کر قبر کے پاس پہنچیں تو اس وقت تک نہ بیٹھیں جب تک جنازہ رکھ نہیں دیا جاتا۔ جنازہ رکھنے سے پہلے بیٹھنا مکروہ ہے کیونکہ پہلے بیٹھنا تکریم میت کے منافی ہے۔ لحد شق سے بہتر ہے۔ قبر میں لحد بنائی جائے، شق بنانا مکروہ ہے ہاں اگر ضرورت ہو تو پھر جائز ہے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اللحدلنا والشق لغیرنا. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لحد ہمارے لئے ہے اور شق غیروں کے لئے۔[1]

ضرورت سے مراد یہ ہے کہ زمین نرم ہو جس میں لحد نہ بن سکتی ہو۔ ایسے میں شق بنائی جائے گی کیونکہ ضرورت ناجائز امور کو مباح کر دیتی ہے۔ اگر زمین جس میں لوگ سکونت پذیر ہیں ریتلی ہے اور اس میں نہ لحد بنائی جا سکتی ہے اور نہ ہی شق بنائی جا سکتی ہے تو ایک گڑھا کھود کر اس میں میت کو رکھا جائے اور اوپر سے مٹی دے دی جائے کیونکہ احکام کی پابندی ربِ قدوس کی طرف سے استعداد کے مطابق فرض ہوتی ہے۔

اگر کوئی سمندر وغیرہ میں فوت ہو جائے؟

اگر کوئی مسلم سمندر میں سفر کرتے ہوئے کشتی (بحری جہاز) میں فوت ہو جائے تو اگر ساحل قریب ہے تو میت کو ساحل پر لایا جائے اور اسے قبر کھود کر دفن کیا جائے ورنہ غسل کے بعد نمازِ جنازہ پڑھ کر اسے سمندر میں پھینک دینا چاہئے۔ یہ سمندر ہی اس کے لئے قبر ہے کیونکہ احکام بقدر وسعت ہوتے ہیں۔

لحد اور شق کی تعریف

لحد یہ ہے کہ گڑھے میں قبلہ کی طرف ایک اور گڑھا اس طرح کھودا جائے کہ اس کے اوپر چھت سا بن جائے اور شق یہ ہے کہ قبر کے درمیان میں ایک گڑھا کھودا جائے۔

صرف مرد ہی میت کو قبر میں اُتاریں

میت کو دفن کرنا صرف مردوں کا حق ہے اور یہ فرض انہیں پر عائد ہوتا ہے نہ کہ عورتوں پر۔ لہٰذا ایک آدمی قبر میں داخل ہو جائے اور میت کو اٹھا کر اس میں رکھے۔ اگر میت عورت کی ہے تو اس کا محرم اسے قبر میں اتارے کیونکہ غیر محرم کا مس کرنا مکروہ ہے۔ اگر کوئی محرم نہیں ہے تو پھر کوئی اجنبی داخل ہو اور اسے قبر میں اتارے کیونکہ بامر مجبوری

---

[1] قبر کے لئے مستطیل گڑھا کھودا جاتا ہے جسے شق کہتے ہیں۔ اس گڑھے سے نیچے قبلہ شریف کی طرف ایک اور گڑھا کھودا جاتا ہے جو صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس میں میت آسانی سے آ جاتی ہے اور پھر اسے پتھروں یا تختوں سے بند کر کے مٹی سے لیپ دیا جاتا ہے تاکہ مٹی اندر نہ جائے اور اس کے بعد باہر والے گڑھے کو بھر کر قبر بنا دی جاتی ہے۔ آج کل تابوت کی وجہ سے شق کا عام رواج ہے۔

اجنبی کا اسے مس کرنا جائز ہے۔

قبر کے پاس چارپائی کیسے رکھنی چاہیے؟

میت کی چارپائی لحد کی چھت پر رکھی جائے اور میت کو قبلہ کی طرف سے لے کر لحد میں اتارا جائے۔ یہ طریقہ احناف کا ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ چارپائی کو اس طرح رکھا جائے کہ میت کا سر قبر کی پائنتی کی طرف ہو اور پھر اسے اٹھا کر اوپر لایا جائے حتیٰ کہ سر قبر کے سر کی طرف اور پاؤں پائنتی کی طرف ہو جائیں (جیسے تلوار میان سے باہر نکالی جاتی ہے اسی لئے حدیث میں سل آیا ہے)۔

عن ابن عباس قال سل[1] رسول الله صلی الله علیه وسلم من قبل رأسه.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سر کی طرف لایا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبر میں اتارنے کی حدیث میں اضطراب ہے کیونکہ حضرت ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔

عن ابی سعید انه علیه السلام اخذ من قبل القبلة واستقبل استقبالا.

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر کو قبلہ شریف کی طرف سے لے کر قبر میں اتارا گیا اور آپ کا رخ انور قبلہ کی طرف کر دیا گیا۔

عن ابراهیم النخعی ان النبی صلی الله علیه وسلم ادخل من جانب القبلة ولم یسل سلاً. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابراہیم نخعی (مراسیل) میں روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو قبلہ کی طرف سے قبر انور میں اتارا گیا اور پائنتی سے سر کی طرف نہیں لایا گیا۔

فتح القدیر میں ایسے ہی ہے۔

ہماری دلیل امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے۔

عن ابن عباس انه علیه السلام دخل قبرا لیلا فاسرج له سراج واخذه من قبل القبلة وقال رحمک الله ان کنت لاواها تلاء القرآن وکبر علیه اربعا.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کو رات کے وقت قبر مبارک میں رکھا گیا، آپ کی تدفین کے لئے چراغ روشن کیا گیا اور آپ کو قبلہ کی طرف سے قبر میں اتارا گیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

میت کو قبر میں اتارنے والا شخص کیا پڑھے؟

جو شخص میت کو قبر میں اتار رہا ہے وہ اتارتے وقت یہ کلمات پڑھے۔ بسم الله وعلی ملة رسول الله

[1] سل کا لفظی معنی ہے بے نیام کیا گیا۔ مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اطہر کو قبر انور کی پائنتی رکھا گیا اور پھر اٹھا کر سیدھا قبر کے سر کی طرف لایا گیا حتیٰ کہ آپ کا سر مبارک قبر شریف کے سرہانے کے برابر آ گیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لحد میں رکھ دیا گیا۔

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ کیونکہ حضرت ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔

عن ابن عمر کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا ادخل المیت القبر قال بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب میت کو قبر میں اتارتے تو بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پڑھتے۔

روی الحاکم عنہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا وضعتم موتاکم فی قبورھم فقولوا بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ۔

حضرت حاکم رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب تم اپنے مردوں کو ان کی قبروں میں اتارنے لگو تو کہو بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)

کچی اینٹیں یا سبزہ وغیرہ رکھنا

فتح القدیر میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ میت کو قبر میں رکھنے کے بعد اینٹیں یا سرکنڈا رکھا جائے پختہ اینٹیں اور لکڑی (یعنی پھٹہ) رکھنا مکروہ ہے۔

عن عامر بن سعد ان سعد بن وقاص قال فی المرض الذی ھلک فیہ الحدوا لی لحداو نصبوا علیّ اللبن نصبا کما صنع برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(رواہ مسلم وابن ابی شیبہ)

عامر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی مرض موت میں فرمایا جس میں کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور فوت ہو گئے کہ میرے لئے لحد تیار کرنا اور مجھ پر کچی اینٹیں رکھنا جس طرح رسول اللہ ﷺ کے لئے کیا گیا تھا۔

عن الشعبی مرسلا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعل علی قبرہ طنامن القصب۔

حضرت شعبی علیہ الرحمہ سے مرسلا روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر سرکنڈا رکھا گیا تھا۔

ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ اینٹیں لگانے کے بعد سرکنڈا رکھا جا سکتا ہے۔

اونٹ کی کوہان نما قبر بنائی جائے

جب میت کی لحد کو اینٹوں یا سرکنڈا سے بند کر دیا جائے تو پھر اس پر مٹی ڈال کر گڑھا بھر دیا جائے اور اوپر اونٹ کی کوہان کی طرح قبر کا نشان بنا دیا جائے۔ قبر کو مربع شکل بنانا مکروہ ہے۔

عن سفیان التمار انہ رأی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسنما۔

(رواہ البخاری)

حضرت سفیان التمار سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کو دیکھا کہ وہ اونٹ کی کوہان کی طرح تھی۔

قبر کو چونا نہیں کیا جائے گا۔

عن جابر قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان یجصص القبروان یبنی علیه وان یقعد علیه. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو چونا کرنے اس پر عمارت بنانے اور اس کے اوپر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

قبر کو مکان کی طرح بلند نہیں کرنا چاہئے

عن ابی الهیاج قال لی علی الابعثک علی مابعثنی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان لاتدع تمثالا الا طمسة ولا قبرا مشرفا الاسویة. (رواہ مسلم)

ابی الہیاج رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یاد رکھئے میں تجھے اس کام کے لئے بھیج رہا ہوں جس کام کے لئے رسول اللہ ﷺ نے مجھے بھیجا تھا کہ کوئی مورتی نہ چھوڑنا مگر اسے نیست و نابود کر دینا۔ نہ کوئی اونچی قبر مگر اسے برابر کر دینا۔

میت کو دوسرے شہر کی طرف منتقل کرنا

میت جس شہر میں فوت ہو اسے اس شہر سے کسی دوسرے شہر کی طرف منتقل نہیں کرنا چاہئے۔

عن جابر قال لما کان یوم احد جاءت عمتی بابی لتدفنه فی مقابرنا فنادی منادی رسول الله صلی الله علیه وسلم ردوا القتلی الی مضاجعهم. (رواہ الترمذی)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے دن میری پھوپھی آئیں تا کہ وہ میرے والد گرامی کو ہماری (خاندان والوں کی) قبروں میں دفن کریں تو رسول اللہ ﷺ کے منادی نے ندا دی، مقتولوں کو ان کے قتل کی جگہ کی طرف واپس لے جاؤ۔

میت کو پہلی قبر سے نکال کر کسی دوسری جگہ منتقل کرنا

قبر سے میت کو نکال کر کسی دوسری جگہ دفن کرنا جیسا کہ آج ہم میں عام مروج ہے مکروہ تحریمی ہے اور سخت ناپسندیدہ عمل ہے کیونکہ قبر کو اکھیڑنا اور میت کو نکالنا جائز نہیں کیونکہ انسان میت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے لیکن تبرک کے لئے اگر صلحاء کی قبور کے قریب منتقل کرنا چاہتا ہے تو جائز ہے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد گرامی کو مصر سے بیت المقدس کی طرف منتقل کیا تھا کیونکہ بیت المقدس میں ان کے آباء و اجداد علیہما السلام کے مزارات پر انوار تھے۔ فتح القدیر میں ہے کہ یہ دوسری شریعت کا حکم ہے جس کی پابندی ہمارے لئے ضروری نہیں۔ تو ان کا یہ کہنا محل نظر ہے کیونکہ پہلی شریعتیں بھی ہمارے لئے حجت ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

و روی عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة رضی الله عنها حین زارت قبر اخیها عبد الرحمن وکان مات بالشام وحمل منها ولو کان الامر فیک الی لما نقلتک

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے اپنے بھائی حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کی زیارت کی جو شام میں فوت ہوئے تھے اور وہاں سے انہیں منتقل کیا گیا تھا تو حضرت عائشہ

ولدفنتک حیث مت۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا تھا۔ اگر آپ کا معاملہ میرے ہاتھ ہوتا تو میں آپ کو منتقل نہ کرتی اور جہاں آپ کا وصال ہوا ہے وہیں آپ کو دفن کرتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا مکروہ ہے۔ افضل یہ ہے کہ میت کو منتقل نہ کیا جائے اور منتقل کرنے میں یہ خرابی بھی ہے کہ اس طرح تدفین میں دیر ہو جاتی ہے اور لاش کے پھٹنے اور بدبو پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دیر کی وجہ سے کچھ ایسے حالات ہو جائیں کہ لوگ میت سے متنفر ہوں اور میت کی تکریم میں فرق آئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے جسد اطہر کو منتقل کرنے میں یہ اندیشہ نہیں تھا کیونکہ انبیاء حالت حیات وممات میں پاک ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے اجساد پاک کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا مکروہ نہیں اور یہ چیز ان کے خصائص میں سے ہے۔

سجدۂ تلاوت کا بیان

قرآن کریم میں چودہ آیات ایسی ہیں جن کو پڑھنے اور سننے سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ وہ آیاتِ کریمہ سورۃ اعراف، سورۃ رعد، سورۃ نحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ مریم، سورۃ حج، سورۃ فرقان، سورۃ نمل، سورۃ الم تنزیل سجدہ، سورۃ ص، سورۃ حم سجدہ، سورۃ نجم، سورۃ اذا السماء انشقت اور سورۃ اقراء۔

سورۃ ص میں آیتِ سجدہ ہے

ان سورتوں میں احناف کے نزدیک آیات سجدہ ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی آیاتِ سجدہ چودہ ہیں لیکن ان کے نزدیک سورۃ ص کی بجائے سورت حج کی دو آیات میں سجدہ ہے۔

ہماری دلیل کہ سورت ص میں آیتِ سجدہ ہے یہ حدیث ہے۔

عن مجاھد قال قلت لابن عباس اسجد فی صٓ فقرء ومن ذریته داؤد وسلیمان حتی اتی فبھدٰھم اقتدہ فقال بینکم ممن امران یقتدی بھم.

حضرت مجاہد سے روایت کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے عرض کیا کہ میں سورت ص میں سجدہ کرتا ہوں تو انہوں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔ ومن ذریته داؤد وسلیمان حتیٰ کہ وہ فبھداھم اقتدہ پر پہنچے اور فرمایا وہ لوگ آپ کے درمیان ہیں جن کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔

فی روایة عکرمة عن ابن عباس قال لیس ص من عزائم السجود وقد رایت النبی صلی اللہ علیه وسلم یسجد فیھا.

(رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے حضرت عکرمہ کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اس سورت کی تلاوت کرتے تو سجدہ فرماتے تھے۔

وعن ابن عباس قال ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسجد فی ص وقال سجدھا داؤد توبۃ ونسجدھا شکرا (رواہ النسائی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورت ص میں سجدہ فرماتے تھے اور فرمایا کہ یہاں حضرت داؤد علیہ السلام نے سجدۂ توبہ کیا اور ہم یہاں سجدۂ شکر کرتے ہیں۔

شوافع کہتے ہیں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ سورۃ ص ہی میں کوئی ایسی آیت نہیں جس پر سجدہ ضروری ہو بلکہ اس پر سجدہ داؤد علیہ السلام کی مطابقت میں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ سورت ص کی ایک آیت کی تلاوت سے سجدہ لازم آتا ہے اگرچہ اس کے وجوب کا سبب ادائے شکر ہے۔ تمام عبادات کا وجوب شکر کے سبب ہی تو ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام یا کسی اور نبی کی مطابعت سے ہمارا مقصود متاثر نہیں ہوتا۔

سورۃ حج میں آیتِ سجدہ کے متعلق ائمہ کا مؤقف

دوسری آیت جس میں اختلاف ہے وہ سورت حج کی ایک آیت ہے۔ ہماری دلیل اس بارے یہ ہے کہ اس آیت میں رکوع کو سجدہ کے ذکر کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ ربِ قدوس کا ارشاد ہے۔ **وارکعوا واسجدوا**۔ ظاہر ہے یہاں رکوع وسجود سے مراد نماز کے رکوع وسجود ہیں۔ جو نماز کے ارکان میں سے ہیں۔ اس لئے یہاں صرف سجدہ کو واجب سمجھنا صحیح نہیں ہے لیکن شوافع اس ضمن میں ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

عن عقبۃ بن عامر قال قلت یا رسول اللہ فی الحج سجدتان قال نعم ومن لم یسجد فلا یقرءھا۔ (رواہ جامع ترمذی، سنن ابوداؤد)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: کہ میں نے عرض کیا رسول اللہ! کیا سورت حج میں دو سجدے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ سو جس نے سجدہ نہ کیا اس نے اس سورت کی تلاوت نہیں کی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۃ الحج کی تلاوت کی اور اس میں دو سجدے کئے اور فرمایا: اس سورت کو دو سجدوں کی بدولت فضیلت بخشی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک سورت حم میں آیت **یسأمون** کی تلاوت پر سجدہ واجب ہوتا ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک **ایاہ تعبدون** پر سجدۂ تلاوت ہے۔ ہماری رائے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے جو نہایت ہی محتاط رائے ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں گیارہ سجدے ہیں۔ طوال مفصل میں کوئی سجدہ نہیں جبکہ سورت حج میں ان کے نزدیک بھی دو سجدے ہیں اور سورت ص میں کوئی سجدہ نہیں۔

طوال مفصل سورتوں میں سجدے ہیں

ہمارے نظریہ کے مطابق طوال مفصل میں سجدے ہیں جیسا کہ حدیث مبارک سے ثابت ہے۔

عن ابن مسعود ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرء سورۃ والنجم فسجد فیھا وسجد من کان معہ غیران شیخامن قریش اخذ کفا من حصی اوتراب فرفعہ الی جبھۃ وقال یکفینی ھذہ قال عبداللہ فلقد رأیتہ بعد قتل کافرا. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سورت والنجم کی تلاوت فرمائی اور اس کی تلاوت کے دوران سجدہ فرمایا۔ آپ ﷺ کے ساتھیوں نے بھی سجدہ کیا سوائے ایک قریشی بوڑھے کے جس نے زمین سے کنکریاں یا مٹی اٹھائی اسے ماتھے سے لگایا اور کہا میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ بعد میں وہ کافر ہو کر قتل ہوا۔

مالکی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ قیام مکہ مکرمہ کے دوران پیش آیا۔

قد روی ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یسجد فی شئی من المفصل منذتحول الی المدینۃ. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ منتقل ہونے کے بعد طوال مفصل کی کسی آیت پر سجدہ نہیں کیا۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور کو سجدہ کرتے نہ دیکھا ہو۔ ان کے نہ دیکھنے سے نہ تو یہ لازم آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طوال مفصل میں سجدہ نہیں کرتے تھے اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ یہ سجدہ منسوخ ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورت والنجم کی تلاوت کی اور سجدہ تلاوت کیا پھر اٹھے اور ایک دوسری آیت کی تلاوت کی۔ یہ واقعہ نماز کا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے پیچھے تھے۔ کسی نے بھی اس کا انکار نہ کیا۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ یہ سجدہ منسوخ نہیں ہے۔ اگر سورت نجم میں سجدہ منسوخ ہوتا تو ان صحابہ کرام علیہم الرضوان میں سے کوئی تو اس سے باخبر ہوتا اور کوئی تو اس پر اعتراض کرتا۔

رہا سورت انشقت اور سورت اقرء میں سجدۂ تلاوت تو اس کا ثبوت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کردہ یہ حدیث ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ اور اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں سجدہ کیا۔ اسے امام مسلم علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ میں اسلام قبول کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے سجدہ کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ مفصل سورتوں میں بعد از ہجرت بھی سجدہ واجب رہا۔

سجدۂ تلاوت واجب ہے

پھر ہمارے نزدیک سجدۂ تلاوت واجب ہے اور حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک سنت ہے۔ ہماری دلیل یہ روایت ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

الله عليه وسلم اذا قرء ابن ادم السجدة فسجد اعتزل الشيطان يبكي يقول يا ويلنا امر ابن ادم بالسجود فسجد فله الجنة وامرت بالسجود فلي النار. (رواہ مسلم)

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب ابن آدم آیتِ سجدہ پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان الگ جا کر روتا ہے اور کہتا ہے۔ ہائے بربادی! ابن آدم کو سجدہ کا حکم ملا تو اس نے سجدہ کیا اور اسے جنت ملی۔ مجھے سجدہ کا حکم ملا (تو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں) میرے لئے جہنم کی آگ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابن آدم کو سجدے کا حکم دیا گیا۔ مامور بہ واجب ہوتا ہے۔ مندوب مامور بہ نہیں ہوتا جیسا کہ اصول فقہ کی کتب میں مذکور ہے۔

ہماری دوسری دلیل یہ ہے کہ آیاتِ سجدہ کی تین قسمیں ہیں۔ بعض آیات ایسی ہیں جن میں امر کا صیغہ آیا ہے اور ظاہر ہے امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ بعض آیات ایسی ہیں جن میں سجدہ نہ کرنے والوں کی مذمت بیان کی گئی ہے اور ظاہر ہے مذمت ترک واجب کے بغیر نہیں ہو سکتی اور بعض آیات میں انبیاء علیہم السلام کے سجدے کا تذکرہ ہے اور ان نفوس طاہرہ کی متابعت میں آیات کریمہ کی تلاوت پر سجدہ واجب ہے۔ چونکہ آخری قسم ظنی الدلالت ہے اس لئے ہم نے سجدہ کو واجب قرار دیا ہے' فرض قرار نہیں دیا۔

شوافع کی دلیل یہ ہے۔

عن زيد بن ثابت قال قرأت علي رسول الله صلى الله عليه وسلم النجم فلم يسجد فيها. (رواہ البخاری)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سورت نجم کی تلاوت کی تو آپ ﷺ نے اس پر سجدہ نہیں فرمایا۔

چونکہ ترک کرنا واجب نہ ہونے کی دلیل ہے اسی لئے مالکی علماء نے بھی اسے سجدہ نہ کرنے کی دلیل ٹھہرایا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوری طور پر سجدہ نہ کیا اور بعد میں کیا ہوتا کہ یہ سنت بھی امت پر عیاں ہو جائے کہ سجدہ واجب ہے لیکن اسے عمر میں کسی وقت بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ احناف کا اس بارے یہی نظریہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدہ ترک نہیں فرمایا بلکہ اسے مؤخر فرمایا ہے۔

عن ربيعة انه حضر عمر بن الخطاب قرء يوم الجمعة على المنبر سورة النحل حتى اذا جاء السجدة فنزل وسجد وسجد الناس حتى اذا كانت الجمعة القابلة قرء بها حتى اذا جاءت السجدة قال يايها الناس انما امرنا بالسجود فمن سجد فقد اصاب ومن لم يسجد فلا اثم عليه.

حضرت ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امیر المؤمنین نے جمعہ کے دن منبر پر کھڑے ہو کر سورت نحل کی تلاوت فرمائی۔ جب آیتِ سجدہ آئی تو نیچے اترے' سجدہ فرمایا' لوگوں نے بھی سجدہ کیا حتیٰ کہ دوسرا جمعۃ المبارک کا دن آیا تو بھی یہی سورت تلاوت کی اور جب آیتِ سجدہ آئی تو فرمایا: لوگو! ہم سجدے سے آگے گزرتے

ہیں۔ پس تم میں سے جس نے سجدہ کیا تو اس نے درست عمل کیا اور جس نے سجدہ نہیں کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (رواہ البخاری)

اور یہ الفاظ زائد کہے ہیں کہ نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس سجدے کو واجب نہیں کیا ہاں اگر ہم چاہیں تو۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ فوراً سجدہ کرنا واجب نہیں۔ جو کر لے تو بہتر ہے کیونکہ واجب جلدی ادا ہو گیا اور جس نے ادا نہیں کیا بلکہ اسے مؤخر کر دیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ اس واجب میں تاخیر کی وسعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ بات لازم نہیں ٹھہرائی کہ تلاوت کے وقت ہی ہم سجدہ کریں۔ ہاں اگر سجدہ کر لیں تو بہتر ہے۔ اس سے واجب فوری طور پر ادا ہو جائے گا حالانکہ اسے کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مکلّف کو یہ اختیار دیا ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کیونکہ استثناء تقاضا کرتا ہے کہ مشیت کے بعد یہ فرض ہو اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ واجب میں وسعت ہو ورنہ ایسی چیز کا وجوب لازم آئے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے واجب نہیں ٹھہرایا۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ فرض نہیں ہے اور یہاں استثناء منقطع ہے تو بھی زیادہ سے زیادہ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نظریہ تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام صحابہ کرام علیہم الرضوان اسی رائے کو ماننے والے تھے۔ رہا انہوں نے حضرت عمر پر اعتراض کیا تو جب معلوم ہو کہ فلاں مجتہد ہے اور اس مسئلہ میں اس کی رائے یہ ہے تو پھر اعتراض نہیں کیا جاتا۔

آیتِ سجدہ کی سماعت سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے

آیتِ سجدہ کی تلاوت سے جس طرح سجدہ کرنا واجب ہو جاتا ہے اسی طرح آیتِ سجدہ سننے سے بھی سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے کیونکہ امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشادِ گرامی ہے۔ اس شخص پر بھی سجدہ واجب ہے جس نے آیتِ سجدہ کی تلاوت کو سنا۔ اسے امام بخاری علیہ الرحمہ نے معلقاً روایت کیا ہے۔

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد ہے کہ سننے والے پر بھی سجدۂ تلاوت ضروری ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔

سماع میں ارادہ شامل ہو یا نہ ہو سجدہ واجب ہے۔ فتح القدیر میں ایک روایت اس حکم کے منافی ہے۔

عن امیر المؤمنین عثمان مر بقاص فقرء سجدة یسجد معه عثمان فقال انما السجود علی من استمع ثم مضی ولم یسجد.

امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ ایک قصہ گو کے پاس سے گزرے۔ قصہ گو نے ایک آیت پڑھی جس پر حضرت عثمان سجدہ کرتے تھے۔ فرمایا سجدہ سننے والے پر ہے۔ آپ چلے گئے اور سجدہ نہ کیا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس میں سجدہ میں دیر کے علاوہ اور کچھ مذکور نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں اس بات کی بھی خبر دی جا رہی ہے کہ سننے والے پر بھی سجدہ واجب ہے اور یہی ہمارا مقصود ہے اور یہ ضروری نہیں کہ قرآن کریم کی اس آیت کو اسی نیت کے ساتھ سنا گیا ہو اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ مقتدی جو سننے کی نیت کے بغیر سن رہا ہے اس پر

کچھ واجب نہیں حالانکہ وہ سننے پر مامور ہے۔ جس رکعت میں امام نے آیتِ سجدہ کی تلاوت کی اور مقتدی اس رکعت میں آ کر مل گیا خواہ مقتدی نے نماز کے اندر آیتِ سجدہ سنی یا نماز سے باہر یا بالکل آیتِ سجدہ سنی ہی نہیں اس پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ اگر مقتدی آیتِ سجدہ پڑھنے سے پہلے امام کے ساتھ ملا یا بعد میں' دونوں صورتوں میں وہ سجدہ کرے گا کیونکہ امام کی متابعت ضروری ہے۔

اگر نمازی نے آیتِ سجدہ پڑھی اور کسی ایسے آدمی نے اس کو سن لیا جو نماز نہیں پڑھ رہا تو سننے والے پر بھی سجدہ واجب ہے کیونکہ سماع پایا جا رہا ہے۔

اگر مقتدی نے نماز میں آیتِ سجدہ کی تلاوت کی' امام اور دوسرے مقتدیوں نے اس کو سن لیا تو ان پر سجدہ واجب نہیں کیونکہ مقتدی قرأت کرنے کا مجاز نہیں' امام کی قرأت ہی اس کی قرأت ہے اس لئے اس کی قرأت کو قرأت ہی شمار نہیں کریں گے بخلاف جنبی کے' کہ اس کے لئے قرأت کرنا جائز نہیں۔ اگر اس کی قرأت کوئی شخص سن لیتا ہے تو اس پر سجدہ واجب ہے لیکن ممنوع ہونے کے باوجود اس کی قرأت' قرأت شمار ہوگی اگرچہ وہ گناہگار ہوگا۔ اسی طرح جنبی پر بھی بعد از طہارت سجدہ واجب ہوگا۔

ایک آدمی نماز نہیں پڑھ رہا' مقتدی سے آیتِ سجدہ سن لیتا ہے تو سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے کیونکہ باہر والے آدمی کے اعتبار سے مقتدی محجور نہیں ہے۔

اگر آیتِ سجدہ نماز میں تلاوت کی جائے تو فوراً سجدہ واجب ہو جاتا ہے کیونکہ یہ سجدہ حالتِ نماز میں واجب ہے اور نماز کے افعال کے ساتھ ملا ہوا ہے اس لئے اس کو نماز کے بعد وقت پر مؤخر نہیں کیا جا سکتا۔

رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرنا

اگر کسی نے آیتِ سجدہ تلاوت کی اور اس نیت کے ساتھ رکوع کر لیا کہ سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے یا سجدہ کر لیا کہ اس کے ساتھ ساتھ سجدۂ تلاوت بھی ادا ہو جائے تو نماز کے رکوع اور سجود کے ساتھ سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا۔

عن ابن عمرو ابن مسعود انهما اجازا ان یرکع عن السجود فی الصلوة.

حضرت ابن عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ انہوں نے اجازت دی ہے کہ نماز میں سجدۂ تلاوت کو رکوع میں ادا کر دیا جائے۔

کیونکہ سجدۂ تلاوت کا وجوب اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے اظہار اور شیطان کو مار بھگانے کے لئے ہے اور یہ دونوں مقصد رکوع اور نماز والے سجدہ سے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے نیت کر کے نماز والے رکوع اور سجود کے ساتھ بھی یہ سجدہ ادا ہو جاتا ہے لیکن نماز سے باہر رکوع سجدہ کی جگہ نہیں لے سکتا کیونکہ نماز سے باہر رکوع عبادت شمار نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ شیطان کو مار بھگانے کا ذریعہ قرار پاتا ہے۔

اگر نمازی نے آیتِ سجدہ پڑھ کر فوراً سجدہ نہ کیا بلکہ تین یا اس سے زائد آیات بھی ساتھ ملا دیں تو اب وہ سجدہ ہی کرے گا اور سجدہ کی جگہ رکوع نہیں کر سکتا کیونکہ سجدہ اب اس کے ذمہ قرض ہے اور کسی اور واجب کے ذریعے اس کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔

بہتر یہ ہے کہ آیتِ سجدہ کو تلاوت کرنے کے فوراً بعد سجدہ کرے اور پھر اٹھ کر چند آیات تلاوت کر کے رکوع وسجود کر کے رکعت مکمل کرے۔

بعض علماء فقہ فرماتے ہیں کہ اگر آیتِ سجدہ سورت کے آخر میں ہے تو زیادہ مناسب یہ ہے کہ رکوع کرے اور سجدہ نہ کرے (یعنی رکوع کے وقت سجدہ تلاوت کی نیت کر لے اور الگ سجدہ تلاوت نہ کرے)۔

جو سجدۂ تلاوت نماز میں واجب ہوا سے نماز میں ہی ادا کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کی ادائیگی ایسے ناقص سجدہ سے نہیں ہو سکتی جو نماز سے باہر کیا جائے اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ نماز کے افعال کے ساتھ جڑا ہوا ہے ان سے الگ ادا نہیں ہو سکتا۔

ایک مجلس میں اگر دو سجدے واجب ہوئے تو انہیں ایک ہی سجدہ سمجھا جائے گا کیونکہ مجلس متفرقات کو جامع ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

ایک آیتِ سجدہ کو ایک مجلس میں بار بار پڑھنا

جب ایک آیتِ سجدہ کو ایک مجلس میں بار بار پڑھا جائے تو صرف ایک ہی سجدہ کرنا پڑے گا۔ اس کی دلیل دیتے ہوئے فتح القدیر میں نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ہر بات کو تین بار دہراتے تھے تا کہ صحابہ کرام کو حفظ ہو جائے اور ظاہر ہے جب حدیث میں تکرار فرماتے تھے تو قرآن کریم کی آیات کے حفظ کے لئے اس تکرار کا اہتمام کیوں نہیں کرتے ہوں گے؟ آپ ﷺ قرآن کریم کی سجدہ والی آیت کو ایک سے زائد بار دہراتے لیکن صرف ایک بار سجدہ کرتے تھے اور دلالت اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ آیتِ سجدہ سننے والا اگر اسی آیت کو پڑھ دے تو اس پر ایک ہی سجدہ واجب ہو گا حالانکہ سبب میں تکرار ہے یعنی اس نے آیتِ سجدہ کو سنا اور اسے پڑھ بھی دیا۔ اس میں فلسفہ یہ ہے کہ حفظ کے لئے آیت کا تکرار ضروری ہے کیونکہ آیت صرف تکرار سے ہی حفظ ہو سکتی ہے۔ بار بار ایک آیت کی تلاوت پر اگر بار بار سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے تو اس سے حرج لازم آئے گا پھر اتحاد سبب میں ہے حکم میں نہیں کیونکہ اگر سبب میں تداخل نہ ہو تو سبب متعدد ہو جائیں گے اور اس کے نتیجے میں کئی سجدے واجب ہوں گے کیونکہ ہر سبب وجوب کی طرف لے جاتا ہے۔ تو تعدد سبب کی وجہ سے تعدد وجوب پایا جائے گا لیکن تداخل کی وجہ سے ایک ہی سجدہ واجب ہو گا عبادت جب کسی وجہ سے واجب ہو جائے تو اس کی ادائیگی واجب ہوتی ہے کیونکہ اس میں احتیاط کے پہلو کو ملحوظ رکھا جاتا ہے لیکن عقوبات میں ایسا نہیں کیونکہ سبب کا تعدد اگرچہ وجوب کے تکرار کا تقاضا کرتا ہے مگر تداخل تکرر کی نفی کرتا ہے مگر عقوبات کی بنیاد دفع اور دور کرنے[1] پر رکھی جاتی

---

[1] عبادات اور عقوبات میں فرق ہے۔ عبادات میں اگر کوئی چیز ایک معمولی دلیل سے بھی ثابت ہو رہی ہو تو اس پر عمل کیا جاتا ہے لیکن عقوبات اور سزاؤں میں دوسرا پہلو زیادہ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اگر جرم کے ثبوت میں معمولی سا بھی شک پڑ جائے تو مجرم کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر عبادت ضروری نہیں ہو گی تو نفلی عبادت کا ثواب مل جائے گا اس لئے ناقص دلیل اور معمولی سبب بھی اس کے لئے کافی ہوتا ہے جبکہ عقوبات اور سزاؤں میں اس پہلو کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کوئی مجرم شک کا فائدہ حاصل کر لیتا ہے تو اُسے چھوڑ دیا جائے لیکن کسی بے گناہ کو محض شک اور معمولی دلیل کی بنیاد پر سزا نہیں ہونی چاہئے۔

ہے۔ اگر کسی وجہ سے بھی اس سے چھٹکارا ممکن ہو تو چھٹکارا دیا جاتا ہے اگر تداخل سبب میں ہو کہ آیتِ سجدہ کی تلاوت کی اور سجدہ کر لیا پھر اسی مجلس میں اسی آیت کی تلاوت کی تو ایک ہی سجدہ کافی ہے۔ دوبارہ سجدہ نہیں کرنا پڑے گا لیکن عقوبت میں ایسا نہیں۔

اگر کسی شخص نے زنا کیا اور اس پر حد جاری کی گئی۔ اس نے پھر زنا کیا تو اس پر دوبارہ حد زنا جاری ہوگی کیونکہ یہاں تداخل سبب میں نہیں اور یہ اس لئے ہے کہ عقوبت زجر و توبیخ کے لئے مشروع کی گئی ہے۔ اس لئے جب زنا پر مجرم کو حد زنا جاری کی گئی اور اس کے بعد پھر اس نے زنا کیا تو اس نے حد کا اثر قبول نہیں کیا اسی لئے اس کو دوبارہ سزا دی جائے گی تا کہ اسے نصیحت حاصل ہو جائے۔

مجلس بدلنے سے وجوب کا تکرار لازم آتا ہے اسی لئے علماء کہتے ہیں کہ تانا تنتے ہوئے اگر کوئی شخص آیتِ سجدہ بار بار پڑھتا ہے تو ایک سے زائد بار سجدۂ تلاوت واجب ہوگا۔ اسی طرح اگر درخت کی مختلف ٹہنیوں پر ایک ہی آیتِ سجدہ کو بار بار تلاوت کیا تو کئی سجدے کرنا پڑیں گے۔

سجدۂ تلاوت کرنے کا طریقہ اور اس کی شرائط

سجدۂ تلاوت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سجدہ کرنے والا تکبیر (اللہ اکبر) کہے اور ایک سجدہ کرے پھر تکبیر کہے اور سر اٹھا لے۔ سجدہ میں وہی ذکر کرنا ہے جو نماز کے سجدہ میں کیا جاتا ہے۔ (یعنی سجدۂ تلاوت میں بھی سبحان ربی الاعلی پڑھے یا اس قسم کے دوسرے الفاظ جو اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو بیان کریں) جو چیزیں نماز کے لئے شرط ہیں وہی چیزیں سجدۂ تلاوت کے لئے بھی شرط ہیں کیونکہ سجدۂ تلاوت بھی نماز ہے۔

تتمہ

امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک ایک اکیلا سجدہ سجدۂ تلاوت کے علاوہ ایک مستقل عبادت ہے۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت کے علاوہ کوئی دوسرا اکیلا سجدہ عبادت نہیں۔ اگر کسی نے سجدہ کرنے کی نذر مانی تو امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک اس نذر کا پورا کرنا واجب ہے اور صاحبین کے نزدیک اس نذر کو پورا کرنے کے لئے اسے نفل نماز پڑھنا پڑے گی کیونکہ اکیلا سجدہ صرف سجدۂ تلاوت ہی ہوسکتا ہے۔ ہاں ایک سجدہ کی نذر ماننے سے اسے نماز کی صورت میں نذر ضرور پوری کرنا پڑے گی کیونکہ مشروط کی نذر شرط کو واجب کرتی ہے۔ مثلاً کسی نے اعتکاف کی نذر مانی تو اس پر روزہ رکھنا واجب ہوگا۔

حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کا قول صحت کے زیادہ قریب ہے۔

سجدۂ شکر

عن ابی بکرۃ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جاءہ امر سرورا وبشربہ

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسرت و شادمانی کے موقع پر

خرساجدا شاکر للہ تعالی.

سجدۂ شکر بجالاتے تھے۔

اسے امام ابوداؤد علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

وعن کعب بن مالک انہ لما جاء تہ البشارۃ بتوبتہ خرساجدا. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت کعب بن مالک سے روایت ہے کہ جب یہ بشارت ملی کہ ان کی توبہ قبول ہوگئی ہے تو وہ سجدہ میں گر گئے۔

فتح القدیر میں ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سجد مرۃ لرؤیۃ زمن ومربہ ابوبکر فنزل فسجد شکر اللہ تعالی ومربہ عمر فنزل وسجد شکر للہ تعالی.

نبی کریم ﷺ نے ایک اپاہج آدمی کو دیکھا تو سجدہ فرمایا۔ وہاں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر ہوا تو وہ بھی اترے اور انہوں نے سجدہ کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔ حضرت عمر آئے تو وہ بھی سواری سے اترے اور انہوں نے بھی سجدۂ شکر ادا کیا۔

فتح القدیر میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یمامہ کی فتح اور مسیلمہ کذاب کے قتل پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ حضرت امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یرموک کی فتح پر سجدہ کیا۔ امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب دیکھا کہ پستان والا خارجی نہروان کی جنگ میں قتل ہو گیا ہے تو آپ نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ کیا۔ واللہ اعلم باحکامہ.

☆☆☆☆☆

زکوٰۃ کا بیان

زکوٰۃ ایک اہم فریضہ اور ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ اس کے فضائل ومناقب نہایت مشہور اور اس کی اہمیت بے حد واضح ہے۔ کتاب مبین قرآن کریم میں اس کار خیر کے نتیجے میں ملنے والے اس ثواب کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ زکوٰۃ اور اس کے متعلقہ مسائل کو ہم چند فصول میں بیان کریں گے۔

زکوٰۃ کا حکم

زکوٰۃ ہر آزاد مکلّف، صاحب نصاب مسلمان پر فرض ہے جس کو مالک نصاب ہوتے ہوئے ایک سال گزر چکا ہو۔ زکوٰۃ ضروریات دین میں سے ہے حتیٰ کہ اس کا منکر کافر ہوتا ہے اور اس کا تارک گناہگار قرار پاتا ہے۔ زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے یہ شرط ہے کہ انسان مال کا مالک ہو اور اس کی ملکیت تام ہو وہ اپنی ملکیت میں جسے چاہے جب چاہے تصرف بھی کر سکتا ہو۔ کوئی اسے کسی حق کی وجہ سے نہ تو روک سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اور امر مانع ہو۔

کیونکہ زکوٰۃ نام ہے کسی کو مال کا مالک بنانے کا اور دوسرے کو وہ مال کا مالک تبھی بنا سکتا ہے کہ یداً اور رقبۃ[1] اُسے ملک تام حاصل ہو۔ غلامِ مکاتب پر زکوٰۃ فرض نہیں کیونکہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں ہوتے۔ جو شخص نصاب کا مالک ہے لیکن مال اس کے ابھی ہاتھ میں نہیں اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں جیسے ایک عورت نے شادی کی اور مخصوص مال کو مہر مقرر کیا جو نصاب کے برابر ہے اور ابھی تک اس نے خاوند سے مہر لیا نہیں اور اس پر ایک سال گزر گیا ہے یا ایک شخص نے تجارت کی غرض سے کچھ مال خریدا مگر اسے اپنے قبضہ میں نہیں لیا اور اس پر ایک سال بیت گیا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں کیونکہ وہ مالک نصاب تو ہے لیکن مال اس کے تصرف میں نہیں۔ اسی لئے وہ اپنے اس مال میں سے کچھ حصہ الگ کر کے کسی شخص کو اس کا مالک نہیں بنا سکتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ نصاب مکمل ہو۔ عنقریب اس کی تفصیل آئے گی۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ مال قرض سے خالی ہو۔ اگر کسی کے پاس بہت زیادہ مال ہے مگر اس نے اتنا قرض دینا ہے کہ سارا مال قرض خواہ لے جائیں تو

---

[1] فقہ میں ملکا تاما یدا ورقبۃ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یدا سے مراد یہ ہوتا ہے کہ مال اس کے ہاتھ میں ہو کسی کو ادھار نہ دیا ہو۔ رقبۃ کا مطلب ہے کہ ملکیت میں کوئی دوسرا شامل نہ ہو یا کسی وجہ سے ملکیت میں نقص نہ ہو۔

تب یہ شخص قرض سے سبکدوش ہو تو ایسے شخص پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے کیونکہ یہ مال اس کی اصل ضروریات سے زائد نہیں ہے یعنی بمشکل اس کی اپنی ضرورت قضائے دین کو پورا کرتا ہے۔

وقد روی الامام مالک ان امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہ کان یقول ھذا شھر زکوتکم فمن کان علیہ دین فلیؤد دینہ حتی یحصل اموالکم فتؤدون منھا الزکوۃ.

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے یہ تمہارے لئے زکوٰۃ کا مہینہ ہے پس جو مقروض ہے وہ اپنا قرض چکا دے تاکہ تمہیں اپنے مال مل جائیں اور تم زکوٰۃ دے سکو۔

اس قول سے واضح ہوا کہ جو مال قرض میں مشغول ہو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس قرض سے مراد وہ قرض ہیں جو لوگ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ اس سے مراد نذر' کفارہ وغیرہ نہیں۔ اگر نذر اور کفارہ پورا کرنے کے لئے مال دینا ہے تو ان کی وجہ سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی۔

مال ایک نصاب سے زائد نہیں ہوتا جیسے کسی شخص کے پاس نصاب کے برابر مال تھا اور اس پر ایک سال گزر گیا مگر اس نے زکوٰۃ نہ دی' دوسرا سال گزرنے پر وہ صرف ایک ہی سال کی زکوٰۃ دے گا' دوسرے سال کی زکوٰۃ نہیں دے گا کیونکہ نصاب کا ایک جزء زکوٰۃ میں مشغول تھا۔ اس وجہ سے باقی مال نصاب نہیں رہا لیکن نذر اور کفارہ میں ایسا نہیں کیونکہ ایسی صورت میں مال کا جزء مشغول نہیں ہوتا۔

نابالغ کے مال پر زکوٰۃ نہیں

بچے کے مال پر زکوٰۃ نہیں اگرچہ اس پر پورا سال گزر جائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بچے کے مال پر زکوٰۃ فرض ہے اور اس کے مال سے اس کا ولی اس بچے کی طرف سے زکوٰۃ دے گا۔ یہ نزاع عاقل اور غیر عاقل بچے کے بارے ہے۔

ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی ہے کہ:

رفع القلم عن ثلثة عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یعقل. (رواہ ابوداؤد والترمذی والحاکم)

تین شخص مرفوع القلم ہیں۔ سونے والا حتیٰ کہ بیدار ہو جائے۔ بچہ حتیٰ کہ بالغ ہو جائے اور پاگل حتیٰ کہ تندرست ہو جائے۔

ہماری دوسری دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پانچ چیزوں میں نماز' روزے' حج اور زکوٰۃ کا تذکرہ فرمایا۔ اس لئے زکوٰۃ عبادت ہے اور عبادت کے لئے نیت شرط ہے اور اس کی ادائیگی صرف اسی وقت معتبر ہوگی کہ مالک کا اختیار بھی شامل ہو۔ ناسمجھ بچے سے یہ تمام چیزیں تصور بھی نہیں کی جاسکتیں۔ جب ادائیگی ممکن ہی نہیں تو فرضیت خالی اور فائدہ ہونے کی وجہ سے متحقق ہی نہیں ہوتی۔ ہاں ولی مکلف ہے لیکن دوسرے مکلف

شخص کی نیت بچے کی نیت کی جگہ نہیں لے سکتی۔

زکوٰۃ مالی ٹیکس نہیں

شوافع کبھی تو دلیل میں یہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ ایک مالی ٹیکس ہے جو دوسرے ٹیکسوں مثلاً عشر اور خراج کی طرح واجب الادا ہے لیکن یہ کوئی دلیل نہیں کیونکہ زکوٰۃ ٹیکس نہیں عبادت ہے' کبھی وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان النبی صلی الله علیه وسلم خطب الناس فقال الامن ولی یتیما له مال فلیتخیر فیه ولا یترکه حتی یاکله الصدقة. (رواہ الترمذی)

عمرو بن شعیب سے' وہ اپنے والد گرامی سے اور وہ اپنے دادا سے روایت ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لوگوں سے خطاب فرمایا اور کہا: خبردار! جو کسی ایسے یتیم کا ولی ہو جس کی ملکیت میں مال و دولت ہو تو اسے چاہئے کہ اس مال سے تجارت کرے اور اسے ایسا نہ چھوڑے کہ اسے صدقہ کھا جائے۔

فتح القدیر میں ہے کہ یہ حدیث ضعیف ترین ہے۔ اسے امام ترمذی نے ضعیف کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ منہال فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امام احمد علیہ الرحمہ اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

اگر اسے صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو صدقہ سے مراد وہ صدقات ہوں گے جو ٹیکس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً صدقۂ فطر' قریبی رشتہ داروں کا نان و نفقہ' اس سے مراد زکوٰۃ نہیں لیا جا سکتا کیونکہ زکوٰۃ عبادت ہے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لئے کی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی ادائیگی کے لئے نیت شرط ہے۔

مجنون پر زکوٰۃ کی ادائیگی کب ساقط ہوتی ہے؟

جنون میں تفصیل ہے۔ جنون یا تو اصلی ہوگا کہ بچپن سے وہ آدمی ہے ہی فاتر العقل یا عارضی ہوگا کہ بعد میں زمانۂ بلوغت میں کسی حادثے کی وجہ سے جنون کی کیفیت میں مبتلا ہوا ہوگا پھر دونوں صورتیں یا تو تھوڑے عرصہ کے لئے ہوں گی یا زیادہ عرصہ کے لئے۔ اگر جنون کا عارضہ وقتی اور عارضی ہے تو یہ نیند کی طرح ہے جو عبادات کی ادائیگی سے مانع ہے کیونکہ جنون نیند کی طرح وجوب ادا کو ساقط کر دیتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عبادات صرف اسی وقت معتبر ہو سکتی ہیں جب ان کی ادائیگی صحیح اختیار سے کی جائے۔ جنون میں چونکہ اختیار صحیح نہیں اس لئے جنون کی حالت میں عبادات کی ادائیگی ہی صحیح نہیں پس وہ شارع علیہ السلام کی طرف سے واجب الادا ہی نہیں لیکن اگر ایک مجنون آدمی کسی کا کوئی نقصان کرتا ہے تو مالی نقصان بہر حال اس کا ولی پورا کرے گا اور اس کے مال سے عشر اور خراج بھی دیا جائے گا۔ یہ سب کچھ اس کا ولی کرے گا۔

نیند نفس وجوب کے منافی نہیں کیونکہ بیداری کی امید ہوتی ہے اور پتہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اسے ادا کرے گا یا قضاء کرے گا لیکن جنون جب طویل ہو تو اس میں اداء یا قضاء کا امکان نہیں ہوتا اسی لئے اس سے نفس وجوب بھی ساقط ہو جاتا ہے۔

اگر جنون چند لمحوں کے لئے طاری ہوتا ہوتو پھر اس پر عبادات واجب ہوں گی اور افاقہ ہونے کے بعد وہ انہیں ادا یا قضاء کرے گا کیونکہ اس کے لئے یہ ممکن ہے۔ اسی لئے نفس وجوب اس کے ذمہ ہے۔ کم جنون کی حد عبادات میں مختلف ہے۔ نماز میں یہ ایک دن اور ایک رات ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ایک دن اور ایک رات کے بعد نماز کا تکرار لازم آ جاتا ہے اس لئے وہ کم سے زیادہ مدت میں چلی جاتی ہے۔ روزہ میں جنون کی کم مدت سے مراد ایک ماہ ہے کیونکہ روزوں کا فرض مہینہ ایک ہی ہے۔ اس لئے اس میں ایک ماہ مکمل ہونے کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسی طرح زکوٰۃ کے لئے ایک سال کم مدت ہے اور ایک سال سے زیادہ مدت زیادہ شمار ہوگی۔ شیخ ابن الھمام علیہ الرحمہ نے ایسا ہی کہا ہے۔

مشہور یہ ہے کہ زیادہ مدت سے مراد وہ عرصہ ہے جس میں ایک واجب، حد تکرار میں داخل ہو جائے۔ نماز ایک دن اور ایک رات گزرنے کے بعد حد تکرار میں داخل ہوتی ہے، زکوٰۃ ایک سال گزرنے کے بعد حد تکرار میں داخل ہوتی ہے۔

شیخ ابن الھمام نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حد تکرار تک پہنچنے کی صرف یہ صورت ہے کہ دوسرا سال بھی مکمل ہو جائے نہ کہ دوسرا سال شروع ہو کیونکہ زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے سال کا پورا ہو جانا شرط ہے (تکرار زکوٰۃ کے لئے ایک سال نہیں دو سال مکمل درکار ہیں)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مشائخ کے پیش نظر نفس وجوب ہے۔ اس اعتبار سے دوسرا سال شروع ہوتے ہی زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے اور حد تکرار میں زکوٰۃ داخل ہو جاتی ہے کیونکہ جب انسان ابتدائے سال میں نصاب کا مالک ہوتا ہے تو تبھی اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور سال گزرنے کے بعد اس کی ادائیگی لازم آ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے سال کے شروع میں بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

کم اور زیادہ مدت میں ایک اور لحاظ سے بھی فرق کیا جا سکتا ہے کہ جب پورا سال تندرستی میں گزرا اور جنون کا عارضہ لاحق نہیں ہوا تو زکوٰۃ کی فرضیت کا سبب سال کی ابتداء میں ہی جنون سے پہلے پایا گیا یعنی وہ خاص جزء جو مال کے ساتھ ملا ہوا ہے لہٰذا نفس فرضیت اس آدمی کے ذمہ ہے پھر جنون کا اگر عارضہ لاحق ہو بھی گیا تو نفس وجوب (فرضیت) اس سے ساقط نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ امید موجود ہے کہ وہ سال کے دوران صحت مند ہو جائے گا جیسا کہ نیند کی حالت میں انسان عارضی طور پر خطاب کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ جب جنون لمبا نہ ہوا اور سال کے آخر میں اسے افاقہ ہو گیا تو خطاب اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور زکوٰۃ کی ادائیگی اس پر لازم ہو گئی۔

کیونکہ اہلیت وجوب کے وقت وہ سبب پایا گیا جس کی بناء پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور اداء کی اہلیت کے زمانے تک یہ باقی رہا اس لئے وہ شخص حکم خداوندی کا مخاطب ٹھہرا اور اس پر نفس وجوب اور ادائیگی دونوں لازم آئے۔

اس کے برعکس اگر پورا سال ہی حالت جنون میں مبتلا رہا اور سال کے دوران اسے کچھ افاقہ نہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس کی طرف متوجہ ہوتا یا سال گزرنے کے بعد اسے افاقہ ہوا اور وہ حکم خداوندی کا مخاطب ٹھہرا تو اب زکوٰۃ کی ادائیگی اس پر فرض نہیں بلکہ ادائیگی صحیح نہیں۔ لہٰذا نفس وجوب کا کچھ فائدہ نہ رہا اور اس وجہ سے نفس وجوب

ساقط ہو گیا۔

بہر حال سال کے دوران تھوڑا سا جنون اپنے وقت میں تعلق خطاب کو باطل نہیں کرتا لیکن اگر جنون پورے سال پر حاوی ہو تو آدمی مخاطب نہیں رہتا اسی لئے جب اس کا وقت آتا ہے تو ادائیگی واجب نہیں رہتی اور نفس وجوب بھی ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ نفس وجوب کے لئے لازم ہے کہ آدمی خطاب کو سمجھے اور عبادت کو اس کے وقت میں ادا کر کے سبکدوش ہونے کا اہل ہو۔ جب لازم نہ پایا گیا تو ملزوم بھی اٹھ گیا۔

رہا اصلی پاگل پن یعنی کوئی شروع سے ہی پاگل پن میں مبتلا ہے تو امام یوسف کے نزدیک اس پر نماز، روزہ فرض نہیں۔ امام ابوحنیفہ کی ایک روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے جسے صاحبِ ہدایہ نے پسند کیا ہے۔ میرے خیال میں یہی رائے قرین ثواب ہے کیونکہ بچپن میں سبب نے اس پر کوئی چیز واجب نہیں کی۔ جب وہ جنون میں مبتلا ہوا تو اسی حالت پر رہا جس حالت پر پہلے تھا اور یہ سبب کسی چیز کو واجب کرنے سے مانع رہا لیکن جو بلوغت کے بعد پاگل ہوا اس پر عبادت واجب ہوئی۔ لہٰذا اب وہ اس وقت تک یہ حکم نہیں اٹھ سکتا جب تک کوئی قوی سبب موجود نہیں ہو جاتا۔ اگر کوئی ایسا سبب پایا گیا جو اس کے وقت میں تعلق خطاب سے مانع تھا تو نفس وجوب اٹھ جائے گا ورنہ نہیں اور ایسے شخص کا عبادت کرنے سے مرفوع القلم ہونا زیادہ آسان ہے۔ **ھذا ما عندی۔**

جو شخص حالت جنون میں بالغ ہوا پھر وہ تندرست ہو گیا تو سال کی ابتداء کا حساب افاقہ کے دن سے لگایا جائے گا۔ خواہ وہ پورا سال بیماری میں مبتلا رہا ہو یا اس سے کم عرصہ تک۔

امام محمد فرماتے ہیں اصلی اور عارضی جنون میں کوئی فرق نہیں۔ دورانیہ کو دیکھا جائے گا۔ بیماری اگر لمبے عرصے کے لئے ہے تو وجوب زکوٰۃ کو مانع ہے۔ تھوڑے عرصے کے لئے ہے تو مانع نہیں۔

ان دونوں میں سے جنون مدید (جو پورا سال رہے) زکوٰۃ کی فرضیت کو مانع ہے اور جنون قصیر (جو سال سے کم عرصہ تک رہے) زکوٰۃ کی فرضیت سے مانع نہیں۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کی رائے کی مشہور دلیل یہ ہے کہ جو پاگل پن بچپنے میں لاحق ہوتا ہے وہ دماغ کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے درحقیقت اس کی وجہ ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے عقل کامل نہیں ہوتی اور انسان بعد میں بھی اس کیفیت سے باہر نہیں آتا۔ یہ جنون اصلی ہے اور ایسا پاگل شخص بچوں کی طرح شرعی احکام کا مکلف نہیں ہوتا لیکن جو شخص بلوغت تک صحت مند رہا اور بعد میں پاگل ہو گیا تو اس کا جنون کمال عقل کے بعد کسی اور عارضے کا نتیجہ ہے۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ اصل میں جبلی طور پر آدمی سلامت ہوتا ہے تو سلامتی حقیقی چیز ہے اور اس کا فوت ہو جانا کسی عارضہ کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے جنون ہے ہی عارضی کیفیت۔ عارضی جنون میں حکم یہ ہے کہ قصیر ہے تو زکوٰۃ کی فرضیت سے مانع نہیں اور اگر مدید ہے تو زکوٰۃ کی فرضیت سے مانع ہے۔

سال مکمل ہونے پر صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے

زکوٰۃ صرف اس مال پر واجب ہے جس پر سال گزر جائے اور وہ نصاب بنتا ہو۔ نصاب کی تفصیل انشاء اللہ عنقریب آئے گی۔

سال گزرنے کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من استفاد مالا فلا زکوة علیه حتی یحول الحول علیه. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے مال سے فائدہ حاصل کیا اس پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک سال گزر نہیں جاتا۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ زکوٰۃ ضروریات سے زائد ایسے مال پر فرض ہے جس میں نمو ہو اور نمو سال سے پہلے ممکن نہیں کیونکہ سال چار موسموں اور مختلف لمحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ سال میں مال کی نمو یا تو تجارت سے ہوگی یا کاشت کاری سے۔ چونکہ نمو امر خفی ہے اس لئے ایک سال کے عرصہ کو نمو کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ نمو امر خفی اس لحاظ سے ہے کہ سفر اور مشقت جیسی چیزیں اس کو مشکوک بنا دیتی ہیں۔ اس لئے حولانِ حول کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا اور حکم کو اس پر لاگو کر دیا گیا کہ نمو ہو یا نہ ہو جب ایک سال کا عرصہ گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

صاحبِ نصاب سال گزرنے سے قبل بھی زکوٰۃ دے سکتا ہے

جب کوئی شخص صاحب نصاب ہو تو وہ سال گزرنے سے پہلے بھی زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه وجوه آله الکرام ان العباس سال رسول الله صلی الله علیه وسلم فی تعجیل زکوته قبل ان یحول الحول مسارعة الی الخیر فاذن له فی ذلک. (رواہ ابوداؤد والترمذی)

امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا سال گزرنے سے پہلے نیکی کی طرف جلدی کرنے کی غرض سے وہ زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اجازت مرحمت فرمائی۔

ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ جب سال گزرنے سے پہلے اس سال کی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ سال کا گزرنا فرضیت زکوٰۃ کا سبب نہیں اور جب سال گزرنے سے پہلے فرض کو ادا کرنے کی نیت سے زکوٰۃ دینا جائز ہے تو معلوم ہوا کہ فرضیت ثابت ہے اور جب سال گزرنے تک دیر کرنا گناہ کا موجب نہیں تو معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی طلب کا خطاب (واتوا الزکوة) متوجہ نہیں۔ سو زکوٰۃ کی فرضیت' ادائیگی زکوٰۃ کی فرضیت سے مختلف چیز ہے لہٰذا زکوٰۃ کا انسان کے ذمہ لازم ہونا اصل میں سبب سے ثابت ہے اور وہ سبب نصاب ہے۔ (یعنی جب انسان نصاب کا مالک ہوتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے) لیکن اس کی ادائیگی کے فرض ہونے میں ڈھیل دی گئی ہے۔ (فوراً واجب ہوتے ہی ادا نہیں ہوتی بلکہ سال تک اسے ڈھیل دی جاتی ہے) اور خطاب (زکوٰۃ دو) پورا سال گزرنے کے بعد متوجہ ہوتا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے جس پر اصول فقہ کی کتابوں میں خوب گفتگو کی گئی ہے۔ ہم نے فواتح الرحموت شرح المسلم میں اس بارے کچھ گفتگو کی ہے۔

مال ضمار میں زکوٰۃ نہیں

مال ضمار (یعنی جس مال کی واپسی کی امید نہ ہو) میں زکوٰۃ فرض نہیں اور مال ضمار سے مراد وہ دولت ہے جس کی وصولی کی کچھ امید نہ ہو جیسے قرض کا مال کہ مقروض دینے سے انکار کرتا ہے اور قرض خواہ کے پاس کوئی گواہ اور ثبوت نہیں ہے۔ اسی طرح سمندر میں گرنے والا یا مدفون مال جس کے بارے معلوم نہیں ہو سکا کہ مال کہاں دفن کیا گیا تھا۔ بادشاہ کے ہاتھوں غصب شدہ مال یا کسی اور کے ہاتھوں ظلماً چھینا گیا مال' وہ مال جو دشمن دارالحرب لے گیا۔ امانت رکھا گیا مال کہ معلوم نہیں یہ مال کس کے پاس امانت رکھا تھا؟ وہ مال جو عورت کو بطور مہر ادا کیا گیا پھر معلوم ہوا کہ وہ تو لونڈی تھی اور اس کا نکاح باطل ہے (کہ اس کے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح ہو گیا) اور سال گزرنے کے بعد یہ سب حالات معلوم ہوئے۔ اسی طرح کسی مرد کی داڑھی نوچنے کی دیت کے طور پر مال دیا گیا لیکن سال گزرنے کے بعد داڑھی کے بال دوبارہ اگ آئے اور جب مال مالک کے پاس پہنچا تو سال گزر چکا تھا یا سال کا اکثر حصہ گزر چکا تھا تو گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ ہمارے نزدیک ان پر فرض نہیں۔ امام زفر اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی انہیں دینا ہو گی کیونکہ یہ مال ایک شخص کی ملکیت تھے اور یہ ملکیت بھی صحیح تھی لہٰذا سبب پائے جانے کی وجہ سے زکوٰۃ فرض ہو گی۔

ہم کہتے ہیں کہ سبب نہیں پایا جا رہا کیونکہ سبب ایسا مال ہے جس میں نمو ممکن ہو مگر یہاں نمو کی کوئی صورت نہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا سبب وہ مال ہے جو کسی کی ملکیت میں ہو اور اس میں وہ پوری طرح تصرف کر سکتا ہو اور وہ اپنے ہاتھ سے مال دے کر ایک دوسرے کو اس کا مالک بنا سکتا ہو اور یہ چیزیں مال ضمار میں نہیں پائی جاتیں۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں۔

عن ایوب السختیانی ان عمر بن عبد العزیز کتب فی مال قبضه بعض الولاۃ ظلما فامر ان یردہ الی اھلہ وتوخذ زکوته لما مضی من السنین ثم عقب ذلک بکتاب ان لاتؤخذ منه الازکوۃ واحدۃ فانه کان ضمارا۔

ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے مال کے سلسلے میں ایک خط لکھا جو بعض والیوں نے ظلماً اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور حکم دیا کہ وہ مال اصل مالکوں کو واپس کر دیا جائے اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ لے لی جائے اس کے بعد ایک اور خط تحریر فرمایا کہ اس مال سے زکوٰۃ نہ لی جائے سوائے ایک سال کی زکوٰۃ کے کیونکہ وہ مال ضمار تھا۔

قرض دی گئی رقم پر زکوٰۃ کے متعلق ائمہ احناف کا موقف

رہا وہ قرض جو مقروض کے ذمے ثابت ہے اور اس پر گواہی بھی موجود ہے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی تین قسمیں ہیں۔ قوی' متوسط اور ضعیف۔ قوی سے مراد وہ قرض ہے جو قرض یا مال تجارت کا بدل

ہے۔ ایسے مال میں سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہے اور ادائیگی میں اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک وہ چالیس درہم اپنے ہاتھ میں نہیں لے لیتا۔ جب وہ چالیس درہم مقروض سے واپس لے لے گا تو اس میں سے ایک درہم زکوٰۃ ادا کرے گا اور اسی طرح جوں جوں اسے رقم ملتی جائے گی وہ اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کرتا جائے گا۔

دین متوسط سے مراد وہ قرض ہے جو مال تجارت کے علاوہ کسی اور کا بدل ہو۔ اس میں وہ قرض بھی شامل ہے جو وارث کو وراثت میں ملنا ہوتا ہے۔ ایسے مال پر سال گزرنے پر زکوٰۃ فرض ہے اور ادائیگی میں اس وقت تک مہلت ہے جب تک اصل مالک پورے نصاب کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے لیتا۔ ان دونوں قسموں پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی فرض ہے۔

تیسری قسم یعنی دین ضعیف سے مراد وہ قرض ہے جو کسی کے ذمہ واجب الادا ہوں لیکن کسی مال کے بدلے نہیں۔ مثلاً مہر کا مال جو خاوند نے بیوی کو دینا ہے۔ خلع کا مال' قصاص کا مال' دیت کا مال' زر کتابت وغیرہ ایسے قرض ہیں جو کسی مال کا بدل نہیں ہوتے۔ ایسے مال پر زکوٰۃ اس وقت فرض ہو گی جب وہ مالک کے قبضہ میں آ جائے اور قبضہ کے بعد اس پر ایک سال کا عرصہ گزر جائے۔ ایسے مال پر گزشتہ (یعنی قبضہ سے پہلے) سالوں کی زکوٰۃ دینا فرض نہیں ہے کیونکہ یہ مال کسی مال کا بدل نہیں ہوتا اس لئے اس پر مال کا اطلاق قبضہ کے بعد ہوتا ہے۔ قبضہ سے پہلے وہ مال کے حکم میں نہیں۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ سب دین برابر ہیں' سب پر زکوٰۃ فرض ہے لیکن یہ مہلت دی جائے گی کہ جب تک قبضہ نہیں ہوتا زکوٰۃ ادا نہ کی جائے اور جو مال مالک کے ہاتھ میں آ گیا تھوڑا ہے یا زیادہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ہاں کتابت اور سعایہ کے بدل میں زکوٰۃ نہیں کیونکہ وہ ثابت شدہ قرض نہیں۔ بدل کتابت عجز کی وجہ سے ساقط ہو سکتا ہے اور ''سعایہ'' مؤخر ہو سکتا ہے۔

ادائیگی زکوٰۃ میں نیت شرط ہے

زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیت شرط ہے کیونکہ زکوٰۃ ایک عظیم عبادت اور نماز کی طرح ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں اصل مطلوب ثواب ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے نیت ضروری ہے۔ اگر زکوٰۃ بلا نیت ادا کی گئی تو ادا نہیں ہو گی جیسے نماز بغیر نیت کے معتبر نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نماز بلا نیت ایک لغو عمل ہے اور زکوٰۃ ہبہ بن جاتی ہے اور ہبہ پر ثواب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

اگر کسی نے مطلق صدقہ کی نیت سے زکوٰۃ دی تو یہ نفلی صدقہ ہو گا جب تک زکوٰۃ کی نیت سے زکوٰۃ ادا نہیں کرتا' وہ اس فریضہ سے بریٔ الذمہ نہیں ہو گا جیسے نماز میں مطلق نیت سے نفل نماز ہوتی ہے۔ ہاں اگر وہ اپنا سارا مال صدقہ کی نیت سے خرچ کر دیتا ہے تو زکوٰۃ کے فریضہ سے سبکدوش ہو جائے گا کیونکہ فرض زکوٰۃ نام ہے مال میں سے ایک جزء کسی مصرف (مصارف زکوٰۃ کا تذکرہ بعد میں ہو گا) کے حوالے کرنے کا تاکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل ہو۔ سو اس مال میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی موجود ہوتا ہے۔ جب ایک شخص اپنا تمام مال راہ خدا میں خرچ کر

دیتا ہے تو سارا مال اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں چلا جاتا ہے جیسا کہ حدیث صدقہ میں مذکور ہے اور یوں حق حقدار کے پاس پہنچ جاتا ہے اور زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے۔

زکوٰۃ میں انسانی قدرت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ایک تو تھوڑے مال پر زکوٰۃ نہیں' نصاب پر ہے جو خطیر مالیت رکھتا ہے دوسرا سال بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کو فرض قرار دیا گیا ہے اور کثیر مال میں سے ایک جزء راہ خدا میں دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام کی نظر میں انسان کے لئے آسانیاں پیدا کرنا تھیں نہ کہ اسے مشکلات میں مبتلا کرنا تھا۔ اسی لئے اگر مال ضائع ہو جائے اور اس میں مالک کا ہاتھ نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ سب قدرتِ خداوندی سے ہوا۔ لہٰذا حقدار نے اپنا حق تلف کر دیا اگر اس کا بدل انسان کے ذمہ لازم کیا جائے تو زکوٰۃ ایک ٹیکس ہوگی اور یہ اس کی رحمت سے بعید ہے۔ علم الاصول میں اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو پائی جاتی ہے۔

مویشیوں کی زکوٰۃ

مویشیوں کی زکوٰۃ اور دیگر امور کے متعلق حضور ﷺ کا اہل یمن کے نام گرامی نامہ

ان خطوط کا ذکر جن میں صدقات کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے ایک خط عمرو بن حزم کا ہے۔ اس خط کو حاکم نے ابوبکر بن محمد بن حزم سے روایت کیا۔ انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے اسے روایت کیا اور ان کے دادا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرمایا۔ یہ خط حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل یمن کے نام لکھا تھا۔ اس میں فرائض' سنن اور دیتوں کا بیان ہے۔ اس خط کو لے کر عمرو بن حزم یمن تشریف لے گئے تھے اور یمنیوں کو پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ خط یہ ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے۔ یہ خط محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے سرجیل بن عبد کلال' حارث اور نعیم بن کلال سرداران ذی رعین' معافر اور ہمدان کے نام لکھا جا رہا ہے۔ اس کے بعد تمہارا قاصد لوٹ آیا ہے۔ تم نے مغانم دے دیئے۔ خمس اور اہل ایمان پر جو صدقات واجب ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ جس زمین کو بارش کا پانی سیراب کرتا ہو اسی طرح سبزیوں میں سے دسواں حصہ دینا ہوگا جبکہ وہ پانچ وسق کو پہنچ جائیں اور جس زمین کو کنویں راہٹ وغیرہ سے سیراب کیا جاتا ہو اس سے بیسواں حصہ دینا ہوگا جبکہ پیداوار (کم از کم) پانچ وسق ہو۔ اونٹ جو سال بھر یا سال کا اکثر حصہ چرتے ہوں ہر پانچ پر ایک بکری ہوگی اور یہی زکوٰۃ چوبیس اونٹوں تک رہے گی۔ جب چوبیس سے ایک بھی زائد ہو جائے گا تو ایک بنت مخاض (ایک سالہ اونٹنی) واجب ہوگی۔ اگر ایک سالہ اونٹنی (گلے) میں نہ پائی گئی تو پھر ایک ابن لبون (دو سالہ اونٹ) دینا ہوگا۔ یہاں تک کہ یہ تعداد پینتیس ۳۵ ہو جائے۔ اگر ایک زائد ہو جاتا ہے تو پھر پینتالیس تک ایک بنت لبون (دو سالہ مادہ اونٹنی) اگر اس تعداد سے ایک

زائد ہو جائے (یعنی چھیالیس ہو جائے) تو اس میں ایک حقہ (تین سال کی اونٹنی) جو جفتی کے قابل ہو حتیٰ کہ تعداد ساٹھ ہو جائے۔ اگر ساٹھ سے ایک اونٹ زائد ہو تو پھر پچھتر تک جذعہ (پانچ سالہ اونٹنی) اگر اس سے ایک بڑھ جائے (یعنی چھہتر ہو جائے) تو دو بنت لبون (دو سالہ اونٹنیاں) نوے تک۔ اگر ایک بڑھ جائے تو قابل جفتی دو حقے (تین سالہ اونٹنیاں) ایک سو بیس تک۔ ایک سو بیس سے جو زائد ہوں گی ان میں سے ہر چالیس پر ایک دو سالہ اونٹنی اور ہر پچاس پر تین سالہ اونٹنی۔

تیس گائے میں سے ایک دو سالہ بچھڑا یا بچھڑی۔ ہر چالیس گائے پر ایک گائے۔

ہر چرنے والی چالیس بکریوں پر ایک بکری ایک سو بیس تک اگر ایک سو بیس سے ایک بڑھ جائے تو پھر دو سو تک دو بکریاں۔ اگر ایک بڑھ جائے تو تین سو تک تین بکریاں۔ اگر اس تعداد سے ایک بکری زیادہ ہو تو ہر سو پر ایک بکری۔

صدقہ میں لاغر' کمزور' اندھی' نر بکری یا بھیڑ نہیں لی جائے گی اگر صدقہ لینے والا راضی ہو تو حرج نہیں۔

صدقہ کے ڈر سے جو مال جدا جدا ہوا سے اکٹھا نہ کیا جائے اور جو اکٹھا ہوا سے الگ الگ نہ کیا جائے اور جس مال میں دو آدمی شریک ہوں تو دونوں رضامندی سے برابر حصہ بانٹ لیں۔

ہر پانچ اوقیہ چاندی میں سے پانچ درہم اور جو اس سے زائد ہو تو چالیس درھموں میں ایک درہم۔ پانچ سے کم اوقیہ میں زکوٰۃ نہیں۔

ہر چالیس دینار میں ایک دینار۔

صدقے کا مال محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اہل محمد کے لئے حلال نہیں۔ یہ ایسا مال ہے جس کے ذریعے لوگ اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں۔ یہ مال مسلمان فقیروں کے لئے' راہ خدا میں اور مسافروں کے لئے ہے۔ غلام' کھیتی اور اس میں کام کرنے والوں میں کچھ واجب نہیں جبکہ اس کا عشر ادا کر دیا گیا ہو۔

مسلمان کے غلام اور اس کے گھوڑے میں کوئی چیز لینا واجب نہیں۔ اس خط میں یہ چیز بھی مرقوم تھی کہ عند اللہ سب کبیرہ گناہوں سے بڑے گناہ شرک' قتل ناحق' جنگ سے فرار' والدین کی نافرمانی' پاکباز عورت پر جھوٹی تہمت' جادو سیکھنا' سود خوری' یتیم کا مال کھانا ہیں۔

عمرہ حج اصغر ہے' قرآن کو بغیر وضو نہ چھوا جائے۔ نکاح سے پہلے کوئی طلاق نہیں۔ غلام کو خریدنے سے پہلے اسے آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ تم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے کہ اس کے جسم کا کچھ حصہ نظر آ رہا ہو اور تم میں سے کوئی شخص بالوں کا جوڑا بنا کر نماز نہ پڑھے اور ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھوں پر کوئی کپڑا نہ ہو"۔

اسی نامہ مبارک میں یہ بھی مرقوم تھا کہ جس نے کبھی مومن کو عمداً قتل کیا تو وہ مجرم ہے اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا مگر یہ کہ مقتول کے ورثاء راضی ہو جائیں۔ قتل کی دیت میں سو اونٹ ہیں۔ ناک کٹ جانے کی صورت میں اگر ناک کٹ جانے کے بارے دعویٰ کیا گیا تو پوری دیت ہے۔ (اسی طرح) زبان' ہونٹ' خصیتین کے دونوں

انڈے کٹ گئے' آلہ تناسل' ریڑھ کی ہڈی' دونوں آنکھیں۔ ان میں سے ہر ایک چیز کے لئے پوری دیت دینا لازم ہے۔ ٹانگ کٹ جانے کی صورت میں نصف دیت ہے۔ سر کے ایسے زخم کی تہائی دیت ہے جو دماغ کی جھلی تک پہنچ جائے۔ جو زخم معدے تک پہنچ جائے اس پر تہائی دیت ہے۔ ہڈی ٹوٹ کر اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اس پر پانچ اونٹ دیت ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں سے اگر کوئی انگلی کٹ جائے تو بیس اونٹ۔ دانت ٹوٹ جائے تو پانچ اونٹ اور ایسا زخم جو گوشت کے نیچے ہڈی کو ظاہر کر دے۔ اس کی صورت میں پانچ اونٹ۔ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور سونا رکھنے والوں پر ایک ہزار دینار دیت ہے''۔

امام نسائی نے اس خط کو ''اور اس کتاب میں ہے'' کے الفاظ سے روایت کیا ہے۔ امام نسائی نے ابن شہاب سے روایت فرمایا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامہ مبارک جو انہوں نے عمرو بن حزم کے لئے لکھا تھا جبکہ انہیں نجران پر امیر بنا کر بھیجا' پڑھا۔ یہ خط ابوبکر بن حزم کے پاس تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھا: یہ ''اللہ اور اس کے رسول کا بیان ہے۔ اے ایمان والو! اپنے وعدوں کو پورا کرو۔ اس خط میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیات مبارکہ لکھیں حتیٰ کہ آپ ان آیات کو لکھتے ہوئے یہاں تک پہنچے بیشک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے پھر یہی خراج سے متعلقہ خط تحریر فرمایا کہ سو اونٹ کی زکوٰۃ اور اس طرح اسے ذکر فرمایا۔

حماد بن سلمہ سے روایت ہے کہ میں نے قیس بن سعد سے کہا: میرے لئے (کہیں سے) محمد بن عمرو بن حزم کا خط لو۔ انہوں نے مجھے ایک خط دیا اور بتایا کہ یہ خط میں نے ابوبکر بن محمد بن حزم سے لیا ہے اور انہوں نے بتایا کہ یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے دادا کو لکھا تھا۔ اس میں اونٹوں کی زکوٰۃ کا بیان ہے۔ انہوں نے حدیث بیان کی حتیٰ کہ ایک سو بیس اونٹوں کی زکوٰۃ تک پہنچے۔ پس جب ایک سو بیس اونٹ ہو جائیں تو پھر اونٹوں کی پہلی زکوٰۃ کی طرف لوٹنا ہو گا (یعنی پانچ پر ایک بکری) فتح القدیر میں ہے کہ اسے طحاوی اور ابوداؤد نے مراسیل میں روایت کیا ہے اور اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اہل بحرین کے نام خط

ایک اور خط یہاں ذکر کرنا ضروری ہے جو حضرت ابوبکر صدیق کا لکھا ہوا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو حضرت انس کو بحرین بھیجا اور انہیں یہ خط لکھ کر دیا۔

یہ خط اس صدقہ کی تفصیلات کے بارے ہے۔ جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرض قرار دیا۔ جو شخص اہل ایمان سے اس خط کے مندرجات کے مطابق زکوٰۃ کا مطالبہ کرے تو وہ اسے دیں اور جو زائد کا مطالبہ کریں وہ اسے نہ دیں۔ پچیس سے کم اونٹوں پر بکریاں بطور زکوٰۃ فرض کی گئی ہیں۔ ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری۔ پچیس اونٹ ہو جائیں تو ایک برس کی اونٹنی۔ یہاں تک کہ اونٹوں کی تعداد پینتیس کو پہنچ جائے۔ اگر ایک سال کی اونٹنی نہ ہو تو پھر دو سالہ نر اونٹ۔ جب چھتیس اونٹ ہو جائیں تو پینتالیس تک ایک دو سالہ مادہ اونٹنی۔ جب

چھیالیس اونٹ ہو جائیں تو ان میں تین سال کی اونٹنی جو جفتی کے قابل ہو۔ جب یہ تعداد اکسٹھ ہو جائے تو اکہتر تک چار سال کی اونٹنی۔ جب اونٹ چھہتر ہو جائیں تو نوے تک دو سال کی دو اونٹنیاں۔ جب تعداد اکانوے کو پہنچ جائے تو اس میں جفتی کے قابل تین تین سال کی دو اونٹنیاں ایک سو بیس تک۔ جب ایک سو بیس سے تعداد زیادہ ہو جائے تو پھر ہر چالیس میں ایک دو سالہ اونٹنی اور پچاس میں ایک تین سالہ اونٹنی۔ اگر کسی کے پاس صرف ۴ اونٹ ہوں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ ہاں اگر وہ چاہے تو نفلی صدقہ دے سکتا ہے۔ چار سے پانچ ہو جائیں تو ان میں ایک بکری۔

اور چرنے والی بکریاں جب چالیس ہوں تو ایک سو بیس تک صرف ایک بکری۔ ایک سو بیس سے بڑھ جائیں تو دو سو تک دو بکریاں۔ دو سو سے زیادہ ہو جائیں تو تین سو تک تین بکریاں اور تین سو سے زیادہ ہو جائیں تو پھر ہر سو پر ایک بکری۔ اگر کسی آدمی کے پاس چالیس سے ایک بھی کم کا ریوڑ ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ ہاں اگر مالک چاہے تو۔ متفرق مال کو اکٹھا اور اکٹھے کو زکوٰۃ کے خوف سے متفرق نہیں کیا جائے گا۔

جو مال مشترک ہو تو وہ دونوں شریکوں کے درمیان برابر برابر بٹ جائے گا۔ زکوٰۃ میں بوڑھی، لاغر اور بکرا نہیں لیا جائے گا۔ سوائے اس کے کہ زکوٰۃ لینے والا پسند کرے۔

چاندی میں چالیسواں حصہ ہے۔ اگر کسی کے پاس صرف ایک سو نوے درہم ہوں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ سوائے اس کے کہ مالک خود دینا چاہے۔

اگر کسی نے زکوٰۃ میں ایک چار سالہ اونٹ دینا ہے اور اس کے پاس چار سالہ اونٹ نہیں تین سالہ ہے تو وہی لے لیا جائے گا۔ اگر ہو سکے تو اس کے ساتھ دو بکریاں یا بیس درہم دے۔ اگر کسی کی زکوٰۃ تین سالہ اونٹ تک پہنچ گئی ہے لیکن اس کے پاس تین سالہ اونٹ کے بجائے دو سالہ ہے تو اس سے وہی قبول کر لیا جائے اور صدقہ دینے والا بیس درہم یا دو بکریاں بھی صدقہ لینے والے کو دے دے۔ جس کی زکوٰۃ دو سالہ اونٹنی کو پہنچ گئی ہے اور اس کے پاس دو سالہ کی بجائے تین سالہ اونٹنی ہے تو اس سے وہ قبول کیا جائے اور صدقہ لینے والا اپنی طرف سے صدقہ دینے والے کو دو بکریاں یا بیس درہم دے۔ جس کا صدقہ ایک سالہ اونٹنی کو پہنچ گیا مگر اس کے پاس ایک سالہ نہیں بلکہ دو سالہ اونٹنی ہے تو اسے قبول کیا جائے اور زکوٰۃ لینے والا زکوٰۃ دینے والے کو بیس درہم یا دو بکریاں دے۔ اگر ایک سالہ اونٹنی لازم تھی مگر دو سالہ اونٹنی بھی نہیں بلکہ دو سالہ اونٹ ہے تو اسی اونٹ کو قبول کیا جائے اور اس کے ساتھ اور کچھ نہیں۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا خط مبارک

(اسی طرح کا ایک خط) امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تحریر شدہ ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ میں نے زکوٰۃ کے بارے حضرت عمر کے خط کا مطالعہ کیا ہے۔ خط کچھ اس طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ خط زکوٰۃ سے متعلق ہے چوبیس اونٹوں میں ہر پانچ کے بدلے ایک بکری۔ اس سے زیادہ ہوں تو پینتیس تک ایک برس کی اونٹنی۔ اگر ایک برس کی اونٹنی نہ ہو تو دو

سالہ اونٹ۔ اس سے زیادہ میں پینتالیس تک دو سال کی اونٹنی اور اس سے زیادہ میں ساٹھ تک تین سال کی اونٹنی جو جفتی کے قابل ہو اور اس سے زیادہ میں پچھتر تک چار سال کی اونٹنی اور اس سے زیادہ میں نوے تک دو دو سال کی دو اونٹنیاں اور اس سے زیادہ میں ایک سو بیس تک تین تین سال کی دو اونٹنیاں جو جفتی کے قابل ہوں اور جو اس سے زیادہ ہوں تو ہر چالیس میں دو سال کی اونٹنی اور ہر پچاس میں تین سال کی اونٹنی۔

اور چرنے والی بکریاں جب چالیس ہو جائیں تو ایک سو بیس تک ایک بکری اور اس سے زیادہ میں دو سو تک دو بکریاں اور اس سے زیادہ میں تین سو تک تین بکریاں اور اس سے زیادہ میں ہر سو پر ایک بکری اور زکوٰۃ میں بکرا نہیں لیا جائے گا اور نہ عیب دار اور بوڑھی بکری سوائے اس کے کہ زکوٰۃ لینے والا پسند کرے اور جو مال جدا جدا ہو اسے اکٹھا نہ کیا جائے اور نہ زکوٰۃ کے خوف سے اکٹھے مال کو جدا جدا کیا جائے اور جس مال میں دو آدمی شریک ہوں تو دونوں رضامندی سے برابر حصہ بانٹ لیں اور چاندی جب پانچ اوقیہ ہو جائے تو اس میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔

امام مالک کی یہ روایتیں حضرت عمر پر موقوف ہیں۔

مال مویشی کی زکوٰۃ کے حوالے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک اور گرامی نامہ

ابو داؤد علیہ الرحمہ٬ امام زہری علیہ الرحمہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کی نقل ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوٰۃ کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ سالم بن عبداللہ بن عمر نے میرے سامنے پڑھا اور میں نے اسے یاد کر لیا۔ یہی وہ خط ہے جسے عمر بن عبدالعزیز نے عبداللہ بن عبداللہ بن عمر اور سالم بن عبداللہ سے نقل فرمایا۔ ایک سو بیس اونٹ تک اسی طرح ہے جیسے حدیث گزر چکی ہے۔ جب ایک سو اکیس ہو جائیں تو دو سالہ تین اونٹیناں حتیٰ کہ یہ تعداد ایک سو انتیس ہو جائے۔ جب ایک سو تیس ہو تو دو سالہ دو اور ایک تین سالہ اونٹنی دینا ہوں گی ایک سو انتالیس تک۔ ایک سو چالیس سے ایک سو انچاس تک تین تین سال کی دو اور دو سال کی ایک اونٹنی ایک سو پچاس سے ایک سو انسٹھ تک تین تین سال کی دو اور دو سال کی ایک اونٹنی۔ ایک سو پچاس سے ایک سو انسٹھ تک تین تین سال کی تین اونٹنیاں ایک سو ساٹھ سے ایک سو انہتر تک دو دو سالہ چار اونٹنیاں ایک سو ستر سے ایک سو اناسی تک دو دو سالہ تین اور ایک چار سالہ اونٹنی ایک سو اسی سے ایک سو نواسی تک تین تین سالہ دو اور دو دو سالہ دو اونٹنیاں۔ ایک سو نوے سے ایک سو ننانوے تک تین تین سالہ تین اور دو سالہ ایک اونٹنی دو سو پر تین سالہ چار اونٹیناں یا دو سالہ پانچ اونٹنیاں جو موجود ہوں۔ چرنے والی بکریوں کے بارے ایسے ہی بیان کیا جیسے گذشتہ حدیث میں گزرا ہے۔

اس روایت میں دوسری احادیث کی نسبت قدرے زیادہ تفصیل ہے۔

مشترکہ مال میں زکوٰۃ کی صورتیں

تمام روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں جو مال جدا جدا ہو اسے اکٹھا نہ کیا جائے اور جو اکٹھا ہو زکوٰۃ کے خوف

سے اسے الگ نہ کیا جائے۔ شوافع کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے مال کو اکٹھا کر کے زکوٰۃ نہ لی جائے مثلاً تین آدمی ہیں جن کے پاس چالیس چالیس بکریاں ہیں تو ہر چالیس میں سے ایک بکری لی جائے نہ کہ ان کو جمع کر کے ایک سو بیس میں سے ایک بکری۔ اسی طرح ایک شخص کے پاس ایک سو بیس بکریاں ہیں تو انہیں زکوٰۃ زیادہ لینے کی غرض سے الگ الگ نہ کیا جائے بلکہ یہ مال ایک آدمی کا ہے لہٰذا ایک سو بیس سے صرف ایک بکری لی جائے۔ اسی طرح دو یا دو سے زائد آدمیوں کا مشترکہ مال ہے جو نصاب کو پہنچ جاتا ہے لیکن جب صدقہ لینے والا آئے تو یہ مال مختلف شریکوں کو دے کر الگ کر دیا جائے تاکہ ہر ایک کے پاس مال نصاب سے کم ہو اور زکوٰۃ نہ دینی پڑے۔ اسی لئے امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب مال مشترک ہو اور اشتراک صحیح بھی ہو مثلاً چراگاہ، جفتی کے لئے نر، دودھ نکالنے والا ایک ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگر نصاب کے برابر ہے۔ اگر پانچ شریکوں کے پاس پانچ اونٹ ہیں تو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا پڑے گی۔ اسی طرح اگر دو آدمیوں میں چالیس بکریاں مشترک ہیں اور ہر ایک کے حصہ میں بیس بکریاں آتی ہیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ اکٹھے مال کو جدا جدا کرنا لازم آئے گا۔

ہمارے نزدیک دونوں صورتوں میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی ورنہ نصاب سے کم میں زکوٰۃ کا فرض ہونا لازم آئے گا اور یہ صدقہ کی نص کے خلاف ہے۔

ہمارے نزدیک تفریق المجتمع سے مراد ملک میں تفریق ہے اسی طرح ملکیت میں جدا جدا مال کو اکٹھا کرنا مراد ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس بیس بکریاں ہیں اور دوسرے کے پاس بھی بیس تو انہیں عامل زکوٰۃ صدقہ لینے کے لئے اکٹھا نہ کرے کہ چالیس کی تعداد پوری ہو اور ایک بکری زکوٰۃ میں مل جائے۔ اسی طرح ایک شخص کے پاس چالیس ہیں تو انہیں جدا جدا نہ کیا جائے کہ زکوٰۃ نہ دینا پڑے۔ جدا جدا کرنے سے زکوٰۃ زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک سو بیس کو تین حصوں میں الگ الگ کرنے سے تین بکریاں زکوٰۃ بنتی ہے اور ایک سو بیس اگر ایک ہی شخص کی ملکیت شمار ہو تو صرف ایک بکری زکوٰۃ بنتی ہے۔ اگر مالک ایک ہی شخص ہے تو صدقہ زیادہ لینے کی غرض سے اسے الگ الگ ریوڑ میں تقسیم نہ کیا جائے۔

اسی طرح ایک آدمی کے پاس تیس اونٹ ہیں تو انہیں پچیس اور پانچ دو حصوں میں الگ الگ نہ کیا جائے کہ اس طرح ایک ایک سالہ اونٹنی اور ایک بکری مل جائے گی "زکوٰۃ کے خوف سے"۔ کے الفاظ اس نفی کی وجہ کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی متفرق کو مجتمع اور مجتمع کو متفرق نہ کیا جائے کہ اس طرح زکوٰۃ لازم آئے گی جبکہ شارع نے زکوٰۃ لازم نہیں کی۔ دیکھئے ہمارے مشائخ کس قدر دقیق نظر رکھتے ہیں اور باریک بین ہیں۔

اونٹوں کی زکوٰۃ پر مختلف ائمہ کی بحث

اونٹوں کا نصاب سال کا اکثر حصہ چرنے والے پانچ اونٹ ہیں۔ پانچ سے کم اونٹوں پر زکوٰۃ نہیں۔ جب پانچ ہوں تو زکوٰۃ کے طور پر بکری دی جائے گی۔ نو تک ایک ہی بکری دینا ہوگی جب دس ہو جائیں تو دو بکریاں حتیٰ کہ اونٹوں کی تعداد چودہ ہو جائے۔ جب اونٹوں کی تعداد پندرہ ہوگی تو تین بکریاں بطور زکوٰۃ دینا ہوں گی اور انیس

تک تین بکریاں فرض رہیں گی۔ جب اونٹوں کی تعداد بیس ہو جائے گی تو چار بکریاں دینا ہوں گی اور چوبیس تک یہی تعداد فرض رہے گی۔ اونٹ جب پچیس ہو جائیں گے تو پھر ایک بنت لبون یعنی اونٹ کا وہ مادہ بچہ جس کی عمر کا پہلا سال مکمل ہو چکا ہو اور دوسرا سال شروع ہو گیا ہو۔ پینتیس (۳۵) تک بنت لبون دینا ہو گا اگر اونٹوں کی تعداد چھتیس ہو جائے تو پنتالیس تک ایک بنت لبون دینا پڑے گا۔ بنت لبون ایسی مادہ اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو (اور اس کی دو سال عمر مکمل ہو گئی ہو) جب اونٹوں کی تعداد چھیالیس ہو جائے تو ساٹھ تک ایک حقہ دینا فرض ہو گا۔ حقہ ایسی اونٹنی کو کہتے ہیں جو چوتھے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ اکسٹھ سے پچھتر تک ایک جذعہ یعنی ایسی اونٹنی جو پانچویں سال میں قدم رکھ چکی ہو اور اس کے چار سال مکمل ہو چکے ہوں۔

پچھتر میں دو بنت لبون نوے تک۔ اکانوے پر دو حقے ایک سو بیس تک اس پر ائمہ کا اتفاق ہے اور صدقات کے بارے جو خطوط لکھے گئے ان میں بھی یہی مذکور ہے۔ جب ایک سو بیس پر پانچ اونٹوں کا اضافہ ہو گا تو ان پر ایک بکری اور دو حقے زکوٰۃ دینا ہو گی۔ اگر ایک سو بیس پر دس کا اضافہ ہو جائے تو دو حقے اور دو بکریاں اگر پندرہ کا اضافہ ہو جائے تو تین بکریاں اور دو حقے۔ اگر ایک سو بیس پر مزید بیس کا اضافہ ہو جائے (یعنی اونٹوں کی تعداد ایک سو چالیس ہو جائے) تو چار بکریاں اور دو حقے۔ اگر پچیس زائد ہو جائیں تو پھر بنت لبون اور دو حقے دینا ہوں گے۔ اگر اونٹوں کی تعداد ڈیڑھ سو ہو جائے تو تین حقے دینا ہوں گے پھر نئے سرے سے اسی طرح حساب لگایا جائے گا۔ اگر (ڈیڑھ سو سے) پانچ اونٹ زائد ہو جائیں تو ان پر ایک بکری اور تین حقے زکوٰۃ دینا ہو گی۔ دس زائد ہونے پر دو بکریاں اور تین حقے۔ پندرہ زائد ہونے پر تین بکریاں اور تین حقے۔ بیس زائد ہونے پر چار بکریاں اور تین حقے۔ پچیس زائد ہونے پر ایک بنت مخاض اور تین حقے۔ چھتیس زائد ہونے پر ایک بنت لبون اور تین حقے۔ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو چھیانویں تک پہنچ جائے گی تو ان میں چار حقے دینا ہوں گے۔ دو سو تک یہی زکوٰۃ فرض رہے گی جب اونٹوں کی تعداد دو سو ہو جائے گی تو اب مالک کو اختیار ہے چاہے تو چار حقے دے اور چاہے تو پانچ بنت لبون دے جب یہ تعداد دو سو اونٹوں سے بڑھ جائے گی تو پھر ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری اور چار حقے یا پانچ بنت لبون دینا ہوں گی۔ جب دو سو سے پچیس کا اضافہ ہو گا تو پھر ان زائد پر ایک بنت مخاض دینا ہو گا اور اس میں جو دو سو پر زکوٰۃ تھی اسے بھی شامل کیا جائے گا۔

جب چھتیس زائد ہوں گے تو اس زائد تعداد پر ایک بنت لبون ہو گا اور دو سو پر جو زکوٰۃ ہے وہ بھی دینا ہو گی دو سو چھیالیس پر پانچ حقے ڈیڑھ سو تک پھر یہی طریقہ نئے سرے سے شروع ہو گا۔ دو سو چھیانوے پر چھ حقے تین سو تک۔ اسی طریقہ سے یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ یہ اندازہ ہمارے نزدیک ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی ایک روایت کے مطابق اسی طریقہ سے اونٹوں کی زکوٰۃ دی جائے گی۔ اس کی دلیل حضرت عمرو بن حزم کا وہ خط ہے جسے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو اسے اونٹوں کے اول فریضہ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ فتح القدیر میں ہے کہ امام طحاوی علیہ الرحمہ نے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہمارے مذہب کے مطابق روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ

علیہ الرحمہ نے بھی امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہمارے مذہب کے مطابق روایت نقل کی ہے۔

امام احمد' شافعی اور مالک علیہم الرحمہ کی رائے یہ ہے کہ جب ایک سوبیس سے ایک اونٹ بھی زائد ہو جائے تو تین لبون فرض ہو جاتے ہیں اور جب تعداد ایک سوتیس ہو جائے تو ایک حقہ اور دو بنت لبون زکوٰۃ دی جاتی ہے پھر چالیس اور پچاس پر حساب گھومتا رہتا ہے۔ ہر چالیس پر بنت لبون اور ہر پچاس پر حقہ دیا جاتا ہے۔ ان کی دلیل وہ خط ہے جسے افضل الصدیقین' امام ھداۃ المسلمین الصدیق الاکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تحریر فرمایا۔ جب ایک سوبیس سے بڑھ جائیں (یعنی اونٹ) تو ہر چالیس پر ایک بنت لبون ہے اور ہر پچاس پر ایک حقہ ہے۔ اسی طرح تمام کتب میں موجود ہے۔

شوافع کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے اور اس میں کسی قسم کا شک نہیں جبکہ امام طحاوی علیہ الرحمہ کی روایت پر اعتراض کئے گئے ہیں۔ طحاوی علیہ الرحمہ کی روایت کردہ حدیث اس خط کی متعارض نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی سند میں کوئی کلام نہیں۔

شیخ ابن الہمام علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس کی سند بہت قوی اور ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے تو یہ اعتراض تب وارد ہو سکتا ہے۔ جب ان دونوں حدیثوں کو ایک دوسرے کا معارض ٹھہرایا جائے۔ ہمارے نزدیک تو ان میں تعارض ہی نہیں کیونکہ حضرت صدیق اکبر کے خط میں صرف یہ مذکور ہے کہ ہر چالیس پر بنت لبون ہے اور ہر پچاس پر حقہ ہے۔ ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کیونکہ چھتیس اور چالیس پر ایک جیسی زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح چھیالیس اور پچاس پر ایک جیسی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط میں یہ نہیں لکھا گیا کہ چالیس سے کم میں زکوٰۃ نہیں بلکہ خط میں چالیس پر زکوٰۃ کا تذکرہ ہے اور چالیس سے کم کے بارے خط خاموش ہے جبکہ امام طحاوی علیہ الرحمہ کی روایت چالیس سے کم اونٹوں کی زکوٰۃ کو بھی بیان کرتی ہے۔ اس لئے طحاوی کی روایت پر عمل کیا جائے گا چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد جب ایک سوبیس سے بڑھ جائیں۔ بظاہر امام طحاوی کی روایت کے منافی ہے اس لئے آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زیادہ سے مراد کثرت ہے تاکہ مختلف حدیثوں میں جو الفاظ آئے ہیں یہ لفظ ان تمام کو شامل ہو جائے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری ایک روایت میں کثرت کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت سالم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ کے بارے ایک خط تحریر فرمایا لیکن اسے عمال کی طرف نہ بھیجا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا۔ اس خط کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمال کے نام روانہ کیا اور اس پر عمل ہوا حتیٰ کہ ان کا وصال ہو گیا پھر یہی خط حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمال کے نام ارسال فرمایا تو اس پر عمل ہوا پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارسال کیا تو اس پر عمل ہوا پھر اسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارسال فرمایا اور اس پر عمل ہوا۔ اس خط میں یہ حکم تھا کہ اکانوے پر ایک سوبیس تک دو حصے زکوٰۃ فرض ہے جب اونٹوں کی کثرت ہوگئی تو پھر ہر پچاس پر ایک حقہ اور ہر چالیس پر بنت لبون۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی علیہما الرحمہ نے روایت کیا ہے۔ ابن الہمام کی گفتگو ختم ہوئی۔

اس جلیل القدر عالم کے نزدیک الزیادۃ کو الکثیرۃ پر محمول کیا گیا ہے یہ بعید ہے بلکہ حق یہ ہے کہ سالم کی روایت میں کثرت سے مراد زیادت ہے۔ بھلا یہ مراد یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ یہ لفظ کثرت معینہ پر دلالت ہی نہیں کرتا۔ اس لئے کثیر زیادتی مجمل ہے اور یہ مناسب نہیں کہ صدقہ کے بارے لکھا جانے والا خط مجمل عبارت پر مشتمل ہو۔ اس خط کو عمال کی طرف ارسال کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس کی روشنی میں زکوٰۃ وصول کی جائے اگر خط کی عبارت ہی مجمل ہو تو زکوٰۃ وصول کرنے کی صورت کیا ہو سکتی تھی اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حدیث پاک میں لفظ زیادہ ہونے سے مراد کثرت نہیں ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اگر اونٹ ایک سو بیس سے زائد ہو جائیں تو جو تعداد ایک سو بیس سے زیادہ ہوگی ان میں ہر چالیس پر ایک بنت لبون اور ہر پچاس پر ایک حقہ ہوگا اور جو زیادتی چالیس سے کم ہوں گے اس کے بارے خاموشی ہوگی۔ امام طحاوی کی روایت نئے سرے سے حساب کو واجب کرتی ہے۔ اسی سے ہم نے اس کو معلوم کیا ہے یہ حنفیہ کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ اس میں کلام بعید از قیاس ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق کا خط یہ تو بتاتا ہے کہ چالیس پر ایک بنت لبون اور پچاس پر ایک حقہ ہے لیکن چالیس سے کم پر کتنی زکوٰۃ واجب ہے اس بارے یہ خط خاموش ہے اور جہاں بیان کی ضرورت ہو اگر وہاں خاموشی اختیار کی جائے تو خاموشی کو بیان سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ کتب اصول میں وارد ہے اسی کو اصول الفقہ کی زبان میں بیان ضرورت کہتے ہیں۔ اب دیکھیں جو بحث ہم کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خط اس لئے ارسال کیا تھا تا کہ اس خط کی روشنی میں لوگوں سے صدقات وصول کئے جائیں اور اس میں بیان کردہ مقدار سے نہ تو کچھ زائد لیا جائے اور نہ ہی اس سے کم۔ خط کے شروع میں بیان کیا گیا ہے جو اس مقدار سے زیادہ زکوٰۃ کے لئے کہے تو اسے نہ دیا جائے اور جو اس خط کے مطابق زکوٰۃ کے لئے کہے تو اسے صدقہ دیا جائے۔

ان الفاظ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو کچھ خط میں تحریر ہے اس سے زائد صدقہ نہ لیا جائے اور یہ الفاظ اس بات کی بھی دلیل ہیں کہ جو کتاب میں بیان ہوا ہے وہ صدقہ ہے اور جس کے بارے خط خاموش ہے وہ صدقہ نہیں اور استیناف جس پر حنفی علماء قائم ہیں وہ خط میں مذکور صدقہ سے زائد ہے لہٰذا وہ واجب نہیں اس لحاظ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط اور طحاوی کی روایت میں تعارض ہے۔ اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط پر عمل ہوگا کیونکہ اس کی سند قوی اور صحیح ہے پھر حضرت سالم سے جو حدیث مروی ہے وہ نص مفسر ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک سو بیس سے ایک بھی زیادہ ہوگا تو تین بنت لبون دینا ہوں گے اور ایک سو انتیس تک یہی زکوٰۃ فرض رہے گی۔ ایک سو تیس اونٹوں پر دو بنت لبون اور ایک حقہ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق تصریح ہے۔ البتہ طحاوی علیہ الرحمہ کی روایت سے معارض ہے اس لئے طحاوی علیہ الرحمہ کی روایت پر اس کو مقدم رکھا جائے گا کیونکہ اس کی سند قوی ہے۔

حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط کو حضرت حاکم علیہ الرحمہ نے بتمامہ نقل کیا ہے اس خط میں وہ چیزیں نہیں جو طحاوی نے ذکر کی ہیں اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ راوی خط کا پورا متن نقل کرے اور وہ چیز چھوڑ

دے جس پر خط کے حکم کا دارومدار ہے اور اس خاص عبارت کو چھوڑنے سے اس کا ارادہ اس میں درج حکم کو تبدیل کرنا ہو۔ اسی وجہ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت مشکوک بن جاتی ہے حالانکہ وہ مرسل ہے اور سالم کی روایت مسند ہے پھر امام طحاوی علیہ الرحمہ کی روایت میں اس زیادتی کی وجہ سے کلام کیا گیا ہے۔ لہٰذا زیادہ صحیح رائے وہ ہے جسے امام شافعی نے اور حضرت امام احمد نے روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں کمی بیشی درست نہیں

اگر مالک کے پاس اونٹوں میں کوئی زیادہ عمر کا اونٹ نہ ہو حالانکہ زکوٰۃ میں بڑا اونٹ دینا فرض ہو تو وہ چھوٹی عمر کا اونٹ دے اور جو زیادہ رقم بنتی ہے وہ بھی زکوٰۃ وصول کرنے والوں کے حوالے کر دے۔ اس طرح اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ یا جو جانور دینا فرض ہے صدقہ لینے والا اس سے بہتر جانور لے لے اور جو رقم زیادہ بنتی ہے وہ مالک کو واپس کر دے۔ اسی طرح بنت مخاض دینا ہے اور اس کے مال میں بنت مخاض نہیں تو جائز ہے کہ زکوٰۃ لینے والا بنت لبون لے اور زائد رقم واپس کرے۔ اسی طرح اگر بنت لبون دینا فرض ہے اور اس کے پاس بنت لبون نہیں تو زکوٰۃ لینے والا بنت مخاض لے اور زائد رقم بھی لے لے۔ اسی طرح باقی عمر کے جانوروں میں بھی زکوٰۃ لی جا سکتی ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی ہے کہ زکوٰۃ کی ایک معین مقدار ہوتی ہے اس سے کم یا اس سے زیادہ لینا صحیح نہیں۔

اسی وجہ سے ہمارے نزدیک زکوٰۃ میں اونٹوں کی بجائے ان کی قیمت ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آنے والے صفحات میں بیان ہو گی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر فرض جانور سے کم درجہ کا جانور لیا تو اس کے ساتھ دو بکریاں لے یا بیس درہم نہ کم نہ زیادہ دے۔ اگر صدقہ میں اصل جانور سے اعلیٰ جانور لیا تو دو بکریاں یا بیس درہم مالک کے حوالے کرے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس بارے نص ہے۔

دو بکریوں اور بیس درہموں کا مسئلہ تعجب خیز ہے کیونکہ ہو سکتا ہے بھاؤ کی کمی کی وجہ سے ایک بنت لبون کی کل قیمت ہی بیس درہم ہو تو اس طرح وہ بنت لبون لے گا اور اس کی قیمت مالک کے حوالے کرے گا یا بنت مخاض لے گا اور ساتھ بنت لبون کی قیمت بھی وصول کرے گا۔ رہی یہ بات کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط میں یہی مذکور ہے تو ہو سکتا ہے اس دور میں بنت مخاض اور بنت لبون کی قیمتوں کے درمیان بیس درہموں کا ہی تفاوت ہو اسی طرح بنت مخاض اور ابن لبون کی قیمت ایک ہو۔ اسی لئے ایک کی جگہ دوسرا جانور لینے کا حکم دیا گیا ہو۔ یہ نہیں کہ قیمت کم ہو یا زیادہ وہی دو بکریاں اور بیس درہم دینا ہوں گے جو خط میں مذکور ہیں۔

بکریوں کی زکوٰۃ

چالیس سے کم بکریوں پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ جب چالیس ہو جائیں تو ایک بکری دینا فرض ہے۔ چالیس سے ایک سو بیس تک ایک ہی بکری بطور زکوٰۃ دی جائے گی۔ جب ایک سو بیس سے ایک بھی بڑھ گئی تو دو سو تک دو بکریاں

دی جائیں گی۔ اگر اس تعداد سے ایک بھی بڑھ گئی تو تین بکریاں دی جائیں گی پھر چار سو پر چار۔ پانچ سو پر پانچ اسی حساب سے جس قدر تعداد میں اضافہ ہوگا زکوٰۃ میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ صدقہ کے سلسلہ میں عاملین کو جو خطوط لکھے گئے ان تمام میں یہی مذکور ہے۔

بھیڑ اور بکری برابر ہیں کیونکہ لفظ شاۃ بھیڑ اور بکری دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر بیس بھیڑیں اور بیس بکریاں ہوں تو نصاب مکمل ہے اور ان پر زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ وہ چالیس بھیڑ، بکریوں کا مالک بن گیا ہے۔

زکوٰۃ میں دو دندی (جس کے سامنے کے دو دانت گر گئے ہوں) لی جائے گی بچہ نہیں۔ یہی ظاہر الروایۃ میں ہے کیونکہ اوسط درجے کا مال لینا فرض ہوتا ہے نہ ناقص اور نہ ہی اعلیٰ۔ اس لئے جذعہ قبول نہیں کیا جائے گا' امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ سے بھی یہی روایت ملتی ہے۔

روی مسعر بن رستم قال کنت فی شعب من هذه الشعاب فی غنم لی فجاء رجلان علی بعیرا فقالا لی انا رسولا رسول الله صلی الله علیه وسلم الیک اتودی صدقة غنمک فقلت ما علی فیها فقالا شاة فاعمد الی شاة عرفت مکانها ممتلیة مخضا وشحما فاخرجتها الیهما فقالا هذه شاة شافع وقد نهانا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان نلخذ شافعا الشافع التی فی بطنها ولدها قلت فای شاة تاخذان قالا عناقا جذعة او ثنیة[1] قالا فاعمدالی عناق معناط والمعناط التی لم تلد ولدا ولکن حان ولادها فاخرجتها الیهما فقالا ناولناها فجعلاها معهما علی بعیرهما ثم انطلقا.

(رواہ ابوداؤد والترمذی)

حضرت مسعر بن رستم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک وادی میں اپنے ریوڑ کو چرا رہا تھا کہ میرے پاس دو آدمی آئے جو اونٹوں پر سوار تھے اور کہنے لگے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے آپ کی طرف بھیجا ہے۔ کیا آپ اپنی بکریوں کا صدقہ (زکوٰۃ) دیں گے؟ میں نے پوچھا ان بکریوں میں سے مجھے کتنی بکریاں زکوٰۃ دینا ہوگی۔ وہ فرمانے لگے کہ صرف ایک بکری۔ میں ایک ایسی بکری کی طرف لپکا جسے میں جانتا تھا کہ عمدہ بکری ہے وہ بکری گابن اور خوب موٹی تازی تھی۔ میں ریوڑ سے نکال کر اسے ان دو صحابہ کرام علیہما الرضوان کے پاس لایا تو وہ کہنے لگے کہ یہ گابن ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں گابن بکری لینے سے منع کیا ہے۔ میں نے کہا پھر آپ حضرات کس قسم کی بکری لیں گے؟ فرمانے لگے ہم بکروٹا (جس کی عمر سال سے کم ہو) لیں گے خواہ وہ دوندا ہو یا کھیرا ہو (یعنی سامنے والے دو دانت گرا چکا ہو یا ابھی دانت گرنے ہوں) فرماتے ہیں میں ایک ایسی بکری کی طرف لپکا جس نے ابھی بچہ نہیں دیا تھا لیکن جوان تھی۔ میں وہ ریوڑ سے باہر لایا تو انہوں نے فرمایا یہ بکری ہم نے لے لی انہوں نے اسے اونٹ پر لادا اور چلے گئے۔

---

[1] مثنیٰ" ایسے جانور کو کہتے ہیں جو بچپنے کی عمر سے نکل کر جوانی کی عمر کو پہنچتا ہے۔ اس عمر میں جانوروں کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ جاتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد نئے دانت نکل آتے ہیں جو شباب کو ظاہر کرتے ہیں۔

بطور زکوٰۃ نر اور مادہ دونوں جانور لئے جاتے ہیں کیونکہ لفظ شاۃ دونوں پر بولا جاتا ہے اور نص میں لفظ شاۃ آیا ہے۔

گائے کی زکوٰۃ

تیس سے کم گائیوں پر زکوٰۃ فرض نہیں تیس پر ایک تبیع یا تبیعہ (یعنی بچھڑا یا بچھڑی جس کی عمر دو سال یا اس سے کم ہو) نر اور مادہ میں کوئی فرق نہیں۔

جب گائیں چالیس کی تعداد کو پہنچ جائیں تو ان پر ایک مسن یا مسنہ (دو سال سے زیادہ عمر کی گائے یا بیل) دیا جائے گا جیسا کہ عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط سے ظاہر ہے۔

عن ابن مسعود قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فى كل ثلثين من البقر تبيع او تبيعة وفى كل اربعين. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر تیس گائے پر ایک تبیع یا تبیعہ ہے اور ہر چالیس (مسن یا مسنہ)۔

حضرت مسروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

عن معاذ قال بعثنى النبى صلى الله عليه وسلم فامرنى ان اخذمن كل ثلثين بقرة تبيعا اوتبيعة ومن كل اربعين مسنة ومن كل حالم دينارا اوعدله معافر. (رواہ الترمذی والنسائی)

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا اور حکم دیا کہ ہر تیس گائے پر ایک تبیع یا تبیعہ لوں اور ہر چالیس پر ایک مسنہ اور ہر بالغ آدمی سے ایک دینار یا ایک دینار کی قیمت کی معافری (ایک علاقہ کی طرف نسبت ہے) چادریں بطور جزیہ لی جائیں۔

نسائی میں معافری ثیاب کے الفاظ ہیں۔ کیا مسروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملے ہیں؟ اس میں کلام ہے لیکن اگر ان کی ملاقات ثابت نہ ہو تو پھر بھی حدیث قابل حجت ہے۔

بھینس اور گائے میں زکوٰۃ کے حوالے سے کچھ فرق نہیں۔ اگر تیس کی تعداد میں کچھ گائیں اور کچھ بھینسیں ہوں تو زکوٰۃ فرض ہوگی کیونکہ بقرہ کا لفظ گائے اور بھینس دونوں پر صادق آتا ہے اور نص میں بقر کا لفظ آیا ہے۔

ساٹھ گائے اور بھینسوں میں دو تبیعے۔ ستر میں ایک مسن اور ایک تبیعہ۔ اسی میں دو مسن۔ نوے میں تین تبیعے سو میں ایک مسن اور دو تبیعے زکوٰۃ ہوگی اور اس کے بعد ہر دس پر مسنہ تبیعہ میں بدلتا جائے گا اور تبیعہ مسنہ میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نص میں موجود ہے کہ تیس پر تبیعہ اور چالیس پر مسنہ ہے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ چالیس سے زیادہ اور ساٹھ سے کم پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر چالیس سے ایک گائے بڑھ جائے تو اس ایک کی زکوٰۃ بھی دینا ہوگی جو ایک مسنہ کے دسویں حصے کی چوتھائی بنتا ہے۔ جب دو بڑھ جائیں یعنی بیالیس گائیں ہو جائیں تو ایک مسن کے دسویں حصے کا نصف دیا جائے گا۔ اس روایت سے علماء یہ استدلال کرتے ہیں کہ چالیس اور ساٹھ کے درمیان والے جانوروں پر اگر زکوٰۃ فرض نہیں تو اس پر کوئی نص ہونی چاہئے لیکن ایسی کوئی نص موجود نہیں رہی اس کے اثبات کی دلیل تو وہ یہ ہے کہ مال نعمت خداوندی ہے جس پر شکر

واجب ہے۔

حضرت حسن علیہ الرحمہ کی ایک روایت ہے کہ چالیس اور پچاس کے درمیان کے جو جانور ہیں ان پر زکوٰۃ نہیں جب ان کی تعداد پچاس ہو جائے تو اس پر مسنہ کا چوتھائی حصہ واجب ہے کیونکہ نصاب کی بنیاد ہی اس چیز پر رکھی گئی ہے کہ دہائیوں کے جو درمیان کی تعداد ہے اس پر تو زکوٰۃ نہیں لیکن دہائیوں پر ہے۔

تیسری روایت یہ ہے کہ چالیس اور ساٹھ کے درمیان سب معاف ہے کیونکہ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط میں صرف تیس اور چالیس کی زکوٰۃ کا بیان ہے اور تیس سے کم پر خاموشی ہے اور جہاں بیان کی ضرورت ہو وہاں پر خاموشی بیان بن جاتی ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے پھر بات یہ بھی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیس سے کم گائیں یا بھینسوں پر زکوٰۃ نہیں لی جیسا کہ حضرت طاؤس سے روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیس گائے پر ایک تبیع لیا اور چالیس پر ایک مسنہ چالیس سے جو کم تھے جب وہ لائے گئے (یعنی تیس اور چالیس کے درمیان) تو ان کی زکوٰۃ لینے سے آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا میں نے اس بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ نہیں سنا۔ میں آپ سے ملوں گا اور عرض کروں گا (تب ان کی زکوٰۃ لوں گا) مگر حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واپسی سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دہائیوں کے جو درمیان جانور ہیں ان کے بارے کوئی حکم نہیں دیا تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ رہی کیونکہ وجوب کے لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہو۔ جب امر نہیں تو وہ تعداد اپنے اصل یعنی عدم فرضیت زکوٰۃ پر باقی رہے گی اور کبھی کبھار یہ روایت بھی پیش کی جاتی ہے۔

عن ابن عباس قال بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم معاذ الى اليمن فامره ان ياخذمن كل ثلثين من البقر تبيعا اوتبيعة ومن كل اربعين مسنة قالوا فالا وقاص قال ما امرلي رسول الله صلى الله عليه وسلم بشئي وساسأله اذا قدمت عليه فلما قدم على رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ليس فيها شئي.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن بھیجا اور حکم دیا کہ وہ ہر تیس گائیں پر ایک تبیعہ یا تبیع لیں اور ہر چالیس پر ایک مسنہ، لوگوں نے عرض کیا کہ جو تعداد تیس اور چالیس کے درمیان ہے یا چالیس اور ساٹھ کے درمیان ہے اس کے بارے کیا حکم ہے تو انہوں نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس چیز کا حکم نہیں دیا ہے۔ میں جب واپس حاضر خدمت ہوں گا تو اس بارے ضرور پوچھوں گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (جو تیس اور چالیس یا چالیس اور ساٹھ کے درمیان ہے) اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس حدیث کو دار قطنی اور بزاز نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ضعف ہے اور حدیث کا متن اس کے ضعف پر دال ہے کیونکہ یہی واقعہ صحیح احادیث سے ثابت ہے جن میں مذکور ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واپسی سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے کچھ نہ پوچھ سکے۔ اکثر مؤرخین نے بھی یہی لکھا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن میں تھے تو کسی کو اعلان کرتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین ہو چکی ہے۔ آپ شدت محبت سے واپس آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ پایا اور جو کچھ سنا تھا وہ سچ تھا۔ واللہ اعلم۔

گھوڑوں کی زکوٰۃ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مکمل سال یا سال کا اکثر حصہ چراگاہوں میں چرنے والے گھوڑوں کے ساتھ اگر گھوڑیاں بھی ہوں تو ان پر زکوٰۃ فرض ہے۔ مالک کو اختیار ہے کہ چاہے تو ہر گھوڑے کے بدلے ایک دینار دے اور چاہے تو قیمت کا اندازہ کر کے زکوٰۃ ادا کرے۔ اندازہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ گھوڑے کی قیمت لگائے اور ہر دو سو درہم پر پانچ درہم زکوٰۃ دے صرف نر گھوڑے ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں کیونکہ جب تک نر اور مادہ دونوں نہیں ہوں گے ان کی نسل نہیں چلے گی۔

اگر صرف گھوڑیاں ہوں تو ان کے بارے دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ گھوڑیوں پر زکوٰۃ فرض ہے اور دلیل میں ایک طویل حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں مذکور ہے۔

ورجل ربطها تغنيا وتعففا ثم لم ينس حق الله في رقابها ولا ظهورها فهي لذلك الرجل ستر.

وہ شخص جس نے گھوڑوں کو باندھا مالدار ہونے اور پاکیزہ رہنے کی غرض سے پھر ان کی گردنوں اور پیٹھوں میں اللہ کے حق کو نہیں بھولا تو یہ گھوڑے اس شخص کے لئے پردہ ہوں گے۔

گردنوں میں اللہ تعالیٰ کا حق صرف زکوٰۃ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ دلیل تبھی صحیح ہو سکتی ہے جب حق اللہ سے مراد فرض حق لیا جائے اگر اسے عام رکھا جائے جیسا کہ ظہور کا رقاب پر عطف کیا گیا ہے تو اس سے مراد وہ حق نہیں ہوگا جس کا ادا کرنا فرض ہے (یعنی زکوٰۃ) کیونکہ (پیٹھ) میں زکوٰۃ نہیں ہوتی۔

شیخ ابن الہمام نے پیٹھوں پر حق کو اس مفہوم پر محمول کیا ہے کہ وہ حاجیوں کو سوار کریں اور قافلے تک پہنچا دیں اس طرح گھوڑوں کی پیٹھوں کا حق ادا ہو جائے گا۔ ظاہر ہے یہ فرض نہیں بلکہ مستحب عمل ہے اس لئے اس حدیث سے زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے پھر بالفرض اگر حدیث فرضیت زکوٰۃ پر دلالت کرتی ہو تو بھی یہ نر اور مادہ گھوڑوں میں فرق نہیں کرتی اور نہ ہی سائمہ اور غیر سائمہ میں فرق کرتی ہے۔ اس لئے یہ اصل مذہب کے خلاف ہے۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ یہی روایت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی جاتی ہے کہ گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں۔ صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے جیسا کہ فتح القدیر میں فتاویٰ قاضی خان کے حوالے سے منقول ہے۔ صاحبین کے قول کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ابی هريرة ان النبی صلی الله عليه وسلم قال ليس على المسلم فی فرسه وعبده صدقة. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمان پر اس کے گھوڑے اور غلام میں زکوٰۃ نہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ سوائے صدقۃ الفطر کے اور کوئی صدقہ نہیں۔

حضرت عمرو بن حزم کے خط میں بھی یہی مذکور ہے۔ صاحبِ ہدایہ کے نزدیک اس حدیث میں گھوڑے سے مراد وہ گھوڑا ہے جو غزوات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ واللہ اعلم.

دارقطنی میں ایک روایت یوں آئی ہے۔

عن حارثة بن مضرب قال جاء ناس من اهل الشام الی عمر رضی الله عنه فقالوا انا قد اصبنا اموالا خيلا ورقيقا انا نحب ان تزكيه فقال ما فعل صاحبای قبلی فافعله انا ثم استشار اصحاب رسول الله صلی الله عليه وسلم فقالوا حسن وسكت علی نسأله فقال هو حسن لو لم يكن جزية راتبة يوخذون بها بعدک فاخذمن الفرس عشرة دراهم وفی رواية فوضع علی كل فرس دينارا.

حارثہ بن مضرب سے روایت ہے کہ شام کے لوگ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے ہم نے گھوڑوں اور غلاموں کی صورت میں مال پائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ انہیں پاک کریں (یعنی زکوٰۃ لیں) (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے جواب دیا میرے دونوں دوستوں (یعنی حبیب خدا ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے مجھ سے پہلے ایسا نہیں کیا کہ میں ایسا کروں (یعنی گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ لوں) پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ علیہم الرضوان سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا ان کی زکوٰۃ لے لینا بہتر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بھی فرمایا کہ یہ بہتر ہے اگر آپ کے بعد ان سے بطور جزیہ یہ نہ لیا جائے۔ اس پر گھوڑوں کی زکوٰۃ دس درہم لی گئی۔ ایک روایت میں ہے کہ ہر گھوڑے پر ایک دینار لیا گیا۔

اسی کو دلیل بنا کر ابن ہمام کہتے ہیں کہ گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ ان کی زکوٰۃ کی وصولی پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کا اجماع ہو چکا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ لینے کو بہتر قرار دیا مگر یہ شرط عائد کی کہ آپ کے بعد دوبارہ یہ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے اور اسے جذیہ کا رنگ نہ دیا جائے کہ آنے والے حکمران لوگوں سے زکوٰۃ کی طرح گھوڑوں کی زکوٰۃ وصول کرنے لگیں ان کے ارشاد کا یہی مقتضاء ہے کیونکہ ہم امیر کے لئے جبر کو جائز نہیں گردانتے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے بہتر اس غرض سے قرار دیا ہے کہ دوبارہ یہ نفلی صدقہ وصول نہ کیا جائے کیونکہ محسنین پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ یہ اجماع قولی ہے حقیقت میں مذکورہ روایت صاحبین کے لئے حجت

ہے کیونکہ اس میں واضح لفظوں میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں کی زکوٰۃ نہیں لی اور نہ ہی ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کی اتباع فرض ہے اگر گھوڑوں پر زکوٰۃ فرض ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھوڑوں کی زکوٰۃ لیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی گھوڑوں کی زکوٰۃ لیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام صحابہ کرام سے مشورہ نہیں کیا ہوگا کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس وقت تمام صحابہ کرام حاضر ہوں بلکہ وہ مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے اس لئے اسے اجماع نہیں کہہ سکتے پھر جن لوگوں سے مشورہ کیا گیا انہوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ گھوڑوں کی زکوٰۃ واجب ہے بلکہ انہوں نے کہا بہتر ہے اور یہ لفظ استحباب کے لئے بولا جاتا ہے۔ صدقہ کے مستحب اور مستحسن ہونے میں شک ہی کیا ہے' یہ کسی بھی مال میں سے دیا جا سکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ فی نفسہٖ مستحسن امر ہے لیکن ضروری ہے کہ اسے واجب سمجھ کر جبراً وصول نہ کیا جائے کہ بعد والے لوگ اسے ضروری خیال کر کے لوگوں سے وصول کرنے لگیں اور وہ جزیہ کی صورت اختیار کر جائے کہ اس کی ادائیگی کو لوگ بطیب خاطر دینے کی بجائے بوجھ محسوس کریں اور یہ عمل مستحب عمل سے محض ایک جبری ٹیکس کی صورت اختیار کر جائے کیونکہ جب مجبوراً ادا کیا جائے تو مستحب عمل ثواب کا موجب نہیں رہتا۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقصود یہ تھا کہ نہ لینا بہتر ہے کیونکہ یہ اندیشہ ہے کہ بعد میں یہ جزیہ بن جائے گا رہی یہ بات کہ امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو قبول کیوں لیا تو یہ اس لئے کہ انہوں نے بطور تبرع آپ کے حوالے کیا تھا اور کوئی شخص نفلی صدقہ کو منع نہیں کر سکتا۔ اسی لئے حضرت عمر نے واضح الفاظ میں شامیوں کو بتا دیا تھا کہ مجھ سے پہلے کسی حاکم وقت نے گھوڑوں کی زکوٰۃ نہیں لی۔ اس لئے اسے فرض خیال نہ کیا جائے کہ یہ جزیہ بن جائے۔

گدھوں اور خچروں پر زکوٰۃ

گدھوں اور خچروں پر بالا جماع زکوٰۃ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ طویل حدیث میں فرمایا اور نہ ہی اس بارے قرآن کریم میں کوئی آیت نازل ہوئی سوائے ایک آیت کے اور وہ آیت یہ ہے۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔

پس جس نے ایک ذرّہ برابر نیکی کی تو اس کو دیکھے گا۔

زکوٰۃ میں کیسا مال لیا جائے ؟

زکوٰۃ میں اوسط درجے کا مال لیا جائے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لمعاذ ایاک و کرائم اموالھم وعن امیر

نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا لوگوں سے ان کے عمدہ ترین مال لینے سے بچنا۔ حضرت

المؤمنين عمر اتى بغنم من الصدقة فرأى فيها شاة حافلا ذات خسرع عظيم فقال عمر ماهذه الشاة قالوا هى من الصدقة قال ما اعطى هذه اهلها وهم طايعون لاتفتنوا الناس لا تاخذوا حزرات اموال المسلمين نكبوا عن الطعام. (رواہ مالک)

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں صدقہ کی بکریاں پیش کی گئیں۔ ان میں سے ایک ایسی بکری تھی جس کے بڑے بڑے تھن تھے جو دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کیسی بکری ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ بکری صدقہ کی ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کے مالکوں نے اسے بدل نخواستہ دیا ہوگا۔ لوگوں کو آزمائش میں نہ ڈالا کرو۔ مسلمانوں سے پسندیدہ مال نہ لیا کرو کہ کھانے سے محروم ہو جائیں۔

زکوٰۃ صرف سائمہ مویشیوں پر ہے

زکوٰۃ صرف ایسے جانوروں پر فرض ہے جو چرنے والے ہوں جن جانوروں کو گھر میں چارا ڈالا جاتا ہو یا وہ کھیتی باڑی میں کام آتے ہوں یا بوجھ برداری میں استعمال ہوتے ہوں کیونکہ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط میں سائمہ کی قید موجود ہے۔ لہٰذا غیر سائمہ پر زکوٰۃ نہیں ہوگی کیونکہ بیان کے وقت سکوت بیان تصور ہوتا ہے۔ یہ خط صدقات کی وصولی کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس میں کسی چیز (جو واجب یا فرض تھی) کے بارے سکوت صحیح نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جن روایات میں سائمہ کی قید نہیں بلکہ مطلقاً اونٹوں کا ذکر ہے ان کو اسی معنی پر محمول کیا جائے گا۔

عن امير المؤمنين على قال احسبه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال ليس فى العوامل صدقة. (رواہ ابوداؤد)

امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں گمان کرتا ہوں کہ یہ روایت نبی کریم ﷺ سے نقل کی گئی ہے کہ جن جانوروں سے کام لیا جاتا ہو (یعنی کھیتی باڑی یا بوجھ برداری وغیرہ کا کام) ان پر زکوٰۃ نہیں۔

یہ الفاظ ایک طویل حدیث سے لئے گئے ہیں جو صدقات کو بیان کرتی ہے۔

یہ احادیث امام مالک کے اس نظریہ کے خلاف دلیل ہیں کہ تمام جانوروں پر زکوٰۃ واجب ہے خواہ وہ سائمہ ہو یا علوفہ (جنہیں گھر میں چارا ڈالا جاتا ہو اور وہ چراگاہ میں نہ چرتے ہوں)۔ کھیتی باڑی یا کسی اور کام میں لائے جاتے ہوں یا نہ لائے جاتے ہوں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نظریہ اس لئے قائم کیا کہ بعض روایات میں کہ پانچ اونٹوں کی زکوٰۃ ایک بکری ہے وہ سمجھے کہ شاید یہ لفظ عام ہے جو تمام جانوروں کو شامل ہے ان کی نظر عموم تک نہ گئی۔

سائمہ جانور کی تعریف

سائمہ سے مراد ہمارے نزدیک وہ جانور ہیں جو سال کا اکثر حصہ چرتے ہوں اور ان کو پالنے کا مقصد نسل کشی اور بڑھوتی ہو یہ کہنا کہ اکثر حصہ سال میں وہ چرتے ہوں تو سائمہ ہیں یہ درحقیقت اس لئے ہے کہ اکثر پر کل کا حکم لگتا

ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ پورا سال اگر وہ چرتے ہیں تو پھر ان پر زکوٰۃ ہو گی ورنہ نہیں حتیٰ کہ اگر صرف ایک یا دو ماہ بھی انہیں گھاس ڈالا گیا تو ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہو گی۔ یہ نظریہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے ہمارا نہیں۔

شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہر میں رہنے والے لوگوں کے مویشیوں پر بھی زکوٰۃ فرض کی ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ ان کے مویشی پورا سال چراگاہوں میں نہیں چرتے بلکہ انہیں بعض اوقات گھر میں باندھ کر بھی چارہ ڈالنا پڑتا ہے۔

اونٹ' گائے اور بھیڑ بکری کے بچوں میں زکوٰۃ نہیں

اونٹ' گائے اور بھیڑ بکری کے بچوں میں زکوٰۃ نہیں۔ مثلاً ایک شخص نے پچیس اونٹ کے بچے خریدے یا اسے ھبہ کئے گئے یا اسے وراثت میں ملے اور ان پر ایک سال کا عرصہ گزر گیا تو ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کرنا پڑے گی۔ اسی طرح ایک شخص سائمہ جانوروں کے نصاب کا مالک ٹھہرا اور سال کے دوران ان جانوروں نے بچے دیئے پھر کسی وجہ سے ان کی مائیں مر گئیں تو سال مکمل ہونے پر بچوں پر زکوٰۃ نہیں ہو گی۔ جب جانوروں کے بچے بڑے ہو جائیں گے تو پھر ان کے سال گزرنے کا اندازہ لگا کر زکوٰۃ دی جائے گی۔ یہ رائے امام محمد اور امام ابوحنیفہ کی آخری رائے ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے ایک مخصوص مقدار کو بطور زکوٰۃ واجب کیا ہے اور ان بچوں میں اس خاص مقدار کو واجب کرنا بالاجماع ناممکن نہیں اور چونکہ زکوٰۃ لازم ہے اس لئے تمام مال لینا ہو گا یا اس کا اکثر حصہ لینا ہو گا جیسا کہ ایک مسنہ یا حقہ کی قیامت تمام نصاب کو پہنچ جاتی ہے یا نصاب سے بڑھ جاتی ہے اور کسی ایسی مقدار کو واجب کرنا جس پر کوئی نص ہی وارد نہیں ہوئی صحیح نہیں کیونکہ رائے سے صدقہ کی مقدار کا تعین نہیں کیا جا سکتا اسی لئے بچھڑوں یا دوسرے جانوروں کے بچوں پر زکوٰۃ فرض نہیں۔[1]

پہلے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مختلف مویشیوں کے بچوں پر وہی زکوٰۃ واجب ہو گی جو دو سالہ مویشیوں پر ہوتی ہے یہی قول امام زفر کا ہے اور یہی امام مالک سے نقل کیا گیا ہے شاید امام زفر اور امام مالک کو گمان گزرا ہے کہ اونٹ اور گائے کا اطلاق مسن پر بھی ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار مخصوص ہے اور صرف ایسے مال پر فرض ہے جس میں اس مخصوص مقدار کو فرض کیا جا سکتا ہے اور مویشیوں کے بچوں کے علاوہ باقی جتنے جانور ہوں گے ان پر زکوٰۃ ہو گی پھر امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے اپنی رائے سے رجوع کیا اور یہ رائے قائم کی کہ مویشیوں کے بچوں میں سے ایک بچہ بطور زکوٰۃ دیا جائے گا۔ اسی قول کو امام ابو یوسف اور امام شافعی علیہما الرحمہ نے اختیار کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ چھوٹے مویشیوں پر بھی زکوٰۃ اظہار تشکر و امتنان کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے جانبین کا لحاظ رکھا جانا چاہئے اگر بچہ مویشیوں پر مسن فرض قرار دیں تو اس سے مالک کو نقصان ہو گا اور ان کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیں تو فقیروں کو نقصان ہو گا اس لئے ان بچھڑوں

[1] کیونکہ مویشیوں میں دو سالہ یا تین سالہ جانور بطور زکوٰۃ دیا جاتا ہے جو ایک مخصوص مقدار ہے۔ بچھڑوں میں ایسی عمر کا کوئی جانور ہی نہیں تو وہ مسن یا حقہ ان پر کیسے فرض کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان پر زکوٰۃ نہیں۔

میں سے ایک بچھڑا دینا فرض ہے۔ یہ گفتگو محض رائے پر مبنی ہے اور رائے کو شریعت میں اس قدر دخل نہیں۔ اس کے بعد امام ابوحنیفہ نے پھر رجوع کر لیا اور اس رائے کو اختیار کیا جسے شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ بھیڑ بکری کے چالیس سے کم اور گائے کے تیس سے کم بچوں میں زکوٰۃ نہیں۔ جب بھیڑ بکری کے بچے چالیس ہو جائیں تو ان میں سے ایک بکروٹا دینا ہو گا اور بچھڑوں میں سے ایک بچھڑا دینا لازم ہو گا۔ رہا اونٹ کے بچوں کا مسئلہ تو اگر وہ پچیس ہوں تو ان میں سے ایک دیا جائے گا اور چھہتر پر دو حتیٰ کہ یہ مقدار واجب کی تہائی کو پہنچ جائے جب تہائی کو پہنچ جائے تو پھر دو بچوں کی تہائی بطور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ ایک روایت کے مطابق پچیس سے کم اونٹ کے بچوں پر کچھ فرض نہیں جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ پانچ میں ایک بچہ شتر کا پانچواں حصہ قیمت اور دس پر اونٹ کے ایک بچے کے دو پانچویں حصے دیئے جائیں گے ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اونٹ کے بچے کی قیمت کا پانچواں حصہ اور بکری کی قیمت کو دیکھا جائے گا جو رقم ان دونوں میں سے کم ہو گی وہ بطور زکوٰۃ لاگو ہو گی۔ اس طرح دس پر دو بکریوں کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے گا۔

ان جانوروں کے بچوں کو کب بڑا شمار کیا جائے گا؟

گائے، بکری، اونٹ کے بچے جب دودندے ہو جائیں گے تو پھر یہ بڑے جانوروں میں شمار ہوں گے اور ان کو بڑوں کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ کا تعین کیا جائے گا۔ زکوٰۃ تو بالاتفاق واجب ہو گی لیکن زکوٰۃ کی مقدار بڑے جانور ہوں گے پھر جب تک مال میں مقدار زکوٰۃ موجود نہیں زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔ جب ریوڑ میں دو مسن اور ایک سو انیس بکروٹے ہیں تو ان میں سے دو مسن زکوٰۃ دی جائے گی۔ ایک ایک مسن اور ایک سو بیس بچے ہیں تو صرف ایک مسن فرض ہو گا یہ رائے امام ابوحنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمہ کی ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ایک مسنہ اور ایک بکروٹا واجب ہے۔ اگر گائیں ہو تو ایک مسنہ اور ایک بچھڑا واجب ہے۔ اگر مسنہ درمیانے درجے کا نہ ہو تو وہی اعلیٰ قسم کا یا ادنیٰ قسم کا مسنہ دیا جائے گا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا موجود ہی نہیں۔

زکوٰۃ میں جانور کی بجائے اس کی قیمت ادا کرنا

زکوٰۃ میں ضروری نہیں کہ جانور ہی دیئے جائیں، ان کی قیمت لگا کر رقم بھی دی جا سکتی ہے اسی طرح کفارہ، صدقۃ الفطر اور نذر میں مال کی بجائے نقدی دی جا سکتی ہے۔ اگر درمیانی درجہ کے دو حقے فرض تھے اور مالک نے ایک ایسا حقہ دے دیا جس کی قیمت اوسط درجہ کے دو حقوں کی قیمت کے برابر ہے تو جائز ہے کیونکہ جن میں تفاضل سود نہیں ہوتا ان میں قیمت لگا کر ایک کی بجائے دو لے لینا یا دے دینا جائز ہے لیکن جس شخص نے دو ایسے دینار زکوٰۃ دینا ہو جو جید نہ ہوں اور وہ اس کی جگہ وہ ڈیڑھ دینار ایسا دے دے جو اچھا ہو تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ سودی مال میں اچھے یا برے مال میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا۔

ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں عمدہ گندم کی ایک بوری صدقہ کروں گا تو وہ ردی گندم کی دو بوریاں جن کی قیمت ایک عمدہ گندم کی بوری کے برابر ہو صدقہ نہیں کر سکتا کیونکہ گندم اور دوسری اجناس میں

تفاضل سود بن جاتا ہے۔

اگر نذر مانی کہ دو کمزور بکریاں صدقہ کروں گا تو ایک موٹی بکری جس کی قیمت ان دو بکریوں کی قیمت کے برابر ہو صدقہ کی جاسکتی ہے کیونکہ مویشی سودی نہیں۔

اگر ایک شخص نذر مانتا ہے کہ وہ دو کمزور بکریاں فی سبیل اللہ ذبح کرے گا یا ان کی قربانی دے گا تو اب ایک موٹی بکری جس کی قیمت ان دو کمزور بکریوں کے برابر ہے' ذبح نہیں کرسکتا کیونکہ یہاں اس کے ذمہ دو خون بہانے ہیں۔ ایک سے ایک خون بہا ادا ہوگا لیکن صدقہ میں تفاضل جائز ہے کیونکہ صدقہ میں مقصود محتاج کی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے اور وہ دونوں صورتوں میں پوری ہوجاتی ہیں۔

امام شافعی علیہ الرحمہ کی رائے ہے کہ زکوٰۃ میں مال دیا جائے گا اور مال کی جگہ ان کی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی۔ شاید اس وجہ سے کہ حدیث میں بکری اور بنت مخاض کے الفاظ آئے ہیں اور وہ ان کے تغیر کو جائز نہیں سمجھتے۔

ہمارا نظریہ یہ ہے کہ قیمت بھی ادا کی جاسکتی ہے اور اعلیٰ لے کر رقم دی جاسکتی ہے اور ادنیٰ لے کر رقم لی جاسکتی ہے مثلاً ایک شخص نے زکوٰۃ میں بنت مخاض دینا ہے اور وہ بنت لبون دے کر باقی قیمت ادا کر دیتا ہے تو جائز ہے کیونکہ بنت مخاض دینا ضروری نہیں اصل میں فرض بنت مخاض کی مالیت ہے۔ اگر اس کی صورت واجب ہوتی تو صرف وہی دیا جاسکتا جیسے قربانی اور ھدی کے تمام واجبات میں خاص اصل جانور دیئے جاتے ہیں۔

ہماری دوسری دلیل یہ ہے۔

قال طاؤس قال معاذ لاھل الیمن ائتونی بخمیس اولبیس مکان الذرة والشعیر اھون علیکم وخیر لا صحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینة. (رواہ بخاری)

حضرت طاؤس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل یمن سے فرمایا کہ آپ لوگ جوار اور جو کی جگہ مجھے نیزے اور کپڑے دے دیں یہ تمہارے لئے آسان ہوگا اور مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان کے لئے بہتر ثابت ہوگا۔

ہماری تیسری دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ کی اونٹنیوں میں ایک خوبصورت اونٹنی دیکھی اور پوچھا یہ کیا ہے (یعنی یہ اونٹنی کہاں سے لی گئی ہے) فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن ابی شیبہ علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دو اونٹوں کے بدلے ایک اونٹنی جوان دو کی قیمت کے برابر ہو لی جاسکتی ہے کیونکہ زکوٰۃ میں جانوروں کی مالیت مقصود ہے جو ایک خاص مقدار رکھتی ہے جانور مقصود نہیں جب یہ معلوم ہو گیا کہ نص سے دو اونٹوں کے بدلے ایک خوبصورت اونٹنی لی جاسکتی ہے تو لامحالہ بکریوں کے بارے جو کچھ گذشتہ سطور میں بیان ہوا ہے وہ صحیح ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ زکوٰۃ میں کسی نے بکری دی تو تب بھی صحیح ہے کیونکہ یہ واجب مالیت کا فرد ہے اور اگر قیمت ادا کرتا ہے تو بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی کیونکہ اس طرح اس کی مالیت ادا ہوجاتی ہے۔ اگر بکری کی جگہ کسی نے اس کی قیمت کی مالیت کے کپڑے دے دیئے تو بھی جائز ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ شوافع کا اپنی کتب اصول میں یہ کہنا کہ اگر قیمت دینا جائز ہے تو پھر بکری دینا جائز نہیں

اس میں کوئی وزن نہیں کیونکہ بکری کی بجائے اس کی قیمت کو جائز سمجھنا بعید کی تاویل نہیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ لفظ شاۃ ایسی صورت میں بھی اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہو رہی ہے اس کا ذکر صرف مالیت واجبہ کے اعتبار سے ہے کیونکہ ایک مخصوص مقدار مال واجب ہے نہ کہ بکری کی صورت۔ پس شوافع کا یہ قول کہ بکری کی بجائے قیمت کو بطور زکوٰۃ دینا جائز ہے' بعید کی تاویل ہے حنفیوں کے کلام میں غور وفکر نہ کرنے کا نتیجہ ہے کیونکہ حنفی یہ نہیں کہتے کہ صرف قیمت ہی جائز ہے اور بس بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بکری واجب ہے اور اگر اس کی مالیت دینا چاہتا ہے تو بھی دے سکتا ہے۔ درحقیقت یہ تاویل نہیں چہ جائیکہ یہ بعید کی تاویل ہو۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ تاویل ہے تو پھر بھی اس تاویل کے جائز ہونے پر شرعی دلیل موجود ہے اور وہ یہ کہ لفظ شاۃ مضاف الیہ ہے اور قیمت مضاف ہے اکثر مضاف کو حذف کر دیا جاتا ہے لیکن معنی میں اس کا اعتبار ہوتا ہے اس صورت میں یہ دور کی تاویل نہیں اور بکری سے مراد بکری کی قیمت ہے۔

ہمارے مشائخ یہ استدلال بھی پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رازق ہے اس کا وعدہ ہے کہ وہ ہر ایک کو رزق دے گا۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اس وعدہ کو ایفاء کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو مال و دولت عطا کر کے غنی بنا دیا اور کچھ لوگ مال و دولت سے محروم فقیر رہے غنیوں کو تو مال و دولت مل گیا اس طرح ان کے ساتھ وعدہ پورا ہوا اللہ کریم نے غریبوں کے ساتھ وعدہ ایفاء کرتے ہوئے مالداروں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور غریبوں کو اس کا مالک بنائیں۔

اب فقیروں کی ضروریات مختلف ہیں انہیں کھانے پینے کی بھی ضرورت ہے' کپڑے اور مکان کی بھی ضرورت ہے۔ امیروں کا دیا ہوا مال ان گوناگوں ضروریات کے لئے ناکافی ہوتا ہے اس سے اندازہ ہوا کہ امراء کے لئے مویشیوں اور غلے کی بجائے نقدی دینا جائز ہے تاکہ وہ بآسانی اپنی فوری ضروریات کا اہتمام کر سکیں اور اس طرح فقیروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا ہوا وعدہ پورا ہو۔

اس گفتگو پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے حکم سے فقیروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا نہیں ہوتا کیونکہ اس سے لازم آتا ہے۔ کہ اگر امراء زکوٰۃ نہ دیں تو فقیروں کو رزق نہیں پہنچے گا' ایسا نہیں ہو سکتا اگر اغنیاء زکوٰۃ نہ بھی دیں تو اس کا وعدہ پورا ہو گا اور فقیروں کو ان کا رزق پہنچے گا کیونکہ وہ ان کے دلوں میں کسب معاش کا خیال ڈال دیتا ہے کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کو کچھ دینے کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔ یہ سب اسی رزاق کی رازقیت ہے۔

رہا وہ جو فتح القدیر میں ہے کہ جب کسی شخص کو کچھ دینے کا وعدہ کیا گیا ہو پھر کسی مالدار شخص کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ اتنا مال فلاں شخص کو دے تو یہ یقینی طور پر وعدہ کا ایفاء ہے فتح القدیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں وعدہ کا ایفاء سمجھا جائے گا جب وہ مال حکم دینے والے نے دیا ہو۔ اگر حکم دینے والا مال کے وصول کا کوئی ذریعہ پیدا کر دے اور پھر اسے حکم دے کہ وہ اسے فقیر کو دے تو مذکورہ قول کے مطابق یہ حکم وعدہ کا ایفاء کے لئے نہیں ہو گا۔ بلکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ ایک اور بھلائی ہے اس وعدہ کا ایفاء نہیں ہے۔ الغرض اس بارے جو کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا دعویٰ یہ نہیں کہ وعدہ وفا کرنے کا انحصار زکوٰۃ کا حکم دینے پر ہے اور اس کی دوسری کوئی صورت

نہیں بلکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ انسان کو جس جس طریقے سے رزق حاصل ہوتا ہے وہ ایفائے عہد کی ہی صورت ہے اور اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ زکوٰۃ کا حکم بھی اللہ تعالیٰ کے رزق پہنچانے اور اپنا وعدہ پورا کرنے کی ایک صورت ہے اس لئے اگر زکوٰۃ دینے والا مال کی بجائے اس کا بدل (قیمت وغیرہ) دے دیتا ہے تو اس کی اجازت ہے۔

فتح القدیر میں مذکور ہے کہ یہ عذر زکوٰۃ دینے والے کے لئے مال تبدیل کرنے کی اجازت کا موجب نہیں ہو سکتا اور یہ کیوں جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص مال دینے کا وعدہ کیا ہو اور اسے اختیار دے دیا ہو کہ وہ جس طرح چاہے اسے صرف کرے۔ پس فقیر کے لئے استبدال کی اجازت ہے لہٰذا اس سے لازم آیا کہ اگر وعدہ پورا کرنے کو زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ اس کی ادائیگی کے حکم کے ساتھ متعین کر دیا جائے تو پھر یہ حکم بدل کا بھی ہوگا ورنہ وعدہ پورا نہیں ہوگا۔

اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مال کے دینے کا وعدہ نہیں کیا پس بعض لوگوں پر فرض ہے کہ وہ مویشی دیں۔ بعض غلہ دیں اور بعض نقدی کی صورت میں زکوٰۃ ادا کریں۔ تو اس طرح ساری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس لئے مال کی بجائے کپڑے دینا بھی صحیح ہوا۔

پھر اس بارے یہ تحقیق بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امراء کی طرح فقراء سے بھی رزق پہنچانے کا وعدہ فرمایا ہے وہ ہر ایک کو یقینی طور پر رزق عطا کرتا ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی محروم رہ جائے لیکن اس کی صورتیں مختلف ہیں کبھی تو امیروں کے دل میں صدقہ وخیرات کا خیال ڈال دیتا ہے اور کبھی فقیروں کو کمانے پر لگا دیتا ہے اور انسان مختلف قسم کے کام کرنے لگتا ہے تو وعدہ کا ایفاء درحقیقت اللہ تعالیٰ کا تکوینی ارادہ ہے کہ رزق ہر ایک تک پہنچے یہ شرعی اور غیر شرعی دونوں طریقوں سے پہنچ سکتا ہے اگر حلال میں اسے منحصر کریں تو گویا جو زندگی بھر حرام کھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا رازق نہیں حالانکہ ایسا نہیں لہٰذا زکوٰۃ کی فرضیت ہی وعدے کا ایفاء نہیں کیونکہ یہ وعدہ تو ضرور پورا ہونا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی مکلف کے اختیار پر موقوف ہے ہاں زکوٰۃ کا حکم وعدہ پورا کرنے کی ایک صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے بندوں کو رزق دیتا ہے جب حکم زکوٰۃ ہی وعدہ کا ایفاء نہ ہوا تو بدل صحیح نہ ہوا۔ پس وعدہ کا ایفاء ارادہ تکوینی ہے حکم زکوٰۃ نہیں اس طرح ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کی زکوٰۃ دینا صحیح نہیں ہے اگر دوران سال نصاب کی جنس سے کچھ مال مزید بڑھ گیا اور مالک نصاب کے علاوہ اس مال کا بھی مالک ٹھہرا تو اس مال پر بھی زکوٰۃ فرض ہے اور نصاب پر سال کا گزرنا دوران سال پیدا ہونے والے مال کے لئے کافی سمجھا جائے گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ سال کے دوران صاحب نصاب جس مال کا مالک بنتا ہے اسے اس نصاب میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے لئے بھی حولانِ حول شرط ہے۔

ہم کہتے ہیں سال کے دوران صاحب نصاب کے ہاتھ جو مال آیا وہ نصاب کے تابع ہے کیونکہ وہ اسی کی جنس میں سے ہے تو حولانِ حول اصل پر ضروری ہے تابع پر نہیں جیسے مویشیوں کے نصاب کا کوئی شخص مالک ہے سال کے دوران ان کے بچے ہو جاتے ہیں یا صاحب نصاب کو سال کے دوران مال تجارت سے نفع ہو جاتا ہے تو انہیں

نصاب کا حصہ سمجھا جائے گا اور اس پر الگ سے حولانِ حول کو شرط قرار نہیں دیا جائے گا۔

امام شافعی علیہ الرحمہ اپنے نظریہ کی تائید میں یہ حدیث مبارک پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مال سے استفادہ کیا تو اس پر زکوٰۃ نہیں حتیٰ کہ اس پر سال گزر جائے۔

اس حدیث کی سند پہلے گذر چکی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص نصاب کا مالک نہیں اور دورانِ سال وہ صاحب نصاب بن جاتا ہے تو اس پر اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں جب تک سال گزر نہیں جاتا کیونکہ اس صورت میں حاصل ہونے والا مال اصل ہے تو اصل پر سال کا گزرنا ضروری ہے لیکن سال کے دوران اصل میں جو اضافہ ہوا اور یہ اضافہ ہے بھی نصاب کی جنس سے تو یہ نصاب کے تابع ہوگا اور اصل پر سال کا گزرنا ہی کافی ہوگا۔

زکوٰۃ صرف نصاب پر فرض ہوگی نہ کہ عفو پر

شیخین کے نزدیک زکوٰۃ صرف نصاب پر فرض ہے عفو پر نہیں ہدایہ میں اس قول کی یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پانچ اونٹوں میں ایک بکری ہے اور پانچ سے زائد اونٹوں پر (جسے فقہ کی زبان میں عفو کہتے ہیں) کوئی زکوٰۃ نہیں حتیٰ کہ وہ دس ہو جائیں اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر نصاب کے بارے فرمایا۔

فتح القدیر کے مصنف فرماتے ہیں کہ ابن جوزی علیہ الرحمہ نے اس قول کی نسبت قاضی ابویعلی اور ابی اسحاق شیرازی کی طرف کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ قول ان دونوں علماء کی کتب میں موجود ہے امام محمد فرماتے ہیں اور یہی قول امام زفر کا بھی ہے کہ زکوٰۃ نصاب اور عفو دونوں کے مجموعے پر فرض ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط کی یہ سطور ہیں جب اونٹوں کی تعداد پچیس کو پہنچ جائے تو پینتیس تک ایک بنت مخاض فرض ہوگا۔ اسی طرح تمام وہ خطوط جو صدقات کے بارے تحریر ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ عفو پر بھی زکوٰۃ ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ مذکورہ حدیث کی نسبت یہ خط زیادہ صحیح ہے اور اسی کی سند زیادہ قوی ہے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ حضرت ابوبکر صدیق کا خط متن اور سند کے اعتبار سے قوی ہے تو پھر زائد پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ پس امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ صحیح ہے۔

اگر کچھ اونٹ مر جائیں تو شیخین کے نزدیک پہلے انہیں عفو کی طرف پھیرا جائے گا لیکن امام محمد کے نزدیک کل (نصاب اور عفو) کی طرف۔ اس کو یوں سمجھئے کہ کسی کے پاس پینتیس اونٹ تھے جن میں سے دس ہلاک ہو گئے تو شیخین کے نزدیک اس پر ایک بنت مخاض فرض ہوگا جس طرح اونٹوں کی ہلاکت سے پہلے اس پر بنت مخاض فرض تھا جبکہ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک ایک بنت مخاض کی قیمت سات حصے بنائیں جائیں گے اور ان میں سے پانچ حصے بطور زکوٰۃ دیئے جائیں گے کیونکہ شیخین کے نزدیک پچیس اونٹوں پر زکوٰۃ فرض ہے جبکہ امام محمد کے نزدیک پینتیس پر۔

میری (مصنف علیہ الرحمہ) رائے میں اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ بنت مخاض نصاب اور عفو دونوں کے مجموعے کی زکوٰۃ ہے تو پھر بھی یہی زکوٰۃ رہے گی کیونکہ جو مافوق کی زکوٰۃ ہے وہی ماتحت کی زکوٰۃ بھی ہے۔ دس

اونٹ ہلاک ہو گئے تو پچیس اونٹ جو باقی بچے ہیں ان کی بھی زکوٰۃ تو دینی ہے۔ ان کی تعداد پر ایک بنت مخاض واجب ہے۔ سال گزر چکا ہے لہٰذا باقی کی زکوٰۃ دینا ہو گی اگر اس سے زائد اونٹ باقی بچ جاتے تو پھر بھی جملہ اونٹوں کی یہی زکوٰۃ ہوتی جب ایک چیز کے کئی اسباب ہوں تو جب تک ایک سبب بھی موجود رہے گا وہ چیز موجود رہے گی۔

اگر ہلاک ہونے والا مال عفو سے زیادہ ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک سب سے پہلے اسے عفو کی طرف پھیرا جائے گا اور پھر قریب ترین نصاب کی طرف اور مشہور یہ ہے کہ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک نصاب کو مقررہ حصہ کی طرف پھیرا جائے گا۔

جیسے چالیس اونٹوں میں سے پندرہ اونٹ ہلاک ہو گئے تو چار اونٹوں کو عفو کی طرف پھیرا جائے گا اور گیارہ کو قریب ترین نصاب کی طرف۔ لہٰذا اس صورت میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایک بنت مخاض فرض ہو گا اور امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک بنت لبون کا پندرھواں حصہ جبکہ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک بنت لبون کے آٹھ حصے بنا کر اس میں سے پانچ حصہ (قیمت) زکوٰۃ دے دی جائے گی۔

میرے نزدیک امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ پورے پچیس پر بنت مخاض کی مالیت فرض ہوتی ہے جب پچیس سے بڑھ کر چھتیس ہو جائیں تو اس اضافہ کی وجہ سے ایک بنت لبون کی مالیت فرض ہو جاتی ہے۔ اب یہ مالیت بنت مخاض کی مالیت اور کچھ زائد کو شامل ہے جب پچیس سے زائد ہلاک ہو گئے تو بنت لبون کا سبب نہ پایا گیا اور بنت مخاض کی فرضیت کا سبب پایا گیا اور بنت مخاض، بنت لبون کو بھی شامل تھا اور کچھ زائد مالیت کو بھی لہٰذا بنت مخاض تو فرض رہے گا کیونکہ اس کی فرضیت کا سبب موجود ہے لیکن جو اس پر زائد فرض تھا وہ فرض نہیں رہے گا کیونکہ اس کا سبب موجود نہیں رہا۔

فرض مالیت کے اجزاء کو مال کے اجزاء پر تقسیم کرنا صحیح نہیں کیونکہ شریعت میں اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ نصاب کے اجزاء بنت لبون کے اجزاء کی فرضیت کا سبب نہیں اس لئے رائے سے ان کو اجزائے بنت لبون کی فرضیت کا سبب بنانا صحیح نہیں ہے۔

بنو تغلب سے مسلمانوں جیسا سلوک ہو گا اور ان سے وہی کچھ لیا جائے گا جو دوسرے مسلمان مرد اور عورتوں سے لیا جاتا ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے لئے یہی حکم دیا تھا، تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ بڑی شہرت رکھتا ہے۔

سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کا بیان

چاندی اور سونے پر زکوٰۃ کب فرض ہوتی ہے؟

چاندی کی زکوٰۃ اس وقت فرض ہو گی جب کسی کے پاس دوسو درہم ہوں گے، ان دوسو درہموں میں سے پانچ درہم بطور زکوٰۃ ادا کئے جائیں گے۔ یہاں بھی حولانِ حول شرط ہے۔ حضرت عمرو بن حزم کے خط میں یہی مذکور ہے۔

سونے کا نصاب بیس دینار ہے (یعنی کسی کے پاس اگر بیس دینار ہوئے تو وہ زکوٰۃ دے گا)۔ اس پر نصف دینار زکوٰۃ ہوگی جیسا کہ عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط میں مذکور ہے۔ اس کی دوسری دلیل حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ کی نقل کردہ حدیث ہے کہ امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: میں گمان کرتا ہوں کہ یقیناً انہوں نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لی ہوگی۔ یہ حدیث طویل ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: جب تیرے پاس دوسو درہم ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو اس میں سے پانچ درہم زکوٰۃ ہے اور آپ پر کوئی اور چیز دینا فرض نہیں یعنی سونے میں حتیٰ کہ تیرے پاس بیس دینار ہو جائیں اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان میں سے نصف دینار زکوٰۃ ہے اور جو اس سے زائد رقم ہوگی (سونے کی صورت میں) تو اسی حساب سے اس پر بھی زکوٰۃ ہوگی۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا یہ قول حضرت علی کا ہے یا انہوں نے اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے حولانِ حول ضروری ہے جیسا کہ عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط سے ظاہر ہے۔ اگر کسی کے پاس چالیس دینار ہوں تو اس پر ایک دینار واجب ہے۔ یہ الفاظ نصاب کو بیان نہیں کرتے بلکہ صرف چالیس دیناروں پر زکوٰۃ کو بیان کرتے ہیں۔

بغیر ڈھلے ہوئے سونے' چاندی پر زکوٰۃ کے متعلق ائمہ کرام کی وضاحت

زکوٰۃ جس طرح سونے اور چاندی کے سکوں پر فرض ہے اسی طرح سونے اور چاندی کی پتریوں (غیر ڈھلا ہوا سونا' چاندی) پر بھی فرض ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک زیورات پر زکوٰۃ نہیں کیونکہ وہ انسان کی ضرورت ہے اور ضروریات پر زکوٰۃ نہیں جیسے کپڑے' گھر اور اس قسم کی دوسری ضروریاتِ زندگی۔ یہ قیاس نص کے مقابل ہے اس لئے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہماری دلیل یہ ہے کہ ارشادِ ربانی ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ.

کنز سے مراد ذخیرہ اندوزی ہے کہ انسان مال جمع کرتا جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے۔

قال عبد الله بن دينار قال سمعت ابن عمر وهو يسال عن الكنز ماهو فقال هو المال الذى لايؤدى منه زكوته. (رواہ مالک)

حضرت عبداللہ بن دینار فرماتے ہیں میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سنا جبکہ ان سے کنز کے بارے سوال ہوا کہ کنز کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کنز وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے۔

بعض شافعی علماء فرماتے ہیں کہ جو عام لفظ مدح وذم میں وارد ہو وہ عام نہیں ہوتا لہٰذا اس آیت میں بھی عموم نہیں ہے شوافع کا یہ کہنا غلط ہے جیسا کہ اصول کی کتابوں سے واضح ہے۔

ہماری دوسری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ:

مامن صاحب ذهب ولا فضة لايودى

جو شخص سونا چاندی رکھتا ہو اور اس کی زکوٰۃ نہ دے تو

حقها الا اذا كان يوم القيمة صفحت له صفائح من نار فاحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها وجهه وجبهته وظهره كلما ردت اعيدت له في يوم كان مقداره خمسين الف سنة حتى يقضى بين العباد فيرى سبيله اما الى الجنة واما الى النار.

قیامت کے دن اس کے لئے آگ کی چٹانوں کے پرت ہوں گے اور جہنم کی آگ سے اس کو تپایا جائے گا اور اس کے پہلو پیشانی اور پیٹھ کو اس کے ساتھ داغا جائے گا ایک بار عمل کرنے کے بعد دوبارہ لوٹایا جائے گا جو دن پچاس ہزار دن کے برابر ہے اس میں یہ عمل مسلسل ہوتا رہے گا۔ حتیٰ کہ لوگوں کے درمیان رب قدوس فیصلہ فرما دے گا' جنت والے جنت کو اور جہنم والے جہنم کو چلے جائیں گے تو اسے (جنت یا جہنم کا) راستہ دکھا دیا جائے گا۔

زیورات میں زکوٰۃ کی فرضیت کے بارے ہماری خاص دلیل یہ حدیث ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان امرأة اتت رسول الله صلى الله عليه وسلم ومعها ابنة لها وفي يد ابنتها مسكتان غليظتان من ذهب فقال التعطين زكوة هذا قالت لا قال ايسرك ان يسورك الله بهما يوم القيمة سوارين من نار قال فخلقهما فالقتهما الى النبي صلى الله عليه وسلم وقالت هما لله ورسوله. (رواہ ابوداؤد)

عمرو بن شعیب اپنے والد گرامی سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس عورت کے ساتھ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جس کے ہاتھ میں سونے کے موٹے کنگن تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے؟ عرض کرنے لگی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو یہ چاہتی ہے قیامت کے دن ان دونوں کے بدلے اللہ تعالیٰ تجھے آگ کے کنگن پہنائے؟ راوی فرماتے ہیں کہ اس بچی نے فوراً ان کنگنوں کو اتار کر نبی کریم ﷺ کی طرف پھینک دیا اور عرض کرنے لگی یہ اللہ اور اس کے رسول کے ہوئے۔

فتح القدیر میں ہے کہ بقول ابوالحسن بن قطان کے اس کی سند صحیح ہے۔ منذری نے اپنی مختصر میں فرمایا ہے کہ اس کی سند میں کوئی کلام نہیں پھر انہوں نے اس کی سند کے تمام راویوں کا فرداً فرداً ذکر کیا۔

ایسی ہی ایک اور حدیث مروی ہے۔

عن عطاء قال بلغني ان ام سلمة قالت كنت البس اوضاحاً من ذهب فقلت يا رسول الله اكنز هو فقال مابلغ ان يودى زكوته فزكى فليس بكنز. (رواہ مالک)

حضرت عطاء سے روایت ہے' فرماتے ہیں مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ارشاد ہے کہ میں سونے کی پازیبیں استعمال کرتی تھی۔ میں نے حضور ﷺ سے (ایک دن) پوچھا یا رسول اللہ کیا یہ بھی کنز (ذخیرہ اندوزی) ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس قدر نہیں کہ اس کی زکوٰۃ دی جائے یہ پاک ہے' کنز نہیں ہے۔

عن امیر المؤمنین عمر انه کتب الی ابی موسی الاشعری ان مر قبلک من نساء المسلمین ان یزکین حلیهن ولا یجعلن الضیافة والهدیة بینهن تعارضا. (رواہ ابن ابی شیبہ)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابی موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ لکھ بھیجا کہ اپنی طرف سے مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دو کہ وہ اپنے زیورات کی زکوٰۃ ادا کریں اور اسے باہم مہمان نوازی اور ہدیہ نہ بنائیں کہ باہم تبادلہ کریں۔

فتح القدیر میں ان تمام احادیث کو ذکر کرنے کے بعد یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر موقوف احادیث اور اس ضمن کی دوسری مرفوع احادیث کثرت سے ہیں لیکن ہم نے صرف ان احادیث کو ذکر کیا ہے جن کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔

فتح القدیر کی اس عبارت سے ظاہر ہوا کہ سفر سعادت کے مصنف کا یہ کہنا کہ زیورات کی زکوٰۃ کے بارے کوئی صحیح حدیث نہیں، بہت بڑی خطا ہے اور امام ترمذی علیہ الرحمہ کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ زیورات کی زکوٰۃ کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے۔ منذری فرماتے ہیں کہ شاید ترمذی علیہ الرحمہ نے ان دو طرق کا قصد کیا ہو جن کو انہوں نے ذکر کیا ہے ورنہ حضرت ابوداؤد کے طریق میں تو کسی کو کچھ کلام نہیں جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

جب چاندی دوسو سے بڑھ کر دوسو چالیس درہم ہو جائے تو دوسو پر ایک درہم ہوگا اور جو چالیس درہم زیادہ ہیں تو ہر چالیس درہموں پر ایک درہم فرض ہوگا اور چالیس سے کم عفو شمار ہوگا جس پر امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک کچھ زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ اس طرح جب بیس مثقال ہوں تو ہر چار مثقال پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور چار سے کم مثقال عفو شمار ہوں گے جس پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ جو زائد مالیت ہے اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہوگی اگر یہ زیادتی چاندی میں ایک درہم کی مقدار ہو یا سونے میں ایک مثقال ہو تو صاحبین کے نزدیک عفو نہیں۔ یہی رائے امام شافعی علیہ الرحمہ کی ہے کیونکہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ جو اس سے زائد ہوگا اس پر اس کے حساب سے زکوٰۃ ہوگی۔

ہماری دلیل حضرت عمرو بن حزم کا خط ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے جو اس سے زائد ہو تو ہر چالیس درہم پر ایک درہم فرض ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسو سے زائد میں ہر چالیس درہموں پر صرف ایک درہم فرض قرار دیا ہے۔ پس جو مالیت چالیس سے کم ہے اس پر کسی قسم کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔ عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خط زیادہ قابل عمل ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ خط صحیح (حدیث کی حیثیت رکھتا) ہے اور اسلام کے قواعد میں سے ہے، امت نے اس خط کو قبول کیا ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے اسے اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو گیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط ہے۔ جب حضرت عمرو بن حزم کے خط کی یہ حالت ہے تو حضرت امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو (دوسو سے) زائد درہم ہیں ان پر ان کے

حساب کے مطابق واجب ہوگی بشرطیکہ وہ اس مقدار کو پہنچ جائیں جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ جب عفو دراہم میں ثابت ہوگیا تو دنانیر میں بھی ثابت ہوگیا کیونکہ دراہم اور دنانیز ایک ہی جنس سے ہیں۔ ایک دینار کی قیمت دس درہم بنتی ہے تو زائد دنانیر پر زکوٰۃ صرف اس صورت میں فرض ہوگی جب ان کی مالیت چالیس درہموں کو پہنچ جائے گی۔

اس اختلاف کے پیش نظر بہت سارے مسائل سامنے آتے ہیں جب ایک شخص دو سو درہم اور (زائد) پانچ درہم کا مالک بنا اور اس پر دو سال گزر گئے اور اس نے زکوٰۃ نہیں دی تو امام صاحب کے نزدیک اب وہ دو سال کی زکوٰۃ دس درہم دے گا کیونکہ ایک سال کے پہلے ہی سے اس پر پانچ درہم فرض تھے۔ باقی دو سو پر دوسرے سال کے پانچ درہم بھی فرض ہو گئے اس طرح کل دس درہم ہوئے۔ صاحبین کے نزدیک دو سو کی زکوٰۃ پانچ درہم ہوگی اور پانچ درہموں کی زکوٰۃ پانچ کے دسویں کا چوتھائی ہوگا یہ پہلے سال کی زکوٰۃ ہوگی' دو سو میں سے پانچ کے دسویں کی چوتھائی کو نکال لیں کہ اس طرح یہ رقم دو سو درہموں سے کم ہو جائے گی اور نصاب نہ ہونے کی وجہ سے اس پر دوسرے سال کی زکوٰۃ ہی فرض نہیں ہوگی۔ دینار کا وزن معروف ہے' حجاز مقدس میں اس کے وزن کے بارے کوئی اختلاف نہیں۔ درہم کے وزن میں اعتبار سات کا ہے یعنی دس درہموں کا وزن سات دنانیر کے برابر ہوتا ہے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دیوان میں یہ چیز ثابت ہے۔

دو سو درہموں کا وزن پچپن روپے کے برابر ہے اور ایک روپیہ گیارہ ماشے کا ہوتا ہے جبکہ ایک ماشہ آٹھ رتی کا۔ بیس دینار کا وزن چھ روپے اور تقریباً تین رتی بنتا ہے۔

زکوٰۃ جس طرح عمدہ سونے اور چاندی پر فرض ہے اسی طرح ردی سونے اور چاندی پر بھی زکوٰۃ فرض ہے کیونکہ سونے اور چاندی کا لفظ ردی پر بھی صادق آتا ہے۔

اگر سونا اور چاندی ڈھلا ہوا ہے تو جس چیز کو غلبہ ہے اس کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ دی جائے گی کیونکہ ڈھلے ہوئے سونے چاندی میں کچھ نہ کچھ ملاوٹ ہوتی ہے لہٰذا اس جنس کا اعتبار ہوگا جس کی کثرت ہے لیکن ردی اور ملاوٹ شدہ سونے یا چاندی میں زکوٰۃ ان کی جنس میں سے دی جائے گی۔

وہ ڈھلا ہوا سونا چاندی جس میں ملاوٹ زیادہ ہو اس کو متاع خیال کیا جائے گا اور اگر وہ تجارت کے لئے ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اگر وہ اس قدر زیادہ ہے کہ اگر اسے بھٹی میں ڈال کر سونے اور چاندی کو الگ کریں تو سونا اور چاندی نصاب کو پہنچ جائیں تو پھر یہ متاع نہیں ہے' اس پر زکوٰۃ فرض ہے اگرچہ یہ تجارت کے لئے نہ ہو کیونکہ سونے اور چاندی پر ہر حال میں زکوٰۃ فرض ہے۔

سونا اور چاندی دونوں کو ملا کر نصاب شمار کیا جائے گا

اگر کسی کے پاس سونا اور چاندی دونوں دھاتیں ہیں اور الگ الگ ان کا نصاب نہیں بنتا تو دونوں کو ملا کر نصاب بنایا جائے گا اور زکوٰۃ لی جائے گی کیونکہ ان پر زکوٰۃ مالیت اور ثمنیت کی وجہ سے ہے اور اس میں دونوں دھاتیں مشترک ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دونوں کو قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے ملایا جائے گا کیونکہ ان پر زکوٰۃ مالیت کے اعتبار

سے لاگو ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک اجزاء کا اعتبار ہو گا کیونکہ زکوٰۃ کے نصاب میں قیمت کا اعتبار کوئی حیثیت نہیں رکھتا اعتبار صرف مقدار کا ہوتا ہے حتیٰ کہ کسی سونے چاندی سے بنی ہوئی چیز میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی جس پر دوسو درہم سے زیادہ قیمت خرچ ہوئی ہو لیکن اس کا وزن کم ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ ایک چیز جب کسی صورت میں ڈھال دی گئی اور اس کی اصل قیمت کا اعتبار نہیں رہا تو جب اسے قیمتاً دوسری چیز سے ملائیں گے تو بھی اس کی قیمت کا اعتبار نہیں ہو گا۔ ان دونوں جنسوں کا باہم ملانا تو ہے ہی مالیت کے اعتبار سے۔ اس اختلاف سے یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ ایک شخص ایک سو درہم اور پانچ دنانیر جن کی قیمت ایک سو درہم ہے' کا مالک ہے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ فرض ہے جبکہ صاحبین کے بقول اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

سامانِ تجارت کی زکوٰۃ کا بیان

تجارت کے مال میں زکوٰۃ کا حکم

سامان تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے' سونا ہو یا چاندی' اس کی مالیت جب نصاب کو پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے یعنی کل قیمت کا ۴/۱۰ زکوٰۃ دینا ہو گی لیکن ضروری ہے کہ یہ مال مالک نے تجارت کی نیت سے خرید اہو کیونکہ حدیث شریف میں ہے۔

عن سمرة بن جندب قال اما بعد فان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یامرنا ان نخرج الصدقة من الذی نعده للبیع. (رواہ ابوداؤد)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں اما بعد رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ: ہم اس مال میں سے صدقہ دیں جسے ہم تجارت کا مال شمار کرتے ہیں۔

خرید و فروخت کے وقت جو نیت ہے وہی معتبر ہو گی اور اسی وقت سے اس کے سال گزرنے کا حساب لگایا جائے گا کیونکہ نیت صرف اس وقت نیت ہے جب وہ کسی کام سے ملی ہوئی ہے۔ لہٰذا جس شخص نے سواری کے لئے گھوڑا خریدا پھر اس نے اسے بیچنے کا ارادہ کر لیا تو اس نیت سے وہ گھوڑا مال تجارت شمار نہیں ہو گا جب تک کہ اسے بیچ نہیں دیتا۔ لہٰذا جس وقت یہ گھوڑا بیچے گا اس وقت سے اس کی وہ رقم مال تجارت شمار ہو گی۔

اگر کسی نے تجارت کی نیت سے گھوڑا خریدا پھر اسے سواری کے لئے رکھنے کا ارادہ کر لیا تو تجارت کی نیت باطل ہو جائے گی کیونکہ یہ نیت عمل کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور وہ عمل ہے تجارت کا ترک کرنا۔

اگر کسی کو ھبہ یا وصیت وغیرہ میں کوئی چیز ملی ہو

اگر کسی کو ھبہ میں کوئی چیز ملی یا وصیت' نکاح' خلع یا دیت میں کچھ مال ملا اور اس نے اس مال سے تجارت کرنے کی نیت کر لی تو امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک یہ مال تجارت شمار ہو گا کیونکہ یہ نیت مقترن بالعمل ہے

اور وہ عمل ہے ھبہ' وصیت یا اس قسم کی کسی اور چیز کو قبول کرنا جبکہ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ فرض نہیں کیونکہ نیت کے لئے شرط ہے کہ وہ مقترن بالعمل ہو اور وہ شخص ان چیزوں کو اس نیت سے قبول نہیں کر رہا بلکہ ھبہ اور وصیت کی نیت سے قبول کر رہا ہے۔

جب کوئی شخص کسی چیز کا وارث بنا اور اس نے تجارت کی نیت کر لی تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہمارے ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کیونکہ ارث جبری ہے (یعنی خود بخود منتقل ہو جاتی ہے) لہٰذا یہاں نیت مقترن بالعمل نہیں۔ مال تجارت میں مالک کو اختیار ہے کہ چاہے تو درہموں کی قیمت لگائے اور چاہے تو دیناروں کی قیمت لگالے کیونکہ قیمت لگانے کے لئے دونوں چیزیں (سونا اور چاندی) مساوی ہیں۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس میں فقراء کو فائدہ ہو اس سے قیمت کا اندازہ لگائے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ انسان کو اختیار نہیں ان کے نزدیک جس چیز سے مال خریدا گیا ہے اس سے قیمت لگائی جائے کیونکہ اس سے مالیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ مال نقدی سے نہیں خریدا گیا بلکہ کسی سودے میں لیا ہے تو نقد غالب سے قیمت لگائے (یعنی جو عموماً اس شہر میں استعمال ہوتی ہے)۔ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک دونوں صورتوں میں نقد غالب سے قیمت لگائی جائے گی کیونکہ اس سے قیمت لگانا آسان ہوگا۔ اگر کسی کے پاس سونا' چاندی اور مال تجارت تینوں چیزیں ہیں تو ان تمام کی قیمت لگا کر زکوٰۃ دی جائے گی کیونکہ ان تمام میں زکوٰۃ مالیت کے لحاظ سے فرض ہوتی ہے۔ سونے' چاندی کو مویشیوں کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا اور نہ ہی مال تجارت کو مویشیوں سے ملایا جائے گا کیونکہ زکوٰۃ کی فرضیت کے لحاظ سے مویشی ان سے مختلف ہیں۔

اگر کوئی آدمی سال کے شروع اور آخر میں صاحبِ نصاب ہو

اگر کوئی شخص سال کے شروع اور آخر میں صاحب نصاب رہا مگر درمیان میں کچھ دن کے لئے نصاب کا مالک نہیں رہتا تو بھی اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی کیونکہ زکوٰۃ کے نفس وجوب کا سبب ہے ملک نصاب' جب سال کی ابتداء میں وہ نصاب کا مالک ہے تو اس کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہے اور سال گزرنے پر ادائیگی بھی فرض ہوتی ہے لہٰذا سال گزرنے پر جب نصاب پایا جا رہا ہے تو اس کی ادائیگی فرض ہے تاکہ وہ اپنے ذمہ سے سبکدوش ہو جائے۔ درمیان کا عرصہ جس میں وہ نصاب کا مالک نہیں رہا اس کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ اسے نہ تو نفس وجوب میں کوئی دخل ہے اور نہ ہی وجوبِ اداء میں لہٰذا ملک نصاب کا اس میں کوئی اعتبار نہیں۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک غلے اور پھلوں کے لئے کوئی نصاب مقرر نہیں۔ زمین سے تھوڑی فصل پیدا ہو یا زیادہ اس پر صدقہ فرض ہے خواہ یہ فصل سبزیوں کی صورت میں ہو یا غلے کی صورت میں۔ پھلوں کی صورت میں یا کسی اور صورت میں ہاں ایندھن' سرکنڈے اور گھاس وغیرہ پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ اگر ایندھن وغیرہ کو کسی نے زمین میں خود کاشت کیا ہو تو پھر اس پر صدقہ ہوگا۔

جن زمینوں سے نصف عشر وصول کیا جائے گا

عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

قال فیما سقت الانهار والغیم والعشور وفیما سقی بالسانیة نصف العشور.

اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہری، بارشی عشر والی اور جس کو راہٹ سے پانی دیا جاتا ہو اس پر نصف عشر ہے۔

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔اسی طرح کی حدیث صحیح بخاری میں بھی ہے۔

جن سے عشر وصول کیا جائے گا

عن معاذ انه بعثنی رسول الله صلی الله علیه وسلم الی الیمن وامرنی ان اخذ مماسقت السماء العشر وما سقی بالدوالی نصف العشر.

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن بھیجا اور حکم دیا کہ: جو بارانی زمین ہے اس سے عشر (دسواں حصہ) لو اور جس کو راہٹوں سے سیراب کیا جاتا ہو اس میں نصف عشر۔

اسے امام نسائی علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے اور یہ حکم عام ہے فصل کم ہو یا زیادہ دونوں صورتوں میں زکوٰۃ فرض ہوگی۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ فصل کا بھی نصاب مقرر ہے اگر فصل نصاب سے کم ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں اور نصاب ہے پانچ وسق۔ایک وسق چھ صاع کا ہوتا ہے اس سے کم پر زکوٰۃ فرض نہیں صاحبین کے نزدیک یہ بات بھی شرط ہے کہ فصل جلد خراب ہو جانے والی نہ ہو بلکہ ایسی فصل پر زکوٰۃ فرض ہے جو ایک طویل عرصے تک خراب نہ ہوتی ہو۔ صاحبین کے نزدیک اسی وجہ سے سبزیوں پر زکوٰۃ فرض نہیں۔صاحبین نصاب کی شرط اس لئے لگاتے ہیں کہ عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط میں یہ شرط موجود ہے کہ پیداوار پانچ وسق کو پہنچ جائے۔

عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال لیس فیما دون خمسة اواق صدقة ولا فیما دون خمس ذود صدقة ولیس فیما دون خمسة اوسق صدقة.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پانچ اوقیہ سے کم میں صدقہ نہیں نہ پانچ سے کم اونٹوں میں صدقہ ہے اور نہ ہی پانچ سے کم اوسق میں صدقہ ہے۔

اسے امام مسلم علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے اسی طرح کی ایک حدیث امام بخاری علیہ الرحمہ نے روایت کی ہے۔

عن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لیس فیما دون خمس اواق من الورق صدقة ولیس فیما دون خمس ذود من الابل صدقة ولیس فیما دون خمسة اوسق صدقة.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر زکوٰۃ نہیں، پانچ سے کم اونٹوں پر زکوٰۃ نہیں اور پانچ وسق سے کم (پیداوار) پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ہم کہتے ہیں کہ یہ خاص وعام کے درمیان تعارض ہے ان میں سے کسی کو مقدم نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان میں سے ایک کو راجح کرنا پڑے گا۔

علماء نے امام صاحب کے قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ پیداوار میں زکوٰۃ کی فرضیت کا سبب قوت نمو ہے لہٰذا پیداوار میں نصاب کا کوئی اعتبار نہیں۔

دوسری شرط بقاء ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سبزیوں پر صدقہ لینے سے منع فرمایا ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے دارقطنی نے موسیٰ بن طلحہ سے مرسلاً روایت کیا ہے یہ حدیث بھی اس ضمن میں روایت کی جاتی ہے کہ "سبزیوں میں صدقہ نہیں"۔

فتح القدیر میں امام ترمذی کی نقل کردہ مختلف احادیث کو سبزیوں پر زکوٰۃ کے فرض نہ ہونے کے بارے ذکر کیا ہے جن کو یہاں ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے بیان کردہ مختلف الفاظ سے روایت کردہ ان احادیث کو ذکر کرنے کے بعد امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح نہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس باب میں کوئی صحیح حدیث نہیں پائی جاتی۔

ہم کہتے ہیں کہ جب اس ضمن میں کوئی صحیح حدیث نہیں پائی جاتی تو اس حدیث کا عموم باقی رہے گا کہ جس کو نہری پانی سے سیراب کیا جائے اس پر عشر ہے اور اس حدیث کو جو ہر اعتراض سے بالا ہے دارقطنی کی مرسل حدیث پر فوقیت حاصل ہوگی اور کمزور ہونے کی وجہ سے دارقطنی کی حدیث مذکورہ حدیث کی معارض ہی نہیں ہوگی کیونکہ اس کی سند اور سنن صحیح ہیں۔

جن اشیاء کا وزن نہیں کیا جاسکتا ان کا نصاب قیمت کے لحاظ سے ہوگا

زعفران اور روئی جن کا وزن نہیں کیا جاسکتا ان کے نصاب کا اندازہ قیمت سے ہوگا اگر ان کی قیمت پانچ وسق کو پہنچ جائے تو زکوٰۃ فرض ہوگی ورنہ نہیں۔ یہ قول امام ابو یوسف کا ہے کیونکہ جب نصاب کی شرعی مقدار موجود نہ ہو تو قیمت کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ اعلیٰ پیمانہ کو نصاب شمار کیا جائے گا مثلاً کپاس کا پیمانہ گانٹھ ہے۔ تو جب کپاس پانچ گانٹھوں کے برابر ہوگی تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی ایک گانٹھ کا وزن تین سو سیر ہوتا ہے اور زعفران میں نصاب پانچ سیر ہوگا اس لئے اسے نصاب بنایا گیا ہے کہ وسق ایک اعلیٰ پیمانہ ہے جس سے دوسری فصلوں کا حساب ہوتا ہے اسی طرح دوسری انواع کا جو اعلیٰ پیمانہ ہوگا اس کو بنیاد بنا کر نصاب مقرر کیا جائے گا۔

امام ابو یوسف کے نزدیک گنے کا رس جب پانچ اوسق فصل کی قیمت کے برابر پہنچ جائے تو اس کا نصاب مکمل ہو جائے گا اور اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک جب گنے کا رس پانچ سیر ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک جب گنے کی قیمت (اس کی نہیں) پانچ اوسق کے برابر ہو جائے تو نصاب مکمل سمجھا جائے گا جبکہ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک گنے کا نصاب تب مکمل ہوگا جب تنا اس مقدار کو پہنچ جائے جس سے گنے کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

شہد پر زکوٰۃ کا حکم کب لاگو ہوتا ہے؟

شہد جب عشر والی زمین سے حاصل کیا گیا ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ یہ احناف کی رائے ہے۔ امام شافعی

علیہ الرحمہ کے نزدیک شہد میں زکوٰۃ فرض نہیں کیونکہ وہ مکھی کے بطن سے نکلتا ہے اس لئے وہ ریشم کی طرح ہے (ریشم ایک کیڑے کے پیٹ میں پیدا ہوتا ہے۔ ابتداء میں یہ کیڑا بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے درختوں کے پتے ڈال کر بڑا کیا جاتا ہے کچھ عرصہ بعد اس کے جسم پر ریشم لپٹنا شروع ہو جاتا ہے اور ابتداء میں بمشکل نظر آنے والا کیڑا دیکھتے ہی دیکھتے ریشم کے ایک گھولے میں لپیٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔ یا پھر ریشم چھوڑ کر اڑ جاتا ہے)۔

ہم کہتے ہیں کہ اس ضمن میں احادیث وارد ہوئی ہیں ایک حدیث یہ ہے

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فى كل عشرة ازقاق من العسل زق.

سیدنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہد کی ہر دس مشکوں پر ایک مشک (زکوٰۃ) ہے۔

اسے امام ترمذی علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

اس باب میں بہترین دلیل یہ حدیث ہے۔

عن سليمان عن موسى بن ابى سيارة قال قلت يا رسول الله ان لى نحلا قال والعشور قلت يا رسول الله صلى الله عليه وسلم احمهالى فحماهاله.

سلیمان نے موسیٰ بن ابی سیارہ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے پاس شہد کی مکھیاں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عشر ادا کیا کرو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ میرے لئے اندازہ مقرر فرما دیجئے آپ ﷺ نے ان کے لئے اندازہ (نصاب) مقرر فرما دیا۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن ماجہ، امام احمد، امام ابوداؤد طیالسی، ابویعلی موصلی نے اپنی مسانید میں روایت کیا ہے۔ صاحب فتح القدیر امام بیہقی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ یہ صحیح ترین حدیث ہے جو شہد میں عشر کے بارے وارد ہوئی ہے لیکن اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا یہ حدیث مرسل ہے۔ سلیمان ابن موسیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی صحابی کو نہیں پایا۔ شہد کی زکوٰۃ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔

اس اعتراض سے اس حدیث کو کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہمارے نزدیک مرسل بھی حجت ہے۔ حضرت امام محمد بن اسماعیل (امام بخاری) کا یہ کہنا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ان کے گمان کے مطابق فیصلہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک مرسل صحیح نہیں ہمارے نزدیک مرسل صحیح ہے اس لئے ہمارے نزدیک تو شہد کی زکوٰۃ پر صحیح حدیث موجود ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ حارث بن عبد الرحمٰن بن ابی ذباب الدوسی فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اسلام قبول کیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! اسلام لانے پر جو مال میری قوم کے پاس تھے وہ انہیں عطا فرما دیجئے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری یہ درخواست منظور کر لی اور مجھے ان پر عامل بنا دیا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور میں

بھی میں عامل رہا۔ فرماتے ہیں جب میں اپنی قوم کے پاس حاکم بن کر گیا تو انہیں نصیحت کی کہ اے میری قوم! زکوٰۃ ادا کرو کیونکہ اس مال میں کوئی بھلائی نہیں جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے۔ لوگوں نے پوچھا۔ شہد پر کتنی زکوٰۃ دینا ہو گی؟ میں نے کہا دسواں حصہ۔ الغرض میں نے عشر لے کر حضرت عمر کی خدمت میں پیش کر دیا اور انہوں نے اسے بیچ کر قیمت مسلمانوں کے صدقہ میں ملا دی۔

بقول صاحبِ فتح القدیر کے اس واقعہ کے راوی ابن ابی شیبہ ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل اس حدیث سے مختلف ہے ان کا کہنا ہے کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہد کی زکوٰۃ کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ انہوں نے اپنی رائے سے نفلی صدقہ کی نیت سے شہد کا دسواں حصہ بھی پیش کر دیا۔

حدیث مبارک میں لفظ زکوٰۃ امام شافعی کے مؤقف کو رد کرتا ہے کیونکہ نفلی صدقہ کو زکوٰۃ کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حدیث میں کہیں یہ اشارہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم نہیں دیا تھا اور ان لوگوں نے رائے قائم کر کے صدقہ دے ڈالا بلکہ الفاظ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابی جانتے تھے کہ زکوٰۃ فرض ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی قوم کو حکم دیا اور زکوٰۃ کا مال بارگاہِ خلافت میں پیش کر دیا اور لوگوں کو بتایا کہ جس مال سے زکوٰۃ نہ دی جائے اس میں خیر و برکت نہیں رہتی لوگوں نے پوچھا شرح زکوٰۃ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا دسواں حصہ۔ نفلی صدقے کی مقدار متعین نہیں ہوتی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین نے بھی اسے زکوٰۃ کا نام دیا اور اس کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا جس سے شہد کی زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔

امام نسائی حضرت عمرو بن شعیب سے وہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ بنی متعان کا ایک شخص اپنے شہد کا عشر لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ سلبہ کی وادی اسے ٹھیکے میں دی جائے' حضور نے وہ جنگل اس کے حوالے کر دیا۔

جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو سفیان بن وھب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا آپ نے جواب دیا کہ اگر ہلال تجھے ہی دیتا رہے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتا تھا تو اس کا ٹھیکہ جاری رکھ ورنہ وہ جنگل کی مکھیوں کی طرح ہیں ہر شخص کھا سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک شہد تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں عشر فرض ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ شہد پر زکوٰۃ اس وقت فرض ہو گی جب اس کی قیمت پانچ وسق کے برابر ہو۔ انہیں سے دوسری روایت یہ ہے کہ شہد پر زکوٰۃ دس مشکیزوں کے اعتبار سے ہے۔ تیسری روایت ان سے پانچ سیر کی ملتی ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شہد کا نصاب پانچ فراق ہے اور ہر ایک فراق چھیاسٹھ رطل کا ہے۔ شہد کا یہ نصاب اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ یہ شہد کا سب سے بڑا پیمانہ ہے۔ جو شہد پہاڑوں سے اتارا جاتا ہے یا وہ پھل جو پہاڑی علاقوں سے توڑا جاتا ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہے کیونکہ وہ زمینی پیداوار ہی ہے اس لئے اس پر عشر ہو گا جو زمین نہری ہو یا کنویں' راہٹ (ٹیوب ویل وغیرہ) سے پانی دیا جاتا ہے اس پر نصف عشر ہو گا لیکن بارانی زمین جس کا دارومدار بارش پر ہے اس کی پیداوار سے عشر لیا جائے گا جیسا کہ حضرت عمرو بن حزم کے گزشتہ خط سے ظاہر ہے۔

گزشتہ احادیث میں بھی اس کا ذکر ہے۔ وجہ ظاہر ہے بارانی زمین پر اتنی محنت نہیں کی جاتی جتنی کہ پانی والی زمین پر محنت کرنا پڑتی ہے۔ بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ کسان کی محنت اور دوسرے اخراجات کو نکال کر باقی جو فصل ہو گی اس پر عشر ہو گا لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اس طرح تو عشر ہی ختم ہو جائے گا کیونکہ نہری زمین پر بڑے اخراجات اٹھتے ہیں۔ اگر کھاد بیج اور کسان کی مزدوری نیز پانی کا خرچہ نکال لیا جائے تو باقی بہت کم فصل بچے گی۔

مالک کے بدلنے سے زمین کا حکم تبدیل نہیں ہو گا

بنو تغلب کی زمینوں پر دو عشر لازم ہیں۔ اس قبیلہ کے بچے اور عورتیں بھی دو گنا عشر دیں گے اس لئے کہ ان کے ساتھ صلح اسی شرط پر ہوئی تھی۔

امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی تغلبی نے کسی مسلمان سے زمین خریدی تو اب اس پر دو گنا عشر نہیں ہو گا کیونکہ مالک بدلنے سے عشر تبدیل نہیں ہوتا۔ اگر زمین بیچ دی گئی تو جس طرح پہلے احکام تھے وہی رہیں گے۔ مثلاً اگر پہلے زمین کسی عام مسلمان کی تھی اس سے بنو تغلب کے کسی شخص نے خریدی یا کسی ذمی نے خریدی تو اگر وہ عشری تھی تو اب بھی عشری رہے گی اگر پہلے اس سے دو گنا عشر لیا جاتا تھا تو اب بھی دو گنا لیا جائے گا اگر اس سے پہلے خراج لیا جاتا تھا تو اب بھی خراج لیا جائے گا۔ مالک کے بدلنے سے زمین کا حکم تبدیل نہیں ہو گا اگر مسلمان نے عشری زمین خریدی تو خراجی رہے گی اگر مسلمان نے ایسی زمین خریدی جس پر دو گنا عشر واجب ہے تو اب بھی وہ دو گنا عشر دے گا۔ یہ طرفین کے نزدیک ہے کیونکہ دو گنا عشر اس زمین کا وظیفہ ہے۔ اب وہی وظیفہ مسلمان کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مسلمان دو گنا عشر نہیں دے گا کیونکہ دو گنا عشر کا جو داعیہ تھا وہ زائل ہو گیا۔ علماء جواب دیتے ہیں کہ جو داعی ہے وہ دُگنا عشر کی ابتداء کی علت ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ علت ہمیشہ باقی رہے بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک چیز ابتداء میں کسی حکم کے لئے علت تھی لیکن بعد میں وہ علت نہ رہی اور حکم فرض ہونے کے بجائے سنت قرار پایا۔ جیسے رمل ابتداء میں اظہار قوت کے لئے تھا تاکہ دشمن یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یثرب کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہے لیکن اب وہ علت نہیں رہی مگر رمل کا حکم باقی ہے اور طواف کے دوران اسے سنت کی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا دو گنا عشر والی زمین جب کسی مسلمان کے پاس آ جائے گی تو اس کی مثال ایسی ہی ہو گی۔

اگر خریدنے والا آدمی ذمی (مسلم مملکت میں رہائش پذیر کافر) ہو اور تغلبی نہ ہو اور وہ خراجی یا ایسی زمین خریدے جس پر دُگنا عشر واجب ہو تو اس کا وہی حکم رہے گا جو پہلے ہے کیونکہ ذمی دُگنا عشر کے واجب ہونے کا محل ہے اسی لئے اس پر اتفاق ہے کہ زمین کا پہلا حکم باقی رہے گا۔

اگر ذمی غیر تغلبی عشری زمین خریدتا ہے دوسرے لفظوں میں بیچنے والا مسلمان ہے تو اب وہ عشری زمین امام صاحب کے نزدیک خراجی بن جائے گی کیونکہ کافر پر خراج ہونا زیادہ مناسب ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک عشر دُگنا ہو جائے گا اور اس کے ساتھ تغلبی کا سا سلوک کیا جائے گا اور عشری زمین کو خراجی زمین سے تبدیل

کرنے سے دُگنا عشر لینا زیادہ آسان ہے۔ ذمی سے خراج یا دُگنا عشر لینا رائے سے ہے لیکن تغلبی تو اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بالاجماع اس پر دگنا عشر واجب ہے۔ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک دونوں صورتوں میں یہ زمین اپنی حالت پر عشری رہے گی کیونکہ عشر زمین کی پیداوار سے لیا جانے والا صدقہ ہے اس لئے یہ تبدیل نہیں ہوگا اور نہ ہی اس میں تغیر ہوگا۔

مشائخ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ وظیفہ کا باقی رہنا اصل حکم ہے لیکن یہ اس وقت جب کوئی مانع موجود نہ ہو۔ مگر یہاں تو مانع موجود ہے کیونکہ عشر ایک لحاظ سے عبادت ہے اور کافر عبادت کے اہل نہیں۔

اگر زمین خریدنے والا تغلبی ہو اور زمین خراجی یا دُگنا عشر والی تو ملکیت کی منتقلی سے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی کیونکہ وظیفہ کی تبدیلی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر زمین عشری ہو اور خریدنے والا تغلبی ہو تو شیخین کے نزدیک اب اس پر دگنا عشر واجب ہوگا کیونکہ تغلبی پر مسلمان کی نسبت دگنا عشر واجب ہے۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ اگر خراجی یا دُگنا عشر والی زمین کو کوئی تغلبی خریدتا ہے تو اسے ایک ہی عشر دینا ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک مقرر شدہ مقدار عشر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اگر اسی زمین پر شفعہ کیا گیا اور فیصلہ شفعہ کرنے والے کے حق میں ہو گیا یا بیع فاسد تھی اس وجہ سے زمین بیچنے والے کو واپس کر دی گئی تو عشری ہی رہے گی جیسے پہلے تھی گویا مسلمان نے تغلبی سے زمین کا سودا ہی نہیں کیا۔

اگر گھر کو گرا کر باغ بنا دیا ہو

مسلمان نے اپنے گھر کو گرا کر باغ بنا دیا جس کو عشری زمین کا پانی سیراب کرتا ہے تو اس پر عشر ہوگا اگر اس باغ کو خراج والی زمین کا پانی سیراب کرتا ہے تو اس پر خراج ہوگا کیونکہ جو صدقہ ابتداء میں مقرر ہوگا وہ پانی کے ساتھ تبدیل ہوتا رہے گا۔ ذمیوں کے گھروں پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں۔ اگر ذمی نے گھر کو باغ بنا دیا تو اس پر خراج لاگو ہوگا خواہ اسے عشر والی زمین کا پانی سیراب کرتا ہو یا خراج والی زمین کا پانی۔ شیخین کے قول پر قیاس کرتے ہوئے صاحبِ ہدایہ نے کہا ہے کہ اگر عشر والی زمین کے پانی سے سیراب ہوتا ہے تو اس پر عشر ہوگا۔ ہاں امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک ایک ہی عشر ہوگا اور امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک دو عشر۔

عشری پانی اور خراجی پانی کی وضاحت

عشری پانی سے مراد بارش، کنوئیں، چشموں اور دریاؤں کا پانی ہے جو کسی کی ملکیت نہیں ہوتا اور نہ ہی ان پانیوں پر کسی کا عمل دخل ہوتا ہے کیونکہ کنوئیں کے علاوہ جتنے پانی ہیں ان سے کوئی بھی پانی لے سکتا ہے۔ اصل میں وہ ہر ایک کے لئے مباح ہیں اور کسی خاص آدمی کی ملکیت میں نہیں آتے۔ رہے کنوئیں تو ظاہر ہے اسے مسلمانوں نے کھودا ہوگا اور یہ انہیں کی ملکیت شمار ہوں گے اس لئے انہیں غنیمت شمار نہیں کرنا چاہئے۔

خراجی پانی سے مراد ان نہروں کا پانی ہے جو عجمی لوگوں کی زمین کو سیراب کرتی ہیں اور ان پر انہیں کا عمل دخل ہوتا ہے کیونکہ قریب ترین ہونے کی وجہ سے یہ نہریں عجمیوں کے تصرف میں ہوتی ہیں اس لئے یہ غنیمت کی حیثیت

اختیار کر جاتی ہیں اور ان سے سیراب کی جانے والی زمینوں پر خراج لاگو ہو جاتا ہے۔

سیحون کا پانی ترمذ کو سیراب کرتا ہے اور سیحون ترکوں کی نہر ہے۔ دجلہ سے بغداد کی زمینیں سیراب ہوتی ہیں اور فرات سے کوفہ کی زمینوں کو پانی دیا جاتا ہے اس لئے ان پانیوں سے سیراب ہونے والی زمینیں امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک عشری ہیں کیونکہ ان نہروں پر کسی کی ملکیت نہیں۔ امام ابو یوسف کے نزدیک یہ زمین خراجی ہے کیونکہ ان نہروں کو عبور کرنے کیلئے کشتیوں کے پل کی ضرورت پڑتی ہے اور ان پر ٹیکس لیا جاتا ہے لہٰذا ایک لحاظ سے یہ پانی کسی کی ملکیت ہوئے۔

جس زمین سے تیل اور تارکول وغیرہ حاصل ہوتے ہوں

زمین سے جو تارکول اور تیل نکلتا ہے اگر عشری زمین ہے تو اس پر کوئی عشر نہیں کیونکہ وہ زمین کی پیداوار نہیں بلکہ پانی کے فوارے کی طرح ایک فوارہ ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں خراجی زمین سے نکلیں تو اس پر خراج ہے بشرطیکہ زمین زراعت کے قابل ہو کیونکہ خراج صرف ایسی زمین پر ہوتا ہے جس میں زراعت ممکن ہو۔

معدنیات کی زکوٰۃ

معدنیات اگر خراجی یا عشری زمین سے نکلیں تو ان پر خمس (پانچواں حصہ) دینا ہوگا خواہ یہ معدنیات سونے' چاندی کی ہوں یا لوہے اور سکے کی۔ امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے کہ اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ مباح ہے اور شکار کی طرح اس آدمی نے اسے اپنی کوشش سے حاصل کیا ہے ہاں اگر معدنیات کا تعلق سونے یا چاندی سے ہے اور اس پر ایک سال گزر جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی جس طرح دوسرے مال پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔ ہماری دلیل یہ حدیث ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم فی الرکاز الخمس (رواہ مالک وابوداؤد)	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ارشادِ نبوی ہے رکاز (قدرتی خزانہ جو زمین میں مدفون ہو) میں خمس ہے۔

شیخین' ترمذی اور نسائی علیہم الرحمہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ:

قال العجماء جبار ومنبر جبار وفی الرکاز الخمس.	(رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا کہ عجماء' کنواں اور معدن تینوں ہدر ہیں اور رکاز میں خمس (پانچواں حصہ) ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''معدن ہدر ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر معدنیات گڑھے میں کسی آدمی کے ہاتھ سے ضائع ہو گیا تو مزدور پر کسی قسم کا تاوان نہیں۔ رکاز سے مراد وہ خزانہ ہے جو زمین میں قدرتی طور پر مدفون ہوتا ہے یا کوئی انسان اس کو دفن کر کے بھول جاتا ہے۔ یہ لفظ معدنیات اور کنز کو عام ہے۔ امام شافعی کا رکاز کو کنز کے ساتھ مختص کرنا بلا دلیل ہے' اس کا کوئی مخصص نہیں۔

جس زمین میں معدنیات ہیں اگر پہلے وہ کافروں کی ملکیت تھی مسلمانوں نے اس علاقہ کو فتح کیا تو زمین اور

جو کچھ اس زمین کے اندر ہے سب مال غنیمت ہے اور مال غنیمت پر خمس قرآن کریم سے ثابت ہے۔ فتح کے بعد جب زمینیں تقسیم ہو جائیں گی اور اس کے بعد کسی جگہ سے کوئی خزانہ برآمد ہوگا تو اب اس خزانے یا معدنیات پر مالک کا حق ہوگا تمام مجاہدین کا نہیں اس لئے خمس کے چار حصے خزانہ پانے والے کے ہوں گے اور اس میں کوئی دوسرا شخص شریک نہیں ہوگا۔

ذاتی یا غیر کی زمین سے ملنے والی اشیاء کا حکم

اگر کسی شخص کے گھر کے اندر سے کان نکل آئی تو اس پر کسی قسم کا صدقہ نہیں ہوگا کیونکہ یہ معدنیات زمین کا جز ہیں اور جب زمین پر صدقہ نہیں تو اس کے اجزاء پر صدقہ کیسے واجب ہوگا؟

یجب فیه الخمس لان الارض غیر خال عن المؤن (رواہ فی الجامع الصغیر)

ایک روایت یہ ہے کہ اس پر خمس واجب ہے کیونکہ زمین میں محنت کی گئی ہے زمین مؤنت سے خالی نہیں۔

اگر زمین سے خزانہ برآمد ہو تو اس پر بھی خمس واجب ہوگا کیونکہ حدیث کے الفاظ عام ہیں پھر دیکھا جائے گا کہ یہ خزانہ کس سمت کی زمین میں ہے۔ اگر مسلمانوں کی سمت میں واقع ہے تو اس کا حکم اس گرے ہوئے مال کی طرح ہے جس کا مالک نامعلوم ہو اگر کفار کی سمت میں واقع ہے تو پھر دیکھا جائے گا اگر مباح زمین میں ہے تو خزانہ پانے والے کو پانچ خمس ملیں گے کیونکہ ظاہر ہے یہ خزانہ کفار کا دفن کردہ ہے جس کو خزانہ پانے والے نے اپنی ملکیت میں لے لیا ہے لہٰذا مجاہدین کا اس پر کوئی حق نہیں ہے کیونکہ انہیں اس کا علم نہیں تھا۔

اگر خزانہ کسی کی ذاتی زمین سے برآمد ہوا تو امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک اس کا خمس لیا جائے گا اور باقی جو بچے گا وہ خزانہ پانے والے کا ہوگا کیونکہ غنیمت کا مستحق وہی ہوتا ہے جو مال غنیمت کو اپنے ہاتھ میں لے کر محفوظ کر لیتا ہے اس لئے خزانے کا مستحق خزانہ پانے والا ہوگا۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ اور امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک خمس کے بعد جو بچے گا وہ اس شخص کو ملے گا جس کے لئے حد بندی کی گئی ہوگی۔ یعنی وہ شخص جس کو حکومت نے یہ زمین الاٹ کی ہوگی کیونکہ سب سے پہلے اس زمین اور اس میں جو کچھ ہے پر اسی پہلے مالک کی ملکیت ثابت ہوئی اور بیچنے کے بعد زمین کا مالک تو دوسرا ٹھہرا لیکن خزانے پہلے مالک کی ملکیت ہے وہ زمین کو فروخت ہونے سے فروخت نہیں ہوا لیکن بدلنے سے ان کی ملکیت بھی بدل جاتی ہے۔ اسی لئے اگر زمین فروخت ہونے کے بعد اس میں سے معدنیات کی کان نکل آئے تو وہ اسی شخص کی ملکیت ہوگی جس کی زمین ہے۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ سب سے پہلے یہ زمین کس مسلمان کو الاٹ کی گئی تو پھر جو سب سے پہلا معلوم مالک ہے یہ خزانہ اس کا ہوگا۔ اگر سمت مشتبہ ہو جائے اور معلوم نہ ہو سکے کہ یہ سمت اسلامیان کی ہے یا جاہلیت کی تو اسے جاہلیت کی سمت خیال کیا جائے گا اور خمس سے بقیہ دولت پانے والے کی ہوگی کیونکہ وہی اس کا اصل مالک ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اسلامی سمت خیال کی جائے گی کیونکہ عہد اسلام کو نسبتاً تقدم حاصل ہے۔

ایک شخص دشمن کی سرزمین میں داخل ہو گیا اور وہاں اس کے ہاتھ کوئی مدفون خزانہ لگا اگر یہ خزانہ کسی فرد واحد کی زمین سے لیا گیا ہے تو اسے اس کے اصل مالک کے حوالے کیا جائے گا کیونکہ کسی کی ملکیت سے کچھ لینا جائز

نہیں ہے۔ اگر یہ خزانہ کسی صحراء میں مدفون تھا تو پھر جس نے اسے کھود کر نکالا اس کا ہوگا کیونکہ اس کا کوئی فرد واحد مالک نہیں اور ایسے مال کو لینا ناجائز نہیں ہے۔ ایسے خزانے سے خمس بھی نہیں لیا جائے گا کیونکہ اس مال کی حیثیت چوری کے مال کی ہے۔

پارہ' موتی' عنبر اور سمندر سے ملنے والے دیگر زیورات کے متعلق حکم

پارہ میں خمس ہے کیونکہ وہ بھی معدنیات میں سے ہے اور اسے علاج کے لئے نکالا جاتا ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک اس پر کوئی چیز واجب نہیں کیونکہ اگر اسے مارا جائے تو وہ مر جاتا ہے لہٰذا یہ معدنیات میں سے نہیں ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ پارہ خود بخود نہیں مرتا اسے کسی چیز کے ساتھ ملا کر مارا جا سکتا ہے اس لئے وہ چاندی کی طرح ہے۔

موتی اور عنبر پر بھی کچھ واجب نہیں۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں موتی اور عنبر پر بھی صدقہ واجب ہے۔ ان کے علاوہ ہر زیور پر جو سمندر سے نکلتے ہیں خمس واجب ہے۔

فی الهداية لان امير المؤمنين عمر رضی الله تعالٰی عنه اخذ الخمس من العنبر.

ہدایہ میں اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے عنبر سے خمس لیا۔

فتح القدیر میں اس پر یہ اعتراض ہے کہ یہ ثابت نہیں ہاں تابعین نے عنبر پر خمس لیا لیکن یہ دلیل نہیں۔ طرفین کی دلیل یہ ہے۔

قول ابن عباس ليس العنبر بركاز وانما شئي وسره البحر (رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ ارشاد ہے کہ عنبر خزانہ نہیں یہ ایسی چیز ہے جسے سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے۔

ان دو وجوہات کی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ جو چیز سمندر سے برآمد ہوئی اس پر کچھ واجب نہیں کیونکہ سمندر پر کسی کی ملکیت نہیں لہٰذا وہ رکاز شمار نہیں ہوتا۔

مالی واجبات کی وصولی

حکومت جب کسی شخص کو صدقات کی وصولی کے لئے مقرر کرے تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ تاجروں کو تحفظ فراہم کرے تاکہ راستوں پر ان کے تجارتی قافلے پوری طرح امن و امان سے سفر کریں۔ عاملین کی یہ بھی ڈیوٹی ہے کہ وہ لوگوں سے راستوں میں صرف اس مال کی زکوٰۃ وصول کریں جو ان کے پاس موجود ہے۔ جو مال گھر میں ہے اس کی زکوٰۃ راستوں پر بیٹھ کر وصول نہیں کی جا سکتی۔ اگر مسلمان کے ہاتھ میں نصاب کے برابر مال ہے تو اس سے سال میں صرف ایک بار عشر (دسواں حصہ) کا چوتھا حصہ لیا جائے گا کیونکہ (چونگی) ایک طرح کی زکوٰۃ ہے۔ ذمی سے عشر کا نصف لیا جائے گا۔ یہ چونگی ان سے اس لئے لی جاتی ہے کہ حکومت انہیں سلامتی اور حمایت مہیا کرتی ہے۔ یہ مال صدقہ شمار نہیں ہوگا۔ مسلمانوں اور ذمیوں سے ٹیکس لیتے وقت اس فرق کو اس لئے ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ امام محمد

علیہ الرحمہ نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

عن زیاد ابن جریر قال بعثنی عمر بن الخطاب الی عین النمر مصدقا فامرنی ان آخذ من المسلمین من اموالھم اذا اختلفوا بھا للتجارۃ ربع العشر ومن اموال اھل الذمۃ نصف العشر ومن اموال اھل الحرب العشر

زیاد بن جریر سے روایت ہے کہ مجھے عمر بن الخطاب نے صدقہ لینے کے لئے عین النمر بھیجا اور حکم دیا کہ میں مسلمانوں سے عشر کا چوتھا حصہ لوں جبکہ وہ ان مالوں سے تجارت کرتے ہوں اور ذمیوں کے مالوں سے نصف عشر اور حربیوں کے مال سے پورا عشر لوں۔

اہل حرب کے مال سے عشر اسی اثر کی روشنی میں لیا جاتا ہے اور اسی کو دلیل بنا کر مسلم علاقوں سے گزرنے والے لوگوں سے ٹیکس لیا جاتا ہے لیکن اہل حرب سے عشر اس صورت میں لیا جائے گا جب وہ ہمارے تجارتی قافلوں سے مال کا دسواں حصہ لیتے ہوں یا ہمیں علم نہ ہو کہ وہ کیا لیتے ہیں؟ اگر وہ لوگ کم لیں تو ہمیں بھی کم لینا ہوگا' اگر وہ سرے سے ہمارے تجارتی قافلوں سے کچھ لیتے ہی نہ ہوں تو اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سے کچھ نہ لیں۔ اگر غیر مسلم ہمارے تجارتی قافلوں سے سب مال لے لیں تو ہم سارا مال نہیں لیں گے بلکہ اتنا مال ان لوگوں کے پاس چھوڑ دیں گے جس کے ذریعے وہ اپنے گھروں تک پہنچ جائیں۔

اگر گزرنے والا عامل سے یہ کہے کہ ابھی تک اس کے مال پر سال پورا نہیں گزرا یا یہ دعوئ کرے کہ وہ مقروض ہے اور حلف اٹھا دے تو اس کی بات کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ اس نے وجوب کا انکار کیا ہے اور منکر کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوتا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے تو دوسرے عامل کو زکوٰۃ دے دی ہے تو اگر دوسرا عاشر ہے تو حلف کے ساتھ اس کی بات کی تصدیق کی جائے گی اور اسے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تحریر لاؤ کیونکہ تحریر جعلی بھی ہو سکتی ہے۔ ایک آدمی کا خط دوسرے آدمی کے ساتھ مل سکتا ہے۔ بس قسم پر اعتماد کیا جائے گا اور اس سے دوبارہ زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوگا کیونکہ ٹیکس عاشر کے حوالے کرنے ہیں۔ جب ایک عاشر نے ٹیکس وصول کر لیا تو دوسرا شخص وصول نہیں کر سکتا۔

مویشیوں کی زکوٰۃ سلطان تک پہنچانا ضروری ہے صرف زکوٰۃ کی ادائیگی کافی نہیں اس لئے وہ ابطال کا مالک نہیں ہے۔ علماء نے یہی فرمایا ہے۔ جس چیز میں مسلم کی تصدیق کی جا سکتی ہے اس میں ذمی کی تصدیق بھی کی جائے گی کیونکہ ذمی سے مسلمان کی نسبت دُگنا ٹیکس لیا جاتا ہے۔ تو اس میں بھی ان شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جن شرائط کا لحاظ مسلم کے حق میں رکھا جاتا ہے۔

حربی اگر ایسی کوئی بات کرتا ہے تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی بلکہ اس سے ٹیکس لیا جائے گا کیونکہ یہ ٹیکس راستے سے گزرنے کا ہے اور اس سفر میں ان کی حمایت کی وجہ سے ہے اور مال اس کے پاس موجود ہے جس کی حفاظت کی ضرورت ہے اس لئے ان سے ٹیکس لیا جائے گا اور اس کے بدلے انہیں سیکورٹی مہیا کی جائے گی۔

اگر حربی اپنی لونڈیوں کے بارے یہ کہے کہ ان سے ان کی اولاد ہے تو ان کی بات مان لی جائے گی اور ان سے کچھ نہیں لیا جائے گا کیونکہ یہ نسب کا اقرار ہے اور اگر حربی نسب کا اقرار کرتا ہے تو اس کا اقرار صحیح مانا جائے گا۔

اگر حربی سال کے اندر دوسری بار ٹیکس لینے والے کے پاس سے گزرے اگر وہ گھر نہیں گیا تو کہا جاتا ہے کہ اس سے دوبارہ ٹیکس نہیں لیا جائے گا کیونکہ اس طرح تاجر کا مال ختم ہو جائے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ ٹیکس دے چکا ہے۔ گھر نہ جانے کی وجہ سے حمایت اور امن وامان کا پہلا معاہدہ ابھی باقی ہے۔ ہاں اگر حربی ٹیکس دینے کے بعد گھر چلا گیا اور دوبارہ تجارت کی غرض سے اسلامی مملکت سے گزرا تو اس سے ٹیکس لیا جائے گا کیونکہ پہلی امان اور حمایت اب باقی نہیں رہی اس کو اس سفر میں دوبارہ امان اور حمایت کی ضرورت ہے جس پر اسلامی مملکت ٹیکس لینے کی مجاز ہے۔

اگر حربی خنزیر اور شراب لے کر اسلامی مملکت سے گزرے

اگر حربی اسلامی مملکت سے گزرے اور اس کے مال میں شراب اور خنزیر ہو تو شراب کی قیمت کا دسواں حصہ تو لیا جائے گا لیکن خنزیر کا دسواں نہیں لیا جائے گا۔ امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ دونوں پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک یہ دونوں چیزیں مال شمار نہیں ہوتیں۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہمارے نزدیک شراب اور خنزیر کی کوئی قیمت نہیں لیکن ذمیوں کے نزدیک تو یہ مال ہے اور اسے خریدا اور بیچا جا سکتا ہے لہٰذا ان کی قیمت کا دسواں لیا جائے گا۔ امام ابو یوسف کا موقف یہ ہے کہ خنزیر کا دسواں نہیں لیا جائے گا اگر تاجر کے پاس صرف خنزیر ہوں اور اگر شراب اور خنزیر دونوں چیزیں ہوں تو خنزیر کو شراب کا تابع بناتے ہوئے اس سے دسواں لیا جائے گا۔ علماء ہمارے قول کی یہ توجیہہ بیان کرتے ہیں کہ شراب ذوات الامثال میں سے ہے قیمت اس کی جگہ نہیں لے سکتی اور قیمت کا لینا اس طرح نہیں جس طرح شراب کا لینا ہے کیونکہ خنزیر ذوات القیم میں سے ہے۔ خنزیر کی جگہ خنزیر کی قیمت لی جا سکتی ہے اور اس کی قیمت لینا عین خنزیر لینے کے مترادف ہے۔ **واللہ اعلم**۔

اگر دسواں لینے والے کے پاس سے ایسا شخص گزرا جس کے پاس مال تجارت ہے جس کی مالیت نصاب کو پہنچتی ہے (اور وہ مال اس کا اپنا نہیں) تو اس سے دسواں نہیں لیا جائے گا۔ اسی طرح کوئی شخص مال مضاربت لے کر گزرے جو نصاب کے برابر ہو تو اس پر مرجوع الیہ قول کے مطابق دسواں نہیں۔ یہ صاحبین کا قول ہے۔ اسی طرح عبد ماذون گزرا اور اس کے پاس قرض سے فارغ مال ہے تو صاحبین کے نزدیک اس پر دسواں نہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر امام صاحب کے قول کو مضاربت پر قیاس کریں تو اس طرح صاحبین کے قول کی طرف رجوع کا حکم سامنے آتا ہے۔

ان تمام صورتوں میں دسواں ضروری نہیں کیونکہ زکوٰۃ مالک کے ساتھ لی جا سکتی ہے اور ادائیگی صرف اسی صورت میں معتبر ہوتی ہے کہ مالک اپنے ہاتھ سے عاشر کے حوالے کرے اور مذکورہ صورتوں میں مالک موجود نہیں۔

دوبارہ زکوٰۃ کب لی جائے گی؟

اگر خارجیوں کے علاقہ سے کوئی شخص گزرا اور انہوں نے دسواں لے لیا تو دوبارہ زکوٰۃ لی جائے گی کیونکہ اس نے خارجیوں کو جو زکوٰۃ دی یہ اس کی اپنی غلطی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ زکوٰۃ اہل عدل کو دینا تھی تاکہ وہ اسے

حقداروں تک پہنچاتے' اس نے زکوٰۃ خارجیوں کے حوالے کر دی تو اس کی ادائیگی معتبر ہی نہیں ہوگی اور دوبارہ زکوٰۃ دینے کا پابند ہوگا تا کہ وہ اس فریضہ سے سبکدوش ہو۔

مصارفِ زکوٰۃ کا بیان

ربِ قدوس کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (التوبۃ: ٦٠)

زکوٰۃ تو انہیں لوگوں کے لئے ہے۔ محتاج اور نرے نادار اور جو اسے تحصیل کر کے لائیں اور جن کے دلوں کو اسلام سے الفت دی جائے اور گردنیں چھڑانے میں اور قرض داروں کو اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کو' یہ ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔

یہ کل آٹھ مصارف ہیں جن میں سے مؤلفۃ قلوب ساقط ہے۔

مؤلفۃ القلوب کی اقسام اور ان کے متعلق وضاحت

مؤلفۃ قلوب کی مزید تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ان کافروں کی ہے جن کو حضور ﷺ اس غرض سے زکوٰۃ وصدقات دیتے تھے تا کہ یہ اسلام لے آئیں۔ دوسری قسم ان کافروں کی ہے جن کے شر سے بچنے کے لئے ان کو مال دیا جاتا تھا تیسری ان ضعیف العقیدہ مسلمانوں کی تھی جن کو ایمان پر ثابت قدم رکھنا مقصود تھا اور اس غرض سے ان کی مالی معاونت کی جاتی تھی۔

فتح القدیر میں ہے کہ امام سیوطی علیہ الرحمہ نے ایک چوتھی قسم کا تذکرہ بھی فرمایا ہے کہ بعض لوگوں کو رسول اللہ ﷺ اس غرض سے بھی دولت عطا فرماتے تھے تا کہ ان کو دیکھنے والے اسلام قبول کریں۔ آپ ﷺ تالیف قلوب کی غرض سے اغنیاء کو بھی مال دیتے لیکن بعد میں ان لوگوں کو مال دینے سے ہاتھ روک لیا گیا اور تمام صحابہ کرام علیہم الرضوان نے اس موقف سے اتفاق فرمایا۔ گویا تالیف قلوب حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے تھا۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد کسی خلیفۃ المسلمین نے ان کو کچھ نہ دیا۔ حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج تالیف قلوب کا تصور نہیں۔ حضور ﷺ نے لوگوں کی مالی مدد کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کیا یا ان کی شرارتوں کو بے اثر بنایا لیکن بعد میں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ امام سیوطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ کی ایک حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ ابن منذر بن ابی حاتم نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے امام ابوجعفر محمد باقر کرم اللہ وجہہ و وجوہ آباؤ الکرام سے روایت کیا ہے کہ اس دور میں کوئی مؤلفۃ القلوب نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حکم ختم ہو گیا ہے کیونکہ اب وہ علت باقی نہیں رہی۔ علت اس حکم کی یہ تھی کہ اسلام کو عزت حاصل ہو۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسلام ایک غالب دین ہے۔ کافروں کی مدد کی ضرورت نہیں بلکہ اب عزت ان کو مال نہ دینے کی صورت میں ہے تا کہ اسے کافروں کے قبولِ اسلام میں رشوت تصور نہ کیا جائے۔

عن ابی عبیدة السلمانی قال جاء عیینة بن حصین والا فرع بن حابس ای ابی بکر فقالا یاخلیفة رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم من عند نا ارضا نسبخة لیس فیها کلاء وما منفعة فان رأیت ان لقطعنا لعلنا نحرسها ونزرعها ولعل الله ان ینفع بها فاقطها ایاهما و کتب لهمالذلک کتابا واشهد لهما فانطلقا الی عمر لیشهداه علی ما فیه فلما قرء علی عمر الکتاب تناوله من ایدیهما فنقل فیه فمحاه فتد ابرا وقالا مقالة سیئة فقال عمران رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم کان یتألفکما والاسلام یومئذ قلیل فان الله قد اعز الاسلام فاذهبا فاجتهد اجهد کمالا ارعی الله علیکما ان ارعیتما

ابو عبیدہ سلمانی سے روایت ہے کہ عیینہ بن حصین اور افرع بن حابس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! ہمارے پاس ایک شور زمین پڑی ہے۔ جس میں نہ کوئی گھاس ہے اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر آپ اس کو ہمارے نام کردیں تو ہوسکتا ہے ہم اس کی دیکھ بھال کریں اور اس میں فصل بودیں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس سے نفع دے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ زمین ان کے نام کردی اور ان دونوں کو اس پر ایک خط بھی لکھ کر دیا اور اس پر گواہ مقرر کردیئے وہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے تاکہ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی گواہ بنائیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب انہوں نے یہ خط سنایا تو آپ نے ان سے خط لے کر اس میں کچھ نقل کیا اور اس وثیقہ کو مٹا دیا۔ وہ لوگ واپس چلے گئے اور برا بھلا کہنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ تمہاری دلجوئی کیا کرتے تھے۔ اس وقت اسلام کے پاس افرادی قوت کم تھی اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت دے دی ہے۔ اب تم جاؤ اور جو کرنا ہے کرو۔ اگر تم شفقت ومہربانی کا سلوک کرو تو اللہ تعالیٰ تم پر رحم وکرم نہ فرمائے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اسے ابن ابی حاتم علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ ان دونوں کو دلجوئی کی غرض سے زکوٰۃ کا مال دیا جاتا تھا۔ اسلام کو جب غلبہ نصیب ہوگیا تو اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ لہٰذا یہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں رہا اور ہوسکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مطلب یہ ہو کہ تمہیں دینا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا کیونکہ اسلام کے ماننے والے تعداد میں کم تھے آج کثرت تعداد کی وجہ سے ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم تمہیں زکوٰۃ کا مال دیں لہٰذا جاؤ اور جو کرسکتے ہو کرو۔

تالیفِ قلوب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت نہیں تھی۔ اگر حضور ﷺ ان کی تالیف قلبی نہ فرماتے تو ان کا ٹھکانا جہنم کا آخری گڑھا ہوتا۔ حضور ﷺ رحمۃ للعالمین تھے۔ آپ ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ میری نفرت کی وجہ سے وہ اس سزا سے دوچار ہوں۔ آپ نے نفرت کم کرنے اور ان کے دلوں میں اپنی محبت

پیدا کرنے کے لئے مال دیا تا کہ وہ رسوا نہ ہوں لیکن حضور ﷺ کے وصال کے بعد اگر ان کو نہیں دیا جائے گا تو ان کے دل سے امراء اسلام کی محبت کم ہو گی اور تعظیم رسول اور محبت رسول اللہ ﷺ بڑھے گی کیونکہ حضور ﷺ انہیں دیا کرتے تھے اور اب امراء انہیں نہیں دے رہے۔

پھر جیسے بیان کیا جا چکا ہے کہ علت چونکہ موجود نہیں اس لئے اس پر مرتب ہونے والا حکم موجود نہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ حکم ضرورت کے تحت ایک وقت کے لئے تھا۔ صحابہ جانتے تھے کہ اس کا وقت کیا ہے ورنہ اگر یہ علت حکم کے مشروع ہونے کے لئے علت ہوتی تو علت کے ختم ہونے سے حکم ختم نہ ہوتا پھر مؤلفۃ قلوبھم کے الفاظ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ حکم ایک مدت کے لئے تھا۔

فقیر اور مسکین کی تعریف

تالیف قلوب کے سقوط کے بعد سات مصارف زکوٰۃ رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم اور دوسری قسم فقراء ومساکین کی ہے۔ فقیر سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس ضروریات حیات بہت تھوڑی ہوں اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ یہ تعریف امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے مروی ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ فقیر اور مسکین کی ایک تعریف اس کے الٹ بھی کی گئی ہے (فقیر جس کے پاس کچھ نہ ہو، مسکین جس کے پاس تھوڑا بہت ہو) تیسری تعریف یہ ہے کہ فقیر وہ ہے جو اپنے گھر میں رہے اور کسی سے سوال نہ کرے جبکہ مسکین وہ ہے جو گھر سے باہر جا کر لوگوں سے سوال کرے۔ یہ تعریف امام زہری علیہ الرحمہ سے مروی ہے۔

چوتھی تعریف یہ ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس مال نہ ہو لیکن عزیز واقارب ہوں اور مسکین وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو اور نہ ہی خویش واقارب ہوں۔ یہ تعریف حضرت مجاہد سے مروی ہے۔ بہر حال جو شخص صاحب نصاب نہیں اور اگر اس کے پاس کچھ ہے بھی تو ضروریات زندگی کے قبیل سے ہے تو اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ اگر کسی عالم کے پاس کتب خانہ ہے جس کی مالیت نصاب بلکہ کئی نصابوں کے برابر ہے اور کتب کے علاوہ اس کے پاس اتنا مال نہیں جو نصاب کو پہنچتا ہو تو اس عالم دین کے لئے زکوٰۃ لینا حلال ہے۔ اگر کسی ان پڑھ کے پاس اتنی کتابیں ہوں جو نصاب کی مالیت کو پہنچتی ہوں تو اس کے لئے زکوٰۃ لینا جائز نہیں (کیونکہ کتابیں اس کی ضرورت نہیں)۔

اگر کسی شخص کے پاس گھوڑا، گھر اور غلام ہے اور اسے غلام کی ضرورت نہیں اور نہ ہی گھوڑا اس کی ضرورت ہے تو اس کے لئے زکوٰۃ لینا حلال نہیں (کیونکہ گھوڑا اور غلام ہر آدمی کی ضرورت نہیں) اگر گھوڑا اور غلام اس کی ضرورت ہے تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے (مزدور کی ضروریات میں غلام اور گھوڑا نہیں جبکہ تاجر کی ضرورت ہے)۔

نصاب کی مقدار جو زکوٰۃ لینے سے مانع ہے اس کے لئے نمو شرط نہیں۔ وہ نصاب جو سوال سے مانع ہے وہ پچاس درہم ہیں۔

عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من سال ولہ مال یغنیہ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے سوال کیا حالانکہ اس کے

جاء مسألته یوم القیمة خموشا و کدوحا قالوا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ما یغنیہ قال خمسون درھما او قیمتھا من الذھب (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

پاس بقدر ضرورت مال تھا تو قیامت کے دن وہ سوال کی صورت میں آئے گا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ کتنا مال اس کی ضرورت کے لئے کافی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا پچاس درہم یا سونے کی صورت میں ان کی قیمت۔

بعض مشائخ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ جس کے پاس ایک دن کا کھانا ہے یا اس کے پاس کچھ نہیں مگر کما سکتا ہے تو اس کے لئے سوال حرام ہے اور یہ قول مذکورہ حدیث کے منافی نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے یہ وعید پچاس درہم کے مالک کے لئے ہو لیکن حرمت کا ثبوت اس سے کم مالیت پر بھی جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک فقیر اور مسکین دو الگ مصارف ہیں۔ امام ابو یوسف کے نزدیک ایک ہی مصرف ہے۔ اگر کسی نے وصیت کی کہ یہ مال زید' فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہے تو زید کو تیسرا حصہ ملے گا اور فقیروں' مسکینوں کو دو حصے ملیں گے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک نصف مال زید کا ہوگا اور نصف غرباء و مساکین کا (کیونکہ یہ دو الگ الگ صنفیں نہیں) فتح القدیر میں فخر الاسلام نے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔

عاملین زکوٰۃ کو ان کے کام کی مناسبت سے زکوٰۃ دی جائے گی

تیسرا مصرف عاملین زکوٰۃ ہیں۔ انہیں ان کے کام کی مناسبت سے زکوٰۃ دی جائے گی اگرچہ یہ لوگ امیر ہوں لیکن عامل اگر ہاشمی ہے تو اسے زکوٰۃ کے مال سے تنخواہ نہیں دی جائے گی۔ ہاں بقدر ضرورت اس کام کی اجرت کے طور پر انہیں دی جاسکتی ہے جس سے وہ اپنے بچوں کی کفالت کرسکیں لیکن اسے معین نہیں کیا جاسکتا ہاشمیوں کو زکوٰۃ دینا صحیح نہیں جو لوگ اس کام پر مامور ہیں اور کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتے تو انہیں قاضی کی طرح بقدر کفایت دینا جائز ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ تنخواہ مقرر ہوگی بعض کے نزدیک ۱/۸ حصہ ملے گا کیونکہ صدقہ آٹھ قسم کے لوگوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ عنقریب اس کے بارے میں بیان کیا جائے گا۔

اگر مال ان اصناف کی ضروریات سے کم ہو تو نصف سے زیادہ نہیں دیا جائے گا کیونکہ نصف عین انصاف ہے۔

ہاشمی کے لئے زکوٰۃ لینا جائز نہیں

ہاشمی کے لئے زکوٰۃ لینا جائز نہیں اور اس کی دلیل عبدالمطلب بن ربیعہ بن الحارث کی یہ حدیث ہے۔

قال ابن ربیعة بن الحارث قال لعبد المطلب ابن ربیعة و الفضل بن العباس اتیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فقولا

فرماتے ہیں کہ ابن ربیعہ بن الحارث نے عبدالمطلب اور فضل بن عباس سے کہا تم دونوں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور عرض کرو کہ ہمیں صدقات پر عامل

استعملنا على الصدقات فاتى على بن ابى طالب ونحن على تلك الحال فقال ان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم لا يستعلم احدا منكم على الصدقة فقال عبد المطلب فانطلقت انا والفضل حتى اتينا رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقال لنا ان هذه الصدقة انما هى من اوساخ الناس وقال لا يحل لمحمد ولا لآل محمد

(رواہ النسائی و مسلم)

بنائیں، علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور ہم اسی حال میں تھے کہ فرمانے لگے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تم میں سے کسی کو عامل مقرر نہیں فرمائیں گے۔ عبد المطلب کہتے ہیں کہ میں اور فضل بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا یہ صدقہ ہے یہ لوگوں (کے مالوں) کی میل کچیل ہے اور فرمایا محمد اور آلِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے یہ حلال نہیں۔

مسلم کی روایت طویل ہے۔

غلاموں کو آزاد کرانے کی غرض سے زکوٰۃ کا استعمال

چوتھا مصرف غلامی سے آزادی ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے مالکوں کو زرِ کتابت ادا کرنا ہے (یعنی مکاتب) فتح القدیر میں طبری کے حوالہ سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ ایک مکاتب نے کھڑے ہو کر گزارش کی کہ اے امیر! لوگوں کو میری مدد کی تلقین کیجئے۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعری نے لوگوں کو اس کی مدد کی ترغیب دی۔ لوگوں میں سے کسی نے اس کی جھولی میں زیور، کسی نے پگڑی، کسی نے کوئی دوسرا کپڑا اور کسی نے انگوٹھی پھینکی حتیٰ کہ بہت سا مال جمع ہو گیا۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دیکھ کر فرمایا اس مال کو جمع کر لو پھر حکم دیا کہ اسے بیچ دو۔ (اس مال کو بیچ دیا گیا اور اس کی قیمت) مکاتب کے مالک کو دے دی گئی اور جو زائد تھا دوسرے غلاموں کی آزادی کے لئے دیا گیا اور جن لوگوں نے مال دیا تھا انہیں یہ مال واپس نہ کیا گیا۔ آپ نے فرمایا یہ وہ مال ہے جو تم نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے دیا ہے۔

ہمارا مذہب امام الطریقت والفقہ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔ امام زہری، عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم کی رائے بھی یہی ہے کہ فی الرقاب سے مراد مکاتب ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور حدیث بھی پیش کی جاتی ہے جسے امام احمد روایت کرتے ہیں۔

ان رجلا جاء الى النبى صلى الله عليه وآله وسلمفقال دل على عمل يقربنى الى الجنة ويا عدنى عن النار قال اعتق النسمة وفك الرقبة فقال اوليسا سواء قال لا.

کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض پرداز ہوا (یا رسول اللہ!) مجھے کوئی ایسا عمل فرمائیے جو مجھے جنت کے قریب اور جہنم سے دور کر دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا انسان کو آزاد کرو اور گردن سے قلادہ نکال دو۔ وہ شخص پھر عرض کرنے لگا اس کے علاوہ کوئی اور عمل۔ آپ ﷺ نے

فرمایا نہیں۔

''عتق النسمۃ'' سے مراد ہے آدمی کو آزاد کر کے اپنے آپ سے الگ کر دینا اور ''فک الرقبۃ'' کا معنی ہے اس کے ثمن کا تعین کر دینا (تا کہ غلام وہ قیمت دے کر آزاد ہو جائے)۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فی الرقاب سے مراد مکاتب ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ ''فی الرقاب'' سے مراد یہ ہے کہ زکوٰۃ سے غلام خریدا جائے اور پھر اسے آزاد کر دیا جائے لیکن یہ مفہوم صحیح نہیں کیونکہ زکوٰۃ دوسرے کو مال کا مالک بنانا ہے۔ غلام کو خرید کو آزاد کرنے میں ملکیت ثابت نہیں پھر غلام کی آزادی ولاء کا سبب بنتی ہے (یعنی آزاد ہونے والا آزاد کرنے والے کا مولیٰ بن جاتا ہے) اور اس سے دنیاوی نفع حاصل ہوتا ہے لہٰذا غلام کو آزاد کرنے کی غرض سے زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔

مقروض کو زکوٰۃ کے مال سے دینا

پانچواں مصرف ''غارمین'' کا ہے۔ ان سے مراد مقروض لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں کو اتنی زکوٰۃ دینا جائز ہے جس سے وہ قرض ادا کر سکیں لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ مقروض کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ قرض ادا کر سکتا ہو۔ ایک قول کے مطابق غارم سے مراد وہ شخص ہے جو اصلاح احوال کے لئے سماجی کوششوں میں مصروف ہو۔

حاجی یا غازی کو زکوٰۃ کب دینا درست ہے؟

چھٹا مصرف ''فی سبیل اللہ'' ہے اگرچہ اس لفظ کا اطلاق بھلائی کے ہر کام پر ہوتا ہے لیکن یہ لفظ آیت میں عام نہیں ہے بلکہ بالا جماع یہ لفظ خاص ہے۔ یا تو اس سے مراد وہ جنگجو ہیں جو مال نہ ہونے کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کر سکتے جیسا کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی رائے ہے یا اس سے مراد حاجیوں سے پیچھے رہ جانے والا حاجی ہے۔ مال زکوٰۃ سے اس کی مدد کی جاسکتی ہے لیکن غازی ہو یا حاجی ان کی زکوٰۃ سے اس وقت مدد کی جاسکتی ہے جب وہ فقیر ہوں (یعنی صاحبِ نصاب نہ ہوں)۔ امام ابوحنفیہ کے نزدیک حاجی اگر فقیر ہے تو اسے فقیر خیال کرتے ہوئے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ امام محمد کے نزدیک غازی کو فقیر ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ بہر حال ایک اعتبار سے اس لفظ کے اطلاق میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

بعض علماء کے نزدیک نمازی اگرچہ امیر ہوں تو انہیں پھر بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

مسافر کے لئے زکوٰۃ کا مال لینا

ساتواں مصرف ''ابن السبیل'' ہے۔ اس سے مراد وہ مسافر ہے جو وطن سے دور ہو اور اس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ وہ اپنے وطن پہنچ سکے۔ مسافر کو اتنا مال دینا جائز ہے جس کی مدد سے وہ اپنے وطن پہنچ سکے' اگرچہ اس کے گھر میں مال موجود ہو۔ فتح القدیر میں ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ آدمی اپنے ملک سے باہر کسی دوسرے ملک میں ہو تو تبھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے بلکہ اگر انسان اپنے ملک میں ہو تو تب بھی اس کی زکوٰۃ سے اتنی مدد کی جاسکتی ہے جس کے ذریعے وہ گھر پہنچ سکے لیکن بہتر یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کی بجائے کسی سے قرض لے تا کہ گھر پہنچ سکے لیکن ضروری نہیں کہ

وہ قرض لے کیونکہ ہوسکتا ہے کوئی سفر میں اسے قرض نہ دے اس لئے زکوٰۃ لینا جائز ہوگا۔ اگر مسافر نے زکوٰۃ کا مال لیا اور جب گھر پہنچا تو اس مال میں سے کچھ مال باقی تھا تو یہ بقیہ مال اس کے لئے جائز ہے۔ اگرچہ اس کے علاوہ اس کے گھر میں مال موجود ہو۔ یہ سات مصارف زکوٰۃ ہیں۔

مصارفِ زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی تقسیم کا طریقہ

احناف' امام مالک اور امام احمد علیہم الرحمہ کے نزدیک ان اصناف میں سے کسی ایک صنف کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور تمام اصناف میں تقسیم بھی کی جاسکتی ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک تمام اصناف میں زکوٰۃ تقسیم کرنا واجب ہے۔ ہر صنف میں سے کم از کم تین آدمیوں کو زکوٰۃ کا مال دیا جائے کیونکہ لام ملکیت کے لئے ہے۔ (یعنی صدقات کے مالک یہ سات اصناف ہیں) اس لئے کسی ایک صنف کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ہر صنف کے ایک ایک شخص تک یہ زکوٰۃ پہنچائی جائے (چونکہ جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے) اس لئے کم از کم تین افراد کو دینا ضروری ہے کیونکہ جمع کے لئے کم از کم تین افراد ہوتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ملکیت ثابت کرنا صحیح نہیں اور نہ ہی جمع کے معرف باللام صیغہ کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنا صحیح ہے۔ اگر جمع کے معرف باللام صیغہ کو اس معنی پر محمول کریں جس پر امام شافعی کرتے ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جو بھی صدقہ دینا ہو ایک ایک فقیر اور ایک ایک مسکین کو تلاش کیا جائے کیونکہ جمع کا معرف باللام صیغہ عموم پر دال ہوتا ہے۔ اس طرح ادائیگی سرے سے صحیح نہیں ہوگی کیونکہ اس معنی کے اعتبار سے ہر فقیر صدقہ کا مالک ہوگا اور نہ ہی زکوٰۃ دینے والے کو ان تمام لوگوں کا علم ہے کہ ہر ایک شخص تک زکوٰۃ کا مال پہنچائے۔ اگر اس سے مراد یہ لیں کہ ہر ایک صنف میں سے ایک آدمی کو دینا ضروری ہے تو اگرچہ یہ ہمارے اس قول کے منافی نہیں کہ ایک صنف کو زکوٰۃ دینا جائز ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اس طرح بھی زکوٰۃ کی ادائیگی ممکن نہیں اس لئے ہم کہتے ہیں کہ لام جنس کا ہے جیسا کہ اصول کی کتابوں میں مذکور ہے جمع معرف باللام سے جب عموم کا معنی لینا ممکن نہ ہو تو اس کو لام جنس پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس طرح جمع اپنی جمعیت پر نہیں رہتا کیونکہ لام جنس سے جمعیت کا معنی باطل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ علم الاصول کی کتابوں سے واضح ہے۔ اس طرح آیتِ کریمہ کا معنی یوں ہوگا کہ جنس صدقات جنس فقراء کے لئے ہے۔ لام تملیک کا نہیں کیونکہ غیر معین کی تملیک صحیح نہیں پس اس سے مراد مصرف کا بیان ہوگا پھر تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ لام جارہ اختصاص کے لئے وضع کیا گیا ہے اور وہ ملک اور بیان مصرف سے زیادہ عمومیت کا معنی دیتا ہے اس لئے اسے یہاں ملک پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ پس مصرف کا بیان متعین ہوگیا۔ جب لام جارہ مصرف کے بیان کے لئے ہو تو جمع معرف باللام کو عموم پر محمول کرنا جو اس کا حقیقی مدلول ہے ممکن ہے۔ اس طرح معنی یہ ہوگا کہ صدقات کا مصرف ایک ایک فقیر اور ایک ایک مسکین ہے۔ زکوٰۃ دینے والا جس کو چاہے زکوٰۃ دے۔ اگر چاہے تو ایک کو دے اور چاہے تو ایک سے زیادہ کو دے۔ یہ ایسی تحقیق ہے جس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

پھر ہمارا موقف وہی ہے جو صحابہ کرام کا تھا۔ امیر المؤمنین برویۃ ابن ابی شیبہ' ابن عباس برویۃ طبرانی اور ابن ابی حاتم سے ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت حذیفہ سے ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں جس سے

ہمارے مذہب کی صحت عیاں ہوتی ہے لیکن امام شافعی علیہ الرحمہ کی تائید اقوال واعمال صحابہ سے نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہی ہمارے دین کی بنیاد ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال بعث علی بن ابی طالب من الیمن بذهبة فقسمها بین اربعة من المؤلفة الاقرع بن حابس الحنظلی وعلقمة بن علاثة العامری وعتبة بن بدر الفزاری وزید بن جبل الطائی فقالت القریش والانصار تقسم بین صنا دید اهل نجد وتد عنا فقال النبی صلی الله علیه و آله وسلم انما اتألفهم

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونا دے کر یمن بھیجا اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چار آدمیوں اقرع بن حابس حنظلی' علقمہ بن علاثہ عامری' عتبہ بن بدر فزاری' زید بن جبل طائی کی تالیف قلب کے لئے سونا ان میں تقسیم فرمایا قریش اور انصار نے کہا کہ آپ نجد کے سرداروں میں سونا تقسیم کر رہے ہیں اور ہمیں چھوڑ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تو ان کی تالیف قلبی کر رہا ہوں۔

فتح القدیر میں ہے کہ ابوعبیدہ نے کتاب الاموال میں کہا ہے۔

ان النبی صلی الله علیه و آله وسلم اتاه بعد ذلک مال فجعله فی صنف واحد وهم المؤلفة قلوبهم الاقرع بن حابس وعیینة بن حصین وعلقمة وزید الجبل قسم فیهم الذهبة التی بعث بهامعاذ من الیمن وانما توخذ من اهل الیمن الصدقة ثم اتاه مال آخر فجعله فی صنف آخر هم الغارمون فقال القبیصة بن المخارق حین اتاه وقد تحمل جعاله یا قبیصة ابن المخارم حتی تاتیناالصدقة فنا مرلک بها

کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مال آیا اور آپ ﷺ نے صرف ایک صنف میں تقسیم فرمایا اور وہ ایسے لوگ تھے جن کی تالیف قلبی مقصود تھی یعنی اقرع بن حابس' عیینہ بن حصین' علقمہ اور زید جبل۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کے درمیان سونا تقسیم فرمایا جو معاذ رضی اللہ عنہ نے یمن سے بھیجا تھا کیونکہ اہل یمن سے صدقہ لیا جاتا تھا پھر آپ ﷺ نے اسے دوسری صنف یعنی مقروضوں میں تقسیم کیا۔ حضور ﷺ کے پاس قبیصہ بن المخارق آیا جس کے پاس کپڑا تھا۔ آپ نے فرمایا اے قبیصہ! یہاں ٹھہریئے حتیٰ کہ صدقہ آئے ہم تمہارے لئے صدقہ کا حکم دیں گے۔

ظالم اور باغی بادشاہ کے ہاتھ پر زکوٰۃ کی ادائیگی

اگر باغی اور ظالم بادشاہ زکوٰۃ وصول کرنا شروع کر دیں جس طرح آج ہمارے زمانے میں ہو رہا ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ زکوٰۃ کی رقم مستحق لوگوں تک نہیں پہنچے گی تو زکوٰۃ دینے والوں پر ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ کا اعادہ کریں اور خود مستحقین تک پہنچیں۔ انہوں نے باغیوں اور ظالم بادشاہوں کی مقرر کردہ انتظامیہ کو جو زکوٰۃ دی وہ کسی شمار میں نہیں کیونکہ اس کی ادائیگی صرف اس وقت صحیح ہوگی جب مستحقین میں سے کسی کو زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ کے مال کا مالک بنائے گا اور مذکورہ صورت میں زکوٰۃ مستحقین تک پہنچی ہی نہیں بادشاہ وقت بھی صرف اس لئے زکوٰۃ کا مال جمع کرتا ہے تاکہ ایک ضابطہ کے تحت مصارف میں تقسیم کرے اور حقدار کا حق اس تک پہنچ سکے۔

ایک قول یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والوں کی نیت اگر زکوٰۃ کی تھی تو ان کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی کیونکہ یہ باغی اور ظالم فقیر ہیں انہوں نے لوگوں کا بے حساب مال ہڑپ کیا ہے اور ان کے پاس جو کچھ ہے وہ بھی غریب عوام کا ہے اس لئے جب یہ جبراً مال وصول کرنے آئے تو زکوٰۃ دینے والے نے ان کی حقیقی حالت کا اعتبار کرتے ہوئے صدقہ کی نیت کر لی تو اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی لیکن ظالم لوگ اگر اسے غلط جگہ استعمال کرتے ہیں تو گنہگار ہوں گے۔

یہ روایت جہاں زکوٰۃ کی ادائیگی کو جائز گردانتی ہے وہاں اس بات کا بھی جواز فراہم کرتی ہے کہ ظالم اور باغی حکومت زکوٰۃ لے سکتی ہے لیکن صحیح رائے پہلی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے (کہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی) کیونکہ یہ قول تکلف سے خالی نہیں۔ اس طرح تو ڈاکوؤں پر بھی زکوٰۃ کے مستحق بن جائیں گے اور ڈاکہ کے وقت اگر کوئی صدقہ کی نیت کرے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی حالانکہ اس میں جبر ہے اخلاص نہیں اور کوئی عبادت اخلاص کے بغیر ادا نہیں ہوتی۔

ذمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں

ذمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں اگر چہ وہ فقیر ہو۔

لانه سأل ضمام ابن ثعلبة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم انشدك بالله الله امرك ان تاخذ هذه الصدقة من اغنيائنا فتقسمها على فقرائنا فقال النبى صلى الله عليه وآله وسلم اللهم نعم. (رواہ البخاری)

کیونکہ ضمام ابن ثعلبہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا۔ میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ یہ صدقہ ہمارے امیروں سے لیں اور ہمارے فقیروں میں تقسیم کریں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہاں بلا شک۔

یہ پوری حدیث نہیں بلکہ طویل حدیث کا ایک جز ہے۔

لما قال لمعاذ حين وجهه الى اليمن اعلمهم ان الله قد فرض عليهم الصدقة توخذ من اغنيائهم وتقسم على فقرائهم

کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت حکم دیا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو بتانا کہ صدقہ اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیا ہے جو ان کے غنیوں سے لیا جائے گا اور ان کے فقیروں پر تقسیم کیا جائے گا۔

اسے صحاح ستہ میں روایت کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات ذمیوں کو دیئے جا سکتے ہیں لیکن نفلی صدقات بھی مؤمنین کو دینا افضل ہے کیونکہ رب قدوس کا ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْآ اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا کہ ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو۔ بے شک انصاف

الْمُقْسِطِيْنَ. (الممتحنہ:۸) والے اللہ کو محبوب ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

تصدقوا علی اهل الديان كلها — تمام ادیان کے ماننے والوں کو صدقہ دو۔

ابن ابی شیبہ علیہ الرحمہ سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرسلا روایت کرتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم لاتصدقوا الا على اهل دينكم — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی کو صدقہ نہ دو سوائے اپنے دین والوں کے۔

اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ. (البقرۃ:۲۷۲) — انہیں راہ دینا تمہارے ذمہ نہیں .... اور جو مال دو تمہیں پورا ملے گا۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام دینوں کے ماننے والوں کو صدقہ دو۔

یہ حکم مطلق ہے۔ اگرچہ یہ زکوٰۃ کو بھی شامل ہے لیکن زکوٰۃ ایک ایسی حدیث سے خاص ہو جاتی ہے اور اس حکم سے نکل جاتی ہے جو سند اور صحت کے اعتبار سے اس حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

بنی ہاشم اور ان کے موالیوں کو زکوٰۃ دینا

بنی ہاشم کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں جیسا کہ حدیث گزر چکی ہے۔

عن ابی هريرة قال اخذ الحسن بن على تمرة من تمر الصدقة فجعلها فى فيه فقال رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم كخ كخ ارم بها اما علمت انا لا تحل لنا الصدقة. (رواہ البخاری ومسلم) — حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی کھجوروں سے ایک کھجور لے لی اور اسے منہ میں ڈال لیا۔ حضور ﷺ نے کخ کخ کرتے ہوئے فرمایا اسے پھینک دو کیا آپ نہیں جانتے کہ صدقہ ہمارے لئے جائز نہیں۔

اس بارے میں اس قدر احادیث ہیں کہ اگر تواتر کا دعویٰ کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

بنی ہاشم کے موالی کو بھی زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔

عن ابی رافع بعث رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم رجلا على الصدقة من بنى مخزوم فقال لى اصبحنى فانك تصيب منها معى قلت حتى سأل رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم فانطلق الى رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم فسأله فقال مولى القوم من انفسهم وانا لاتحل لنا — حضرت ابی رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو بنی مخزوم سے صدقہ لینے کی غرض سے بھیجا۔ وہ شخص مجھ سے کہنے لگا کہ میرے ساتھ آؤ آپ کو بھی میرے ساتھ حصہ ملے گا۔ میں نے کہا جب تک رسول اللہ ﷺ سے اس بارے پوچھ نہیں لیا جاتا۔ وہ شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس بارے آپ سے پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایک قوم کا آزاد کردہ غلام انہیں

الصدقۃ (رواہ الترمذی وابوداؤد) میں سے ہوتا ہے ہمارے لئے صدقہ جائز نہیں۔

فتح القدیر میں ابوعصمہ' ابی حنیفہ سے روایت کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں بنی ہاشم کو زکوۃ دینا جائز ہے کیونکہ آج ان کی مالی حالت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کی مالی معاونت کی جائے۔ اسی لئے بعض متاخرین نے اس قول پر فتویٰ دیا ہے لیکن یہ غلطی ہے کیونکہ اس سے نصوص کی مخالفت لازم آتی ہے جو ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے قطعی ہیں۔

حضور ﷺ کی ذات اقدس پر تو ہر قسم کا صدقہ حرام تھا نفلی بھی اور فرضی بھی۔

عن بهز بن حكيم عن ابيه عن جدهان رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم كان اذا اتى بشئى سال اصدقة ام هدية فان قالوا صدقة لم ياكل و ان قالوا هدية اكل

بہز بن حکیم اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جب کوئی چیز پیش کی جاتی تو آپ پوچھتے کہ کیا یہ صدقہ ہے یا تحفہ ہے؟ اگر لوگ بتاتے کہ یہ صدقہ ہے تو آپ ﷺ اسے نہ کھاتے اگر بتاتے کہ تحفہ ہے تو کھا لیتے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دوسرے ہاشمی نفلی صدقہ استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ نفلی صدقہ میل کچیل نہیں ہوتا۔ امام مالک روایت کرتے ہیں کہ انہیں یہ بات پہنچی ہے کہ:

ان رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم قال لا تحل الصدقة لآل محمد انما هى من اوساخ الناس.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آل محمد ﷺ پر صدقہ حلال نہیں کیونکہ یہ لوگوں کے میل کچیل سے ہے۔

نفلی صدقہ طہارت علی الطہارت کی مانند ہے۔ اس میں کسی قسم کی (گناہوں کی) گندگی نہیں ہوتی بلکہ اس میں ھبہ کا معنی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس میں گندگی کا شبہ ہوتا ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ کے لئے نفلی صدقہ لینا بھی حرام ہے جیسا کہ علماء نے تصریح کی ہے۔

ہاشمی جن پر صدقہ حرام ہے ان سے مراد حضرت علی' عباس' عقیل' جعفر اور حارث کی اولاد امجاد علیہم السلام ہیں کیونکہ یہی لوگ ہاشم کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ ابولہب کی اولاد کو اس حکم میں شامل نہیں کرتے اگرچہ وہ بھی نسلاً ہاشمی ہیں ان کو شامل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زکوۃ سے ہاشمیوں کا استثناء تکریم کی خاطر ہے اور ابولہب ہاشمی ہونے کے باوجود کفر کی وجہ سے قابل تکریم نہیں۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اگر اولاد ہوتی تو تکریماً انہیں بھی زکوۃ لینا حرام ہوتا۔

امیر آدمی کو صدقہ وغیرہ دینا

کسی مالدار کو صدقہ دینا جائز نہیں کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

قال اخبرنى رجلان انهما اتيا النبى صلى الله

مجھے دو آدمیوں نے بتایا کہ وہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی

علیه و آله وسلم وهو فی حجة الوداع وهو یقسم الصدقة فسألاهٔ عنهافرفع فینا النظر وخفضه فرأیاجلدین فقال ان شئتمااعطیتکما ولاحظ فیها لغنی ولالقوی مکتسب (رواہ الترمذی وابوداؤد)

کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ صدقہ تقسیم کر رہے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے بارے پوچھا۔ حضور ﷺ نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ انہوں نے دو چڑے دیکھے حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے دوں لیکن اس میں کسی غنی کا حصہ نہیں اور نہ ہی کسی طاقت رکھنے والے کما سکنے والے کا حصہ ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ بقول صاحب التنقیح یہ حدیث صحیح ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں یہ حدیث کس قدر قوی ہے اور اس کی سند کیا ہی خوبصورت سند ہے۔ فتح القدیر کے مصنف کے بقول حضرت معاذ کی حدیث اور یہ حدیث امام شافعی علیہ الرحمہ کی رائے کے خلاف دلیل ہے۔ امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ جو غنی جہاد پر جا رہا ہے اور اس کے پاس کچھ نہیں بچا اس نے تمام مال نمازیوں کو دے دیا ہے تو اب زکوٰۃ سے اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔

ہاں یہ حدیث امام شافعی علیہ الرحمہ کے خلاف حجت ہے بلکہ ضمام بن ثعلبہ کی حدیث بھی امام شافعی کی رائے کا بطلان کرتی ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے لیکن اپنی رائے کے ثبوت میں شوافع عطاء بن یسار سے رویت کردہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

ان رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم قال لا تحل صدقة لغنی الا لخمسة لغاز فی سبیل الله ولعامل علیها او لغارم اولرجل اشتراها بماله او لرجل کان له جارمسکین فیصدق علی المسکین فاهدی المسکین لغنی. (رواہ مالک وابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی غنی کے لئے صدقہ لینا جائز نہیں سوائے پانچ کے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا' عاملین زکوٰۃ' مقروض وہ جس نے صدقہ کا مال اپنے مال کے بدلے خرید لیا یا وہ آدمی جس کا پڑوسی مسکین ہے۔ کوئی شخص مسکین کو زکوٰۃ دیتا ہے اور یہ مسکین اپنے غنی پڑوس کو بطور ہدیہ صدقہ کے مال میں سے دے دیتا ہے۔

اس معنی کی حدیث کو ابوسعید سے روایت کیا ہے۔

عن ابی سعید قال قال قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم لا تحل الصدقة لغنی الا فی سبیل الله او ابن السبیل او جار فقیر یتصدق علیه فیهدی لک ویدعوک.

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غنی کے لئے صدقہ حلال نہیں سوائے اس کے کہ جہاد کرنے والا ہو۔ مسافر ہو یا فقیر کا پڑوسی ہو۔ فقیر کو صدقہ دیا جائے اور وہ تجھے ھدیہ دے اور تیری دعوت کرے۔

یہ استثناء سابقہ احادیث کے عموم کے معارض ہے۔ غنی کے آزاد کردہ غلام کو زکوٰۃ دینا جائز ہے کیونکہ وہ فقیر ہے اور فقراء کے عموم میں داخل ہے۔ غنی کو زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ تکریم نہیں بلکہ عدم احتیاج ہے اس لئے غنی کا آزاد

کردہ غریب غلام زکوٰۃ لے سکتا ہے کیونکہ وہ ضرورت مند ہے لیکن ہاشمی کے آزاد کردہ غلام کے لئے زکوٰۃ لینا حلال نہیں کیونکہ یہ ممانعت ہاشمیوں کی تکریم کے پیش نظر ہے۔

جن چیزوں پر زکوٰۃ کا استعمال درست نہیں

زکوٰۃ کے مال سے مسجد تعمیر نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی اس سے میت کی تدفین ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی غلام کو آزاد کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس طرح زکوٰۃ کا ایک رکن تملیک مفقود ہو جاتا ہے زکوٰۃ کے مال سے میت کا قرضہ بھی ادا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قرض خواہ کے حوالے کرنے سے میت کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔

اگر میت وصیت کرے کہ میرا قرضہ زکوٰۃ کے پیسوں سے ادا کیا جائے تو اس بارے علماء کی آراء مختلف ہیں۔ محیط میں ہے کہ اگر زندہ یا مردہ کا قرض اس کے حکم سے ادا کیا گیا تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ دینے والا شخص اپنے اصول وفروع کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ املاک ان کے درمیان مشترک ہوتی ہیں (یعنی آباء واجداد اور آگے چلنے والی نسل کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ ان تمام کی ملکیت ہوتا ہے) ایک امیر ہو تو دوسرے کو امیر تصور کیا جاتا ہے (جیسے باپ امیر ہو تو بیٹا امیر خیال کیا جاتا ہے) اس طرح تملیک معتبر نہیں ہوتی کیونکہ بیٹے کی زکوٰۃ اگر باپ لے گا تو منفعت بیٹے سے منقطع نہیں ہوگی جبکہ زکوٰۃ میں ضروری ہے کہ زکوٰۃ دینے والا اس مال سے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے کیونکہ ان کی املاک بھی متصل ہیں اور ایک کا مال دوسرے کا مال شمار ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے ارشادِ خداوندی ہے:

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى O (الضحیٰ:۸) اللہ تعالیٰ نے آپ کو حاجت مند پایا تو غنی کر دیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال کو رسول اللہ ﷺ کا مال کہا جا رہا ہے اسی وجہ سے میاں بیوی اور فروع واصول کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں کی جاتی۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

عن زینب قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تصدقن یا معشر النساء ولو من حلیکن قالت فرجعت الی عبداللہ فقلت انک رجل خصف ذات الیدوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد امرنا بالصدقة فاته فاسأله فان کان ذلک یجزی عنی والاصرفتها الی غیرکم فقال لی عبداللہ بن ائیته انت فانطلقت فاذا امرأة من الانصار بباب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عورتو! صدقہ دیا کرو اگرچہ وہ تمہارے زیورات سے ہو۔ فرماتی ہیں کہ میں عبداللہ کے پاس واپس آئی اور کہا آپ موچیوں کا کام کرتے ہیں اور دستکار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقے کا حکم دیا ہے آپ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوں اور پوچھیں۔ اگر زکوٰۃ کا مال میری طرف سے آپ کو دیا جا سکتا ہے تو فبہا ورنہ تمہارے علاوہ کسی اور کو دوں۔ عبداللہ کہنے لگے آپ خود جائیں۔ میں چلی گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک انصاری عورت رسول اللہ ﷺ

وسلم حاجتي حاجتها قالت وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد القيت عليه المهابة فخرج علينا بلال فقلنا له ائت رسول الله صلى الله عليه وسلم فاخبره ان امرأتين بالباب تسألانک اتجزی الصدقة عنهما على ازواجهما وعلى ايتام في حجورهما ولا تجزه من نحن قالت فدخل بلال على رسول الله صلى الله عليه وسلم فسأله فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم اى الزيانيب قال امراة عبدالله فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لهما اجران اجر القرابة واجر الصدقة (رواہ مسلم)

کے دروازے پر ہے۔ میری اور اس کی ضرورت ایک ہی تھی۔ حضور ﷺ نہایت بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ہمارے پاس حضرت بلال تشریف لائے۔ ہم کہنے لگیں آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جایئے اور بتایئے کہ دروازے پر کھڑی دو عورتیں پوچھتی ہیں کہ کیا اُن کی طرف سے دیا گیا صدقہ ان کے خاوندوں کے لئے اور ان کے زیر کفالت یتیم بچوں کے لئے جائز ہے۔ یہ نہ بتانا کہ ہم کون ہیں۔ فرماتی ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور آپ سے استفسار فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون سی زینب؟ (حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے) کہا عبداللہ کی بیوی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انہیں دو اجر ملیں گے۔ ایک قرابت داری کا اور ایک صدقہ کا۔

امام بخاری نے بھی اسی واقعہ کو نقل کیا ہے لیکن قدرے مختلف الفاظ میں۔

ظاہر ہے اس واقعہ میں نفلی صدقہ کا تذکرہ ہے اس لئے یہ دلیل نہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث بھی اس پر شاہد ہے کہ یہ نفلی صدقہ ہے فرض نہیں۔

عن ابی سعید قال خرج رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم في اضحى اوفطر الى المصلى ثم انصرف فوعظ الناس فامرهم بالصدقة فقال ايها الناس تصدقوا فمر على النساء فقال يا معشر النساء تصدقن فاني اريتكن اكثر اهل النار فقلن ولم ذلک يا رسول الله قال تكثرن اللعن وتكفرن العشيرة ما رأيت من ناقصات عقل و دين اذهب طلب الرجل الحازم من احد فكن يامعشر النساء ثم انصرف فلما صارالى منزله جاءت زينب امرأة ابن مسعود تستأذن عليه فقيل يارسول الله صلى الله عليه وآله وسلم هذه زينب فقال اى

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدالاضحیٰ یا عیدالفطر کے دن عیدگاہ کی طرف نکلے پھر واپس آئے لوگوں سے وعظ فرمایا اور انہیں صدقہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: لوگو! صدقہ دیا کرو۔ آپ ﷺ عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا۔ اے خواتین کا گروہ! صدقہ کیا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر جہنمی ہیں۔ کہنے لگیں۔ یہ کیوں یا رسول اللہ! فرمایا: تم اکثر لعن طعن کرتی ہو، خاوندوں کی نافرمانی کرتی ہو۔ میں تم کو عقل و دین میں ناقص دیکھتا ہوں۔ اے عورتو! تم ایک اچھے بھلے سیانے آدمی کے عقل کو ماؤف کر دیتی ہو پھر آپ ﷺ واپس تشریف لائے۔ جب آپ گھر آئے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی تشریف لائیں اور آپ کی خدمت میں حاضری کی اجازت مانگی۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! زینب آئی ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا

الزيانب فقيل امرأة ابن مسعود قال نعم ائذنوا لها فاذن لها فقالت يا نبي الله انك اليوم امرت بالصدقة و كان عندى حلى لى فاردت ان اتصدق به فزعم ابن مسعود انه وولده احق من تصدقت به عليهم فقال النبي صلى الله عليه و آله وسلم صدق ابن مسعود زوجك وولدك احق من تصدقت به عليهم. (رواہ بخاری)

کونسی زینب؟ عرض کیا گیا ابن مسعود کی زوجہ محترمہ۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں اُسے آنے دو۔ انہیں اجازت مل گئی۔ عرض کریں لگیں۔ اے اللہ تعالیٰ کے نبی! آپ نے آج صدقہ کا حکم دیا میرے پاس زیور ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے صدقہ کروں۔ ابن مسعود کا خیال ہے کہ وہ اور ان کا بیٹا دوسرے لوگوں کی نسبت اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابن مسعود نے سچ کہا۔ بلاشبہ تیرا گھر والا اور بیٹا بہ نسبت دوسروں کے تیرے صدقہ کے زیادہ مستحق ہیں۔

یہ حدیث واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ یہ واقعہ نفلی صدق سے تعلق رکھتا ہے۔ ورنہ زکوٰۃ بھی اولاد کو دینا جائز ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہاں اصول اور فروع کو چھوڑ کر دوسرے اقرباء کو صدقہ وزکوٰۃ دینا افضل ضرور ہے اسی طرح میاں بیوی کا رشتہ اگرچہ بہت قریب کا ہوتا ہے لیکن وہ ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے کیونکہ قریبی رشتہ داروں کو صدقہ وزکوٰۃ دینا انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ ساتھ صلہ رحمی بھی ہے لیکن ایک بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ اگر غیر زیادہ ضرورت مند ہوں تو پھر صدقہ وزکوٰۃ ان کو نہ دیا جائے۔

اپنے غلام کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں

اپنے مکاتب اور غلام کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں اور نہ ہی اس غلام کو[1] جس کو شریک نے اپنی طرف سے آزاد کر دیا ہو کیونکہ غلام کو دینا اپنے آپ کو دینے کے مترادف ہے اور مکاتب کو دینا بھی ایک لحاظ سے خود لینا ہے کیونکہ اس نے وہی رقم زرِ کتابت میں اسے لوٹانا ہے اس لحاظ سے وہ رقم مکاتب کی ملکیت نہیں ہوگی اور وہ غلام جس کے بعض کو آزاد کیا گیا ہو وہ بھی مکاتب کے قائم مقام ہے۔ صاحبین کہتے ہیں کہ مکاتب کو زکوٰۃ دینا جائز ہے کیونکہ وہ آزاد ہے۔

اگر غیر مستحق شخص کو زکوٰۃ دے دی ہو

اگر کسی شخص نے کوشش کر کے ایک آدمی کو زکوٰۃ دی اور اس کا گمان یہ تھا کہ یہ زکوٰۃ کا مستحق ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو امیر تھا اور اس کو زکوٰۃ لینا حرام تھا تو طرفین کے نزدیک وہ دوبارہ نہیں دے گا۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ وہ دوبارہ زکوٰۃ دے کیونکہ اسے یقین ہو گیا ہے کہ اس نے حقدار کو حق نہیں دیا حالانکہ مستحق تک پہنچنا ممکن تھا متعذر نہیں تھا۔ اگر اس نے تحری ہی نہیں کی اور بغیر یہ جانے کے کہ مستحق ہے یا نہیں کسی کو زکوٰۃ دے دی یا اسے شک تھا کہ نہ جانیں یہ مستحق ہے یا نہیں لیکن اس نے چھان بین نہیں کی اور زکوٰۃ کسی کے حوالے کر دی یا اس

---

[1] اس کی صورت یہ ہے کہ ایک غلام کو دو آدمیوں نے خریدا۔ ان میں سے ایک نے آزاد کیا تو اس کا ایک حصہ آزاد ہے مکمل آزاد نہیں کیونکہ دوسرے نے اپنا حصہ آزاد نہیں کیا اس لئے اس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں کیونکہ غلام مالک نہیں بن سکتا بلکہ اس کا مال مالک کا مال شمار ہوتا ہے۔

نے چھان بین تو کی لیکن زکوٰۃ کسی ایسے آدمی کو دی جس کے بارے چھان بین نہیں ہوئی تو اس کی زکوٰۃ نہیں ہوئی اس پر لازم ہے کہ زکوٰۃ دوبارہ ادا کرے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

طرفین کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے پر لازم تھا کہ وہ گمان غالب پر عمل کرے اور اس نے وہ کیا لہٰذا زکوٰۃ ادا ہوگئی جیسے کسی پر قبلہ مشتبہ ہوگیا تو تحری کے بعد اس نے غالب گمان پر ایک طرف کو منہ کر کے نماز پڑھ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ غلطی ہوگئی تو نماز ہو جائے گی۔ اس طرح تحری کے بعد اگر غیر مستحق کو زکوٰۃ دی تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اعادہ نہیں ہوگا۔

اس کی دوسری دلیل معن بن یزید کی حدیث ہے۔

قال بايعت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم انا وابی وجدی وخطب علی رسول الله صلى الله عليه وسلم فانكحنی وخاصمت اليه وكان ابی يزيد اخرج دنانير يتصدق بها فوضعها عند رجل في المسجد فاعطانيها ولم يعرف فاتيته بها فقال ابی والله ما اياک اردت فخاصمته الى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقال لک مانويت يا يزيد ولک ما اخذت يامعن

فرماتے ہیں کہ میں نے اور میرے والد اور دادا نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی۔ آپ ﷺ نے میری منگنی کی اور نکاح پڑھایا۔ میں آپ کے پاس یہ جھگڑا لے کر گیا کہ میرے والد یزید چند دینار لے آیا جنہیں وہ صدقہ میں دینا چاہتا تھا اور آ کر وہ دینار مسجد میں ایک آدمی کے پاس رکھ دیئے۔ اس نے وہ دینار مجھے دے دیئے اور نہ پہچان سکا میں دینار لے کر گھر آ گیا۔ میرے والد گرامی نے کہا اللہ کی قسم میں نے تجھے دینے کا ارادہ نہ کیا تھا۔ میں یہ جھگڑا حضور کے پاس لے گیا تو آپ نے فرمایا: اب یزید تیرے لئے وہ ہے جس کی تو نے نیت کی۔ اے معن تو نے جو لے لیا یہ تیرا ہے۔

اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ یہ محض ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے اور ہو سکتا ہے یہ واقعہ نفلی صدقہ کے بارے ہو اس لئے یہ حجت نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے صاحب فتح القدیر فرماتے ہیں یہ محض حکایت حال نہیں بلکہ حضور ﷺ کا یہ ارشادِ عام ہے لہٰذا اس میں غور و خوض کرنا چاہئے کیونکہ یہ قابل تحقیق مسئلہ ہے۔

اگر کسی نے نصاب کے برابر مال زکوٰۃ کسی فقیر کو دے دیا تو یہ جائز ہے لیکن مکروہ ہے۔ جائز اس لئے ہے کہ زکوٰۃ لینے سے پہلے وہ فقیر تھا اور زکوٰۃ کا مستحق تھا۔ بعد میں اگر غنی ہو گیا تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ امام زفر کا گمان ہے کیونکہ غنی پر زکوٰۃ دینا فرض ہے لیکن غناء فقر کے بعد ہے اور جب اس کو زکوٰۃ دی گئی تو یہ فقیر تھا۔ رہی یہ بات کہ جب اتنی مالیت زکوٰۃ دینا جائز ہے تو کراہت کس لئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے قرب میں غنا اس کے مکروہ ہونے کا سبب ہے۔ جیسے کسی شخص کا لباس، جسم اور نماز کی جگہ سب پاک ہیں لیکن اس کے قریب گندگی پڑی ہے تو نماز ہو جائے گی لیکن مکروہ ہوگی۔

زکوٰۃ دوسرے شہر کی طرف منتقل کرنا

ایک شہر سے دوسرے شہر میں زکوٰۃ کو منتقل کرنا مکروہ ہے ہاں اگر دوسرے شہر میں زیادہ مستحق موجود ہوں تو منتقل کرنے میں کوئی حرج نہیں اسی طرح زکوٰۃ دینے والے کے رشتہ دار اگر مستحق ہیں اور دوسرے شہر میں قیام پذیر ہیں تو پھر بھی زکوٰۃ منتقل کی جاسکتی ہے کیونکہ پہلا حق شہر کے فقیروں کا ہے اور پھر دوسروں کا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن سے صدقہ لے کر مدینہ طیبہ روانہ کیا کیونکہ مدینہ طیبہ کے لوگ نسبتاً زیادہ ضرورت مند تھے۔

صدقۂ فطر کا بیان

صدقۂ فطر کن پر لازم ہے؟

فطرانہ ہر آزاد مسلم پر فرض ہے وہ اپنی' اپنی چھوٹی اولاد اور غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرنے کا پابند ہے اگرچہ اس کا غلام کافر ہی کیوں نہ ہو۔

عن ابن عمر قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم زکوۃ الفطر صاعا من تمر او صاعا من شعیر علی کل عبد او حر صغیر او کبیر (رواہ مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر مسلمان غلام اور آزاد' چھوٹے اور بڑے پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو صدقہ فطر کو واجب قرار دیا۔

عن عبد اللہ بن ثعلبۃ قال خطب رسول اللہ ﷺ الناس قبل یوم الفطر بیوم او بیومین قال ادوا صاعا من بر او قمح بین اثنین او صاعا من تمر او شعیر عن کل حر وعبد صغیر او کبیر.

عبداللہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عید الفطر سے ایک دن یا دو دن پہلے لوگوں سے خطاب فرمایا اور حکم دیا کہ گندم یا گیہو دونوں میں سے ایک کا ایک صاع یا کھجور یا جو کا ایک صاع ہر آزاد' غلام' چھوٹے یا بڑے کی طرف سے ادا کرو۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی سند قوی ہے' ان کے بقول اس کی سند میں کوئی کلام نہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ کافر غلام کی طرف سے صدقہ واجب نہیں آپ دلیل میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کردہ شیخین کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر مسلمان آزاد' غلام' مرد اور عورت پر فرض کیا ہے کہ وہ رمضان کی عید الفطر کے موقعہ پر ایک صاع کھجور' یا ایک صاع جو دیں۔ یہ استدلال کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ عام کے افراد میں سے کسی ایک فرد پر حکم لگانا تخصیص کا موجب نہیں ہوتا جیسا کہ علم الاصول کی کتب میں مذکور ہے۔ مشائخ فقہ فرماتے ہیں کہ ایک واقعہ سے متعلقہ حکم کے سبب میں مطلق ومقید دونوں وارد ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سے مطلق کی تقیید لازم نہیں آتی جبکہ شوافع کے نزدیک مطلق مقید بن جاتا ہے۔ اصول فقہ میں اس پر

سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عام کے ایک فرد پر حکم لگانے والے امور کے قبیل سے ہے اور یہ ہمارے نزدیک تخصیص کا موجب نہیں بنتا اور نہ ہی جمہور شوافع کے نزدیک تخصیص کا موجب ہے سوائے ایک روایت کے جو ابوثور رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کی گئی ہے۔

ہدایہ میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں' صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ ایک رائے یہ ہے کہ صدقۃ الفطر غلام کی ذات پر واجب ہے اور آقا اس کی طرف سے اسے ادا کرنے پر نائب کا درجہ رکھتا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ صدقۃ الفطر ہے ہی آقا پر واجب کیونکہ غلام کسی چیز کا مالک نہیں۔ اب جو غلام کافر ہے وہ شرعی احکام کا اہل ہی نہیں اس لئے کافر غلام پر صدقۃ الفطر واجب نہیں۔

ہمارے ائمہ نے دوسرے مؤقف کو اپنایا ہے یعنی صدقۃ الفطر آقا پر واجب ہے' غلام پر نہیں اور آقا مسلمان ہونے کی وجہ سے شرعی احکام کے واجب ہونے کا اہل ہے اس لئے اس پر فطرانہ واجب ہے۔ ہمارے ائمہ کرام کی رائے ہی صحیح ہے کیونکہ غلام کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اس واجب کو ادا کرے کیونکہ وہ غلام ہے' اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں (حتیٰ کہ وہ اپنی ذات کا بھی مالک نہیں) جو اس کے ہاتھ میں ہے وہ اس کے مالک کا ہے اور ظاہر ہے فطرانہ یا کسی حکم کے وجوب کا مطلب ابتلاء اور تکلیف ہے جو اس پر شاق گزرے۔ جب غلام نے کچھ بھی ادا نہیں کرنا تو وہ احکام کا مکلّف کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ یہ تکلیف مالایطاق ہے۔ رہا یہ کہ غلام پر وجوب اس فائدہ کا حامل ہے کہ اس کی طرف سے آقا ادا کرے تو اس میں غلام کی آزمائش تو نہ ہوا اور اس کو خواہش نفس کی مخالفت کا پابند نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ یہ ابتلاء اور تکلیف تو آقا ہے جس نے غلام کی طرف سے صدقہ دینا ہے۔ اس طرح غلام پر زکوٰۃ فطر واجب کرنا بے فائدہ ہے پھر ترک سے غلام گناہگار بھی نہیں ہوتا بلکہ اس کا آقا گناہگار ہوتا ہے اور ظاہر ہے جو گناہگار ہو رہا ہے حکم پر عمل پیرا ہونا اسی پر واجب ہے۔ اس کے علاوہ عبداللہ بن ثعلبہ کی حدیث اس پر نص ہے کہ فطرانہ غلام کی بجائے آقا پر واجب ہوتا ہے کیونکہ اس میں ''ادّوا'' امر کا صیغہ آیا ہے۔ یہ حدیث نص مفسر ہے اس لئے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کی اس کے مطابق تاویل کرنا ہوگی۔

صدقہ فطر کو واجب کرنے میں جو چیز سبب ہے وہ سر ہے جس کا وہ خرچ برداشت کرتا ہے اور اس کے ساتھ رہتا ہے کیونکہ عبداللہ بن ثعلبہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں' ہر آزاد اور غلام کی طرف سے'' حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ کی حضرت عبداللہ بن ثعلبہ سے روایت کردہ حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہر چھوٹے بڑے اور آزاد و غلام کی طرف سے ادا کرنے کا حکم دیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں **ممن یموتون** (زیر کفالت) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور یہ بھی ہے کہ اس طرح ایک آدمی پر ایک وقت میں متعدد صدقات واجب ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے زیر کفالت نئی سر ہوتے ہیں لہٰذا وجوب کا اصل سبب سر ہے۔

اس پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ فطرانہ کے وجوب کا سبب اگر سر ہے تو پھر اسے ہر سال واجب نہیں ہونا

چاہئے جس طرح حج کا سبب بیت اللہ شریف ہے اسی لئے وہ ہر سال واجب نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فطرانہ کے وجوب کا سبب سر اپنی بقاء اور زندگی کی وجہ سے ہے اور بقاو زندگی ہر سال ایک نئی نعمت ہے تو اس وجہ سے ہر سال فطرانہ واجب ہوتا ہے جیسے زکوٰۃ میں نمو کا اعتبار کرتے ہوئے ہر سال زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے کیونکہ نمو ہر سال پائی جاتی ہے جس کا تکرار لازم آتا ہے۔ زندگی تو لحظہ بلحظہ ایک نعمت ہے بلکہ اس کا ہر سانس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا دین ہے لیکن آسانی اور رحمت کے تحت ہر گھڑی صدقہ واجب نہیں بلکہ ہر سال واجب ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فطرانہ روزے دار کے روزوں کی طہارت کے لئے واجب کیا گیا ہے اور سر کو اسی طہارت کا اعتبار کرتے ہوئے سبب ٹھہرایا گیا ہے۔ لہٰذا جب روزے ہر سال رکھنا فرض ہے تو پھر ان کی طہارت بھی ہر سال ضروری ہے۔

کیا صدقۂ فطر صرف غنی پر لازم ہے؟

صدقہ فطر صرف غنی پر واجب ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا صدقة الا عن ظهر غنى (رواہ البخاری تعلیقاً) کوئی صدقہ نہیں سوائے غنی کی پیٹھ (ذات) کی طرف سے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے اس کی سند بھی بیان کی ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ صدقہ فطر اس فقیر پر بھی واجب ہے جس کے پاس ایک دن کا کھانا ہے۔ آپ دلیل میں حضرت ابوداؤد کی یہ روایت پیش کرتے ہیں۔

عن عبد الله بن ثعلبة او ثعلبة بن عبد الله بن ابى صغير عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم زكوة الفطر صاع من بر او قمح عن كل اثنين صغير او كبير حر او عبد ذكر او نثى اما غنيكم فيزكيه الله واما فقير كم فيرد عليه اكثر مما اعطاه.

حضرت عبد اللہ بن ثعلبہ یا ثعلبہ بن عبد اللہ بن ابی صغیر سے روایت ہے وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چھوٹے' بڑے' آزاد' غلام' مرد' عورت کی طرف سے صدقہ فطر گندم یا دونوں میں سے کسی ایک کا صاع ہے۔ تمہارے غنی کو تو اللہ تعالیٰ تزکیہ نفس عطا فرماتا ہے اور فقیر کو دیئے گئے سے زیادہ واپس دے دیتا ہے۔

ہر شخص جو غور و فکر کرتا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس حدیث سے امام شافعی یہ استدلال نہیں کر سکتے کہ فقیر پر بھی فطرانہ واجب ہے کیونکہ یہ حدیث صدقہ کی مقدار میں ان کے مذہب کی مخالفت کرتی ہے۔

فتح القدیر میں اس حدیث کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسے امام احمد علیہ الرحمہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو بھی صحت میں اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی جس کو ہم نے روایت کیا ہے۔ بالفرض ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث ہماری روایت کردہ حدیث سے صحت میں کم نہیں تو پھر بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فقیر پر صدقہ فطر واجب ہے۔ اس میں تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ الفطر کی مقدار کتنی ہے۔ اس سے غنی کو تزکیہ نفس کی دولت ملتی ہے اور فقیر کے مال میں برکت پیدا ہوتی ہے اور اس میں شک ہی کیا ہے۔ صدقہ مطلقاً (فرض ہو

یا نفل) برکت کا موجب ہوتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فطرانہ واجب ہے بلکہ یہ کہنا بعید از قیاس نہیں کہ اس حدیث سے تو فقیر پر صدقہ فطر کے واجب نہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

صدقہ فطر کے وجوب کے لئے نصاب ضروری ہے جو زکوٰۃ لینے سے مانع ہو کیونکہ صاحبِ نصاب غنی شمار ہوتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ مال حوائج ضروریہ سے فارغ ہو خواہ نامی ہو یا غیر نامی ہو' نقدی کی صورت میں ہو یا مال تجارت کی صورت میں یا گھریلو سامان کی صورت میں ہو۔

اگر کسی شخص کے بچوں کے پاس مال ہو تو ان کے مال سے صدقہ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ یہ رائے شیخین کی ہے کیونکہ صدقہ نفقہ کی طرح وہ ضروری بوجھ ہے جو کسی نہ کسی کو بہرحال برداشت کرنا ہوتا ہے۔ سو ان کے مال میں سے فطرانہ ادا کرنا واجب ہے۔

حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ باپ پر اپنے مال میں سے بچوں کا فطرانہ ادا کرنا واجب ہے کیونکہ حدیث پاک میں حکم باپ کو دیا گیا ہے لیکن بڑے بچوں اور عورت کی طرف سے ادا کرنا واجب نہیں کیونکہ فطرانے کے وجوب کا سبب وہ سر ہیں جن کی وہ کفالت کرتا ہے اور جو اس کے زیر ولایت ہیں لیکن عورت اور بڑے بچے بچیاں خود مختار ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے اپنی عورت اور اپنی بڑی اولاد کی طرف سے صدقہ فطر ادا کر دیا تو جائز ہوگا کیونکہ عادۃً اس میں اس کو اجازت حاصل ہوگی لیکن مکاتب کی طرف سے ادا کرنا واجب نہیں کیونکہ مکاتب خود مختار ہوتا ہے اور نہ ہی تجارت کے غلام کی طرف سے واجب ہے لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ مکاتب اور تجارت کے غلام کی طرف سے بھی ادا کرے گا۔ صاحبِ ہدایہ کہتے ہیں کہ اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک فطرانہ غلام پر واجب ہے آقا نیابۃً ادا کرتا ہے پس صدقہ فطر غلام پر واجب ہے اور زکوٰۃ آقا پر لہٰذا دونوں ایک دوسرے کے منافی نہیں جبکہ ہمارے نزدیک آقا پر واجب ہے کہ غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے اسی طرح اس غلام کی طرف سے زکوٰۃ کی ادائیگی بھی فرض ہے اگر تجارت کے غلام پر فطرانہ واجب ٹھہرائیں تو اس طرح دگنی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے' جو صحیح نہیں۔

شیخ ابن الھمام نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت لوگوں کے پاس موجود مالیت میں ہے اور فرضیت کا سبب مالیت ہے جبکہ صدقۃ الفطر کا وجوب ہر آدمی (سر) کی طرف سے ہے دونوں کے سبب مختلف ہیں تو اس سے دُگنا زکوٰۃ لازم نہیں آتی۔

پھر حدیث مبارک عام ہے کیونکہ "عبد" کا لفظ تجارت کے غلام کو بھی شامل ہے اس لئے کسی مخصص کا ہونا ضروری ہے۔

عبد مشترک کی طرف سے دونوں شریکوں میں سے کسی پر صدقہ فطر واجب نہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی کو ملک تام حاصل نہیں اور نہ ان میں سے کوئی پوری طرح غلام پر ولایت رکھتا ہے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک مشترک غلام میں صدقہ فطر واجب نہیں لیکن صاحبین کے نزدیک کہا جاتا ہے کہ واجب ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ امام صاحب کے نزدیک غلام کی تقسیم کرنا صحیح نہیں جبکہ

صاحبین کے نزدیک صحیح ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ بالاتفاق مشترک غلام میں صدقہ فطر واجب نہیں کیونکہ تقسیم سے پہلے غلام کسی کی ملکیت تامہ میں نہیں اس لئے مکمل طور پر کسی کا غلام نہیں۔

اگر کسی نے غلام بیچا اور خریدنے والے کو اختیار دے دیا کہ پسند نہ آئے تو واپس کر دینا۔ ایسے غلام کا صدقہ وہ شخص ادا کرے گا جو اختیار کی مدت ختم ہونے یا سودا ہو چکنے کے بعد مالک ٹھہرے گا۔ اگر خریدنے والا مالک ٹھہرا تو صدقہ وہ دے گا اور اگر غلام واپس ہو گیا تو بیچنے والا دے گا۔

صدقۂ فطر کے وجوب کا وقت

ہمارے نزدیک صدقہ ءفطر کے وجوب کا وقت عید کے دن کا طلوع فجر ہے جبکہ امام شافعی کے نزدیک رمضان کے مہینے کے آخری دن کا غروب آفتاب ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ صدقہ کے لفظ کی نسبت فطر کی طرف کی گئی ہے اور اسے زکوٰۃ الفطر کا نام دیا گیا ہے اس لئے یہ فطر کے ساتھ خاص ہے اور فطر دن کے وقت ہوتا ہے نہ کہ رات کے وقت اس لئے جس نے آخری یا وسط رات میں اسلام قبول کیا یا بچہ رات کے وقت پیدا ہوا تو ان پر فطرانہ واجب ہو گا۔ امام شافعی کے نزدیک واجب نہیں ہو گا۔ اگر کوئی رات کے وقت فوت ہو گیا تو امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک اس پر صدقہ فطر واجب ہے جبکہ ہمارے نزدیک واجب نہیں۔

وقت سے قبل فطرانہ ادا کرنا جائز ہے

وقت سے پہلے فطرانہ ادا کرنا جائز ہے کیونکہ ادائیگی سبب وجوب کے پائے جانے کے بعد ہو رہی ہے۔

عن نافع عن ابن عمر قال امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بزکوٰۃ الفطر ان نودی قبل خروج الناس الی الصلوٰۃ قال وکان ابن عمر یودیھا قبل ذلک بالیوم ویومین (رواہ ابوداؤد)

حضرت نافع سے روایت ہے۔ وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ لوگوں کے نماز عید کو جانے سے پہلے فطرانہ ادا کرو۔ حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک دو دن پہلے ادا کر دیا کرتے تھے۔

نماز سے پہلے ادا کرنا مستحب ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث سے ثابت ہے۔ اگر عید کے روز سے صدقہ مؤخر کر دیا تو ساقط نہیں ہو گا کیونکہ سبب کے پائے جانے کی وجہ سے صدقہ واجب ہے جس کی ادائیگی ضروری ہے اور سوائے ادا کرنے کے اس سے سبکدوش ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ صدقہ کا عبادت ہونا معقول (جسے عقل سمجھ سکے) ہے اس لئے اسے کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے لیکن قربانی میں ایسا نہیں کیونکہ قربانی ایک خاص وقت میں تو عبادت ہے لیکن اس وقت کے علاوہ جانور کا ذبح کرنا عبادت شمار نہیں ہوتا۔ حسن بن زیاد کہتے ہیں عید کے روز کے گزر جانے سے صدقہ فطر ساقط ہو جاتا ہے جیسے قربانی وقت گزرنے کے بعد واجب نہیں رہتی۔ ان کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے فرماتے ہیں۔

فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

حضور ﷺ نے فطرانہ واجب ٹھہرایا ہے جو روزوں کو

وسلم زكوة الفطر طهر الصيام من اللغو والرفث وطعمة للمساكين من اداها قبل الصلوة فهي زكوة مقبولة ومن اداها بعد الصلوة فهي صدقة من الصدقات. (رواہ ابوداؤد)

لغویات اور بری باتوں سے پاک کرتا ہے اور مسکینوں کے لئے کھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس نے صدقہ نماز سے پہلے ادا کر دیا تو اس کی طرف سے یہ صدقہ مقبول ٹھہرا اور جس نے نماز کے بعد ادا کیا تو یہ دوسرے صدقات کی طرح ایک (نفلی) صدقہ ہے

یہ حدیث سقوط فطرانہ کی دلیل نہیں کیونکہ ''ھی'' ضمیر دونوں جگہ ایک ہی چیز کی طرف راجع ہے اور وہ ہے واجب صدقہ فطر۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نماز کے بعد ادا کیا گیا فطرانہ بھی واجب صدقہ ہے لیکن اس کا وہ ثواب نہیں جو نماز سے پہلے ادا کئے جانے والے فطرانہ کا ہے۔ اگر اس سے وہ مفہوم لیا جائے جو استدلال کرنے والا لیتا ہے تو لازم آئے گا کہ عید کے روز نماز عید کے بعد بھی صدقہ فطر واجب نہیں رہتا بلکہ ساقط ہو جاتا ہے اور یہ نظریہ ہر ایک کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

فطرانہ کی مقدار

فطرانہ کی مقدار نصف صاع گندم یا ایک صاع کھجور یا جو۔ کشمش کے بارے اختلاف ہے۔ صاحبین کہتے ہیں کہ وہ کھجور کی مثل ہے۔ امام ابوحنیفہ سے یہ روایت بھی منقول ہے۔ جامع صغیر میں ہے کہ امام صاحب کے نزدیک کشمش گندم کی مانند ہے اس لئے کشمش نصف صاع واجب ہے۔ یہی روایت راجح ہے کیونکہ گندم کی طرح کشمش میں گٹھلی نہیں ہوتی اور اسے گندم کی طرح پورا کھایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ انشاء اللہ عنقریب سامنے آئے گی۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ گندم ہو یا کوئی اور جنس کھانے سے ایک صاع واجب ہے۔ ہماری دلیل عبداللہ بن ثعلبہ کی گذشتہ حدیث کے علاوہ عمرو بن شعیب کی یہ حدیث ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان النبي صلى الله عليه وآله وسلم بعث مناد يا في فجاج مكة الا ان صدقة الفطر واجب على كل مسلم ذكر او انثى حر او عبد صغير او كبير مدان من قمح اوسواه وصاع من طعام. (رواہ الترمذی)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ کے گلی کوچوں میں اعلان کروایا کہ صدقہ فطر ہر مرد، عورت، چھوٹے، بڑے مسلمان پر فرض ہے۔ (جس کی مقدار) گندم کے دو مد اور کھانے کا ایک صاع ہے۔

عن حسن البصري قال خطب ابن عباس في آخر رمضان على منبر البصرة فقال صدقة صومكم فكان الناس لم يعلموا فقال من ههنا من اهل المدينة قوموا الى اخوانكم فعلموهم فانهم لا يعلمون ثم قال فرض

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رمضان کے آخر میں بصرہ میں منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور فرمایا: اپنے روزہ کا صدقہ (دو)۔ لوگ کچھ نہ سمجھے۔ آپ نے پوچھا کیا یہاں کوئی مدینہ والوں میں سے ہے؟ اپنے بھائیوں کو کھڑے ہو کر بتاؤ کیونکہ

رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم هذه الصدقة صاعا من تمرا وشعيرا ونصف صاع من قمح على كل حراو مملوک ذكر اوانثى صغيرا وكبير فلما قدم على راى رخص الشعير فقال قد اوسع الله عليكم فلو جعلتموها صاعا من كل شيء. (رواہ ابوداؤد)

وہ فطرانہ کے بارے کچھ نہیں جانتے پھر فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے بطور صدقہ ایک صاع کھجور' یا جو یا نصف صاع گندم ہر آزاد' غلام' مرد' عورت' چھوٹے' بڑے پر فرض قرار دیا ہے۔ جب آپ تشریف لائے تو جو میں رخصت دی اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں وسعت دی ہے کیا ہی اچھا ہوا اگر تم ہر جنس سے ایک صاع صدقہ فطر دو۔

امام نسائی نے بھی ایسی ایک حدیث روایت کی ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چھوٹے' بڑے' آزاد' غلام' مرد اور عورت پر نصف صاع گندم یا ایک صاع کھجور یا جو صدقہ فطر واجب فرمایا ہے۔

اس حدیث پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضرت حسن قدس سرہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نہیں ملے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان حضرات کی مدینہ طیبہ میں ملاقات ثابت ہے اور دونوں ہم عصر ہیں لیکن یہ جواب صحیح نہیں کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بصرہ میں جب خطبہ دیا تو امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے وہاں عامل تھے اور یہ بات قطعی ہے کہ ان کے دور میں حضرت حسن بصری بصرہ میں نہیں تھے۔ صحیح جواب یہ ہے کہ اگر دونوں کی ملاقات ثابت نہیں تو یہ حدیث مرسل ہوگی اور مرسل حجت ہوتی ہے خصوصاً جب راوی امام اور عادل ہوں اور اس کی تائید کسی دوسری قوی حدیث سے ہو رہی ہو۔

اگر آپ یہ کہیں کہ امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس حکم میں تبدیلی کر دی اور گندم کا پورا صاع واجب کر دیا تو میں کہوں گا کہ انہوں نے حکم میں تبدیلی نہیں کی۔ وہ ایک منصوص حکم کو بدل بھی کیسے سکتے ہیں؟ انہوں نے تو صرف یہ حکم دیا کہ واجب مقدار میں اضافہ کر کے نفلی صدقہ کا بھی ثواب حاصل کر لو جیسا کہ سیاق کلام سے ظاہر ہے۔ وہ حدیث جو ابن مسیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر گندم کے دو مد واجب فرمائے ہیں۔'' فتح القدیر میں ہے کہ اسے حضرت ابوداؤد نے مراسیل میں روایت کیا ہے اور طحاوی روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تنقیح میں کہا گیا ہے کہ اس کی سند سورج کی طرح صحیح ہے اور اس کا مرسل ہونا نقصان دہ نہیں کیونکہ ابن مسیب رضی اللہ عنہ کی مرسل حدیث بالاتفاق حجت ہے۔ دو مد کی حدیث پر خطا کا حکم لگانا غلطی ہے کیونکہ حضور ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کرام گندم کے علاوہ دوسری اجناس صدقہ فطر ادا کرتے تھے اور گندم بہت کم میسر تھی۔ آپ ﷺ کے زمانہ شریف کے بعد گندم زیادہ ہوگئی اور لوگوں نے گندم سے صدقہ فطر دینا شروع کیا تو نصوص کی روشنی میں دو مد مقرر ہوئے۔ انشاء اللہ عنقریب اس پر مزید گفتگو ہوگی۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے عمل کی روشنی میں ہمارا مؤقف صحیح ہے۔

فعن افضل الصديقين امام المسلمين ابى بكر ن الصديق انه اخرج مدين من حنطة وان رجلااوى اليه صاعابين النين

افضل الصدیقین' امام المسلمین ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے گندم کے دو مد فطرانہ دیا اور ایک آدمی نے آپ کی خدمت میں دو کے درمیان ایک صاع

پیش کیا۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن ابی شیبہ نے ابی قلابہ سے انہوں نے افضل الصدیقین سے روایت کیا ہے یہ روایت منقطع ہے لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ مرسل حجت ہے۔

عن امیر المؤمنین عثمان رضی الله عنه انه قال فی خطبة ادوا زکوة الفطر مدین من الحنطة

امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے خطبہ میں فرمایا: گندم کے دو مد صدقہ فطر ادا کرو۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے امام طحاوی علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه ووجوه آله الکرام قال علی من جرت علیه نفقتک نصف صاع من بر او صاع من شعیر

امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ ووجوہ آلہ الکرام سے روایت ہے کہ جس کی کفالت آپ کے ذمے ہے اس پر نصف صاع گندم یا ایک صاع جو (صدقہ فطر) واجب ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے طحاوی اور عبد الرزاق نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح کی ایک حدیث حضرت عبد الرزاق نے حضرت ابن مسعود، ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے۔

شوافع ابو سعید رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

عن ابی سعید کنا نخرج علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم زکوٰة الفطر عن کل صغیر و کبیر حرا ومملوک صاعا من طعام اوصاعا من اقط اوصاعا من شعیرا وصاعا من تمرا وصاعا من زبیب فلم نزل نخرجه حتی قدم علینا معاویة حاجا او معتمرا فکلم الناس علی المنبر فکان فیما کلم به الناس علی المنبر ان قال انی اری مدین من بر الشام یعدل صاعامن تمر هنالک قال ابو سعید اما انا فلا ازال اخرجه کما کنت اخرجه (رواه الستہ بالفاظ مختلفۃ)

حضرت ابو سعید سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے دور اقدس میں صدقہ فطر دیا کرتے تھے ہر چھوٹے بڑے آزاد اور غلام کی طرف سے ایک صاع کھانا یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع کشمش اور ہم یہی فطرانہ برابر دیتے رہے حتیٰ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حج یا عمرہ کرنے ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے بات کی۔ آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے جو باتیں کیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ میرے خیال میں شام کی گندم کے دو مد یہاں کے ایک صاع کھجور کے برابر ہیں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں ہمیشہ اتنا ہی صدقہ دے رہا ہوں جتنا دیا کرتا تھا۔

شافعی علماء فرماتے ہیں کہ حدیث میں طعام سے مراد گندم ہے کیونکہ یہ لفظ گندم کے لئے بولا جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ اس کا عطف دوسری اجناس پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طعام سے مراد گندم ہے کیونکہ عطف مباینۃ کا تقاضا کرتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو سعید پورا صاع دیتے رہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ حاکم کی روایت میں صاعامن حنطه کے الفاظ آئے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحاح میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ بعض روایات میں صاعاً من طعام کے الفاظ نہیں۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے شیخین کی روایت ہے کہ ہم صدقہ فطر ادا کرتے تھے جبکہ رسول اللہ ﷺ ہم میں موجود تھے۔ ہر چھوٹے، بڑے آزاد اور غلام کی طرف سے تین اصناف میں۔ کھجور کا ایک صاع۔ پنیر کا ایک صاع اور جو کا ایک صاع۔ ہم اسی طرح صدقہ فطر دیتے رہے حتیٰ کہ حضرت معاویہ آئے اور انہوں نے خیال کیا کہ گندم کے دو مد ایک صاع کھجور کے برابر ہیں۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں برابر اسی طرح صدقہ فطر ادا کرتا رہا۔

''صاعاً من طعام'' کے الفاظ اگرچہ شیخین کی روایت میں آئے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ راوی کا وہم ہے۔

''صاعاً من طعام'' سے گندم مراد لینا ممکن نہیں کیونکہ اگر اس سے مراد گندم ہے تو پھر صدقہ فطر میں اختیار ہوگا چاہے تو کوئی گندم کا صاع دے اور چاہے تو جو کا صاع دے۔ گندم کے دو مد کو کھجور کے ایک صاع کا بدل کہنے کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک واجب چونکہ دوسرے واجبات کے ساتھ مقدار میں موافقت نہیں کر رہا تو اس میں تبدیلی کر دی جائے۔ یہ تو یونہی ہوگا کہ غلام کی قیمت چونکہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانے سے زیادہ ہے اس لئے آدھے غلام کو آزادی دی جائے تاکہ وہ دس مسکینوں کے کھانے کے برابر ہو جائے اور قسم کا کفارہ ادا ہو جائے یا دس مسکینوں کے کپڑوں پر چونکہ ان کے کھانے سے زیادہ خرچ آ رہا ہے لہٰذا صرف پانچ آدمیوں کو کپڑے پہنا دیئے جائیں۔ یہ چیز کب جائز ہوسکتی ہے اور اسے لوگ کب گوارا کر سکتے ہیں؟

حاکم کی روایت صحیح نہیں ہے۔ ابوداؤد علیہ الرحمہ حضرت ابوسعید سے روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فرمایا: ''یا ایک صاع گندم کا'' یہ روایت محفوظ نہیں۔ شیخین کی روایت ''من ثلثة اصناف'' صریح ہے جس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور اقدس میں گندم صدقہ نہیں کی جاتی تھی۔

عن ابن عمر قال لم یکن الصدقة علی عهد رسول الله الا التمر والزبیب والشعیر ولم یکن الحنطة

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ عہد نبوی میں صرف کھجور، کشمش اور جو صدقہ دیئے جاتے تھے۔ (صدقہ میں) گندم نہیں دی جاتی تھی۔

کیونکہ گندم بہت تھوڑی ہوتی جس طرح ہمارے ہاں کھجور یا کشمش کم ہوتی ہے اور ان کا صدقہ نہیں دیا جاتا۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن خزیمہ نے مختصر المسند الصحیح میں روایت کیا ہے۔ اس سے آپ پر یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت جس سے شوافع استدلال کرتے ہیں کسی راوی کا گمان ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں صاعاً من طعام یا مابعد عطف کی تاویل ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں من بیانیہ ہے۔ بعض روایات میں اذو اکا لفظ آیا ہے جو ظاہر ہے، دوسری رائے کی تائید کرتا ہے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے حضرت امام بخاری روایت کرتے ہیں۔

کنا نخرج علی عهد رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یوم الفطر صاعا من طعام قال ابوسعید وکان طعامنا یومئذ

ہم رسول اللہ ﷺ کے دور اقدس میں عید کے دن کھانے کا ایک صاع بطور فطرانہ دیتے تھے۔ ابوسعید فرماتے ہیں کہ اس دور میں ہمارا کھانا، جو، کشمش اور کھجور ہوتی تھی۔

الشعیر والاقط والتمر.

جب ایسا ہے جس طرح ہم نے بیان کیا ہے تو گندم کا ذکر اس حدیث میں نہیں ہے (کیونکہ گندم استعمال ہی نہیں ہوتی تھی) اسی لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نصف صاع گندم کو ایک صاع کھجور کے برابر قرار دیا۔ یا تو اس لئے کہ آپ کو علم ہی نہیں تھا کہ گندم کا فطرانہ کتنا ہے سو آپ نے نصف صاع گندم کو ایک صاع کھجور پر قیاس کیا کیونکہ دونوں کی قیمت برابر تھی اور ظاہر ہے اصل مقصود صدقات میں مالیت ہے یا حضرت معاویہ کو معلوم تھا کہ گندم کا فطرانہ نصف صاع ہے سو آپ نے اس کے مقابلے میں کھجور کے ایک صاع کو بیان کیا تا کہ لوگوں کو اس کی حکمت معلوم ہو جائے (یعنی گندم نصف صاع اس لئے ہے کہ اس کی قیمت ایک صاع کھجور کے برابر ہے) لوگوں نے اس کو اختیار کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو کچھ حضرت معاویہ بیان فرما رہے ہیں وہ نصوص کے موافق ہے۔

نصف صاع گندم کو ایک صاع کھجور کے برابر قرار دینا یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مخصوص نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی نصف صاع گندم دینے کو رواج دیا۔

عن ابن عمر قال کان الناس یخرجون صدقة الفطر علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاعامن شعیر اوصاعامن تمر اوزبیب فلما کان عمر کثر الحنطة بحل عمر نصف صاع من حنطة مکان صاع من تلک الاشیاء (رواہ النسائی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے دور میں جو، کھجور اور کشمش کا ایک صاع صدقہ فطر ادا کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں جب گندم کی بہتات ہوگئی تو آپ نے ان اجناس کے ایک صاع کی جگہ گندم کے نصف صاع کے بارے حکم نامہ جاری فرمایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ نصوص میں گندم کے نصف صاع کا حکم ہے اسی لئے آپ نے گندم کی کثرت پر نصف صاع کا حکم جاری فرمایا۔ لہٰذا نصف صاع گندم واجب الاتباع ہے کیونکہ یہ حکم حضور ﷺ کا ہے۔ اگر آپ اسے امیر المؤمنین کا حکم خیال کرتے ہیں تو پھر بھی آپ کا ارشاد واجب الاتباع ہے کیونکہ آپ نجم ہدایت ہیں اور جب نصوص اور حضرت علی المرتضیٰ کے ساتھ ساتھ دوسرے اکابر صحابہ کرام علیہم الرضوان کے اقوال بھی اس کی موافقت کریں تو مخالفت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا برابر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو صدقہ پر قائم رہنا کچھ نقصان نہیں دیتا کیونکہ زیادہ سے زیادہ اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو نصف صاع گندم والی حدیث کا علم نہیں تھا۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گندم کا نصف صاع واجب نہیں تھا اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ احادیث میں نصف صاع کا تذکرہ ہے اور ان احادیث کو صحاح میں روایت کیا گیا ہے نیز خلفاء راشدین کا عمل بھی ان احادیث کی موافقت کرتا ہے۔

شوافع اپنی تائید میں ایسی احادیث بھی لائے ہیں جن میں ایک صاع گندم کا تذکرہ ہے لیکن وہ تمام احادیث ضعیف ہیں اور استدلال کے قابل نہیں ہیں۔ فتح القدیر میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہے اگر ان کا مطالعہ مقصود ہو تو رجوع کریں۔

فطرانہ ادا کرتے ہوئے کونسا پیمانہ استعمال کریں گے ؟

یاد رکھئے حضرت ابوسعید اور بن عمر رضی اللہ عنہم کی حدیثیں بتاتی ہیں کہ کشمش ٗ جو کی مانند ہے نہ کہ گندم کی مانند اس لئے صحیح قول صاحبین کا ہوگا اس کے بارے گذشتہ صفحات میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اسے واضح کریں گے۔

صاع یا نصف صاع کا اعتبار کرتے ہوئے وزن کا لحاظ رکھا جائے گا یہ رائے شیخین کی ہے لیکن امام محمد کے نزدیک وزن کا اعتبار نہیں ہوگا۔ احادیث میں دو مد کا اطلاق شیخین کے قول کی تائید کرتا ہے۔فتویٰ شیخین کے قول پر ہے۔

صدقہ فطر میں امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ اور امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک عراقی صاع معتبر ہے جس کا وزن آٹھ رطل ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ ایک رطل ہمارے علاقے کے مطابق ایک سو اسی فلوس کا ہے جبکہ ایک فلوس کا وزن اٹھارہ ماشہ ہے۔ (تقریباً دو کلو)

امام ابو یوسف اور امام شافعی علیہما الرحمہ حجازی صاع کو معتبر گردانتے ہیں جس کا وزن پانچ رطل اور ایک رطل کا تیسرا حصہ ($5\frac{1}{3}$ رطل) ہے۔ علماء ان دونوں حضرات کے موقف کے لئے اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیل لہ یا رسول اللہ صاعنا اصغر الصیعان ومدنا اکبر الامداد فقال اللھم بارک لنا فی صاعنا وبارک لنا فی قلیلنا و کثیرنا واجعل لنا مع البرکۃ برکتین.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ! ہمارا صاع سب سے چھوٹا صاع ہے اور ہمارا مد سب سے بڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اے اللہ! ہمارے لئے ہمارے صاع میں برکت فرما۔ اے اللہ! ہمارے قلیل اور کثیر میں برکت فرما اور ہمارے لئے ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں دے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ یہاں چھوٹے صاع سے مراد حجازی صاع ہے۔ ہدایہ میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ عراقی صاع ہاشمی صاع سے چھوٹا ہے۔ ہاشمی صاع بائیس رطل کا ہوتا ہے۔ لوگ ہاشمی صاع استعمال کرتے تھے لیکن فطرانہ دینے کے لئے عراقی صاع استعمال کرتے تھے جو استعمال ہونے والے صاعوں میں سے سب سے چھوٹا صاع شمار ہوتا تھا۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس روایت میں حضور ﷺ کے علاوہ دوسری کوئی دلیل نہیں کہ حجازی صاع معتبر ہے لیکن ایسے معاملات میں سکوت حجت نہیں بن سکتا کیونکہ یہ دینی امر نہیں ہے۔ ان کی دوسری دلیل حضرت حسن بن ولید قرشی کی یہ حدیث ہے۔ حسن بن ولید ایک ثقہ راوی ہیں کہتے ہیں کہ حضرت امام ابو یوسف حج سے واپسی پر ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا میں چاہتا ہوں تمہارے لئے علم کا دروازہ کھول دوں جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ ایک مسئلے کے بارے میں نے چھان بین کی۔ اس غرض سے مدینہ منورہ آیا اور صاع کے بارے پوچھا۔ لوگوں نے

بتایا کہ ہمارا صاع وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کا صاع ہے۔ میں نے پوچھا تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ یہی رسول اللہ ﷺ کا صاع ہے؟ کہنے لگے ہم کل دلیل لائیں گے جب صبح ہوئی تو میرے پاس پچاس بوڑھے آئے جو مہاجرین اور انصار کے بیٹے تھے۔ ہر شخص کے پاس ایک صاع تھا جسے اس نے اپنی چادر کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے والد اور گھر والوں کے حوالے سے بتاتا تھا کہ یہ صاع رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ میں نے دیکھا کہ تمام صاع برابر تھے۔ فرماتے ہیں میں نے اس کا اندازہ لگایا تو وہ پانچ رطل پورے اور رطل کے تیسرے حصے سے کچھ کم نکلا ($5^1/_3$ تقریباً) تو میں نے اس کو قوی دلیل خیال کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ کے قول سے رجوع کرلیا۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس روایت میں جاہل لوگ ہیں اس لئے یہ دلیل نہیں بن سکتی۔ اس کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام ابویوسف نے مدنی صاع کا جب اندازہ لگایا تو وہ $5^1/_3$ رطل سے کچھ کم بنا کیونکہ مدینہ طیبہ کا رطل نسبتاً بڑا تھا۔ عراقی صاع آٹھ رطل کا تھا کیونکہ عراقی رطل چھوٹا تھا۔ اس طرح پانچ اور آٹھ میں جو بظاہر تفاوت تھا وہ رطل میں فرق کی وجہ سے تھا۔ اگر دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے صرف مدنی رطل یا صرف عراقی رطل استعمال کئے جاتے تو عراقی صاع اور مدنی صاع میں کچھ فرق نہ ہوتا۔

بغدادی رطل بیس استار کا ہوتا ہے اور مدنی رطل تیس استار کا۔ اس طرح بغداد کے آٹھ رطل اور مدینہ طیبہ کے $5^1/_3$ رطل دونوں برابر ہیں کیونکہ ہر ایک ایک ساٹھ استار کے برابر ہیں اس لئے یہ "میں نے قول ابوحنیفہ کو ترک کر دیا" صحیح نہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام محمد علیہ الرحمہ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

عراقی صاع کا معتبر ہونا صحیحین وغیرھا کتب کی احادیث سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک صاع پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے اور ظاہر ہے یہ معجزہ نہیں تھا۔ $5^1/_3$ رطل پانی غسل کے لئے ناکافی ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مد یعنی دو رطل پانی سے وضو فرمایا کرتے تھے اور ایک صاع یعنی آٹھ رطل پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے۔" فتح القدیر میں ہے کہ اس حدیث کو اس مقدار کے ساتھ حضرت انس اور ام المؤمنین رضی اللہ عنہما سے تین طرق کے ساتھ دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے ضعیف بتایا ہے۔ اس حدیث کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ابن عدی نے روایت کیا ہے اور انہوں نے بھی اس کی سند کے حوالے سے اسے ضعیف گردانا ہے۔

اس کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کا صاع آٹھ رطل کا تھا۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حسن بن صالح رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

جو اور گندم کی بجائے ان کا آٹا یا ستو یا قیمت دی جاسکتی ہے

جو اور گندم کی جگہ ان کا آٹا اور ستو بھی دیئے جاسکتے ہیں۔ گندم کا آٹا اور اس کا ستو گندم کی طرح نصف صاع اور جو کا آٹا جو کی طرح ایک صاع پورا دینا ہوگا۔ ضروری نہیں کہ صدقہ فطر میں اجناس ہی دی جائیں۔ جنس کی جگہ اس کی قیمت دینا بھی جائز ہے۔ امام ابویوسف علیہ الرحمہ کے بقول تو قیمت دینا بہتر ہے۔ ہدایہ میں مذکور ہے کہ یہ قول فقیہ ابوجعفر کا اختیار کردہ ہے کیونکہ قیمت سے بآسانی ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ قیمت

دینے کو جائز نہیں سمجھتے جس طرح زکوۃ میں قیمت دینے کے حق میں نہیں۔

بخل کی مذمت

بخل سے مراد دولت کی ہوس ہے جو انسان کو بھلائی کے کاموں میں مال خرچ کرنے سے روکتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی بیماری اور خطرناک روگ ہے۔ بخل تمام گناہوں اور شرارتوں کا سرچشمہ ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ ایک بخیل شخص سود جیسی لعنت سے کسی صورت نہیں بچ سکتا۔ وہ دولت کی ہوس میں ہر گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ لین دین میں کمی بیشی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ حیلوں بہانوں سے اپنی دولت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایسی بری خصلت ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ گناہ کبیرہ میں سے ایک گناہ بخل ہے بلکہ اکثر کبائر کا دروازہ ہے' انسان کو برے اخلاق سکھاتا ہے اور اعلیٰ کردار سے روکتا ہے۔ مثلاً مہمان نوازی اور ایسے دوسرے اخلاق حمیدہ سے بخیل تہی دامن ہوتا ہے۔

بخیل کی مذمت احادیث کی روشنی میں

بخل کی مذمت میں قرآن کی قطعی نصوص اور احادیث متواترہ وارد ہوئی ہیں۔ بخل کا مذموم ہونا ان امور کی طرح ہے جو ضروریاتِ دین شمار ہوتے ہیں۔ ہم ذیل میں چند احادیث پیش کرتے ہیں۔

فعن ابن عمر قال خطب رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقال اياكم والشح فانما هلك من كان قبلكم بالشح امرهم بالبخل فبخلوا امرهم بالفجور ففجروا. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطاب کیا اور فرمایا: حرص سے بچو آپ لوگوں سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ حرص کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ حرص نے ان کو بخل کا حکم دیا تو انہوں نے بخل کیا۔ حرص ہی نے انہیں قطع تعلقی کا حکم دیا تو انہوں نے قطع تعلقی کی۔ حرص کے حکم سے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہوئے۔

عن الخدرى قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم خصلتان لا تجتمعان فى مومن البخل وسوء الخلق (رواہ الترمذی)

حضرت خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندۂ مؤمن میں بیک وقت دو خصلتیں نہیں پائی جا سکتیں ایک بخل اور دوسری بد خلقی۔

عن ابى هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يقول العبد مالى مالى وانما له من ماله ثلث ما اكل فافنى اولبس فابلى اواعطى فاقنى وماسوى ذلك فهو ذاهب وتاركه للناس. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انسان میرا مال میرا مال کہتا ہے حالانکہ اس کے مال میں سے صرف تیسرا حصہ اس کا ہوتا ہے۔ وہ جو اس نے کھا لیا اور فنا کر دیا یا وہ جو اس نے پہن کر بوسیدہ کر دیا یا وہ جو (راہ خدا میں) دیا اور اسے محفوظ کر لیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ہاتھ سے نکل جانے والا ہے وہ اسے

دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لعن اللہ عبد الدینار ولعن اللہ عبد الدرھم. (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے درہم و دینار کی پوجا کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔

عن ابی مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایکم مال وارثہ احب الیہ من مالہ قالوا یا رسول اللہ مامن احد الاو مالہ احب الیہ فقال ان مالہ ما قدم ومال وارثہ ما اخر. (رواہ البخاری)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جس کو اپنے مال کی نسبت اپنے وارث کا مال زیادہ عزیز ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ ہر شخص اپنے ہی مال کو عزیز رکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: انسان کا اپنا مال وہ ہے جو اس نے آگے بھیج دیا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو پیچھے رہ گیا۔

حضرت ابووائل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابو ہاشم ابن عتبہ بیمار تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کو تشریف لائے دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پوچھنے لگے خالو جان آپ کیوں رو رہے ہیں۔ کیا (جسم میں) کہیں درد ہے یا دنیا (میں رہنے کی) حرص ہے۔ فرمانے لگے ایسی کوئی بات نہیں لیکن میں نے حضور ﷺ سے سنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عھد الینا عھد الم آخذبہ قال وما ذلک قال سمعتہ یقول انما یکفی منجمع المال خادم ومرکب فی سبیل اللہ واخذنی الیوم قد جمعت. (رواہ الترمذی)

آپ ﷺ نے ہم سے ایک عہد لیا جسے میں پورا نہیں کر سکا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا وہ وعدہ کیا تھا؟ فرمانے لگے میں نے آپ ﷺ کو فرماتے سنا کہ صرف اتنا مال جمع کرنا کافی ہے۔ ایک خادم اور جہاد فی سبیل اللہ کیلئے ایک گھوڑا۔ آج میں نے سب کچھ جمع کر رکھا ہے۔

امام نسائی بھی اس طرح کی ایک حدیث روایت کرتے ہیں۔

جامع الاصول میں ہے کہ رزین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ جب آپ کا وصال ہوا تو جو کچھ پیچھے چھوڑا تھا وہ صرف تیس درہم تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس سامان میں ایک بڑا پیالہ بھی تھا جس میں آپ آٹا بھی گوندھتے تھے اور کھانا بھی کھاتے تھے۔

عن ابی ھریرۃ قالقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مثل البخیل والمتصدق مثل رجلین علیھما جبتان من حدید اذا ھم المتصدق بصدقۃ اتسعت علیہ حتی یعفی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بخیل اور صدقہ کرنے والا ان دو آدمیوں کی مانند ہیں جن پر لوہے کے جبے ہوں۔ جب صدقہ کرنے والا صدقہ دینے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ جبہ اس پر

اثره و اذا هم البخيل بصدقة تقلصت عليه و انضمت يداه الى تراقيه انقبضت كل حلقة الى صاحبتها قال فسمعت رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم يقول فيجتهد ان يوسعها فلا يستطيع. (رواہ مسلم)

کھل جاتا ہے حتیٰ کہ اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور جب بخیل صدقہ دینے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ جبہ اس پر تنگ ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ گریبان سے مل جاتے ہیں۔ ہر حلقہ دوسرے سے جڑ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا بخیل کوشش کرتا ہے کہ لوہے کا وہ جبہ اس پر کھل جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

اس موضوع پر اور بھی بہت ساری احادیث ہیں جن کو یہاں بیان کرنا آسان نہیں۔ لہٰذا انہیں چند احادیث پر اکتفا کرتا ہوں۔

بخل کی اقسام

بخل کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض قسمیں بہت شدید نوعیت کی ہیں۔ سب سے بڑا بخل یہ ہے کہ انسان دوسروں کو بخل کا حکم دے۔

ربِ قدوس ارشاد فرماتا ہے:

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ. (النساء:۳۷)

جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں۔

یہ بخل کی شدید ترین صورت ہے۔ ایسا شخص اس گناہ کا بھی بوجھ اٹھاتا ہے جو لوگ اس کے حکم سے کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے غرباء و مساکین کی جو دل شکنی ہوتی ہے اور انہیں تکلیف پہنچتی ہے اس کا گناہ بھی اسی شخص کے ذمہ ہوتا ہے۔

بخل کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان حسد میں مبتلا ہو اور خواہش کرے کہ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس کا ہو جائے۔ حسد بری بلا ہے اللہ کریم نے اس سے منع فرمایا ہے اور حسد کی شدید ترین کیفیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال کو ہر جائز و ناجائز طریقہ سے ہڑپ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ حضرت طاؤس فرماتے ہیں کہ بخل یہ ہے کہ انسان جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے اس کو خرچ کرنے سے کنجوسی برتے اور شح اس کو کہتے ہیں کہ لوگوں کے مال حلال و حرام طریقے سے ہتھیانے کی کوشش کرے۔ اسے ابو حاتم نے روایت کیا ہے۔

اکثر بخیل لوگ یہ حماقت کرتے ہیں کہ مال جمع کرتے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ حرام طریقوں سے جمع کیا گیا یہ مال مرنے کے بعد وارث لے جائیں گے۔ یہ بہت بڑی حماقت ہے کیونکہ مال جمع کرنے کا حساب تو اسے دینا ہوگا لیکن اس سے نفع اندوز دوسرے ہوں گے مؤاخذہ تو بخیل سے ہوگا کہ یہ مال کس کس ذریعہ سے کمایا لیکن اس سے لطف اندوز وارث ہوں۔ ان سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ مال کہاں سے لیا؟ وارث اگر بخل نہیں کریں گے تو ان پر مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا۔ اس سے بڑی حماقت بھی کوئی ہو سکتی ہے؟

سب سے بڑا بخل تو یہ ہے کہ انسان زکوٰۃ ادا نہ کرے۔ یقیناً ایسا شخص دنیا اور آخرت میں ذلیل و خوار ہوگا اور عذاب عظیم سے دوچار ہونا پڑے گا دنیا میں ذلت و رسوائی یہ ہے کہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی جائے اور انہیں کیف کردار تک پہنچایا جائے گا اور ان کا مال غنیمت خیال کرتے ہوئے لوٹ لیا جائے گا۔ احناف اور امام احمد کی رائے یہ ہے کہ انہیں قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ زکوٰۃ دیں۔ اگر وہ قید ہونے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کریں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ اگر ان کے پاس قوت ہو اور اسلامی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائیں تو ان سے اسی طرح جہاد کیا جائے گا جس طرح کافروں سے جہاد کیا جاتا ہے۔

امام مالک اور امام شافعی علیہما الرحمہ فرماتے ہیں کہ اگر امام زکوٰۃ کا مطالبہ کرے اور وہ اس کے مقابلے کو ٹھکرا دیں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ اگر وہ اس مطالبے کے جواب میں یہ کہیں کہ وہ خود مستحقین کے ہاتھ میں زکوٰۃ کا مال دیں گے تو ظاہر ہے وہ ہمارے ساتھ ہیں کیونکہ اغنیاء پر یہی فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ مصارف کے حوالے کریں۔ اگر وہ زکوٰۃ دینے سے انکار کریں اور کہیں کہ ہم نہ تو حکومت کو دیتے ہیں اور نہ ہی زکوٰۃ کے مستحقین کے حوالے کرتے ہیں تو وہ اسلام کے ایک رکن کا انکار کر رہے ہیں لہٰذا ان سے جنگ ہوگی۔ اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ وہ حکومت کو دینے سے انکار کریں اور کہیں کہ ہم خود مستحقین تک پہنچائیں گے لیکن زکوٰۃ دے چکنے کے بعد حکومت مطالبہ کرے اور وہ دوبارہ دینے سے انکار کر دیں تو بالاجماع ان کے خلاف جنگ نہیں ہوگی کیونکہ وہ فریضہ ادا کر چکے ہیں اور حکومت اس کا مطالبہ اس وقت کر رہی ہے جب وہ اس فریضہ سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ہم یہ زکوٰۃ مستحقین کے حوالے خود کریں گے اور ایسا نہ کریں تو بالاجماع ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔

زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنا

مانعین زکوٰۃ سے جنگ اجماع صحابہ سے ثابت ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں سے جنگ کی جائے تو عمر فاروق نے کہا کہ آپ ان کے خلاف جنگ کیسے کر سکتے ہیں حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کروں حتیٰ کہ وہ لا الہ الا اللہ کہنے لگیں۔ جب وہ یہ کلمہ کہیں گے تو وہ ہم سے اپنے خون اور مال محفوظ کر لیں گے سوائے قصاص کے۔ افضل الصدیقین ابوبکر صدیق نے فرمایا اگر وہ ایک بکری کا بچہ بھی دینے سے انکار کریں گے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں ان سے جنگ کروں گا۔ زکوٰۃ لا الہ الا اللہ کا حق ہے۔ خدا کی قسم میں اس شخص سے لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس چیز کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا ہے جس کے لئے ان کے سینہ کو کھول دیا ہے۔ میں جان چکا ہوں کہ یہی حق ہے۔ (اس طرح) افضل الصدیقین کی رائے اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے ایک ہوگئی کہ ان کے خلاف جنگ ہوگی۔ اس کے بعد تمام صحابہ کرام نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کرنے پر متفق ہو گئے پھر اس وقت تک تلوار بے نیام رکھی جب تک ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے گردنیں خم کر کے زکوٰۃ نہ دے دی اور اسی طرح

شریعت مطہرہ کی اتباع پر کمر بستہ ہو گئے جس طرح رسول اللہ ﷺ کے دور اقدس میں تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر صدیق کو بہترین جزاء دے جو اس قادر مطلق نے صدیقین کو دی ہے۔ یہ واقعہ بڑی شہرت کا حامل ہے۔ اس کو صحاح اور سنن نے بڑی شرح وبسط سے روایت کیا ہے۔

بخیل مانع زکوٰۃ کا عذاب الیم کا مستحق ہونا نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔

رب قدوس کا ارشاد ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

(آل عمران: ۱۸۰)

اور جو بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی۔ ہرگز اسے اپنے لئے اچھا نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے لئے برا ہے۔ عنقریب وہ جس میں بخل کیا تھا قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق ہوگا۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم من اتاه الله ما لا فلم يؤد زكوته مثل له شجاع اقرء له زبيبتان يطوقه يوم القيمة فياخذبلهزمته يعني يشدقه يقول انامالك انا كنزك ثم تلاهذه الآية وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (رواہ البخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور اس نے اس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو وہ مال گنجا[1] سانپ بن کر قیامت کے دن اس کے گلے سے لپٹ جائے گا۔ اس کی آنکھوں اوپر دو نقطے[2] ہوں گے وہ اس کے جبڑوں کو کاٹ کاٹ کر کھا جائے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں۔ تیرا خزانہ ہوں۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ

عن ابی مسعود عن النبی صلى الله عليه وسلم قال مامن رجل لايؤدی زكوة ماله الامثل له يوم القيمة شجاعا اقرع منه وهو يتبعه فيقول اناكنزك حتى يطوق به في عنقه ثم قرء النبي صلى الله عليه وآله وسلم مصداقه من كتاب الله وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ.

حضرت ابن مسعود رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو بھی آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا قیامت کے روز اس کا یہ مال گنجا سانپ بن کر اس کا پیچھا کرے گا اور کہے گا میں تیرا جمع کردہ مال ہوں حتیٰ کہ اس کی گردن سے لپٹ جائے گا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے اس کے بارے یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ.

اور رب قدوس کا ارشاد ہے:

---

[1] زیادہ زہریلا ہونے کی نشانی ہے۔
[2] سانپ کی آنکھوں کے اوپر سیاہ نقطے بھی اس کے زیادہ زہریلا ہونے کی علامت ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ o يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ o

(التوبۃ: ۳۴-۳۵)

اور وہ کہ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی۔ جس دن وہ تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں پھر ان سے داغیں گے ان کی پیشانیاں اور کروٹیں اور پیٹھیں۔ یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لئے جوڑ کر رکھا تھا۔ اب چکھو مزا اس جوڑ کر رکھنے کا۔

عن ابی هريرة مامن صاحب ذهب ولافضة لايؤدى حقها الاجعلت له يوم القيمة صفايح ثم احمى عليها فى نار جهنم ثم كوى بها جبينه وجبهته وظهره فى يوم كان مقداره خمسين الف سنة حتى يقضى الله فيرى سبيله اما الى الجنة واما الى النار قيل يا رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فالابل قال ولاصاحب ابل لايؤدى منها حقها ومن حقها حلبها يوم ورودها الا اذا كان يوم القيمة نطح له بقاع فرفر اوفرما كانت لا يفصل منها فصيلا واحد ايطأ باخفا فها وتعضه بافواهها كلما وردا ولها رد عليه اخرا هافى يوم كان مقداره خمسين الف سنة حتى يقضى بين العباد فيرى سبيله اماالى الجنة واما الى النار قيل يارسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فالبقرو الغنم قال لا صاحب بقر ولا غنم لايؤدى حقها الا اذا كان يوم القيمة نطح له بقاع فرفر لاينفذ منها شيئاليس فيها عفصاء ولاجلجاء ينطحه بقرونها ويطأ o باظلا فها كلمامرت اولها ردعليه اخرى هانى يوم كان مقداره

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سونے چاندی کا مالک جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا قیامت کے روز یہ سونا چاندی اس کے لئے تختے بن جائیں گے پھر انہیں جہنم کی آگ سے گرم کیا جائے گا اور ان تختوں کے ساتھ ان کی پیشانیوں، چہروں اور پیٹھوں کو پورا دن داغا جائے گا۔ جس کی مقدار ایک ہزار سال کی ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دے گا اور وہ اپنا راستہ جنت کی طرف یا جہنم کی طرف دیکھ لے گا۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! اونٹوں کے بارے بھی کیا یہی حکم ہے؟ فرمایا: اونٹوں کا مالک جو ان کی زکوٰۃ نہیں دے گا اونٹوں کا حق یہ بھی ہے کہ پانی پلانے کے دن اونٹنیوں کا دودھ دوہ کر غریبوں کو پلایا جائے۔ قیامت کے دن (زکوٰۃ نہ دینے والے کو) ایک چٹیل زمین پر اوندھا لٹا دیا جائے گا اس وقت وہ اونٹ آئیں گے درآنحالیکہ وہ بہت فربہ ہوں گے اور ان میں سے کوئی بچہ تک گم نہیں ہو گا وہ اس شخص کو اپنے کھروں سے روندیں گے اور اپنے منہ سے کاٹیں گے۔ ان کا ایک ریوڑ گزر جائے گا تو دوسرا آ جائے گا۔ پچاس ہزار سال کے برابر دن میں یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ جب لوگوں کے فیصلے ہو جائیں گے تو اسے جنت یا جہنم کا راستہ دکھا دیا جائے گا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ گائے اور بکریوں والوں کا کیا ہو گا؟ فرمایا جو گائے اور بکریوں والا ان کا حق (زکوٰۃ) ادا نہیں کرے گا، قیامت کے دن اسے چٹیل

خمسین الف سنة حتی یقضی بین العباد فیری سبیله اما الی الجنة واما الی النار قیل یا رسول الله فالخیل قال الخیل ثلثه هی الرجل وزرولرجل سترو لرجل اجر فاما الذی له اجر فرجل ربطها فی سبیل الله فاطال لها فی مرج او روضة فما اصابت فی طیلها من المرج اوالروضة کانت له حسنات ولوانه انقطع طیلها فاستنت شرفا او شرفین کانت له آثارها وارو اثها حسنات ولو انها مرت بنهر فشربت منه ومن لم یردان یسقیها کان ذلک حسنات له فهی لذلک الرجل اجرورجل ربطها تغنیا وتعففا ثم لم ینس حق الله فی رقابها ولاظهور هافهی لذلک الرجل سترورجل ربطها فخر اوریاء ونواء لاهل الاسلام فهی علی ذلک وزر وسئل رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم عن الحمر فقال ما انزل الله علی فیها شئی الاهذه الآیة الجامعة الفاذة وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ. (رواہ البخاری ومسلم)

میدان میں منہ کے بل لٹا دیا جائے گا۔ تمام گائے اور بکریاں اس کو اپنے کھروں سے روندیں گی اور اس کو سینگوں سے ماریں گی۔ اس روز ان میں کوئی الٹے سینگوں والی ہوگی نہ بغیر سینگوں والی اور نہ ٹوٹے ہوئے سینگوں والی ایک ریوڑ گزرنے کے بعد فوراً دوسرا ریوڑ آ جائے گا اور پچاس ہزار برس کے برابر دن میں یونہی ہوتا رہے گا۔ حتیٰ کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا پھر اسے جنت یا دوزخ کا راستہ دکھا دیا جائے گا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! گھوڑوں والوں کا کیا ہوگا؟ فرمایا: ان کی تین قسمیں ہیں۔ مالک کے لئے ستر ہوتے ہیں۔ مالک کے لئے اجر ہوتے ہیں یا مالک کے لئے بوجھ جس گھوڑے کو مالک نے دکھلاوے، فخر اور مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے کے لئے رکھا ہو وہ باعث بوجھ ہے۔ راہ خدا میں جہاد کے لئے باندھا ہے تو ستر ہوگا بشرطیکہ وہ ان حقوق کو نہ بھولا ہو جو گھوڑوں کی پیٹھوں اور گردنوں سے وابستہ ہیں اور جو گھوڑے مالک کے لئے اجر ہیں وہ گھوڑے ہیں جن کو مالک نے راہ خدا میں مسلمانوں کے لئے باندھا ہو۔ کسی چراگاہ یا باغ میں یہ گھوڑے جو کھائیں گے، پیشاب کریں گے اور لید کریں گے اس کے برابر مالک کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اگر رسی تڑا کر ایک دو ٹیلوں کا چکر لگائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے قدموں کے نشانات اور لید کے برابر مالک کو نیکیاں دے گا۔ اگر مالک گھوڑوں کو لے کر نہر سے گزرے اور بغیر ارادہ کے بھی گھوڑے پانی پی لیں تو اس پانی کے برابر اللہ تعالیٰ مالک کو ثواب دے گا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! گدھوں کے بارے کیا حکم ہے فرمایا ان کے بارے کوئی حکم نازل نہیں ہوا البتہ یہ جامع آیت ہے۔ جس نے ذرا برابر نیکی کی وہ اس کی جزاء دیکھے گا اور جس نے ذرا برابر برائی کی اس کی سزا پائے گا۔

فضائل صدقات

ربِ قدوس کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرة:۲۷۴)

وہ جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات میں اور دن میں چھپے اور ظاہر ان کے لئے ان کا انعام ہے ان کے رب کے پاس ان کو نہ کچھ اندیشہ ہو نہ غم۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ. (البقرة:۲۷۶)

اللہ ہلاک کرتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو۔

صدقہ دفع بلیات، عفوبیات اور حصول برکات میں ایک عجیب تاثیر رکھتا ہے۔ اس کی فضیلت میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند احادیث یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

فعن عدی بن حاتم قال قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم اتقوا النار ولو بشق تمر

حضرت عدی بن حاتم طائی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آگ سے بچو اگر چہ کھجور کے کچھ حصہ کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔

اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث متعدد طرق اور کئی اسانید سے روایت کی گئی ہے حتیٰ کہ یہ تواتر کے قریب پہنچ جاتی ہے۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم مانقص مال من صدقة وما زاد الله عبد بعضو الاعزاوماتواضع عبد لله الارفعه الله. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صدقے سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی اور اس سے بندے کی عزت وتوقیر میں اللہ تعالیٰ اضافہ ہی فرماتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بالیقین اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ فرماتا ہے۔

عن امیر المؤمنین علی کرم الله وجهه بادروا بالصدقة فان البلاء لایتخطا.

امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صدقہ کرنے میں جلدی کرو کیونکہ مصیبت صدقہ کو نہیں پچھاڑ سکتی۔

یہ حدیث جامع الاصول میں مذکور ہے۔

عن ام نجیدان رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم قال ردوا المسکین ولوبظلف محترق. (رواہ مالک)

ام نجید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسکین کو واپس کرو اگر چہ جلے ہوئے کھر کے ساتھ (یعنی معمولی چیز)۔

عن ابی هریرة قال یا رسول الله ای الصدقة افضل قال جهد المقل وابدأبمن یعول.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا: جو کم مال والا تکلیف اٹھا کر دے اور پہلے ان لوگوں کو دے جن کا خرچ تیرے ذمے ہے۔

عن ابی هریرة یبلغ به النبی صلی الله علیه و آله وسلم تبارک وتعالی یا ابن آدم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ بات ہم تک پہنچایا کرتے تھے کہ رب قدوس کا

انفق انفق علیک وقال یمین الله ملآن نحاء لایفیضها سخاء اللیل والنهار ارأیتم ما انفق مذخلق السموت والارض فانه لم یفض ما بیمینه قال وعرشه علی الماء وبیده الاخری القبض یرفع ویخفض. (رواہ مسلم)

ارشاد ہے: اے آدم کی اولاد! خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے سخی ہے' رات دن خرچ کرنے سے اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بھلا بتاؤ تو سہی جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کس قدر خرچ کر چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اس کا عرش پانی پر ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں صفت قبض ہے۔ جسے چاہتا ہے بلند کرتا ہے جسے چاہتا ہے پست کرتا ہے۔

عن ابی هریرة قال قال رجل لاتصدقن اللیلة بصدقة فخرج بصدقته فوضعها فی یدزانیة فاصبحوا یتحدثون تصدق اللیلة علی زانیة قال اللهم لک الحمد علی زانیة لا تصدقن بصدقة فخرج بصدقته فوضعها فی یدغنی فاصبحوا یتحدثون تصدق علی غنی قال اللهم لک الحمد علی غنی لاتصدقن بصدقة فخرج بصدقته فوضعها علی یدسارق فاصبحوا یتحدثون تصدق علی سارق فقال اللهم لک الحمد علی زانیة وعلی غنی وعلی سارق فقیل له اما صدقتک فقد قبلت اما الزانیة فلعلها تستعف بها عن زناها ولعل الغنی یعتبر فینفق مما اعطاه الله ولعل السارق یستعف بها عن سرقته هذا.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا میں رات کو ضرور صدقہ کروں گا۔ وہ صدقہ لے کر نکلا اور اسے ایک زانیہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو لوگ کہہ رہے تھے رات کے وقت ایک زانیہ کو صدقہ دیا گیا ہے۔ وہ کہنے لگا اے اللہ! سب تعریفیں تیرے لئے ہیں۔ زانیہ کو صدقہ کا مال دے بیٹھا ہوں۔ اب میں ضرور صدقہ کروں گا۔ وہ اپنے صدقہ کا مال لے کر نکلا اور ایک غنی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ صبح لوگ کہہ رہے تھے ایک غنی کو صدقہ دیا گیا ہے' صدقہ دینے والا کہنے لگا اے اللہ! تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں' میں ایک غنی کو صدقہ دے بیٹھا ہوں' اب میں ضرور صدقہ کروں گا' گھر سے صدقہ لے کر نکلا اور ایک چور کے ہاتھ پر رکھ دیا' لوگوں نے باتیں کیں کہ چور کو صدقہ دیا گیا' کہنے لگا اے اللہ! سب تعریفیں تیرے لئے ہیں' ایک زانیہ' غنی اور سارق کو صدقے کا حصہ دے دیا۔ اس شخص سے کہا گیا' آپ کا صدقہ قبول ہوا' زانیہ ہوسکتا ہے زنا کو چھوڑ کر پاک دامنی اختیار کرے۔ اس صدقہ کے ذریعے ہوسکتا ہے غنی عبرت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال سے وہ بھی خرچ کرنے لگے اور ہوسکتا ہے تیرے دیئے گئے صدقہ کے طفیل چور چوری کو ترک کر کے راہ مستقیم کو اختیار کر لے۔

زکوٰۃ کے بارے اتنا ہی کہنا ہے۔

الحمد لله رب العالمین.

روزہ کا بیان

روزہ کی فضیلت

روزہ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ اس کے فضائل حد شمار سے باہر ہیں۔ تمام مسلمان اس کی اہمیت سے واقف ہیں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنۃ عشرۃ امثالھا الی سبعۃ مأتہ ضعف قال اللہ عزوجل الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ یدع طعامہ وشرابہ وشھوتہ من اجلی للصائم فرحتان فرحۃ عند فطرہ وفرحۃ عند لقاء ربہ لخلوف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک (رواہ الستہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابن آدم کے ہر عمل کا اسے دس گنا سے سات سو گنا تک ثواب ملتا ہے رب قدوس فرماتے ہیں کہ: سوائے روزہ کے، روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزاء دوں گا۔ وہ میرے لئے اپنا کھانا، پینا اور خواہش نفسانی کو ترک کرتا ہے روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی اسے روزہ افطار کرتے وقت حاصل ہوتی ہے اور دوسری خوشی اسے اپنے پروردگار سے ملاقات کرتے وقت حاصل ہوگی۔ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے

عن ابی ھریرۃ و ابی سعید قالا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یقول اللہ ان الصوم لی وانا اجزی بہ للصائم فرحتان اذا افطر فرح واذا لقی ربہ فجزاہ فرح ولخلوف الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ارشادِ خداوندی ہے روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزاء دوں گا۔ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جب وہ روزہ افطار کرتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملاقات کرے گا تو اس کی جزاء خوشی ہوگی۔ روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی خوشبو سے زیادہ اچھی ہے۔

عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قال اینا الصیام جنۃ یستجن بھا العبد من النار وھولی وانا اجزی بہ وسمعت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ ہمارے رب کا فرمان ہے کہ: روزے ڈھال ہیں۔ ان کے ذریعے انسان آگ سے رہائی حاصل

النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم الصیام جنۃ حصیفۃ من النار (رواہ مسلم والنسائی)

کرتا ہے۔ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزاء دوں گا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ روزے جہنم سے مضبوط ڈھال ہیں۔

محدثین فرماتے ہیں کہ انا اجزی بہ معروف کا صیغہ ہے جس کا معنی یہ ہے کہ میں روزے کی پوری پوری جزاء دوں گا بخلاف دوسرے اعمال کے۔

ایوب بن حسان واسطی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی سے سنا کہ اس نے سفیان بن عیینہ سے سوال کیا۔ اے ابو محمد! حضور ﷺ نے اپنے رب کے ارشاد کل عمل ابن آدم لہ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ کو کس معنی میں بیان کیا ہے؟ تو ابن عیینہ نے فرمایا یہ حدیث عمدہ ترین اور محکم ترین احادیث میں سے ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندے کا محاسبہ کرے گا اور اس کے ذمے جتنے گناہ ہوں گے اس کے سارے اعمال ان کے بدلے میں دے دے گا حتیٰ کہ صرف روزہ بچ جائے گا پس اللہ تعالیٰ اس کے باقی تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا اور اسے جنت میں داخل فرما دے گا۔ اسے امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ یہ ہے اس کی تفسیر کہ روزہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور وہی اس کا اجر دے گا۔ نہ وہ اس کے اجر کو ضائع کرے گا اور نہ ہی اس کو آدمی کے گناہوں میں دے گا بلکہ روزہ دار کو اس کی پوری پوری جزاء دے گا۔

صوفیاء کرام علیہم الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ روزہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ سو اس کا صلہ خود ذات باری تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ اور قیامت کے دن دیدار الٰہی روزہ دار کی جزاء ہوگی اسی لئے بعض لوگ اجزی بہ (صیغہ مجہول) پڑھتے ہیں۔ یعنی میں ہی اس کی جزاء ہوں۔

روزہ کی تعریف

صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک تین خواہشوں (کھانا' پینا اور جماع) سے اپنے آپ کو روکنا روزہ کہلاتا ہے کیونکہ رب قدوس کا ارشاد ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ. (البقرۃ:۱۸۷)

کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے ظاہر ہو جائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے دوڑے سے (پو پھٹ کر) پھر رات آنے تک روزے پورے کرو۔

فجر سے مراد صبح صادق ہے' صبح کاذب نہیں کیونکہ کاذب رات میں شامل ہے۔

عن سمرۃ بن جندب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لایمنعکم من سحورکم اذان بلال ولاالفجر المستطیل ولکن الفجر المستطیر فی الافق

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلال کی اذان تمہیں سحری کھانے سے نہ روکے اور نہ ہی وہ روشنی جو لمبائی میں پھیلتی ہے بلکہ فجر وہ روشنی ہے جو افق پر پھیل جاتی ہے۔

(رواہ مسلم وابوداؤد والترمذی)

اس کے علاوہ کئی اور احادیث بھی ہیں۔

اکثر مشائخ کے نزدیک روزہ میں طلوع فجر کا اعتبار ہوگا جبکہ بعض علماء کے خیال میں روشنی کے نمودار ہوتے ہی روزہ شروع ہو جائے گا اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ اگر فجر طلوع ہوگئی لیکن روشنی پھیلنے سے پہلے کسی نے کچھ کھا پی لیا تو روزہ ہو جائے گا۔ برجندی کی شرح مختصر الوقایہ میں ہے کہ روزہ کے لئے پہلی روایت کو علماء نے اختیار کیا ہے اور نماز کے لئے دوسری کو دوسری روایت صاحب فتوحات حضرت شیخ اکبر قدس سرہ کا مذہب ہے۔ یہ روایت نص کے ظاہر سے موافقت رکھتی ہے کیونکہ رب قدوس کا ارشاد ہے:

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ (البقرۃ:۱۸۷) حتیٰ کہ تمہارے لئے سفید دھاگا (کالے دھاگے سے) ظاہر ہو جائے۔

یہ نہیں فرمایا کہ طلوع ہو جائے۔ اس کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔

قال هما فجران فاما الذی یسطع فی السماء فلیس یحل ولا یحرم شیئا لکن الفجر الذی یتبین علی رؤس الجبال هو الذی یحرم الشراب. (رواہ عبدالرزاق)

فرماتے ہیں: فجر دو قسم کی ہے' ایک وہ فجر ہے جس کی روشنی آسمان پر چھا جاتی ہے لیکن یہ روشنی کسی چیز کو حلال اور حرام نہیں کرتی دوسری وہ فجر ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پہ ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ فجر ہے جو پینے کو حرام کر دیتی ہے۔

روزہ کے افطار کا وقت

روزے کا وقت ختم ہونے میں غروب آفتاب معتبر ہے۔ جونہی سورج غروب ہوتا ہے' رات شروع ہو جاتی ہے اور بالاجماع افطار کرنا حلال ہو جاتا ہے لیکن شیعوں کا امامیہ فرقہ کہتے ہیں کہ جب تک ستارے نظر نہیں آ جاتے اور تاریکی چھا نہیں جاتی' افطار جائز نہیں ہوتا۔

اہل سنت کی دلیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے فرماتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم اذا قبل الليل وادبر النهار وغابت الشمس فقد افطر الصائم. (رواہ البخاری ومسلم)

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: جب رات آ جائے اور دن پیٹھ پھیرے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار روزہ افطار کر دے۔

عن عبد الله بن ابی اوفی قال كنا مع رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فی سفر فی شهر رمضان فلما غابت الشمس قال یا فلان انزل فاجدح لنا قال یا رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ان علیک نهارا قال انزل فاجدح لنا قال فنزل فجدح

عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ جب سورج غروب ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے فلاں! اتریئے اور ہمارے (قافلہ والوں کے لئے) ستو بھگویئے۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ ابھی تک تو دن ہے۔ فرمایا: اترو اور ہمارے لئے ستو بھگویئے۔ راوی

فاتی بہ فشرب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدیہ اذا جاء الشمس من ھھنا وجاء اللیل من ھھنا فقد افطر الصائم۔

(رواہ البخاری ومسلم)

فرماتے ہیں کہ وہ صحابی اترے اور انہوں نے ستو بھگوئے پھر وہ ستو کا یہ پانی لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے' آپ نے اپنے ہاتھ میں لے کر (ستو ملا وہ پانی) پیا اور دونوں ہاتھوں کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جب سورج یہاں تک پہنچ جائے اور رات یہاں تک آ جائے تو روزہ دار روزہ افطار کر دے۔

بدکلامی اور جھوٹ سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے

روزہ دار کے لئے گالی گلوچ' لڑائی جھگڑا' بدکلامی' دشمنی اور اس کی وجہ سے شور وغل کرنا اور ہزیان بکنا سب مکروہ ہیں کیونکہ شیخین کی مذکورہ حدیث میں یہ بھی ہے۔ ''روزے ڈھال ہیں جب تم میں سے کوئی شخص روزہ سے ہو تو نہ تو بری باتیں کرے اور نہ ہی شور وغل کرے۔ اگر کوئی اسے گالی دے یا جھگڑا کرے تو وہ کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔''

روزہ دار کے لئے جھوٹ بولنا ناپسندیدہ ہے۔

عن ابی ھریرۃ قالقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من لم تدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے جھوٹ اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑا اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا ترک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الصیام جنۃ مالم یخرقھا قال بکذب اوغیبۃ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روزے ڈھال ہیں جب تک کہ روزہ دار اسے توڑ نہ دے عرض کیا گیا اس کو کس چیز سے روزہ دار توڑ دیتا ہے فرمایا جھوٹ اور غیبت سے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔

الغرض روزہ دار کو ایسے امور سے بچنا چاہئے جو کہ نفسانی خواہشات کا موجب ہیں اور روحانی بالیدگی کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ جب غیبت' جھوٹ جیسے امور بذاتہ گناہ کبیرہ ہیں تو روزہ کی حالت میں کس قدر ناپسند ہوں گے اور روزہ کو کس قدر نقصان پہنچانے والے ہوں گے۔ روزہ دار کا تمام بری باتوں سے مجتنب ہونا ضروری ہے ورنہ سوائے بھوک اور پیاس کے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کم من صائم لیس لہ من صیامہ الاالظماء وکم من قائم لیس من قیامہ الاالسھر۔ (رواہ الدارمی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کتنے ایسے روزہ دار ہیں جنہیں روزہ سے سوائے پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور کتنے ایسے نمازی ہیں جنہیں قیام سے سوائے بیداری کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

روزہ کی نیت

روزے کی تین قسمیں ہیں۔ بعض روزوں کے لئے دن مخصوص ہیں مثلاً رمضان شریف کے روزے اور نذر معین کے روزے۔ ان کے لیے نیت کافی ہے وقت کا تعین ضروری نہیں۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

رمضان شریف کے روزے بلاشبہ فرض ہیں کیونکہ ارشادِ خداوندی ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ. (البقرۃ:۱۸۵) جو تم میں سے اس مہینے (رمضان) کو پائے تو وہ اس کے روزے رکھے۔

روزہ اسلام کا ایک رکن ہے اور ایسا فریضہ ہے جو ضروریاتِ دین سے ہے بہت عرصہ پہلے مسلمانوں میں ایک ایسا بدعتی گروہ پیدا ہوا جس کو یہ وہم پیدا ہوا روزہ یا اس کے فدیہ میں سے ایک چیز فرض ہے۔ اس بدعتی گروہ نے قرآن کریم کی اس آیت کو بطور دلیل پیش کیا۔

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ. (البقرۃ:۱۸۴) اور جو لوگ طاقت نہیں رکھتے وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

اس وہم کا علمائے فقہ وتفسیر نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ منسوخ ہے جیسا کہ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے آپ فرماتے ہیں کہ جب **وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین** کی آیت نازل ہوئی تو ہم میں سے جو شخص چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا افطار کر لیتا (یعنی روزہ نہ رکھتا) اور ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ ادا کر دیتا حتیٰ کہ اس کے بعد والی آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور اس نے (پہلی) آیت کو منسوخ کر دیا۔ اسے امام مالک کے علاوہ پانچوں محدثین نے روایت کیا ہے۔

عن ابی لیلی قال حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزل رمضان فشق علیھم فکان من اطعم کل یوم مسکینا ترک الصیام ممن یطیقونہ ورخص لھم فی ذلک فنسختھا وان تصوموا خیرلکم فامروا بالصیام. (رواہ البخاری)

حضرت ابو لیلیٰ سے روایت ہے کہ ہم سے رسول ﷺ کے اصحاب نے بیان فرمایا ہے کہ جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بارے آیت کا نزول ہوا تو روزہ رکھنا ان کے لئے مشکل ثابت ہوا۔ جو روزہ نہ رکھتا تھا وہ ایک مسکین کو کھانا کھلاتا۔ انہیں روزہ کی بجائے فدیہ دینے کی اجازت تھی اس آیت کو **وان تصوموا خیر لکم** نے منسوخ کر دیا اور انہیں روزہ رکھنے کا حکم دے دیا گیا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ **وان تصوموا خیر لکم** اختیار کے منافی نہیں ہے اس لئے یہ آیت فدیہ والی آیت کی ناسخ نہیں بن سکتی تو میں کہوں گا کہ **وانت تصوموا** کے الفاظ سے پوری آیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس میں **فلیصمہ** (تو وہ روزہ رکھے) کے الفاظ بھی ہیں۔ جیسا کہ حدیث کے آخری الفاظ (انہیں روزے کا حکم دے دیا گیا) سے ثابت ہے اس کی دلیل ابو لیلیٰ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بھی ہے۔

قال حدثنا اصحابنا ان رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم لما قدم المدینة امرهم بصیام ثلثة ایام من کل شهر تطوعا من غیر فریضة ثم نزل صیام رمضان و کانوا قوما لم یتعودوا للصوم فکان مشقة علیهم الصوم فکان من لم یصم اطعم مسکینا ثم نزلت هذه الآیة فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْعَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ فکانت الرخصة للمریض والمسافر وامرنا بالصیام.

فرماتے ہیں کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان نے یہ بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ہمیں ہر ماہ نفلی نہ کہ فرضی طور پر ہر ماہ تین دن روزے رکھنے کا حکم دیا۔ پھر ماہ رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا۔ کچھ لوگ اس کے عادی نہیں تھے اس لئے انہیں روزہ رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ سو جو روزہ نہ رکھتا مسکین کو (بطور فدیہ) کھانا کھلا دیتا پھر یہ آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْعَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ نازل ہوئی۔ مریض اور مسافر کے لئے رخصت تھی (اس آیت کے نازل ہونے کے بعد) ہمیں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا اور رخصت واپس لے لی گئی۔

عن ابن ابی لیلی قال دخلت علی عطاء بن رباح فی شهر رمضان وهو یأکل فقلت اتاکل قال ان الصوم اول مانزل کان من شاء صام ومن شاء افطر واطعم مسکینا فلما نزلت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وجب الصوم علی کل مسلم الامریض ومسافر والشیخ الفانی مثلی فانه یفطر ویطعم عن کل یوم مسکینا.

حضرت ابن ابی لیلیٰ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں عطاء بن رباح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور وہ کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے کہا آپ کھانا کھا رہے ہیں؟ فرمانے لگے جب ابتدا میں روزے کا حکم ملا تو (رخصت تھی) جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے فدیہ دے اور (ایک روزے کے بدلے) ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ تو روزہ ہر مسلمان پر فرض ہو گیا سوائے مریض' مسافر اور بہت بوڑھے شخص کے جس طرح میں ہوں۔ سو وہ روزہ نہ رکھے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں اسے وکیع نے روایت کیا ہے۔

بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ ان کے نزدیک یطیقونہ میں ہمزہ (اطاق یطیق اطاقة یعنی باب افعال کا ہمزہ جس کی ایک خاصیت سلب مصدر بھی ہے) سلب کا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ساٹھ مسکینوں کا کھانا بطور فدیہ دے دیں۔ لہٰذا یہ آیت شیخ فانی کے متعلق ہے اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس کو یطوقونہ (باب تفعیل) بھی پڑھا گیا ہے یعنی جو لوگ روزہ نہیں رکھ سکتے۔

یہ تاویل متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت سے

مخصوص ہے اور ہمزہ سلب کا نہیں ہے۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کے علاوہ باقی لوگوں پر رمضان کے روزے فرض ہیں۔ ہاں مریض اور مسافر دوسرے دنوں میں اتنے روزے رکھنے کے پابند ہیں۔ حضرت شیخ اکبر قدس سرہ کا بھی یہی مؤقف ہے۔ آپ فتوحاتِ مکیہ میں فرماتے ہیں کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو رمضان کے روزوں کے بارے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہیں تو وہ روزہ رکھ لیں اور چاہیں تو نہ رکھیں۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت اگر روزہ رکھے گی تو یہ روزہ فرض روزہ کی ادائیگی ہوگا کیونکہ یہ فرض روزے کے زیادہ مشابہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ روزہ فرض کے نہیں بلکہ نفل اور مستحب کے زیادہ مشابہ ہے۔ لہٰذا اسے اختیار ہے کہ نفلی یا فرضی روزے کی نیت کرے اس لئے فرمایا۔

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ. (البقرۃ:۱۸۴) اگر روزہ رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔

حضرت سلمی بن اکوع سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور اقدس میں ہم سے جو شخص رمضان کا روزہ رکھنا چاہتا تو رکھ لیتا چاہتا تو افطار کر دیتا اور اس کا فدیہ ایک مسکین کا کھانا دے دیتا حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ تم میں سے جو اس مہینے کو پائے وہ اس کے روزے رکھے۔ پس کچھ لوگوں نے اس آیتِ کریمہ کو ناسخ بنایا ہے اور کچھ نے مخصص' ثانی الذکر ہم احناف کا مذہب ہے۔ یعنی یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے اب بھی یہ رخصت ہے کہ جب انہیں بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو فدیہ دے کر روزہ نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کو ان کے حق میں نفل قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا. جس نے نفلی روزہ رکھا تو اس کے لئے بہتر ہے۔

لفظ خیر کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے جس میں کھانا کھلانے اور روزہ کو شامل فرمایا ہے (یعنی اگر کوئی اپنی مرضی سے مسکین کو کھانا کھلا دیتا ہے یا روزہ رکھ لیتا ہے تو اس کے لئے باعث خیر ہے)

حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ یہ آیت (وعلی الذین ...... الخ) حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے حق میں رخصت کا حکم رکھتی ہے۔ دار قطنی کے بقول حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ وہ روزانہ ایک مسکین کا کھانا نصف صاع گندم بطور فدیہ دے۔ (یہ ساری گفتگو فتوحات مکیہ سے لی گئی ہے) حضرت شیخ کا کلام ختم ہوا۔

اگر بنظر انصاف دیکھیں تو آیت کا حکم اب بھی باقی ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں روزہ ترک کر کے فدیہ دے سکتی ہیں جیسا کہ حضرت شیخ اکبر علیہ الرحمہ کی تصریحات آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

روزوں کی اقسام

حضرت شیخ مزید فرماتے ہیں: ''جان لیجئے مشروع روزے کی تین قسمیں ہیں واجب' سنت اور مستحب' واجب کی آگے تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ جسے ابتداء سے ہی اللہ تعالیٰ نے ضروری ٹھہرایا ہو جیسے رمضان شریف کے روزے یا مسافر کے حق میں دوسرے دنوں میں اتنے ہی روزے رکھنا۔ ہمارے نزدیک اس نے افطار کئے ہوں یا نہ کئے ہوں جبکہ دوسروں

کے نزدیک اس نے افطار کئے ہوں (تب یہ فرض ہوں گے اور مریض کے حق میں۔
ضروری روزوں کی دوسری قسم وہ ہے جو کسی سبب سے ضروری ٹھہرے ہوں جیسے کفارہ کے روزے اور جو ہم نے یہاں ذکر کئے ہیں اس کے علاوہ کوئی روزے واجب نہیں ہیں۔ انتھی کلام الشیخ.

رمضان کے روزے رکھنا فرض ہیں

شیخ کی اس گفتگو سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت شیخ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے قائل تھے۔ بعض لوگوں نے خواہ مخواہ آپ کی طرف یہ بات منسوب کر دی ہے کہ حضرت ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے قائل ہی نہ تھے۔ نعوذ باللہ۔ یہ محض جھوٹ وافتراء ہے۔ بعض ملحدوں نے خواہش پرستی میں ایسی باتیں حضرت کی طرف منسوب کر دی ہیں' ایسے لوگوں کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں یہ نام کے صوفی' تصوف کے نام پر بدنما دھبہ ہیں۔ ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں اور ان کی فرضیت کا انکار کفر ہے۔

(اوپر آپ نے حضرت شیخ کے حوالے سے پڑھا کہ وہ اس آیت کو منسوخ نہیں سمجھتے) حقیقت میں یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بطور نص بیان فرما رہے ہیں کہ کچھ لوگ تو روزہ رکھتے تھے اور کچھ لوگ روزہ کی بجائے فدیہ دیتے تھے لیکن یہ آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ نازل ہوئی تو پھر تمام لوگ روزہ رکھنے لگے۔

يُطِيقُوْنَهٗ میں ہمزہ سلب کا نہیں ہے اور نہ ہی روزے کی فرضیت کے خصوص کے لئے ہے۔ حضرت سلمہ کا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ کے نزول کے بعد روزے کا تعین کرنا یہ تصریح ہے کہ الَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهٗ منسوخ ہے اور صحابی کی خبر مقبول ہوتی ہے۔

شیخ نے اس لئے اس آیت کو پہلی آیت کا مخصص بنایا ہے کہ ان کے نزدیک مخصص بعض نسخ کا حکم رکھتا ہے۔ یہ اصطلاح درحقیقت احناف استعمال نہیں کرتے۔ حنفی اصطلاحات کے مطابق تخصیص اور تنسیخ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ حضرت شیخ کا مطلب یہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهٗ اس طرح پوری کی پوری منسوخ نہیں کہ کسی ایک فرد کے بارے بھی اس کا حکم ثابت نہ ہو بلکہ یہ آیت بعض افراد کے حق میں منسوخ ہے اور بعض کے حق میں اس کا حکم باقی ہے۔ بعض سے مراد حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی) ہیں۔ اس پر آپ علیہ الرحمہ نے تخصیص کے لفظ کا اطلاق کیا ہے۔ اس مقام کو اسی طرح سمجھا جانا چاہئے۔

روزے کی فرضیت کا سبب ماہ رمضان کا پایا جانا ہے جیسا کہ آیت کریمہ ہے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ.

پھر اکثر حنفی علماء کہتے ہیں ماہ رمضان کے روزے کئی عبادات ہیں اور جو چیزیں فرض ہو رہی ہیں وہ بھی ایک سے زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہر فرض کا ایک الگ سبب ہے۔ سو اس طرح ہر دن' روزے کے لئے سبب ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے رمضان کی ہر رات کا آخری جز روزے کی فرضیت کے لئے سبب ٹھہرتا ہے کیونکہ صبح ہوتے ہی مسبب (روزہ) شروع ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے سبب مسبب سے پہلے پایا جاتا ہے۔

بعض علماء کے نزدیک وہ رات پورے مہینے کے روزوں کے لئے سبب ہے جس رات چاند نظر آیا اور ظاہر ہے روزے کی فرضیت کو بیان کرنے کے لئے الفاظ ضروری ہیں (تو اصل چیز تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے)۔

روزے کی نیت کے متعلق ائمہ کا موقف

روزے کی ادائیگی کے لئے جمہور کے نزدیک نیت شرط ہے لیکن امام زفر کا گمان ہے کہ امام ابوحنیفہ نیت کو شرط قرار نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ رمضان کا دن جب روزے کے لئے متعین ہے تو اس میں کھانے پینے اور جماع سے روکنا روزہ ہی ہے جیسے کسی نے بلانیت زکوٰۃ پورا مال کسی کو دے دیا تو زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ روزہ ایک ایسا عمل ہے جو خالصتاً عبادت ہے اور اسلام کا ایک رکن ہے اس لئے اس کی ادائیگی کے لئے نیت ضروری ہے جیسا کہ حدیث مشہور اور آیتِ کریمہ سے ثابت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ. (البینۃ:۵) — اور ان لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں صرف اسی پر عقیدہ لاتے ہوئے۔

اور اس طرح کی دسری آیات واحادیث۔

اس میں فلسفہ یہ ہے کہ کھانے پینے کا ترک کبھی عادۃً ہوتا ہے اور کبھی عبادت کی غرض سے کھانا پینا ترک کیا جاتا ہے اس لئے اس بات کا تعین ضروری ہے کہ یہ امساک عادۃً نہیں عبادۃً ہے لیکن زکوٰۃ کا مسئلہ اس سے مختلف ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی بھی بغیر نیت کے نہیں لیکن جب سارا مال ہی فقیر کے حوالے کر دیا تو زکوٰۃ ساقط ہوگئی کیونکہ وہ مال ہی نہیں رہا جس کی وجہ سے زکوٰۃ فرض تھی جیسے ہاتھ کا دھونا فرض ہے لیکن جس کا ہاتھ ہی کٹ جائے تو وہ وضو کرتے ہوئے اس فرض کو کیسے ادا کرے گا ظاہر ہے اس کے ذمہ سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔

رمضان کے روزوں کی نیت ہمارے نزدیک نصف النہار شرعی سے پہلے پہلے ہو سکتی ہے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رات کے وقت ہی معتبر ہے بعد میں نہیں۔

عن ام المؤمنين حفصة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم من لم يجمع الصيام قبل الفجر فلا صيام له. (رواہ ابوداؤد والترمذی) — اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے فجر سے نیت نہیں کی اس کے کوئی روزے نہیں۔

نسائی کے الفاظ یہ ہیں جس نے طلوع فجر سے پہلے روزے کی نیت نہیں کی تو اس نے روزہ نہیں رکھا۔

نسائی علیہ الرحمہ کی ایک دوسری روایت میں من لم يبت الصيام قبل الفجر فلاصيام له کے الفاظ آئے ہیں (معنی میں کوئی فرق نہیں)۔

جامع الاصول میں ہے کہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے بقول یہ حدیث حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر موقوف ہے اور اسے معمر، زبیدی، ابن عیینہ، یونس ایلی نے حضرت امام زہری سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ امام مالک اور نسائی بھی اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح امام نسائی اور امام مالک علیہما الرحمہ اسے حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کرتے ہیں۔

فتح القدیر میں ہے کہ عبداللہ بن ابی بکر نے اس حدیث کو امام زہری سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ حضرت حفصہ اس حدیث کی نسبت حضور علیہ السلام کی طرف کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ سرور کائنات علیہ السلام نے فرمایا: جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہیں کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔ ابوبکر بن عبداللہ ثقہ راوی ہیں۔ حدیث کو مرفوع روایت کرنا ''زیادت'' ہے اور ثقہ کی ''زیادت'' قبول کی جاتی ہے۔

صاحب فتح القدیر دارقطنی سے ایک دوسری سند کا تذکرہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیہقی کی روایت میں کلام ہے۔ تفصیل فتح القدیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ امام شافعی کے لئے استدلال کرتے ہوئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر روزہ رکھنے سے پہلے رات کے وقت ہی نیت نہ کی جائے تو روزہ کا ایک حصہ بلانیت ٹھہرے گا جو فاسد ہوگا اور جب ایک حصہ فاسد قرار پا گیا تو پورا روزہ فاسد ہوگیا کیونکہ فرض روزہ اس کمی کو قبول نہیں کرتا لہٰذا رات کے وقت کی نیت ضروری ہے اور سحری کے بعد کی نیت معتبر نہیں۔

احناف کے دلائل یہ ہیں۔

عن سلمة بن الاكوع ان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم امر رجلا من اسلم ان اذن فى الناس من كان اكل فليصم بقية يومه ومن لم يكن يا كل فليصم فان اليوم يوم عاشوراء. (رواہ البخاری ومسلم والنسائی)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے قبیلہ اسلم کے ایک شخص کو لوگوں میں یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ جس نے جو کچھ کھالیا ہے تو وہ باقی دن کا روزہ رکھے اور جس نے کچھ نہیں کھایا وہ روزہ رکھے کیونکہ آج عاشوراء (دسویں محرم) کا دن ہے۔

اسی حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ فرض روزہ کی نیت دن کے وقت بھی ہوسکتی ہے کیونکہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشوراء کے روزے کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ ناسخ نے عاشورہ کے روزے کی فرضیت کو منسوخ کیا لیکن دن کے وقت نیت کا حکم باقی رہا۔ یوم عاشوراء کی فرضیت اور اس کا منسوخ ہونا بے شمار روایات سے ثابت ہے جس کے انکار کی گنجائش نہیں۔ اس ضمن میں صرف دو حدیثیں پیش کی جارہی ہیں۔

عن جابر بن سمرة قال كان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يا مرنا بصيام عاشوراء ويحثنا عليه ويتعاهدنا عنده فلما فرض رمضان لم يا مرنا ولم ينهانا ولم يتعاهدنا عنده. (رواہ مسلم)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام ہمیں عاشوراء کے روزے کا حکم دیتے ہوئے اس کی ترغیب دیتے تھے اور ہم سے اس پر وعدہ لیتے تھے۔ جب رمضان فرض ہوا تو عاشوراء کے روزے کا نہ آپ علیہ السلام نے حکم دیا نہ منع فرمایا اور نہ ہی ہم سے اس بارے عہد لیا۔

عن عبد الرحمن بن مسلمة عن عمه قال ان اسلم اتيت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقال صمتم يومكم هذا قالوا لا

عبدالرحمٰن بن مسلمہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ اسلم کے لوگ رسول اللہ علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے آپ علیہ السلام نے پوچھا کیا تم لوگ آج روزہ سے

قال فاتموا بقیة یومکم واقضوہ. (رواہ ابوداؤد) ہو؟ لوگوں نے عرض کیا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنا بقیہ دن مکمل کرو اور اس روزہ کی قضاء کرو۔

اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اس سے مراد عاشوراء کا روزہ ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت ساری احادیث ہیں۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ روزے کی نیت دن کے وقت بھی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ کچھ کھایا پیا نہ ہو۔

لہٰذا دن کے پہلے جزء میں کھانے پینے اور جماع سے رکنا موقوف ہوتا ہے۔ اگر نصف النہار سے پہلے پہل نیت پائی گئی تو روزہ ہو جائے گا۔ نیت نہ پائی گئی تو روزہ نہیں ہوگا کیونکہ اس دن کو روزہ رکھنا متعین ہے۔ لہٰذا یہ حکم ان تمام روزوں کے لئے ہے جن کا وقت شریعت میں یا روزہ دار کی طرف سے مقرر ہے۔ اس سے شوافع کی عقلی دلیل کا جواب بھی آ گیا (وہ کہتے ہیں کہ اس طرح روزہ کا کچھ حصہ بلانیت ہے جو فاسد ہے۔ بعض کے فساد سے کل کا فساد لازم آیا کیونکہ فرض روزہ اس تنقیص کو قبول نہیں کرتا) سو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو حصہ بلانیت ہے وہ اس حصے کا تابع ہے جس کے لئے نیت کی گئی ہے۔ بغیر نیت کے امساک نیت کے امساک پر موقوف ہے۔ قواعد شرعیہ کی رو سے اقل پر اکثر کا حکم لگایا جاتا ہے نہ کہ اکثر پر اقل کا حکم۔ لہٰذا جب اکثر کے لئے نیت پائی گئی تو اقل کے لئے بھی معتبر ٹھہری لیکن اس کے برعکس معتبر نہیں۔ پس شرعی نصف النہار سے پہلے نیت پائی گئی تو روزہ ہو جائے گا۔

حضور ﷺ کا ارشاد "جس نے نہیں کھایا" نص مفسر ہے اور بتاتی ہے کہ دن کے وقت بھی نیت کی جا سکتی ہے۔ اس پر عمل ہوگا۔ یہ حدیث کسی تاویل کو قبول نہیں کرتی لیکن شوافع نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے وہ تاویل کو قبول کرتی ہے۔ ہم کہیں گے کہ اس حدیث میں یا تو کمال کی نفی ہے یعنی جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہیں کی تو اس کے روزے کو کمال حاصل نہیں یا معنی یہ ہوگا کہ جس نے یہ نیت نہ کی کہ میں صبح سے روزے سے ہوں تو اس کا کوئی روزہ نہیں۔ ہمارے نزدیک نیت کی صحت کے لئے یہ شرط ہے کہ آدمی صبح سے روزہ دار ہونے کی نیت کرے۔ اگر کسی نے یہ نیت کی کہ اب سے لے کر غروبِ آفتاب تک وہ روزہ سے ہے تو یہ نیت صحیح نہیں ہوگی۔

یا پھر حدیث میں غیر موقتہ روزوں کے لئے صبح صادق سے پہلے نیت کو شرط قرار دیا گیا ہے جیسے کفارہ کے روزے وغیرھا اور عام کی تخصیص ہوتی ہی رہتی ہے۔ اس سے ہمارے علماء کی دقت نظر اور تمام احادیث تک رسائی ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ شوافع کا ہماری تاویل کو بہت دور کی تاویل کہنا ان کی کم علمی کی دلیل ہے۔ وہ نصوص کے قوالب سے احکام اخذ کرنے سے قاصر ہیں۔

رمضان شریف کے روزے مطلق نیت صوم سے یا کسی اور واجب اور نفل کی خاص نیت سے ادا ہو جاتے ہیں لیکن ائمہ ثلاثہ (احمد، شافعی، مالک) اس چیز کے قائل نہیں کیونکہ ان کے نزدیک نیت میں روزے کا تعین شرط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

لکل امرء ما نوی. ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔

رمضان میں کسی اور روزہ کی نیت کی تو نیت معتبر ہی نہیں اسی طرح مطلق روزہ کی نیت کی (کہ میں کل روزہ

رکھوں گا یہ نیت نہیں کی کہ اس رمضان کا فرض روزہ رکھوں گا) تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس سے روزہ نہیں ہوگا۔

ہم (احناف) کہتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ فرض روزوں کے لئے مخصوص ہے لہٰذا رمضان کے دنوں میں کوئی دوسرا روزہ رکھا ہی نہیں جا سکتا اس لئے مطلق نیت ہو یا کسی اور روزہ کی نیت رمضان کا روزہ ہی ہوگا جس کے لئے یہ وقت خاص ہے۔

روزہ کی نیت کے متعلق ایک اشکال

شیخ ابن الھمام نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے تو نیت معتبر نہیں ہوگی۔ وہ کسی اور چیز کی نیت کرے اور اس نیت سے عمل دوسرا متحقق ہو یہ صحیح نہیں کیونکہ ایک آدمی رمضان میں نفل یا کسی اور روزے کے نیت کرتا ہے جس کے لئے رمضان کا مہینہ معیار نہیں سو یہ نیت غیر معتبر ہوئی کیونکہ نفل یا دوسرا کوئی روزہ رمضان میں ہو نہیں سکتا اس طرح رمضان کا روزہ بغیر نیت کے رکھا گیا تو بغیر نیت کے روزہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''انما الاعمال بالنیات اعمال کا مدار نیتوں پر ہے''۔

فتح القدیر میں امام ابن الھمام فرماتے ہیں کہ شریعت میں فرض روزوں کے لئے وقت متعین ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ رمضان میں کوئی دوسرا روزہ نہیں ہوسکتا لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مکلّف پر نیت میں فرض روزہ کی تعیین ضروری نہیں۔ لزوم تعیین صرف اس لئے ہے کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ فرض کی بجا آوری آدمی کے اختیار سے ہو رہی ہے جبر سے نہیں، محل کا تعین شرعاً آدمی کے اختیار میں نہیں لہٰذا مطلق نیت کافی نہیں اور تمہارا یہ کہنا کہ مطلق کی نیت سے فرض روزہ ہو جائے گا تو ہم کہتے ہیں کہ کلام اس میں نہیں کہ مطلق سے فرض روزہ مراد لیا جائے۔ اگر مطلق سے فرض مراد ہو تو یہ نیت ہی فرض روزہ کی ہوئی بلکہ کلام اس میں ہے کہ مطلق کی نیت کی جائے اور فرض روزے کا دل میں خیال ہی پیدا نہ ہو۔ ایسے میں مطلق نیت سے رمضان کا روزہ نہیں ہوگا۔ اگر فرض روزہ ثابت ہو گیا تو یہ روزہ بلانیت ہوا اور یہ محض جبر ہے اور فرض کی ادائیگی کے لئے اختیار ضروری ہے۔

لہٰذا جب مطلق نیت سے رمضان کا فرض روزہ نہ ہوا تو نفلی یا کسی اور فرضی روزے کی نیت سے رمضان کا روزہ متحقق نہیں ہوگا کیونکہ تمہارے نزدیک کسی دوسرے فرض یا نفلی روزے کی نیت سے رمضان کا روزہ اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس میں جو زیادتی ہوتی ہے وہ لغو ہوتی ہے مثلاً میں نفل روزے کی نیت کرتا ہوں، نفل زیادتی ہے اور یہ لغو ہے۔ میں روزے کی نیت کرتا ہے۔ تمہارے نزدیک یہ معتبر ہے بلکہ اس میں تو نیت کا باطل ہونا بدرجہ اولیٰ ہے کیونکہ مطلق نیت میں تو امکان ہے کہ فرضی روزہ ہو جائے کیونکہ فرض روزہ بھی مطلق کے افراد میں سے ایک فرد ہے لیکن جب اس نے یہ نیت کی کہ یہ نفلی روزہ ہے یا کفارہ کا روزہ ہے تو پھر رمضان کا فرض روزہ نہیں ہوگا کیونکہ رمضان کا روزہ نفلی یا کفارے کے روزوں کا فرد نہیں ہے۔ اگر اس سے فرض روزہ متحقق ہوگا تو گویا اختیار سے نہیں جبر سے ہوگا کیونکہ روزہ رکھنے والا تو فرض روزہ رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا یہ جبراً ادا ہو گیا اور یہ صحیح نہیں یہ ساری گفتگو فتح القدیر میں ہے اور جو کچھ اس ضمن میں تحریر ہے اس کا خلاصہ ہے۔

جواب

ماہ رمضان کے ہر دن میں صرف ایک روزہ رکھا جا سکتا ہے دو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دنوں کو فرض روزوں کے لئے محل بنایا ہے۔ ان دنوں میں رمضان کے ان فرض روزوں کے علاوہ کوئی دوسرا روزہ ممکن ہی نہیں کیونکہ یہ کسی اور روزہ کا محل ہی نہیں بلکہ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ دوسرے روزوں کے لئے ان ایام کی حیثیت رات کی سی ہے۔ جس طرح رات کے وقت کوئی روزہ نہیں رکھا جا سکتا ان دنوں میں رمضان کے علاوہ کوئی دوسرا روزہ نہیں رکھا جا سکتا لہٰذا اس مہینے کے دنوں میں اگر مطلق روزہ کی بھی نیت کی گئی تو یہ نیت مطلق نہیں مقید ہوگی کیونکہ اس میں ایک ہی روزہ ممکن ہے اور وہ ہے رمضان کا فرض روزہ۔ سو مطلق نیت سے رمضان کا روزہ ہو جائے گا۔ اگر فرض روزے کا دل میں خیال نہیں آیا تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کیونکہ مطلق روزہ کا خیال فرض روزے کا ہی خیال ہے جیسے کسی شخص کے ذمے کئی دنوں کی نمازیں ہوں اور ان کی قضاء کرنا چاہتا ہو تو اگر وہ اس طرح نیت کرے کہ میں نیت کرتا ہو ظہر کی پہلی نماز کی جو میرے ذمے واجب الاداء ہے تو یہ نیت یقینی طور پر صحیح ہے اگر چہ اس کے دل میں یہ بات نہ ہو کہ وہ کس دن کی ظہر کی نماز ہے۔ اختیار جس کا ادائے فرض میں پایا جانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ عبادت کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس عبادت کا فرض ہونا البتہ جبری معاملہ ہے کیونکہ اس میں بندے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ روزہ کی صورت میں اتنا ارادہ (کہ عبادت ہے) بہر حال موجود ہے۔ اگر اس کا ارادہ عبادت کا نہیں تو ہمارے نزدیک بھی اس کی نیت معتبر نہیں۔

اگر کسی نے رمضان میں روزہ رکھتے ہوئے یہ نیت کی کہ وہ آج رمضان کا فرض روزہ اور کفارہ کا روزہ رکھے گا تو رمضان کا روزہ ہوگا کفارہ کا روزہ نہیں ہوگا کیونکہ فرض روزے کا یہ مہینہ محل ہے لیکن کفارہ کا روزہ اس کے منافی ہے۔ سو کفارہ کا روزہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر فرض اور نفل روزے کی نیت کی تو فرض روزہ ہوگا اور نفلی روزہ نہیں ہوگا۔

امام ابن الہمام کے اعتراض کا دوسرا جواب یہ ہے کہ نفلی روزہ بھی مطلق یا واجب کی نیت سے ہو جاتا ہے حالانکہ وہ نفل روزے کی نیت نہیں کرتا بلکہ مطلق روزہ کی نیت کرتا ہے۔ اگر مطلق روزے کی نیت سے نفلی روزے کی ادائیگی ہو سکتی ہے تو اس سے جبر لازم آتا ہے اور جبر کے ساتھ عبادت صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ اختیار ہر عبادت کے لئے شرط ہے۔ اگر واجب کی نیت کی تو ظاہر ہے اس سے نفل روزے کا تحقق پہلے سے بھی زیادہ جبر ہے۔ سو اس کے بارے جو آپ کا جواب ہوگا وہ ہمارا جواب ہوگا۔

یہ ساری گفتگو تندرست مقیم سے تعلق رکھتی ہے۔

مسافر آدمی کا روزہ

مسافر اگر رمضان میں کسی دوسرے واجب روزے کی نیت کرے گا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا وہی روزہ ہوگا جس کی اس نے نیت کی۔ اسی طرح نفل کی نیت کی تو نفل ہوگا کیونکہ مسافر رمضان میں اسی طرح افطار کر

سکتا ہے جس طرح شعبان میں افطار کر سکتا ہے۔ اس بناء پر چاہئے یہ کہ مطلق نیت سے مسافر کا فرض روزہ ادا نہ ہو کیونکہ جب یہ مہینہ اس کے لئے اسی طرح ہے جس طرح شعبان کا مہینہ ہے تو رمضان اس کے لئے معیار نہیں ہے اس لئے نیت کی تعیین ضروری ہے۔ اگرچہ امام صاحب کی ایک روایت اس کو جائز ٹھہراتی ہے اور اس کے مخالف دوسرا کوئی قول نہیں۔

علماء فقہ اس دوسری روایت کی یہ توجیہ بیان کرتے ہیں کہ افطار کی مشروعیت مصالح بدنی کے لئے ہے لہٰذا اگر وہ روزہ رکھتا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس سے اس کے دینی مصالح حاصل ہوں۔ واجب روزہ اس کے ذمہ قرض ہے اور اس کی ادائیگی اس کا دینی فائدہ ہے اور اہم ترین فرض رمضان کا فرض روزہ ہے جس کو وہ ترک کر سکتا ہے۔ نفل روزے کو جائز قرار دینے میں کوئی بدنی منفعت نہیں ہے اور نہ ہی اس میں مسافر کی کوئی دینی مصلحت ہے (یعنی یہ اس کے ذمہ واجب الاداء نہیں) کیونکہ رمضان کا روزہ نفل روزہ سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ اگر وہ روزہ رکھے گا تو فرض روزہ ہوگا اور وہ ایک فرض سے سبکدوش ہوگا۔

امام محمد اور امام ابو یوسف علیہما الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں مقیم اور مسافر برابر ہیں۔ مسافر جس بھی نیت سے روزہ رکھے گا' ماہ رمضان میں رمضان کا روزہ ہی ہوگا۔ صاحبین کا قول صحت کے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے کیونکہ افطار کی اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ رمضان کے دن فرض روزہ کے لئے معیار ہی نہیں رہے۔ شارع نے تو ان دنوں میں انسان پر فرض روزے ہی لاگو کئے ہیں۔ وہ پابند ہے کہ ان دنوں میں فرض روزے رکھے ان ایام میں وہ دو روزے نہیں رکھ سکتا کیونکہ فرض روزہ اس کے ذمہ واجب الاداء ہے اس لئے کوئی دوسرا روزہ اس دن نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر مطلق روزے کی نیت کرے گا تو بھی وہی روزہ ہوگا جو اس کے ذمے فرض ہے۔ شارع نے اسے افطار کی اجازت دی ہے لہٰذا وہ روزہ نہ رکھے اگر کوئی دوسرا روزہ رکھے گا تو دوسرا روزہ نہیں ہوگا۔ یہ کہنا بجا کہ اس کے دینی منافع اہم ہیں لیکن یہ اس صورت میں جب ممکن ہو اور رمضان میں کسی دوسرے واجب روزہ کی ادائیگی ممکن ہی نہیں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

بیمار آدمی کے روزے کا حکم

بیمار آدمی کا حکم بھی وہی ہے جو مسافر کا ہے امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک کسی دوسرے روزے کی ادائیگی بھی صحیح ہے اور رمضان کے روزے کی بھی۔ یہ امام حسن کی روایت ہے۔ اسی کو صاحب ہدایہ نے اختیار کیا ہے۔ ان کے علاوہ بخارا کے مشائخ کا بھی یہی نقطہ نگاہ ہے۔

شیخ فخر الاسلام اور جناب شمس الائمہ فرماتے ہیں کہ جس روزہ کی نیت کرے گا وہی روزہ ہوگا لیکن بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ مریض اگر کسی دوسرے روزے کی نیت بھی کرے گا تو تب بھی رمضان کا روزہ ہوگا کیونکہ اس کو اس لئے روزہ ترک کرنے کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ جب اس نے روزہ رکھ لیا تو ظاہر ہو گیا کہ عاجز نہیں لہٰذا کسی اور روزے کی نیت کی تو بھی فرض روزہ ہوگا۔

لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ مریض کو روزہ ترک کرنے کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ روزہ رکھنے سے

اس کی بیماری لمبی ہو جائے گی اس لئے نہیں کہ وہ روزہ رکھنے سے عاجز ہے۔ اگر مریض نے کسی اور واجب کی نیت کی، روزہ رکھا اور روزہ نے اس کو تکلیف دی جس کے نتیجے میں اس کا مرض بڑھ گیا تو اس کے لئے رخصت ثابت ہے۔ مریض اور مسافر اس بارے ایک جیسے ہیں۔

بعض مشائخ نے بیماری کی دو قسمیں بنائی ہیں۔ ایک وہ بیماری ہوتی ہے جس سے مریض کو روزہ رکھنے کی صورت میں تکلیف ہوتی ہے اور ایک وہ ہے جس میں مریض کو روزہ رکھنے سے تکلیف نہیں ہوتی۔ پہلی صورت میں افطار کی اجازت ہے اور یہ رخصت مرض بڑھ جانے کے اندیشے کی وجہ سے ہے۔ ایسی صورت میں دوسرے واجب کی نیت صحیح ہے جبکہ دوسری صورت میں رخصت کا تعلق عجز سے ہے۔ ایسے میں کسی دوسرے واجب کی نیت کی تو ظاہر ہے وہ عاجز نہیں رہا (لہٰذا فرض روزہ ہوگا)۔

یہ محاکمہ بھی محل نظر ہے کیونکہ جس بیماری میں روزہ نقصان دہ نہیں اس میں سرے سے مریض کو روزہ ترک کرنے کی اجازت ہی نہیں وہ تو موضوع بحث سے خارج ہے۔ ہاں اگر اتنی نکاہت ہے کہ روزہ رکھنے سے ضرر ہوگا تو ایسی صورت میں رخصت دی جائے گی تاکہ ضعف بڑھ نہ جائے لہٰذا اس طرح کی کمزوری پہلی قسم کے زمرے میں آتی ہے۔ صحیح رائے وہی ہے جسے صاحبِ ہدایہ نے اختیار کیا ہے۔ یہ ساری گفتگو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق کی گئی ہے۔

صاحبین کے نزدیک مریض کا حکم مقیم جیسا ہے۔ مسافر میں ہم نے اس کی وجہ بیان کر دی ہے۔

نذر کا روزہ

نذر معین کا روزہ مطلق نیت سے بھی ادا ہو جاتا ہے اور نفلی روزے کی نیت سے بھی ادا ہو جاتا ہے۔ دو روایتوں میں سے صحیح ترین روایت یہی ہے کیونکہ رمضان کے مہینے کی طرح معین دن بھی روزے کا معیار ہے مگر یہ کہ انسان اس دن کسی اور واجب روزے کی نیت کر لے جو اس کے ذمے واجب الاداء ہو کیونکہ نذر کا روزہ انسان نے خود اپنے اوپر واجب کیا ہے لیکن دوسرا واجب جس کی وہ نیت کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض یا واجب کیا گیا ہے لہٰذا اولیت فرض یا واجب روزہ کو ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے انسان پر لازم ٹھہرایا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ معین دن نفلی روزہ کے لائق تھا۔ انسان کو اجازت اور اختیار ہے کہ وہ اس دن نفلی روزہ کی بجائے کوئی واجب روزہ رکھ لے۔ جب اس نے نذر مان لی کہ فلاں دن روزہ رکھوں گا تو اس پر واجب ہو گیا جس کو ترک کرنا جائز تھا اور نفلی روزہ اس دن جائز نہ رہا لیکن شارع نے جس واجب کے لئے پوری عمر کو وقت مقرر کیا ہے کہ انسان زندگی میں جس دن چاہے اسے ادا کرے اپنی نذر سے اس کو مقید نہیں کر سکتا اس لئے دوسرا واجب روزہ اس معین دن میں رکھا جا سکتا ہے۔ سو اگر کسی نے معین دن کو کسی دوسرے واجب کی نیت کی تو نذر معین کا روزہ نہیں ہوگا بلکہ دوسرا واجب ادا ہوگا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ اس طرح تو وہ خاص دن نذر کے روزے کے لئے معیار نہیں رہا بلکہ اس میں کوئی اور واجب بھی ہو سکتا ہے لہٰذا نیت کا تعین اس میں بھی لازم ہے اور نذر کا روزہ مطلق نیت روزہ یا نفلی روزہ کی نیت سے

نہیں ہوسکتا تو میں کہوں گا کیونکہ مطلق نیت سے دوسرا واجب ادا نہیں ہوتا تو جس کا یہ وقت ہے وہ مطلق نیت سے ادا ہو جائے گا اور یہ وقت اس روزے کا ہے جسے آدمی نے خود اپنے اوپر واجب کیا ہے لہٰذا یہ روزہ صحیح ہو جائے گا۔

لیکن جب نفلی روزہ کی نیت کی تو اس نے اسی روزہ کی نیت کی جو اس دن ہو سکتا تھا لیکن نذر مان کر اس نے اس کو واجب بنا دیا لہٰذا اب یہی روزہ ہو گا نفلی روزہ نہیں ہو گا بلکہ جو پہلے نفلی تھا وہ واجب میں تبدیل ہو گیا اور اب اس کو نفلی کہنا لغو ہوا لہٰذا نذر معین کے روزے کی نیت کرتے ہوئے اگر کسی نے نفلی روزے کی نیت کی تو نذر معین کا روزہ ہی ہو گا۔ اگر اس نے نذر معین کے روزے میں یہ نیت کی کہ میں اس دن کے روزے کی نیت کرتا ہوں (صوم کی نسبت الوقت کی طرف کی) تو نذر کا روزہ ہی ہو گا کیونکہ اس دن کا وظیفہ یہی روزہ ہے۔

رمضان شریف کے قضاء اور کفارہ کے روزے

روزے کی دوسری قسم صیام عمری ہیں۔ یعنی ایسے روزے جن کی ادائیگی کے لئے دن مقرر نہیں بلکہ وہ زندگی میں کسی وقت بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً رمضان شریف کے قضاء روزے اور کفارہ کے روزے۔ ان روزوں کے لئے ایام معین نہیں بلکہ جب چاہیں انہیں رکھ لیں۔ حج قرآن کے تین روزے احرام کے دنوں میں جب چاہیں رکھ لیں ان کے لئے دن خاص نہیں ہیں۔ نذر مطلق کے روزے بھی زندگی میں کسی وقت رکھے جا سکتے ہیں۔

ایسے روزوں کے لئے رات کے وقت نیت کرنا شرط ہے۔ ان کی نیت دن کے وقت نہیں ہو سکتی کیونکہ جب ان کے لئے وقت مقرر نہیں ہے تو دن کے کسی جز میں کھانے پینے اور جماع سے رکنے کو اس دن کے روزے پر موقوف نہیں کیا جا سکتا لہٰذا صبح سے پہلے نیت کرنا شرط ہے تاکہ دن کے وقت رکنا واجب عمری کی ادائیگی بن جائے اور نفلی روزہ کی نیت کی تو نفلی ہو گا۔ اگر مطلق روزے کی نیت کی تو بھی ان روزوں میں سے کوئی روزہ نہیں ہو گا نیت میں تعیین ضروری ہے کیونکہ ان دونوں کے لئے وقت معیار نہیں ہے۔

نفلی روزوں کے لئے کب نیت کرنا درست ہے؟

تیسری قسم نفلی روزوں کی ہے۔ ان کی نیت زوال سے پہلے ہو سکتی ہے۔

عن ام الدرداء قالت كان ابو الدرداء ياتينى نهارا فيقول عندكم طعام فان قلنا لا قال انى صائم يومى هذا وفعله ابو طلحة وابوهريرة وابن عباس.

اُم درداء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ دن کے وقت تشریف لاتے تھے اور پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس کھانا ہے؟ اگر ہم کہہ دیتے کہ نہیں تو فرماتے آج میں روزہ دار ہوں۔ حضرت ابوطلحہ ابوہریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی ایسا کرتے تھے۔

جیسا کہ بخاری شریف کی معلق حدیث سے ثابت ہے۔

یہ حدیث نص صریح ہے کہ یہ روزہ پورے دن کا روزہ ہوتا ایسے نہیں جس طرح امام شافعی علیہ الرحمہ کی طرف نسبت کی جاتی ہے کہ ایسا روزہ صرف بعض دن کا روزہ ہوتا ہے لیکن ضروری ہے کہ نصف النہار سے پہلے کچھ کھایا پیا

نہ ہو۔ ماہرین فن ثقہ کرام فرماتے ہیں کہ ایسا کوئی قول شوافع کی کتابوں میں نہیں کہ جس سے ثابت ہو کہ وہ آدھے روزے کے بھی قائل تھے۔

اس ضمن میں ایک مرفوع حدیث بھی موجود ہے۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

قالت قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم عائشۃ ھل عند کم من طعام قالت فقلت یا رسول اللہ ما عندنا شئی قال فانی صائم قالت فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاھدیت لنا ھدیۃ اوجاءنا زود قالت فلما رجع رسول اللہ قالت قلت یا رسول اللہ اھدیت لنا بھدیۃ اوجاء نا زود وقد خبأت لک شیئا قال ما ھو قلت حیس قال ھاتیہ فجئت بہ فاکل ثم قال قد کنت اصبحت صائما. (رواہ مسلم)

فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن مجھ سے پوچھا عائشہ! کیا تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا ہمارے پاس تو کچھ نہیں آپ ﷺ نے فرمایا: تو میں روزے سے ہوں۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب باہر تشریف لے گئے تو ہمارے پاس ہدیہ لایا گیا یا کھانا لایا گیا۔ فرماتی ہیں جب رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لائے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ ہمیں ہدیہ دیا گیا ہے یا کھانا میں نے آپ کے لئے کچھ چھپا رکھا ہے فرمایا کیا ہے؟ میں نے کہا حیس (کھجور، گھی اور ستو سے تیار کیا گیا کھانا) آپ ﷺ نے فرمایا لاؤ۔ میں لے کر حاضر ہوئی اور آپ نے اسے تناول فرمایا پھر گویا ہوئے میں نے صبح روزے سے کی۔ طلحہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث مجاہد سے بیان کی انہوں نے فرمایا یہ بمنزلہ اس آدمی کے ہے جو اپنے مال سے صدقہ نکالتا ہے اب اگر وہ چاہے تو فقیر کو دے اور چاہے تو روک لے۔"

حضور ﷺ نے فانی صائم (پھر میں روزے سے ہوں) فرمایا۔ حرف فا تعقیب کے لئے ہے۔ یعنی حضرت عائشہ کی گزارش سننے کے بعد آپ نے روزہ کی نیت کی۔ اس سے معلوم ہوا نفلی روزے کی نیت بھی دن کے وقت ہو سکتی ہے اور شریعت میں پورے دن کا روزہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نیت سے پہلے اور نیت کے بعد کھانے پینے وغیرہ سے رکنا سب روزہ ہے۔

نفلی روزوں کی نیت دن کے وقت اس لئے معتبر ہے کہ شریعت نے زندگی کے تمام دنوں کو رمضان شریف کے علاوہ انہیں روزوں کا وقت قرار دیا ہے۔ لہٰذا نفلی روزہ ان میں سے ہر دن کا وظیفہ ہے اس لئے زندگی کے ان دنوں میں کھانے پینے اور جماع سے رکنا نیت پر موقوف ہوتا ہے۔ اگر نیت روزہ کی ہوگئی تو روزہ ہو گیا اگر نہیں تو روزہ نہ ہوا۔ یہ علت تمام ان روزوں میں پائی جاتی ہے جن کیلئے وقت مقرر ہے۔ اگر دن کا اول حصہ کھانا پینا نہ ہوا تو نیت کے ساتھ روزہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ہمارے مشائخ نے رمضان کے روزوں کو نفلی روزوں پر قیاس کیا ہے۔

چاند دیکھنے کا بیان

کون سے مہینوں کا چاند دیکھنا لازم ہے؟

عاقل، بالغ مسلمانوں (مکلفین) پر فرض ہے کہ وہ شعبان کی تیسویں رات کو رمضان شریف کا چاند دیکھیں کیونکہ فرض کا مقدمہ بھی فرض ہے اسی طرح رمضان شریف کی تیسویں رات کو عید کا چاند دیکھنا بھی فرض ہے۔ رمضان اور عید کے علاوہ ذی القعدہ کی تیسویں شام کے وقت ذی الحجہ کا چاند دیکھنا بھی فرض ہے۔

یہ فرض کفایہ ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام لوگ چاند دیکھیں اسی لئے تمام کا دیکھنا شرط نہیں ہے لیکن زیادہ سے زیادہ لوگوں کو چاند دیکھنا چاہئے کیونکہ بعض لوگ اگر نہیں دیکھ سکیں گے تو دوسرے لوگ دیکھ لیں گے۔

اگر روزوں یا عید کا چاند نظر آ جاتا ہے تو لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ روزے رکھیں یا عید کی صورت میں عید کریں اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس دن مکمل کریں اور اس کے بعد رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا ہے تو روزے رکھیں اگر شوال کا مہینہ ہے تو عید کریں کیونکہ حدیث پاک ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا رأیتم الھلال فصوموا واذا رأیتموہ فافطروا فان غم علیکم فعدوا ثلثین۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی افطار کرو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس دن مکمل کرو۔

بخاری کے الفاظ یہ ہیں "چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو جائے تو تیس دن گن لو۔"

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا رأیتموہ فصوموا واذا رأیتموہ فافطروا فان غم علیکم فاقدروا۔ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم چاند دیکھو تو افطار کرو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس دن پورے کر لو۔

شیخین کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس کی تعداد پوری کرو۔

مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں چاند کا ثبوت

رمضان کے چاند کو اگر ایک آدمی نے دیکھا تو اس کا دیکھنا کافی سمجھا جائے گا بشرطیکہ مطلع صاف نہ ہو اور اس کی گواہی کے قبول ہونے پر تمام مکلفین کو روزہ رکھنا ہوگا۔

عن ابن عمر قال ترای الناس الھلال فاخبرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگوں نے باہم چاند دیکھنا شروع کیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ

وسلم انی رأیته فصام و امر الناس بصیامه. (رواہ ابوداؤد)

میں نے چاند دیکھ لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

عن ابن عباس قال جاء اعرابی الی النبی صلی الله علیه و آله وسلم فقال رأیت الهلال قال الحسن فی حدیثه یعنی هلال رمضان فقال اتشهد ان لا آله الاالله قال نعم قال اتشهد ان محمدا رسول الله قال نعم قال یابلال اذن فی الناس ان یصوموا غدا. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بارگاہِ نبوی میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا میں نے چاند دیکھا ہے۔ حسن اپنی روایت میں فرماتے ہیں کہ اس کی مراد رمضان کا چاند تھا۔ حضور ﷺ نے پوچھا کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں؟ عرض کیا ہاں۔ حضور ﷺ نے پوچھا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلال! لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ کل روزہ رکھیں۔

بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ ''آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں یہ اعلان کر دیں کہ وہ قیام کریں اور روزہ رکھیں۔

یہ حدیث تراویح کے بارے نص صریح ہے۔ تراویح صحابہ کرام علیہم الرضوان کا معمول تھا اور رسول اللہ ﷺ نماز تراویح کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

عادل شخص کی گواہی کو قبول کیا جائے گا

ظاہر الروایت میں مخبر کے لئے عادل ہونا شرط ہے کیونکہ چاند کے بارے خبر ایک دینی کام کے بارے اطلاع ہے۔ امام حسن کی روایت کے مطابق مستور الحال کی خبر بھی معتبر ہے۔ یہ اعرابی کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ظاہری اسلام کو کافی سمجھا اور اس کی عدالت کے بارے کچھ نہ پوچھا۔

شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں یہ اس وجہ سے ہے کہ مسلمان اکثر عادل ہوتے ہیں اس لئے سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اعرابی نے اسی وقت اسلام قبول کیا تھا۔ کافر جب اسلام قبول کر لیتا ہے تو عادل شمار ہوتا ہے تاوقت کہ اس کا فسق ظاہر نہ ہو جائے کیونکہ اسلام پہلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور اسلام کے بعد اس کا پہلا کردار اس کی عدالت میں مخل نہیں ہوتا لیکن آج کے دور میں فسق زیادہ ہے اس لئے مستور الحال مسلمان کی گواہی کافی نہیں۔ اس کی عدالت کے بارے سوال کیا جائے گا۔

ہم کہتے ہیں ہمارے زمانے میں ایسے امور میں عدالت کی شرط لگانا اکثر اعمال میں خلل کا سبب بنے گی خصوصاً روزوں میں اس لئے مناسب یہ ہے کہ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ سے مروی قول پر فتویٰ دیا جائے۔ اگر چاند کی گواہی دینے والا صاحب مروت ہے اور اس کے بارے غالب گمان یہ ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا تو اس کی بات کو قبول کیا جائے گا تاکہ روزوں کا معاملہ مختل نہ ہو۔

ایک آدمی نے تیس کی رات (۲۹ دن کے بعد رات آتی ہے) کو چاند دیکھ لیا مگر کسی اور نے نہیں دیکھا اور اس

کی گواہی بھی رد کر دی گئی تو لازم ہے کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ اس کے نزدیک تو فرضیت کا سبب پایا جا رہا ہے۔

عیدالفطر کے چاند کے لئے دو آدمیوں کا گواہی دینا

عیدالفطر کے چاند کے لئے ہمارے نزدیک دو آدمیوں کی گواہی ضروری ہے اور باقی ائمہ کے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔ مگر امامیہ (شیعہ) کے نزدیک چالیس آدمیوں کی گواہی شرط ہے۔ ہم دو کی شہادت کو اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ شہادت میں اصل دو آدمی معتبر ہیں۔ عیدالفطر کے چاند کی گواہی دیتے ہوئے لفظ شہادت (یعنی میں گواہی دیتا ہوں) کہنا ضروری ہے کیونکہ اس میں جھوٹ کا گمان ہوتا ہے اس لئے چھان بین ضروری ہے۔

عن رجل من اصحاب رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم قال اختلف الناس فی آخر یوم من رمضان فقام اعرابیان فشهدا عند رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم تا الله الهلال ورأیناه امس عشیة فامر رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم الناس ان یفطروا. (رواہ ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی سے روایت ہے کہ رمضان شریف کے آخری دن میں لوگوں کے درمیان اختلاف رونما ہوا۔ دو دیہاتی کھڑے ہوئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے گواہی دی کہ بخدا ہم نے کل رات کو چاند دیکھا ہے سو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ روزہ نہ رکھیں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "اور اپنی عیدگاہ کو جائیں۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عید کے چاند کے لئے دو آدمیوں کی گواہی کافی ہے۔ چالیس کی ضرورت نہیں۔

اگر تیسویں رمضان کے دن کو چاند نظر آ گیا اور اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا تو یہ چاند آنے والی رات کا ہے اس دن کا روزہ مکمل کریں جس دن یہ چاند نظر آیا ہے۔ خواہ زوال سے پہلے نظر آئے یا بعد میں نظر آئے کیونکہ ظاہر ہے چاند (یعنی پچھلے مہینے کا چاند) افق کے نیچے قوس الرؤیہ میں پہنچ گیا ہے۔ جب وہ رات کو نظر نہیں آیا اگرچہ رات ابر آلود تھی تو وہ اس کا افق کے نیچے قوس الرؤیہ تک پہنچنے کا احتمال ہے۔ لہٰذا شک اور احتمال کی وجہ سے گویا رات کو چاند طلوع نہیں ہوا۔ یہی نظریہ علماء کا اختیار کردہ ہے۔

مردود الشھادۃ پر روزہ لازم ہے

اگر ایک شخص نے عید کا چاند دیکھا اور اس کی شہادت رد کر دی گئی کیونکہ وہ اکیلا تھا یا دو آدمیوں نے چاند دیکھنے کی گواہی دی لیکن کسی وجہ سے ان کی گواہی رد ہو گئی تو چاند دیکھنے والوں پر روزہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ اسی میں احتیاط ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الفطر یوم یفطر الناس والاضحی یوم یضحی الناس. (رواہ الترمذی)

عیدالفطر کا دن وہ ہے جس دن تمام لوگ روزہ ترک کر دیں اور قربانی کا دن وہ ہے جس دن تمام لوگ قربانی کریں۔

اگر لوگوں نے ایک آدمی کی گواہی پر رمضان شریف کے روزے شروع کئے تھے پھر عید کا چاند ابر کی وجہ سے نظر نہ آیا تو وہ تیس دن مکمل کریں۔ یہ تیس دن پہلے دن کے علاوہ ہوں گے۔ شیخین کا یہی مؤقف ہے کیونکہ عید کے لئے ایک آدمی کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ وہ اس دن کو شامل کرتے ہوئے تیس دن مکمل کریں کیونکہ جب ایک آدمی کی گواہی سے روزہ رکھنا فرض ٹھہرا تو وہ دن رمضان شریف کا دن شمار ہوگا اور اس کو شامل کرتے ہوئے تیس دن مکمل کئے جائیں گے۔ کتنی ہی چیزیں ہیں جو قصداً ثابت نہیں ہوتیں لیکن تبعاً ثابت ہو جاتی ہیں۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

عید الاضحیٰ کا چاند بھی گواہی کے لحاظ سے عید الفطر کی طرح ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ لفظ شہادت کا استعمال ضروری ہے (یعنی یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں) اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن حسين بن الحارث ان امير مكة قال عهد الينا رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم ننسك لرؤية فان لم يرده وشهد لمشاهد اعدل نسكنا بشهادتهما قال الامير ان فيكم من هوا علم بالله ورسوله مني وقدشهد هذا من رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم. و اوفى بيده الى رجل قال الحسين فقلت الشيخ الى جنبي من هذا الذي اومى اليه الامير قال هذا عبد الله بن عمرو صدق كان اعلم بالله عزوجل وعزمته فقال امرنا بذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم (رواہ ابوداؤد)

حسین بن حارث سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ امیر مکہ نے کہا کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے یہ عہد لیا کہ ہم چاند دیکھ کر قربانی کیا کریں۔ اگر چاند نظر نہ آئے اور دو عادل شخص گواہی دیں تو ان کی گواہی پر قربانی کریں۔ امیر مکہ نے فرمایا کہ تم میں ایک ایسا شخص بھی ہے تو مجھ سے کہیں زیادہ اللہ اور اس کے رسول کے بارے جانتا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کی گواہی دی ہے اور انہوں نے ایک آدمی کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا حسین فرماتے ہیں میرے پہلو میں ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔ میں نے ان سے پوچھا امیر مکہ نے جس شخص کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کون ہیں؟ انہوں نے فرمایا یہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ امیر مکہ نے سچ کہا کہ آپ اللہ عزوجل اور اس کی عظمت کو لوگوں کی نسبت زیادہ جانتے تھے۔ انہوں (یعنی عبد اللہ بن عمر) نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے ہمیں اس کا حکم فرمایا ہے۔

رمضان میں ایک اور عیدین کے لئے دو آدمیوں کی گواہی اس وقت قابل قبول ہوگی جب مطلع ابر آلود ہو۔ اگر مطلع صاف ہو تو پھر جم غفیر کی گواہی ضروری ہے یعنی اتنے لوگ کہ جن سے علم (یقین) حاصل ہو جائے ہاں امام شافعی علیہ الرحمہ جم غفیر کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ مطلع کے ابر آلود ہونے کی حالت پر اسے قیاس کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ جب مطلع صاف ہے اور کوئی چیز رویت ہلال سے مانع نہیں ہے تو جم غفیر کو نظر آنا چاہئے کیونکہ سبھی تو اندھے نہیں ہوتے ہر شخص تقریباً چاند دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو صرف ایک کو چاند نظر آیا باقی سبھی دیکھنے سے قاصر رہے تو اس میں جھوٹ کا گمان موجود ہے اس لئے مطلع جب صاف ہو تو جم غفیر کی شرط لگائی گئی ہے۔

یوم شک کا روزہ

شعبان کی تیسویں رات کو اگر مطلع ابر آلود ہے اور اس دن کے بارے شک ہے کہ ہو سکتا ہے یہ رمضان کا دن ہو تو بالا جماع اس دن کو رمضان کے روزے کی نیت سے روزہ نہیں رکھا جا سکتا۔ ہاں امام احمد علیہ الرحمہ سے روزہ رکھنے کی ایک روایت منقول ہے۔ شک کے دن روزہ نہ رکھنے کی دلیل یہ حدیث پاک ہے جسے پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔

قولہ صلی اللہ علیہ وسلم صوموا بالرؤیۃ وافطروا بالرؤیۃ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔

اگر رمضان کے روزے کی نیت سے روزہ رکھا تو گناہگار ہوگا اگر کسی نے شک کے دن روزہ رکھا اگر معلوم ہو جائے کہ رمضان شروع ہو چکا ہے تو یہ فرض ہو گیا ورنہ نفلی ہوا (لیکن شک کے دن نفلی روزہ رکھنا بھی گناہ ہے) اگر کسی نے شک کے دن کوئی اور واجب روزہ رکھا تو بھی گناہگار ہوگا کیونکہ شک کے دن روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے لہٰذا یہ روزہ ہو تو جائے گا لیکن مکروہ ہوگا حالانکہ یہ کامل واجب تھا۔ اگر بعد میں یہ معلوم ہو جائے کہ رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا ہے تو رمضان کا روزہ ہو جائے گا اگر واضح ہو گیا کہ شعبان باقی تھا تو ایک قول کے مطابق یہ نفلی روزہ ہوگا کیونکہ جو کامل واجب ہے وہ اس دن کو ادا نہیں ہو سکتا جس دن روزہ رکھنے کی ممانعت ہو۔ بعض کہتے ہیں جس واجب کی نیت کی ہے وہ ہوگا۔ ہدایہ نے اسی قول کو درست قرار دیا ہے کیونکہ مطلقاً روزے سے نہیں روکا گیا بلکہ رمضان کی نیت سے روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور کراہت اس وجہ سے ہے کہ نہی تو بہر حال موجود ہے۔ صاحبِ ہدایہ کا قول محلِ نظر ہے۔ انشاء اللہ اس کی وضاحت عنقریب ہو جائے گی۔

شک کے دن نفلی روزہ بلاشبہ اس شخص کے حق میں جائز ہے جس کے معمول میں آ رہا ہو مثلاً ایک شخص کا یہ معمول ہے کہ وہ ہر ماہ کے آخری تین یا دو دنوں میں روزہ رکھتا ہے یا پورے شعبان' نصف شعبان یا آخری عشرہ میں روزے رکھتا ہے۔ اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔

یوم شک کو نفلی روزہ رکھنا

شک کے دن خالصتاً نفلی روزے کی نیت سے یا مطلق روزہ کی نیت کر کے روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہے۔ یہ احناف کا مؤقف ہے جبکہ امام شافعی اسے مکروہ بلکہ حرام خیال کرتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

لاتقدموا رمضان بصوم یوم اویومین الارجلا یصوم فیصومہ۔ رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھو ہاں وہ شخص رکھ سکتا ہے جو پہلے رکھتا ہو۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے صحاح کے چھ راویوں نے روایت کیا ہے۔

ہدایہ میں امام شافعی علیہ الرحمہ کو یہ جواب دیا گیا ہے کہ حدیث میں مطلق روزے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ رمضان کی نیت سے روزہ رکھنے سے روکا گیا ہے۔ صاحبِ ہدایہ اپنے مؤقف کی تائید میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد

نقل کرتے ہیں۔

لایصام فی الیوم الذی یشک فیه انه من رمضان الاتطوعا۔ جس دن کے رمضان ہونے میں شک ہو اس دن روزہ نہ رکھا جائے مگر نفلی۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس حدیث کا ماخذ معلوم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔
ہم اپنے مذہب کی تائید میں وہی حدیث پیش کرتے ہیں جو امام احمد یوم شک کے روزے کی فرضیت کے بارے پیش کرتے ہیں۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لرجل هل صمت من سرر شعبان قال لا قال فاذاافطرت فصم یوما. (رواہ ابوداؤد) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا: کیا آپ نے شعبان کے آخر میں روزہ رکھا؟ انہوں نے عرض کیا نہیں حضور ﷺ نے فرمایا: جب تو نے روزہ نہیں رکھا تو تو ایک دن روزہ رکھ۔

اسی طرح کی حدیث صحیحین میں بھی ہے۔
شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مبارک لا تقدموا شهر رمضان بصوم یوم او یومین (رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھو) سے متعارض ہے۔ اس تعارض کو صرف اس صورت میں ختم کیا جا سکتا ہے کہ نہی کو اس معنی پر محمول کیا جائے کہ رمضان کی نیت سے روزہ رکھنا جائز نہیں اور مذکورہ حدیث (رواہ ابوداؤد) کو مستحب روزہ پر محمول کیا جائے تا کہ وہ حدیث صوموا بالرؤیة الخ کے معارض نہ رہے۔

یہ بندہ (مصنف کتاب) کہتا ہے کہ حدیث ''رمضان سے پہلے ایک یا دو دن روزہ نہ رکھو'' کو شیخ ابن الھمام اور صاحبِ ہدایہ نے جس معنی پر محمول کیا ہے وہ بہت دور کا معنی بنتا ہے۔ اگر حدیث کو اس معنی پر محمول کریں تو استثناء صحیح نہیں کیونکہ اس معنی کی رو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو روزوں کا عادی ہے اور جس کے معمول میں شک کا روزہ آ گیا ہے وہ رمضان کی نیت سے روزہ رکھ لے کیونکہ مستثنیٰ پر مستثنیٰ منہ سے مخالف حکم لگتا ہے جیسا کہ ہمارے محقق مشائخ اور ائمہ ثلاثہ کے متبعین کی تصریحات موجود ہیں پھر اس حدیث کو اس لئے بھی اس پر محمول نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ دن شک کا دن نہ ہو تو یہ حکایت حال ہو گی اور ہو سکتا ہے وہ دن یوم شک نہ ہو پھر دوسری حدیث کو ندب پر محمول کرنا جیسا کہ آن عظیم علماء نے فرمایا ہے بہت ہی بعید کا معنی ہے کیونکہ امر کا صیغہ جو قضاء کو واجب کرنے والا ہے ترک مندوب میں وہ صحیح نہیں ہے ورنہ امر اپنے ظاہر سے ہٹ جائے گا اور ایسے میں امر کے صیغے کا استعمال بے معنی ہو گا کیونکہ مندوبات کی قضا ہوتی ہی نہیں اور یہ اسی طرح ہو گا کہ کوئی ایام بیض کے نفلی روزوں کی قضا کا حکم دے اور نفلی روزوں کی قضا ہوتی ہی نہیں اس لئے تعارض کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ ہو سکتا ہے مخاطب نے شعبان کے آخری روزہ کی نذر مانی ہو۔ بخاری کی روایت میں صم یومین (دو دن روزہ رکھو) کے الفاظ ہیں لہٰذا یہ شک کے دن کا روزہ ہی نہیں بنتا کیونکہ شک کا دن ایک ہی ہو سکتا ہے دو نہیں۔ ابن اثیر جامع الاصول میں فرماتے ہیں کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس آدمی نے شعبان کے دو آخری دنوں میں روزہ رکھنے کی نذر مانی تھی اور نذر کے ذریعے یہ دونوں روزے اپنے اوپر واجب کر لئے تھے۔ جن کو پورا کرنا مستحب تھا ورنہ وہ شوال میں قضاء کرتا۔ جب

صورت حال یہ ہوگی تو نہی والی حدیث اپنے عموم پر رہے گی اور اس کو خاص نہیں کیا جائے گا۔

یوم شک کے دن روزہ رکھنے کے بارے نہی وارد ہوئی ہے۔

فعن صلة بن زفر قال كنا عند عمار في اليوم الذي يشك فيه من شعبان او رمضان فاتيناه بشاة مصلية فنحي بعض القوم فقال انى صائم فقال عمار من صام يوم الشك فقد عصى ابا القاسم صلى الله عليه وسلم. (رواہ اصحاب السنن الثلاثۃ)

صلہ بن زفر سے روایت ہے کہ ہم حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے پاس تھے۔ شک تھا کہ نہ جانے شعبان کا دن ہے یا رمضان کا ہم بھونی ہوئی بکری لے کر آپ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ کچھ لوگ وہاں سے ہٹ گئے اور کہنے لگے ہمیں تو روزہ ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے شک کے دن روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔

اس حدیث کے بارے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رمضان کی نیت سے روزہ رکھنے کے بارے ہے کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ہم نشین یہ لوگ یوم شک کو رمضان کا روزہ رکھتے کیونکہ رمضان تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا تھا۔

عن سماك قال عكرمة في يوم شكل فيه اهو من رمضان او من شعبان وهو ياكل خبزا او بقلا ولبنا فقال لي هلم فقلت اني صائم فقال وحلف بالله لتفطرن قلت سبحان الله مرتين فلما رأيته يحلف ولا يستثني فتقدمت فقلت هات الآن ما عندك قال سمعت ابن عباس يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم صوموا الرؤية وان حال بينكم سحابة وظلمة فاكملوا العدة عدة شعبان ولا تستقبلوا الشهرا قبالا ولا تصلوا رمضان بيوم من شعبان. (رواہ النسائی)

حضرت سماک سے روایت ہے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روٹی، سبزی اور دودھ تناول فرما رہے تھے۔ شک کا دن تھا اور معلوم نہیں تھا کہ رمضان کا دن ہے یا شعبان کا انہوں نے مجھ سے فرمایا آؤ۔ میں نے عرض کیا میں روزے سے ہوں۔ فرمانے لگے بخدا تم ضرور افطار کرو گے۔ میں نے دو مرتبہ سبحان اللہ کہا (یعنی انکار کیا کہ روزہ کیسے توڑ دوں) جب میں نے دیکھا کہ آپ قسم اٹھا رہے ہیں اور روزہ ہر حال میں تڑوانا چاہتے ہیں تو میں آگے بڑھا اور عرض کیا۔ اب لاؤ جو آپ کے پاس ہے۔ فرمانے لگے میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چاند دیکھ کر روزہ رکھو۔ اگر بادل اور تاریکی حائل ہو جائیں تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔ نہ تو رمضان کے مہینے کا آگے بڑھ کر استقبال کرو اور نہ رمضان کو شعبان کے دن کے ساتھ ملاؤ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شعبان کے آخر میں شعبان کے روزے کی نیت کر کے بھی روزہ ممنوع ہے۔[1] اس نہی (لا تصلوا) کا دوسری نہی (لا تستقبلوا) پر عطف ہے۔ سو دونوں کے درمیان مغایرت ضروری ہے۔ استقبال رمضان سے مراد یہ ہے کہ ایک یا دو دن قبل رمضان کی نیت سے روزے رکھے جائیں اور رمضان کو شعبان

[1] وان حال بينكم سحابة و ظلمة فاكملوا العدة عدة شعبان و لا تستقبلوا الشهرا قبالا و لا تصلوا رمضان بيوم من شعبان.

سے ملانے کا مطلب یہ ہے کہ نفلی روزے رکھ کر شعبان کو ملا نہ دیا جائے۔ ترکیب میں فاکملوا کے بعد والا کلام وان حال بینکم سحابة وظلمة کی جزاء ہوگا۔ یہ حدیث شک کے ساتھ خاص ہے۔

یہاں جس کراہت کی بات ہو رہی ہے (احناف کے نزدیک شک کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے) وہ کراہت تحریمی ہے۔ یہی زیادہ قرین قیاس محسوس ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں لفظ عصیان آیا ہے۔ اگر شک کے دن کوئی دوسرا واجب روزہ رکھا تو جائز نہیں ہوگا۔ اگر چہ بعد میں معلوم ہو گیا کہ یہ دن شعبان کا تھا کیونکہ ایک کامل روزہ ایسے دن نہیں رکھا جا سکتا جس میں روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہو۔ ہاں اگر کسی نے نفلی روزہ رکھا تو نفلی روزہ ہو جائے گا لیکن رکھنے والا گناہگار ہوگا کیونکہ شرعیات میں نہی اصل کی مشروعیت کا موجب ہوتی ہے لیکن وصف کے لئے مشروعیت نہیں بنتی۔

اگر نیت میں تردّد ہو

اگر نیت میں تردد ہو مثلاً اگر رمضان ہوا تو روزہ ہوگا' شعبان ہوا تو روزہ نہیں ہوگا تو ایسی نیت معتبر نہیں ہوگی اگر روزے کی پختہ نیت کی لیکن صفت میں تردد ہے کہ رمضان ہوا تو رمضان کا روزہ ہو جائے گا ورنہ نفلی روزہ ہوگا تو ایسی صورت میں اس کا روزہ ہو جائے گا لیکن رمضان کی نیت کے شبہے کی وجہ سے بالاتفاق مکروہ ہوگا۔ اگر ایسی صورت میں معلوم ہو گیا کہ رمضان شروع ہو چکا ہے تو نیت کی وجہ سے رمضان کا روزہ ہوگا اگر رمضان نہیں تو نفلی روزہ ہوگا کیونکہ نفلی روزہ بھی محض روزے کی نیت سے ہو جاتا ہے۔

شک کے دن نصف النہار تک کچھ نہیں کھانا چاہئے تاکہ جب کسی سے یہ معلوم ہو جائے کہ رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا ہے تو آدمی نیت کر کے رمضان شریف کا روزہ رکھ لے۔ مشائخ نے فرمایا ہے کہ نصف النہار شرعی سے قبل تک انتظار کرنے کے بعد اگر کہیں سے کوئی خبر موصول نہ ہو تو عوام الناس کھا پی لیں لیکن خواص نفلی روزہ مکمل کریں۔ خواص سے مراد وہ لوگ ہیں جو نفل اور فرض کی نیت کے فرق کو جانتے ہیں تاکہ صرف نفلی روزہ کی نیت ہو اور یہ نیت فرض کی نیت سے مختلط نہ ہو۔

روزہ کے ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کی صورتیں

جب روزہ دار بھول کر کچھ کھا پی لے یا جماع کر بیٹھے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ امام مالک فرماتے ہیں ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ رکن کے فوت ہونے سے عبادت پوری فوت ہو جاتی ہے جیسے بھولے سے نماز میں گفتگو کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

ہماری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ یہ حدیث ہے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

اکل وشرب ناسیا فلا یفطر فانما هو رزق رزقه الله تعالی. (رواہ البخاری ومسلم)

جس نے بھول کر کچھ کھا پی لیا وہ افطار نہ کرے یہ درحقیقت وہ رزق ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے نوازا ہے۔

من نسی وهو صائم فاكل وشرب فليتم

جو بھول گیا حالانکہ وہ روزے سے تھا اور کھا پی لیا تو وہ اپنا

صومہ فانما اطعمہ اللہ وسقاہ. روزہ پورا کرے اسے اللہ تعالیٰ نے ہی کھلایا اور پلایا ہے۔

مالکی کہتے ہیں کہ ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ روزہ تو ٹوٹ گیا ہے لیکن دن کا باقی حصہ وہ کھانے پینے اور جماع سے مجتنب رہے۔ ان کا یہ کہنا بالکل درست نہیں کیونکہ امام ترمذی کی مذکورہ بالا حدیث اس مفہوم کو رد کرتی ہے پھر روزہ ٹوٹنے کی جو علت ہے اس کی نسبت یہاں مکلف کی طرف نہیں ہوسکتی کیونکہ نسیان اس کا پیدا کردہ ہے جس نے روزہ فرض کیا ہے اور روزہ دار اس میں بے اختیار ہے اور روزہ میں کوئی مذکر[1] (یاد دلانے والی چیز) بھی نہیں اس لئے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اس کو نماز پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نماز میں مذکر (یاد دلانے والا) ہے اور دونوں کی علت مختلف ہے۔ (ایک کی علت کھانا پینا ہے اور دوسری کی گفتگو)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خطا[2] اور زبردستی روزہ تڑوانے کی صورت میں بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ وہ فرماتے ہیں نسیان کی طرح خطاء اور اکراہ[3] (مجبور کر دینا) میں بھی صحیح ارادہ معدوم ہے۔ دوسرا وہ اس حدیث مشہور سے استدلال کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے خطاء، نسیان اور اکراہ سے درگزر فرمایا ہے۔ میری امت سے خطاء اور بھول کو اٹھالیا گیا ہے"۔

ہم کہتے ہیں کہ خطا اور اکراہ کھا پی لیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ منافی (کھانا پینا) آدمی کی تقصیر کی وجہ سے پایا جا رہا ہے کیونکہ اس نے احتیاط نہیں کی اور عزیمت[4] کی راہ ترک کی ہے لیکن ایسی صورت میں اس پر لازم ہے کہ وہ روزہ داروں کی طرح غروب آفتاب تک کھانے پینے سے احتراز کرے کیونکہ رمضان شریف کی تعظیم کا یہی تقاضا ہے۔ چونکہ یہ غلطی بڑی نہیں اس لئے قضاء ہوگی کفارہ نہیں ہوگا۔

خطاء اور اکراہ کو نسیان پر محمول نہیں کر سکتے کیونکہ نسیان فعل کی نسبت بندے کی طرف نہیں ہوسکتی لیکن خطاء کی نسبت بندے کی طرف ہوگی اور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے احتیاط نہیں کی اسی طرح اکراہ میں روزہ ٹوٹنے کی وجہ بھی انسان کی اپنی کمزوری ہے اگر وہ چاہتا تو عزیمت کا مظاہرہ کرتا اور روزہ نہ توڑتا۔ رہی یہ بات کہ اس حدیث کو کس معنی پر محمول کریں گے تو ظاہر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی امتی نے خطأً گناہ کیا یا اسے گناہ کرنے پر مجبور کیا گیا اور اس وجہ سے اس سے خلاف مشروع فعل صادر ہوگیا تو ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

بوس و کنار سے روزہ نہیں ٹوٹتا جب تک انزال نہ ہو

بوس و کنار سے روزہ نہیں ٹوٹتا تاوقت یہ کہ انزال ہو جائے۔ اگر بوس و کنار کرتے ہوئے انزال ہوگیا تو روزہ

---

[1] نماز پڑھتے ہوئے انسان ہاتھ باندھ کر قبلہ رو کھڑا ہوتا ہے یا بیٹھا ہوتا ہے یا پھر رکوع وسجود میں ہوتا ہے۔ یہ خاص ہیئت اس کو یاد دلانے کے لئے کافی ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے۔ اگر پھر بھی وہ گفتگو کرتا ہے تو اس میں نمازی کا اپنا قصور بھی موجود ہے کہ وہ نماز کی طرف متوجہ نہیں رہا لیکن روزہ میں ایسی خاص ہیئت نہیں جو اسے یاد دلائے کہ وہ روزہ سے ہے۔

[2] مثلاً کلی کرتے یا غسل کرتے ہوئے پانی اندر چلا گیا۔

[3] کسی نے روزہ دار سے کہا کہ روزہ توڑ ورنہ قتل کر دوں گا۔

[4] قتل کی دھمکی سے روزہ توڑ دینے کی رخصت ہے لیکن اگر کوئی ڈٹ جاتا ہے اور روزہ نہیں توڑتا تو یہ عزیمت ہے۔

ٹوٹ جائے گا' قضا لازم آئے گی کفارہ نہیں دینا پڑے گا۔

اس مسئلہ میں بعض شیعوں نے اختلاف کیا ہے۔ ہماری دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة الصديقة كان النبي صلى الله عليه وسلم يقبل ويباشر وهو صائم كان املككم لاربة. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ روزے کی حالت میں بوس و کنار کرتے تھے اور آپ ﷺ کو تم سب سے زیادہ اپنی خواہش نفسانی پر ضبط تھا۔

آخری الفاظ اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ رسول خدا ﷺ کا بوس و کنار انزال تک نہیں پہنچتا تھا بلکہ انزال سے پہلے آپ الگ ہو جاتے تھے۔

عن عمرو بن سلمة انه سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم ايقبل الصائم قال سل ام سلمة عن ذلك فاخبرته ان رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعل ذلك فقال يا رسول الله قد غفر الله لك ماتقدم من ذنبك وما تاخر فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم اما والله انى لاتقاكم لله واخشاكم له. (رواہ مسلم)

حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا روزہ دار بوسہ لے سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے بارے اُم سلمہ سے پوچھے (انہوں نے حضرت ام المؤمنین ام سلمہ سے پوچھا تو) انہوں نے فرمایا رسول اللہ ﷺ بوس و کنار کرتے ہیں۔ حضرت عمرو نے عرض کیا یا رسول اللہ! کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے تمام بظاہر خلاف اولیٰ کاموں کو بخش دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: مگر پھر بھی بخدا میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے لئے تقویٰ اختیار کرنے والا اور اس سے ڈرنے والا ہوں۔

عن جابر ان امير المؤمنين عمر بن الخطاب قال هششت فقبلت وانا صائم فقلت يا رسول الله صنعت امرا عظيما قبلت وانا صائم قال رأيت لو مضمضت بالماء وانت صائم قلت لاباس قال فمه (رواہ ابوداؤد)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے خوش ہو کر بوسہ لے لیا حالانکہ میں روزے سے تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر دیا کہ میں نے روزے کی حالت میں بوسہ لے لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا خیال ہے روزے کی حالت میں تو اگر کلی کرے تو روزہ ٹوٹ جائے گا میں نے عرض کیا نہیں کوئی حرج نہیں۔ فرمایا تو پھر بوسے سے بھی نہیں ٹوٹتا۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ بوس و کنار سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن جب بوس و کنار کرتے ہوئے انزال ہو گیا تو خواہش پوری ہو گئی لہٰذا معناً یہ بھی جماع ہے جس سے روزہ ٹوٹ گیا لیکن چونکہ چھوٹی جنایت ہے کیونکہ اس میں جماع کی صورت نہیں لہٰذا قضاء ہو گی کفارہ نہیں دینا پڑے گا۔

بوس وکنار سے روزہ مکروہ بھی نہیں ہوتا بشرطیکہ روزہ دار کو یقین ہو کہ نہ تو انزال ہوگا اور نہ بوس وکنار جماع کی طرف لے جائے گا کیونکہ حضور علیہ السلام نے خود روزے کی حالت میں بوس وکنار کیا' ہاں اگر دونوں میں سے کسی ایک کا خوف ہو تو پھر بوسہ دینا اور بغل گیر ہونا مکروہ ہے کیونکہ جو چیز حرام ہے اس کے دواعی سے بچنا ضروری ہے۔ ام المؤمنین کی حدیث میں اس بات کا اشارہ بھی موجود ہے جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں۔

عن ابی هريرة ان رجلا سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المباشرة للصائم فرخص له واتاه آخر فسأله فنهاه عنه فاذا الذی رخص له شیخ واذا الذی نهاه شاب. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ علیہ السلام سے پوچھا کیا روزہ دار اپنی بیوی سے بغل گیر ہو سکتا ہے؟ تو رسول اللہ علیہ السلام نے اسے اجازت دے دی اور دوسرا آیا اس نے بھی یہی سوال کیا تو آپ علیہ السلام نے اسے منع فرما دیا۔ جس کو آپ نے رخصت دی تھی وہ بوڑھا تھا اور جس کو آپ علیہ السلام نے منع فرمایا تھا وہ جوان تھا۔

اس حدیث پاک میں غور وفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصل میں رخصت ضبط نفس کی بناء پر ہے اور اس میں جوان یا بوڑھے کو کوئی دخل نہیں۔ اگر ایک بوڑھے شخص کو یہ اندیشہ ہے کہ بوس وکنار سے انزال ہو جائے گا یا جماع کر بیٹھے گا تو اس کے لئے اجازت نہیں کہ وہ بوس وکنار کرے اگر جوان ہے اور امن سے ہے تو اسے اجازت دی جائے گی۔ بوس وکنار کے حکم کا دارومدار درحقیقت امن پر ہے۔

احتلام اور شہوت کی نظر سے دیکھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ ان میں ایسی کوئی چیز نہیں جو روزے کے منافی ہو' احتلام کے بارے تو حدیث پاک بھی آئی ہے جسے انشاء اللہ عنقریب ذکر کریں گے۔

مشت زنی سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

مشت زنی سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یہی صحیح رائے ہے اور اسی پر فتویٰ ہے کیونکہ اس طرح انسان اپنے اختیار سے شہوت کا ازالہ کرتا ہے اس لئے یہ جماع کا معنی رکھتی ہے۔ ویسے مشت زنی ہے حرام۔ قطعی احادیث سے اس فعل شنیع کی حرمت کو بیان کیا گیا ہے جیسا کہ رسول اللہ علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے:

ناكح اليد ملعون. ہاتھ سے نکاح کرنے والا ملعون ہے۔

لیکن فقہا فرماتے ہیں اگر دفع شہوت کے لئے کوئی شخص مشت زنی کرتا ہے نہ کہ قضائے شہوت کے لئے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس طرح وہ بڑے گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔[1]

حالتِ جنابت میں روزہ رکھنا

حالتِ جنابت میں صبح کرنے سے روزہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔

عن ام المؤمنين عائشة و ام المؤمنين ام

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ام المؤمنین

---

[1] حرمت قطعی ہے۔ نص کے مقابلے میں قیاس کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا مشت زنی کی کسی صورت اجازت نہیں۔ جمہور فقہاء اسے حرام کہتے ہیں۔

سلمة قالتا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليصبح جنبا من جماع غير احتلام في رمضان ثم يصوم. (رواہ البخاری ومسلم)

سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان شریف کے مہینے میں جماع نہ کہ احتلام سے حالت جنابت میں صبح کرتے اور پھر روزہ رکھ لیتے۔

اس کی دوسری دلیل یہ آیت کریمہ ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ. (البقرۃ:۱۸۷)

روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال ہوا۔

جب پوری رات کے کسی حصے میں جماع کرنا جائز ہوا تو اس سے حالت جنابت میں صبح کرنا لازم آیا۔ اسی آیت کے آخر میں فرمایا:

فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ. (البقرۃ:۱۸۷)

تو اب ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھا ہے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے ظاہر ہو جائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے (پو پھٹ کر) پھر رات آنے تک روزے پورے کرو۔

غایت (حتی) کا تعلق مباشرت (باشروھن) کھانے اور پینے سے ہے (یعنی مباشرت اور کھانا پینا اس وقت تک حلال ہے جب تک صبح نہیں ہو جاتی) اگر اس کا تعلق مباشرت سے نہ جوڑیں تو مطلب یہ ہوگا کہ دن کے وقت بھی روزے کی حالت میں جماع جائز ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ سو جماع صبح تک جائز ہے اور صبح تک جماع کی حلت حالت جنابت میں صبح کرنے کو مستلزم ہے۔ لہٰذا اگر صبح حالت جنابت میں ہو تو روزہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔

روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا

سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن انس قال جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال اشتكت عيني فاكتحل وانا صائم قال نعم. (رواہ الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میری آنکھ دکھتی ہے میں روزے کی حالت میں سرمہ لگا لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔

وكان انس بن مالك يكتحل وهو صائم. (رواہ ابوداؤد)

حضرت انس بن مالک روزے کی حالت میں سرمہ لگا لیا کرتے تھے۔

رہی وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کو اثمد (سرمے کا پتھر) کے استعمال کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزہ دار کو بچنا چاہئے۔ ابوداؤد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے یحییٰ بن معین نے کہا یہ حدیث منکر ہے۔ فقہ کی رو سے روزہ صرف اس چیز سے ٹوٹتا ہے جو جسم میں کسی راستے سے جائے جبکہ آنکھ اور حلق کے درمیان کوئی سوراخ نہیں ہے۔ آنکھ میں سے حلق تک اگر کوئی چیز پہنچتی ہے تو وہ مساموں کے ذریعے جاتی ہے اور مسام کے

ذریعے اگر کوئی چیز داخل ہوتی ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا جیسے غسل سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگرچہ مساموں کے ذریعے پانی کی ٹھنڈک جوف تک پہنچ جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے روزہ دار کے لئے مکروہ قرار دیا ہے کہ وہ ٹھنڈک کے لئے غسل کرے یا گیلا کپڑا جسم پر رکھے کیونکہ اس طرح عبادت میں جس مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ زائل ہو جاتی ہے اور مشقت کا ازالہ مکروہ ہے اس لئے نہیں کہ غسل روزے کے فساد کی طرف لے جاتا ہے اسی لئے تیل خواہ کوئی سا ہو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

روزہ کی حالت میں قے کے متعلق ائمہ احناف کا مؤقف

روزہ دار کو اگر قے ہو جائے اور وہ اسے روکے نہیں بلکہ قے کر دے تھوڑی ہو یا زیادہ روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اگرچہ قے خود بخود واپس لوٹ جائے یا وہ آدمی لوٹا لے' تھوڑی ہو یا زیادہ روزہ فاسد نہیں ہوگا اس پر فتویٰ ہے۔

حضرت امام ابو یوسف علیہ الرحمہ فرماتے ہیں قے اگر منہ تک آئی اور خود بخود لوٹ گئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر روزہ دار نے جان بوجھ کر واپس نگل لی تو تب ٹوٹے گا خود بخود اندر لوٹ گئی تو نہیں ٹوٹے گا کیونکہ وہ اپنے اختیار سے نگل رہا ہے اس لئے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ تھوڑی واپس لوٹ بھی جائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ تھوڑی نجاست ہو تو اسے نجاست کا خروج شمار ہی نہیں کرتے حتیٰ کہ اس سے طہارت بھی نہیں ٹوٹتی۔ اس میں یہ بات بھی ہے کہ تھوڑی قے معدے کے منہ سے آتی ہے جس کے ساتھ نجاست شامل نہیں ہوتی اس وجہ سے نہیں کہ کچھ باہر نہیں آیا۔

اگر کوئی جان بوجھ کر قے کرتا ہے تو تھوڑی کرے یا زیادہ روزہ ٹوٹ جائے گا بشرطیکہ اسے یاد ہو کہ وہ روزہ سے ہے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اگر روزہ دار خود قے کرے اگر تھوڑی ہے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

ہماری دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد ہے۔ ''جس نے قے کی جبکہ وہ روزے سے تھا تو اس پر قضاء ہے اور جس کو قے ہو گئی تو اس پر قضاء نہیں۔'' اسے امام مالک نے روایت کیا ہے۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من ذرعہ القیئ وھو صائم فلیس علیہ قضاء ومن استقاء فلیقض. (رواہ الترمذی وابوداؤد)	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو روزے کی حالت میں قے ہو جائے اس پر قضا نہیں اور جو خود قے کر دے تو وہ روزہ قضاء کرے۔

امام ترمذی کی روایت میں ''جان بوجھ کر'' کے الفاظ ہیں۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے ہم اسے ہشام بن حسان عن ابن سیرین عن ابی ہریرہ کی سند سے نہیں جانتے۔ ہمارے پاس یہ حدیث عیسیٰ بن یونس کے ذریعے پہنچی ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں میں اس حدیث کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ اسی لئے صاحب فتح القدیر فرماتے ہیں کہ راوی نے خود تصدیق کر دی کہ حدیث محفوظ نہیں تو پھر مزید کسی گفتگو کی کیا ضرورت ہے؟ یہ حدیث شاذ

اور مقبول ہے۔

انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

یہ حدیث مبارک عام ہے' قے واپس لوٹے یا نہ لوٹے اگر خود قے کی ہے تو اس کا روزہ نہیں رہا۔

جب روزہ دار قے کو لوٹا دیتا ہے تو کیوں اس کا روزہ فاسد ہو جاتا ہے؟ علماء فرماتے ہیں کہ قے کے بعد اس نے جان بوجھ کر قے کو واپس لوٹایا ہے اور ظاہر ہے باہر سے کوئی چیز پیٹ میں داخل کرنا روزے کو توڑ دیتی ہے۔

عن ابی الدرداء ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاء وافطر قال معدان فلقیت ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد دمشق فقلت ان ابا الدرداء حدثنی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاء وافطر قال صدق وانا صببت لہ وضوء. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابودرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قے کی (جان بوجھ کر نہیں) اور روزہ افطار کر دیا۔ معدان کہتے ہیں کہ میں دمشق میں رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا اور کہا کہ حضرت ابودرداء نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو قے ہو گئی اور آپ ﷺ نے روزہ افطار کر دیا۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ابودرداء نے سچ کہا۔ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں پر پانی انڈیلا۔

تو یہ حدیث اس پر دال نہیں کہ قے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے حدیث میں صرف یہ خبر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو قے ہو گئی اور آپ ﷺ نے روزہ افطار کر لیا۔ ممکن ہے قے کی وجہ سے آپ نے اپنے جسم میں کمزوری محسوس کی ہو اور روزہ توڑ دیا ہو کیونکہ یہ واقعہ نفلی روزے کا ہے اور نفلی روزہ توڑ دینے میں حرج نہیں۔ اس سے یہ دلیل اخذ نہیں کی جا سکتی کہ قے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ابن ماجہ علیہ الرحمہ نے بھی اس واقعہ کو نقل فرمایا ہے اور تصریح کی ہے کہ یہ نفلی روزہ تھا اور نفلی روزہ معمولی عذر کی وجہ سے توڑا جا سکتا ہے۔

پچھنے لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

پچھنے لگانا اور فصد کرانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ امام احمد فرماتے ہیں پچھنے لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

عن ثوبان ان النبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال افطر الحاجم والمحجوم.

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے فرمایا پچھنے لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

اس کے علاوہ دوسرے طرق سے بھی یہ حدیث روایت ہوئی ہے۔

ہماری دلیل ابن عباس سے روایت کردہ حدیث ہے۔

عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احتجم وھو محرم واحتجم وھو

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ۔ حالت احرام میں بھی پچھنے لگوائے اور حالتِ صیام میں بھی۔

صائم۔ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث خاص انہیں لوگوں کے لئے حکم کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم تھا کہ یہ دونوں مفطر ہیں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھنے لگانے والا چونکہ خون چوستا ہے اس لئے اور جسے پچھنے لگائے جاتے ہیں اس کا خون نکلتا ہے اس لئے کمزور ہو جاتے ہیں لہٰذا ان کو روزہ توڑ دینے کا حکم دیا جارہا ہے۔ اگر اس سے کمزوری محسوس نہ ہو تو روزہ مکروہ تک نہیں ہوتا چہ جائیکہ ٹوٹ جائے۔

قال ثابت سئل انس اکنتم تکرھون الحجامة للصائم علی عھد رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا الامن الضعف۔

(رواہ البخاری)

حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا آپ لوگ رسول اللہ ﷺ کے دور میں روزہ دار کے پچھنے لگوانے کو ناپسند کرتے تھے؟ (حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے) جواب دیا نہیں۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

قال انس اول ما کرھت الحجامة للصائم ان جعفر بن ابی طالب احتجم وھو صائم فمر برسول الله صلی الله علیه فقال افطر ھذا ثم رخص رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الحجامة بعده للصائم وکان انس یحتجم وھو صائم۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سب سے پہلے اسے روزہ دار کے لئے اس وقت ناپسند کیا گیا جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پچھنے لگوائے اور وہ روزے سے تھے۔ اس کے بعد ان کا گزر رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا روزہ توڑ دے مگر اس کے بعد آپ نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوانے کی اجازت دے دی۔ حضرت انس خود پچھنے لگواتے تھے حالانکہ وہ روزے سے ہوتے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے دارقطنی نے بیان کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

لہٰذا وہ حدیث منسوخ ہے جس میں پچھنے لگوانے کے بعد روزہ توڑنے کا حکم ہے۔ امام احمد کے استدلال کا صحیح جواب یہی ہے۔

گرد وغبار وغیرہ کا منہ میں داخل ہونا

اگر بغیر ارادے اور کوشش کے کوئی چیز منہ میں چلی جائے اور اس سے بچنا ناممکن ہو مثلاً دھواں اور گرد وغبار تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ انسان پر صرف اسی قدر حکم لاگو ہوتا ہے جس کی وہ استطاعت رکھتا ہے۔ اگر کسی نے تمباکو نوشی کرتے ہوئے دھواں منہ میں داخل کر دیا جیسا کہ آج یہ چیز عام ہے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ اس سے عادی لوگوں کو فرحت اور تسکین ملتی ہے۔ ہمارے نزدیک اگر مکھی حلق میں چلی گئی تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ اس پر انسان کو اختیار نہیں جس طرح دھواں حلق میں چلا جائے تو عدم اختیار کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

اگر آنسو اور پسینہ حلق میں چلے گئے اور ان کی ملاحت محسوس ہوئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا اگر ملاحت محسوس نہیں

ہوئی تو روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ وہ ہونٹوں سے آگے نہیں آئے۔ قاضی خان کے فتاویٰ کی اس عبارت "اگر پسینہ یا آنسو یا نکسیر کا خون اندر چلا گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔" کو فتح القدیر میں اسی مفہوم پر محمول کیا گیا ہے (یعنی حلق میں اثر محسوس ہو تو تب روزہ ٹوٹے گا)۔

بارش اور برف کے منہ میں جانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

بارش اور برف کے بارے صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' وجہ یہ ہے کہ ہونٹ بند کر کے کسی خیمہ یا چھت کے نیچے کھڑے ہو کر بارش اور برف باری سے بچنا ممکن ہے۔

معمولی چیز کھانے کے بارے حکم

تھوڑی سی چیز جو چنے کے دانے سے چھوٹی ہے اگر روزہ دار اسے چبا لے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ چبانے سے وہ ختم ہو جاتی ہے اور حلق تک کچھ نہیں پہنچ پاتا کہ روزہ ٹوٹے ہاں اگر بغیر چبائے نگل لے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ علماء نے اس رائے کو امام محمد کے اس قول سے اخذ کیا ہے کہ اگر تل دانتوں میں تھا اور روزہ دار نے اسے نگل لیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اگر باہر سے منہ میں لے کر نگلا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

اگر گوشت کا چنے کے دانے سے چھوٹا ٹکڑا جو دانتوں میں پھنسا تھا نگل لیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا بخلاف امام زفر کے' روزہ نہ ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے کہ قلیل دانتوں کے تابع ہے جس طرح تھوک۔ اگر گوشت کے ٹکڑے کو باہر نکال کر کھایا تو روزہ ٹوٹ جائے گا جیسے تل کے بارے ابھی بات ہو رہی تھی۔ اگر چنے کے دانے سے چھوٹا نہیں بلکہ اس کے برابر ہے تو بہر حال روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ عموماً اتنا گوشت دانتوں میں نہیں پھنستا۔ اس لئے اسے دانتوں کے تابع نہیں بنا سکتے۔

اگر منہ کے علاوہ کھانے پینے کی کوئی چیز داخل کی

اگر کسی نے کھانے اور پینے کی غرض سے متعاد راستے کے علاوہ کسی اور راستے سے کوئی چیز داخل کی۔ اگر وہ معدہ تک پہنچ جاتی ہے اور چیز ایسی ہے جس کا شمار غذا میں ہوتا ہے یا دوا میں تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگر دوا اور غذا نہیں تو روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

الفطر مما دخل وليس مما خرج. (رواہ البخاری)

روزہ اس چیز سے ٹوٹتا ہے جو جسم میں داخل ہو اس سے نہیں ٹوٹتا جو جسم سے خارج ہو۔

قال ابن مسعود الوضوء مما خرج والفطر مما دخل وليس مما خرج.

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ وضو اس چیز کی وجہ سے ٹوٹتا ہے جو جسم سے باہر نکلے اور روزہ ایسی چیز سے ٹوٹتا ہے جو جسم کے اندر داخل ہو نہ کہ جو جسم سے خارج ہو۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے امام عبد الرزاق علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے امیر المؤمنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ و وجوہ آلہ الکرام سے روایت کیا ہے۔

عن ام المؤمنین عائشة مرفوعاً قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما الافطار مما دخل ولیس مما خرج.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزہ ایسی چیز سے ٹوٹتا ہے جو اندر جائے ایسی چیز سے نہیں جو باہر نکلے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابویعلیٰ رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی ایک آزاد کردہ لونڈی سے روایت کیا جن کا نام سلمٰی تھا اور انہوں نے یہ حدیث ام المؤمنین سے روایت کی۔

بعض محدثین نے اس حدیث پر کلام کیا اور کہا ہے کہ جس لونڈی سے ابویعلیٰ نے یہ حدیث روایت کی وہ علوم سے واقف نہیں تھیں۔

علماء فقہ فرماتے ہیں کہ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ روزہ ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ غذا یا دوا جو چیز انسان کے بدن کے لئے سودمند ثابت ہوسکتی ہے اس کا جسم کے اندر چلا جانا۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسی اصول کی بناء پر اگر کسی نے استنجاء کرتے ہوئے مبالغہ کیا اور پانی کی تری دبر (نیچے سے) کے راستے اندر چلی گئی تو چاہئے کہ اس سے روزہ نہ ٹوٹے کیونکہ اس میں روزہ ٹوٹنے کی صورت نہیں پائی جا رہی اس لئے کہ کوئی ایسی چیز اندر نہیں گئی جو بدن کے لئے فائدہ مند ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اس اصول کی بناء پر کہا جاتا ہے کہ اگر کسی نے حقنہ کیا یا کان میں دوائی ڈالی یا ناک میں دواء ڈالی تو روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ جسم میں وہ چیز داخل ہوئی جو بدن کی صلاح کرسکتی ہے۔

اگر کسی نے کان میں پانی ڈالا یا پانی غلطی سے کان میں چلا گیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ ایسی چیز اندر گئی ہے جس نے بدن کو کچھ فائدہ نہیں دیا لیکن کسی نے اگر ناک میں پانی ڈالا تو روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ اس سے پیاس بجھ جائے گی اور فائدہ ہوگا۔

روزہ کی حالت میں عضو تناسل میں تیل یا دوائی ڈالنے پر ائمہ احناف کی وضاحت

اگر عضو تناسل کے سوراخ میں دوائی ڈالی یا تیل ڈالا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ امام ابویوسف کے نزدیک ٹوٹ جائے گا جبکہ ھدایہ میں امام محمد کا قول مضطرب ذکر کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر مثانہ میں سوراخ ہے جس سے پیشاب دھار باندھ کر نکلتا ہے (جیسے عام آدمیوں کے مثانے میں سوراخ ہوتا ہے اور اسی سوراخ کے راستے آلہ تناسل سے پیشاب زور سے نکلتا ہے) تو روزہ ٹوٹ جائے گا اگر بالفرض کسی کا سوراخ نہیں بلکہ پیشاب میں چھڑکاؤ کی کیفیت ہوتی ہے (ایسا شاید کوئی آدمی ہو جس کا پیشاب فوارے کی طرح نکلتا ہو) تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

اگر زخم بڑا ہو

اگر پیٹ میں اتنا بڑا زخم ہے کہ معدہ بھی زخمی ہے یا سر پر ایسی کاری ضرب لگی ہے کہ دماغ نظر آنے لگا ہے اور کوئی شخص معدے یا سر کے اس گہرے زخم پر تر دوائی لگاتا ہے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک روزہ ٹوٹ

جاتا ہے کیونکہ دواء کی رطوبت جب زخم کی رطوبت سے ملے گی تو زیادہ ہو جائے گی اور دواء جوف معدہ یا جوف دماغ تک پہنچ جائے گی۔ صاحبین کا موقف یہ ہے کہ روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ دوا کا پہنچنا غیر یقینی ہے۔

عورت کا گوند یا کسی دوسری چیز کو چبانا

عورت کے لئے کھانے کی کوئی چیز چبانا مکروہ ہے کیونکہ اس میں معمولی سی بے احتیاطی سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ ہاں اگر بچے کی خاطر کسی سخت خوراک کا چبانہ ضروری ہے تو حرج نہیں لیکن یہ طے ہے کہ چبانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

گوند چبانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس کا اثر پیٹ تک نہیں پہنچتا لیکن مکروہ ہے کیونکہ اگر اندر چلی گئی تو روزہ ٹوٹ بھی سکتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ یہی سوچیں گے کہ اس نے روزہ نہیں رکھا ہوا اور اس سے رمضان شریف کی بظاہر بے حرمتی ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر گوند لیس دار ہے اور اس کا ذائقہ بھی ہے تو روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ اس کے اجزاء بدن کے اندر چلے جائیں گے یہ قول بھی ہے کہ کالے رنگ کی ہو تو ٹوٹ جاتا ہے ورنہ نہیں۔ بہر حال احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ گوند کو نہ چبایا جائے۔

روزے کے علاوہ عام حالات میں عورتوں کے لئے گوند چبانا مکروہ نہیں کیونکہ یہ مسواک کا کام بھی دیتی ہے مردوں کے لئے مکروہ ہے کیونکہ اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہاں اگر کسی تکلیف کو دور کرنے کی خاطر چبانا ناگزیر ہو تو حرج نہیں۔

روزہ دار کے لئے مسواک کرنا کیسا ہے؟

مسواک سے روزے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور نہ ہی مسواک مکروہ ہے کیونکہ مسواک کی احادیث میں حکم عام ہے۔

جیسے ارشادِ نبوی ہے:

لو لا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوۃ.	اگر میں اپنی امت کے لئے اسے مشکل نہ سمجھتا تو انہیں حکم دیتا کہ ہر نماز کے ساتھ مسواک کریں۔

ایک روایت میں ''ہر وضو کے ساتھ'' الفاظ آئے ہیں اور اس میں روزہ دار یا غیر کی کوئی قید نہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

صلوۃ بسواک افضل عند اللہ من سبعین صلوۃ بغیر سواک.	مسواک کے ساتھ پڑھی گئی ایک نماز عند اللہ بغیر مسواک کے پڑھی گئی ستر نمازوں سے بہتر ہے۔

اس حدیث میں بھی حکم عام ہے اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ روزہ دار کے لئے زوال کے بعد مسواک کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس سے وہ بو ختم ہو جاتی ہے جو روزے کی وجہ سے منہ میں پیدا ہوتی ہے کیونکہ بھلائی اس عمل میں ہے جس کے نتیجے میں یہ بو

پیدا ہوتی ہے۔ مقصد بو پیدا کرنا نہیں اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

من اغبرت قدماہ فی سبیل اللہ حرمہ اللہ عن النار۔

جس کے پاؤں راہ خدا میں غبار آلود ہوئے اللہ نے اس پر جہنم کی آگ حرام فرما دی۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پاؤں کا غبار دھونا مکروہ عمل ہے۔

عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت ہے کہ میں نے معاذ بن جبل سے پوچھا میں روزے کی حالت میں مسواک کر لیا کروں؟ تو انہوں نے فرمایا ہاں۔ عرض کیا دن کے وقت کر لیا کروں؟ فرمایا: ہاں دن کے وقت بھی اگلے پچھلے پہر جب جی چاہے کر لیا کرو۔ میں نے کہا لوگ پچھلے پہر مسواک کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لخلوف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک فقال سبحان اللہ لقد امرھم بالسواک وھم یعلمون ان لابدلفی الصائم من خلوف وان استاک وما کان بالذی یامرھم ان ینتنوا افواھھم عمدا ما فی ذلک من الخیر شئی بل فیہ شرا الا من ابتلی بھلاء لا یجد منہ بدا۔

روزہ دار کے منہ کی بو عند اللہ کستوری کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ فرمانے لگے سبحان اللہ! حضور ﷺ نے تو انہیں مسواک کا حکم دیا اور یہ لوگ جانتے ہیں کہ روزہ دار کے منہ سے بہرحال بو آئے گی اگرچہ وہ مسواک ہی کرے۔ یہ لوگ تو اپنے مونہوں لو جان بوجھ کر متعفن کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ اس میں کوئی بھلائی نہیں بلکہ اس میں شر ہے ہاں اگر کسی کو کوئی تکلیف ہے جس کی وجہ سے وہ مسواک نہیں کر سکتا تو الگ بات ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔

جان بوجھ کر جماع کرنے سے کفارہ اور قضاء دونوں لازم ہوں گے

جس نے کسی ایک راستے سے (آگے سے یا پیچھے سے) جان بوجھ کر جماع کیا یا جان بوجھ کر ایسی چیز کھا پی لی جو دوا بن سکتی ہے یا غذا تو اس پر قضاء بھی لازم آئے گی اور کفارہ بھی روزہ توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ غلام آزاد کرے۔ اگر غلام نہیں تو لگاتار دو ماہ کے روزے رکھے اگر روزے بھی نہیں رکھ سکتا تو ساٹھ مسکینوں کا کھانا دے۔ ہر ایک مسکین کے بدلے نصف صاع گندم یا ایک صاع کھجور یا جو اگر ساٹھ مسکینوں کو صبح وشام کا کھانا ایک ہی دن میں کھلا دیا تو بھی جائز ہے۔ اس حکم کی بنیاد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث ہے۔

عن ابی ھریرۃ نحن جلوس عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذجاء رجل فقال یارسول اللہ اھلکت قال مالک قال وقعت علی امرأتی وانا صائم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھل تجد رقبۃ تعتقھا

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ہم بارگاہِ نبوی میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ حضور ﷺ نے پوچھا: تجھے کیا ہو گیا ہے؟ عرض کیا میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے ہم بستری کر بیٹھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیرے پاس کوئی غلام ہے جسے تو آزاد کر

قال لاقال فهل تستطيع ان تصوم شهرين متتابعين قال لا قال هل تجد اطعام ستين مسكينا قال لاقال اجلس فمكث النبي صلى الله عليه وسلم فبينما نحن على ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم بعرق فيه تمرو العرق المكتل الضخم فقال اين السائل قال اناقال خذهذ افتصدق به فقال الرجل اعلىٰ افقر مني يا رسول الله فوالله ما بين لابتيها يريد الحرمين اهل بيت افقر من اهل بيتي فضحك النبي صلى الله عليه وسلم حتى بدت انيابه ثم قال اطعمه اهلك. (رواہ البخاری ومسلم)

سکے؟ عرض کیا نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا دو ماہ کے لگا تار روزے رکھ سکتا ہے؟ عرض کیا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو کیا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے؟ عرض کیا نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ حضور ﷺ ٹھہر گئے (یعنی خاموش ہو گئے) ہم وہیں بیٹھے ہی تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عرق پیش کیا گیا جس میں کھجوریں تھیں۔ (عرق ایک پیانہ ہے) فرمایا کہ سائل کہاں ہے؟ عرض گزار ہوا کہ میں یہاں ہوں۔ فرمایا کہ انہیں لے کر خیرات کر دو۔ وہ آدمی عرض گزار ہوا یا رسول اللہ! کیا اپنے سے زیادہ غریب پر؟ خدا کی قسم ان دونوں سنگلاخ میدانوں کے درمیان کوئی گھر والے ایسے نہیں جو میرے گھر والوں سے زیادہ غریب ہوں۔ پس نبی کریم ﷺ ہنس پڑے یہاں تک کہ پچھلے دانت مبارک نظر آنے لگے پھر فرمایا کہ اپنے گھر والوں کو کھلا دو۔

یہ حدیث مختلف طرق سے روایت کی گئی ہے۔ حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ کی روایت میں ''میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے ہم بستری کر لی'' کے الفاظ ہیں۔ حدیث واضح لفظوں میں رمضان میں جماع کی بات کر رہی ہے لیکن اصل چیز بیوی سے جماع نہیں بلکہ روزے پر ظلم ہے۔ عرف میں یہی سمجھا جاتا ہے فی نفسہٖ جو چیز مباح ہے جیسے عورت سے جماع وہ کفارے کا موجب نہیں بنتی اور نہ ہی یہ چیز ہلاکت کا سبب بے حرمتی واقع ہوتی ہے۔ یہاں بھی رمضان کے روزے پر ظلم کیا گیا ہے۔ یہ زیادتی جماع کے ذریعے ہوئی ہے یہ بات کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے علماء فقہ فرماتے ہیں کہ روزے پر جب بھی ایسی جنایت ہوگی جیسے جماع کر کے کی گئی ہے وہی چیز واجب ہو جائے گی جو افطار بالجماع کے ذریعے واجب ہوئی ہے (یعنی قضاء اور کفارہ)۔

پھر جب یہ بات واضح ہو گئی کہ اس جنایت میں بیوی بھی برابر کی شریک ہے تو لامحالہ اس پر بھی کفارہ اور قضاء لازم ہوں گے بشرطیکہ وہ جماع پر راضی ہو ایسا نہیں کہ کفارہ صرف مرد پر لازم ہو جیسے امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کفارہ مرد پر لازم ہے عورت پر نہیں کیونکہ وہ فعل کا محل ہے لیکن عورت صرف فعل کا محل ہی نہیں وہ اس فعل میں شریک بھی ہے کیونکہ اس کی مرضی کے بغیر مرد کے لئے جماع کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ سو ہماری گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو چیز مرد کے حق میں بیان بن رہی ہے وہی عورت کے حق میں بھی بیان بن رہی ہے کیونکہ دونوں اس اصل میں شریک ہیں۔ یعنی دونوں جنایت علی الصوم کے مرتکب ہوئے ہیں لہٰذا شوافع کا یہ کہنا ساقط ہو گیا کہ عورت کے بارے خاموشی کفارہ کے عدم وجوب کی دلیل ہے۔

روزے کا کفارہ عورت اپنے مال سے ادا کرے گی کیونکہ یہ عبادت ہے جو تنبیہ کے طور پر واجب کی گئی ہے اور

اس میں یہ غرض بھی پوشیدہ ہے کہ جنایت کی پردہ پوشی ہو جائے۔ نہ کہ غسل کے پانی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہنا کہ مرد کے مال سے کفارہ ادا ہو گا جیسا کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کا نظریہ ہے۔

کھانے پینے سے بھی قضاء اور کفارہ لازم آئیں گے

روزہ توڑنے اور روزے پر جنایت کے سلسلے میں کھانا پینا بھی جماع کی طرح ہے۔ اگر کسی نے کچھ کھا پی لیا تو کفارہ لازم ٹھہرے گا کیونکہ عرف میں ایک ایسے جرائم پر ایک جیسی سزا خیال کی جاتی ہے۔ افطار بالجماع کا حکم نص سے ثابت ہے تو اس قسم کی جتنی بھی جنایتیں ہوں گی ان کا حکم وہی ہو گا جو افطار بالجماع کا ہو گا لہٰذا دلالت النص سے ثابت ہوا کہ کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور کفارہ وقضاء لازم ہو جاتے ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ کھانے پینے پر کوئی کفارہ نہیں ان کا خیال ہے کہ جماع پر کفارہ قیاس ہے اس لئے اس پر کسی دوسری چیز کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ گناہ کی معافی توبہ سے ہو جاتی ہے اس کی معافی کے لئے مالی جرمانہ خلاف قیاس ہے سو اس پر کھانے پینے کو قیاس کر کے کفارہ لازم نہیں کیا جا سکتا۔

ہم کہتے ہیں کہ کفارہ کے بارے جب نص موجود ہے تو معلوم ہوا کہ کفارہ کی ادائیگی توبہ کی تکمیل کے لئے ہے۔ بلا کفارہ توبہ سے بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ چاہے تو گناہ معاف کر سکتا ہے لیکن کفارہ توبہ کو کامل کرتا ہے اور اس سے قبولیت کی امید بڑھ جاتی ہے کہ انسان توبہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے مالی تاوان بھی ادا کرے۔

حدیث پاک میں بالترتیب تین چیزوں کا بیان ہے۔ یہ تین چیزیں بالترتیب واجب ہیں اس میں اختیار نہیں جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ ہے۔ کفارۂ ظہار کی طرح اگر کسی کے پاس غلام ہے تو وہ غلام آزاد کرے گا۔ غلام کی آزادی پر قادر ہوتے ہوئے وہ روزے نہیں رکھ سکتا۔ اگر غلام نہیں رکھتا جسے کفارہ میں رہا کرے تو متواتر دو ماہ روزے رکھے گا اور روزوں کی قدرت کے باوجود ساٹھ مسکینوں کو کھانا نہیں کھلا سکتا۔ اگر نہ غلام آزاد کر سکتا ہے نہ متواتر دو ماہ روزے رکھ سکتا ہے تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا۔

شیخین حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں۔ جسے ایک نظر دیکھ لینا ضروری ہے۔

ان رجــلا افــطـرفي رمضان فامره النبي صــلـى الله عليه وسلم ان يعتق رقبة اويصوم شهـريـن متتـابـعيـن اويـطعم ستين مسكينا.	ایک آدمی نے رمضان کا روزہ توڑ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے حکم دیا کہ غلام آزاد کرے یا متواتر دو ماہ روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

اس حدیث میں بظاہر یہی لگتا ہے کہ اختیار دیا گیا ہے کہ تینوں میں سے جو کام چاہو کر لو غلام آزاد کر دو نہیں تو روزے رکھ لو۔ اگر نہ غلام آزاد کرنے کا ارادہ ہے اور نہ روزے رکھنا چاہتے ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو حالانکہ ایسا نہیں۔ یہ حدیث یکے بعد دیگرے تین حالتوں کے موافق تین چیزوں کے کفارے کو بیان کر رہی ہے جس طرح کہ مذکورہ حدیث میں بالکل واضح ہے ہو سکتا ہے یہ بھی وہی واقعہ ہو جسے اختصار کے ساتھ روایت بالمعنی کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہو اس لئے اس کو اس مفہوم پر محمول کریں گے جو مفہوم ہم نے بیان کیا ہے۔

ایک اور اہم بات اس حدیث کے حوالے سے ہے۔ حضور ﷺ نے اس آدمی کو حکم دیا کہ عرق میں جو کچھ ہے وہ صدقہ کر دو۔ ایک عرق میں پندرہ صاع غلہ آ سکتا ہے اور اتنا غلہ روزے کے کفارے کے لئے ناکافی ہے کیونکہ پندرہ صاع سے ساٹھ آدمیوں کے دن رات کا کھانا ہی تیار نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ ان پر صدقہ کیا جائے۔ ہاں اس بارے یہی کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ جو کچھ عرق میں ہے وہ صدقہ کر دو اور بقیہ کسی دوسرے وقت دے دینا جب فراخی حاصل ہوتا کہ کچھ کفارہ تو ادا ہو جائے۔

اگر روزہ رکھ کر توڑ دے

روزہ رکھ کر توڑنے پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔ اگر سرے سے روزہ رکھا ہی نہیں تو اس پر کفارہ نہیں۔ ایسے شخص کے بارے شریعت یہ حکم دیتی ہے کہ اسے قید کر دیا جائے حتیٰ کہ وہ توبہ کر لے اور روزے رکھنے لگے اور اس پر توبہ کے آثار ظاہر ہو جائیں اگر وہ ترک صوم پر اصرار کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اگر طاقتور ہو تو اس کے خلاف جنگ کی جائے جس طرح کہ نماز کے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔

کفارہ صرف اس صورت میں واجب ہوتا ہے جب رمضان کے روزے کے خلاف کامل جنایت کا ارتکاب کیا۔ اگر کسی نے قضاء روزہ توڑ دیا یا کسی اور واجب روزہ کو توڑ دیا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا کیونکہ عام دنوں کی بنسبت رمضان کے دنوں میں روزہ کے خلاف جنایت شدید تصور کی جاتی ہے۔ دوسری نص رمضان کے روزوں کے بارے ہے اس لئے اس حکم کو دوسرے روزوں پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔

کسی شخص سے کوئی ایسا کام ہوا جس سے روزہ ٹوٹتا نہیں تھا لیکن وہ شک میں مبتلا ہو گیا کہ شاید اس کا روزہ ٹوٹ گیا ہے اور اسی شک کی بناء پر اس نے کچھ کھا پی لیا یا جماع کر لیا تو صرف قضاء ہوگی کفارہ نہیں ہوگا۔

حالتِ شک میں کھانے پینے والے کے متعلق حکم

اگر اسے شک تھا کہ روزہ ٹوٹا ہے یا نہیں وہ ظاہری قیاس کی بناء پر اس نتیجے پر پہنچا کہ روزہ ٹوٹ گیا ہے مثلاً اس نے بھول کر کچھ کھا پی لیا جب اسے یاد آیا کہ وہ تو روزے سے تھا۔ اس نے غور و فکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ روزے کا رکن فاسد ہو گیا ہے لہٰذا روزہ ٹوٹ گیا ہے پھر اس خیال سے کھا پی لیا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی مفتی نے اسے فتویٰ دے دیا کہ تیرا روزہ ٹوٹ گیا ہے اور اس نے کھا پی لیا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

اگر کسی نے پچھنے لگوائے اور کسی سے یہ حدیث سن لی کہ پچھنے لگانے والا اور جس کو پچھنے لگائے گئے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس حدیث کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ یہ کسی دوسری حدیث سے منسوخ الحکم ہے اور یہ سوچ کر کچھ کھا پی لیا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا کیونکہ وہ ایک شرعی دلیل کے گمان کی وجہ سے روزہ توڑ رہا ہے جو ایک معمولی جنایت ہے۔

اگر وہ جانتا تھا کہ اس حدیث کا مفہوم کیا ہے یا جانتا تھا کہ یہ منسوخ ہوگئی ہے اور پھر جان بوجھ کر کھایا پیا یا

جماع کیا تو کفارہ لازم ہوگا۔ اگر افطار کسی ایسے فعل کی وجہ سے واقع ہوا جس کے بارے کوئی شرعی دلیل نہیں ہے بلکہ محض وہم وگمان کی بناء پر کھا پی لیا مثلاً سرمہ لگایا یا تیل لگایا یا غیبت کی' کوئی بری بات کی احتلام ہوگیا۔ شہوت کی نظر سے دیکھا اور انزال ہوگیا اور یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ امور روزہ کو توڑ دیتے ہیں اور پھر کھا پی لیا یا جماع کیا تو کفارہ لازم ہوگا کیونکہ جنایت کامل ہے ظن کا کوئی اعتبار نہیں۔

جن صورتوں میں روزہ دار پر صرف قضاء لازم آئے گی

زندہ شخص کے دونوں راستوں میں سے کسی ایک راستے میں جماع کرے گا تو کامل جنایت تب متحقق ہوگی کیونکہ اس طرح شہوت زوروں پر ہوتی ہے اس کے برعکس اگر مردہ یا چوپائے سے جماع کیا اور انزال ہوگیا تو کفارہ واجب نہیں ہوگا صرف قضاء واجب ہوگی کیونکہ اس میں شہوت کم ہوگی اور علی وجہ الکمال شہوت پوری نہیں ہوگی۔

اگر بوس وکنار سے بغیر جماع کے انزال ہوگیا یا مشت زنی کی یا عورت کی رانوں پر انزال ہوگیا اور دخول نہیں کیا تو قصور جنایت کی وجہ سے صرف قضاء ہوگی کفارہ نہیں ہوگا کیونکہ یہ صورۃً جماع نہیں ہے۔

کھانے اور پینے میں کامل جنایت یہ ہے کہ انسان معتاد راستے سے کھائے پیئے۔ کھانے کے لئے معتاد راستہ منہ ہے اور پینے کے لئے منہ کے علاوہ ناک بھی معتاد راستہ شمار ہوتا ہے (کیونکہ اس سے پانی یا مشروب بآسانی پیا جاسکتا ہے)۔

اگر کوئی چیز غیر معتاد راستے سے پیٹ میں چلی گئی جیسے زخم کے ذریعے کان یا دبر کے راستے تو کفارہ واجب نہیں ہوگا کیونکہ اسے حقیقت میں کھانا پینا نہیں کہہ سکتے۔

اگر کوئی ایسی چیز کھا پی لی جو غذا ہے یا دوا تو تب کفارہ لازم آئے گا۔ اگر مٹی کھالی اور مٹی ایسی نہیں تھی جو بطور دوا استعمال ہوتی ہے یا لوہا کھالیا جسے بطور دوا استعمال نہیں کیا جاتا یا درخت کے پتے کھالئے لیکن وہ اس قدر نہیں تھے کہ خوراک بن سکیں۔ نہ ہی ایسے درخت کے پتے تھے جنہیں بطور خوراک استعمال کیا جاسکتا ہے یا دواء کے طور پر کھایا جاسکتا ہے تو ان تمام صورتوں میں قضاء ہوگی کفارہ نہیں ہوگا کیونکہ جنایت کامل نہیں ہے۔

سحری وافطاری کا بیان

سحری کھانے کا وقت

رمضان المبارک میں سحری کھانا مستحب ہے۔

عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تسحروا فان في السحور بركة. (رواہ البخاری)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سحری کھایا کرو' سحری میں برکت ہوتی ہے۔

سحری میں تاخیر پسندیدہ عمل ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبدالکریم بن ابی المخارق کو یہ فرماتے سنا کہ جلدی افطار کرنا اور سحری میں دیر کرنا نبیوں کا عمل ہے۔ ہمارے مشائخ فرماتے ہیں سحری کا مستحب وقت رات کا چھٹا پہر ہے۔ طلوع فجر یا مشکوک وقت تک مؤخر نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے حرام کے ارتکاب کا اندیشہ ہے۔

عن زید بن ثابت قال تسحر نامع رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم قمناللصلوة قال انس بن مالک کم کان القدربینهما قال قدر خمسین آیة. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کا کھانا کھایا پھر ہم نماز کے لئے اٹھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے پوچھا کھانے اور نماز کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ فرمایا تقریباً پچاس آیتوں (کی تلاوت) کا۔

اب اس حدیث پر عمل کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو صاحبِ وحی تھے وہ طلوع فجر کا قطعی وقت جانتے تھے۔ آپ ﷺ اور آپ کے ساتھ سحری کھانے والوں کے لئے جائز تھا کہ وہ طلوع فجر کے لمحے سے پہلے تک سحری کھائیں لیکن جس کو فجر کا یقینی علم نہ ہو بلکہ ظن وتخمین یا روشنی کے ذریعے اندازے کا محتاج ہو تو اسے چاہئے کہ اس وقت روزہ بند کرے جب یقین ہو کہ ابھی فجر طلوع نہیں ہوئی اور رات کا کچھ حصہ باقی ہے یہ اس لئے ضروری ہے کہ اسے یہ کھٹکا نہ رہے کہ طلوع فجر کے وقت اس نے کھایا پیا ہے۔ اس اندیشے سے بچنا جب واجب ہے تو اس کا مقدمہ بھی واجب ہے۔ اگر طلوع فجر میں شک کے ہوتے ہوئے کھایا پیا تو روزہ مکروہ تحریمی ہوگا لیکن اس شک سے روزہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ اصل رات کی بقا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے روایت ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے۔ صاحب ھدایہ نے اس رائے کو اختیار کیا ہے کہ اگر روزہ دار کو شک ہے کہ فجر طلوع ہوئی ہے یا نہیں اور غالب گمان بھی نہیں بلکہ دونوں جانب برابر ہیں تو افضل یہ ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دے تا کہ ایک ممنوع چیز سے بچاؤ ہو سکے لیکن شک کی بناء پر کھانا پینا ترک کرنا واجب نہیں ہے۔ صاحب ھدایہ کی دلیل ان کے دعویٰ پر منطبق نہیں ہو سکتی کیونکہ حرام سے بچنا واجب ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ کھانا پینا ترک کر دیا اور ترکِ اکل وشرب واجب ہے۔ واللہ اعلم۔

اگر طلوعِ فجر کا گمان ہونے کے بعد سحری کھائی

اگر طلوع فجر کا گمان ہونے کے باوجود سحری کھالی اور احتمال بھی ہے کہ فجر طلوع نہ ہوئی ہو تو صحیح روایت یہ ہے کہ روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضاء واجب ہو جائے گی۔ شیخ ابن الہمام کا یہی مؤقف ہے کیونکہ گمان غالب یقین کے قائم مقام ہوتا ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

ھدایہ میں ظاہر الروایہ کے مطابق اس پر قضاء نہیں ہے کیونکہ یقین تب زائل ہوتا ہے جب اس کے مقابلے میں یقین ہو۔ اگر بعد میں کسی وجہ سے یہ بات واضح ہو جائے کہ صبح طلوع ہو چکی تھی تو کیا اب اس کے ذمے صرف قضاء ہی ہوگی یا کفارہ بھی لازم ہوگا۔ ہاں اس پر کفارہ بھی لازم ٹھہرے گا کیونکہ یہ ظاہر ہونے کے بعد کہ فجر واقعی

طلوع ہو چکی تھی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی جنایت ناکمل نہیں مکمل ہے۔ ھدایہ میں ہے کہ اس پر کوئی کفارہ نہیں کیونکہ اس معاملے کی بنیاد اصل پر رکھی جائے گی اور اصل یہ ہے کہ اس نے جان بوجھ کر نہیں کھایا لیکن ان کا یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ ظن غالب پر عمل واجب تک واجب کا ترک کامل جنایت ہے اس لئے کفارہ ہوگا۔

افطاری میں جلدی کرنا مستحب ہے

روزہ افطار کرنے میں تعجیل مستحب ہے۔

عن سهل بن سعد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لايزال الناس بخير ما عجلوا الفطر. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگ جب تک افطار میں جلدی کرتے رہیں گے بھلائی پر کاربند رہیں گے۔

عن ابى هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا يزال الدين ظاهرا ما عجل الناس الفطرلان اليهود والنصارى يؤخرون. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تک لوگ روزہ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے دین غالب رہے گا کیونکہ یہود ونصاریٰ اس میں تاخیر کرتے ہیں۔

عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الله احب عبادى الى اعجلهم فطرا. (رواہ الترمذی)

انہیں سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ بندے میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہیں جو روزہ افطار کرنے میں نسبتاً زیادہ جلدی کرتے ہیں۔

جس طرح افطار میں جلدی مستحب ہے اسی طرح نماز مغرب میں بھی جلدی مستحب ہے نماز مغرب افطاری سے پہلے بھی پڑی جا سکتی ہے حضور ﷺ نے خود افطار سے پہلے نماز مغرب ادا فرمائی جیسا کہ عبداللہ ابن اوفی کی حدیث پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔ اسی طرح امیر المؤمنین عمر امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہما سے بھی ثابت ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد روزہ افطار کرنا صحیح ہے۔

فعن حميد بن عبد الرحمن ان عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان كانا يصليان المغرب حتى ينظر الى الليل الاسود قبل ان يفطرا ثم يفطران بعد الصلوة وذلك فى رمضان. (رواہ مالک)

حمید بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ عمر ابن الخطاب اور عثمان غنی رضی اللہ عنہما مغرب کی نماز پڑھتے تھے حتی کہ افطار سے پہلے سیاہ رات دیکھتے پھر نماز کے بعد افطار کرتے اور یہ واقعہ رمضان کا ہے۔

امام محمد علیہ الرحمہ نے موطا میں بتصریح کہا ہے کہ دونوں طرح جائز ہے۔ روزہ دار چاہے تو پہلے روزہ افطار کرے اور بعد میں نماز پڑھے اور چاہے تو پہلے نماز پڑھے اور بعد میں روزہ افطار کرے لیکن مغرب کی نماز کے بعد کسی قسم کی تاخیر نہ کرے۔ نماز مغرب سے مراد سنن اور نوافل نہیں بلکہ اس سے مراد صرف فرض کی تین رکعتیں ہیں۔ اگر سنن اور نوافل پر بھی افطار کو موخر کرے گا تو اس افطار میں تاخیر لازماً آئے گی بلکہ مغرب کے فرض پڑھ کر روزہ

افطار کرے اور پھر سنن اور نوافل پڑھے۔ شیخ اکبر نے فتوحاتِ مکیہ میں اسی بات کی تصریح فرمائی ہے۔

کھجور اور پانی سے روزہ افطار کرنا

مستحب یہ ہے کہ روزہ کھجور سے پھر پانی سے افطار کیا جائے۔

عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من وجد تمرا فلیفطر علیه ومن لافلیفطر بالماء فانه طهور. (رواہ الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس کھجور ہو وہ کھجور سے افطار کرے اور جس کے پاس کھجور نہ ہو وہ پانی سے افطار کرے کیونکہ پانی نہایت ہی پاکیزہ چیز ہے۔

افطاری کے وقت کی دعا

افطار کے وقت یہ دعا کرنی چاہئے۔

اللهم لك صمت وعلى رزقك افطرت.

اے اللہ میں نے صرف تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق پر افطار کیا۔

کیونکہ حضرت معاذ بن زہرہ سے روایت ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب روزہ افطار کرتے تو یہ دعا کرتے۔ اللهم لك صمت وعلى رزقك افطرت۔ اسے امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

روزہ افطار کرنے میں جلدی کرنا اگرچہ مستحب ہے لیکن غروبِ آفتاب کے یقین اور رات کے داخل ہونے سے پہلے افطار حرام ہے۔ اگر یقین حاصل ہونے سے پہلے افطار کر دیا تو یقیناً گناہگار ہوا خواہ واقعتاً سورج غروب ہوا ہو یا غروب نہ ہوا ہو کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تیقن سے پہلے افطار حرام ہے۔

اگر حالتِ شک میں افطار کر دیا

اگر حالت شک میں افطار کر دیا تو گناہگار ہوگا' قضاء بھی لازم ہوگی کیونکہ دن جو اصل ہے وہ تو متحقق ہے۔ اب یہ یقین اس وقت تک زائل نہیں ہوگا جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ سورج غروب ہو گیا ہے اگر افطار کر چکنے کے بعد شک یقین میں تبدیل ہو جائے اور واضح ہو جائے کہ سورج غروب نہیں ہوا تھا تو ھدایہ میں ہے کہ اس پر کفارہ واجب ہونا چاہئے کیونکہ اصل (یقین) کا تقاضا یہی ہے۔ (یعنی دن اصل ہے اور یہ یقینی سمجھا جائے گا شک تو غروب میں ہے اور دن کو جان بوجھ کر کھانے پینے سے کفارہ واجب ہو جاتا ہے لہٰذا یہاں بھی کفارہ واجب ہونا چاہئے)۔

اگر غالب گمان یہ ہے کہ سورج غروب نہیں ہوا تو افطار جائز نہیں اگر ایسی صورت میں افطار کیا تو قضاء لازم آئے گی اور واضح ہونے کی صورت میں (کہ سورج غروب نہیں ہوا تھا) کفارہ بھی واجب ہوگا۔

اگر اسے یقین تھا کہ سورج غروب ہو گیا ہے اور روزہ افطار کر چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ اس نے کھا پی لیا یا سحری میں یہ سمجھ کر کھاتا رہا کہ ابھی رات ہے وقت ختم نہیں ہوا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ

سحری کا وقت ختم ہو چکا تھا تو ان دونوں صورتوں میں روزہ دار گناہگار نہیں ہوگا لیکن قضاء لازم ہوگی۔ ان دونوں صورتوں میں کفارہ نہیں کیونکہ یہ جنایت کامل نہیں خطا ہے لیکن بقیہ دن تعظیماً نہ کھانا پینا ضروری ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں خطاء کی صورت میں روزہ فاسد ہی نہیں ہوتا وہ اپنا روزہ مکمل کرے گا۔ اس کا جواب ہم پہلے ہی دے چکے ہیں۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا وعن ابیھا سے روایت ہے کہ مطلع ابر آلود تھا۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں روزہ افطار کرلیا پھر سورج (بادلوں سے) نکل آیا۔ حضرت ہشام سے پوچھا گیا کہ انہیں قضاء کا حکم دیا گیا ہوگا؟ فرمایا کیا اس کے علاوہ بھی کوئی چارہ کار تھا۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں نے روزہ افطار کیا' مطلع ابر آلود تھا۔ وہ سمجھے کہ سورج غروب ہو چکا ہے لیکن (وہ بادلوں سے) نمودار ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم آج کا دن مکمل کریں گے پھر اس کی جگہ اور روزہ رکھیں گے۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت امام مالک روایت بیان کرتے ہیں۔

عن اسلم ان عمر افطر ذات یوم فی رمضان فی یوم غیم ورأی انه قدامسی وغابت الشمس فجاء رجل وقال یا امیر المؤمنین طلعت الشمس فقال عمر الخطب یسیر وقد اجتهدنا.

حضرت اسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے رمضان میں ایک دن روزہ افطار کیا۔ بادل بنے ہوئے تھے۔ وہ یہ سمجھے کہ شام ہوگئی ہے اور سورج غروب ہو چکا ہے ایک آدمی نے آ کر اطلاع دی۔ امیر المؤمنین! سورج تو نکل آیا ہے۔ آپ نے فرمایا معمولی بات ہے۔ ہم نے اجتہاد کیا۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ الخطب یسیر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حرج نہیں ہم قضا کرلیں گے۔ واللہ اعلم.

اس لفظ کا لغوی معنی ہے معمولی بات ہے۔ اس لئے امام مالک نے جو معنی کیا ہے وہ صحیح ہے۔

امام ابوحنیفہ کی روایت میں اس کو صراحتاً بیان کیا گیا ہے۔ شوافع کے نزدیک اس جملہ کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے کہ یہ معمولی بات ہے۔ ہم نے اجتہاد کیا اور اجتہاد میں غلطی ہوگئی اور غلطی پر قضاء نہیں ہوتی (ان کے نزدیک روزہ باقی ہے)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا جملہ کو اس معنی پر محمول کرنا محض غلطی ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں تصریح ہے جو اس معنی کی تردید کرتی ہے حضرت امام ابوحنیفہ کی ایک دوسری روایت ملاحظہ فرمائیں۔

عن علی بن حنظلة عن ابیه شهدت عمر بن الخطاب فی رمضان وقرب الیه شراب فشرب بعض القوم وهم یرون الشمس قدغربت ثم ارتقی المؤذن فقال یاامیر

حضرت علی بن حنظلہ سے روایت ہے وہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ میں رمضان المبارک میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کی جناب میں مشروب پیش کیا گیا۔ لوگوں نے مشروب پیا وہ سمجھے کہ سورج

المؤمنين والله ان الشمس طالعة لم يغرب فقال عمر رضي الله عنه من كان افطر فليصم يومامكانه ومن لم يكن افطر فليتم حتى تغرب الشمس.

غروب ہو گیا ہے۔ مؤذن (اذان والی بلند جگہ پر) چڑھا تو عرض کیا۔ امیر المؤمنین! بخدا سورج (بادلوں سے) نکل آیا ہے۔ غروب نہیں ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جنہوں نے روزہ افطار کر دیا وہ اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھیں اور جنہوں نے افطار نہیں کیا وہ اسے مکمل کریں حتی کہ سورج غروب ہو جائے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے ابن ابی شیبہ علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔ ایک دوسرے طریق میں یہ اضافہ بھی ہے۔ ''ہم نے آپ کو یاد کرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور ہم نے آسانی کے دن کی قضاء کرنے کی کوشش کی۔'' اس میں امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے افطار کا تذکرہ نہیں۔ شاید یہ کوئی دوسرا واقعہ ہے۔ قضاء کا واجب ہونا قوی ترین دلیل سے ثابت ہے۔ واللہ اعلم.

مسافر و مریض کا حکم

مسافر اور مریض کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔

ربِ قدوس ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ. (البقرۃ:۱۸۵)

اور جو بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں۔

بعض علماء کے نزدیک افطار عزیمت ہے۔ وہ ظاہر آیت سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ مسافر اور مریض پر دوسرے دنوں میں اتنے روزے رکھنا فرض ہیں اس لئے اگر مسافر روزہ رکھے گا تو اس کا روزہ نہیں ہوگا اور اس کے بدلے بعد میں اسے روزہ رکھنا پڑے گا۔ حضرت شیخ اکبر قدس سرہ کا یہی مذہب ہے۔ یہی چیز کئی صحابہ علیہم الرضوان سے مروی ہے۔

قال ابن عمر الافطار في السفر صدقة تصدق بها على عباده.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں اسے ابن ابی شیبہ علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

قال ابن عباس الافطار في السفر عزيمة.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں سفر میں افطار عزیمت ہے۔

امام سیوطی کے بقول اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت محرز سے روایت ہے کہ میں سفر میں تھا اور روزہ رکھ لیا جب واپس آیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کی قضاء کر۔ امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اسے عبد بن حمید نے روایت کیا ہے۔

عن عبد الله بن عامر ان امیر المؤمنین عمر امر رجلا صام رمضان السفر ان یعید.

عبداللہ بن عامر سے روایت ہے کہ امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ روزہ دوبارہ رکھے۔ اس نے حالت سفر میں روزہ رکھ لیا تھا۔

مسافر کے روزہ کی مذمت میں کئی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

عن عبد الرحمن ابن عوف قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم صائم رمضان فی السفر کالمفطر فی الحضر.

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سفر میں رمضان کا روزہ رکھنے والا حضر میں روزہ نہ رکھنے کی مانند (گناہگار) ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اسے نسائی اور ابن ماجہ علیہما الرحمہ نے روایت کیا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لیس من البر الصیام فی السفر.

(رواہ البخاری ومسلم)

حالت سفر میں روزے رکھنا نیکی نہیں۔

عن جابر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم خرج عام الفتح الی مکة فی رمضان فصام حتی بلغ کراع الغمیم فصام الناس فدعا بقدح من ماء فرفعه حتی نظر الناس الیه ثم شرب فقیل له بعد ذلک بعض الناس قد صام فقال اولئک العصاة.

(رواہ مسلم والنسائی)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح کے سال ماہ رمضان میں مکہ شریف کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ روزے سے تھے جب آپ کراع الغمیم (ایک جگہ جو عسفان سے تین میل کے فاصلے پر ہے) میں پہنچے تو لوگ روزے سے تھے۔ آپ ﷺ نے پانی کا ایک پیالہ طلب فرمایا اور اس کو لے کر بلند کیا حتی کہ لوگوں نے دیکھ لیا پھر آپ ﷺ نے پانی پیا۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا (یا رسول اللہ) بعض لوگوں نے افطار نہیں کیا بلکہ روزہ سے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا وہ نافرمانی کرنے والے ہیں۔

عن انس بن مالک ان النبی صلی الله علیه وسلم قال ان الله وضع عن المسافر الصوم وشطر الصلوٰة وعن الحبلی والمرضع. (رواہ الترمذی والنسائی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مسافر سے روزہ اور ایک حصہ نماز کو دور کر دیا ہے اور حاملہ اور دودھ والی عورت کو۔

جمہور ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ افطار مسافر کے لئے رخصت ہے عزیمت نہیں۔ اگر مسافر روزہ رکھ لے تو فرض روزہ ادا ہو جائے گا اور اس کی قضاء نہیں ہوگی۔ یہ لوگ آیت کریمہ کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ "تم میں سے جو بیمار ہو اور جو مسافر ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں اتنے روزے رکھ لے لیکن اس سے حتمی حکم لازم نہیں ٹھہرتا (کہ تم نے لامحالہ رمضان کے بعد تندرستی یا سفر کے بعد ہی گنتی پوری کرنی ہے)۔

جمہور علماء پہلی اور دوسری حدیث کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ جب مریض کو روزہ نقصان دے اور رمضان

شریف میں دورانِ سفر روزہ رکھنے سے مسافر کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑے تو وہ اس اجازت سے فائدہ حاصل نہ کرنے اور مشقت میں پڑنے کی وجہ سے اسی طرح گناہگار ہوگا جس طرح حضر میں جان بوجھ کر روزہ ترک کرنے والا گناہگار ہوتا ہے کیونکہ شارع کی اجازت کے باوجود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ مرض اور سفر میں روزہ ہوتا ہی نہیں۔

دوسری حدیث کے پس منظر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ایسی مشقت کے ساتھ خاص ہے جو نقصان دینے والی ہو۔ اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے شیخین روایت کرتے ہیں۔

عن جابر قال كان النبي صلى الله عليه وسلم فرأى رجلا قد اجتمع الناس عليه وقد ظلل عليه فقال ما له قالوا رجل صائم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليس من البر الصيام في السفر.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ لوگ اکٹھے ہیں اور اس پر سایہ کر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا اسے کیا ہوا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔

السفر میں لام عہد کے لئے ہے اور معہود وہ روزے ہیں جو انسان کو نقصان پہنچائیں۔

رہی تیسری حدیث تو وہ ایک خاص واقعہ کے متعلق ہے۔ حضرت امام مسلم نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے یوں کہا ہے۔ ''لوگوں نے روزہ رکھ لیا۔ آپ ﷺ کی خدمت میں گزارش کی گئی کہ لوگوں پر یہ روزہ شاق گزر رہا ہے وہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے عصر کے بعد پانی کا برتن منگوایا...... الخ۔

یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حالت سفر میں محض اس لئے روزہ ترک کیا کہ لوگ مشکل میں تھے اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع کے شوق میں روزہ افطار نہیں کر رہے تھے اسی لئے حضور ﷺ نے روزہ افطار کر لیا اور حضور ﷺ کے افطار کے بعد جس نے روزہ افطار نہ کیا اور یہ سمجھتے رہے کہ روزہ نہ توڑنا تقویٰ ہے تو ان کے بارے حضور ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے معصیت کا ارتکاب کیا۔ یا تو اس لئے کہ ان کا گمان تھا کہ وہ روزہ توڑنے والوں سے زیادہ پرہیزگار ہیں۔ یا اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو معصوم عن الخطاء ہیں انہوں نے روزہ افطار کر بھی لیا تو حرج نہیں لیکن ہمیں تو ہر صورت میں روزہ پورا کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انہوں نے معصیت کا ارتکاب کیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے اگرچہ بظاہر خلاف اولیٰ کو رب قدوس نے بخش دیا ہے لیکن جو تقویٰ اور خوف الٰہی کی کیفیت آپ کو نصیب ہے اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صحابہ کرام پر بہر حال حتی المقدور آپ ﷺ کی اطاعت ضروری تھی۔ ان کا تقویٰ و پرہیزگاری کو رسول اللہ ﷺ کے تقویٰ و پرہیزگاری سے کیا نسبت ہو سکتی ہے یا اس لئے کہ انہوں نے مشقت کے باوجود روزہ افطار نہیں کیا اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے نافرمانی کی۔

ان احتمالات کے ہوتے ہوئے یہ حدیث ان لوگوں کے نظریے کو ثابت کرنے کی دلیل نہیں بن سکتی جو یہ خیال کرتے ہیں کہ سفر اور مرض کی حالت میں افطار کرنا عزیمت ہے۔

رہی چوتھی حدیث تو وہ بھی متروک ہے ورنہ یہ لازم آئے گا کہ مسافر پر سرے سے روزہ فرض ہی نہیں ہے اور یہ مؤقف نص کے خلاف ہے۔ امام ابوداؤد علیہ الرحمہ کے نزدیک اس حدیث کی روایات میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسافر کو نماز کا ایک حصہ نہ پڑھنے کی چھوٹ دی ہے اور اسے روزہ نہ رکھنے کی رخصت دی ہے۔ دودھ پلانے والی اور حاملہ کو جب بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کو بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مسافر کے لئے روزہ رکھنا سرے سے جائز ہی نہیں۔ ترمذی اور نسائی علیہما الرحمہ کی گذشتہ روایات بھی اس معنی کی تائید کرتی ہیں۔

جمہور ائمہ نے درج ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة الصديقة رضي الله عنها ان حمزة رضي الله عنه بن عمر الاسلمي قال لنبي صلى الله عليه وسلم اصوم في السفر وكان كثير الصيام فقال ان شئت فصم وان شئت فافطر. (رواہ الستۃ)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حمزہ بن عمر اسلمی رضی اللہ عنہ بڑے روزہ دار تھے۔ بارگاہِ رسالت میں عرض پرداز ہوئے (حضور!) میں سفر میں بھی روزہ رکھوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تو چاہے تو روزہ رکھ اور چاہے تو افطار کر لے۔

عن انس قال كنا نسافر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم يعب الصائم على المفطر ولا المفطر على الصائم.

(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے جو روزہ نہ رکھتا وہ روزہ دار کو برا نہ کہتا۔

شیخین ہی کی ایک روایت میں حضرت حمید فرماتے ہیں کہ میں ابی ملکیہ رضی اللہ عنہ سے ملا انہوں نے بھی مجھے یہی بات بتائی۔

عن ابن عباس قال سافر رسول الله صلى الله عليه وسلم في رمضان حتى بلغ عسفان ثم دعاباناء من ماء فشرب نهارا ليراه الناس وافطر حتى قدم مكة وكان ابن عباس يقول صام رسول الله صلى الله عليه وسلم في السفر وافطر فمن شاء صام ومن شاء افطر. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان شریف میں سفر پر نکلے۔ جب عسفان پہنچے تو پانی کا برتن منگوایا اور دن کے وقت اسے پی لیا تاکہ لوگ دیکھیں اور روزہ توڑ لیا حتی کہ مکہ شریف پہنچے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے سفر میں روزہ رکھا بھی اور افطار بھی کیا۔ جو چاہے وہ روزہ رکھے اور جس کا جی چاہے روزہ نہ رکھے۔

شیخین ہی سے ایک روایت اس طرح ہے۔

ان النبي صلى الله عليه وسلم خرج من

نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ آپ کے

المدينة ومعه عشرة الآف وذلك على رأس ثمان سنين فسار بمن معه من المسلمين الى مكة يصوم ويصومون حتى بلغ الكديد وهو ماء بين عسفان وقديد افطر وافطروا.

ساتھ دس ہزار آدمی تھے۔ یہ آٹھ ہجری کے شروع کی بات ہے۔ آپ ﷺ مسلمانوں کو اپنی معیت میں لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان روزہ سے تھے۔ جب آپ کدید پہنچے تو عسفان اور قدید کے درمیان ایک چشمہ ہے تو آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے روزہ افطار کیا۔

امام زہری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری حکم لیا جاتا ہے۔ عجیب بات ہے امام زہری اس صورت میں بھی آخری قول وفعل کی بات کر رہے ہیں حالانکہ آخری قول وفعل اس وقت دلیل بنایا جاتا ہے جب احادیث میں تعارض ہو۔ یہاں تعارض نام کی کوئی چیز نہیں یہاں تو بات عزیمت اور رخصت کی ہو رہی ہے۔

عن حمزة بن عمرو الاسلمي قال انى صاحب ظهرا عالجه اسافر عليه واكريه وانه ربما صادفني هذا الشهر يعني رمضان وانا اجد القوة وانا شاب واجدني ان اصوم يا رسول الله اهون علي من ان اؤخره فيكون دينا افاصوم يا رسول الله صلى الله عليه وسلم اعظم لاجري ام افطر قال اى ذلك شئت يا حمزة. (رواہ ابوداؤد)

حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں سواری رکھتا ہوں۔ میں سفر کرتا ہوں تو سواری کو لے جاتا ہوں اور کرایا دیتا ہوں۔ کبھی سفر میں یہ مہینہ یعنی رمضان کا مہینہ شروع ہو جاتا ہے حالانکہ مجھ میں طاقت ہے میں جوان ہوں۔ یا رسول اللہ! روزہ رکھ لینا میرے لئے بنسبت روزہ میں تاخیر کرنے کے زیادہ آسان ہے کیونکہ اس طرح روزہ میرے ذمہ واجب الاداء بن جائے گا۔ یا رسول اللہ! کیا میرے لئے روزہ رکھ لینے میں زیادہ اجر وثواب ہے یا روزہ افطار کرنے میں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو تو چاہے کر لے اے حمزہ۔

نسائی شریف میں یہ الفاظ ہیں جب حمزہ بن عمرو اسلمی نے سفر میں روزے کے بارے سوال کیا جس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چاہے تو روزہ رکھ لے اور چاہے تو روزہ ترک کر دے۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ مسافر سفر میں روزہ رکھ سکتا ہے جن احادیث میں ممانعت کا تذکرہ ہے وہ خاص حالات کی غمازی کرتی ہیں کہ گرمی اتنی شدید اور سفر اتنا کٹھن تھا کہ روزے سے جانی نقصان بھی ہو سکتا تھا جس کے پیش نظر حضور ﷺ نے ممانعت فرمائی۔

حدیث حمزہ سے ایک دوسری بات بھی واضح ہوتی ہے کہ رخصت کے لئے ضروری نہیں کہ سفر کسی نیک مقصد کے لئے کیا جا رہا ہو بلکہ اس میں حکم مطلق ہے۔ یاد رہے امامیہ (شیعہ حضرات) سفر معصیت میں رخصت کے قائل نہیں۔

تیسری بات جسے ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جس سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے وہ مطلق سفر ہے۔

اس میں کسی قسم کی کوئی قید نہیں بس جب سفر درپیش ہے تو روزہ افطار کیا جا سکتا ہے خواہ یہ سفر کسی نیک کام کے ارادہ سے ہو یا برے کام کے ارادہ سے یا ارادہ نہ برا ہو اور نہ نیک بلکہ مباح کام کی غرض سے سفر کر رہا ہو تو ہر صورت میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے کیونکہ نص مطلق ہے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سفر معصیت میں اجازت نہیں۔ اس نکتہ پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ اس حکم کے لئے یہ شرط بھی عائد نہیں کی گئی کہ تکلیف ہو تو تب رخصت ہے اور اگر سفر خوشگوار ہو تو رخصت نہیں۔ اسی پر اجماع ہے۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ روزہ میں مسافر کو جو تکلیف پہنچتی ہے اور کفارہ میں مالی تاوان سے اس کو جو قلبی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے پوری طرح آگاہ ہونا ممکن نہیں اسی لئے کفارہ میں مالدار شخص کے غلام آزاد کرنا صرف صحیح نہیں بلکہ واجب ہے اور غلام آزاد کرنے کی استطاعت کے باوجود روزے رکھنا صحیح نہیں۔ اسی بناء پر علماء نے یحییٰ بن یحییٰ جامع موطا کے اس فتویٰ کو غلط قرار دیا کہ بادشاہانِ وقت غلام آزاد کرنے کی بجائے روزے رکھیں کیونکہ غلام آزاد کرنا ان کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اس سے ان کو زجر و توبیخ کرنا ممکن نہیں لیکن امام عیسیٰ جو احناف سے تعلق رکھتے ہیں ان کے فتویٰ کو علماء نے جائز قرار دیا ہے۔ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ ملوک کے پاس جتنی دولت ہے وہ حرام طریقے سے حاصل کی گئی ہے۔ اگر بالفرض یہ لوگ یہ لوٹی ہوئی دولت حقداروں کے سپرد کر دیں تو ان کے پاس غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ رہے اس لئے ان پر روزہ توڑنے کا کفارہ غلام آزاد کرنا نہیں بلکہ روزے رکھنا ہے۔ دیکھئے امام عیسیٰ کی نظر کس قدر دقیق ہے اور جو کچھ یحییٰ بن یحییٰ نے کہا ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں۔

جان کا اندیشہ ہو تو روزہ نہ رکھنا افضل ہے

وہ مسافر جس کو یہ اندیشہ ہے کہ روزہ رکھے گا تو جانی نقصان ہوگا اس پر روزہ نہ رکھنا ضروری ہے۔ اگر روزہ کی حالت میں فوت ہو گیا تو گناہگار ہوگا کیونکہ یہ خودکشی کے مترادف ہے۔ ہاں اگر طاقت ہے اور سخت جانی کی وجہ سے مشقت برداشت کر سکتا ہے اور روزہ رکھ کر پورا کر لیتا ہے تو یہ رمضان کا فرض روزہ ادا ہو گیا اور ادا کی قضاء نہیں ہوتی۔ جس طرح غصب شدہ زمین میں نماز پڑھنے سے نماز ہو جائے گی لیکن پڑھنے والا گناہگار ہوگا۔

اندیشہ نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے

اگر سفر مشکل نہیں اور نقصان کا اندیشہ نہیں تو روزہ رکھ لینا افضل ہے۔ امام احمد اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگ امام شافعی کے اس نظریہ سے اختلاف کی بات کرتے ہیں لیکن کتبِ شافعیہ کے مطالعہ سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آتی۔ حقیقت یہی ہے کہ اس مسئلے میں امام شافعی کی رائے ہماری رائے کی طرح ہے۔

ہم درج ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔

عن سلمة بن المحنق قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ادرک رمضان

حضرت سلمہ بن محنق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے سفر میں ماہ رمضان کو پایا

فی السفر و کانت له حمولة یاوی الی شبع فلیصم رمضان حیث ادرکه. (رواہ ابوداؤد)

اور اس کے پاس اچھی سواری بھی ہو جو اسے آرام سے منزل تک لے جائے تو وہ جہاں رمضان شروع ہو جائے وہیں روزے رکھے۔

عن انس قال من افطر قبل رخصة ومن صام فهو افضل.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس نے افطار کیا اس نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رخصت کو قبول کیا اور جس نے روزہ رکھا اس نے بہت اچھا کام کیا۔

امام سیوطی کے بقول اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال کنانغز ومع رسول الله صلی الله علیه وسلم فی رمضان فمنا الصائم ومنا المفطر فلا یجد الصائم علی المفطر ولاالمفطر علی الصائم ویرون ان من وجدقوة فصام حسن ویرون ان من وجد ضعفا فافطر فحسن. (رواہ مسلم)

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم رمضان المبارک کے مہینے میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد کرتے ہم میں سے کچھ لوگ روزہ سے ہوتے کچھ لوگ روزہ نہ رکھے ہوتے نہ تو روزہ دار غیر روزہ دار کو ملامت کرتا اور نہ روزہ چھوڑنے والا روزہ رکھنے والے کو ملامت کرتا۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ جو طاقت رکھتا ہو اس کے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے اور جو کمزور ہو اس کے حق میں افطار بہتر ہے۔

مریض افطار کرسکتا ہے

مریض کے لئے کچھ قیود ہیں۔ ان کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ افطار کرسکتا ہے۔ مثلاً وہ سمجھتا ہے اگر روزہ رکھے گا تو مرض شدت اختیار کر جائے گی تو احناف کے نزدیک وہ روزہ نہ رکھے۔ امام شافعی کی طرف اگر چہ اس قول کی نسبت کی جاتی ہے کہ اگر ہلاکت کا اندیشہ ہو تو تب افطار جائز ہے ورنہ نہیں لیکن اس قول کی نسبت امام شافعی کی طرف کرنا صحیح نہیں کیونکہ ان کی کتب اس کا رد کرتی ہیں۔ حقیقت میں امام شافعی اس مسئلے میں ہم احناف کے ہم نوا ہیں۔

اگر بیماری ایسی ہے کہ روزہ رکھنے سے ضرر کا اندیشہ نہیں تو افطار جائز نہیں کیونکہ بعض بیماریاں ایسی بھی ہیں کہ روزہ ان کے لئے مفید ہوتا ہے اور فاقہ کشی سے بیماری جاتی رہتی ہے سو ایسی صورت میں افطار کیسے مباح ہوسکتا ہے؟ دوسری بات یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی جسمانی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے اس لئے مطلق بیماری کو اگر افطار کا سبب ٹھہرایا جائے تو ہر آدمی افطار ہی کرے اور کسی پر روزہ فرض ہی نہیں لہٰذا اس طرح تو روزہ کی فرضیت کا کوئی فائدہ ہی نہ رہے کیونکہ اس طرح قضاء کی بھی مہلت نہ ملے کیونکہ مطلق بیماری سے تو آدمی پاک نہیں ہوسکتا۔ کوئی نہ کوئی تکلیف تو انسان کو ہوتی ہی ہے۔

ایسی مرض جس کے ہوتے ہوئے انسان کو روزہ رکھنے کی اجازت ہو افضل یہ ہے کہ انسان روزہ نہ رکھے لیکن روزہ رکھے گا اور تکلیف برداشت کرے گا تو فرض روزہ ادا ہو جائے گا کیونکہ یہ روزہ وقت پر رکھا گیا۔ اگر اسے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں تو گویا اسے ترک صوم کی اجازت ہی نہیں تھی۔ ہاں مرض کی حالت میں روزہ رکھا اور

رخصت پر عمل نہ کیا تو گناہگار ہوگا کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور اذن شرعی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

حاملہ اور مرضعہ کے متعلق بحث

حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی) کو اگر بچوں کے نقصان کا اندیشہ ہو تو انہیں اجازت ہے روزہ نہ رکھیں اور دوسرے دنوں میں اتنے روزے رکھ لیں کیونکہ حاملہ اور مرضعہ کا وہی حکم ہے جو مریض کا ہے۔ مریض کو بھی رخصت اسی وجہ سے دی گئی ہے کہ وہ جانی نقصان سے بچ جائے اور حاملہ اور مرضعہ کو رخصت دینے کی غرض بچے کی جان کو نقصان سے بچانا ہے۔ دونوں میں چونکہ ایک جیسی علت ہے لہٰذا حکم بھی ایک جیسا ہوگا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حاملہ اور مرضعہ روزہ کی بجائے فدیہ ادا کریں گی۔ شیخ اکبر قدس سرہ کی بھی یہی رائے ہے۔

عن ابن عمر قال الامام مالك بلغه ان عبد الله بن عمر سئل عن امرأة الحاملة اذا خافت على ولدها واشتد عليها الصيام قال تفطر وتطعم مكان كل يوم مسكينا مدا من حنطة بمد النبي صلى الله عليه وسلم.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے امام مالک فرماتے ہیں کہ ان تک یہ بات پہنچی ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حاملہ عورت کے بارے سوال کیا گیا کہ وہ ڈرتی ہے کہ اس کے بچے کو نقصان پہنچے گا اور اس کے لئے روزے رکھنا مشکل ہیں تو آپ نے فرمایا وہ روزے نہ رکھے اور ہر روزہ کی جگہ ایک مسکین کو رسول اللہ ﷺ کے مد سے ایک مد گندم کا دے دے۔

مسافر جسے رمضان المبارک میں سفر درپیش ہو اس کیلئے روزہ چھوڑنا صرف اس صورت میں مباح ہے جب اس پر پیاس غالب آ جائے اور اسے اندیشہ ہو کہ ہلاک ہو جائے گا یا بیمار ہو جائے گا کیونکہ شروع میں اس پر رمضان کے روزے فرض ہو گئے تھے لہٰذا ان کا مکمل کرنا اس پر فرض ہے اور پیاس کا غلبہ بیماری کے حکم میں ہے۔ اسی طرح جب رمضان شریف میں دن کے وقت بیمار ہو گیا اور سمجھتا ہے کہ روزہ افطار نہیں کروں گا تو مرض شدت اختیار کر جائے گی تو اس کو افطار کرنا جائز ہے۔

جان کا خوف ہو تو مسافر اور مریض کے علاوہ صحت مند بھی روزہ افطار کر سکتا ہے

علماء فرماتے ہیں کہ کسی نے لونڈی کے ذمے سخت مشقت کا کام لگایا اگر وہ روزہ رکھتی ہے تو گمان ہے کہ وہ ہلاک ہو جائے گی یا بیمار پڑ جائے گی یا سلطان کے کارندوں نے کوئی سخت کام کسی شخص کے ذمے لگایا۔ اگر وہ روزہ رکھتا ہے تو ہلاکت یا مرض کا اندیشہ ہے اور وہ اس کام میں تاخیر بھی نہیں کر سکتا تو لونڈی اور مذکورہ شخص بیمار کے حکم میں ہیں۔ ان کے لئے افطار جائز ہے۔

پاگل اور مجنون پر کب روزے کی فرضیت ساقط ہو گی؟

رمضان کا مہینہ تھا دن کے وقت کسی پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور کئی دن تک بے ہوش رہا تو اس پر پہلے دن

کے علاوہ باقی دنوں کی قضا ہوگئی کیونکہ پہلے دن روزہ کی نیت پائی گئی (اگر بے ہوشی کی حالت میں ناک میں نالی وغیرہ لگا کر خوراک دی گئی تو روزہ ٹوٹنے کی وجہ سے پہلے دن کی قضا بھی ہوگی) اگر کوئی شخص رمضان شریف کے شروع ہونے کے چند دن بعد پاگل ہوگیا تو ان دنوں کی اس پر قضاء ہوگی کیونکہ یہ جنون بے ہوشی کے حکم میں ہے۔

اگر رمضان شروع ہونے سے پہلے پاگل ہوگیا اور پورا مہینہ اس کیفیت میں گزرا تو قضاء واجب نہیں بلکہ اس سے روزہ ساقط ہو جائے گا۔ زکوٰۃ کے بیان میں اس پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

حیض اور نفاس والی عورت پر مخصوص دنوں کی قضاء لازم ہے نماز کے بیان میں اس مسئلے کی تفصیل بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

قضاء روزوں کو لگاتار رکھنا ضروری نہیں

روزوں کی قضاء کے لئے دن مقرر نہیں ہیں اور نہ ہی متواتر قضاء کرنا ضروری ہے۔ روزہ قضاء کرنے والے کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو متواتر قضاء کرے اور چاہے تو کبھی ایک رکھ لے اور پھر ناغہ کرے اور پھر چند روزے رکھ لے اور ناغہ کرے۔ (یعنی صرف تعداد پوری کرنی ہے تسلسل ضروری نہیں) مگر امام شافعی علیہ الرحمہ تواتر کی شرط عائد کرتے ہیں تاکہ قضاء ادا کے مطابق ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ ربِ قدوس نے مطلق فرمایا ہے کہ **فعدة من ایام اخر**۔ اس میں تسلسل کی کوئی قید نہیں۔

عن محمد بن المنکدر قال بلغنی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن تقطیع قضاء شھر رمضان فقال ذلک الیک ارأیت لو کان علی احد کم دین قضی الدرھم والدرھمین الم یکن قضاء فا للہ احق ان یعفو ویغفر.

حضرت محمد بن المنکدر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ماہ رمضان کی قضاء کے غیر متواتر ہونے کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ آپ پر چھوڑا گیا ہے۔ اگر تم میں سے کسی شخص کے ذمے قرض ہو اور وہ اس طرح ادا کرے کہ کبھی ایک درہم دے اور کبھی دو تو کیا وہ قضاء نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تو زیادہ درگزر کرنے اور معاف کرنے کا حق رکھتا ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اسے ابن ابی شیبہ اور دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے مگر یہ مرسل ہے اور مرسل ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے۔

ہمارا مذہب متعدد صحابہ کرام علیہم الرضوان سے منقول ہے۔

عن عبیدة بن الجراح انه سئل عن قضاء رمضان متفرقا قال ان اللہ لم یرخص لکم فی فطره وھو یرید ان یشق علیکم فی قضاء ناحص العدة وصم کیف شئت.

حضرت عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے رمضان کے قضاء روزوں کو متفرق طور پر رکھنے کے بارے سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں روزہ نہ رکھنے کی رخصت اس لئے نہیں دی کہ قضاء کی صورت میں تم کو مشکل میں ڈال دے۔ گنتی پوری کر اور جو جی میں آئے وہ کر (یعنی

متفرق یا متواتر جس طرح تیرا جی چاہتا ہے روزوں کو قضا کر)

امام سیوطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اسے ابن ابی شیبہ علیہ الرحمہ' دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

عن معاذ بن جبل انه سئل عن قضاء رمضان قال احص العدة وصم كيف شئت.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے رمضان کی قضاء کے بارے پوچھا گیا تو فرمایا: گنتی پوری کر اور روزہ رکھ جس طرح چاہے۔

امام سیوطی علیہ الرحمہ کے بقول اسے حضرت ابن ابی شیبہ اور حضرت امام دارقطنی علیہما الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

عن رافع بن خديج وعن ابى هريرة ان امرأة سألته كيف تقضى شهر رمضان فقال صومى كيف شئت واحصى المدة فانما يريدالله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر.

حضرت رافع بن خدیج اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے ان سے پوچھا کہ وہ ماہ رمضان کی قضاء کس طرح کرے؟ تو انہوں نے فرمایا: جس طرح (متواتر یا متفرق) چاہے روزے رکھ اور گنتی پوری کر۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ رکھتا ہے نہ کہ تنگی کا۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اسے وکیع بن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔

اگر تو کہے کہ قرأت شاذہ میں فعدة من ايام اخر متتابعات کے الفاظ آئے ہیں اور قرأت شاذہ تمہارے نزدیک حجت ہے تو میں کہوں گا کہ یہ قرأت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے لیکن اس کی سند قابل اعتماد نہیں اگر اسے تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے کتاب اللہ کے اطلاق کو باطل نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ بخلاف ابن مسعود کی قرأت کے جو کفارہ یمین میں ہے کیونکہ اس میں متتابعات مشہور ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک متتابعات کا لفظ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت میں منسوخ ہے اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام سیوطی علیہ الرحمہ نے دارقطنی کے حوالے سے نقل فرمائی ہے اور یہ تصریح بھی کی ہے کہ امام بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة قال قالت نزلت فعدة من ايام اخر متتابعات فسقطت متتابعات.

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آیت فعدة من ايام اخر متتابعات نازل ہوئی اور (بعد میں) متتابعات ساقطت ہو گیا۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ساقطت ہو گیا کا مطلب ہے منسوخ ہو گیا۔

مریض اور مسافر اگر پورے سال میں قضاء روزے نہ رکھے

مسافر اور مریض اگر پورا سال قضاء نہ کر سکے اور دوسرا رمضان آ گیا تو نہ وہ گناہگار ہوئے اور نہ وہ فدیہ دیں گے۔ پہلے وہ رمضان کے ادا روزے رکھیں گے اور اس کے بعد جب چاہیں گے گذشتہ رمضان کے قضاء روزے رکھیں گے کیونکہ ان کی مطلقاً گنتی پوری کرنی ہے۔ اس میں دنوں اور سالوں کی کوئی قید نہیں۔ عمر میں کسی وقت بھی

قضاء روزے رکھے جاسکتے ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سال بھر تاخیر کی تو فدیہ دینا پڑے گا۔

روی انه صلی الله علیه وسلم قال فیمن مرض فی رمضان فافطر ثم صح ولم یصم حتی ادرکه رمضان آخر یصوم الذی ادرکه ثم یصوم الذی افطر فیه ویطعم من کل یوم مسکینا.

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے بارے فرمایا جو رمضان میں بیمار ہو گیا اور روزے نہ رکھ سکا پھر تندرست ہو گیا اور روزے نہ رکھے حتی کہ دوسرا رمضان شروع ہو گیا تو پہلے اس رمضان کے روزے رکھے جو شروع ہو چکا ہے اور پھر اس رمضان کے جس کے روزے رہ گئے ہیں اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا دے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اس حدیث کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس کی سند میں ابراہیم بن نافع ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولا کرتا تھا بلکہ اس پر حدیث گھڑنے کی تہمت ہے۔

اگر مسافر سفر میں یا گھر آتے ہی فوت ہو جائے یا مریض بیماری کے دوران فوت ہو جائے تو نہ گناہگار ہوں گے اور نہ ہی ان کے ذمے کوئی فدیہ ہوگا کیونکہ ان کو اتنا وقت نہیں ملا جس میں وہ روزے رکھتے اور ان پر **فعدة من ایام اخر** کا حکم لاگو ہوتا۔ اگر انہوں نے وقت پایا اور روزے قضاء نہ کئے تو جتنے روزوں کا وقت ملا اتنے روزوں کے وہ تارک شمار ہوں گے کیونکہ حالت صحت یا حالت اقامت میں انہوں نے کچھ دن گزارے اور خطاب خداوندی کے مخاطب ٹھہرے اور جتنے روزے ان کی وفات کے بعد یا تندرستی کے بعد رہ گئے ان میں وہ مخاطب ہی نہیں۔

ھدایہ میں مذکور ہے کہ دوسرے دنوں کا پایا جانا۔ تو جتنے دن مریض یا مسافر کو حالت اقامت اور تندرستی میں میسر آئیں گے اسی کا اندازہ کیا جائے گا۔ شاید صاحب ھدایہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قضاء کے خطاب کے متوجہ ہونے کا سبب گنتی ہے (یعنی جتنے دن وہ حالت صحت واقامت میں رہے اتنے دن اللہ تعالیٰ کا خطاب ان کی طرف متوجہ ہوگا اور ان دنوں کا فدیہ ان کی طرف سے ادا کرنا ہوگا) ورنہ قضاء کے وجوب کا سبب بھی وہی ماننا پڑے گا جو اداء کے وجوب کا سبب ہے اور اداء کے وجوب کا سبب ہے رمضان کے مہینے کو پانا۔ ہاں مسافر اور مریض پر روزے فرض تو ہو جاتے ہیں لیکن عذر کی وجہ سے انہیں تاخیر کی اجازت دی جاتی ہے۔

بوڑھے مرد' عورت کا روزے کے بدلے فدیہ دینا

وہ بزرگ جو بڑھاپے کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کا کھانا (بطور فدیہ) ادا کرے یعنی ایک صاع کھجور یا نصف صاع گندم جیسے کہ تمام کفاروں میں یہ مقدار معروف ہے۔

قال الامام مالک بلغنی ان انس بن مالک کبر حتی کان لایقدر علی الصیام وکان یفتدی.

امام مالک فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بوڑھے ہو گئے حتی کہ روزہ رکھنے کی قدرت نہ رہی تو آپ فدیہ ادا کرتے تھے۔

عن ابن عباس كانت رخصة للشيخ الكبير والعجوزة الكبيرة وهما يطيقان الصوم ان يفطر اويطعما مكان كل يوم مسكينا ثم نسخت بعد ذلك فقال فمن شهد منكم الشهر فليصمه واثبت للشيخ الكبير والعجوزة الكبيرة اذا كانتا لا يطيقان الصوم ان يفطر او يطعما وللحبلى والمرضع اذا خافتا افطرتا واطعمنا مكان كل يوم ولا قضاء عليهما. (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ بوڑھے مرد اور عورت کے لئے اجازت ہے کہ اگر وہ روزہ نہیں رکھ سکتے تو اس کے بدلے ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں کیونکہ پہلے تو یہ حکم تمام لوگوں کے لئے تھا لیکن بعد میں منسوخ ہو کر بوڑھے مرد اور عورت کے ساتھ خاص ہو گیا اور حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ روزہ ترک کر دیں اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ ان دونوں پر قضا نہیں ہے۔

امام سیوطی کے بقول اسے بیہقی، ابن ابی حاتم، ابن منذر، عبد بن حمید، سعید بن منصور اور ابن جریر نے روایت کیا ہے۔

لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے استدلال کرتے ہوئے حاملہ اور مرضعہ پر فدیہ لازم کرنا خلاف مذہب ہے۔ ھدایہ میں ہے کہ اس کی اصل وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ہے۔ جس کا مطلب ہے جو طاقت نہ رکھے مگر اس سے اس کی تردید ہوتی ہے کہ یطیقونہ اپنے معنی پر ہے لیکن اس کا حکم منسوخ ہے۔

روى عطاء انه سمع ابن عباس يقرء على الذين يطيقونه فدية طعام مسكين قال ابن عباس ليست منسوخة وهي للشيخ الكبير والمرأة الكبيرة التى لايستطيعان ان يصوما فيطعمان مكان كل يوم مسكينا. (رواہ البخاری)

حضرت عطاء مروی ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وعلی الذین یطیقونہ آیت تلاوت کی اور فرمایا یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ یہ حکم بوڑھوں کے لئے اب بھی موجود ہے جو روزہ نہیں رکھ سکتے وہ ہر دن کے بدلے مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

یہی مفہوم امیر المؤمنین علی، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے علاوہ کئی دوسرے صحابہ کرام سے بھی مروی ہے اور کسی ایک صحابی سے بھی اس کے خلاف کوئی روایت مذکور نہیں لہٰذا اس پر اجماع ہے کہ بوڑھے لوگ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ فدیہ دیں۔ حضرت ابن عباس کا قول کہ آیت منسوخ نہیں ان کی ذاتی رائے نہیں کیونکہ وہ ظاہر القرآن کے مخالف ہے کہ یہاں حرف نفی مقدر ہے۔ لامحالہ یہ قول انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہوگا اور یہ بات ایک حقیقت ہے کہ عربی لغت میں نفی کا کلمہ بارہا لفظاً موجود نہیں ہوتا لیکن معنی میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ آیات اور عربی اشعار اس پر شاہد عدل ہیں۔

فتح القدیر کا یوں کہنا بڑا تعجب خیز ہے جیسا کہ اس رسالہ کے شروع میں حضرت سلمہ بن اکوع کی حدیث کے حوالے سے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس آیت کا منسوخ ہونا قطعی ہے اور اس کی ناسخ آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ ہے۔ حضرت سلمہ صحابی ہیں اور وہ اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جو اجتہاد اور رائے کے دائرہ

سے باہر ہو۔ اس لئے ان کا قول حجت ہے اور یہ آیت منسوخ ہے پھر انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ لوگ روزہ رکھنے کی بجائے فدیہ دے دیا کرتے تھے حتی کہ ناسخ آیت نازل ہوئی اور انہیں یہ حکم دیا گیا کہ آئندہ فدیہ نہیں ادا کرنا بلکہ روزہ رکھنا ہے اور وہ اپنے قول میں سچے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد والذین یطیقونہ کا مطلب یہ ہو تا کہ جو لوگ طاقت نہیں رکھتے تو پھر وہ روزے ترک کر کے فدیہ ادا کیوں کرتے؟ صاحب فتح القدیر کا یہ کہنا کہ یہ مذہب امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' زیادہ حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ تو بعض صحابہ سے حکایت ہے اس پر اجماع کیسے ہوسکتا ہے؟ پھر حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح ہے جبکہ صاحب فتح القدیر کہتے ہیں کہ نسخ کے بارے کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ انہوں نے یہ تو کہہ دیا کہ فلاں فلاں صحابی کا یہ مذہب ہے لیکن انہوں نے کسی کی سند بیان نہیں کی۔ انہوں نے اس مذہب کی نسبت حضرت ابن عمر کی طرف بھی کی حالانکہ امام بخاری حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فدیة طعام مسکین والی آیت پڑھی اور فرمایا یہ منسوخ ہے۔ حضرت ابن عباس سے حضرت ابوداؤد نے بھی یہی روایت کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کوئی سمجھ نہیں آتی کہ فتح القدیر کے مصنف نے ایسی گفتگو کیوں کی' شاید ان کا مقصد یہ ہو کہ بوڑھے شخص پر فدیہ ہے' روزہ نہیں اور ان صحابہ کرام سے یہی مروی ہے اور اس کے خلاف کوئی حدیث نہیں اگر یوں کہتے تو شاید غلط نہ ہوتا لیکن انہوں نے آیت کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس کا مطلب ہے جو طاقت نہیں رکھتا۔ تو آیت کو اس معنی پر محمول کرنا اور اس کی نسبت ان صحابہ کرام کی طرف کرنا یہ صحیح نہیں ہے۔ بہرحال یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آیت منسوخ ہے جیسا کہ اس کے بارے حضرات سلمہ' ابن عمر' ابن عباس کی روایات کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

بروایہ ابن ابی لیلی انہ حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نزل رمضان فشق علیہم فکان من اطعم کل یوم مسکینا ترک الصوم ممن یطیقة ورخص لهم فی ذلک فنسختها وان تصوموا خیر لکم فامروا بالصوم. (رواہ البخاری)

حضرت ابن ابی لیلیٰ روایت کرتے ہیں کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نے بیان کیا ہے کہ رمضان کا چاند طلوع ہوا۔ ان پر روزے رکھنے مشکل ہو گئے تو جو ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا وہ روزہ ترک کر دیتا حالانکہ وہ روزہ کی طاقت رکھتا ہوتا۔ انہیں ایسا کرنے کی اجازت تھی مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور **وان تصوموا خیر لکم** والی آیت نے اسے منسوخ کر دیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ روزے رکھیں۔

وان تصوموا سے مراد صرف یہ الفاظ نہیں بلکہ پوری آیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ''انہیں روزے کا حکم دیا گیا۔'' کا ارشاد **فمن شهد منكم**...... الخ کی طرف ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ نسخ کا انکار ممکن نہیں۔

صاحب فتح القدیر کا یہ کہنا بھی تعجب خیز ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اخبار بالنسخ پر مقدم ہے کیونکہ اخبار بالنسخ رائے اور اجتہاد سے ممکن نہیں لیکن منسوخ میں تاویل جو اسے ناسخ کے ساتھ پائے جانے والے تعارض سے نکال دے اس میں رائے اور اجتہاد کا امکان ہے اس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو اخبار بالنسخ

سے کیسے مقدم مان سکتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب نسخ کی خبر کئی صحابہ کرام علیہم الرضوان نے دی ہو اور اسے صحیح طرق کے ساتھ روایت کیا گیا ہو اور خصوصاً جب مخبر یہ خبر دے رہے ہوں کہ ناسخ کے نزال سے پہلے منسوخ پر عمل کی نوعیت کیا تھی۔ تو ایسے میں یہ کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ عدم منسوخیت کا قول صحیح احادیث پر مقدم ہے پھر اس عظیم محقق علیہ الرحمہ نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ قرآن کریم اور لغت عرب میں حرف نفی مقدر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود پھر کہتے ہیں کہ حرف نفی کا مقدر ہونا کسی رائے اور اجتہاد سے نہیں کیونکہ ظاہر القرآن کے خلاف ہے بلکہ یہ سماع سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ گفتگو تو بے حد حیران کن ہے۔

اس مقام پر صحیح تحقیق یہی ہے کہ یہاں دوسری قرأتیں معنوی اعتبار سے ایک ہی ہیں اگر یطیقونہ کو آپ باب تفعیل تصور کریں اور یطوقونہ پڑھیں اور اسے طوق سے مشتق مانیں اور یہ معنی کریں کہ اگر کوئی تکلیف میں مبتلا ہو یا باب تفعل سے یطوقونہ پڑھیں تو اس کا اصل ہوگا یتطوقونہ تو پھر بھی معنی ہوگا جو اپنی گردنوں میں اسے طوق (مشکل) سمجھتے ہیں، ہوگا۔

یطیقونہ بھی باب تفعل سے ہوگا جیسا کہ قاموس میں ہے تب اس کا اصل یتطوقونہ ہوگا۔ واؤ کو یاء سے بدلیں گے اور تاء کو طا سے اور ہم جنس حروف کو باہم ادغام کر دیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان قرأتوں کی تفسیر بیان کی ہے اور ان کے عدم منسوخ کا حکم دیا ہے جیسا کہ بخاری شریف کے شارحین مثلاً امام عینی وغیرہ نے تصریح کی ہے۔

قرأت متواترہ یطیقونہ اطاقۃ سے ماخوذ ہے اور یہ آیت ہر شخص کے نزدیک منسوخ ہے۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

عن مجاهد عن ابن عباس كان يقرء وعلى الذين يطوقونه فدية طعام مسكين يقول وعلى الذين يحملونه قال هو الشيخ الكبير الذى لايطيق الصوم امران يطعم كل يوم مسكينا قال ومن تطوع خيرا ومن زاد فاطعم اكثر من مسكين فهو خير.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اسے وعلی الذین یطوقونہ فدیۃ طعام مسکین پڑھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس کا مطلب ہے جو فدیہ ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے مراد شیخ کبیر (بوڑھا) ہے۔ جو روزہ نہیں رکھ سکتا۔ اس کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا دے اگر کوئی اس مقدار سے زیادہ دے تو یہ اس کے لئے بہتر ہوگا۔ جو ایک مسکین کی بجائے ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا دے تو اس کو فدیہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ نفلی صدقہ کا ثواب بھی ملے گا۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ انہوں نے ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، دار قطنی، حاکم (انہوں نے اسے صحیح بھی کہا ہے) اور بیہقی علیہم الرحمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وعلی الذین یطوقونہ کا معنی ہے یکلفونہ فدیۃ طعام مسکین۔ (یعنی وہ جنہیں روزہ تکلیف دے ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔

اگر کسی نے بھلائی کی نیت سے اس میں اضافہ کیا اور ایک اور مسکین کو بھی کھانا کھلا دیا تو یہ عمل اس کے لئے خیر کا موجب ہے'' اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔'' فرمایا یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور بہت بوڑھے شخص جو روزہ نہیں رکھ سکتے یا مریض جو جانتا ہے کہ روزہ رکھے گا تو تندرست نہیں رہ سکے گا (ان دو کے) علاوہ کسی کے لئے روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ اس طرح حضرت ابوداؤد علیہ الرحمہ کی روایت سے یہ روایت متعارض نہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ فدیہ کی رخصت اس شخص کے لئے تھی جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اس طرح جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہو اس پر حتمی طور پر روزہ فرض ٹھہرا۔ فدیہ دینا ثابت ہوگیا بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لئے اس طرح کے دوسرے لوگ جو روزہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ **والذین یطوقونه او یطیقونه** (باب تفعیل سے) اس قرأت کا لحاظ کریں تو پھر آیت منسوخ نہیں جیسا کہ بخاری کی روایت میں عطاء سے روایت ہے کہ انہوں نے ابن عباس سے سنا...... اس لحاظ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے دونوں قولوں کے درمیان تعارض بھی نہیں ہوگا اور آیت کے منسوخ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا حکم ثابت ہونا اور اکثر صحابہ کرام کا اس پر منسوخ کا حکم کا باقی ہونا دونوں واضح ہو جائیں گے۔

مفتیٰ بہ قول

صحیح ترین مسئلہ اس ضمن میں یہ ہے کہ شیخ فانی پر فدیہ واجب ہے اور روزہ کا نہ رکھنا ان قرأتوں سے ثابت ہے کیونکہ ان قرأتوں کو اجلہ صحابہ علیہم الرضوان نے قبول کیا ہے اور ان کے مطابق عمل کیا ہے۔ اس لئے وہ مشہور قرأتیں بن گئی ہیں جن پر عمل کرنا واجب ہے۔

اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ گویا دو آیتیں ہوئیں۔ ایک منسوخ التلاوۃ ہے لیکن اس کا حکم باقی ہے اور وہ ہے **وعلی الذین یطوقونه یا یطیقونه** (باب تفعیل سے) **فدیة طعام مسکین** اور دوسری آیت وہ ہے جس کی قرأت موجود ہے لیکن عمل منسوخ ہے اور وہ ہے **وعلی الذین یطیقونه** (باب افعال)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حاملہ اور مرضعہ پر رخصت کا حکم لگایا ہے اور اسی منسوخ التلاوۃ آیت سے استدلال کیا ہے جو ان کا اجتہاد ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت ان دونوں کو شامل نہیں کیونکہ تطوق کا مطلب یہ ہے کہ روزہ ان کے گلے کا کلادہ ہے جو عدم طاقت سے کنایہ ہے حالانکہ یہ دونوں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتی ہیں لہٰذا یہ اس آیت کے حکم میں شامل نہیں۔ انہیں اپنی جان کا نہیں بچے کی جان کا اندیشہ ہوتا ہے گویا وہ مریض کی مانند ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول جو کہ پہلے گزر چکا ہے اس کو اس ضمن میں دلیل نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ اس سے ان کا دوسرا قول رد ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں منسوخ التلاوۃ آیت جسے ابن عباس نے روایت کیا ہے اس کو دلیل بنایا جائے گا۔ ان کا کہنا کہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ حکم لگایا ہے وہ ہمارے خلاف حجت نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم۔

فوت شدہ شخص کی طرف سے روزوں کا فدیہ ادا کرنا

جو شخص فوت ہو گیا اور اس کے ذمے روزے ہیں۔ خواہ وہ رمضان شریف کے ہیں یا نذر کے یا کوئی اور' اس نے وارثت میں مال چھوڑا ہے تو وارث کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے ترکہ سے فدیہ دے جس طرح شیخ فانی اپنے مال سے فدیہ دیتا ہے کیونکہ ادائیگی سے عاجز ہو جانا دونوں میں مشترک ہے بلکہ فوت شدہ کا ادائیگی سے عاجز ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے اور یہ اثبت اور الزم ہے لہٰذا دلالت النص سے شیخ فانی والا حکم میت کے حق میں بھی ثابت ہے۔ (یعنی جس طرح روزہ سے عاجز ہونے کی وجہ سے شیخ فانی فدیہ ادا کرتا ہے فوت شدہ شخص پر جتنے روزے فرض یا واجب ہوں گے ان کا بھی فدیہ دینا پڑے گا)۔

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من مات وعليه صيام شهر رمضان فليطم مكان كل يوم مسكينا. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص فوت ہو گیا اور اس کے ذمے ماہ رمضان کے روزے ہیں تو وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے' ظاہر ہے اس میں رائے اور اجتہاد کو دخل نہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوگا۔

عن ابن عباس قال جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ان امى ماتت وعليها صوم شهر فاقضيه عنها فقال صلى الله عليه وسلم لو كان على امك دين اكنت قاضيه قال نعم قال فدين الله احق ان يقضى. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میری والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا ہے' ان کے ذمے ایک مہینے کے روزے تھے کیا میں ان کی طرف سے ان روزوں کو قضاء کر سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اگر آپ کی والدہ مرحومہ پر کسی کا قرض ہوتا اور آپ اسے ادا کرتے تو کیا ادا ہو جاتا۔ عرض کیا ہاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔

اس حدیث سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں کہ میت کے روزوں کی قضاء کے لئے روزے رکھیں جائیں کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما جو اس حدیث کے راوی ہیں:

قال لا يصلى احد عن احد ولا يصوم احد عن احد. (رواہ النسائی)

فرماتے ہیں کہ کوئی کسی دوسرے کی طرف سے نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرے شخص کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے۔

جب مثل معقول کے ذریعے قضاء پر اسے محمول کرنا صحیح نہ ہوا تو مثل غیر معقول پر محمول کرنا صحیح ہوگا اور روزہ کا غیر معقول مثل فدیہ ہے۔

عن ابن عمر قال الا مام مالک ان ابن عمر كان يسئال هل يصوم احد عن احداو يصلي احد عن احد فيقول لا يصوم احد عن احد ولا يصلي احد عن احد.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے امام مالک فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا جاتا کہ کیا ایک شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے یا نماز پڑھ سکتا ہے؟ تو آپ فرماتے نہ تو کوئی دوسرے کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ نماز پڑھ سکتا ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے عبد الرزاق نے امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فتح القدیر میں امام مالک کا یہ قول بھی مذکور ہے کہ میں نے مدینہ طیبہ میں کسی صحابی اور تابعی سے نہیں سنا کہ کسی نے دوسرے کی جگہ روزہ رکھا ہو یا نماز پڑھی ہو۔ صاحب فتح القدیر فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت نے جس پر فرض کئے ہیں اسی کی طرف سے ادائیگی صحیح ہو سکتی ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة الصديقة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من مات وعليه صوم صام عنه وليه. (رواہ البخاری ومسلم)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ارشادِ نبوی ہے: جو شخص فوت ہو گیا اور اس پر روزہ ہے تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔

اسے ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ جامع الاصول میں ہے کہ یہ حکم نذر کے روزے کے بارے ہے۔

عن ابن عباس قال اذا مرض الرجل في رمضان ثم مات ولم يصح اطعم عنه ولم يكن عنه قضاء وان نذر قضى عنه وليه.

(رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں جب کوئی شخص رمضان المبارک میں بیمار ہو جائے اور جانبر ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کی طرف سے نہ تو مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا اور نہ ہی قضاء روزے رکھنا پڑھیں گے۔ اگر نذر کے روزے ہیں تو پھر روزے رکھنا پڑیں گے۔

عن ابن عباس جاءت امرأة الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت يا رسول الله ان امي ماتت وعليها صوم نذر افاصوم عنها قال ارأيت لو كان على امك دين فقضية فكان يؤدى ذلك عنها قالت نعم قال فصومي عن امك. (رواہ بخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض پرداز ہوئی یا رسول اللہ! میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے ذمے نذر کا روزہ تھا کیا میں ان کی طرف سے رکھ لو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا کیا خیال ہے اگر تیری والدہ کے ذمے قرض ہوتا اور تو اسے ادا کرتی تو کیا اس کا قرض ادا ہو جاتا۔ عرض پرداز ہوئی ہاں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کی طرف سے روزہ رکھ لے۔

یہ احادیث بتاتی ہیں کہ ولی میت کی طرف سے روزے رکھ سکتا ہے فتح القدیر میں نسخ کا دعویٰ کیا گیا ہے لیکن یہ رائے اجتہادی ہے اس لئے اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا ہاں اگر قطعی اجماع اس کے خلاف ثابت ہو جائے تو الگ

بات ہے۔ واللہ اعلم۔

میت کے روزوں کا فدیہ ادا کرنے کے لئے یہ بات شرط ہے کہ میت نے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کی ہو اسی طرح زکوٰۃ، حج نذر کا صدقہ وغیرہ کے فدیہ کے لئے بھی وصیت شرط ہے مگر امام شافعی کا اس مسئلے میں اختلاف ہے وہ اسے لوگوں کے قرضہ جات پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح دنیوی قرضوں کو بغیر وصیت کے ادا کرنا ضروری ہے دینی قرضوں کے لئے بھی وصیت شرط نہیں ہے۔ وصیت کو شرط قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ عبادات کا حکم اس مقصد کے تحت دیا جاتا ہے کہ بندے کو ادائیگی کے لئے آزمایا جائے اور مالی عبادات میں مال فعل کا محل ہے اور اس میں مقصود فعل ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جس پر واجب لاگو ہو رہا ہے وہ کچھ کرے اور یہاں فعل کی صرف یہی صورت ممکن رہ جاتی ہے کہ وہ وصیت کرے کیونکہ فعل ہے۔ جب کوئی شخص اپنے روزوں یا دوسری فرض عبادات کے فدیہ کی وصیت کر دیتا ہے تو اب ولی پر اس کی ادائیگی ضروری ہے لیکن یہ وصیت صرف ترکہ کے تیسرے حصے میں ادا ہو سکتی ہے کیونکہ عموماً وصیت تیسرے حصہ کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ ہاں اگر وارث چاہیں تو ثلث سے زائد حصہ میں سے بھی فدیہ دے سکتے ہیں۔ امام محمد فرماتے ہیں انشاء اللہ ایسی صورت میں رب قدوس فدیہ قبول کرے گا لیکن اس میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وارث بغیر وصیت کے بھی فدیہ دیں گے تو بہتر ہوگا کیونکہ صدقہ کا ثواب میت کو یقینی طور پر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ امید کرنی چاہئے کہ وہ نیکی کا بہترین صلہ عطا کرے گا۔

اگر میت کے ذمے نمازیں ہوں تو اس پر وصیت واجب ہے۔ ایک نماز کا فدیہ روزے کی طرح ایک صاع کھجور یا نصف گندم ہے کیونکہ نماز اور روزہ ایک جیسی فرض عبادات ہیں لہٰذا جو چیز روزہ کا بدل ہے وہ نماز کا بدل بن سکتی ہے اور اس تعلیل کا احتمال ہے کیونکہ خلاف عقل مثل قیاس سے ثابت نہیں ہو سکتا جیسا کہ اصول سے ثابت ہے مگر اس احتمال والی تعلیل پر عمل احتیاطاً کیا جائے گا اگر یہ تعلیل صحیح ہوئی تو فدیہ ادا ہو جائے گا ورنہ جو مال آپ دیں گے وہ صدقہ قرار پائے گا اور اللہ تعالیٰ سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس کے طفیل اللہ تعالیٰ میت کے گناہ معاف کرے گا اسی لئے امام محمد فرماتے ہیں کہ انشاء اللہ اسے جزاء ملے گی لیکن قطعیت سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ممنوع، نفلی اور منت کے روزوں کا بیان

ایام ممنوعہ کے روزے

عید الفطر، عید قربان اور ایام تشریق کے روزے رکھنے کے بارے نہی وارد ہوئی ہے۔

فعن ابی سعید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن صیام یومین یوم الفطر ویوم النحر. (رواہ مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن عید الفطر اور قربانی کے روزوں سے روکا ہے۔

اسی طرح کی ایک حدیث میں ہے کہ:

عن ابی ھریرۃ وام المؤمنین وعن کعب

حضرت ابوہریرہ، ام المؤمنین اور کعب بن مالک رضی اللہ

بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثہ واوس بن الحدثان ایام التشریق فناد یا انہ لا یدخل الجنۃ الامؤمن و ایام منی ایام اکل وشرب. (رواہ مسلم)

تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں (کعب بن مالک) اور اوس بن حدثان کو تشریق کے دنوں میں (اعلان کرنے کے لئے شہر میں) بھیجا اور انہوں نے یہ اعلان کیا جنت میں مؤمن کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا اور منیٰ کے دن کھانے اور پینے کے دن ہیں۔

ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ ان دنوں میں روزہ رکھنا فی نفسہٖ ممنوع نہیں اور نہ ہی ان دنوں روزہ رکھنے سے روزہ باطل ٹھہرتا ہے کیونکہ شرعی احکام میں نہی صحت پر دلالت کرتی ہے۔ اگر ان دنوں میں روزے اپنی ذات کے اعتبار سے فاسد ہوتے تو کوئی روزہ رکھ بھی لیتا تو وہ روزہ شمار ہی نہ ہوتا۔ سوان دنوں میں روزہ رکھنے کے بارے نہی روزوں سے نہی نہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے ان دنوں میں روزے اپنے اصل کے اعتبار سے تو مشروع ہیں لیکن وصف کے اعتبار سے مشروع نہیں ہیں اور وصف یہ ہے کہ ان دنوں میں انسان اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے۔ ''منیٰ کے دن کھانے پینے کے دن ہیں۔'' یعنی یہ ایام اللہ کی ضیافت کے ایام ہیں لہٰذا ان میں کھاؤ پیو۔ اگر ان ایام میں کوئی شخص روزہ رکھ لیتا ہے تو روزہ توڑ دینا اس پر واجب ہے کیونکہ ان دنوں میں روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس روزے کی قضاء نہیں کیونکہ قضاء ادا کردہ عبادت کو باطل ہونے سے بچانے کے لئے واجب ہوتی ہے۔ چونکہ ایام مذکورہ میں روزہ رکھنا ممنوع تھا اس لئے اسے باطل ہونے سے بچانا واجب نہیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ روزہ رکھے گا تو روزہ مکمل ہو جائے گا اور اس وجہ سے وہ گناہگار ہوگا کیونکہ ممانعت کے باوجود اس نے روزہ رکھ لیا۔

اگر ان دنوں میں روزے رکھنے کی منت مان لی۔ مثلاً کہہ دیا میں نے عید کے دن کے روزے کی نذر مان لی یا اس نے ایک متعین دن کو روزہ رکھنے کی منت مان لی مثلاً کہا کہ آنے والی جمعرات کو روزہ رکھوں گا اور اتفاق سے جمعرات کو عید قربان تھی تو امام ابوحنیفہ سے حضرت امام حسن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق پہلی صورت میں نذر صحیح ہے کیونکہ اس میں معصیت نہیں اتفاق سے ادائیگی کے وقت وہ معصیت ہوگئی ہے۔

ظاہر الروایۃ جو ہمارے ائمہ سے منقول ہے وہ یہ کہ دونوں صورتوں میں نذر باطل نہیں بلکہ صحیح ہے کیونکہ نذر کا تعلق ان ایام کے روزوں سے ہے اور روزے اپنی ذات کے اعتبار سے معصیت نہیں بلکہ ان ایام کے جوار (پڑوس) کی وجہ سے معصیت ہیں کیونکہ اصل کے اعتبار سے تو روزے مشروع ہیں وصف کے اعتبار سے غیر مشروع ہیں۔

عن ابن عمر جاء الیہ رجل فقال انی نذرت ان اصوم یوما فوافق یوم اضحی اوفطر فقال ابن عمر امر اللہ بوفاء النذر ونھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صوم ھذا الیوم. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا میں نے ایک دن روزہ رکھنے کی منت مانی تھی اتفاق سے وہی دن بقرعید یا عید الفطر کا نکلا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نذر کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس دن

روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔

دیکھئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس نذر کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ نذر باطل ہے کیونکہ یہ معصیت کی نذر ہے لیکن آپ نے ادائیگی میں تردد کا اظہار فرمایا کیونکہ اس سے معصیت لازم آتی تھی۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ نذر میں معصیت نہیں کیونکہ منت تو وہ روزہ رکھنے کی مان رہا ہے جو اپنی ذات میں اطاعت اور مشروع ہے۔ معصیت صرف ادائیگی میں ہے کیونکہ اس طرح روزہ ایک وصف سے متصف ہو جاتا ہے اور وہ وصف ہے اس کا ممنوع ہونا۔

مذکورہ ایام میں جب روزے رکھنے کی منت صحیح ہوئی تو ان ایام میں روزے رکھنا منت ماننے والے پر واجب ہوئے لیکن ادائیگی ممکن نہیں روزہ رکھتا ہے تو گناہگار ہوتا ہے۔ نذر کیسے پوری کرے؟

علماء فقہ فرماتے ہیں کہ منت ماننے والے پر واجب ہے کہ وہ مذکورہ ایام میں روزے نہ رکھے اور رسول اللہ ﷺ کی ممانعت کی اطاعت کرے اور گناہ کے ارتکاب سے بچے۔ جب مذکورہ ایام گزر جائیں تو منت کے روزوں کی قضاء کرے تا کہ اس پر منت کے جو روزے فرض ہیں ان کی ادائیگی سے عہدہ برا ہو جائے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح مسافر اور مریض جنہیں روزہ نقصان دیتا ہے ان پر سبب کے پائے جانے کی وجہ سے رمضان شریف کے روزے فرض ہوتے ہیں لیکن حالت سفر اور مرض میں ان کے لئے روزہ رکھنا حرام ہوتا ہے کیونکہ ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے اور ایسی صورت میں شریعت نے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے لہٰذا وہ سفر اور مرض میں روزہ نہیں رکھتے اور بعد میں اس کی قضاء کر لیتے ہیں بہرحال اگر کوئی شخص مذکورہ ایام میں روزے رکھ لے گا تو ادا ہو جائیں گے اور نذر پوری ہو جائے گی کیونکہ وہ جس طرح نذر کے ساتھ (ناقص) واجب ہوئے تھے (ناقص) ادا ہو گئے لیکن وصف کے لحاظ سے ممنوع ہونے کی وجہ سے معصیت کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے گناہ ہوگا اور چونکہ صحت و وجوب کی جہت اور حرمت کی جہت باہم مختلف ہیں لہٰذا دونوں کے اجتماع میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے مخصوصہ زمین میں نماز پھر جہت وجوب یہ ہے کہ یہ نذر کے روزے ہیں اور جہت حرمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ضیافت سے اعراض برتا جا رہا ہے۔ جہت وجوب اور جہت حرمت کے درمیان عموم من وجہ کی نسبت پائی جا رہی ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ جہت وجوب روزہ ہے اور جہت حرمت یہ ایام ہیں۔ اس لئے اس پر وہ اعتراض وارد نہیں ہوتا جو ابن حاجب نے کہا ہے کہ وجوب اور حرمت ایک فعل میں صرف اسی صورت پر دو جہتوں کی وجہ سے جمع ہو سکتے ہیں جب ان کے درمیان عموم من وجہ کی نسبت ہو جیسے نماز اور غصب شدہ زمین میں ہے لیکن جب عموم مطلق پائی جا رہی ہو تو پھر نہیں حالانکہ عموم من وجہ اور عموم مطلق میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں ہے کیونکہ حرمت اور وجوب کا اجتماع تبھی صحیح ہو سکتا ہے جب یہ دونوں دو جہتوں سے ہوں کیونکہ ان کے متعلق مختلف ہیں لہٰذا دو متضاد چیزیں ایک فعل میں جمع نہیں ہو سکتیں اور یہ شامل ہے عموم من وجہ اور عموم مطلق دونوں کو۔

اگر یہ کہیں کہ جب دونوں جہتوں میں عموم من وجہ کی نسبت ہے تو ممکن ہے کہ فعل تو پایا جائے لیکن اس کی جہت حرمت مفقود ہو اور اس طرح واجب فعل کا بجالانا صحیح ہو اور اس میں کسی قسم کی معصیت نہ ہو مگر جب ایک جہت

دوسری جہت کے لئے لازمی ہو یا دونوں باہم لازم وملزوم ہوں تو پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ فعل کو بغیر معصیت کے ادا کیا جائے سواسی وجہ سے وجوب کا حکم لاگو ہوتا ہے اور حرمت ادائیگی کو محال بنا دیتی ہے۔ میں کہوں گا کہ یہ اعتراض تب لازم آئے گا جب حرمت والی جہت' وجوب کی جہت سے عام ہو لیکن جب جہت حرمت خاص ہو اور جہت وجوب عام ہو تو پھر نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جہت وجوب ہے منت کا روزہ ہونا اور جہت حرمت ہے روزے کا ان ایام میں ہونا۔ اس لئے وجوب کی ادائیگی بغیر معصیت کے ممکن ہے۔ دونوں کا اجتماع صرف اس سے لازم آیا کہ مکلف نے روزہ کی ان ایام کی طرف نسبت کر کے روزوں کو منت بنا دیا پھر مذکورہ اعتراض اس صورت میں وارد ہوتا جب شریعت کا مقصود روزوں کی ادائیگی کو واجب کرنا ہوتا۔ جب مقصد ہے ایسا وجوب جس پر قضاء مرتب ہو تو پھر تو کچھ ناممکن نہیں رہا جیسے مریض اور مسافر پر روزے فرض تو ہیں لیکن وہ بعد میں ان کی قضاء کریں گے۔ اسی طرح ان ایام میں روزے رکھنے کی منت مانی تو روزے واجب ہو جائیں گے لیکن ان دنوں کے بعد ان کو قضاء کرے گا۔ اگر کوئی ان دنوں میں نذر کے روزے رکھ لیتا ہے تو روزے تو ہو جائیں گے اور وہ واجب کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جائے گا لیکن گناہگار ہوگا۔ اس مقام پر اکثر فقہ کے ماہرین کے قدم ڈگمگا گئے ہیں۔

صوم وصال رکھنا درست نہیں

صوم وصال رکھنا بھی ممنوع ہے بلکہ حرام ہیں کیونکہ ارشادِ خداوندی ہے۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ. پھر روزے مکمل کرو رات تک۔

ربِ قدوس نے رات کو روزے کے لئے غایت بنایا ہے لہٰذا رات کے وقت کوئی روزہ نہیں۔ رات روزے کا محل ہی نہیں۔ رات کو روزہ اپنی ذات کے لحاظ سے قبیح ہے اس لئے رات کو کسی حال میں روزہ صحیح نہیں۔ اگر کسی نے صوم وصال رکھا اور اسے نیکی سمجھتے ہوئے رات کو کچھ نہ کھایا پیا تو گناہگار ہوگا کیونکہ اس نے ایسی چیز کو قربت کا ذریعہ بنایا جو قربت کا ذریعہ نہیں۔

اگر کسی نے صوم وصال کی نذر مانی تو اس پر دو روزے واجب ہوں گے اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ دونوں روزوں کے درمیان والی رات کو کھائے پیئے۔ ایسی نذر سے رات کے وقت کچھ واجب نہیں ہوتا کیونکہ نذر ثواب کی غرض سے مانی جاتی ہے اور رات کو کھانا پینا ترک کرنا کار ثواب نہیں لہٰذا نذر ماننا تو صحیح ہوا لیکن اس نے وصال کی شرط عائد کی ہے وہ باطل ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ احادیث میں بھی اس کی ممانعت آئی ہے۔

عن ام المؤمنين عائشة قالت نهاهم رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الوصال رحمة لهم فقالوا انك تواصل قال انى لست كهيئتكم انى يطعمنى ربى ويسقينى.

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے از راہ شفقت انہیں (صحابہ کرام کو) صوم وصال رکھنے سے منع فرمایا۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان عرض پرداز ہوئے آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ فرمایا میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یہ سوال کرے کہ یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ صوم وصال سے از راہ شفقت منع کیا گیا

ہے کہ کہیں وہ کمزور نہ پڑ جائیں لیکن فی نفسہ اس کی مشروعیت تو ثابت ہوتی ہے کیونکہ مجاور (روزے کی وجہ سے جو کمزوری پیدا ہوتی ہے) کی وجہ سے ممانعت آئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ صوم وصال سے ممانعت از راہ شفقت ورحمت نہیں بلکہ یہ ممانعت مجاور کی وجہ سے ہے اور وہ ہے ایسی چیز کو روزہ کا حصہ بنانا جو سرے سے عبادت شمار ہی نہیں ہوتی۔ یعنی رات کے وقت کھانا پینا ترک کرنا باعث ثواب اور عبادت ہے ہی نہیں اسے عبادت میں شامل کرنا یعنی دن کے روزے کے ساتھ رات کا روزہ ملانا صحیح نہیں ہے۔ ہاں رسول اللہ ﷺ کے لئے رات کے وقت امساک عن الاکل والشرب والجماع قربت ہے اور ان کے حق میں اس پر ثواب مرتب ہوتا ہے۔

بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ صوم وصال فی نفسہ قربت (باعث اجر وثواب عبادت) ہے لیکن ایسے شخص کے لئے ممنوع ہے جو اس درجے تک نہ پہنچا ہو کہ اسے رب قدوس کھلائے اور پلائے۔ ہاں اگر کوئی اتباع رسول اللہ ﷺ کی برکت سے اس درجہ پر فائز ہے تو اس کے لئے صوم وصال جائز ہے۔ اس بناء پر تو صحابہ کرام علیہم الرضوان میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو بطفیل نبی کریم ﷺ اس مرتبہ پر فائز نہ ہو لہٰذا یہ نہی ان کے لئے ثابت نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم.

خاموشی کے روزے کی حیثیت

خاموشی کا روزہ بھی ممنوع ہے۔ یہ روزہ یہودیوں میں مشروع تھا مگر منسوخ ہو گیا ہے اور ہماری شریعت مقدسہ میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ اگر کوئی خاموشی کا روزہ رکھے گا تو گناہگار ہو گا کیونکہ اس نے ایسی چیز کو عبادت بنایا جو عبادت نہیں۔ اس لئے اس کے فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔

اگر کسی نے خاموشی کے روزے کی منت مانی تو اسے وہی روزہ رکھنا پڑے گا جس کی شریعت نے اجازت دی ہے (یعنی صبح سے شام تک کھانے پینے اور جماع سے روزہ کی نیت کر کے اجتناب کرے گا) اور بولنا اس کے لئے جائز ہو گا کیونکہ خاموشی کا روزہ گفتگو کے ساتھ تین شہوتوں (اکل، شرب، جماع) سے رک جانے کا نام ہے۔ گفتگو نہ کرنا عبادت نہیں اور کھانے، پینے اور جماع سے رکنا عبادت ہے لہٰذا اس کی نذر روزہ معتاد کی ہو گی اور جو قربت نہیں وہ روزہ میں شامل نہیں ہو گی لہٰذا مشروع طریقہ سے روزہ رکھ کر اس نظر کو پورا کیا جائے گا۔

عن ابن عباس قال بینما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخطب یوما اذھو برجل قائم یسأل لو ان الرجل نذر ان یقوم فی الشمس ولا یقعد ویصوم ولا یفطر بنھار ولا یستظل ولا یتکلم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مروہ فلیستظل ولیقعد ولیتکلم ولیتم صومه. (رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی اٹھ کر پوچھنے لگا: اگر کوئی آدمی منت مانے کہ وہ دھوپ میں کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں۔ روزہ رکھے گا اور کبھی بھی روزہ ترک نہیں کرے گا، نہ سائے میں جائے گا اور نہ بات کرے گا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے کہو کہ وہ سایہ میں ہو جائے۔ بیٹھے، بات کرے اور اپنا روزہ مکمل کرے۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے حکم دیا اس کام کا جو اطاعت تھا اور اس کام کو چھوڑنے کا جو گناہ تھا اور مجھے نہیں معلوم کہ آپ ﷺ نے اسے کفارہ کا حکم دیا ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چونکہ قربت کا سبب نہیں اس لئے انہیں قربت وعبادت بنانا گناہ ہے۔ ورنہ فی نفسہٖ دھوپ میں کھڑا ہونا کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ اس سے نقصان نہ ہو۔ اسی طرح خاموشی فی نفسہٖ بھی گناہ نہیں۔ اسی لئے کفارہ کا حکم نہیں دیا کیونکہ کفارہ اس وقت ہوتا ہے جب گناہ کی منت مانی جائے۔ یہ معصیت کی نذر نہیں بلکہ ایسے کام کی نذر ہے جو عبادت نہیں۔

نویں ذوالحجہ کا روزہ رکھنا ممنوع ہے

نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا بھی ممنوع ہے اور یہ مکروہ تنزیہی ہے بشرطیکہ وقوف علی وجہ المسنون میں مخل نہ ہو۔ اگر روزہ رکھ کر عرفات میں مسنون طریقہ کے مطابق ٹھہرنا ناممکن ہو تو پھر روزہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے۔ شیخ اکبر اسے مکروہ تحریمی کہتے ہیں مگر اس وجہ سے نہیں کہ وقوف عرفات میں مخل ہوگا بلکہ اس وجہ سے کہ احرام روزے کے منافی ہے۔ مکروہ ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن صوم عرفة بعرفة. (رواہ ابوداؤد)	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نویں کے دن عرفات کے میدان میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔

پورا سال روزے رکھنا

صیام دہر ممنوع ہیں (یعنی سال بھر روزے رکھنا اور ایک دن بھی افطار نہ کرنا)۔

عن ابن عمر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من صام الابد فلا صام ولا افطر. (رواہ النسائی)	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ابدی روزہ رکھا تو اس کا کوئی روزہ نہیں اور کوئی افطار نہیں کیا۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کچھ اجر نہیں ملے گا۔ اس کا مفہوم یہ نہیں کہ اس کا روزہ نہیں ہوا۔ ابدی روزے اس طرح رکھنا کہ وہ پانچ دن بھی روزہ سے گزارے جن میں روزہ رکھنے کی ممانعت آئی ہے تو یہ حرام ہیں اور باقی مکروہ تنزیہی ہیں۔ شاید اس میں حکمت یہ ہو کہ اس طرح روزہ کا عادی ہو جانا ہر کلفت اور مشقت کو ختم کر دیتا ہے (یعنی روزہ عادت بن جاتا ہے عبادت نہیں رہتا) اس لئے اس پر خواہشات کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے اجر نہیں ملتا۔

صرف دسویں محرم کا روزہ رکھنا

عاشورہ (دسویں محرم) کا اکیلا روزہ بھی ممنوع ہے۔ یہ بھی مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ اکیلا روزہ رکھنے سے یہودیوں کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔ مخالفت یہود کی غرض سے حضور ﷺ نے یومِ عاشورہ کے اکیلے روزہ

سے منع فرمایا ہے۔

عن ابن عباس قال حین صام رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم عاشوراء وامر اصحابه بصومه قالوا یا رسول الله انه یوم یعظمه الیهود والنصاری فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا کان العام القابل صمت الیوم التاسع فلم یأت العام المقبل حتی توفی رسول الله صلی الله علیه وسلم. (رواہ مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب عاشورہ کا روزہ رکھا اور اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہود ونصاریٰ اس دن کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اگلا سال آئے گا تو میں نویں محرم کو روزہ رکھوں گا۔ اگلا سال نہ آیا کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میں دسویں محرم کے ساتھ نویں محرم کا روزہ بھی رکھوں گا۔

اکیلا جمعۃ المبارک کا روزہ بھی ممنوع ہے

اکیلا جمعہ کا روزہ بھی ممنوع ہے اور اس کا حکم بھی مکروہ کا ہے کیونکہ جمعہ عید کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اس روز کا اکیلا روزہ نہ رکھا جائے۔

ایک دلیل تو یہ ہے کہ جمعہ عید ہے اور عید کے دن روزہ نہیں رکھنا چاہئے اور دوسری دلیل ہے۔

عن ابی هریرة قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا یصوم احدکم یوم الجمعة الا ان یصوم قبله او بعده. (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ نے فرمایا: کوئی شخص جمعہ کا (اکیلا) روزہ نہ رکھے مگر یہ کہ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھے۔

یاد رکھئے کہ جمعہ کے اکیلے روزے کے ممنوع ہونے کے بارے کئی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ جواز کی صورت صرف یہ ہے کہ معمول میں آ جائے تو حرج نہیں۔ (مثلاً صوم داؤدی رکھتے ہوئے جمعرات کو افطار کیا جمعہ کو روزہ رکھا اور ہفتہ کو پھر افطار کر لیا تو یہ مکروہ نہیں اگرچہ جمعہ کے دن کا یہ روزہ اکیلا ہے) اس کے باوجود امام مالک اسے مستحب کا درجہ دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مکروہ تنزیہی ہے۔ نذر مانی جائے تو جمعہ کا روزہ واجب ہو جاتا ہے اور اس دن ادائیگی بھی ہو جاتی ہے۔

رمضان المبارک سے قبل روزے رکھنا

رمضان کے شروع ہونے سے پہلے رمضان کے روزے کی نیت سے ایک دو روزے رکھنا بھی ممنوع ہے جیسا کہ امامیہ کرتے ہیں۔ اس سے احتراز ضروری ہے۔ اگر کوئی رمضان شریف کی تکریم کی نیت سے ایک، دو یا تین روزے پہلے رکھتا ہے تو مکروہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

عن ابی هریرة قال لا یتقدم احدکم رمضان بصوم یوم اویومین الا ان یکون رجلا کان یصوم صوما فلیصمه . (رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم میں سے کوئی بھی رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھے الا یہ کہ آدمی (مسلسل) روزے رکھ رہا ہو تو وہ رکھ لے۔

استثناء کا مطلب یہ ہے کہ اگر معمول میں آ جائیں تو پھر روزہ رکھنے میں حرج نہیں۔ مثلاً ایک آدمی جمعرات کا ہمیشہ روزہ رکھتا ہے۔ اتفاق سے شعبان کا آخری دن جمعرات ہے۔ یا وہ ہر ماہ کے آخری روزے رکھتا ہے اور اس طرح شعبان کے آخری روزے بھی رکھ لیتا ہے تو پھر حرج نہیں پھر یہ نہی ہے بھی مکروہ تنزیہی کے لئے اس لئے منت کی صحت اور اس کا پورا کرنا ممنوع نہیں ہے۔

نفلی روزہ توڑنے کے متعلق بحث

نفل نماز کی طرح ہمارے نزدیک نفلی روزہ شروع کرنے سے اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ اس ضمن میں ہم سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ اس پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے اب ہم خاص روزے کے حوالے سے بات کریں گے۔

شوافع ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس حدیث کو ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں افادہ کے لئے پھر ذکر کر دیتے ہیں۔

قالت ام المؤمنین عائشة دخل علی النبی صلی الله علیه وسلم ذات یوم فقال هل عند کم من شئی فقلنا لا قال فانی صائم ثم اتانا یوما آخر فقلنا یا رسول الله صلی الله علیه وسلم اهدی لنا حیس فقال ارینیه لقد اصبحت صائما فاکل. (رواه مسلم والنسائی)

ام المؤمنین حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ کھانے کو کچھ ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا: تو میں نے روزہ رکھ لیا پھر ایک دن ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم نے کہا یا رسول اللہ! ہمیں حیس (کھجور، گھی اور ستو سے تیار شدہ کھانا) تحفہ دیا گیا ہے۔ فرمایا: مجھے دکھاؤ۔ میں نے صبح روزہ رکھ لیا تھا آپ ﷺ نے یہ کھانا تناول فرمایا۔

امام نسائی کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں۔

فقلت یا رسول الله صلی الله علیه وسلم دخلت علی وانت صائم ثم اکلت حیسا قال نعم یا عائشة انما منزلة منصام فی غیر رمضان او غیر قضاء رمضان فی التطوع بمنزلة رجل اخرج صدقة من ما له فجاو منها بماشاء فامضاه وبخل بما بقی فامسکه.

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ میرے پاس تشریف لائے تو روزہ سے تھے پھر بھی آپ نے حیس کھا لیا۔ فرمایا ہاں عائشہ! جو شخص غیر رمضان یا غیر قضائے رمضان کے نفلی روزے رکھتا ہے تو وہ اس آدمی کی جگہ ہوتا ہے جس نے اپنے مال سے صدقہ نکالا۔ جتنا چاہا صدقہ کر دیا اور (غریب) کے حوالے کر دیا اور جو باقی بچا اس میں لالچ کیا اور اسے روک لیا۔

عن ام ھانی قالت کنت قاعدة عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاتی بشراب فشرب منہ ثم ناولنی فشربت منہ فقالت یا رسول اللہ اما انی کنت صائمة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصائم التطوع امین بنفسہ شاء صام و انشاء افطر. (رواہ جامع ترمذی)

حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھی تھی کہ آپ کی خدمت میں مشروب پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے اس میں سے پیا پھر مجھے عنایت فرمایا اور اس میں سے میں نے بھی پیا پھر میں عرض گزار ہوئی یا رسول اللہ! میں تو روزے سے تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نفلی روزہ رکھنے والا خود ہی امین ہوتا ہے چاہے تو روزہ رکھے اور چاہے تو افطار کردے۔

اب وہ احادیث ملاحظہ کیجئے جن سے ہم استدلال کرتے ہیں۔

عن ام المؤمنین عائشة الصدیقة کنت انا و حفصة صائمتین فاھدی لنا طعام فاکلنا منہ فدخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت حفصة وبدرتنی بالکلام و کانت ابنة ابیھا یا رسول اللہ انی اصبحت وعائشة صائمتین متطوعتین فاھدی لنا طعام فافطرنا علیہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقضیا مکانہ. (رواہ ابوداؤدوالترمذی ومالک)

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں اور حضرت ام المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا روزے سے تھیں کہ ہمیں کھانا ہدیہ کیا گیا۔ ہم نے اس میں سے کھا لیا۔ بعد ازیں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ حضرت حفصہ بول پڑیں۔ وہ کلام کرنے میں مجھ سے سبقت لے گئی کیونکہ آخر بیٹی کس کی تھیں۔ یا رسول! میں اور عائشہ نے صبح نفلی روزے سے کی ہمیں ہدیۂ کھانا پیش ہوا اور ہم نے کھانا کھا کر روزہ توڑ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ ایک روزہ رکھو۔

لیکن اس حدیث پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ بعض راویوں کو اپنے شیوخ سے سماع ثابت ہی نہیں لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ شرط صرف ہم عصر ہونا اور امکانِ سماع ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ سے زیادہ حدیث مرسل ہے اور مرسل دلیل بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بقول مصنف فتح القدیر کے اسے ابن حبان علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند متصل ہے۔

شوافع کی پہلی دلیل (حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ نفلی روزہ توڑا جا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے رسول اللہ ﷺ نے اس کی جگہ روزہ رکھا ہو کیونکہ یہ حدیث قضاء کی نفی نہیں کرتی۔ اس لئے یہ حدیث شوافع کے مؤقف کو ثابت نہیں کرتی۔ نفلی صدقہ والی تمثیل سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نفلی روزہ جسے رکھ کر توڑ دیا گیا ہو کی قضاء واجب ہے کیونکہ جو صدقہ کا مال الگ کرتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اسے مستحق کے حوالے کرے اگر کچھ مال کچھ دیر کے لئے روک لیتا ہے تو پھر بھی آخر کار وہ مال اسے صدقہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے یہ معنی لینا کہ جو صدقہ کا ارادہ کرے اور کچھ مال دے کر باقی صدقہ نہ کرے حقیقت سے انحراف ہے۔ رہی حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث تو اس میں امین کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہگار نہیں ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کو ادا ہی نہیں

کرے گا جو اس پر فرض ہے۔

رہی بات قضاء کے واجب ہونے کی تو اس بارے یہ حدیث خاموش ہے۔

اس بات پر تو اتفاق ہے کہ کسی عذر کی بناء پر فرض روزہ افطار کیا جا سکتا ہے لیکن کیا دعوت پر بھی روزہ توڑنا جائز ہے یا نہیں اس بارے دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کی رو سے ضیافت کی وجہ سے بھی نفلی روزہ توڑا جا سکتا ہے جبکہ دوسری روایت کی رو سے روزہ توڑنا جائز نہیں۔ صحیح روایت پہلی ہے کیونکہ حدیث مبارک میں ہے:

عن جابر قال صنع رجل من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم طعاما فدعا النبي صلى الله عليه وسلم فلم اتى الطعام تنحى رجل فقال صلى الله عليه وسلم مالك قال انى صائم فقال صلى الله عليه وسلم تكلف اخوك وصنع طعاما ثم تقول انى صائم كل وصم يوما مكانه.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی نے دعوت کا اہتمام کیا اور رسول اللہ ﷺ کو بھی بلایا۔ جب وہ کھانا لے کر آئے تو ایک شخص الگ ہو بیٹھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آپ کو کیا ہوا (الگ ہو گئے)؟ عرض کیا میں روزہ سے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آپ کے بھائی نے تکلف کیا۔ کھانا تیار کیا پھر آپ کہہ رہے ہیں کہ میں روزے سے ہوں۔ کھانا کھاؤ اور کسی دن اس جگہ روزہ رکھ لیجئے۔

فتح القدیر میں ہے کہ اسے دار قطنی علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

روى البخاري آخى النبي صلى الله عليه وسلم بين سلمان وابى درداء فرأى سلمان ام الدرداء مبتذلة فقال لها ما شانك قالت اخوك ابو الدرداء ليس له حاجة في الدنيا فجاء ابو الدرداء فصنع له طعاما فقال كل فانى صائم قال ما اكل حتى تاكل فاكل فلما كان الليل ذهب ابو الدرداء يقوم قال له سلمان نم فنام ثم ذهب يقول فقال نم فلما كان من آخر الليل قال سلمان قم الآن قال فصليا فقال له سلمان ان لربك عليك حقا ولنفسك عليك حقا ولبدنك عليك حقا ولاهلك عليك حقا فاعط كل ذى حق حقه فاتى النبى فذكر له ذلك

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان اور حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بھائی بھائی بنایا حضرت سلمان نے حضرت ام درداء (ابودرداء کی بیوی) رضی اللہ عنہا کو پریشان دیکھ کر پوچھا کیا وجہ ہے؟ فرمانے لگیں آپ کے بھائی ابودرداء کو دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حضرت ابودرداء تشریف لائے اور حضرت سلمان کے لئے کھانا تیار کیا پھر کہنے لگے آپ کھانا تناول فرمالیں میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان نے فرمایا جب تک آپ نہیں کھائیں گے میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ حضرت ابودرداء نے کھانا تناول فرمالیا۔ جب رات ہوئی تو حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نفل پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ حضرت سلمان نے فرمایا سو جاؤ۔ وہ سو گئے پھر باتیں کرنے لگے حضرت سلمان نے فرمایا۔ اب اٹھو دونوں نے نماز پڑھی پھر